اِنعَامُ البَارِی

دُروسِ بخاری شریف

افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ تعالیٰ

جامعہ دارالعلوم کراچی میں درسِ بخاری شریف کے دوران
حضرت شیخ الحدیث کی جامع، بصیرت افروز اور روح پرور تقاریر

صَحیح البُخَاریُ الجزء الاوّل

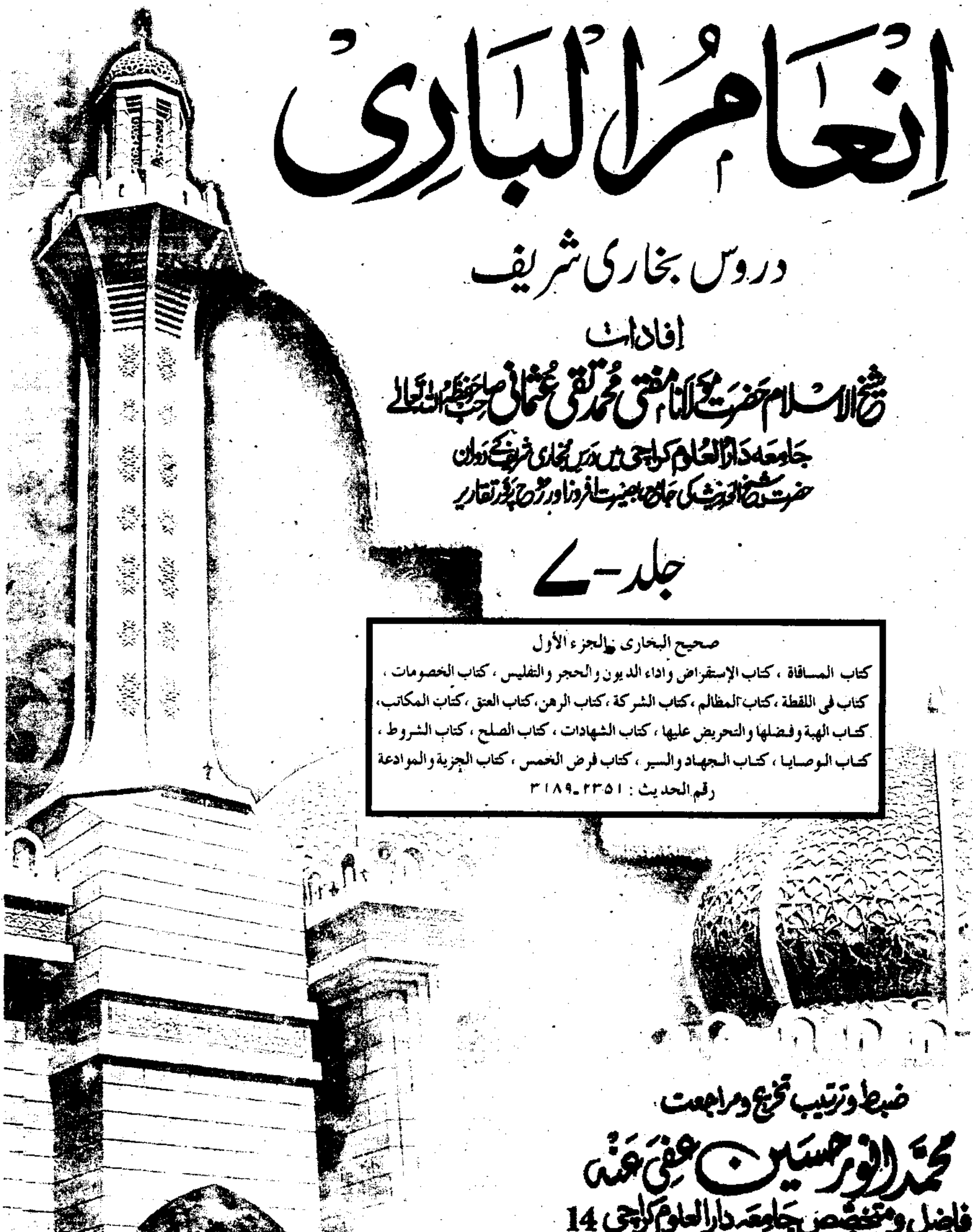
كتاب المساقاة ، كتاب الإستقراض واداء الديون والحجر والتفليس
كتاب الخصومات ، كتاب فى اللقطة ، كتاب المظالم ، كتاب الشركة ، كتاب
الرهن، كتاب العتق ، كتاب المكاتب، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها
كتاب الشهادات ، كتاب الصلح ، كتاب الشروط ، كتاب الوصايا ، كتاب
الجهاد والسير ، كتاب فرض الخمس ، كتاب الجزية والموادعة
رقم الحديث : ٢٣٥١-٣١٨٩

جلد ٧

ضبط و ترتیب تخریج و مراجعت
محمد انور حسین عفی عنہ
فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی 14

مکتبۃ الحراء

Phone: 009-213501039, Cell: 0300-3360816
E-mail: maktabahera@yahoo.com



اِنْعَامُ الْبَارِیْ

دروس بخاری شریف

افادات

شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہم اللہ تعالیٰ

جامعہ دارالعلوم کراچی میں درس بخاری شریف کے دوران
حضرت شیخ الحدیث کی جامع، بصیرت افروز اور پُر اثر تقاریر

جلد-۷

صحیح البخاری الجزء الأول

كتاب المساقاة ، كتاب الإستقراض واداء الديون والحجر والتفليس ، كتاب الخصومات ، كتاب في اللقطة ، كتاب المظالم ، كتاب الشركة ، كتاب الرهن ، كتاب العتق ، كتاب المكاتب ، كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها ، كتاب الشهادات ، كتاب الصلح ، كتاب الشروط ، كتاب الوصايا ، كتاب الجهاد والسير ، كتاب فرض الخمس ، كتاب الجزية والموادعة

رقم الحديث : ۲۳۵۱-۳۱۸۹

ضبط و ترتیب تخریج و مراجعت

محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی 14

S 131, Double Room, 36-A, 'K' Area Korangi, Karachi
Contact: 0092-21-35031039, Cell : 0092-3003360816
Email: maktabahera@yahoo.com & info@deeneislam.com
WebSite: www.deeneislam.com

مکتبۃ الحراء

نام کتاب	:	انعام الباری دروس صحیح البخاری جلد ۷
افادات	:	شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب حفظہ اللہ
ضبط وترتیب تخریج ومراجعت	:	محمد انور حسین (فاضل ومتخصص جامعہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴)
ناشر	:	مکتبۃ الحراء، ۸/۱۳۱، ڈبل روم، "کے" ایریا کورنگی، کراچی، پاکستان
باہتمام	:	محمد انور حسین عفی عنہ
کمپوزنگ	:	حراء کمپوزنگ سینٹر فون نمبر: 35031039 21 0092

ناشر : مکتبۃ الحراء

8/131 سیکٹر **36-A** ڈبل روم، "**K**" ایریا، کورنگی، کراچی، پاکستان۔
فون: 35031039 موبائل: 03003360816
E-Mail:maktabahera@yahoo.com&info@deeneislam.com
website:www.deeneislam.com

﴿ملنے کے پتے﴾

مکتبۃ الحراء۔ فون: 35031039 ، موبائل: 03003360816
E-Mail:maktabahera@yahoo.com

- ☆ **ادارہ اسلامیات**، موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی۔ فون 32722401 021
- ☆ **ادارہ اسلامیات**، ۱۹۰، انارکلی، لاہور۔ پاکستان۔ فون 3753255 042
- ☆ **ادارہ اسلامیات**، دیناناتھ مینشن مال روڈ، لاہور۔ فون 37324412 042
- ☆ **مکتبہ معارف القرآن**، جامعہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴۔ فون 6-35031565 021
- ☆ **ادارۃ المعارف**، جامعہ دارالعلوم کراچی نمبر ۱۴۔ فون 35032020 021
- ☆ **دارالاشاعت**، اردو بازار کراچی۔

افتتاحیہ

از: شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی
شیخ الحدیث جامعہ دار العلوم کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة و السلام على خير خلقه سيدنا و مولانا محمد خاتم النبيين و إمام المرسلين و قائد الغر المحجلين ، و على آله و أصحابه أجمعين ، و على كل من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

أما بعد :

۲۹ رذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو بندے کے استاذ معظم حضرت مولانا **"سحبان محمود"** صاحب قدس سرہ کا حادثۂ وفات پیش آیا تو دار العلوم کراچی کے لئے یہ ایک عظیم سانحہ تھا۔ دوسرے بہت سے مسائل کے ساتھ یہ مسئلہ بھی سامنے آیا کہ صحیح بخاری کا درس جو سالہا سال سے حضرتؒ کے سپرد تھا، کس کے حوالہ کیا جائے؟ بالآخر یہ طے پایا کہ یہ ذمہ داری بندے کو سونپی جائے۔ میں جب اس گرانبار ذمہ داری کا تصور کرتا تو وہ ایک پہاڑ معلوم ہوتی۔ کہاں امام بخاری رحمہ اللہ علیہ کی یہ پرنور کتاب، اور کہاں مجھ جیسا مفلس علم اور تہی دست عمل؟ دور دور بھی اپنے اندر صحیح بخاریؒ پڑھانے کی صلاحیت معلوم نہ ہوتی تھی۔ لیکن بزرگوں سے سنی ہوئی یہ بات یاد آئی کہ جب کوئی ذمہ داری بڑوں کی طرف سے حکماً ڈالی جائے تو اللہ جَلَّ جَلالُہٗ کی طرف سے توفیق ملتی ہے۔ اس لئے اللہ جَلَّ جَلالُہٗ کے بھروسے پر یہ درس شروع کیا۔

عزیز گرامی مولانا محمد انور حسین صاحب سلمہٗ مالک **مکتبة الحراء**، **فاضل ومتخصص** جامعہ دار العلوم کراچی نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے یہ تقریر ضبط کی، اور پچھلے چند سالوں میں ہر سال درس کے دوران اس کے مسودے میری نظر سے گزرتے رہے اور کہیں کہیں بندے نے ترمیم واضافہ بھی کیا ہے۔ طلبہ کی ضرورت کے پیشِ نظر مولانا محمد انور حسین صاحب نے اس کے **" كتاب بدء الوحي "** سے **" كتاب بدء الخلق "** آخر تک کے حصوں کو نہ صرف کمپیوٹر پر کمپوز کرالیا، بلکہ اس کے حوالوں کی تخریج کا کام بھی کیا جس پر ان کے بہت سے اوقات، محنت اور مالی وسائل صرف ہوئے۔

دوسری طرف مجھے بھی بحیثیت مجموعی اتنا اطمینان ہوگیا کہ ان شاء اللہ اس کی اشاعت فائدے سے خالی نہ ہوگی، اور اگر کچھ غلطیاں رہ گئی ہوں گی تو ان کی تصحیح جاری رہ سکتی ہے۔ اس لئے میں نے اس کی اشاعت پر رضامندی ظاہر کردی ہے۔ لیکن چونکہ یہ نہ کوئی باقاعدہ تصنیف ہے، نہ میں اس کی نظر ثانی کا اتنا اہتمام کرسکا ہوں جتنا کرنا چاہئے تھا، اس لئے اس مین قابلِ اصلاح امور ضرور رہ گئے ہوں گے۔ اہل علم اور طلبہ مطالعے کے دوران جو ایسی بات محسوس کریں، براہ کرم بندے کو یا مولانا محمد انور حسین صاحب کو مطلع فرمادیں تاکہ اس کی اصلاح کردی جائے۔

تدریس کے سلسلے میں بندے کا ذوق یہ ہے کہ شروع میں طویل بحثیں کرنے اور آخر میں روایت پر اکتفا کرنے کے بجائے سبق شروع سے آخر تک توازن سے چلے۔ بندے نے تدریس کے دوران اس اسلوب پر عمل کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ نیز جو خالص کلامی اور نظریاتی مسائل ماضی کے ان فرقوں سے متعلق ہیں جواب موجود نہیں رہے، ان پر بندے نے اختصار سے کام لیا ہے، تاکہ مسائل کا تعارف تو طلبہ کو ضرور ہوجائے، لیکن ان پر طویل بحثوں کے نتیجے میں دوسرے اہم مسائل کا حق تلف نہ ہو۔ اسی طرح بندے نے یہ کوشش بھی کی ہے کہ جو مسائل ہمارے دور میں عملی اہمیت اختیار کر گئے ہیں، ان کا قدرے تفصیل کے ساتھ تعارف ہوجائے، اور احادیث سے اصلاحِ اعمال واخلاق کے بارے میں جو عظیم روایات ملتی ہیں اور جو احادیث پڑھنے کا اصل مقصود ہونی چاہئیں، ان کی عملی تفصیلات پر بقدر ضرورت کلام ہوجائے۔

قارئین سے درخواست ہے کہ وہ بندۂ ناکارہ اور اس تقریر کے مرتب کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔ جزاھم اللہ تعالیٰ۔

مولانا محمد انور حسین صاحب سلمہٗ نے اس تقریر کو ضبط کرنے سے لیکر اس کی ترتیب، تخریج اور اشاعت میں جس عرق ریزی سے کام لیا ہے، اللہ ﷻ اس کی بہترین جزا انہیں دنیا و آخرت میں عطا فرمائیں، ان کی اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرما کر اسے طلبہ کے لئے نافع بنائیں، اور اس ناکارہ کے لئے بھی اپنے فضل خاص سے مغفرت ورحمت کا وسیلہ بنادے۔ آمین۔

جامعہ دار العلوم کراچی ۱۴

۲۳ رشوال المکرّم ۱۴۳۲ھ — بندہ محمد تقی عثمانی

۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات — جامعہ دار العلوم کراچی

عرض ناشر

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدِ نِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ وَ اٰلِهٖ وَ أَصْحَابِهٖ وَ سَلِّمْ.

أمّا بعد ـ جامعہ دارالعلوم کراچی میں صحیح بخاری کا درس سالہا سال سے استاذ معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا **سحبان محمود** صاحب قدس سرہ کے سپرد رہا۔ ۲۹ رذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو شیخ الحدیث کا حادثۂ وفات پیش آیا تو صحیح بخاری شریف کا یہ درس مؤرخہ ۴ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ بروز بدھ سے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد ہوا۔ اُسی روز صبح ۸ بجے سے مسلسل ۲ سالوں کے دروس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ضبط کئے۔ انہی لمحات سے استاذ محترم کی مؤمنانہ نگاہوں نے تاک لیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ مواد کتابی شکل میں موجود ہونا چاہئے، اس بناء پر احقر کو ارشاد فرمایا کہ اس مواد کو تحریری شکل میں لاکر مجھے دیا جائے تا کہ میں اس میں سبقاً سبقاً نظر ڈال سکوں، جس پر اس کام (**انعام الباری**) کے ضبط وتحریر میں لانے کا آغاز ہوا۔

چنانچہ یہ سلسلہ تا حال جاری ہے، جس کی وجہ سے یہ مجموعۂ افادات ایک باقاعدہ تصنیفی شکل اختیار کر گیا۔

اس لئے یہ کتاب **''انعام الباری''** جو آپ کے ہاتھوں میں ہے: یہ سارا مجموعہ بھی بڑا قیمتی ہے، اور استاد موصوف کو اللہ ﷻ نے جو تبحر علمی عطا فرمایا وہ ایک دریائے ناپید کنارہ ہے، جب بات شروع فرماتے تو علوم کے دریا بہنا شروع ہو جاتے، اللہ ﷻ آپ کو وسعت مطالعہ اور عمق فہم دونوں سے نوازا ہے، اس کے نتیجے میں حضرت استاذ موصوف کے اپنے علوم ومعارف جو بہت ساری کتابوں کے چھاننے کے بعد خلاصہ عطر ہے وہ اس مجموعہ **''انعام الباری''** میں دستیاب ہے، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ استاذ موصوف کی فقہی آراء وتشریحات، ائمہ اربعہ کی موافقات ومخالفات پر محققانہ مدلل تبصرے علم وتحقیق کی جان ہیں۔

صاحبانِ علم کو اگر اس کتاب میں کوئی ایسی بات محسوس ہو جو ان کی نظر میں صحت وتحقیق کے معیار سے کم ہو اور ضبط ونقل میں ایسا ہونا ممکن بھی ہے تو اس نقص کی نسبت احقر کی طرف کریں اور از راہ عنایت اس پر مطلع بھی فرمائیں۔

دعا ہے کہ اللہ ﷻ اسلاف کے ان علمی امانتوں کی حفاظت فرمائے، اور **''انعام الباری''** کے باقی ماندہ حصوں کی تکمیل کی توفیق فرمائے تا کہ علم حدیث کی یہ امانت اپنے اہل تک پہنچ سکے۔

آمین یارب العالمین . و ما ذلک علی اللہ بعزیز

بندہ: محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل و متخصص جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۳ رشوال المکرم ۱۴۳۲ھ بمطابق ۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات

خلاصة الفهارس

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد لله و كفٰى و سلامٌ على عباده الذين اصطفٰى .

عرض مرتب

اساتذۂ کرام کی درسی تقاریر کو ضبط تحریر میں لانے کا سلسلہ زمانۂ قدیم سے چلا آرہا ہے، ابنائے دارالعلوم دیوبند وغیرہ میں **فیض الباری ، فضل الباری ، أنوار الباری ، لامع الدراری ، الکوکب الدری ، الحل المفهم لصحيح مسلم ، کشف الباری** ،تقریر بخاری شریف اور درس بخاری جیسی تصانیف اکابر کی ان درسی تقاریر ہی کی زندہ مثالیں ہیں اور علومِ نبوت کے طالبین ہر دور میں ان تقاریر دل پذیر سے استفادہ کرتے رہیں اور کرتے رہیں گے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی میں صحیح بخاری کی مسند تدریس پر رونق آراء شخصیت شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم (سابق جسٹس شریعت اپیلٹ بینچ سپریم کورٹ آف پاکستان) علمی وسعت، فقیہانہ بصیرت، فہم دین اور شگفتہ طرز تفہیم میں اپنی مثال آپ ہیں، درسِ حدیث کے طلبہ اس بحر بے کنار کی وسعتوں میں کھو جاتے ہیں اور بحث ونظر کے نئے نئے افق ان کے نگاہوں کو خیرہ کر دیتے ہیں، خاص طور پر جب جدید تمدن کے پیدا کردہ مسائل سامنے آتے ہیں تو شرعی نصوص کی روشنی میں ان کا جائزہ، حضرت شیخ الاسلام کا وہ میدان بحث ونظر ہے جس میں ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔

آپ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ بانی دارالعلوم دیوبند کی دعاؤں اور تمناؤں کا مظہر بھی ہیں، کیونکہ انہوں نے آخر عمر میں اس تمنا کا اظہار فرمایا تھا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں انگریزی پڑھوں اور یورپ پہنچ کر ان دانایان فرنگ کو بتاؤں کہ حکمت وہ نہیں جسے تم حکمت سمجھ رہے ہو بلکہ حکمت وہ ہے جو انسانوں کے دل ودماغ کو حکیم بنانے کے لئے حضرت خاتم النبیین ﷺ کے مبارک واسطے سے خدا کی طرف سے دنیا کو عطا کی گئی۔

افسوس کہ حضرتؒ کی عمر نے وفا نہ کی اور یہ تمنا تشنۂ تکمیل رہی، لیکن اللہ رب العزت اپنے پیاروں کی تمناؤں اور دعاؤں کو رَد نہیں فرماتے، اللہ تعالیٰ نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تمنا کو دورِ حاضر میں شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی **حفظه الله** کی صورت میں پورا کر دیا کہ آپ کی علمی وعملی کاوشوں کو دنیا بھر کے مشاہیر اہل علم وفن میں سراہا جاتا ہے خصوصاً اقتصادیات کے شعبہ میں اپنی مثال آپ ہیں کہ قرآن وحدیث، فقہ وتصوف اور تدین وتقوی کی جامعیت کے ساتھ ساتھ قدیم اور جدید علوم پر دسترس اور ان کو دورِ حاضر کی زبان پر سمجھانے کی صلاحیت آپ کو منجانب اللہ عطا ہوئی ہے۔

جامعہ دارالعلوم کراچی کے سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ کا بیان ہے کہ جب یہ میرے پاس پڑھنے کے لئے آئے تو بمشکل ان کی عمر گیارہ/بارہ سال تھی مگر اسی وقت سے ان پر آثار ولایت محسوس ہونے لگے اور رفتہ رفتہ ان کی صلاحیتوں میں ترقی و برکت ہوتی رہی، یہ مجھ سے استفادہ کرتے رہے اور میں ان سے استفادہ کرتا رہا۔

سابق شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے مجھ سے مجلس خاص میں مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کا ذکر آنے پر کہا کہ تم محمد تقی کو کیا سمجھتے ہو، یہ مجھ سے بھی بہت اوپر ہیں اور یہ حقیقت ہے۔

ان کی ایک کتاب ''علوم القرآن'' ہے اس کی حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ کی حیات میں تکمیل ہوئی اور چھپی اس پر مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے غیر معمولی تقریظ لکھی ہے۔ اکابرین کی عادت ہے کہ جب کسی کتاب کی تعریف کرتے ہیں تو جانچ تول کر بہت جچے تلے انداز میں کرتے ہیں کہ کہیں مبالغہ نہ ہو مگر حضرت مفتی صاحب قدس سرہ لکھتے ہیں کہ:

> یہ مکمل کتاب ماشاء اللہ ایسی ہے کہ اگر میں خود بھی اپنی تندرستی کے زمانے میں لکھتا تو ایسی نہ لکھ سکتا تھا، جس کی دو وجہ ظاہر ہیں:
>
> **پہلی وجہ** تو یہ کہ عزیز موصوف نے اس کی تصنیف میں جس تحقیق وتنقید اور متعلقہ کتابوں کے عظیم ذخیرہ کے مطالعہ سے کام لیا، وہ میرے بس کی بات نہ تھی، جن کتابوں سے یہ مضامین لئے گئے ہیں ان سب مأخذوں کے حوالے بقید ابواب وصفحات حاشیہ میں درج ہیں، انہی پر سرسری نظر ڈالنے سے ان کی تحقیقی کاوش کا اندازہ ہوسکتا ہے۔
>
> **اور دوسری وجہ** جو اس سے بھی زیادہ ظاہر ہے وہ یہ کہ میں انگریزی زبان سے ناواقف ہونے کی بناء پر مستشرقین یورپ کی ان کتابوں سے بالکل ہی ناواقف تھا، جن میں انہوں نے قرآن کریم اور علوم قرآن کے متعلق زہر آلود تلبیسات سے کام لیا ہے، برخوردار عزیز نے چونکہ انگریزی میں بھی ایم۔اے، ایل۔ایل۔بی اعلیٰ نمبروں میں پاس کیا، انہوں نے ان تلبیسات کی حقیقت کھول کر وقت کی اہم ضرورت پوری کردی۔

اسی طرح شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہ اللہ نے حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے بارے میں

تحریر کیا:

لقد من الله تعالى بتحقيق هذه الأمنية الغالية الكريمة ، وطبع هذا الكتاب الحديثي الفقهي العجاب ،في مدينة كراتشي من باكستان ،متوجا بخدمة علمية ممتازة ، من العلامة المحقق المحدث الفقيه الأريب الأديب فضيلة الشيخ محمد تقي العثماني ،نجل سماحة شيخنا المفتي الأكبر مولانا محمد شفيع مد ظله العالي في عافية وسرور.

فقام ذاك النجل الوارث الألمعي بتحقيق هذا الكتاب والتعليق عليه،بما يستكمل غاياته ومقاصده،ويتم فرائده و فوائده ، في ذوق علمي رفيع ،وتنسيق فني طباعي بديع ،مع أبهى حلة من جمال الطباعة الحديثة الراقية فجاء المجلد الأول منه تحفة علمية رائعة .تتجلى فيها خدمات المحقق اللوذعي تفاحة باكستان فاستحق بهذا الصنيع العلمي الرائع : شكر طلبة العلم والعلماء.

کہ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی کتاب شرح صحیح مسلم جس کا نام **فتح الملهم بشرح صحيح مسلم** اس کی تکمیل سے قبل ہی اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ تو ضروری تھا کہ آپ کے کام اور اس حسن کارکردگی کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اسی بناء پر ہمارے شیخ، علامہ مفتی اعظم حضرت مولانا محمد شفیع رحمہ اللہ نے ذہین وذکی فرزند، محدث جلیل، فقیہ، ادیب واریب مولانا محمد تقی عثمانی کی اس سلسلہ میں ہمت وکوشش کو ابھارا کہ **فتح الملهم شرح مسلم** کی تکمیل کریں، کیونکہ آپؒ حضرت شیخ شارح شبیر احمد عثمانیؒ کے مقام اور حق کو خوب جانتے تھے اور پھر اس کو بھی بخوبی جانتے تھے کہ اس باکمال فرزند کے ہاتھوں انشاء اللہ یہ خدمت کماحقہ انجام کو پہنچے گی۔

اسی طرح عالم اسلام کی مشہور فقہی شخصیت ڈاکٹر علامہ یوسف القرضاوی **"تكملة فتح الملهم"** پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

وقد ادخر القدر فضل اكماله وإتمامه – إن شاء الله – لعالم

جليل من أسره علم و فضل "ذرية بعضها من بعض" هو الفقيه ابن الفقيه ،صديقنا العلامة الشيخ محمد تقى العثمانى ،بن الفقيه العلامة المفتى مولانامحمدشفيع رحمه الله وأجزل مثوبته ،و تقبله فى الصالحين .

وقد أتاحت لى الأقدار أن أتعرف عن كثب على الأخ الفاضل الشيخ محمد تقى، فقد التقيت به فى بعض جلسات الهيئة العليا للفتوى والرقابة الشرعية للمصارف الإسلامية ،ثم فى جلسات مجمع الفقه الإسلامى العالمى ، وهو يمثل فيه دولة باكستان، ثم عرفته أكثر فأكثر ، حين سعدت به معى عضوا فى الهيئة الشرعية لمصرف فيصل الإسلامى بالبحرين ، والذى له فروع عدة فى باكستان .

وقد لمست فيه عقلية الفقية المطلع على المصادر،المتمكن من النظر والاستنباط،القادر على الاختيار والترجيح ،والواعى لما يدور حوله من أفكار و مشكلات أنتجها .

هذا العصر الحريص على أن تسود شريعة الاسلام وتحكم فى ديار المسلمين .

ولا ريب أن هذه الخصائص تجلت فى شرحه لصحيح مسلم ، وبعبارة أخرى : فى تكملته لفتح الملهم .

فقد وجدت فى هذا الشرح :حسن المحدث ، وملكة الفقيه ،وعقلية المعلم، وأناة القاضى،ورؤية العالم المعاصر،جنبا إلى جنب .

ومما يذكر له هنا: أنه لم يلتزم بأن يسير على نفس طريقة شيخه العلامة شبير أحمد، كما نصحه بذلك بعض أحبابه، وذلك لوجوه وجيهة ذكرها فى مقدمته.

ولا ریب أن لکل شیخ طریقته وأسلوبه الخاص، الذی یتأثر بمکانه وزمانه وثقافته، وتیارات الحیاة من حوله. ومن التکلف الذی لایحمد محاولة العالم أن یکون نسخة من غیره، وقد خلقه الله مستقلا.

لقد رأیت شروحا عدة لصحیح مسلم، قدیمة وحدیثة، ولکن هذا الشرح للعلامة محمد تقی هو أولاها بالتنویه، وأوفاها بالفوائد والفرائد، وأحقها بأن یکون هو (شرح العصر) للصحیح الثانی.

فهو موسوعة بحق، تتضمن بحوثا وتحقیقات حدیثیة، وفقهیة ودعویة وتربویة. وقد هیأت له معرفته بأکثر من لغة، ومنها الإنجلیزیة، وکذلک قراءته لثقافة العصر، واطلاعه علی کثیر من تیاراته الفکریة، أن یعقد مقارنات شتی بین أحکام الإسلام وتعالیمه من ناحیة، وبین الدیانات والفلسفات والنظریات المخالفة من ناحیة أخری وأن یبین هنا أصالة الإسلام وتمیزه الخ—

انہوں نے فرمایا کہ مجھے ایسے مواقع میسر ہوئے کہ میں برادر فاضل شیخ محمد تقی کو قریب سے پہچانوں۔ بعض فتوؤں کی مجالس اور اسلامی محکموں کے نگراں شعبوں میں آپ سے ملاقات ہوئی پھر مجمع الفقہ الاسلامی کے جلسوں میں بھی ملاقات کے مواقع آتے رہے، آپ اس مجمع میں پاکستان کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ الغرض اس طرح میں آپ کو قریب سے جانتا رہا اور پھر یہ تعارف بڑھتا ہی چلا گیا جب میں آپ کی ہمراہی سے فیصل اسلامی بینک (بحرین) میں سعادت مند ہوا آپ وہاں ممبر منتخب ہوئے تھے جس کی پاکستان میں بھی کئی شاخیں ہیں۔

۔ تو میں نے آپ میں فقہی سمجھ خوب پائی اس کے ساتھ مصادر و مآخذ فقہیہ پر بھرپور اطلاع اور فقہ میں نظر و فکر اور استنباط کا ملکہ اور ترجیح و اختیار پر خوب قدرت محسوس کی۔

اس کے ساتھ آپ کے ارد گرد جو خیالات ونظریات اور مشکلات منڈلا رہی ہیں جو اس زمانے کا نتیجہ ہیں ان میں بھی سوچ سمجھ رکھنے والا پایا اور آپ ماشاء اللہ اس بات پر حریص رہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ کی بالا دستی قائم ہو اور مسلمان علاقوں میں اس کی حاکمیت کا دور دورہ ہو اور بلاشبہ آپ کی یہ خصوصیات آپ کی شرح صحیح مسلم (تکملہ فتح الملہم میں خوب نمایاں اور روشن ہے۔

میں نے اس شرح کے اندر ایک محدث کا شعور، فقیہ کا ملکہ، ایک معلم کی ذکاوت، ایک قاضی کا تدبر اور ایک عالم کی بصیرت محسوس کی۔ میں نے صحیح مسلم کی قدیم وجدید بہت سی شروح دیکھی ہیں لیکن یہ شرح تمام شروح میں سب سے زیادہ قابل توجہ اور قابل استفادہ ہے، یہ جدید مسائل کی تحقیقات میں موجودہ دور کا فقہی انسائکلو پیڈیا ہے اور ان سب شروح میں زیادہ حق دار ہے کہ اس کو صحیح مسلم کی اس زمانے میں سب سے عظیم شرح قرار دی جائے۔

یہ شرح قانون کو وسعت سے بیان کرتی ہے اور سیر حاصل ابحاث اور جدید تحقیقات اور فقہی، دعوتی، تربیتی مباحث کو خوب شامل ہے۔ اس کی تصنیف میں حضرت مؤلف کوئی زبانوں سے ہم آہنگی خصوصاً انگریزی سے معرفت کام آئی ہے اسی طرح زمانے کی تہذیب وثقافت پر آپ کا مطالعہ اور بہت سی فکری رجحانات پر اطلاع وغیرہ میں بھی آپ کو دسترس ہے۔ ان تمام چیزوں نے آپ کے لئے آسانی کر دی کہ اسلامی احکام اور اس کی تعلیمات اور دیگر عصری تعلیمات اور فلسفے اور مخالف نظریات کے درمیان فیصلہ کن رائے دیں اور ایسے مقامات پر اسلام کی خصوصیات اور امتیاز کو اجاگر کریں۔

احقر بھی جامعہ دارالعلوم کراچی کا خوشہ چین ہے اور بحمد اللہ اساتذۂ کرام کے علمی دروس اور اصلاحی مجالس سے استفادے کی کوشش میں لگا رہتا ہے اور ان مجالس کی افادیت کو عام کرنے کے لئے خصوصی انتظام کے تحت گذشتہ اُنیس (۱۹) سالوں سے ان دروس ومجالس کو آڈیو کیسٹس میں ریکارڈ بھی کر رہا ہے۔ اس وقت سمعی مکتبہ میں اکابر کے بیانات اور دروس کا ایک بڑا ذخیرہ احقر کے پاس جمع ہے، جس سے ملک و بیرون ملک وسیع پیمانے پر

استفادہ ہو رہا ہے؛ خاص طور پر درس بخاری کے سلسلے میں احقر کے پاس اپنے دو اساتذہ کے دروس موجود ہیں۔

استاذ الاساتذہ شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا درس بخاری جو دو سو کیسٹس میں محفوظ ہے اور شیخ الاسلام حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کا درس حدیث تقریباً تین سو کیسٹس میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

انہیں کتابی صورت میں لانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ کیسٹ سے استفادۂ عام مشکل ہوتا ہے، خصوصاً طلبا کرام کے لئے وسائل وسہولت نہ ہونے کی بناء پر سمعی بیانات کو خریدنا اور پھر حفاظت سے رکھنا ایک الگ مسئلہ ہے جب کہ کتابی شکل میں ہونے سے استفادہ ہر خاص وعام کے لئے سہل ہے۔

چونکہ جامعہ دارالعلوم کراچی میں صحیح بخاری کا درس سالہا سال سے استاذ معظم شیخ الحدیث حضرت مولانا سحبان محمود صاحب قدس سرہ کے سپرد رہا۔ ۲۹ رذی الحجہ ۱۴۱۹ھ بروز ہفتہ کو شیخ الحدیث کا حادثۂ وفات پیش آیا تو صحیح بخاری شریف کا یہ درس مؤرخہ ۴ رمحرم الحرام ۱۴۲۰ھ بروز بدھ سے شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم کے سپرد ہوا۔ اُسی روز صبح ۸ بجے سے مسلسل ۲ سالوں کے دروس ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ضبط کئے۔ انہی لمحات سے استاذ محترم کی مؤمنانہ نگاہوں نے تاک لیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ یہ مواد کتابی شکل میں موجود ہونا چاہئے، اس بناء پر احقر کو ارشاد فرمایا کہ اس مواد کو تحریری شکل میں لاکر مجھے دیا جائے تاکہ میں اس میں سبقاً سبقاً نظر ڈال سکوں، جس پر اس کام (انعام الباری) کے ضبط وتحریر میں لانے کا آغاز ہوا۔

دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ کیسٹ میں بات منہ سے نکلی اور ریکارڈ ہوگئی اور بسا اوقات سبقت لسانی کی بناء پر عبارت آگے پیچھے ہو جاتی ہے (فالبشر یخطئ) جن کی تصحیح کا ازالہ کیسٹ میں ممکن نہیں۔ لہٰذا اس وجہ سے بھی اسے کتابی شکل دی گئی تاکہ حتی المقدور غلطی کا تدارک ہو سکے۔ آپ کا یہ ارشاد اس حزم واحتیاط کا آئینہ دار ہے جو سلف سے منقول ہے'' کہ سعید بن جبیرؒ کا بیان ہے کہ شروع میں سیدنا حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے آموختہ سننا چاہا تو میں گھبرایا، میری اس کیفیت کو دیکھ کر ابن عباسؓ نے فرمایا کہ:

أو لیس من نعمة الله علیک أن تحدث و أنا شاهد فإن اصبت فذاک و إن اخطأت علمتک.

(طبقات ابن سعد: ص: ۱۷۹، ج: ۶ و تدوین حدیث: ص: ۱۵۷)

کیا حق تعالیٰ کی یہ نعمت نہیں ہے کہ تم حدیث بیان کرو اور میں موجود ہوں، اگر صحیح طور پر بیان کروگے تو اس سے بہتر بات کیا ہو سکتی ہے اور اگر غلطی کروگے تو میں تم کو بتادوں گا۔

اس کے علاوہ بعض بزرگان دین اور بعض احباب نے سمعی مکتبہ کے اس علمی اثاثے کو دیکھ کر اس خواہش

کا اظہار کیا کہ درس بخاری کو تحریری شکل میں بھی پیش کیا جائے اس سے استفادہ مزید سہل ہوگا ''درس بخاری'' کی یہ کتاب بنام ''انعام الباری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اسی کاوش کا ثمرہ ہے۔

حضرت شیخ الاسلام حفظہ اللہ کو بھی احقر کی اس محنت کا علم اور احساس ہے اور احقر سمجھتا ہے کہ بہت سی مشکلات کے باوجود اس درس کی سمعی و نظری تجلیل و تحریر میں پیش رفت حضرت ہی کی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔

احقر کو اپنی تہی دامنی کا احساس ہے یہ مشغلہ بہت بڑا علمی کام ہے، جس کے لئے وسیع مطالعہ، علمی پختگی اور استحضار کی ضرورت ہے، جبکہ احقر ان تمام امور سے عاری ہے، اس کے باوجود ایسی علمی خدمت کے لئے کمر بستہ ہونا صرف فضل الٰہی، اپنے مشفق اساتذہ کرام کی دعاؤں اور خاص طور پر موصوف استاد محترم دامت برکاتہم کی نظر عنایت، اعتماد، توجہ، حوصلہ افزائی اور دعاؤں کا نتیجہ ہے۔

ناچیز مرتّب کو مراحل ترتیب میں جن مشکلات و مشقت سے واسطہ پڑا وہ الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے اور ان مشکلات کا اندازہ اس بات سے بھی بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ کسی موضوع پر مضمون و تصنیف لکھنے والے کو یہ سہولت رہتی ہے کہ لکھنے والا اپنے ذہن کے مطابق بنائے ہوئے خاکہ پر چلتا ہے، لیکن کسی دوسرے بڑے عالم اور خصوصاً ایسی علمی شخصیت جس کے علمی تبحر و برتری کا معاصر مشاہیر اہل علم وفن نے اعتراف کیا ہو ان کے افادات اور دقیق فقہی نکات کی ترتیب و مراجعت اور تعیین عنوانات مذکورہ مرحلہ سے کہیں دشوار و کٹھن ہے۔ اس عظیم علمی اور تحقیقی کام کی مشکلات مجھ جیسے طفل مکتب کے لئے کم نہ تھیں، اپنی بے مائیگی، نا اہلی اور کم علمی کی بناء پر اس کے لئے جس قدر دماغ سوزی اور عرق ریزی ہوئی اور جو محنت و کاوش کرنا پڑی مجھ جیسے نا اہل کے لئے اس کا تصور بھی مشکل ہے البتہ فضل ایزدی ہر مقام پر شامل حال رہا۔

یہ کتاب ''انعام الباری'' جو آپ کے ہاتھوں میں ہے: یہ سارا مجموعہ بھی بڑا قیمتی ہے، اس لئے کہ حضرت استاذ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے جو تبحر علمی عطا فرمایا وہ ایک دریائے ناپید کنارہ ہے، جب بات شروع فرماتے تو علوم کے دریا بہنا شروع ہو جاتے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسعت مطالعہ اور عمق فہم دونوں سے نوازا ہے، اس کے نتیجہ میں حضرت استاذ موصوف کے اپنے علوم و معارف جو بہت ساری کتابوں کے چھاننے کے بعد خلاصہ وعطر ہے وہ اس مجموعہ انعام الباری میں دستیاب ہے، اس لئے آپ دیکھیں گے کہ جگہ جگہ استاذ موصوف کی فقہی آراء و تشریحات، ائمۂ اربعہ کی موافقات و مخالفات پر محققانہ مدلل تبصرے علم و تحقیق کی جان ہیں۔

یہ کتاب (صحیح بخاری) ''کتاب بدء الوحی سے کتاب التوحید'' تک مجموعی کتب ۹۷، احادیث ''۷۵۶۳'' اور ابواب ''۳۹۳۰'' پر مشتمل ہے، اسی طرح ہر حدیث پر نمبر لگا کر احادیث کے مواضع و متکررہ کی نشان دہی کا بھی التزام کیا ہے کہ اگر کوئی حدیث بعد میں آنے والی ہے تو حدیث کے آخر میں [**أنظر**] نمبروں کے ساتھ اور اگر حدیث گزری ہے تو [**راجع**] نمبروں کے ساتھ نشان لگا دیئے ہیں۔

بخاری شریف کی احادیث کی تخریج **الکتب التسعة** (بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابوداؤد، ابن ماجہ، موطاء مالک، سنن الدارمی اور مسند احمد) کی حد تک کردی گئی ہے، کیونکہ بسا اوقات ایک ہی حدیث کے الفاظ میں جو تفاوت ہوتا ہے ان کے فوائد سے حضرات اہل علم خوب واقف ہیں، اس طرح انہیں آسانی ہوگی۔

قرآن کریم کی جہاں جہاں آیات آئی ہیں ان کے حوالہ معہ ترجمہ، سورۃ کا نام اور آیتوں کے نمبر ساتھ ساتھ دیدیئے گئے ہیں۔ شروح بخاری کے سلسلے میں کسی ایک شرح کو مرکز نہیں بنایا بلکہ حتی المقدور بخاری کی مستند اور مشہور شروح کو پیش نظر رکھا گیا، البتہ مجھ جیسے مبتدی کے لئے **عمدة القاری** اور **تکملة فتح الملهم** کا حوالہ بہت آسان ثابت ہوا۔ اس لئے جہاں **تکمله فتح الملهم** کا کوئی حوالہ مل گیا تو اسی کو حتمی سمجھا گیا۔

رب متعال حضرت شیخ الاسلام کا سایہ عاطفت عافیت وسلامت کے ساتھ عمر دراز عطا فرمائے، جن کا وجودِ مسعود بلاشبہ اس وقت ملت اسلامیہ کے لئے نعمت خداوندی کی حیثیت رکھتا ہے اور امت کا عظیم سرمایہ ہے اور جن کی زبان وقلم سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن وحدیث اور اجماع امت کی صحیح تعبیر وتشریح کا اہم تجدیدی کام لیا ہے۔

رب کریم اس کاوش کو قبول فرما کر احقر اور اس کے والدین اور جملہ اساتذۂ کرام کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے، جن حضرات اور احباب نے اس کام میں مشوروں، دعاؤں یا کسی بھی طرح سے تعاون فرمایا ہے، مولائے کریم اس محنت کو ان کے لئے فلاح دارین کا ذریعہ بنائے اور خاص طور پر استاد محترم شیخ القرأ حافظ قاری مولانا عبدالملک صاحب حفظہ اللہ کو فلاح دارین سے نوازے جنہوں نے ہمہ وقت کتاب اور حل عبارات کے دشوار گزار مراحل کو احقر کے لئے سہل بنا کر لائبریری سے بے نیاز رکھا۔

صاحبانِ علم کو اگر اس درس میں کوئی ایسی بات محسوس ہو جو ان کی نظر میں صحت وتحقیق کے معیار سے کم ہو اور ضبط ونقل میں ایسا ہونا ممکن بھی ہے تو اس نقص کی نسبت احقر کی طرف کریں اور ازراہ عنایت اس پر مطلع بھی فرمائیں۔

دعا ہے کہ اللہ جل جلالہ اسلاف کی ان علمی امانتوں کی حفاظت فرمائے، اور ''انعام الباری'' کے باقی ماندہ حصوں کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے تاکہ علم حدیث کی یہ امانت اپنے اہل تک پہنچ سکے۔

آمین یا رب العالمین . و ما ذلک علی الله بعزیز

بندہ: محمد انور حسین عفی عنہ

فاضل ومتخصص جامعہ دارالعلوم کراچی ۱۴

۲۳ رشوال المکرم ۱۴۳۲ھ

بمطابق ۲۲ ستمبر ۲۰۱۱ء بروز جمعرات

كتاب المساقاة

٢٣٥١ - ٢٣٨٤

۴۲۔ کتاب المساقاۃ

پانی کی اقسام

پہلی قسم وہ پانی ہے جو سمندر، بڑے بڑے دریاؤں، نہروں اور ندیوں میں ہوتا ہے، اس کے بارے میں شریعت کا حکم یہ ہے کہ یہ پانی مباح عام ہے، اس واسطے اس سے روکنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

دوسری قسم وہ پانی ہے کہ کسی شخص نے کنواں کھودا ہے اور کنویں سے پانی نکل رہا ہے تو اس کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس پانی میں پہلے کنویں والے کا حق ہے کہ خود سیراب ہو، اور اپنے گھر والوں کو سیراب کرے اور اپنے مویشیوں کو سیراب کرے پھر اس کی ضرورت سے جتنا زائد ہو اس میں لوگوں کو پینے سے منع نہیں کرسکتا یعنی اگر کوئی پانی پینا چاہے یا اپنے مویشیوں کو پلائے تو اس سے منع نہیں کرسکتا، اس کو فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ **"لایمنع الشفہ"**۔

کہتے ہیں کہ شفہ میں انسان کے ہونٹ بھی داخل ہیں اور جانوروں کے ہونٹ بھی داخل ہیں البتہ اگر کوئی شخص اپنے کھیت کی سیرابی کے لئے، آب پاشی کے لئے کنوئیں کا پانی لینا چاہتا ہو تو صاحب البئر اس کو روک سکتا ہے اور یہ کہہ سکتا ہے کہ میں نہیں دیتا لیکن پینے کے لئے منع نہیں کرسکتا۔

تیسری قسم پانی کی وہ جس کو **"الماء المحرز"** کہتے ہیں، یعنی کسی نے مباح عام سے پانی لے کر اپنے کسی برتن، مٹکے یا صراحی میں لے لیا یا حوض بنا کر اس میں بھر لیا تو یہ ایک "ماءِ محرز" کہلاتا ہے، صاحب البئر اس ماءِ محرز سے دوسرے کو روک سکتا ہے، سوائے مضطر کے یعنی کوئی شخص پیاس سے مر رہا ہو تو اس کو پانی پلانا واجب ہے لیکن اگر پیاس سے نہیں مر رہا ہو تو اس صورت میں پانی پینے سے منع کرسکتا ہے اور اس کی بیع بھی جائز ہے، آخری دو قسم کے پانی سے مالک (صاحب ماءِ محرز و صاحب البئر) لوگوں کو پانی لینے سے روک سکتا ہے مثلاً کنوئیں میں آب پاشی کے لئے روک سکتا ہے اور ماءِ محرز میں مطلقاً روک سکتا ہے۔

اس صورت میں بیع پانی کی جائز ہوگی یا نہیں؟ اس میں فقہاء کا کلام ہوا ہے۔

اس بات پر تو اتفاق ہے کہ اگر پانی پینے کے لئے بیچا جائے تو ان صورتوں میں بیچنے کی اجازت ہے لیکن آب پاشی، کھیتوں اور باغات کو سیراب کرنے کے لئے اگر پانی بیچا جائے تو اس بارے میں ہمارے فقہاء کرام

نے فرمایا ہے کہ یہ جائز نہیں ہے اور ساتھ ہی یہ علت بیان کی ہے کہ اس لئے جائز نہیں کہ کھیتوں کی سیرابی کے لئے کوئی مقدار متعین کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس بیع میں جہالت آجائے گی، لہٰذا اس وجہ سے منع کیا گیا ہے۔

اس تعلیل کا مقتضی یہ ہے کہ اگر کہیں کہ کسی طریقے پر جہالت ختم ہو جائے گی تو آب پاشی کے لئے بھی پانی بیچنے کی اجازت ہوگی۔ چنانچہ آج کل جہالت کے زائل کرنے کے مختلف راستے ہیں مثلاً بعض جگہ میٹر نصب ہیں تو میٹر سے پتہ چل جاتا ہے کہ کتنا پانی دیا گیا ہے اس وجہ سے جہالت رفع ہوگئی ہے، لہٰذا بیع جائز ہوگی، چاہے وہ کنویں سے ہو یا ماء محرز سے ہو اور بعض جگہ ٹیوب ویل وغیرہ بھی لگے ہوئے ہیں اس میں وقت کا تعین کر دیا جاتا ہے چونکہ پتہ ہے کہ اتنے وقت میں اتنا پانی نکلے گا تو اس حساب سے دینا بھی جائز ہو گیا کیونکہ جہالت مرتفع ہوگئی۔

ہمارے زمانے میں گھروں میں زمین دوز یا چھت کے اوپر ٹینک وغیرہ بنے ہوئے ہیں یہ ماء محرز میں داخل ہیں اور ان کی بیع بھی جائز ہے۔ تو آبپاشی کے لئے حنفیہ کا اصل مسلک بیع الماء کے ناجائز ہونے کا ہے، لیکن بعض متاخرین حنفیہ نے اس کی اجازت دی ہے، اس لئے جہاں ضرورت نہ ہو وہاں پانی خریدنے میں احتیاط کرنی چاہئے، لیکن جہاں پانی حاصل کرنے کا بیع کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہ ہو اور ضرورت شدید ہو تو اس صورت میں متاخرین حنفیہ کے قول پر فتویٰ دیا جا سکتا ہے۔[1]

(۳) باب من حفر بئرا فی ملکه لم یضمن

۲۳۵۵ ـ حدثنی محمود : أخبرنی عبید الله ، عن إسرائیل ، عن أبی حصین ، عن أبی صالح، عن أبی هریرة ﷺ قال : قال رسول الله ﷺ : "المعدن جبار، والبئر جبار ، والعجماء جبار، وفی الرکاز الخمس" [راجع : ۱۴۹۹]

اس حدیث پر مفصل بحث "کتاب الزکوٰۃ" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

" و البئر جبار " یعنی اگر کوئی شخص کنویں میں گر کر مر جائے تو اس کا خون ہدر ہے اور اس سے مراد وہ "بئر" ہے جو کسی نے اپنی ملک میں کھودا ہو اور یہی ترجمۃ الباب میں ہے کہ **" من حفر بئرا فی ملکه لم یضمن "**.

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مملوک زمین میں کنواں کھودے اور کوئی شخص اس کنویں میں گر جائے تو وہ کھودنے والا ضامن نہیں ہوگا۔ اس طرح اگر کسی شخص نے حاکم کی اجازت سے کسی ایسی جگہ پر کنواں

---

[1] والتفصیل فی : الفقه الاسلامی و ادلته ، ج : ۴ ، ص : ۳۵۸ ، و بدائع ، ج : ۶ ، ص : ۱۸۸ ، والمغنی لابن قدامه ، ج : ۴ ، ص : ۲۹۸ ، و اعلاء السنن ، ج : ۱۴ ، ص : ۱۶۴ .

کھودا جس سے لوگوں کو سیراب کرنا مقصود ہو اور وہ راستہ نہ ہو، اس میں اگر کوئی شخص گر کر مر جائے تو کھودنے والا ضامن نہ ہوگا، لیکن اگر کوئی شخص ایسی جگہ کنواں کھودے جو عام راستہ ہے اور اس کی ملکیت میں بھی نہیں ہے اور اذن سلطان بھی نہیں ہے تو کنواں کھودنے والا متعدی ہے اور تعدی کی وجہ سے وہ ضامن ہوگا۔

''مباشر'' اور ''مسبب'' پر ضمان آنے کے اصول

قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جو شخص ہلاکت یا ضرر کا مباشر ہو وہ ہر حالت میں ضامن ہوتا ہے، چاہے اس کی طرف سے تعدی پائی جائے یا نہ پائی جائے۔ اور جو شخص مباشر نہیں ہے بلکہ مسبب ہے، یعنی اس نے کوئی سبب پیدا کیا اور کسی اور شخص نے بھی اس میں دخل دیا ہے تو ایسی صورت میں وہ اس کا اس وقت ضامن ہوتا ہے جب وہ متعدی ہو، ورنہ نہیں۔ ایسی صورت میں حافر بئر متسبب ہے۔ لہٰذا یہ اس وقت تک ضامن نہیں ہوگا جب تک اس کی طرف سے تعدی نہیں پائی جائے گی، جب تعدی پائی جائے گی تو ضامن ہوگا۔[۲]

ٹریفک حادثات میں مباشر کا تعین کرنا

مندرجہ بالا اصول کو موجودہ دور کے ٹریفک کے حادثات پر منطبق کرنے کے لئے اس کی جزئیات کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر میرا عربی میں ایک رسالہ ہے، اس کا نام ہے **''حوادث المرور''** ہے یعنی ٹریفک کے حوادث۔ اس رسالے میں میں نے تفصیل سے یہ بیان کیا ہے کہ کس صورت میں راکب پر ضمان آئے گا اور کس صورت میں نہیں آئے گا، اور قواعد فقہیہ اس پر کس طرح منطبق ہوتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ قاعدہ اپنی جگہ درست ہے کہ مباشر ہر صورت میں ضامن ہوتا ہے، لیکن اس کا ''مباشر'' ہونا ضروری ہے۔ اب مثلاً ایک شخص صحیح طریقے سے اصولِ ٹریفک کے مطابق کار چلاتا ہوا جا رہا ہے، اچانک ایک شخص صرف ایک فٹ کے فاصلے پر کار کے سامنے کود گیا اور ہلاک ہو گیا تو اس صورت میں اس مباشر کو سائق سیارہ (ڈرائیور) کی طرف منسوب نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس شخص نے خودکشی کی ہے لہٰذا مباشرت کی نسبت خود اس کی ذات کی طرف ہوگی، ڈرائیور کی طرف نہیں ہوگی۔ لہٰذا ڈرائیور ضامن نہیں ہوگا۔[۳]

(۵) باب اثم من منع ابن السبیل من الماء

۲۳۵۸ ـ حدثنا موسیٰ بن اسماعیل: حدثنا عبد الواحد بن زیاد، عن الأعمش قال: سمعت أبا صالح یقول: سمعت أبا هریرة ﷺ یقول: قال رسول الله ﷺ: ((ثلاثة

۲، ۳ المبسوط للسرخسی، ج: ۲۷، ص: ۲۲، ۲۳ باب النهر.

لا ينظر الله اليهم يوم القيمة ولا يزكيهم ولهم عذاب اليم : رجل كان له فضل ماء بالطريق فمنعه من ابن السبيل، ورجل بايع إمامه لا يبايعه إلا لدنيا فان أعطاه منها رضي وان لم يعطه منها سخط ، ورجل أقام سلعته بعد العصر فقال : والله الذي لا إله غيره لقد أعطيت بها كذا وكذا فصدقه رجل))، ثم قرأ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً﴾[4] [أنظر : ۲۳٦۹، ۲٦۷۲، ۷۲۱۲، ۷۴۴٦][5]

تین افراد کے لئے وعید

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ "تین آدمی ایسے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں"۔

(۱) رجل كا ن له فضل ماء بالطريق فمنعه من ابن السبيل:

ایک وہ شخص جس کے پاس راستے میں اس کی ضرورت سے فاضل پانی موجود تھا اور اس نے مسافر کو اس پانی کے پینے سے منع کیا، تو یہ ان لوگوں میں داخل ہے جن کی طرف اللہ جل جلالہ دیکھے گا بھی نہیں۔ **العیاذ باللہ۔**

(۲) رجل بايع إما مه لا يبا يعه إلا لد نيا فإن أعطاه منها رضى و إن لم يعطه منها سخط :

دوسرا وہ شخص ہے جو کسی امام سے بیعت کرے، بیعت کرنے کا مقصد صرف دنیا حاصل کرنا ہے، اگر امام ان کو دنیا کا ساز و سامان دے تب تو خوش ہو، اگر نہیں دیتا تو ناراض ہو۔

(۳) و رجل أقام سعلته بعد العصر :

"**بعد العصر**" کی قید اتفاقی ہے۔ عام طور سے لوگ عصر کے بعد ہی تجارت وغیرہ زور و شور سے کیا [illegible] **فقال "والله الذى لا إله غيره لقد أعطيت بها كذا و كذا"۔**

[illegible] کہ اللہ کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے کہ مجھے اس سلع کی عوض میں اتنے اتنے پیسے [illegible] مجھے اتنے اتنے پیسوں کی پیشکش کی ہے کہ اتنے پیسوں میں تم ہمیں یہ چیز دے دو۔ [illegible] خرید لیا حالانکہ اتنے پیسے کسی نے نہیں دیئے، یہ جھوٹی قسم کھا رہا تھا تو یہ شخص بھی ان

---

[4] آل عمران ۷۷

[5] وفي صحيح مسلم، كتاب الإيمان ،باب بيان غلظ تحريم اسبال الازار والمن بالعطية، رقم ۱۵۷ ، وسنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله ،باب ماجاء في نكث البيعة، رقم ۱۵۲۱ ، وسنن النسائي ، كتاب البيوع ،باب الحلف الواجب للخديعة في البيع ، رقم ۴۳۸٦ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب البيوع ،باب في منع الماء، رقم: ۳۰۱۴، وسنن ابن ماجة ، كتاب التجارات ،باب ماجاء في كراهية الأيمان في الشراء والبيع ،رقم : ۲۱۹۸ ، والجهاد، ۲۸٦۱ ، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ،باب مسند أبي هريرة ، رقم : ۷۱۳۱ ، ۹۸۳٦ .

میں داخل ہے جن کی طرف اللہ ﷻ قیامت کے دن نہیں دیکھیں گے۔

ثم قرأ ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً﴾

(٦) باب سكر الأنهار

۲۳۵۹، ۲۳۶۰ ـ حدثنا عبد اللّٰه بن يوسف : حدثنا الليث قال : حدثني ابن شهاب عن عروة : عن عبد الله بن الزبير ﷺ : أنه حدثه أن رجلامن الأنصار خاصم الزبير عند النبي ﷺ في شراج الحرة التي يسقون بها النخل ، فقال الأنصاري : سرح الماء يمر فأبىٰ عليه ، فاختصما عند النبي ﷺ ، فقال رسو ل الله ﷺ للزبير: "اسق يا زبير ثم أرسل الماء الي جارک" فغضب الأنصاري فقال : أن كان ابن عمتک ؟ فتلون وجه رسول الله ﷺ ثم قال :" اسق يا زبير ثم أحبس الماء حتى يرجع الى الجدر ". فقال الزبير : واللّٰه اني لاحسب هذه الآية نزلت في ذٰلک : ﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْکَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ [٦] قال محمد بن العباس : قال أبو عبدالله : ليس أحد ذكر عروة عن عبد الله الا الليث فقط .[أنظر : ۲۳۶۱ ، ۲۳۶۲ ، ۲۷۰۸ ، ۴۵۸۵]

(٧) باب شرب الأعلى قبل الأسفل

۲۳۶۱ ـ حدثنا عبدان : أخبرنا عبد الله : أخبرنا معمر ، عن الزهري ، عن عروة قال : خاصم الزبير رجلا من الأنصار فقال النبي ﷺ " يا زبير اسق ثم أرسل" فقال الأنصاري : إنه ابن عمتک؟ فقال عليه السلام :" اسق يا زبيرحتى يبلغ الجدر ثم أمسک" قال الزبير : فاحسب هذه الآية نزلت في ذلک : ﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْکَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ [٧] [راجع : ۲۳۵۹].

(٨) باب شرب الأعلى إلى الكعبين

۲۳۶۲ ـ حدثنا محمد : أخبرنا مخلد بن يزيد الحراني قال : أخبرني ابن جريج قال : حدثني ابن شهاب ، عن عروة بن الزبير أنه حدثه أن رجلا من الأنصار خاصم الزبير في شراج من الحرة ليسقى بها النخل ، فقال رسول الله ﷺ "اسق يا زبيرفأمره بالمعروف ثم ارسله الى جارک" فقال الأنصاري : أن كان ابن عمتک ؟ فتلون وجه رسول الله ﷺ ثم قال :" اسق ثم احبس حتى يرجع الماء الى الجدر"واستوعى له حقه.

٦، ٧ [النساء : ٦٥]

فقال الزبير : والله ان هذه الآية انزلت في ذلك : ﴿فَلاَ وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ﴾ فقال لي ابن شهاب فقدرت الأنصار والناس قول النبي ﷺ : "اسق ثم احبس حتى يرجع الى الجدر" وكان ذلك إلى الكعبين .[راجع : ۲۳۵۹] [۸]

حدیث کی تشریح

سکر کے معنی ایسی دیوار بنا دینا جس سے پانی ادھر ادھر نہ جائے ، جس کو اردو میں مینڈھ کہتے ہیں ، یہ چھوٹی سی دیوار ہوتی ہے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے اور یہ حدیث امام بخاری رحمہ اللہ نے متعدد مقامات پر روایت کی ہے ، یہاں یہ پہلی بار آرہی ہے۔

انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ انصار میں سے ایک صاحب نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ کے پاس حرہ کی نالیوں کے بارے میں مخاصمت کی یعنی صورتِ حال یہ تھی کہ "حرہ" کالے کالے پتھروں والی زمین ہوتی تھی ، اس میں قدرتی پانی کی نالیاں گزرتی تھی تو جہاں سے یہ نالی گزر رہی تھی وہاں سے اوپر کی طرف حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کا کھیت تھا اور نیچے کی طرف ایک دوسرے صاحب کا کھیت تھا۔ ایسے میں عام طور پر قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ جو اوپر والا ہے پہلے وہ اپنے کھیتوں کو سیراب کر لیتا ہے پھر دوسرے آدمی کے لئے پانی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا جب پانی آتا تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اوپر سے پانی کو روک لیتے اور اپنے کھیت میں پانی لے لیتے تھے۔ جب ان کا کھیت خوب اچھی طرح بھر جاتا تو بند کو ہٹا دیتے اور پھر پانی کو چھوڑ دیتے تھے جس کے نتیجے میں وہ دوسرے آدمی کے پاس جاتا تھا ، اُس کا کہنا تھا کہ تم پانی کو نہ روکو اور پانی کو میرے پاس آنے دو۔

حرہ کی نالیوں کے بارے میں جس سے نخلستان سیراب کیا کرتے تھے۔ یہ مخاصمت نبی کریم ﷺ کی خدمت پیش ہوئی۔

"فقال الأنصار" ان انصاری صاحب نے کہا کہ تم جو یہ بند باندھ کے رکھتے ہو یہ درست نہیں ہے بلکہ پانی کو چھوڑ دو کہ وہ گزر کر میرے پاس بھی آئے۔ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ نہیں ، میں تو پہلے اپنے کھیت کو پانی دوں گا پھر چھوڑوں گا۔ آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "اے زبیر! پہلے تم اپنے کھیتی میں پانی

---

[۸] وفي صحيح مسلم ، كتاب الفضائل ، باب وجوب اتباعه ، رقم ۴۳۴۷ ، وسنن الترمذي ، كتاب الأحكام عن رسول الله ، باب ماجاء في الرجلين يكون احد هما اسفل من الآخر في الماء ، رقم : ۱۲۸۳ ، ۲۹۸۳ ، وسنن النسائي ، كتاب آداب القضاة ، باب الرخصة للحاكم الذمين أن يحكم وهو غضبان ، رقم : ۵۳۱۲ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الأقضية ، باب من القضاء ، رقم : ۳۱۵۳ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب المقدمة ، باب تعظيم حديث رسول الله والتغليظ على من عارضه ، رقم : ۱۵ ، ومسند احمد ، رقم : ۱۳۴۵

دے دو پھر اپنے پڑوس کے لئے چھوڑ دو کیونکہ پہلے حضرت زبیر کی کھیتی آتی تھی۔انصاری صحابی نے اس فیصلے سے ناراضگی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ ﷺ نے جو فیصلہ کیا وہ اس وجہ سے کیا کہ حضرت زبیر ؓ آپ ﷺ کے پھوپی کے بیٹے ہیں (یعنی ان کی والدہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا تھیں اور یہ رسول اللہ ﷺ کی پھوپی تھیں تو اس واسطے اس طرح فیصلہ ہوا) نبی کریم ﷺ کا چہرۂ مبارک متغیر ہو گیا اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ اے زبیر! تم اپنے کھیتوں کو پانی دو پھر تم پانی کو روکے رکھو یہاں تک کہ پانی منڈھیروں تک لوٹ آئے۔یعنی منڈھیروں تک بھر جائے پھر اس کے بعد چھوڑ دو۔یعنی اصل حکم یہی تھا جو آپ ﷺ نے آخر میں دیا۔

اصل حکم یہ ہے کہ جس شخص کی کھیتی اوپر ہو تو اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کھیت میں اتنا پانی بھرلے کہ اس کی منڈھیریں بھر جائیں، اور جس کی حد فقہاء کرام نے یہ قرار دی ہے کہ کعبین تک آجائے لیکن وہ انصاری جھگڑتے ہوئے آئے تو آنحضرت ﷺ نے مصالحت کے طور پر یہ فرمایا کہ اے زبیر! کہ جتنا پانی تمہاری ضرورت ہے اتنا پانی لے لیا کرو اور اس کے بعد چھوڑ دیا کرو اور بھرنے کا انتظار نہ کیا کرو۔لیکن حضور ﷺ نے ان کے ساتھ جو رعایت فرمائی تھی اس کے اوپر بھی اعتراض کیا تو اس اعتراض کے نتیجے میں آپ ﷺ نے اصل حکم یہ فرمایا کہ کعبین تک تم پانی بھرو یہاں تک کہ پانی منڈھیر تک آجائے۔

"فقال الزبیر" حضرت زبیر ؓ فرماتے ہیں، میرا گمان یہ ہے کہ یہ آیت ﴿**فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ**﴾ اسی موقع پر نازل ہوئی۔

اعتراض کرنے والے صاحب کون تھے؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہی حدیث **"کتاب الصلح"** میں نکالی ہے وہاں لکھا ہوا ہے کہ یہ ایسے انصار میں سے تھے جو بدر میں شامل تھے۔لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ بدری صحابہ میں سے تھے اور واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ بدر میں کوئی منافق شامل نہیں تھا، لہٰذا یہ قول کہ یہ منافق تھے، یہ بات درست نہیں۔[9]

چنانچہ بعض روایتوں میں آیا ہے کہ ان کا نام حاطب ابن ابی بلتعہ ؓ ہے۔لیکن یہ بدری تو تھے، انصاری نہیں تھے۔بعض لوگوں نے یہ توجیہ کی ہے کہ انصار سے یہاں پر اصطلاحی انصار مراد نہیں ہیں بلکہ لغوی ہے یعنی وہ جو حضور ﷺ کی مدد کرتے رہے ہیں۔[10]

بعض روایتوں میں مختلف نام آئے ہیں لیکن اتنی بات واضح ہے کہ یہ بدری صحابہ میں سے تھے۔لہٰذا ان کا حضور ﷺ کے فیصلے پر اس طرح سے ناراضگی کا اظہار کرنا یہ شبہ پیدا کرتا ہے کہ یہ تو کفر ہو جاتا ہے۔**"ماکان**

---

9 عمدۃ القاری، ج:۹، ص:۶۶.

10 عمدۃ القاری، ج:۹، ص:۶۶-۶۷

لمؤمن ولامؤمنة اذا قضى الله ورسوله" [الاية] اور **﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ﴾**.

اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ یہ مدینہ منورہ میں ابتدائے اسلام کا واقعہ ہے یعنی **﴿فَلاَ وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ﴾** کے نزول سے پہلے کا اور یہ غلطی اگرچہ سنگین تھی لیکن اس کو حد کفر تک نہیں سمجھا گیا اور اس کی دو وجہیں ہیں:

ایک وجہ تو یہ ہے کہ احکام وعقائد ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہوئے تھے اور آیت کریمہ بھی نازل نہیں ہوئی تھی، لہٰذا ناواقفیت میں اور تقاضہ بشریت میں ان سے غلطی ہوگئی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ کہا کہ آپ ﷺ نے اپنے پھوپی زاد بھائی کے ساتھ رعایت کی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں کہ آپ نے غلط فیصلہ کیا بلکہ مقصد یہ تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے جو بات فرمائی وہ بطورِ مصالحت فرمائی تھی اور مصالحت میں کوئی بھی طریقہ تجویز کیا جاسکتا ہے اور صلح کرنے کے لئے کوئی فیصلہ تجویز کریں تو وہ کوئی حتمی فیصلہ نہیں ہوتا بلکہ فریقین کی رضامندی سے صلح ہوتی ہے، تو اس واسطے ان انصاری صحابی نے یہ کہا کہ آپ نے مصالحت میں جو مباح طریقہ تجویز کیا ہے وہ آپ کے پھوپی زاد بھائی کی رعایت پر مشتمل ہے۔

گویا راستے تو دو ہیں، یہ بھی اور دوسرا بھی لیکن آپ ﷺ نے اس مباح کو اختیار کیا جو آپ ﷺ کے پھوپی زاد بھائی کی رعایت پر مشتمل ہے، تو گویا انہوں نے یہ الزام عائد نہیں کیا کہ آپ ﷺ نے ظلم کا فیصلہ فرمایا، العیاذ باللہ بلکہ صلح میں اپنے پھوپی زاد بھائی کی جانب رعایت کا فیصلہ کیا۔

اگرچہ فی نفسہٖ نبی کریم ﷺ کے بارے میں یہ بات کہنا بھی سنگین غلطی تھی مگر کفر تک نہیں پہنچتی۔

بعض حضرات نے یہ جواب دیا ہے کہ **"لا یؤمنون"** سے کمال ایمان مراد ہے اور کفر متحقق نہیں ہوتا لیکن یہ بات صحیح نہیں۔ اس لئے کہ جس بات کو اللہ جل جلالہ قسم کھا کر فرما رہے ہیں **" فلا و ربک "** اس کے بارے میں یہ کہنا کہ محض کمال ایمان ہے یہ اس کی اہمیت کو کم کرنے کی مترادف ہے۔ اس لئے وہی بات پسندیدہ ہے کہ غلطی ہوگئی تھی اور اس وقت ہوگئی جب احکام وعقائد راسخ نہیں ہوئے تھے اور وہ غلطی بھی حضور ﷺ کی طرف قضائے بالجور الزام لگانے کی نہیں تھی بلکہ مصالحت میں ایک جانب کی رعایت کرنے کی تھی۔

توہین عدالت اور توہین فیصلہ موجب تعزیر ہے

پھر اس میں کلام ہوا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جو دو مختلف فیصلے فرمائے، ان میں اصل فیصلہ کون سا تھا؟ ایک جماعت نے کہا کہ اصل فیصلہ بعد والا تھا، مگر شروع میں آپ ﷺ نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو اپنے پڑوسی کے

ساتھ حسن سلوک کی تلقین فرمائی تھی، مگر جب وہ اس پر راضی نہ ہوئے تو اصل فیصلہ تجویز فرمایا، لیکن بعض علماء مثلاً علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اصل فیصلہ پہلا ہی تھا، بعد میں جو فیصلہ فرمایا وہ بطور تعزیر تھا۔

چنانچہ علامہ ماوردی رحمہ اللہ نے اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرمایا کہ عدالت کی توہین یا قاضی کے فیصلے کی توہین یا اس پر بددیانتی کا اعتراض کرنا اور اس کو نہ ماننا موجب تعزیر ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ یہ فیصلہ شریعت کے مطابق نہیں ہے اور اس پر دلیل پیش کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن یہ اعتراض کہ یہ فیصلہ بددیانتی کی وجہ سے کیا گیا، یا اقرباء پروری کی وجہ سے کیا گیا تو یہ اعتراض موجب تعزیر ہے اور ایسی صورت میں قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ اس پر تعزیر جاری کرے۔

۲۳۶۴ ۔ حدثنا ابن أبی مریم : حدثنا نافع بن عمر، عن ابن أبی ملیکہ، عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما : ان النبی ﷺ صلی صلوۃ الکسوف فقال : "دنت منی النار حتی قلت : ای رب وأنا معهم . فاذا امرأة حبست أنه قال : تخدشها هرة قال : ما شان هذه ؟ قالوا : حبستها حتی ماتت جوعا". [راجع : ۷۴۵]

۲۳۶۵ ۔ حدثنا اسمعیل قال : حدثنی مالک، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما: أن رسول اللہ ﷺ قال : ((عذبت امرأة فی هرة حبستها حتی ماتت جوعا فدخلت فیها النار، قال : فقال — واللہ أعلم :— لا أنت أطعمتیها ولا سقیتیها حین حبستیها ولا أنت أرسلتها فاکلت من خشاش الأرض)). [أنظر : ۳۳۱۸، ۳۴۸۲] [۱۱]

اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے نماز کسوف پڑھی پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ جہنم میرے قریب آ گئی یہاں تک کہ میں نے اللہ جل جلالہ سے تعجب سے عرض کیا۔ "اے پروردگار! کیا میں ان کے ساتھ ہوں کہ جہنم مجھے ان سے قریب نظر آ رہی ہے، حالانکہ مجھ میں اور جہنم میں آپ کے فیصلے کے مطابق تو بڑا فاصلہ ہے، تو اس میں دیکھا کہ ایک عورت کو بلی زخمی کر رہی ہے۔

"**قال ما شان هذا ؟**" تو فرمایا کہ اس عورت نے ایک بلی کو روک کے رکھا تھا، یہاں تک کہ وہ بھوک سے مر گئی۔

دوسری روایت میں آتا ہے کہ اس نے بلی کو نہ کھلایا، نہ پلایا تو اس کی وجہ سے عذاب ہوا۔ معلوم ہوا کہ جانوروں کو بھی پانی سے روکنا منع ہے۔

---

[۱۱] وفی صحیح مسلم، کتاب السلام، باب تحریم قتل الهرة، رقم : ۴۱۶۰، وکتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم تعذیب الهرة ونحوها من الحیوان الذی لایؤذی، رقم : ۴۷۴۹، وسنن الدارمی، کتاب الرقاق، باب دخلت امرأة النار فی هرة، رقم : ۲۶۹۳.

۲۳۶۷ ۔ حدثنا محمدبن بشار : حدثنا غندر حدثنا شعبة ، عن محمد بن زياد : سمعت أبا هريرة ﷺ ، عن النبی ﷺ قال : "والذی نفسی بیده لأذودن رجالا عن حوضی كما تذاد الغريبة من الابل عن الحوض "۔

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "میں بہت سے لوگوں کو اپنے حوض یعنی حوض کوثر پر آنے سے منع کروں گا" **"کما تذاد الغريبة من الابل عن الحوض"** جیسے اجنبی اونٹوں کا حوض پر آنے سے روکا جاتا ہے۔ اس طرح میں اپنے حوض کوثر سے روکوں گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشأ

امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث کو یہاں پر لانے کا یہ منشأ ہے کہ آپ ﷺ نے اس حوض کی نسبت اپنی طرف فرمائی اور اس سے لوگوں کو روکنے کا حق استعمال فرمایا، تو معلوم ہوا کہ پانی حوض کے اندر محرز کر لیا جائے تو صاحب حوض کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس سے لوگوں کو روکے۔

۲۳۶۸ ۔ حدثنی عبد اللہ بن محمد : أخبرنا عبد الرزاق ، أخبرنا معمر ، عن أيوب وكثير بن كثير ، يزيد احدهما على الأخر عن سعيد بن جبير قال : قال ابن عباس رضی الله عنهما : قال النبی ﷺ : "يرحم الله أم اسمعيل ، لو تركت زمزم . أو قال لولم تغرف من الماء . لكانت عينا معينا . واقبل جرهم فقالوا . اتأذنين أن ننزل عندک ؟ قالت : نعم ولا حق لكم فی الماء ، قالوا : نعم "۔[أنظر: ۳۳۶۲ ، ۳۳۶۳ ، ۳۳۶۴ ، ۳۳۶۵] [۱۲]

قبیلہ جرہم اور آب زم زم

حضرت عبداللہ بن عباس ﷺ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "**يرحم الله أم اسمعيل**" اللہ تعالیٰ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ پر رحم فرمائے "**لو تركت زمزم . او قال : لو لم تغرف من الماء . لكانت عينا معينا**" اگر وہ زمزم کو اسی طرح چھوڑ دیتیں جس طرح وہ نکلا تھا یا اس میں سے ڈونگے سے پانی نہ نکالتیں تو یہ ایک مستقل بہنے والا چشمہ ہوتا۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ زمزم کے جاری ہونے کا واقعہ ہوا تھا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنا پر زمین کے اوپر مارا جس سے زمزم کا پانی جاری ہوا اور زمین سے پانی پھوٹنا شروع ہوگیا۔ حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے جب یہ دیکھا کہ چشمہ سے پانی نکلا ہے تو پانی برتنوں میں بھر لیا۔ چونکہ برتنوں میں بھر لیا تھا، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ

---

[۱۲] مسند احمد ، ومن مسند بن بنی هاشم ، باب بداية مسند عبدالله بن العباس ، رقم : ۲۱۷۱ ، ۳۰۸۰ ، ۳۲۱۷ .

چھوٹے سے کنویں کی شکل اختیار کر گیا۔

نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں ''اگر حضرت ہاجرہ علیہا السلام پانی کو اس طرح رہنے دیتیں اور اس میں سے لیتی رہتی اس کو جمع نہ کرتیں تو یہ اس طرح مستقل بہنے والا چشمہ ہوتا کہ ہر وقت یہ پانی زمین کے اوپر بہہ رہا ہوتا۔ اس ارشاد کے مطابق جب کہ عین معین نہیں ہے، حال یہ ہے کہ ساری دنیا میں کوئی کنواں ایسا نہیں ہے جس سے اتنا پانی نکلتا ہو جتنا بئر زمزم سے نکلتا ہے۔

رمضان المبارک میں جا کر دیکھیں تو سارا عرب اس زمزم سے افطار کرتا ہے، لوگ اس کو بھر بھر کر لے جاتے ہیں اور مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں بھی یہ ملتا ہے، ایک صاحب نے ٹھیکہ لے رکھا ہے کہ وہ ہر وقت ٹینک بھر بھر کے سڑکوں کے ذریعہ اسی پانی کو مدینہ منورہ پہنچاتے ہیں اور مسجد نبوی میں جو کولر رکھے ہوئے ہیں ان میں آپ کو زمزم ہی ملے گا۔ یعنی استعمال کی کثرت کے باوجود بند نہیں ہوتا، دنیا میں کوئی کنواں ایسا نہیں ہے۔

''واقبل جرهم فقالوا'' یعنی نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''جس وقت پانی جاری ہو گیا تو جرہم کا قبیلہ کہیں سے سفر کر کے آرہا تھا، انہوں نے ایک پرندہ دیکھا جو عام طور سے پانی پر ہوتا ہے جس سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ پانی کہیں قریب ہی ہے۔ لہٰذا اس کی تلاش میں نکلے، جب تلاش کرتے ہوئے پانی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ حضرت ہاجرہؑ اپنے بچے کو لئے بیٹھی ہیں۔

جرہم کے لوگوں نے ان سے کہا ''آپ اجازت دیں تو ہم آپ کے قریب پڑاؤ ڈال لیں'' حضرت ہاجرہ علیہا السلام نے کہا کہ ''اجازت ہے لیکن پانی پر تمہارا حق نہیں ہے'' تو انہوں نے قبول کر لیا، لہٰذا وہیں قبیلہ جرہم والے آباد ہوئے اور وہیں سے مکہ شہر بن گیا یعنی قبیلہ جرہم نے مکہ کو آباد کیا۔ اس طرح اللہ جل جلالہ نے اس بستی کا انتظام فرمایا۔

حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا یہ فرمانا کہ پانی پر تمہارا حق نہیں ہوگا، اس کا مطلب یہ ہے کہ پانی تمہاری ملکیت نہیں ہے، اور نہ تم اسے سیرابی کے لئے استعمال کر سکتے ہو، بلکہ صرف اپنے لئے استعمال کر سکتے ہو یعنی پینے کی اجازت دی، لیکن سیرابی اور آب پاشی کے لئے منع فرمایا۔

لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ اس سے استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ پانی کا یہ کنواں اللہ نے ان کے لئے جاری کیا تھا اس لئے ان کی ملکیت میں آ گیا تھا۔

(۱۱) باب لا حمی الا لله ولرسوله ﷺ

۲۳۷۰ ــ حدثنا يحيى بن بكير: حدثنا الليث، عن يونس، عن ابن شهاب، عن

عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبة ، عن ابن عباس رضی اللہ عنهما : أن الصعب بن جثامة قال : أن رسول اللہ ﷺ قال : "لا حمی الا للہ ولرسوله" وقال : بلغنا أن النبی ﷺ حمی النقیع وان عمر حمی الشرف والربذه. [أنظر : ۳۰۱۳] [۱۳]

"حمیٰ" کسے کہتے ہیں؟

حضرت صعب بن جثامہ ؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **"لا حمی الا للہ ولرسوله"**.

اس ارشاد کا پس منظر یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں یہ اصول تھا کہ قبیلے کے بڑے بڑے سردار بعض اوقات قبیلے کے علاقے کی چراگاہ میں سے کچھ حصہ اپنے لئے مخصوص کر لیتے تھے کہ یہ صرف ہمارے جانوروں کے لئے مخصوص ہے اور دوسرے لوگوں کو یہاں پر اپنے جانور چرانے کی اجازت نہیں ہے۔

ایسے علاقوں کو حمی کہتے تھے۔ یعنی وہ زمین یا چراگاہ جو کسی سردار نے یا بادشاہ نے اپنے جانورں کے چرانے کے لئے مخصوص کر دی ہو، اور اس میں دوسرے لوگوں کا داخلہ منع کر دیا ہو۔

"لا حمی الا للہ ولرسوله"

فتح الباری میں لکھا ہے کہ اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ جس سردار کو "حمی" بنانے کی ضرورت پیش آتی، وہ کسی پہاڑ یا بلند ٹیلے پر بیٹھ جاتا تھا اور ایک پالتو کتے کو بھونکواتا تھا، کتے کے بھونکنے کی آواز جہاں جہاں پہنچ جاتی وہ کہتے یہ سارا علاقہ میرا ہے یہ میری حمی ہے، لہٰذا اب کوئی دوسرا آدمی اس میں داخل نہیں ہوسکتا۔ جب نبی کریم ﷺ کا عہد مبارک آیا تو آپ ﷺ نے اس طریقہ کار کو منع فرما دیا اور فرمایا کہ اب کوئی شخص حمی نہیں بنا سکتا۔ اور ارض مباح سب انسانوں کے لئے یکساں طور سے مباح ہیں کوئی شخص اس کو اپنے لئے مخصوص نہیں کرسکتا۔ البتہ اس میں ایک استثناء متصل ہے وہ یہ کہ اللہ اور اس کے رسول اللہ ﷺ کے لئے حمی ہوسکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بیت المال میں سارے مسلمانوں کا حق ہے اور امیر بیت المال کے مویشیوں کے چرنے کے لئے کوئی جگہ مخصوص کرے تو پھر وہ حمی درست ہو جائے گی کہ وہاں صرف بیت المال کے مویشی چریں گے اور کسی دوسرے کے جانور کو وہاں چرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ لہٰذا **"لا حمی الا للہ و لرسو له"** کے یہ معنی ہیں۔ [۱۴]

"وقال : بلغنا أن النبی ﷺ" چنانچہ اس مذکورہ قاعدے کے مطابق راوی کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ

---

[۱۳] وفی سنن أبی داؤد ، کتاب الخراج والامارة والفئی ، باب فی الأرض یحمها الامام أو الرجل ، رقم : ۲۶۷۹ ، ومسند احمد ، اوّل مسند المدنیین اجمعین ، باب حدیث الصعب بن جثامة ، رقم : ۱۵۸۲۷ ، ۱۶۰۶۱ ، ۱۶۰۸۵ .

[۱۴] فتح الباری ، ج : ۵ ، ص : ۴۴ ، ۴۵ .

نے نقیع کے علاقے کو بیت المال کے لئے حمی بنالیا تھا کہ بیت المال کے اونٹ یہیں پر چریں اور حضرت عمرؓ نے شرف اور ربذہ کو حمی بنالیا تھا جو مدینہ منورہ سے قریب تھی کہ بیت المال کے اونٹوں کے لئے یہ جگہ مخصوص کردی تھی اور باقی لوگوں کو منع کردیا تھا۔

اس کی تفصیل بخاری میں آگے آئے گی اور بعض لوگوں نے اس پر بھی اعتراض کیا تھا پھر حضرت عمرؓ نے اس حمی کے نگہبان سے کہا تھا کہ کن کو روکو، کن کو مت روکو۔ اس کی تفصیل بھی ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ بیت المال کے لئے حمی بنانا جائز ہے باقی کسی اور کے لئے حمی بنانا جائز نہیں ہے۔ اور اسی واقعہ کی روشنی میں دیکھئے کہ سردار اراضی شاملات کے لئے جو طریقہ اختیار کرتے تھے وہ جاہلیت کے حمی بنانے کے طریقے کے مطابق تھا کہ ملکیت کا کوئی بھی سبب نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف انگلی پھیر کر کہہ دیا کہ یہ میرا علاقہ ہے، یہ کسی طور سے بھی شریعت میں ثابت نہیں ہے۔

(۱۲) باب شرب الناس وسقی الدواب من الأنهار

۲۳۷۱ ـ حدثنا عبد الله بن یوسف: أخبرنا مالک بن أنس، عن زید بن اسلم عن أبی صالح السمان، عن أبی هریرة رضی الله تعالیٰ عنه قال أن رسول الله ﷺ "الخیل لرجل اجر، و لرجل ستر و علی رجل وزر. فأما الذی له أجر فرجل ربطها فی سبیل الله فاطال لها فی مرج او روضة، فما أصابت فی طیلها ذلک من المرج أو الروضة کانت له حسنات و لو انه انقطع طیلها فاستنت شرفا أو شرفین کانت آثارها و ارواثها حسنات له. و لو انها مرت بنهر فشربت منه و لم یرد أن یسقی کان ذلک حسنات له. فهی لذلک أجر. و رجل ربطها تغنیا و تعففا ثم لم ینس حق الله فی رقابها و لا ظهورها فهی لذلک ستر. و رجل ربطها فخراء و ریاء و نواء لاهل الاسلام، فهی علی ذلک وزر" و سئل رسول الله ﷺ عن الحمر، فقال: "ما أنزل علی فیها شئ الا هذه الآیة الجامعة الفاذة: ﴿فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝﴾ [أنظر: ۲۸۶۰، ۳۶۴۶، ۴۹۶۲، ۴۹۶۳، ۷۳۵۶] [۱۵]

---

[۱۵] وفی صحیح مسلم، کتاب الزکاة، رقم: ۱۶۴۷، وسنن الترمذی، کتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء فی فضل، من ارتبط فرساً فی سبیل الله، رقم: ۱۵۶۰، وسنن النسائی، کتاب الخیل، رقم: ۳۵۰۷، وسنن ابن ماجة، کتاب الجهاد، باب ارتباط الخیل فی سبیل الله۔ رقم: ۲۷۷۸، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أبی هریرة، رقم: ۷۲۴۷، ۸۵۱۱، ۸۶۱۹، ۹۱۱۰، ومؤطا مالک، کتاب الجهاد، باب الترغیب فی الجهاد، رقم: ۸۵۱.

"ولو انه انقطع طيلها" گھوڑے کو رسی سے باندھ رکھا تھا، پھر اگر وہ رسی ٹوٹ گئی، **"فاستنت"** تو گھوڑے بھاگ کھڑے ہوئے، **"شرفا أو شرفين"** ایک ٹیلہ یا دو ٹیلے پار کر کے چلے گئے۔

"كانت آثارها و ارواثها حسنا له" ایسے آدمی کے نشان قدم ہیں اور وہ گھوڑے جو لید وغیرہ کریں گے تو سب اس شخص کی حسنات شمار ہوں گی۔ کیونکہ اس نے گھوڑوں کو جہاد کے لئے پالا تھا۔

"ولو أنها مرت بنهر" اسی جملے کی حدیث اس باب میں لائے ہیں، **"ولم يرد أن يسقيها"** یعنی خود وہ پانی پلانا نہیں چاہتا تھا لیکن چونکہ وہ ان کو پالنے کی وجہ سے اس کا سبب بنا، اس لئے اسے ثواب ملے گا، لہذا جب پلانا چاہتا ہو تو بطریق اولیٰ ثواب ہوگا۔

"ورجل ربطها تغنيا و تحففا لذلک ستر" ایک دوسری قسم ہے، اس نے گھوڑے باندھ کر رکھے **"تغنيا"** غنی حاصل کرنے کے لئے، **"وتعففا"** لوگوں کی آگے سوال سے بچنے کے لئے اور اپنے آپ کو پاکیزہ بنانے کے لئے۔

"ثم لم ينس حق الله لذلک ستر" اور اس نے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں بھلایا، نہ ان کے رقبے میں، نہ ان کی حیثیت میں۔

اس سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید ہوتی ہے کہ گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ اور حق نہ بھلایا کے معنی ہیں جس شخص کے پاس گھوڑا ہے۔

اگر کوئی شخص بیچارہ سواری کا ضرورت مند ہے تو اس کی حاجت پوری کرے، گھوڑوں کے اندر معاملات کا یہ حکم ہے، اسی طرح جن لوگوں کے پاس اپنی گاڑیاں ہوتی ہیں تو ان کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ کبھی کبھی ضرورت مندوں کو سواری کے لئے دیا کریں۔

"وسئل رسول الله ﷺ عن الحمر" جب آپ ﷺ نے گھوڑوں کا بیان فرمایا تو لوگوں نے کہا کہ گدھوں کا بیان بھی فرما دیجئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ پر اس بارے میں کوئی خاص حکم نازل نہیں ہوا۔ **"إلاهذه الآية الجامعة الفاذة"** صرف اس جامع آیت کے **"فمن يعمل مثقال ذرة خيرا يره"**.

۲۳۷۲ ۔ حدثنا اسماعيل حدثنا مالک بن ربيعة بن أبي عبد الرحمن، عن يزيد مولى المنبعث، عن زيد بن خالد الجهني قال: جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فسأله عن اللقطة فقال "اعرف عفاصها ووكاءها، ثم عرفها سنة، فان جاء صاحبها والا فشأنک بها" قال: فضالة الغنم؟ قال "هي لک أو لأخيک أو للذئب" قال: فضالة الإبل؟ قال: "مالک ولها؟" معها سقاؤها وحذاؤها، ترد الماء وتأكل الشجر حتى يلقاها ربها" [راجع: ۹۱]

یہاں پر لانے کا مقصد درحقیقت یہ جملہ ہے کہ "تـرد الـمـاء" یعنی وہ پانی پر وارد ہوا، پانی پیا باقی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔

"**و تأكل الشجر حتى يلقاها ربها**" اس سے پتہ چلا کہ لکڑیاں مباح عام ہوتی ہیں لیکن جب آدمی کاٹ کر اپنے ہاتھوں میں لے لے تو وہ اس کی ملکیت ہوگئیں، اب وہ ان لکڑیوں کو بیچ سکتا ہے۔

(۱۳) باب بيع الحطب والكلاء

۲۳۷۵ ـ حدثنا ابراهيم بن موسى: أخبرنا هشام : أن ابن جريج أخبرهم قال : أخبرني ابن شهاب ، عن علي بن حسين بن علي ، عن أبيه حسين بن علي ، عن أبيه علي بن أبي طالب ؓ انه قال : اصبت شارفا مع رسول الله ﷺ في مغنم يوم بدر، قال : وأعطاني رسول الله ﷺ شارفا أخرى فا نختهما يوما عند باب رجل من الأنصار وأنا أريد أن أحمل عليهما اذخرا لأبيعه ومعي صائغ من بني قينقاع فا ستعين به على وليمة فاطمة ، و حمزة بن عبد المطلب يشرب في ذلك البيت معه قينة ، فقالت : الا ياحمز للشرف النواء ، فثار اليهما حمزة بالسيف فجب أسنمتهما وبقرخواصر هما ثم أخذ من اكباد هما ، قلت لا بن شهاب : ومن السنام ؟ قال : قد جب أسنمتهما فذهب بها . قال ابن شهاب : قال علي ؓ: فنظرت إلى منظر افظعني فاتيت نبي الله ﷺ وعنده زيد بن حارثة فأخبرته الخبر، فخرج ومعه زيد فانطلقت معه فدخل على حمزة فتغيظ عليه فرفع حمزة بصره وقال : هل أنتم الاعبيدلآ بائي؟ فرجع رسول الله ﷺ يقهقرحتى خرج عنهم وذلك قبل تحريم الخمر. [راجع: ۲۰۸۹]

حدیث باب کا مقصد

حضرت علی ؓ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن مال غنیمت سے میرے حصے میں ایک اونٹنی آئی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے مجھے ایک اور اونٹنی بھی عطا فرما دی، لہٰذا میرے پاس دو اونٹنیاں ہوگئیں۔ تو میں نے ایک دن دونوں اونٹنیاں ایک انصاری کے دروازے پر بٹھا دیں اور میرا مقصد یہ تھا کہ میں ان پر اذخر گھاس لاددوں گا تاکہ اس کو بیچوں۔

یہی ترجمۃ الباب کا مقصد ہے کہ اذخر ویسے تو مباح عام ہے لیکن جب کوئی کاٹ لے اور اپنے قبضے میں

لے لے تو وہ اس کی ملکیت ہو گئیں لہٰذا وہ اس کو بیچ سکتا ہے۔

اور میرے ساتھ بنو قینقاع کا ایک سنار تھا۔ یہ اس لئے کہہ دیا کہ اذخر گھاس عام طور سے سناروں کے کام آتی تھی وہ اس کو خریدتے تھے اور اس سے اپنے اوزار وغیرہ کی صفائی کیا کرتے تھے۔

تمنا جو پوری نہ ہوئی

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس گھاس کو کاٹنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کو بازار میں فروخت کر کے جو پیسے ملیں گے اس سے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کے ولیمے میں مدد حاصل کروں گا۔ اسی لئے امام بخاریؒ حدیث یہاں لائے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خودرو گھاس کو اگر کوئی کاٹ کر اس کا احراز کر لے تو وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کی بیع بھی کر سکتا ہے۔

کہتے ہیں کہ میں گھاس کاٹنے چلا گیا اور اونٹوں کو وہاں پر بٹھا گیا۔ جہاں بٹھایا تھا وہاں حضرت حمزہ بن عبد المطلب جو حضور ﷺ کے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے چچا بھی تھے، وہ اس گھر میں بیٹھے ہوئے شراب پی رہے تھے (اس وقت شراب کی حرمت نہیں آئی تھی)۔ ان کے ساتھ ایک گانا گانے والی مغنیہ بھی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ یہ اونٹنیاں بندھی ہوئی ہیں تو اس نے یہ شعر پڑھنے شروع کئے۔

"الا یا حمز للشرف النواء" کہ **"الا یا حمز"** یہ حمزہ کا مخفف ہے۔ **"للشرف النواء: شروف شارف"** کی جمع ہے جس کے معنی اونٹنی کے ہیں اور **"نوا"** کے معنی موٹی تازی۔ تو مطلب یہ ہوا کہ ان موٹی تازی اونٹنیوں کی طرف توجہ دلاتی ہوں۔ جو یہاں تمہارے صحن میں بندھی ہوئی کھڑی ہیں۔ آپ کو دعوت دیتی ہوں کہ ان کے نرخرے میں چھری لگاؤ اور ان کو ان کے خون میں لپیٹ دو۔

اور کہتی ہے کہ جلدی سے اس کے بہترین گوشت کو اس دیگ میں پکا کر ہمیں کھلاؤ، یہ ان اشعار کا حاصل تھا۔

حضرت حمزہ نشے کی حالت میں تو تھے، تلوار لے کر ان اونٹنیوں کی طرف دوڑ پڑے اور ان کے کوہان اور خواصر کاٹ دیئے اور پھر ان کی کلیجی نکال لی۔

"قلت لابن شهاب: ومن السنام؟"

یہ بیچ میں راوی ابن جریج ہیں جو ابن شہاب سے روایت کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن شہاب سے کہا کہ کوہان سے بھی انہوں نے نکال لیا! انہوں نے کہا کہ ہاں ان کے کوہان بھی کاٹ دیئے اور لے گئے۔

"قال علی رضی اللہ عنہ" آگے پھر روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب میں گھاس کاٹ کر واپس آیا تو ایسا منظر دیکھا جس نے مجھے گھبرا دیا (حیران و پریشان کر دیا) کہ اونٹنیاں بیچاری ساری لہولہان اور ذبح ہوئی پڑی تھیں تو میں نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوا آپ ﷺ کے ساتھ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی

بیٹھے ہوئے تھے۔

آپ ﷺ کو میں نے سارا واقعہ سنایا کہ اس طرح سے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے حملہ کر کے میری اونٹنیوں کو ذبح کر دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ خود تشریف لے گئے اور آپ ﷺ کے ساتھ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ بھی تھے آپ ﷺ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ناراضگی کا اظہار فرمایا کہ یہ کیا حرکت کی ہے؟ اس بیچارے کی اونٹنیاں تھیں اور تم نے اس طرح خراب کر دی ہیں تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنی آنکھ اٹھائی، دوسری روایت میں آتا ہے کہ آنکھیں شراب کے نشے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"وقال هل أنتم إلا عبيد لأبائی"

آپ ﷺ تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے دودھ شریک تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھتیجے تھے تو ان سب کو یا صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نشے کی حالت میں یہ جملہ کہہ دیا۔

حضور اقدس ﷺ نے جب یہ دیکھا کہ یہ نشے کی حالت میں ہیں اور اپنے آپے میں نہیں ہیں۔ تو آپ ﷺ الٹے پاؤں واپس تشریف لے گئے **"حتی خرج عنهم"** یعنی آپ ﷺ نے دیکھا کہ یہ سب ان سے اس وقت کہنا فضول ہے، کیونکہ نشے کی حالت میں ہیں۔ لہٰذا آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے **"وذلک قبل تحریم لخمر"** اور یہ واقعہ شراب کے حرام ہونے سے پہلے کا ہے۔

(۱۴) باب القطائع

قطائع قطیعہ کی جمع ہے اور قطیعہ اس زمین کو کہا جاتا ہے جو کوئی امام اپنے کسی باشندے کو بطور ہبہ دیدے جس کا ترجمہ اردو میں عموماً جاگیر سے کیا جاتا ہے کہ حکومت نے کسی شخص کو کوئی جگہ بطور جاگیر عطا فرمائی ہو۔

۲۳۷۶ ۔ حدثنا سليمان بن حرب: حدثنا حماد بن زيد، عن يحيى بن سعيد قال: سمعت انسا رضی اللہ عنہ قال: أراد رسول الله ﷺ أن يقطع من البحرين فقالت الأنصار: حتى تقطع لإخواننا من المهاجرين مثل الذى تقطع لنا، قال: "سترون بعدى أثرة فاصبروا حتى تلقونى". [أنظر: ۲۳۷۷، ۳۱۶۳، ۳۷۹۴] [۱۶]

[۱۶] وفى صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب أعطاء المؤلفة قلوبهم على الاسلام وتصبر من قوى، رقم: ۱۷۵۳، ۱۷۵۶، وسنن الترمذى، كتاب المناقب عن رسول الله، باب فى فضل الأنصار وقريش، رقم: ۳۸۳۶، وسنن النسائى، كتاب الزكوة، باب ابن اخت القوم منهم، رقم: ۲۵۶۳، ومسند أحمد، باقى مسند المكثرين، باب مسند أنس بن مالك، رقم: ۱۱۶۴۲، ۱۲۱۴۷، ۱۲۲۴۵، ۱۲۲۸۸، ۱۲۴۱۹، ۱۲۸۶۸، وسنن الدارمى، كتاب السير، رقم: ۲۴۱۵.

عطاء جاگیر کی شرعی حیثیت

حضرت انس ؓ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے بحرین کی زمینوں میں سے کچھ جاگیریں انصار صحابہ ؓ کو دینے کا ارادہ فرمایا اور اس وقت نبی کریم ﷺ کو صرف انصار صحابہ ؓ کو دینا مقصود تھا، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس وقت بنو نضیر جلاوطن ہوئے تھے اور ان کی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئی تھیں۔ اس وقت نبی کریم ﷺ نے ان کی زمینیں صرف مہاجرین کو تقسیم فرمائی تھیں اور سوائے چند انصار صحابہ ؓ کے اور کسی انصاری کو کوئی زمین عطا نہیں فرمائی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انصار صحابہ ؓ کے پاس تو پہلے سے ہی مدینہ منورہ میں کئی زمینیں تھیں اور مہاجرین چونکہ اپنے گھر بار سب کچھ چھوڑ کر آئے تھے تو آنحضرت ﷺ نے بنو نضیر کی زمینیں ان کو عطا فرما دی تھیں۔ جب بحرین فتح ہوا اور اس کی زمینیں مسلمانوں کے قبضے میں آئیں تو آنحضرت ﷺ نے ارادہ فرمایا کہ وہ زمینیں انصار کو عطا کی جائیں تاکہ بنو نضیر کی زمینوں کی اس طرح کچھ تلافی ہو جائے۔

"فقالت الأنصار" انصار صحابہ ؓ نے جواب میں فرمایا کہ آپ ﷺ نے یہ زمینیں ہمیں عطا نہ فرمائیں یہاں تک کہ آپ ﷺ ہمارے مہاجرین بھائیوں کو بھی ویسی ہی زمینیں عطا فرمائیں جیسی ہمیں عطا فرما رہے ہیں۔

انصار صحابہ کرام ؓ کا جذبۂ ایثار

انصار صحابہ ؓ نے دوبارہ ایثار سے کام لیا اور عرض کیا کہ ہمیں تو عطا فرما رہے ہیں اور مہاجرین کو نہیں دے رہے، لہٰذا مہاجرین کو بھی عطا فرمائیں، اور ہمیں بھی، لیکن اس وقت اتنی زمینیں نہیں تھیں کہ انصار اور مہاجرین کو برابر دی جا سکتیں تو آپ ﷺ نے انصار سے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ **"سترون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی"**۔

یہ جملہ ایک اور موقع پر بھی آپ ؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ جب آپ ﷺ نے غزوۂ حنین سے واپسی پر وہاں کا مال غنیمت اس وقت زیادہ تر وہیں کے لوگوں کو دیا تھا اور بعض انصار کے دل میں خیال پیدا ہوا تو اس کے بعد پھر آپ ﷺ نے ان سے بھی یہ جملہ ارشاد فرمایا تھا جس کے معنی یہ ہیں کہ تم میرے بعد کچھ ترجیح دیکھو گے کہ تمہارے اوپر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جا رہی ہے۔ یعنی میرے بعد جو امراء آئیں گے وہ بعض اوقات تمہارے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے جس میں تمہارے مقابلے میں دوسرے لوگوں کو زیادہ ترجیح دی جائے گی تو فرمایا کہ **"فاصبروا"** اس ترجیحی سلوک کو برداشت کرنا، صبر کرنا **"حتی تلقونی"** یہاں تک کہ تم مجھ سے حوض کوثر پر آملو۔

یہ نہیں فرمایا کہ "ایک تحفظ حقوق انصار کی انجمن بنا لینا" اور پھر اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا اور جلوس نکالنا

بلکہ یہ فرمایا کہ **"فاصبروا"** صبر کرنا۔ کیونکہ اس صبر کرنے کا جو اجر و ثواب اللہ جل جلالہ تمہیں عطا فرمائیں گے وہ اس نقصان کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا جو تمہیں دنیا میں حاصل ہوگا۔

عطاء جاگیر کا مسئلہ

یہاں جو بنیادی مسئلہ قابل ذکر ہے وہ عطاء جاگیر کا ہے کہ آیا حکومت کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی کو کوئی زمین بطور جاگیر دیدے؟

چند صدیوں سے پہلے یورپ میں اور پھر بعد میں ایشائی ممالک میں بھی ایک خاص قسم کا معاشی اور سیاسی نظام جاری رہا ہے جس کو جاگیردارانہ نظام کہتے ہیں۔

اس جاگیری نظام میں طرح طرح کے معاشی اور سیاسی مفاسد لوگوں کے سامنے آئے اس کی بنا پر جاگیردارانہ نظام بہت بدنام ہوا اور جاگیری نظام کے خلاف پورا علم بغاوت بلند ہوا اور زمین کی ملکیت کا سرے سے ہی انکار کر دیا۔

اس موقع پر اشتراکیت نے بھی جاگیردارانہ نظام کو اور زیادہ بدنام کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اُٹھا کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی حیثیت ہے یا نہیں؟

تو لوگوں نے سوچا کہ اگر یہ کہا جائے کہ اسلام میں عطاء جاگیر کی کوئی گنجائش ہے تو یہ جاگیردارانہ نظام کی حمایت ہوگی اور اسلام کی طرف جاگیردارانہ نظام کی حمایت منسوب کرنا خود اسلام کو بدنام کرنے کے مترادف ہے۔ لہذا انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام میں جاگیردارانہ نظام کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اور عطاء جاگیر اسلام میں نہیں ہے۔

بعض لوگوں کی یہ ذہنیت ہے کہ جب کوئی نظریہ ایک دم بہت زور و شور کے ساتھ دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ یہ دیکھے بغیر کہ اس نو پید نظریہ کے بارے میں اسلام کی کیا تعلیمات ہیں ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ نہیں جناب اسلام اس نظریہ کا قائل نہیں ہے۔ اور اس طرح اپنے ذہن اور خیال کے مطابق اسلام کی خدمت کرتے ہیں تاکہ اسلام کی بدنامی نہ ہو اور اس کے ماتھے پر جو داغ لگ رہا ہے وہ دور کر دیا جائے، اس لئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عطائے جاگیر اسلام میں ہے ہی نہیں، حالانکہ یہ تصور بالکل غلط ہے، ابھی آپ نے احادیث میں دیکھا کہ انصار کو جاگیر دینے کا ذکر ہے۔ اسی طرح بے شمار جاگیریں مختلف زمانوں میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عطا فرمائی گئیں۔

مثلاً حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے پورا بیت المقدس کا علاقہ دیدیا تھا، حضرت وائل بن حجر رضی اللہ عنہ کو یمن کا بہت بڑا علاقہ بطور جاگیر عطا فرمایا تھا، حضرت بلال بن حارث المزنی

رضی اللہ عنہ اور حضرت جریر رضی اللہ عنہ کو بہت بڑی جاگیر عطا کی اور اسی طرح حضرات شیخین کو بھی عطا کی تھی۔ تو عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات کتابوں میں موجود ہیں اور خاص طور سے امام ابو عبید رحمہ اللہ کی ''کتاب الاموال''، امام یوسف رحمہ اللہ کی ''کتاب الخراج'' اور ابن آدم کی ''کتاب الخراج'' میں عطاء جاگیر کے بے شمار واقعات موجود ہیں۔ [۱۷]

موجودہ جاگیری نظام کی تاریخ اور ابتدا

یورپ کے جاگیری نظام کی حقیقت

اصل بات یہ ہے کہ لوگ صرف جاگیر کے لفظ کو پکڑ کر بیٹھ گئے اور یہ نہیں سمجھا کہ وہ جاگیری نظام جو یورپ سے شروع ہوا تھا اور جس کے بے شمار مفاسد سامنے آئے اس میں اور اسلام کی عطائے جاگیر میں کیا فرق ہے؟ لہٰذا سمجھے بغیر کہہ دیا کہ اسلام میں جاگیر کا کوئی تصور نہیں ہے۔

پہلے یہ سمجھئے کہ یورپ کا جاگیری نظام کیا تھا؟

وہ یہ تھا کہ جس شخص کو جاگیر دی جاتی تھی، جاگیر دار بنایا جاتا تھا، اس کو زمین بطور ملکیت نہیں دی جاتی تھی، بلکہ عام طور پر جاگیر دار سے یہ کہا جاتا تھا کہ یہ سارے علاقے کی زمینوں کی لگان، خراج لینے کا صرف آپ کو حق حاصل ہے۔ مثلاً یہ کہہ دیا کہ کراچی کے آس پاس جتنے دیہات ہیں، ان پر جتنی زمینیں ہیں، ان پر جو لوگ کاشت کاری کرتے ہیں ان سے حکومت کے بجائے آپ خراج وصول کریں اور اس خراج کی تعیین بھی وہی کرتے تھے اور انہی کو یہ حق حاصل تھا کہ کونسی زمین سے کتنا خراج وصول کرنا ہے اور عام طور سے یہ جاگیریں اس کو دی جاتی تھیں جس نے حکومت کے لئے کوئی خاص خدمات انجام دی ہوں۔

اس وقت بادشاہت کا دور تھا، عموماً بادشاہ اپنے دوستوں اور بڑے بڑے فوجی افسروں کو یہ جاگیریں دیتے تھے۔ بادشاہ نے جس کو نواز دیا کہ اتنی جاگیر ہم نے تم کو دیدی ہے لہٰذا یہاں کے علاقے کا خراج تم وصول کرو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط بھی عائد کی جاتی تھی کہ جب کبھی حکومت کو جنگ وغیرہ کے موقع پر لڑنے والوں کی ضرورت پیش آئے گی تو اپنی جاگیر کے علاقے میں سے آپ اتنے افراد حکومت کو جنگ کے لئے فراہم کریں گے مثلاً کسی کو کہہ دیا کے ہم نے تم کو اتنی جاگیر فراہم کی ہے لیکن جب ہمیں ضرورت پیش آئے گی تو دس ہزار آدمی یا پانچ ہزار آدمی تم لے کر آؤ گے۔ باقی جس طرح چاہو تم ان لوگوں سے خراج وصول کرو، جتنا چاہو وصول کرو اور جو تم وصول کرو گے وہ تمہاری ملکیت ہوگا۔

---

[۱۷] راجع: للتفصیل کتاب الخراج للقاضی أبی یوسف یعقوب بن ابراهیم، ص: ۶۲ – ۷۱.

ہمارے ہاں یہ اصطلاحات مشہور تھیں کہ یہ دس ہزاری جاگیردار ہے، یہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے اس کا مطلب یہ تھا کہ جو جنگ کے موقع پر دس ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ دس ہزاری جاگیردار ہے اور جو پانچ ہزار آدمی فراہم کرتا ہے وہ پانچ ہزاری جاگیردار ہے۔ اس میں یہ ہوتا تھا کہ خراج کی مقدار کے تعین کے حقوق بھی ان کو حاصل تھے تو بسا اوقات اپنے مفاد کی خاطر کاشت کاروں کے اوپر زیادہ خراج عائد کر دیتے تھے اور چونکہ کاشت کار یہ سمجھتے تھے کہ خراج عائد کرنا ان لوگوں کا کام ہے اور اگر ہم نے ذرا سا بھی ان کے چشم ابرو کے خلاف کام کیا تو ہمارا خراج بڑھا دیں گے اور خراج بڑھنے کے نتیجے میں ہمارے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جائے گا اور زندگی دوبھر ہو جائے گی۔ لہٰذا وہ ان کے ہر حکم کی اطاعت کرتے تھے۔ اور وہ ان کے اوپر طرح طرح کے بیگار عائد کرتے تھے یہ کرو وہ کرو۔ اگر وہ نہ کریں تو یہ خراج بڑھا دیتے تھے۔ درحقیقت ان کی حیثیت غلاموں جیسی ہوگئی تھی، اس واسطے ان کو اصطلاح میں رعیت کہا جاتا تھا۔ وہ بیچارے کاشت کار ان کا ہر حکم ماننے کے پابند ہوتے تھے، اور یہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتے تھے کام لیتے اور ان سے خراج وصول کرتے۔

اس کا نقصان یہ ہوا کہ جب ان کے قبضے میں اتنی بڑی مخلوق آ گئی جو ان کی رعیت ہے اور وہ غلاموں جیسی ہے تو گویا یہ ان کا لشکر ہے۔ اور ان کا بادشاہ سے وعدہ بھی ہوتا تھا کہ جنگ کے موقع پر ضرورت کے وقت بادشاہ کو دس ہزار آدمی فراہم کریں گے۔ تو اس طرح ایک آدمی دس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، کوئی بیس ہزار کے لشکر کا مالک ہے، ان کی حیثیت اپنے علاقے میں بادشاہ جیسی ہوتی تھی۔ جب بادشاہ جیسی حیثیت ہوگئی تو گویا اندرون ملک ان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہوگئیں۔ پھر ان کے ساتھ ساتھ ان کی دفاعی اور سیاسی قوت بھی بہت زیادہ مضبوط ہوگئی۔ اس طرح یہ اپنے اپنے علاقوں میں بڑے مستحکم اور مضبوط ہو گئے اور سیاسی اعتبار سے ان کا مرتبہ ہوگیا۔ اب یہ بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھانے لگے کہ اگر تم نے ہماری بات نہ مانی تو ہم تم سے بغاوت کر دیں گے۔ اتنا لشکر ہمارے پاس موجود ہے اور بغاوت کر کے ہم اپنی الگ سلطنت بنالیں گے۔

لہٰذا یہ جاگیردار بادشاہ کے اوپر مسلط ہو گئے اور اگر آٹھ دس جاگیردار آپس میں مل جاتے تھے تو بادشاہ ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا تھا، اور ان کی ہر خواہش پوری کرنے، اور ہر حکم ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا وہ جو چاہتے بادشاہ سے منوا لیتے تھے تو بادشاہ گویا ان کا تابع ہوگیا۔

لہٰذا ان جاگیرداروں نے ایک طرف تو اپنے زیر جاگیر لوگوں کو رعیت اور غلام بنایا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف بادشاہ کو بھی آنکھیں دکھا رہے ہیں اور اس کے ساتھ من مانی کر رہے ہیں اس سے اپنے مفادات اور مرضی کے خلاف فیصلے کرا رہے ہیں تو یہ ہے یورپ کا وہ جاگیرداری نظام جو ایک عرصہ تک یورپ میں رہا۔

پھر اس کے اثرات ہمارے ہندوستان اور پاکستان میں بھی آئے اور اس کا باقی ماندہ اثر بلوچستان میں سرداری نظام کی صورت میں ہے کہ جو سردار ہوتا ہے، وہ ایک طرح سے (اللہ بچائے) اپنے زیر جاگیر لوگوں

کے لئے فرعون بنا بیٹھا ہے کہ ان سے خراج وصول کرتا ہے۔ آج بھی بلوچستان میں کاشت کار اپنی پیداوار کا چھٹا حصہ جاگیردار کو بطور خراج دیتا ہے جسے وہ ششک کہتے ہیں۔

اور تمام لوگ جاگیر دار کے تحت ہیں وہ اس کے غلام ہیں اور سرداروں نے یہ کام کر رکھا ہے کہ ہمارے زیر جاگیر لوگ کسی طرح تعلیم حاصل نہ کر پائیں، کیونکہ انہوں نے اگر تعلیم حاصل کر لی تو یہ ہمارے مطیع اور ہمارے فرماں بردار نہیں رہیں گے، اس لئے ان کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ یہاں کوئی تعلیمی ادارہ نہ بنے اور کوئی سڑک نہ بنے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان میں تعلیم وتمدن آجائے اور یہ دونوں چیزیں آنے کی صورت میں یہ اپنے آپ کو غلام سمجھنا چھوڑ دیں گے، یہ سارے فسادات اس سے پھیلے۔

یہ وہ جاگیرداری نظام تھا جس کے خلاف مزاحمت کا رویہ پیدا ہوا اور بالآخر یورپ میں ختم ہوا اور بعض دوسرے علاقوں میں بھی ختم ہوا۔ اس کے خلاف بڑی نفرت پیدا ہوئی اور بعض جگہوں میں ابھی تک باقی ہے اور نفرت بھی باقی ہے۔

اسلام میں عطاء جاگیر کا مطلب

اس کے برخلاف اسلام میں عطاء جاگیر کا معنی یہ ہے کہ تین صورتوں میں کسی کو جاگیر دی جاسکتی ہے۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ارض موات دے دی گئی یعنی بنجر زمین دی گئی اور کہا گیا کہ تم اس کو آباد کر کے اپنی ملکیت میں لے آؤ۔ اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ وہ اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کریں۔ اگر اس نے تین سال کے اندر آباد کر لیا، تب تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اور اگر وہ تین سال کے اندر اندر اس کو آباد نہ کر سکا تو جاگیر ختم، پھر وہ اس کو نہیں لے سکتا۔

آپ دیکھیں گے کہ اگر اس شرط پر کسی کو جاگیر دی جائے کہ تم اس کو تین سال کے اندر اندر آباد کر لو تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ بنجر زمینیں آباد ہوں گی اور ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ آدمی خود تنہا اس کو آباد نہیں کر سکتا۔ اس کو کچھ مزدور رکھنے پڑیں گے، تو لوگوں کو روزگار ملے گا اور اگر تین سال میں یہ فوائد حاصل نہ ہوئے تو جاگیر ختم۔ واپس لے کر کسی اور کو دی جائے گی، تو اس میں مفاسد ہونے کا احتمال ہی نہیں۔

حضرت بلال بن حارث مزنی رضی اللہ عنہ کو نبی کریم ﷺ نے جاگیر عطا فرمائی، انہوں نے کچھ حصہ تو آباد کیا اور زیادہ تر حصہ آباد نہ کر سکے۔ لہٰذا بعد میں وہ جاگیر ان سے واپس لے لی گئی۔

بعض لوگ تحدید ملکیت والے ہیں؛ وہ کہتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم ﷺ نے جاگیر واپس لے لی، تو وہ اس لئے واپس لی کہ انہوں نے تین سال تک انہیں آباد نہیں کیا اگر آباد کی ہوتی تو واپس نہ لیتے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی زمین جو سرکاری ملکیت ہے بطور حصہ دے دی جائے۔ اسلام

میں بنجر زمین سرکاری ملکیت نہیں ہوتی، سرکاری زمین وہ ہوتی ہے جس بنجر زمین کو سرکار نے آباد کیا۔ ان زمینوں میں سے کوئی زمین کسی کو بطور مالکانہ حقوق کے ساتھ دے دی جائے کہ ہم تمہیں یہ زمین مالکانہ حقوق کے ساتھ دیدیتے ہیں، تم اس کو استعمال کرو اس میں یہ قید نہیں ہوتی کہ تین سال تک آباد نہ کی تو واپس لے لی جائے گی۔

لیکن اس قسم کی جاگیر صرف اراضی سلطانیہ میں ہوسکتی ہے جس کی مالک صرف حکومت ہو، لیکن ایسی اراضی سلطانیہ جو حکومت نے پہلے سے آباد کر کے اپنی ملکیت بنا رکھی ہیں ان کی مقدار اتنی کم ہوتی ہے کہ ان کو بڑے پیمانہ پر کسی کو بطور جاگیر دینا ممکن نہیں ہوتا، کیونکہ حکومت جس زمین کو آباد کرتی ہے تو وہ اپنے کسی مقصد کے تحت کرتی ہے اور اس میں بھی امام اس بات کا پابند ہے کہ مصلحت عامہ کو مدنظر رکھے یہ نہیں کہ کسی کو رشوت میں دیدی یا کسی کو نواز دیا بلکہ جہاں واقعی کوئی شخص حاجتمند ہے اس کو دیں۔ غریب لوگوں کو یا کسی کی خدمات کے صلے میں دیں۔ ویسے ہی بغیر کسی مصلحت کا کہ دینا امام کے لئے جائز نہیں۔ اور جو دے گا اس کی مقدار بھی کم ہوگی کیونکہ اراضی سلطانیہ کی مقدار کم ہوتی ہے۔ غلطی یہاں سے لگتی ہے کہ لوگ اراضی سلطانیہ کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی غیر آباد زمین پڑی ہوئی ہے وہ حکومت کی ملکیت ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ زمین کی ملکیت اور مالکانہ حقوق تو نہیں دیئے لیکن زمین کی منفعت دیدی کہ زمین تو سرکار کی ہے تم اس میں معین مدت تک کاشت کر کے پیسے حاصل کر سکتے ہو، یہ دوسری قسم سے بھی اضعف ہے۔ اس پر بھی وہ ساری حدود وقیود عائد ہیں جو دوسری قسم پر تھیں اور یہ کام بھی بڑے پیمانہ پر نہیں ہوسکتا اس کی تعداد بھی محدود رہے گی۔

اور **چوتھی صورت** جو یورپ وغیرہ میں تھی کہ خراج وصول کرنے کا مالک بنا دیا، اسلام میں یہ جائز نہیں جب تک کہ مقطع لہ یعنی جاگیردار مستحق زکوٰۃ نہ ہو۔ اگر وہ مستحق زکوٰۃ ہے تب یہ کہہ سکتے ہیں کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا لیکن اگر وہ مستحق زکوٰۃ نہیں ہے تب یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تم فلاں زمین کا عشر وصول کرنا کیونکہ عشر کا مصرف مستحقین زکوٰۃ اور فقراء ہیں۔

فرض کریں اگر کسی کو کہہ دیا کہ تم وہاں کا عشر وصول کرو اور وہ مستحق زکوٰۃ تھا، جونہی وہ عشر وصول کرنے کے بعد صاحب نصاب بنا، اگلے سال اس کو عشر وصول کرنے کا حق نہیں رہے گا، تو یہ جاگیر چل ہی نہیں سکتی۔

پہلی تین قسمیں ہوسکتی ہیں، ان میں سے دو قسمیں بڑی محدود ہیں۔ اگر زیادہ بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہے تو پہلی قسم ہے یعنی ارض موات۔

لہٰذا اسلام میں جو زیادہ تر زمین دی گئی وہ ارض موات ہی تھی اور اس میں اس بات کی پابندی تھی کہ تین سال کے اندر اندر خود آباد کریں۔

یہاں ایک بات اور سمجھ لیں کہ ارض موات کو یا تو آدمی خود کاشت کر کے آباد کرے یا مزدوری کے

ذریعہ اجرت پر کرایہ پر دے تو ٹھیک ہے، لیکن اگر کسی نے جس کو ارض موات دی گئی تھی، خود کاشت کرنے یا اپنے مزدوروں سے کاشت کرانے کے بجائے وہ زمین مزارعت پر دے دی، بٹائی پر دے دی، اور کاشتکاروں سے کہا کہ تم اس کو آباد کرو جو کچھ پیداوار ہوگی، وہ میرے اور تمہارے درمیان تقسیم ہوگی تو یہ عقد مزارعت فاسد ہے۔

اس لئے کہ یہ عقد مزارعت کے لئے ضروری ہے کہ آدمی زمین کا مالک ہو، پھر کاشت کار سے عقد مزارعت کرسکتا ہے۔ ابھی جب کہ زمین آباد نہیں ہوئی تو وہ اس کا مالک نہیں بنا اور جب مالک نہیں بنا تو عقد مزارعت کیسا؟

لہٰذا اس صورت میں جو کاشت کار کام کر کے آباد کرے گا وہی اس کا مالک بن جائے گا۔ جاگیر دار مالک نہیں بنے گا جو کاشت کار عملاً کام کرے گا **"من احییٰ أرضا میتاً فھی لہ"** کے اصول کے مطابق وہی مالک بنے گا، جاگیردار اس صورت میں فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ جب وہ خود آباد کرے یا اجرت دے کہ مزدوروں سے آباد کرائے ورنہ مالک نہیں بنے گا۔

یہ نظام صدیوں سے مسلمانوں کے اندر جاری رہا اور اس کے نتیجے میں بڑی بڑی زمینیں لوگوں کے پاس آئیں، لیکن اس قسم کا کوئی مفسدہ پیدا نہیں ہوا جو جاگیرداری نظام کے مفاسد میں شمار کیا جاتا ہے بلکہ اس سے فائدہ ہوا ہے کہ غیر آباد زمینیں آباد ہوئیں، ملکی پیداوار میں اضافہ ہوا، لوگوں کو روزگار ملا اور عشر وخراج کی مقدار زیادہ ہوئی جس سے فقراء اور مساکین کو فائدہ پہنچا۔

اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ان جاگیرداروں نے کوئی سیاسی یا معاشی تسلط حاصل کر کے امراء اور خلفاء کو اپنے فیصلوں کا تابع بنایا ہو اور اپنی جاگیروں کو فساد کا ذریعہ بنایا ہو۔

اس لئے اسلام میں عطاء جاگیر کا جو تصوّر رہے وہ اس عطاء جاگیر سے بالکل مختلف ہے جو یورپ میں شروع ہوا اور بعد میں ایشیاء میں پھیلا۔ البتہ پاکستان، ہندوستان اور برصغیر میں چونکہ مدتوں تک انگریز کا تسلط اور انگریز کے اثرات رہے، اس وجہ سے اس میں کوئی شک نہیں یہاں بعض علاقوں میں اس قسم کا جاگیرداری نظام رائج رہا جو یورپ میں تھا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سرداری نظام میں بھی اسی قسم کے نظام کے باقی ماندہ اثرات ہیں جن کو ختم کرنا ضروری ہے۔

انگریزوں کی عطا کردہ جاگیریں

انگریز کے زمانے میں لوگوں کو بہت سی ایسی جاگیریں عطا کی گئی جو اسلام میں پہلی قسم کی ہیں یعنی بنجر زمین کے مالکانہ حقوق کے ساتھ دی گئیں۔

اس کے دو پہلو ہیں:

بعض مرتبہ وہ اراضی بطور رشوت دی گئیں اور رشوت بھی مسلمانوں سے غداری کرنے پر جس وقت مسلمان انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے جدو جہد میں مصروف تھے۔ انگریز نے مسلمانوں میں ہی کچھ لوگوں کو ان کا جاسوس مقرر کر رکھا تھا۔ وہ مسلمانوں سے غداری کر کے انگریز کو خبریں پہنچایا کرتے تھے کہ فلاں لوگ آپ کے خلاف یہ سازش کر رہے ہیں۔ انگریز کے ہاں اس جاسوسی کی بڑی قیمت تھی۔ اس غداری کے نتیجے میں بطور رشوت یا بطور اجرت (اسلامی نقطہ نظر سے وہ رشوت ہی ہے کیونکہ وہ مسلمانوں سے غداری کی اجرت ہے) ان کی زمینیں اور جاگیریں دی گئیں۔

غداری کے عوض حاصل کردہ جاگیروں کا حکم؟

اس طرح غداری کے عوض جو زمینیں یا جاگیریں دی گئیں شرعاً ان کا جاگیرداروں کو اپنے پاس رکھنا جائز ہی نہیں، اس لئے کہ معقود علیہ غداری ہے، لہٰذا اس کی اجرت میں جو کچھ ملا وہ بھی حرام ہے ان کے لئے ان کو اپنے پاس رکھنا بھی حرام ہے۔

البتہ اگر انہوں نے ان زمینوں کو آباد کر لیا ہو تو ان پر ان کی ملکیت ثابت ہو جائے گی یا نہیں؟ یہ بات محل نظر ہے۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک احیاء سے ملک تب آتی ہے جب حکومت نے اس کی اجازت دی ہو اور یہاں جو اجازت دی گئی وہ چونکہ غداری کے صلے میں ملی تھی، اس لئے اس کا معتبر ہونا محل نظر ہے۔

انگریز حکومت کی طرف سے کسی خدمت کے صلے میں دی گئی جاگیر کا حکم

جو جاگیریں غداری کے نتیجے میں نہیں، بلکہ کسی خدمت کے عوض دی گئیں وہ صحیح ہیں، لیکن اس میں اسلامی اعتبار سے شرط یہ ہے کہ جاگیردار نے اس کو اسلامی طریقہ سے آباد کر لیا ہو۔ اگر اس نے آباد کر لیا، چاہے خود کیا ہو یا مزدوروں سے آباد کرالیا ہو تو اس کی ملکیت صحیح ہو گئی لیکن اگر آباد نہیں کیا تو جتنے حصے کو آباد نہیں کیا وہ اس کی ملکیت میں نہیں آیا۔

سرحد اور پنجاب کے شاملات کا حکم

سرحد اور پنجاب کے شاملات کے علاقے اسی قسم کے ہیں انگریز نے نام لکھ دیئے کہ فلاں کے لئے ہے

لیکن ان لوگوں نے اس میں آباد کاری کا کوئی کام نہیں کیا، اس لئے وہ ان کی ملکیت میں نہیں آئی لیکن جن کو آباد کرلیا وہ ان کی ملکیت میں آگئیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

ہمارے دور میں بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ دوسری قسم بھی ملکیت میں نہیں آتی (جن کو آباد کرلیا ہو) اس کی دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں۔ انگریز کے قبضے سے پہلے مسلمانوں کی حکومت تھی اس لئے ساری زمینیں مسلمانوں کی تھیں۔ انگریز نے جو قبضہ کیا وہ ناحق تھا۔ جب قبضہ ناحق تھا تو کسی کو جاگیر دینے کا بھی کوئی حق نہ تھا۔ اگر کسی کو دے گا تو وہ اس کا مالک نہیں بنے گا۔

لیکن درحقیقت یہ دلیل درست نہیں، یہ جذباتی دلیل ہے فقہی دلیل نہیں، اس لئے کہ فقہ کا مسلمہ اصول ہے۔ اس طور پر حنفیہ کے نزدیک کہ اگر مسلمانوں کی زمینوں پر کافروں کا استیلاء ہو جائے تو کافر اس کے مالک بن جاتے ہیں۔ استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے اصول الشاشی وغیرہ میں اشارۃ النص کی مثال ہے **"للفقراء الذین أخرجوا من دیارهم"** قرآن کریم نے ان فقراء کو جو مکہ مکرمہ میں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے، فقراء قرار دیا۔ اس واسطے کہ ان کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں حالانکہ وہاں بڑی بڑی جائیدادیں چھوڑ کے آئے تھے جن پر مشرکین قابض ہو گئے تھے۔

معلوم ہوا کہ مشرکین کے اس قبضے کو اسلام نے تسلیم کر کے یہ کہہ دیا کہ یہ ان کی ملکیت سے نکال گئیں۔ تو استیلاء کفار موجب ملک ہوتا ہے۔ انگریز جب پاکستان اور ہندوستان کی اراضی پر قابض ہوا تو وہ اراضی اس کی ملکیت میں آگئیں۔ اب وہ جس کو دیں وہ اس کا مالک ہو جائے گا جب کہ مشروع طریقہ سے دینا ہو، بطور رشوت یا غداری کی اجرت کے طور پر نہ ہو، اور یہ جو زمین اور جاگیریں ہیں ان میں دونوں قسم کی ہیں۔ بعض وہ ہیں جو غداری کے صلے میں دی گئی ہیں اور بعض وہ ہیں جو صحیح خدمات کے صلے میں دی گئی ہیں۔

کیا انگریزوں کی عطا کردہ سب جاگیریں غلط ہیں؟

لہٰذا یہ بات جو کہی جاتی ہے کہ انگریزوں نے جتنی جاگیریں دی ہیں سب غلط ہیں سب سے واپس لینی چاہئے، یہ بات شرعی اعتبار سے بھی درست نہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ گیہوں کے ساتھ گھن کو بھی پیس دیا جائے جو جائز طریقے سے مالک بنے ہیں ان کو محروم کر دیا جائے یہ بات درست نہیں۔

ہمارے ملک کی تمام سیاسی پارٹیوں نے ان احکام کو مدنظر رکھے بغیر بلا استثنا یہ کہہ دیا کہ یہ زمینیں سب سے واپس لے لی جائیں گی، چاہے یہ بات دینی جماعتوں نے کہی ہو یہ بات شرعی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے

بلکہ اس تفصیل کے مطابق واپس لینا درست ہوگی کہ جن کے بارے میں یہ بات ثابت ہو جائے کہ انہوں نے غداری کر کے حاصل کی ہیں۔

یہ عجیب قصہ ہے کہ کہتے ہیں کہ سو ایکڑ چھوڑ دیں گے، باقی واپس لے لیں گے، پچاس ایکڑ چھوڑ دیں گے اور باقی واپس لے لیں گے۔

اگر حرام ہے تو پوری حرام ہے اور اگر حلال ہے تو پوری حلال ہے، اس میں سو ایکڑ اور پچاس ایکڑ کا کوئی معنی نہیں، اگر کسی نے غداری کے عوض لی ہے تو سو ایکڑ کیا ایک انچ زمین بھی اس کے پاس چھوڑنا حرام ہے۔ اور اگر کسی نے حلال طریقے سے حاصل کی ہے تو وہ ہزار ایکڑ ہو تب بھی اس کے لئے جائز ہے۔

اس واسطے جو سیاسی پروپیگنڈہ ہے اس کا فقہی اور شرعی احکام سے کوئی تعلق نہیں۔ حقیقت حال وہ ہے جو عرض کر دی گئی۔

مزارعت کا حکم

بعض لوگ جاگیری نظام کے مفاسد کا ذکر کرتے ہوئے مزارعت کو بھی اس کی لپیٹ میں لے کر کہتے ہیں کہ زمیندارانہ نظام بھی ختم کرنا چاہئے۔

حالانکہ زمیندارانہ نظام کی جو خرابیاں ہیں وہ درحقیقت زمیندارانہ نظام کی خرابیاں نہیں ہیں بلکہ افراد کے غیر شرعی طرز عمل کی خرابیاں ہیں۔

ہمارے بعض معاشروں میں خاص طور پنجاب یا سرحد کے بعض علاقوں میں یوں ہوتا ہے کہ زمیندار ناجائز شرطیں عائد کرتا ہے کہ ہم تم کو زمین کاشت کے لئے مزارعت پر دے رہے ہیں لیکن تمہیں فلاں فلاں شرطوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ ہماری بیٹی کی شادی ہوگی تو تمہیں اتنا غلہ فراہم کرنا ہوگا، ہمارے بچے کی ختنہ ہوگی تو تمہیں اتنا گھی لا کر دینا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ اور بیگار یعنی ایسی محنت جس کا کوئی صلہ نہیں وہ ان پر عائد کی جاتی ہے۔ مثلاً ہم کوٹھی بنا رہے ہیں۔ ہمارے گھر کی تعمیر کرو، کوئی صلہ یا اجرت نہیں۔ تو اس قسم کی باتیں ہیں جو ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اس نے زمیندارانہ نظام کو خراب کر دیا ہے۔

دوسرا یہ کہ مزارع کا سماجی رتبہ بہت فروتر بنایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ پنجاب میں اس کو کمّی کہتے ہیں۔ کمّی کے معنی ہیں کمینہ، تو کاشت کار کا نام کمّی ہے کہا جاتا ہے کہ یہ تو ہمارا کمّی ہے۔ اس کو حقیر اور ذلیل سمجھ کر اس کی بے عزتی کی جاتی ہے یہ سب باتیں ناجائز اور حرام ہیں نفس مزارعت کے اندر کوئی خرابی نہیں اگر دو آدمیوں کے درمیان برادری کی بنیاد پر معاملہ ہو جیسا کہ دو شریکوں کے درمیان معاملہ ہوتا ہے۔ خرابی ان شرائط فاسدہ کی وجہ سے ہے۔ ان شرائط فاسدہ کو دور کرنا چاہئے۔

سودی رہن رکھنا

ان مفاسد کے علاوہ ایک بہت بڑا رواج سودی رہن کا ہے کہ قرضہ دیا اور زمین رہن رکھ لی۔ قرض دینے والا اس میں کاشت کر رہا ہے اور قرضے سے کئی گناہ زیادہ اس زمین سے وصول کر چکا لیکن پھر بھی زمین نہیں چھوڑ رہا۔

اس قسم کے بعض مسائل ہیں جنہوں نے ہمارے نظام اراضی کو خراب کیا ہے۔ اور اشتراکیت کا جو پروپیگنڈہ ہے کہ زمین داری نظام ہی غلط ہے، اس سے مرعوب ہونے کے بجائے نظام اراضی کی اصلاح کا جو صحیح طریقہ شریعت نے مقرر کیا ہے وہ اختیار کرنا چاہئے۔

سوال: اندرون سندھ میں حکومت پاکستان کی طرف سے ہاریوں میں زمینیں تقسیم کی جاتی ہیں۔ جب حکومت بدلتی ہے تو نئی حکومت ان زمینوں کو دوبارہ ضبط کر لیتی ہے اور اپنے بعض حامیوں کو دیدیتی ہے۔ نیز بعض دفعہ بنجر زمینیں بھی ہوتی ہیں، جن کو سلطان نے آباد نہیں کیا آیا ایسی زمینیں دینا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جب حکومت بنجر زمین دے رہی ہے تو اس کو لینا اور آباد کرنا جائز ہے اور آباد کرنے سے وہ مالک ہو جائے گا۔ اس کے بعد اگر دوسری حکومت واپس لے گی تو اس کے لئے وہ لینا شرعاً جائز نہیں۔ ہم نے سپریم کورٹ میں یہ فیصلہ دیدیا ہے کہ اگر کسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے تو وہ عدالت میں دعوی کر کے واپس لے سکتا ہے۔[۱۸]

زمین کی وراثت کا مسئلہ

ایک اہم بات یہ ہے کہ ہمارے نظام اراضی میں ایک بہت بڑا فساد وراثت کے جاری نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ خاص طور پر پنجاب میں وراثت کے شرعی احکام زمینوں پر جاری نہیں کرتے۔ بیٹیوں کو زمینوں میں کبھی حصہ نہیں ملتا۔

تو زمینوں میں وراثت کے جاری نہ ہونے کے نتیجے میں زمینوں میں ارتکاز پیدا ہو گیا ہے۔ اگر وراثت کے شرعی احکام جاری ہوتے تو کبھی بھی اتنے بڑے بڑے رقبے ایک آدمی کی ملکیت نہ رہتے۔ سوڈیڑھ سو سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر اس میں وراثت جاری ہوئی ہوتی تو آج کسی کے پاس ایک ایک ہزار ایکڑ رہنے کا تصور بھی نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بخود تقسیم ہو جاتی۔

آج بھی اگر کوئی اسلامی حکومت آئے تو اس پر واجب ہے کہ اس دن سے وراثت کے احکام جاری کرے اس لئے کہ جن لوگوں کے حقوق ختم کئے گئے، زائل کئے گئے یا مارے گئے ہیں، اس کے حقوق مرور ایام

---

۱۸ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں ''عدالتی فیصلے'' جلد دوم صفحہ ۱۵ تا ۲۰۱۔

سے ضائع نہیں ہوئے، اس لئے اس دن سے وراثت جاری ہوگی۔ اگر ایسا ہو جائے تو آپ دیکھیں کہ آج کسی کے پاس ایک ہزار ایکڑ تو درکنار، پانچ سو ایکڑ بھی نہیں ہوگی۔

اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید ملکیت نہیں کی، اس واسطے کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید کی جاتی ہے وہ کبھی نہیں چلتی۔ یہ تحدید ایوب خان نے کی، پھر بھٹو صاحب نے کی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کرنے والوں نے یہ کیا کہ ٹھیک ہے بھائی، پہلے یہ ہوا تھا کہ ایک ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہو سکتی تھی۔ اب جس کے پاس پانچ ہزار ایکڑ ہے اس نے چار ہزار ایکڑ اپنے ان چار ہاریوں کے نام کر دیں جن بے چاروں کو پتہ تک نہیں کہ یہ ان کے نام ہے، ان سے کہا گیا کہ یہاں انگوٹھا لگا دیں۔ انہوں نے انگوٹھا لگا دیا کہ میں نے ایک ہزار ایکڑ وصول کر لی۔ اب وہ اس کے نام پر آ گئی۔ نام بدل گئے لیکن ہے وہ پانچ ہزار اسی کی۔

بھٹو صاحب مرحوم نے سو ایکڑ تک کی تحدید کر دی۔ اس نے دس ہاریوں کے نام کر دی۔ تو اس کے پاس تو پانچ ہزار ایکڑ ہی رہی لیکن نام بدل گئے۔ تو گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے جو تحدید ہوتی ہے وہ سوائے فراڈ کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اسلام نے گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تحدید نہیں کی لیکن نظام ایسا بنایا ہے کہ مآل کار کوئی آدمی زیادہ رقبہ کا مالک نہیں رہ سکتا۔

جب میراث جاری ہوگی تو ایک آدمی کے انتقال سے ایک رقبۂ زمین آٹھ دس حصوں میں تقسیم ہو جائے گی اور اس کا بھی انتقال ہو گیا تو اور زیادہ تقسیم ہو جائے گی۔ تو اس طرح کبھی بڑا رقبہ ایک آدمی کی ملکیت نہیں رہ سکتا جس کے نتیجے میں وہ مفاسد جو آج پیدا ہو رہے ہیں یہ پیدا نہیں ہوں گے۔

آج شریعت کے احکام پر کوئی عمل نہیں کرتا اور کہتے ہیں کہ گزوں اور ایکڑوں کے حساب سے تقسیم کر دو اور باقی چھین لو، جس کا نہ شرعی جواز ہے اور نہ ہی یہ مسئلہ کا صحیح حل ہے۔

سوال: اگر ایک حکومت سے کم قیمت میں یا ناجائز طریقہ سے کوئی زمین حاصل کرے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اس کا حاصل یہ ہے کہ ہر زمین کی سرکاری طور پر کچھ قیمت متعین ہوتی ہے۔ اگر امام سرکاری قیمت کے مطابق دے تو یہ جائز ہے۔ بشرطیکہ وہ بازار کی زمینوں سے غبن فاحش نہ ہو۔

لیکن اگر غبن فاحش ہے تو غبن فاحش کے ساتھ کسی کو دینا درست نہیں ہے۔ امام کو حق نہیں ہے کہ بیت المال کی زمین سے کسی کو غبن فاحش کے ساتھ سستی قیمت پر دیدے۔ اگر دیگا تو وہ ناجائز ہوگا اور اگر کسی نے رشوت کے طور پر لی ہے تو وہ بطریق اولیٰ ناجائز ہے، جائز نہیں۔

سوال: انگریز نے لوگوں کو جو زمینیں دی ہیں، یہ تقریباً ایک صدی قبل کا واقعہ ہے اور انگریز رخصت ہو چکا ہے۔ آج کے دور میں اس عطاء کے گواہ اور ریکارڈ بھی نہیں ہے؟

جواب: میں نے ذاتی طور پر اس کی تحقیق کی ہے۔ ایک ایک زمین اور ایک ایک چپہ کا ریکارڈ موجود

ہے، لہٰذا یہ کہنا غلط ہے کہ ریکارڈ نہیں ہے، کس کو دی گئی؟ اصلاً کس کے نام ہے اور کس کو منتقل ہوئی؟ سب کچھ موجود ہے۔ ویسے انگریز کا نظام حکومت بڑا زبردست تھا۔ ہمارے ہاں ہندوستان و پاکستان میں جو زمینیں تھیں، مغلیہ دور میں ان کا باقاعدہ منظم ریکارڈ نہیں تھا۔ انگریز نے آکر اس کے ایک ایک چپہ کا ریکارڈ بنادیا اس کے ریکارڈ کے دو طریقے ہیں:

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بندوبست کے دفاتر میں ریکارڈ موجود ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس نے کتابیں لکھ کر چھاپ دیں۔ ہر ضلع اور ڈویژن کا ریکارڈ لکھ دیا، یہ چھپی ہوئی کتابیں موجود ہیں۔ میں جس زمانے میں اس کی تحقیق کر رہا تھا، ہزارہ کے ایک گاؤں کا مسئلہ تھا اس موضوع پر مجھے فیصلہ لکھنا تھا اس لئے مجھے تحقیق کرنی پڑی اس وقت دیکھا کہ انگریز نے انتظام کے اندر کیا کمال دکھایا ہے اس نے ایک ایک گاؤں، ایک ایک گلی، ایک ایک رقبہ کا ریکارڈ بنایا ہے نہ یہ کہ صرف دفتروں میں ہے بلکہ کتابوں کی شکل میں چھاپ کے رکھ دیا ہے اور وہاں کے جو رسم ورواج تھے سارے تفصیل سے لکھ کر چلا گیا ہے کہ فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا، فلاں علاقہ میں یہ رواج تھا وغیرہ۔

پہلے یہ تھا اور اب یہ ہے کہ فلاں تاریخ سے فلاں تک یہ رواج رہا۔ یہ ہوا وہ ہوا وہ سب لکھ کر چلا گیا۔ اس واسطے یہ ریکارڈ نکالنا مشکل نہیں ہے اگر حکومت ایک اراضی کمیشن بنادے کہ بھائی تم چھان بین کرو تو کوئی دشواری نہیں ہے، بڑے آرام سے نکل آئے گا اور اطمینان سے اس کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اور میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو بھی چھوڑ دو، صرف وراثت کے احکام جاری کردو۔ پھر دیکھو ان بڑے بڑے رقبوں کا کیا بنتا ہے۔

(۱۶) باب حلب الإبل علی الماء

۲۳۷۸ ـ حدثنا ابراهيم بن المنذر: حدثنا محمد بن فليح قال: حدثني أبي عن هلال ابن علي، عبد الرحمٰن بن أبي عمرة عن أبي هريرة ﷺ، عن النبي ﷺ قال: "من حق الإبل أن تحلب علی الماء". [راجع: ۱۴۰۲]

اونٹوں کا حق یہ ہے کہ کسی پانی پر ان کا دودھ نکالا جائے یعنی کسی کنویں وغیرہ کے پاس لے جا کر دودھ نکالا جائے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جو بیچارے فقراء ومساکین ہیں ان کو پتہ ہوتا ہے کہ دودھ نکالا جائے گا تو وہ وہاں آجاتے ہیں، تو کچھ دودھ ان کو بھی دے دیا جائے۔

یہ حکم استحبابی ہے تا کہ لوگوں سے مواسات و ہمدردی ہو اور غریبوں کو دودھ دیا جائے۔

(۱۷) باب الرجل یکون له ممر أو شرب فی حائط أو فی نخل؟

وقال النبی ﷺ "من باع نخلاً بعد أن تؤبر فثمرتها للبائع ، و للبائع الممرو السقی حتی یر فع و کذٰلک ربی العریة".

گزرگاہ کا حق

یہ باب قائم کیا ہے کہ کسی شخص کو گزرنے کا حق ہو یا کسی باغ یا نخلستان میں آب پاشی کا حق ہو یعنی یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جس طرح باغ یا نخلستان کی ملکیت ہوتی ہے اور وہ شرعاً معتبر ہے۔کیا اسی طرح باغ اور نخلستان کے اندر کسی کو گزرگاہ کا حق ملا ہوا ہے یا کسی کو پانی لینے کا حق حاصل ہے، تو وہ بھی شرعاً معتبر ہے؟ اگر چہ وہ اصل زمین و باغ کا مالک نہیں ہے لیکن اس کو حق ہے کہ نخلستان میں سے گزر جائے یا اس سے پانی لے کر آب پاشی کرے، یہ حق بھی شرعاً معتبر ہے۔

استدلال میں یہ حدیث پیش کی ہے **"وقال النبی ﷺ من باع نخلاً بعد ان تؤبر الخ"** یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ اگر کسی شخص نے نخل یا کھجور کا درخت تأبیر کے بعد بیچا تو اس کا ثمرہ بائع کا ہوگا یعنی نخلستان بیچا تو اس کا ثمرہ بائع کا ہے۔مطلب یہ ہے کہ زمین اور نخل پر تو مشتری قابض ہوگا لیکن لگا ہوا پھل بائع کا ہوگا تو جب پھل بائع کا ہوگا تو وہ اس کو حاصل کرنے کے لئے اندر جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ اندر جانے اور گزرنے کا حق ہے تاکہ وہ اپنا پھل وہاں سے اتار سکے۔ **"و للباع الممرو السقی حتی یر فع".**

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے پتہ چلا کہ بائع کو راستہ کا حق حاصل ہوگا کہ وہ وہاں جا کر پھل اتارے اور اس درخت کو سیراب کرنے کا حق بھی حاصل ہوگا، یہاں تک کہ پھل نکال لیا جائے۔

"وکذلک رب العریة" کہتے ہیں کہ اسی طرح عرایا کے اندر بھی جب مالک نے درخت کسی فقیر کو عاریتاً دیدیا تو اب وہ فائدہ اسی وقت اٹھا سکے گا جب وہ باغ کے اندر جائے اور پھل توڑے تو اس کو بھی اندر جانے، پھل توڑنے اور درخت کو سیراب کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

عرایا کے جواز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رب العریہ کو نخلستان میں ممر کا حق حاصل ہے۔اب اس کی مناسبت سے یہاں عرایا کی حدیثیں روایت کی ہیں۔

۲۳۷۹۔أخبرنا عبداللہ بن یوسف حدثنا اللیث : حدثنی ابن شھاب، عن سالم بن عبد اللہ، عن أبیه ؓ قال : سمعت رسول اللہ ﷺ یقول : "من ابتاع نخلا بعد أن تؤبر فثمرتها للبائع إلا أن یشترط المبتاع ، ومن ابتاع عبدا وله مال فماله للذی باعه إلا

أن يشترط المبتاع". [راجع: ۲۲۰۳] [۱۹]

"وعن مالک، عن نافع، عن ابن عمر عن عمر فی العبد".

پہلی حدیث میں جو پہلا جزو ہے **"من ابتاع نخلا بعد ان تؤبر"** اس پر پیچھے کلام گزر گیا ہے۔

دوسرا جزو ہے **"ومن ابتاع عبدا وله مال فماله للذی باعه إلا أن يشترط المبتاع"** یہ وہاں پرنہیں آیا تھا اس لئے اس کی تھوڑی تفصیل سمجھ لیں۔

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جوشخص کوئی غلام خریدے اور غلام کے پاس کچھ مال ہوتو وہ بائع کا ہوگا **"إلا أن يشترط المبتاع"** الا یہ کہ مشتری شرط لگائے کہ میں عبد کے ساتھ اس کا مال بھی لوں گا۔

صورت مسئلہ یہ ہے کہ ایک مولیٰ نے اپنے عبد کو **"ماذون فی التجارة"** بنایا ہوا ہے۔ وہ تجارت کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کے پاس کچھ مال ہے۔

جمہور کے نزدیک غلام جو کچھ بھی کمائی کرتا ہے وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ مولیٰ کی ملکیت ہوتی ہے لیکن غلام کے قبضے میں ہوتی ہے۔ اب مولیٰ نے غلام بیچا اور اس کے قبضے میں کچھ مال یا نقد پیسے ہیں جو تجارت سے حاصل ہوئے، اس نے کوئی عالیشان لباس یا کوئی قیمتی ٹوپی پہنی ہوئی ہے اور اگر جاریہ ہے تو اس کے اوپر زیور ہے، یہ سارا مال بیع کی صورت میں بائع کا ہوگا البتہ اگر مشتری یہ شرط لگالے کہ میں اس غلام کو اس مال سمیت خرید رہا ہوں جو اس کے قبضے میں ہے تو پھر عبد کی بیع مال کے ساتھ ہو جائے گی۔

عبد کی بیع میں عبد کے مال کی شرط کے بارے میں اختلاف ائمہ

مالکیہ کا قول

امام مالک رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم عام ہے یعنی اس عبد کے قبضے میں جس قسم کا مال بھی ہے۔ اگر مشتری نے بیع میں شرط لگالی کہ وہ میرا ہوگا تو یہ بغیر قید کے یہ شرط لگانا جائز ہے یعنی امام مالکؒ اس حدیث کے ظاہر پر اس کے عموم کے ساتھ عمل کرتے ہیں۔

---

[۱۹] وفی صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب من باع نخلا علیها ثمر، رقم: ۲۸۵۱ - ۲۸۵۴، وسنن الترمذی، کتاب البیوع عن رسول اللہ، باب ماجاء فی ابتیاع النخل بعد التأبیر والبد وله مال، رقم: ۱۱۶۵، وسنن النسائی، کتاب البیوع، باب النخل یباع أصلها ویستثنی المشتری ثمرها، رقم: ۴۵۵۲، وسنن أبی داؤد، کتاب البیوع، باب فی العبد یباع وله مال، رقم: ۲۹۷۷، وسنن ابن ماجة، کتاب التجارات، باب ماجاء فیمن باع نخلا مؤبراً أو عبداً له مال، رقم: ۲۲۰۲، ومسند أحمد، مسند المکثرین من الصحابة، باب مسند عبداللہ بن عمر بن الخطاب، رقم: ۴۳۲۴، ۵۲۸۱، ۶۰۹۱، وسنن الدارمی، کتاب البیوع، باب فیمن باع عبداً وله مال، رقم: ۲۴۴۸.

شافعیہ کا قول

شافعیہ کہتے ہیں کہ یہ شرط اس صورت میں جائز ہے کہ جب ثمن اس جنس سے نہ ہو جس جنس کا عبد کے پاس مال ہے یعنی اگر عبد کے پاس سونا ہے اور قیمت دراہم یا چاندی سے مقرر کی ہے تو یہ عقد جائز ہے لیکن اگر قیمت سونے سے مقرر کی ہے تو پھر یہ عقد جائز ہی نہیں ہوگا۔

حنفیہ کا مسلک

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ثمن خلاف جنس سے ہے جیسے عبد کے پاس سونا ہے اور ثمن چاندی ہے تب تو امام مالک رحمہ اللہ والی بات ہے کہ مطلقاً جائز ہے بشرطیکہ یداً بید ہو، نسیئاً نہ ہو۔

لیکن اگر ثمن بھی اسی جنس سے ہو جس جنس کا عبد کے پاس مال ہے مثلاً عبد کے قبضے میں سونا ہے اور قیمت دینار سے مقرر کی گئی تو حنفیہ کے نزدیک اس بیع کے جواز کی شرط یہ ہے کہ ثمن میں جو سونا ہے اس کی مقدار عبد کے قبضے میں موجود سونے سے زیادہ ہو۔ مثلاً عبد کے پاس دس تولہ سونا ہے تو قیمت گیارہ تولہ سونا مقرر کی۔ اس صورت میں قیمت کے دس تولہ سونا، عبد کے پاس موجود دس تولے سونے کے مقابلے میں ہو جائیں گے اور ایک تولہ سونا عبد کے مقابلے میں ہو جائے گا۔

اور اگر ثمن کا سونا عبد کے قبضے میں موجود سونے کے وزناً مساوی ہو تو پھر یہ بیع جائز نہیں، مثلاً اس کے پاس دس تولہ سونا ہے اور قیمت بھی دس تولہ مقرر کی تو یہ بیع جائز نہیں۔ اس لئے کہ دس تولہ، دس تولہ سونا کے مقابلے میں آگیا اور عبد کے مقابل میں کچھ نہ رہا، لہٰذا بیع جائز نہیں۔

اور اگر قیمت میں جو سونا ہے وہ عبد کے قبضے میں موجود سونے سے کم ہے تو یہ بطریق اولیٰ ناجائز ہوگا۔ ان شرائط کے بغیر بیع جائز نہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ حدیث باب کے عموم سے استدلال کرتے ہیں کہ **"إلا أن يشترط المبتاع"**.

حنفیہ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے یہاں صرف اتنا بتایا کہ اس کی بیع جائز ہے لیکن ظاہر ہے کہ بیع شرائط معہودہ کے ساتھ جائز ہوگی۔ یہ مطلب نہیں کہ جو شرائط ہیں ان کو نظر انداز کر کے بھی بیع جائز ہو جائے گی۔

اگر عبد کے پاس جو مال ہے وہ مال ربویہ میں سے ہے تو اس پر اموال ربویہ کے احکام جاری ہوں گے اور اگر سونا چاندی ہے تو صرف کے احکام جاری ہوں گے، لہٰذا تقابض فی المجلس شرط ہوگا۔[۲۰]

---

۲۰ والتفصيل في : كتاب الفقه على المذاهب الأربعة ، ج : ۲ ، ص : ۲۹۳ ، وتكملة فتح الملهم ، ج : ۱ ، ص : ۴۲۶ ، و فتح الباري ، ج : ۵ ، ص : ۳۸ ، واعلاء السنن ، ج : ۱۴ ، ص : ۳۹ ، والمغني ، ج : ۴ ، ص : ۱۹۰ – ۱۹۱ ، وعمدة القاري ، ج : ۸ ، ص : ۵۰۹ ، ۵۱۰.

کمپنی کے شیئرز کا مسئلہ

اس مسئلہ سے ہمارے دور کا ایک مسئلہ متعلق ہے اور وہ ہے کمپنی کے شیئرز کا مسئلہ۔

کمپنی اور شیئرز

کمپنی اسے کہتے ہیں کہ بہت سارے لوگ مل کر کوئی کاروبار شروع کرتے ہیں۔ ایک کاروبار کے اندر ہزار ہا افراد پیسے لگاتے ہیں اور جو کوئی پیسہ لگاتا ہے اس کو ایک سرٹیفکیٹ دیدیا جاتا ہے کہ تمہارا اس کاروبار میں اتنا حصہ ہے اس کو شیئر کہتے ہیں۔ اردو میں حصہ اور عربی میں سہم کہتے ہیں۔

بعد میں ان شیئرز کی بازار میں خرید وفروخت ہوتی ہے۔ اس خرید وفروخت پر یہ احکام منطبق ہوتے ہیں، اس لئے کہ کسی بھی کمپنی کا جو شیئر ہوتا ہے وہ درحقیقت حامل حصہ کی کمپنی کے اثاثوں میں متناسب ملکیت سے عبارت ہے۔ فرض کریں پی آئی اے کا ایک شیئر دس روپے کا ہے، میرے پاس سو روپے کے دس شیئرز ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پی آئی اے کی جتنی املاک ہیں، جتنے اثاثے ہیں، ان کا جو بھی سو روپے کا حصہ بنتا ہے مثلاً اگر اس کی املاک ایک ارب کی ہیں تو کروڑ واں حصہ سو روپے کا بنے گا، تو معنی یہ ہے کہ میں پی آئی اے کے تمام اثاثوں اور املاک کے کروڑ ویں حصہ کا مالک ہوں اور یہ ملکیت مشاع ہوتی ہے، **"علی سبیل الشیوع"** ہوتی ہے۔

اب املاک مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ مثلاً جہاز، عمارتیں اور فرنیچر وغیرہ، یہ تو عروض کے قبیل میں سے ہیں۔ اسی طرح پی آئی اے کی املاک میں نقد پیسہ بھی ہے جو اس نے بینک میں رکھا ہوا ہے۔ اس کے دیون بھی ہیں جو دوسروں سے واجب الوصول ہیں اور دیون کا حکم بھی وہی ہے جو نقود کا ہے۔

اس طرح ہر حصے کے اندر کچھ اجزاء عروض ہوتے ہیں، کچھ نقود اور کچھ دیون۔ جب میں کوئی حصہ بیچوں گا تو اس کا مطلب ہوگا کہ پی آئی اے کے جو عروض ہیں، ان کا بھی ایک کروڑ واں حصہ بیچ رہا ہوں جو نقود اور دیون ہیں۔ ان کا بھی کروڑ واں حصہ بیچ رہا ہوں۔ اور جو اس مجموعہ کو خرید رہا ہے تو اس کے اوپر بھی وہی احکام عائد ہوں گے ہیں جو **"من باع عبداً وله مال"** کے ہیں۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب حصہ بیچا تو اس میں عروض، نقود اور دیون سب شامل ہیں، تو دیون اور نقود تبعاً اور ضمناً ملے ہیں، اصلاً نہیں ہیں، لہٰذا اس میں یہ تدقیق کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ نقود کتنے ہیں اور دیون کتنے ہیں اور قیمت کیا مقرر ہو رہی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے اصول کا مقتضی یہ ہے کہ شیئرز کو نقد کے معاوضے میں خریدنا جائز ہی نہیں ہونا

چاہیئے۔ اس واسطے کہ ہر کمپنی کے اندر کچھ نہ کچھ نقود بھی ہوتے ہیں۔ اب اگر روپے موجود ہیں تو روپے کو روپے کے بدلے خریدنا جائز نہیں ہوتا جب کہ وہ مرکب ہو۔

اگر کوئی چیز اموال ربویہ اور اموال غیر ربویہ سے مرکب ہے تو اس کو ہم جنس سے خریدنا جائز نہیں ہوتا، لہٰذا ان کے نزدیک شیئرز کو نقد سے خریدنا جائز نہیں ہوگا۔ ہاں کسی اور چیز سے خرید سکتا ہے، مثلاً کپڑے سے لیکن گندم سے ممکن نہیں۔

حنفیہ کے اصول کے مطابق یہ دیکھا جائے گا کہ ان شیئرز میں نقود دونوں کے حصے کا کیا تناسب ہے؟ یعنی ان شیئرز کے حصے میں کتنے نقود آئیں گے۔

فرض کریں کہ ہم نے جو تقسیم کیا تو پتہ چلا کہ سو روپے کے حصے میں پچاس روپے عروض کے مقابل ہیں اور پچاس روپے نقود دیون کے مقابل ہیں۔ اب اس حصے کو کم از کم اکیاون روپے میں خریدنا جائز ہوگا۔ اگر اکیاون روپے میں خریدا تو یہ کہیں گے کہ ایک روپیہ عروض کے مقابلے میں ہے، پچاس روپے نقود و دیون کے مقابلے ہیں اگر اس حصے کو پچاس روپے میں خریدیں تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ پچاس سے زائد میں جائز ہوگا۔ واللہ اعلم۔

عموماً شیئرز کی خرید وفروخت میں یہ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ قیمت اس کمپنی میں موجود دیون اور نقود سے کم مقرر کی جائے۔ عام طور سے زیادہ ہی ہوتی ہے۔ کمپنی بہت ہی دیوالیہ ہو جائے تب بھی جتنے نقود دیون ہیں اتنی قیمت تو لگ ہی جاتی ہے۔ اس لئے یہ بہت ہی شاذ صورت ہے کہ سو روپے کا حصہ انچاس روپے میں فروخت ہو جب کہ اس میں نقود دیون پچاس روپے ہیں۔

كتاب الإستقراض واداء الديون والحجر والتفليس

٢٣٨٥ - ٢٤٠٩

۴۳۔ کتاب الإستقراض وأداء الدیون والحجر والتفلیس

(۱) باب من اشتری بالدین ولیس عنده ثمنه أو لیس بحضرته

۲۳۸۵ ۔ حدثنا محمد بن یوسف هو البیکندی: أخبرنا جریر، عن المغیرة، عن الشعبی، عن جابر بن عبد اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنهما قال: غزوت مع النبی ﷺ فقال: کیف تری بعیرک؟ أتبیعه؟ قلت: نعم، فبعته إیاه فلما قدم المدینة غدوت إلیه بالبعیر فأعطانی ثمنه". [راجع: ۴۴۳]

کوئی شخص کوئی چیز خریدے اور ثمن کو اپنی ذمہ دین بنالے یعنی ثمن مؤجل ہو، اور اس وقت اس کے پاس ثمن نہ ہو "**لیس عنده ثمنه أو لیس بحضرته**" یعنی اس کے پاس ثمن ہے ہی نہیں یا اس وقت موجود نہیں ہے، مالک تو ہے لیکن بیع کے وقت اپنے پاس موجود نہیں ہے۔ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ یعنی مبیع بیچتے وقت بائع کی مملوک ہونا تو ضروری ہے لیکن مشتری کے لئے خریدتے وقت ثمن کا مملوک ہونا ضروری نہیں ہے۔

۲۳۸۶ ۔ حدثنا معلی بن أسد: حدثنا عبدالواحد: حدثنا الأعمش قال: تذاکرنا عند ابراهیم الرهن فی السلم فقال: حدثنی الأسود، عن عائشة رضی اللہ عنها: أن النبی ﷺ اشتری طعاما من یهودی إلی أجل ورهنه درعا من حدید. [راجع: ۲۰۶۸]

"سلم" سے یہاں اصطلاحی سلم مراد نہیں ہے بلکہ اس سے قرض اور دین مراد ہے۔ تو سوال کیا گیا تھا کہ "**تذاکرنا عند ابراهیم الرهن فی السلم**" ہم نے ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے پاس مذاکرہ کیا کہ سلم کے اندر رہن رکھنا جائز ہے یا نہیں؟ یعنی قرض کے اندر۔

انہوں نے یہ حدیث سنائی کہ حضور اقدس ﷺ نے یہودی کے پاس ایک زرہ رہن رکھی تھی۔ یہ عام دین تھا۔

(۳) باب أداء الدیون

وقول اللّٰہ تعالیٰ :

﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوْا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا
وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ إِنَّ اللّٰهَ
نِعِمَّا يَعِظُكُمْ بِهٖ ، إِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعاً بَصِيْراً ﴾[1]

۲۳۸۸ ـ حدثنا أحمد بن يونس : حدثنا أبو شهاب ، عن الأعمش ، عن زيد بن وهب ، عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال : كنت مع النبی ﷺ فلما ابصر ـ يعنی أحدا قال : ما أحب أنه يحول لی ذهبا يمكث عندی منه دينا ر فوق ثلاث الا دينا را ارصده لدين ، ثم قال : ان الأكثرين هم الأقلون ، الا من قال بالمال هكذا وهكذا ، واشار ابو شهاب بين يديه وعن يمينه وعن شماله وقليل ما هم وقال: "مكانک" وتقدم غير بعيد فسمعت صوتا فأ ردت أن آتيه ثم ذكرت قوله : "مكانک حتی آتيک" فلما جاء قلت : يا رسول اللّٰه ، الذی سمعت اوقال : الصوت الذی سمعت ؟ قال : وهل سمعت ؟ قلت : نعم ، قال: أتانی جبرائيل علیہ السلام فقال : من مات من أمتک لا يشرک باللّٰه شيئا دخل الجنة ، قلت : و من فعل كذا و كذا ؟ قال : نعم . [راجع : ۱۲۳۷].

ترجمہ ومختصر تشریح

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کے ساتھ تھا۔ "**فلما أبصر .يعنی أحداً**" جب آپ ﷺ نے احد کی طرف دیکھا (کسی سفر سے واپسی کی بات معلوم ہوتی ہے) آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں یہ بات پسند نہیں کرتا کہ میرے لئے اس احد کو سونے میں تبدیل کر دیا جائے اور اس میں سے میرے پاس ایک دینار بھی تین دن سے زیادہ باقی رہے۔"**الا دينارا**" سوائے اس دینار کے جو میں دین کی ادائیگی کے لئے محفوظ رکھوں۔

یہی موضع ترجمہ ہے کہ دین کی ادائیگی کا اتنا اہتمام تھا کہ ویسے تو آپ ﷺ کو منظور نہیں تھا کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی دولت رہے لیکن فرمایا کہ کسی دین کی ادائیگی کے لئے رکھوں۔ پھر فرمایا "**ان الاكثرين هم الاقلون**" جولوگ مالدار ہیں یعنی جن کے پاس مال بہت زیادہ ہے وہ قیامت کے دن بہت کم نعمتوں والے ہوں

[1] [النساء : ۵۸]

گے۔ **"هم الاقلون ، اقلون النعمة فی الجنة"** ان کو کم ثواب ملے گا **" الا من قال بالمال هكذا و هكذا "** سوائے اس شخص کے جو مال کو لے کر ایسا ایسا کرے یعنی لوگوں کو مٹھی بھر بھر کر دے، ایسے لوگ بہت کم ہیں۔

" و قال : مكانك " کہنے کے بعد حضرت ابوذر غفاری ؓ سے فرمایا کہ تم اپنی جگہ پر ٹھہر جاؤ اور یہ کہہ کر آپ ﷺ تھوڑی دور تک تشریف لے گئے۔ **" فسمعت صوتا فاردت أن آتيه "** اتنے میں مجھے ایک آواز سنائی دی۔ میرا ارادہ ہوا کہ حضور اقدس ﷺ کے پاس جاؤں لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنی جگہ پر ٹھہرنا۔ **" فلما جاء "** جب آپ ﷺ تشریف لائے تو میں نے کہا یا رسول اللہ! وہ کیا بات تھی جو میں نے سنی؟

"قال : و هل سمعت ؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تو نے سنی تھی، **"قلت نعم"** میں نے کہا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ میرے پاس حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے تھے اور یہ فرمایا **"من مات من أمتك لا يشرك بالله شيئا دخل الجنة قلت ومن فعل كذا وكذا ؟ قال : نعم"** میں نے کہا جو یہ اور وہ کریں؟ مطلب ہے کہ گناہ کریں۔ فرمایا وہ بھی جنت میں جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ بالآخر اپنے اعمال کی سزا بھگت کر جنت میں جائے گا۔

۲۳۸۹ ۔ حدثني أحمد بن شبيب بن سعيد : حدثنا أبي ، عن يونس ، قال ابن شهاب : حدثني عبيد الله بن عبدالله بن عتبة قال : قال أبو هريرة ؓ : قال رسول الله ﷺ : لو كان لي مثل أحد ذهبا ما يسرني أن لا يمر علي ثلاث وعندي منه شئ إلا شئ ارصده لدين رواه صالح و عقيل عن الزهري . [أنظر : ۶۴۴۵ ، ۷۲۲۸]

"أن لا يمر " میں لا زائدہ ہے **"أن يمر"** ہونا چاہئے تھا۔

(۴) باب إستقراض الإبل

۲۳۹۰ ۔ حدثنا أبو الوليد : حدثنا : شعبة : أخبرنا سلمة بن كهيل قال : سمعت أبا سلمة بمنى يحدث عن أبي هريرة ؓ : أن رجلا تقاضى رسول الله ﷺ فاغلظ له به فهم أصحابه فقال : " دعوه فان لصاحب الحق مقالا و اشتروا له بعيرا فاعطوه إياه " وقالوا : لا نجد الا أفضل من سنه قال : اشتروه فاعطوه إياه فان خيركم أحسنكم قضاء " . [راجع : ۲۳۰۵]

(۵) باب حسن التقاضی

۲۳۹۱ ۔ حدثنا مسلم : حدثنا شعبة ، عن عبد الملك ، عن ربعی ، عن حذیفة ﷺ قال : سمعت النبی ﷺ یقول : "مات رجل فقیل له : ما كنت تقول ؟ قال : كنت أبایع الناس فأتجوز عن الموسر، وأخفف عن المعسر ، فغفر له " قال أبو مسعود : سمعته عن النبی ﷺ . [راجع : ۲۰۷۷]

معاملات میں نرمی کی وجہ سے مغفرت ہوگئی

اللہ ﷻ نے ایک شخص کی مغفرت کردی، اس کا معاملہ یہ تھا کہ مثلاً کوئی شخص اس سے کوئی چیز خریدنے آتا اور وہ اس سے کہتا کہ اتنے پیسے کم کرو، یہ کہتا اچھا چلو کم دے دو۔ یا اس کا کوئی مقروض ہے تو اس سے کہتا کہ اچھا تم اتنا ادا کردو۔ باقی تمہارے لئے معاف ہے۔ تو وہ اس طرح کیا کرتا تھا تو اللہ ﷻ نے اس کے اس عمل کے صلے میں اس کی مغفرت فرمادی۔

(۶) باب هل يعطى أكبر من سنه؟

۲۳۹۲ ۔ حدثنا مسدد : عن یحیی، عن سفیان : حدثنی سلمة بن كهيل ، عن أبی سلمة ، عن أبی هریرة ﷺ : أن رجلا أتی النبی ﷺ یتقاضاه بعیرا ، قال : قال رسول الله ﷺ "اعطوه" فقالوا : لا نجد الا سنا أفضل من سنه ، فقال الرجل : أوفیتنی أوفاک الله ، فقال رسول الله ﷺ " اعطوه فان من خیار الناس احسنهم قضاء" . [راجع : ۲۳۰۵]

(۷) باب حسن القضاء

۲۳۹۳ ۔ حدثنا أبو نعیم : حدثنا سفیان ، عن سلمة ، عن أبی سلمة ، عن أبی هریرة ﷺ قال : كان لرجل علی النبی ﷺ سن من الإبل فجاءه یتقاضاه فقال ﷺ "اعطوه" فطلبوا سنه فلم یجدوا له الا سنا فوقها ، فقال : "اعطوه" فقال : أوفیتنی أوفی الله بک : قال النبی ﷺ "أن خیاركم احسنكم قضاءً" . [راجع : ۲۳۰۵]

۲۳۹۴ ۔ حدثنا خلاد : حدثنا مسعر : حدثنا محارب بن دثار ، عن جابر بن عبد الله رضی الله عنهما قال : أتیت النبی ﷺ وهو فی المسجد. قال مسعر : أراه قال : ضحی فقال : "صل ركعتین" وكان لی علیه دین فقضانی وزادنی . [راجع : ۴۴۳]

یہ ساری حدیثیں حسن قضا کی ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ ''دین'' کے عقد کے اندر تو زیادۃ کی شرط نہیں تھی، لیکن جب دینے کا وقت آیا تو مدیون نے اس کے حق سے زیادہ دے دیا۔ یہ حُسن قضا ہے اور جائز ہے، بلکہ مستحب ہے۔

(۸) باب اذا قضى دون حقه أو حلّله فهو جائز

۲۳۹۵ ۔ حدثنا عبدان : أخبرنا عبدالله : أخبرنا يونس ، عن الزهرى قال : حدثنى ابن كعب بن مالك أن جابر بن عبد الله رضى الله عنهما أخبره أن أباه قتل يوم أحد شهيداً وعليه دين فاشتد الغرماء فى حقوقهم ، فأتيت النبى ﷺ فسألهم أن يقبلوا تمر حائطى ويحللوا أبى فأبوا ، فلم يعطهم النبى ﷺ حائطى وقال : ''سنغدو عليك'' فغدا علينا حين اصبح فطاف فى النخل ودعا فى تمرها بالبركة فجددتها فقضيتهم وبقى لنا من تمرها. [راجع : ۲۱۲۷]

(۹) باب اذا قاص أو جازفه فى الدين تمرا بتمر أو غيره

۲۳۹۶ ۔ حدثنى ابراهيم بن المنذر : حدثنا أنس ، عن هشام ، عن وهب بن كيسان عن جابر بن عبد الله رضى الله عنهما أنه أخبره أن أباه توفى وترك عليه ثلاثين وسقا لرجل من اليهود ، فاستنظره جابر فأبى أن ينظره ، فكلم جابر رسول الله ﷺ ليشفع له إليه فجاء رسول الله ﷺ وكلم اليهودى ليأخذ ثمر نخله بالتى له فأبى فدخل رسول الله ﷺ النخل فمشى فيها ثم قال لجابر : ''جد له فأوف له الذى له'' فجده بعد ما رجع رسول الله ﷺ فأوفاه ثلاثين وسقا وفضلت له سبعة عشر وسقا فجاء جابر رسول الله ﷺ ليخبره بالذى كان فوجده يصلى العصر ، فلما انصرف أخبره بالفضل فقال : ''أخبر ذلك ابن الخطاب'' فذهب جابر إلى عمر فأخبره ، فقال له عمر : لقد علمت حين مشى فيها رسول الله ﷺ ليباركن فيها . [راجع : ۲۱۲۷] [۲]

---

[۲] وفى سنن النسائى ، كتاب الوصايا ، باب الوصية بالثلث ، رقم : ۳۵۷۶ ، وسنن أبى داؤد ، كتاب الوصايا ، باب ما جاء فى الرجل يموت عليه دين وله وفاء يستنظر ، رقم : ۲۴۹۸ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب الاحكام ، باب أداء الدين عن الميت ، رقم : ۲۴۲۵ ، ومسند احمد ، باقى مسند المكثرين بباب باقى المسند السابق ، رقم : ۱۳۸۳۹ ، ۱۴۴۷۴ .

حدیثِ باب کا مطلب

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے لیکن یہاں ذرا تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان کے والد کی شہادت غزوہ اُحد میں ہوئی تھی۔ **"وترک علیه ثلاثین وسقا لرجل من الیهود"** اور ان کے ذمہ کسی یہودی کا تیس وسق دین تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے ان سے مہلت طلب کی۔ **"انظر"** کے معنی ہیں مہلت دینا اور **"استنظر"** کے معنی ہیں مہلت طلب کرنا۔ **"فابی أن ینظره"** اس یہودی نے مہلت دینے سے انکار کردیا۔

"فکلمه جابر" حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے درخواست کی کہ آپ ﷺ سفارش کریں **"فجاء رسول اللہ ﷺ"** رسول اللہ ﷺ اس یہودی کے پاس آئے اور اس سے بات کی اور یہ پیشکش کی کہ جتنا ان کے نخلستان میں پھل آیا ہے وہ لے لو اور اس سے اپنا دین وصول کرلو اور باقی دین ساقط کرلو۔ **"فابی"** اس نے انکار کیا۔

یہی جملہ ہے جس پر ترجمۃ الباب قائم کیا ہے۔ **"باب اذا قاص أو جازفه.... أو غیره"** کہ اگر کوئی شخص دین کا مقاصہ کرنا چاہے یا مجازفتاً دین ادا کرنا چاہے تو وہ جائز ہے۔ خواہ وہ تمر کے بدلے تمر کیوں نہ ہو۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ بظاہر تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ذمہ تیس وسق کھجور کا دین تھا اور حضور اکرم ﷺ نے پیشکش بھی یہ فرمائی کہ جابر رضی اللہ عنہ کے درخت میں جو پھل ہے وہ اس دین کے بدلے میں لے لو۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں مجازفہ ہے کیونکہ درخت پر جو پھل لگا ہوا ہے اس کی مقدار معلوم نہیں اور ساتھ یہ مقاصہ ہے کہ جتنا دین تمہارے ذمہ ہے اس کھجور سے اس کا مقاصہ کرلو، جو کھجور تمہیں یہاں سے حاصل ہوگی۔

عام قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ اموال ربویہ میں کوئی معاملہ مجازفت کے ساتھ جائز نہیں ہوتا کیونکہ اس میں کمی بیشی کا احتمال ہوتا ہے۔ جب تمر کو تمر کے معاوضے میں لیا، یا دیا جارہا ہے تو دونوں کو مماثل اور برابر ہونا چاہئے، مجازفت بھی جائز نہیں اور کمی بیشی بھی جائز نہیں۔ لیکن یہاں حضور اکرم ﷺ نے یہ پیشکش کی کہ تمہارا جتنا دین ہے اس کے بدلے جتنی کھجوریں لگی ہوئی ہیں وہ لے لو اور ان کی مقدار معلوم نہیں، مجازفت ہے۔

مجازفت اور مفاضلت کب ناجائز ہے؟

مجازفت یا مفاضلت اس وقت ناجائز ہوتی ہے جب اصل عقد میں شرط ہو اگر اصل عقد میں یہ شرط ہو کہ ہم تمہیں جو معاوضہ دیں گے وہ مجازفتاً یا کم وبیش دیں گے تو یہ ناجائز ہے۔

لیکن اگر اصل عقد میں مجازفتاً اور تفاضل کی شرط نہیں تھی بلکہ اصل عقد یہ تھا کہ تیس وسق دے رہا ہوں اور

تیس وسق ہی لوں گا اور ادائیگی کے وقت اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اپنے دین کے عوض یہ ڈھیر لے لو، یہ مجازفت ہے۔ اگر وہ قبول کرلے تو درست ہو جائے گا، اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ یا تو کھجور کا ڈھیر مجازفۃً دیا جارہا ہے وہ اصل دین سے کم ہوگا یا اصل دین سے زائد ہوگا۔

اگر اصل دین سے کم ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ دائن نے ادائیگی کے وقت کچھ حصہ اپنی رضا سے چھوڑ دیا اور اگر اصل دین سے کچھ زائد ہوا تو اس کا معنی یہ ہے کہ مدیون نے دیتے وقت حسن قضا سے کام لیا، تو ادائیگی کے وقت باہمی رضامندی سے کم لینا یا زیادہ لینا دونوں صورتیں جائز ہیں۔ مجازفت اس وقت منع ہے جب اصل عقد میں شرط ہو، یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا یہی مقصد ہے۔

آگے پھر واقعہ یہ بیان کیا کہ حضور اکرم ﷺ نے پیشکش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ **"فدخل رسول الله ﷺ النخل"** آپ ﷺ خود تشریف لے گئے اور حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کھجور کاٹنا شروع کرلو اور اس کا جو دین ہے وہ پورا کا پورا دو۔

حضور ﷺ کا ایک معجزہ

حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے کھجور کاٹا اور اس یہودی کے تیس وسق تھے، وہ اس کو ادا کر دیئے اور سترہ وسق پھر بھی باقی بچ گئے۔ **"فجاء جابر** رضی اللہ عنہ" حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا وہ بتانے کے لئے آئے۔ آپ ﷺ عصر کی نماز پڑھ رہے تھے، جب آپ ﷺ فارغ ہوئے تو بتایا گیا کہ سترہ وسق باقی رہ گئے ہیں۔

"فقال أخبر ذلك ابن الخطاب" آپ ﷺ نے فرمایا کہ جا کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتادو کہ تاکہ ان کے ایمان اور یقین میں اور زیادہ اضافہ ہو۔

" فذهب جابر الى عمر فأخبره" حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات بتائی تو انہوں نے کہا کہ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ جب آپ ﷺ تشریف لے جارہے ہیں تو اللہ تعالیٰ اس پھل کے اندر ضرور برکت عطا فرمائیں گے۔

(۱۱) باب الصلوة على من ترك دينا

۲۳۹۸ ـ حدثنا أبو الوليد : حدثنا شعبة عن عدي بن ثابت، عم أبي حازم، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ قال : ((من ترك مالا فلورثته ، و من ترك كلاً فإلينا)) . [راجع : ۲۲۹۸]

۲۳۹۹ ـ حدثني عبد الله بن محمد : حدثنا أبو عامر : حدثنا فليح ، عن هلال بن

علی ، عن عبد الرحمٰن بن عمرة، عن أبی هریرة ﷺ : أن النبی ﷺ قال : ((ما من مؤمن إلا و أنـا أولیٰ بـه فـی الدنیا والآخرة اقرؤوا إن شئتم : ﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾[۳] فـایـمـا مؤمن مات وترک مالا فلیرثه عصبته من کانوا ، ومن ترک دینا أو ضیاعا فلیأتنی فانا مولاه)) . [راجع : ۲۲۹۸]

یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ شروع میں آپ ﷺ نے مدیون کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کیا تھا لیکن بعد میں جب اللہ جل جلالہ نے فتوحات عطا فرمادیں تو یہ فرمایا کہ جو شخص کوئی مال چھوڑ جائے تو وہ ورثاء کا ہے اور اگر کوئی محتاج چھوڑ کے جائے یعنی جس کے ذمہ دین وغیرہ ہو تو وہ ہمارے پاس آجائے، ہم اس کا دین ادا کریں گے۔

معنی یہ ہے کہ اس کے بعد حضور اکرم ﷺ نے اپنا یہ طرز عمل چھوڑ دیا تھا کہ مدیون کی نماز جنازہ نہ پڑھیں۔

اس لئے **"باب الصلوٰۃ علی من ترک دیناً"** سے یہ بتایا کہ جو دین چھوڑ کر گیا ہو اس کی نماز جنازہ پڑھنا درست ہے اور خود مقتداء کے لئے بھی پڑھنا درست ہے، کیونکہ اب حضور اقدس ﷺ نے یہ اعلان فرما دیا تھا۔

(۱۳) باب لصاحب الحق مقال

و یذکر عن النبی ﷺ : ((لیُّ الواجد یحل عرضه وعقوبته)) قال سفیان : "عرضه" یقول : مطلتنی "وعقوبته" : الحبس

۲۴۰۱ - حدثنا مسدّد : حدثنا یحییٰ ، عن شعبة ، عن سلمة ، عن أبی سلمة ، عن أبی هریرة ﷺ قال : أتی النبی ﷺ رجل یتقاضاه فاغلظ له فهمّ به أصحابه فقال : ((دعوه فان لصاحب الحق مقالا)) .[راجع : ۲۳۰۵]

مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے

"باب لصاحب حق مقال" یعنی جو صاحب حق ہے اس کو کچھ کہنے کا حق حاصل ہے یہ پہلے بھی گزر چکا ہے۔

"ویذکر عن النبی ﷺ" اور نبی کریم ﷺ سے مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بات فرمائی **"لی الواجد یحل عرضه وعقوبته"**.

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو یہاں تعلیقاً ذکر کیا ہے جبکہ مسند احمد وغیرہ میں یہ حدیث موصولاً آئی ہے کہ **"لی الواجد یحل عرضه وعقوبته"**.[۴]

---

۳ [الأحزاب : ۲]

۴ مسند أحمد ، باقی مسند المکثرین ، رقم : ۸۵۴۲ ، ۹۰۲۱ .

"لیّ" کے معنی ہیں ٹال مٹول کرنا اور **"واجد"** کے معنی ہیں غنی، جس کے پاس مال ہو۔ اگر ایسا شخص کسی کا مدیون ہو اور اس کے پاس مال موجود ہو مگر وہ پھر بھی ادائیگی میں ٹال مٹول کرے تو اس کا یہ عمل اس کی آبرو کو اور اس کی سزا کو حلال کر دیتا ہے یعنی ایسا شخص سزا کا مستوجب ہے۔ عرضہ یعنی اس کی آبروریزی بھی کی جا سکتی ہے، اس کو برا بھلا بھی کہا جا سکتا ہے۔

آگے سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے تفسیر کی ہے کہ "عرضہ" کے معنی یہ ہیں کہ دائن اس سے کہہ سکتا ہے کہ تو نے مجھ سے ٹال مٹول کی اس لئے تو بڑا اگڑ بڑ آدمی ہے۔ اس کی برائی کر سکتا ہے۔

"وعقوبۃ" کا معنی یہ ہے کہ اس کو قید کرا سکتا ہے کہ جب تک وہ پیسے نہ دے اس کو قید کیا جائے۔ اس میں حضور اقدس ﷺ نے یہ بات بیان فرمائی ہے کہ اگر ایک شخص مدیون ہے اور ادائیگی پر قادر ہے تو پہلی حدیث میں فرمایا تھا کہ **"مطل الغنی ظلم"** اب جو یہ دیر کر رہا ہے تو یہ مدیون پر ظلم ہے اور اس ظلم کی وجہ سے اس کو سزا بھی دی جا سکتی ہے، اس کی آبرو پر بھی حملہ کیا جا سکتا ہے۔

دین کی ادائیگی میں تاخیر پر جرمانہ عائد کرنا

اس حدیث کی وجہ سے بعض معاصرین نے یہ کہا ہے کہ اگر کوئی مدیون ادائیگی پر قادر ہونے کے باوجود ٹال مٹول کرے تو دائن اس پر کوئی جرمانہ بھی عائد کر سکتا ہے اور وہ جرمانہ اس کے ضرر کے معاوضے کے مطابق ہو سکتا ہے۔ اس کو **"تعویض عن الضرر"** کہتے ہیں کہ تم نے میرا دین وقت پر ادا نہیں کیا۔ اس کی وجہ سے مجھے فلاں ضرر لاحق ہوا۔ اس ضرر کے معاوضے میں مجھے تم اتنے پیسے دو۔

علماء عصر میں سے جن علماء نے یہ بات کہی ہے وہ کہتے ہیں کہ آج کل ہمارے زمانے میں مطل الغنی کی بہت کثرت ہوگئی ہے اور اس طرح لوگ بہت کثرت سے دوسروں کے حقوق غصب کرتے ہیں کہ وقت پر پیسوں کی ادائیگی نہیں کرتے۔ سودی نظام میں اس کا ایک خودکار حل یہ ہے کہ جتنی دیر کرتا جائے گا اس کا سود بڑھتا جائے گا۔ اس واسطے لوگ ڈرتے ہیں کہ اگر بروقت ادائیگی نہ کی تو ہمارا سود بڑھ جائے گا تو وہ جلدی ادائیگی کی کوشش کرتے ہیں۔

لیکن اسلامی نظام میں چونکہ سود کی گنجائش نہیں ہے، لہٰذا مماطلین کو کھلی چھوٹ مل جاتی ہے کہ وہ ٹال مٹول کرتے جائیں اور اس سے اصحاب حقوق کے حقوق پامال ہوں، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ اگر مطل کی صورت میں ان پر کوئی معاوضہ عائد کیا جائے تو یہ جائز ہے اور خاص طور سے بینکوں کے معاملات میں کہ سارے کے سارے بینک اس بنیاد پر چلتے ہیں کہ اس کو بروقت پیسے مل جائیں۔ اگر بینکوں کو پیسے بروقت نہ ملیں تو ان کو بڑا سخت نقصان ہو۔ مماطلین کی ان ساری کاروائی کو ختم کر سکتے ہیں، لہٰذا انہوں نے خاص طور پر بینک کے نظام کے بارے میں

کہا کہ اگر بینک کی طرف سے مثلاً کوئی چیز مرابحہ مؤجلہ کے ساتھ بیچی گئی اور پابند کر دیا گیا کہ اتنی مدّت کے بعد اس کی قیمت ادا کرنا لازمی ہے، باوجود قدرت کے اگر وقتِ مقررہ پر قیمت ادا نہ کی تو اس صورت میں بینک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ تم نے اتنے دنوں تک ہمارا پیسہ ادا نہیں کیا، اتنے دن تک جو استثمارات ہیں ان پر جتنا کچھ کمایا ہے اتنا ہی تم بھی ادا کرو۔

مثلاً اس ادائیگی میں چھ مہینے تک اسلامی بینک میں کوئی شخص پیسے رکھتا ہے تو ان مہینوں میں اس کو جتنا نفع ہوگا اتنا ہی وہ مدیون اپنے دائن کو ادا کر دے۔ بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی ہے، اوراس پر اس سے استدلال کیا ہے کہ **"لی الوا جد عرضه وعقوبته"** کہ غنی کا ٹال مٹول کرنا اس کی آبرو کو بھی حلال کر دیتا ہے اوراس کی عقوبت کو بھی حلال کر دیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقوبت میں عقوبت بالمال بھی داخل ہے۔

عقوبت مالیہ اگر چہ بہت سے فقہاء کے نزدیک جائز نہیں ہے لیکن بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، جس کی تفصیل ان شاء اللہ آگے آئے گی۔ یہ بعض معاصرین کا مؤقف ہے۔

لیکن مجھے یہ مؤقف صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ اس واسطے کہ یہ طریقہ ربوالجاہلیہ کے مشابہ ہے۔ اور ربوالجاہلیہ میں یہ ہوتا تھا کہ اگر کوئی مدیون اپنے وقت پر دین کی ادائیگی سے قاصر رہا تو دائن اس سے کہتا تھا **"إمـــا أن تقضی أو تزد لی"** پیسے ادا کرو یا اپنے مقدار دین کے اندر اضافہ کرو۔ تو یہ وہی چیز ہوگئی کہ تم وقت پر نہیں دے سکتے ہو، لہٰذا زیادہ دو، اس کے مشابہ ہوگیا۔ اس واسطے یہ صورت درست معلوم نہیں ہوتی۔

اوراس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جہاں تک مماطلین کا تعلق ہے تو وہ ہر دور میں رہے ہیں۔ ہمارے دور کی خصوصیت نہیں ہے۔ اگر نہ ہوتے تو حضور اکرم ﷺ یہ ارشاد نہ فرماتے۔ **"لیّ الواجد عرضه و عقوبته"** تو پہلے دن سے ہی اس کا تصوّر موجود ہے لیکن کہیں اس کی نظیر نہیں ہے کہ کسی مماطل سے اس کے مطل کی وجہ سے زیادہ پیسے وصول کئے گئے ہوں۔ آپ ﷺ نے یہ تو فرمایا کہ **"یحل عرضه وعقوبته"** جس کی تفسیر سفیان ثوری نے رحمہ اللہ **"الحبس"** سے فرمائی تو یہاں **"یحل عرضه وماله"** نہیں فرمایا اور پوری تاریخ اسلام میں کہیں ایک بھی مثال نہیں ہے کہ جہاں مماطل (ٹال مٹول) کرنے والے کے اوپر پیسے عائد کئے گئے ہوں۔ زیادہ سے زیادہ اس کو غاصب کہیں گے اور غاصب سے زیادہ سخت درجہ سارق کا ہوتا ہے۔ سارق کا ہاتھ ضرور کاٹ دیا جاتا ہے لیکن ایسا کہیں نہیں کہا گیا کہ تم نے اتنے دنوں تک مجھے اپنے مال سے محروم کیا، لہٰذا مجھے اتنے پیسے دو۔ سارق سے کبھی یہ مطالبہ نہیں کیا گیا۔

منافع مغصوب مضمون ہوتے ہیں یا نہیں؟

اس میں اختلاف ہوا ہے کہ آیا منافع مغصوب مضمون ہوتے ہیں یا نہیں؟

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک منافع مغصوب مضمون ہوتے ہیں، یعنی فرض کریں کسی نے کسی کی زمین غصب کی تو امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتنے دن کا کرایہ ادا کرے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر نقد لیا ہے تو اس صورت میں منافع مضمون نہیں ہوں گے۔ [۵]

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے نظام میں اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں فرق یہ ہے کہ موجودہ نظام میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ روپیہ یا نقد ہر روز کے حساب سے نفع دینے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اس کی طبیعت یہ ہے کہ اس سے سود کے ذریعے روزانہ کوئی نہ کوئی نفع نکلے۔

اس واسطے اگر کسی نے کسی شخص کے پیسے غصب کر لئے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس نے اس سے اتنے دنوں کا سود غصب کر لیا، بخلاف اسلام کے کہ اسلام کے احکام کے مطابق نقد بذات خود یومیہ کے حساب سے نفع بخش نہیں ہے۔ اس کا جو اصل کام ہے وہ یہ ہے کہ اس کو کسی تجارت میں لگایا جائے جس میں نفع کا احتمال بھی ہے اور نقصان کا بھی ہے، تو یومیہ حساب سے روپے کا نفع پیدا کرنا یہ اصول شریعت میں مسلم نہیں ہے۔ لہٰذا جو منافع مغصوب کو مضمون کہتے ہیں یعنی شافعیہ، ان کے نزدیک بھی نقود میں نہیں ہے، حنفیہ کے ہاں اور اوروں میں بھی نہیں ہے۔

آج کل کی معاشی اصطلاح میں ایک اُصول ہوتا ہے جس کو انگریزی میں (**Oppourtunity Cost**) کہتے ہیں اور عربی میں اس کا ترجمہ **"الفرصة الضائعة"** کہا جاتا ہے۔ یعنی آپ نے میرے ایک موقع کو ضائع کر دیا۔

میرے پاس نفع کمانے کا ایک موقعہ تھا آپ نے اس کو ضائع کر دیا، لہٰذا اس کے بدلے مجھے پیسے دو۔ یہ سودی نظام کا اصول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے پیسے کو نفع کمانے کے سلسلے میں ضائع کر دے تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ اس موقع کے ضائع کرنے کا معاوضہ اس کو ادا کرے، لیکن اسلام میں یہ صورت نہیں ہے۔ اس کے اوپر مالی جرمانہ عائد کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ دائن مدیون سے زائد وصول کر رہا ہے جو سود کی ایک شکل ہے، لہٰذا یہ بات مسلم نہیں ہوتی۔

ایک مشکل اور اس کا حل

البتہ مسئلہ یہ ہے کہ لوگ پیسے لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور ادائیگی نہیں کرتے، اس سے اسلامی طریقے کے

---

۵ قال ولا یضمن الغاصب منافع ما غصبه إلا أن ینقص باستعماله فیغرم النقصان وقال الشافعي رحمه الله یضمنها فیجب أجر المثل ولا فرق في المذهبین بین ما اذا عقتلها او سکنها . (الهدایة شرح البدایة ، ج : ۴ ص : ۲۰ ، مطبوعة المکتبة الاسلامیة، بیروت).

مطابق کام کرنے والوں کا بڑا نقصان ہوتا ہے تو اس کا کوئی حل ہونا چاہئے؟

اس کا ایک حل امام مالک رحمہ اللہ نے تجویز کیا ہے۔ وہ یہ کہ جس وقت دائن، دین کا عقد کرے، اس وقت اس میں مدیون سے اس کے سامنے ایک وعدہ کرے کہ اگر میں نے بروقت پیسے ادا نہ کئے تو میں صدقہ کروں گا۔ گویا امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کے مطابق یہ یمین ہوجاتی ہے کہ اگر میں نے بروقت پیسے ادا نہ کئے تو میں صدقہ کروں گا۔

اکثر مالکیہ کے ہاں اس یمین کا ایفاء دیانۃً واجب ہے، قضاءً واجب نہیں ہے اور بعض مالکیہ نے اس کو قضاءً بھی لازم قرار دیا ہے، تو ضرورت کے تحت ان مالکیہ کا قول اختیار کیا جا سکتا ہے جو قضاءً اس کو لازم کرتے ہیں، لہٰذا عقد دین میں اگر یہ شرط لگا دیں، بلکہ مدیون یہ عہد کرلے کہ اگر میں نے بروقت ادائیگی نہ کی تو اتنے پیسے صدقہ کروں گا اور تمہارے ذریعے کروں گا۔ تمہیں دوں گا تم اس کو میری طرف سے صدقہ کردو۔

اس صورت میں اگر وہ ادائیگی بروقت نہیں کرے گا تو وہ دائن کو صدقہ کرنے کیلئے دے گا اور دائن ان پیسوں کو اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا بلکہ صدقہ کرے گا۔ اس سے دائن کے نفع میں تو کوئی اضافہ نہیں ہوگا لیکن یہ چیز اس کے لئے بطور دباؤ کے ضرور کام کرے گی۔ مدیون کو یہ دباؤ رہے گا کہ اگر میں نے بروقت ادائیگی نہ کی تو مجھے اور پیسے خرچ کرنے پڑیں گے۔ اس طرح غنی آدمی بلا وجہ جب تک اس کے پاس پیسے موجود ہوں گے وہ زیادہ ٹال مٹول نہیں کرے گا۔

(۱۴) باب اذا وجد ماله عند مفلس في البيع والقرض والوديعة فهو أحق به،

"وقال الحسن : إذا أفلس وتبين لم يجز عتقه ولا بيعه ولا شراؤه . وقال سعيد بن المسيب : قضى عثمان : من اقتضى من حقه قبل أن يفلس فهو له ، و من عرف متاعه بعينه فهو أحق به".

۲۴۰۲ ـ حدثنا أحمد بن يونس : حدثنا زهير حدثنا يحيى بن سعيد قال : أخبرني أبو بكر بن محمد بن عمرو بن حزم : أن عمر بن عبد العزيز أخبره أن أبا بكر بن عبد الرحمن بن الحارث بن هشام أخبره : أنه سمع أبا هريرة ﷺ يقول : قال رسول الله ﷺ أو قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول : ((من أدرك ماله بعينه عند رجل أو إنسان قد أفلس

فهو أحق به من غيره". [۶]

کوئی شخص بیع میں اپنا مال کسی مفلس کے پاس پالے یعنی وہ مال بیع کے ذریعے ہوا ہو یا قرض کے ذریعے یا ودیعت کے ذریعے تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔

ایک اختلافی مسئلہ

فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کو اپنا کوئی سامان فروخت کیا۔ اس کے ذمہ پیسے واجب ہوگئے۔مشتری نے سامان پر قبضہ کرلیا اور اس کے ذمہ ثمن واجب ہوگئی۔ابھی اس نے ثمن ادا نہیں کی تھی اور بیع اسی کے قبضے میں تھی کہ اتنے میں قاضی نے مشتری کو مفلس (دیوالیہ) قرار دیدیا۔اور دیوالیہ کا حکم یہ ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ضرورت کے مطابق کچھ سامان اس کے پاس چھوڑ کر باقی سارے سامان کی کرکی ہوجاتی ہے اور سارے سامان کو فروخت کر کے جتنے بھی پیسے حاصل ہوں وہ سارے اس کے جتنے غرماء اور دائن ہیں ان کے درمیان تقسیم ہوجاتے ہیں۔ [۷]

عام طور سے اس میں یہ ہوتا ہے کہ اس میں دائن کا پورا حق نہیں ملتا بلکہ سامان بیچ کر جو قیمت حاصل کی جاتی ہے، وہ اتنی ہوتی ہے کہ بس تھوڑا تھوڑا سب کو مل جائے۔سب کا دین کچھ نہ کچھ رہ جاتا ہے۔

تو مسئلہ یہ ہے کہ جس شخص نے اپنا سامان بیچا تھا اور وہ سامان ابھی مفلس کے قبضے میں موجود ہے، اس نے خرچ نہیں کیا تو کیا بائع کو حق حاصل ہے کہ وہ یہ کہے کہ میں نے اس مفلس کو جو سامان بیچا تھا وہ تو پورا کا پورا میں لے لوں گا، کیونکہ اس نے میرے پیسے ادا نہیں کئے اور یہ سامان کرکی میں شامل نہیں ہوگا اور دوسرے غرماء کا اس پر حق نہیں ہے، میں ہی تنہا اس کا حقدار ہوں۔

---

[۶] وفي صحيح مسلم، كتاب المساقاة، باب من ادرک ماباعه عند المشترى وقد أفلس فله الرجوع، رقم: ۲۹۱۳، وسنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ماجاء اذا افلس للرجل غريم. فيجد عنده متاعه، رقم: ۱۱۸۳، وسنن النسائي، كتاب البيوع، باب الرجل يبتاع البيع فيفلس ويوجد المتاع بعينه، رقم ۴۵۹۷، وسنن ابي داؤد، كتاب البيوع، باب في الرجل يفلس فيجد الرجل متاعه بعينه عنده، رقم: ۳۰۵۴، ۳۰۵۹، وسنن ابن ماجة، كتاب الأحكام، باب من وجد متاعه بعينه عند رجل قد أفلس، رقم: ۲۳۴۹، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۶۸۲۷، ۷۱۹۴، ۸۶۳۴، ومؤطا مالک، كتاب البيوع، باب ماجاء في افلاس الغريم، رقم: ۱۱۸۴، وسنن الدارمي، كتاب البيوع، باب فيمن وجد متاعه عند المفلس، رقم ۲۴۷۷.

[۷] قوله (فهو أحق به من غيره) اى كائنا من كان وارثاً وغريماً وبهذا قال جمهور العلماء وخالف الحنفية فتأولوه لكونه خبر واحد خالف الأصول، لان السلعة صارت بالبيع ملكا للمشترى ومن ضمانه واستحقاق البائع أخذها منه نقض لملكه، وحملوا الحديث على صورة وهي ما إذا كان المتاع وديعة أو عارية أو لقطة الخ (فتح البارى، ج: ۵، ص: ۶۳).

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا قول

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ ہاں اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی بیچی ہوئی چیز اٹھا کر لے جائے اور کہے کہ میں لے جاتا ہوں، کیونکہ اس نے میرے پیسے ابھی تک ادا نہیں کئے۔ گویا بیع فسخ کرتا ہوں۔[۸]

امام بخاری رحمہ اللہ کا قول مختار

امام بخاری رحمہ اللہ نے جمہور یعنی ائمہ ثلاثہ کا مذہب اختیار کیا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بائع کو یہ حق حاصل نہیں ہے، بائع نے جب کوئی چیز بیچ دی تو مبیع مشتری کی ملکیت میں آ گئی، اب یہ اس کی دوسری املاک کے مساوی ہے۔ بائع کا حق ہے کہ وہ ثمن وصول کرے، اب مبیع پر اس کا کوئی حق نہیں رہا، ثمن وصول کرسکتا ہے۔ جب ثمن وصول کرسکتا ہے تو اس میں اور دوسرے دائن میں کوئی فرق نہیں ہے جس طرح وہ پیسے وصول کرسکتے ہیں اسی طرح یہ بھی پیسے وصول کرسکتا ہے، ان میں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

لہٰذا وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری مبیع واپس کرو اور میں تنہا اس کا حقدار ہوں بلکہ وہ مبیع بھی مفلس کے دوسرے سامان کے ساتھ فروخت ہوگی اور فروخت ہونے کے بعد حصہ رسدی میں سے اس کو جتنا حصہ ملے گا اتنا مل جائے گا۔ اس کو کہتے ہیں کہ "**اسوۃ للغرما**" ہوگا یعنی دوسرے غرماء کے ساتھ برابر کا حقدار ہوگا۔ ان سے زیادہ اپنی مبیع کو وصول نہیں کرسکتا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔[۹]

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا استدلال

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث یہاں ذکر کی ہے کہ "**من ادرک مالہ بعینہ**" کہ جو شخص اپنا مال بعینہٖ کسی انسان کے پاس پالے جو مفلس ہو گیا ہو تو وہ دوسروں کے مقابلے میں اس کا زیادہ حقدار ہوگا۔

---

۸ قولہ (فھو احق بہ من غیرہ) ای کائنا من کان وارثاً أو غریماً وبھذا قال جمھور العلماء وخالف الحنفیة فتأولوہ لکونہ خبر واحد خالف الأصول، لان السلعة صارت بالبیع ملکا للمشتری ومن ضمانہ واستحقاق البائع أخذھا منہ نقض لملکہ، وحملوا الحدیث علی صورة وھی ما إذا کان المتاع ودیعة أو عاریة أو لقطة الخ (فتح الباری، ج : ۵، ص : ۶۳).

۹ فتح الباری، ج : ۵، ص : ۶۳.

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال مصنف عبدالرزاق کی ایک حدیث سے ہے جس میں یہ آیا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں ایک شخص تھا جو حاجیوں کو کرایہ پر سفر کرایا کرتا تھا، ایک مرتبہ اس نے اونٹنیاں خریدیں اور خریدنے کے بعد اس کو اجرت پوری نہیں ملی، جتنی اس کو ملنے کی توقع تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ مفلس ہوگیا اور قاضی نے اس کو مفلس قرار دے دیا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس فیصلہ آیا تو آپ نے فرمایا کہ جتنی بھی اس کی اونٹنیاں ہیں ان کو فروخت کر کے جتنے دائنین ہیں ان کے درمیان برابر تقسیم کریں۔[۱۰]

اس کے پاس جو کچھ مال تھا وہی اونٹنیاں تھیں جو اس نے بائع سے خرید رکھی تھیں اور ابھی قیمت ادا نہیں کی تھی۔ ان کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ "**أسوة للغرماء**" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بائع بھی ان غرماء کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔ اس کو یہ نہیں کہا کہ تم اپنی اونٹنیاں لے جاؤ بلکہ اس کو "**اسوۃ للغرماء**" قرار دیا۔

اس سے حنفیہ کا استدلال ہے اور یہ اصل استدلال اصول کلیہ سے ہے۔ وہ یہ کہ بیع ہوتے ہی مبیع بائع کے ضمان سے نکل جاتی ہے اور مشتری کی ملکیت میں آجاتی ہے اور بائع کا کوئی حق سوائے مطالبہ ثمن کے بیع پر قائم نہیں رہتا۔ اور یہ اصول "**الخراج بالضمان**" والی حدیث سے بھی ثابت ہے کہ وہ بیع اب مشتری کے ضمان میں آگئی اور مبیع کے تمام حقوق مشتری کی طرف منتقل ہوگئے۔ بائع کے لئے صرف اتنا ہے کہ وہ پیسے کا مطالبہ کرے، لہٰذا اب وہ اس میں دوسرے دائنین کے مساوی ہے۔

حدیث باب کا جواب

جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے اس کے بارے میں حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ بیع پر محمول ہی نہیں بلکہ اس سے مغصوب یعنی کسی نے کوئی چیز غصب کر لی، ودیعت رکھوادی، عاریتاً لے لی "**یا مقبوض علی سوم الشرا**" وغیرہ مراد ہے یعنی اس مفلس شخص نے کسی کا مال غصب کر کے رکھا ہوا تھا تو اب مغصوب منہ کو حق حاصل ہے کہ اگر بعینہ وہ مال مل گیا تو اٹھا کے لے جائے۔ کسی نے مفلس کے پاس ودیعت رکھوائی تھی تو مودِع کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی چیز کو اٹھا کے لے جائے۔ کسی نے مفلس کو عاریتاً کوئی چیز استعمال کے لئے دی تھی تو اب معیر کو حق حاصل ہے کہ وہ شئی اٹھا کر لے جائے "**یا مقبوض علی سوم الشرا**" تھی ("**مقبوض علی سوم الشرا**" اس کو کہتے ہیں کہ ابھی سودا نہیں ہوا، بیع منعقد نہیں ہوئی تھی۔ بائع نے اس کو چیز دی کہ اس کو دیکھ لو اگر چاہو تو خرید لینا ورنہ واپس کر دینا) وہ ابھی رکھی ہوئی تھی کہ وہ مفلس ہوگیا تو مالک حق دار ہے کہ وہ کہے کہ

[۱۰] تکملہ فتح الملہم، ج: ۱، ص: ۴۹۴، واخرج عبد الرزاق فی مصنفہ، ج: ۸، ص: ۲۶۶، رقم ۱۵۱۶۹۔

ابھی لے جاتا ہوں اس لئے کہ ابھی تک بیع نہیں ہوئی۔تو حدیث میں یہ مراد ہے،اور یہی بات بعینہٖ مستدرک حاکم میں سمرۃ بن جندب رضی اللہ عنہ کی حدیث میں مصرح ہے،اس میں الفاظ یہ ہیں کہ اگر کسی کا مال چوری یا غصب ہوگیا، پھر اسے اپنا مال بعینہٖ مفلس کے پاس مل گیا تو وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔[11]

آپ دیکھیں گے حدیث باب میں کہ اس میں **"من أدرک ماله بعینه"** کے الفاظ ہیں اس میں بیع کا ذکر نہیں۔کوئی شخص بعینہٖ اپنا مال کسی شخص کے پاس پالے اور بعینہٖ مال کے پانے کی صورت یہی ہے کہ کسی نے غصب کرلیا، عاریت یا ودیعت رکھوائی تب تو کہیں گے مالہ بعینہٖ لیکن اگر بیع کردی تو وہ مال اب بائع کا تو نہ رہا اور یہاں صرف مالہ نہیں ہے بلکہ بعینہٖ کا لفظ موجود ہے اور آپ کو معلوم ہے کہ تبدل ملک سے تبدل عین ہوجاتا ہے تو اگر ملک تبدیل ہوگئی تو بعینہٖ اس کا نہیں کہہ سکتے،لہٰذا اس حدیث کو غصب،ودیعت،عاریت اور مغصوب **"علی سوم الشراء"** پر محمول کیا جائے گا۔

اعتراض

بعض شافعیہ اور دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض طرق میں لفظ بیع کی صراحت ہے کہ کسی شخص نے بیع کی اور وہ بیع بعینہٖ اس نے پالی تو پھر اس کا بھی یہی حکم ہوگا؟

احناف کی طرف سے جواب

احناف اس کے دو جواب دیتے ہیں:

ایک جواب تو یہ ہے کہ اس حدیث کے اکثر طرق میں بیع کا لفظ نہیں ہے۔میں نے **"تکملہ فتح الملهم"** میں اس حدیث کے سارے طرق جمع کئے ہیں کہ کن کن حضرات نے یہ حدیث روایت کی ہے سوائے چند طرق کے سارے کے سارے طرق ایسے ہیں جن میں بیع کا لفظ نہیں ہے اور اس میں احتمال کی گنجائش بھی ہے کہ اصل حدیث میں بیع کا لفظ نہیں تھا کسی راوی نے اپنی فہم پر اس کو بیع پر محمول کیا اور بالمعنی روایت کرتے ہوئے اس میں لفظ بیع کا اضافہ کردیا۔[12]

دوسرا جواب بعض حضرات یہ دیتے ہیں کہ اگر لفظ بیع والی حدیث کو تسلیم کرلیا جائے کہ حضور اکرم ﷺ نے لفظ بیع استعمال فرمایا تھا تب بھی اس کی دو توجیہات ہوسکتی ہیں:

ایک توجیہ یہ ہے کہ اس سے مراد **"مقبوض علی سوم الشرا"** ہے اور اس پر لفظ بیع کا اطلاق

---

[11] إذا ضاع لأحدكم متاع أو سرق له متاع فوجده في يد رجل بعينه فهو أحق به ويرجع المشتري على البائع بالثمن. (سنن الكبرى للبيهقي، في كتاب التفليس، باب العهدة رجوع المشتري بالدرك، ج: ٦، ص: ٥١، رقم ١١٠٥٨).

[12] تكملة فتح الملهم ج: ١، ص: ٤٩٧.

کر دیا گیا۔

دوسری توجیہ جو حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اختیار کی ہے کہ یہ حکم آنحضرت ﷺ نے دیانت کا دیا ہے، قضا کا نہیں دیا۔ دیانتاً ایسی صورت میں مشتری پر واجب ہے کہ جب پیسے نہیں دے سکا تو مبیع واپس کر دے اور دیانتاً بائع کو حق حاصل ہے کہ مشتری سے جا کر کہے کہ تم مجھے اپنی چیز دے دو پھر لوگ تمہارے پاس آجائیں گے اور غرماء بھی آجائیں گے تو میرا مال ضائع ہو جائے گا۔ لہٰذا تم مجھے پہلے دے دو۔ دیانتاً اس سے پہلے مطالبہ کر لے اور آپس میں ان کے لئے جائز ہے کہ یہ معاملہ کر لیں۔

اور اگر معاملہ قاضی کے پاس پہنچ گیا تو قاضی وہی فیصلہ کرے گا جو اصول کے مطابق ہے اور وہ **"أسوة للغرماء"** ہوگا۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ بھی یہی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسی کے مطابق فیصلہ فرمایا۔[۱۳]

حنفیہ کی قابل استدلال روایت

علامہ ابن حزم رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ یہ مسئلہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو آپ نے فرمایا **"أسوة للغرماء"** مگر ساتھ ہی ابن حزم رحمہ اللہ اعتراض کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس روایت کو بیان کرنے والے خلاس کا سماع حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں ہے، لہٰذا یہ روایت منقطع ہونے کی وجہ سے قابل استدلال نہیں حالانکہ خود علامہ ابن حزمؒ نے بہت سی جگہوں میں خلاس عن علی رضی اللہ عنہ کی روایتوں سے استدلال کیا ہے، لہٰذا یہ حنفیہ کے ہاں قابل استدلال ہے۔[۱۴]

سوال:

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کہ دیانتاً مشتری کو چاہئے کہ وہ مبیع کو بائع کے پاس لوٹا دے تو یہ دیانتاً بھی کیسے جائز ہوگا جبکہ دوسرے **"غرماء"** کا حق بھی اس سے متعلق ہو گیا تو پھر اس کا دینا بھی جائز نہ ہونا چاہئے کیونکہ اپنی ملک میں ہو تو دیدے جب دوسرے **"غرماء"** کا حق متعلق ہو گیا تو بائع کو کیسے دے گا؟

جواب:

جواب یہ ہے کہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کے قول کے مطابق دوسرے غرماء کا حق قضاء قاضی کے بعد متعلق ہوگا۔ قضاء قاضی سے پہلے **"غرماء"** کا حق متعلق نہیں ہوتا، لہٰذا دیانتاً دینے کی گنجائش ہے۔ حضرت شاہ

---

۱۳ **عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۱۲۰۔**

۱۴ **فالجواب عندی أن مافی الحدیث مسئلة الدیانة دون القضاء، ویجب علی المشتری دیانة أن یبادر بسلعته فیردها إلی البائع قبل أن یرفع أمره الی القضاء، فیحکم بالاسوة، (فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۱۳).**

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے قول کا یہی حاصل ہے۔[۱۵]

غرماء میں تقسیم کا طریقہ

تقسیم میں تناسب کا خیال رکھا جائے گا۔ پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ لوگوں کے کتنے قرضے ہیں۔ کسی کا قرضہ ایک لاکھ، کسی کا پچاس ہزار اور کسی کا قرضہ پچیس ہزار ہے تو اب جو مستقرض کی املاک کی قیمت حاصل ہوگی اس میں تناسب کا خیال رکھیں گے۔ پچیس ہزار والے کو سبع (ساتواں حصہ) پچاس ہزار والے کو دو سبع (ساتویں کا ڈبل) اور ایک لاکھ والے کو چار سبع ملیں گے۔

"وقال الحسن : إذا أفلس وتبين لم يجز عتقه ولا بيعه ولا شراؤه . وقال سعيد بن المسيب : قضى عثمان : من اقتضى من حقه قبل أن يفلس فهوله ومن عرف متاعه بعينه فهوأحق به".

حسن بصری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ جب کوئی آدمی مفلس ہو جائے اور پتہ چل جائے کہ یہ مفلس ہو گیا ہے تو اب اس کا عتق کرنا بھی جائز نہیں یعنی خود اس کا کوئی غلام ہے تو اس کو آزاد کرنا چاہے تو آزاد نہیں کر سکتا اور اسی طرح وہ کسی سے بیع و شراء بھی نہیں کر سکتا۔

اور حضرت عثمان ﷺ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ جو شخص مدیون کے مفلس ہونے سے پہلے اپنا حق وصول کر لے یعنی ابھی مفلس ہونے کا اعلان نہیں ہوا تھا، اس سے پہلے کوئی آدمی اپنا حق وصول کر کے لے گیا تو وہ اس کا ہے اور اگر کوئی آدمی جا کر اپنا مال بعینہ پہچان لے تو وہ زیادہ حق دار ہوگا۔ ہم (احناف) کہتے ہیں کہ عقود، ودائع، عواری وغیرہ میں یہ بات درست ہے لیکن بیع میں درست نہیں۔[۱۶]

"وقال أبوعبدالله هذا الاسناد كلهم كانوا على القضاء يحي بن سعيد وأبوبكر بن محمد وعمر بن عبدالعزيز وأبوبكر بن عبدالرحمن وأبوهريرة كانوا كلهم على المدينة"

هذا الأسناد كلهم كانوا على القضاء

آخر میں امام بخاری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس حدیث کی سند میں سب قاضی ہیں یعنی زہیر سے اوپر جتنے

---

[۱۵] فان قتادة روى عن خلاس بن عمرو عن على أنه قال : هوأسوة الغرماء اذا وجدها بعينها الخ ..... واعلم أن الحنفية قد اعتذروا عن العمل بأحاديث الباب باعتذرات كلها واهية الخ ، (تحفة الأحوذى بشرح جامع الترمذى ، كتاب البيوع عن رسول الله ، رقم : ۱۱۸۳ ، وعون المعبود شرح سنن أبى داؤد ، كتاب البيوع ، رقم ۳۰۵۴).

[۱۶] تكملة فتح الملهم ، ج ۱ ، ص : ۴۹۲ .

ہیں۔ یحیٰ بن سعید الانصاری، ابوبکر بن محمد بن عمر بن حزم، عمر بن عبدالعزیز، ابوبکر بن عبدالرحمن بن الحارث اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ یہ سب قاضی ہیں، سب نے قضا کے فیصلے کئے ہیں۔ یہ ایسی اسناد ہیں کہ جس میں سب قاضی ہی قاضی ہیں۔

(۱۵) باب من أخّر الغريم إلى الغد أو نحوه ولم ير ذلك مطلا

"وقال جابر: إشتد الغرماء في حقوقهم في دين أبي فسأ لهم النبي ﷺ أن يقبلو الثمر حائطي فابوا فلم يعطهم الحائط ولم يكسره لهم، وقال: "ساغدو عليكم غدا" فغدا علينا حين أصبح فدعا في ثمرها بالبركة فقضيتهم"

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی مدیون کو یہ کہنا کہ آج کے بجائے کل لے جانا کسی حاجت کی وجہ سے، تو یہ مطل میں داخل نہیں۔ اگر دینے کا ارادہ ہی نہیں ہے، ویسے ہی ٹال مٹول کر رہا ہے، تو اس صورت میں یہ مطل میں داخل ہوگا۔

(۱۶) باب من باع مال المفلس أو المعدم فقسمه بين الغرماء أو أعطاه حتى ينفق على نفسه

۲۴۰۳ ـ حدثنا مسدد: حدثنا يزيد بن زريع: حدثنا حسين المعلم: حدثنا عطاء بن أبي رباح عن جابر بن عبدالله رضي الله عنهما قال: اعتق رجل غلاما له عن دبر، فقال النبي ﷺ "من يشتريه مني؟" فاشتراه نعيم بن عبد الله فأ خذ ثمنه فد فعه اليه".

[راجع: ۲۱۴۱]

یہ ترجمۃ الباب قائم کیا کہ جو مفلس کا مال فروخت کرے وہ قیمت کو یا تو غرماء میں تقسیم کر دے، یا اسی مدیون مفلس کو دیدے تا کہ اپنی ذات پر خرچ کرے، اس میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی کہ ایک شخص نے اپنے غلام کو مدبر بنایا تھا تو نبی کریم ﷺ **"من يشتري مني"** کہہ کر اس کا نیلام کر دیا اور اس کا ثمن لے کر اسی (مدیون) کو لوٹا دیا۔

اپنا اور بیوی بچوں کا حق غرماء سے مقدم ہے

دوسری روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان صاحب نے جو غلام مدبر بنایا تھا ان کے پاس سوائے اس غلام کے اور مال تھا ہی نہیں اور اس کو مدبر بنا دیا جس سے اپنے نفس اور اپنے اہل کا حق فوت ہو گیا۔

اب کوئی اور مال نہیں ہے تو کھائے گا کہاں سے؟ اپنے بچوں کو کھلائے گا کہاں سے؟ اس واسطے حضور

اکرم ﷺ نے اس مدبر کو فروخت کر دیا اور فروخت کر کے ثمن ان کو لوٹا دی کہ یہ خود کھاؤ اور اپنے گھر والوں کو کھلاؤ تو یہاں ان کا اپنا نفس اور ان کے گھر والے غرماء کے قائم مقام تھے، کیونکہ ان کا حق مقدم تھا۔ اس واسطے نبی کریم ﷺ نے وہ مال لے کر بیچا اور اس کا ثمن ان کو لوٹا دیا۔

وجہ استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص ایسا کام کرے کہ جس سے اپنے نفس یا اپنے اہل وعیال کا حق فوت ہو رہا ہو تو امام کو حق حاصل ہے کہ وہ اس کو فروخت کر کے اس کا ثمن واپس اسی کو دیدے تا کہ یہ اپنے نفس اور اپنے اہل وعیال کا حق ادا کر سکے۔ اور جب اپنے نفس اور اہل عیال کے حق کو ادا کرنے کے لئے کسی کے مال کو بیچا جا سکتا ہے تو اگر غرماء دوسرے ہوں تو بطریق اولیٰ دوسرے کا مال بیچا جا سکے گا۔ [۱۷]

ترجمۃ الباب میں **"من باع مال المفلس"** کہا اور یہ بظاہر تقسیم غرماء میں نہیں ہے بلکہ تقسیم غرماء بطور دلالت النص ہے۔

"أو أعطاه حتى ينفق على نفسه" یا اس کو دیدے تا کہ اپنے اوپر خرچ کرے۔ یہاں اصل میں ہوا یہ تھا کہ اس شخص نے جو غلام مدبر بنایا تھا، تو اس سے انہوں نے اپنا اور گھر والوں کا حق فوت کیا تھا۔ حضور اکرم ﷺ نے مال بیچ کر انہی کو لوٹا دیا کہ اپنا حق ادا کرو۔ تو جب اپنا حق ادا کرنے کے لئے بیچنے کی اجازت ہے تو باہر کے غرماء کا حق ادا کرنے کے لئے بیچنے کی بطریق اولیٰ اجازت ہوگئی۔

(۱۷) باب إذا أقرضه إلى أجل مسمى أو أجله في البيع

"وقال ابن عمر في القرض إلىٰ أجل : لأباس به ، وإن أعطى أفضل من دراهمه مالم يشترط وقال عطاء وعمرو بن دينار : هو إلى أجله في القرض"

۲۴۰۴ ـ وقال الليث :حدثني جعفر بن ربيعة ، عن عبدالرحمٰن بن هرمز، عن أبي هريرة ﷺ عن رسول الله ﷺ أنه ذكر رجلا من بني إسرائيل سأل بعض بني إسرائيل أن يسلفه فدفعها إليه إلى أجل مسمى، فذكر الحديث. [راجع:۱۴۹۸]

اگر کوئی معین مدت کے لئے قرض دے یا بیع میں ثمن مؤجل کر دے تو جہاں تک ثمن سے مؤجل کرنے کا تعلق ہے اس کا جواز تو مجمع علیہ ہے لیکن جو پہلا جز ہے **"اذا أقرضه الى أجل مسمى"** یعنی قرض کے

[۱۷] یدل علی ان البیع کان تعزیراً له . (فیض الباری ، ج: ۳ ، ص : ۳۱۴).

اندر کوئی اجل متعین کرنے کا اس بارے میں فقہا کے اندر اختلاف ہے۔ [۱۸]

امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا مسلک

امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تینوں بزرگوں کے نزدیک قرض تاجیل کو قبول نہیں کرتا جس کے معنی یہ ہیں کہ قرض اگر کسی معین مدت تک کے لئے دیا گیا ہو تب بھی مقرض کو قضاءً یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس مدت سے پہلے جب چاہے قرض وصول کرلے یعنی پہلے قرض کا مطالبہ کرسکتا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قرض تاجیل کو قبول کرتا ہے جس طرح بیع مؤجل ہوسکتی ہے۔ اسی طرح قرض بھی مؤجل ہوسکتا ہے اور اگر قرض میں کوئی مدت مقرر کردی تو اس سے پہلے مقرض کو مطالبہ کا حق نہیں، نہ قضاءً نہ دیانتاً۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی تائید

امام بخاری رحمہ اللہ اس مسئلہ میں امام مالکؒ کی تائید کرنا چاہتے ہیں اور امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کررہے ہیں کہ قرض مؤجل ہوتا ہے۔

”وقال ابن عمر فی القرض إلی أجل: لأباس به، وان أعطی أفضل من دراهم مالم یشترط“.

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا قرض الی اجل کے بارے میں، فرمایا کہ چاہے بعد میں وہ اچھے دراہم اور بہتر دراہم دیدے اس میں کوئی حرج نہیں جب تک عقد قرض میں زیادتی کی شرط نہ ہو۔ اب یہ جو فرمایا **”لأباس به“** ہوسکتا ہے عبداللہ بن عمرؓ کا مذہب وہی ہے جو امام مالکؒ اور امام بخاریؒ کا ہے۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر قرض میں کوئی اجل کا ذکر کردے تو اس میں کوئی حرج نہیں وہ ایک وعدہ کی طرح ہوگا کہ بھئی میں تمہیں ایک مہینہ کے لئے ادھار دیتا ہوں، قرض دیتا ہوں تو یہ ایک وعدہ ہوگا۔ قضاءً تو دائن ہر وقت مطالبہ کرسکتا ہے لیکن وعدہ کرلیا کہ میں ایک مہینہ تک مطالبہ نہیں کروں گا تو دیانتاً اس کو چاہئے کہ وہ ایک مہینہ سے پہلے مطالبہ نہ کرے اگر اس سے پہلے مطالبہ کرے تو وعدہ خلافی ہوگی اور ہم بھی

---

[۱۸] وهذا لازم بالاتفاق، فإنه من المعاوضات، بخلاف الأول، فإنه کان من باب المروءات. (فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۱۵).

کہتے ہیں کہ وعدہ خلافی ہوگی۔ اس واسطے مطالبہ کرنا دیانتاً مناسب نہیں ہے، جائز نہیں ہے لیکن قضاءً اسے مطالبہ کا حق حاصل ہے ہوسکتا ہے ”**لأباس به**“ سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا مطلب بھی یہی ہو۔

”وقال عطاوعمرو بن دینار : هو إلى أجله في القرض“

عطا بن ابی رباحؒ اور عمرو بن دینارؒ کا کہنا یہ ہے کہ جب قرض میں اجل لگائی ہے، تو اس سے قبل مطالبہ کا حق نہیں **”وقال الليث :حدثني جعفر بن ربيعه ....“**

یہ وہی لکڑی بہانے والا واقعہ ہے اس میں جو قرضہ دیا تھا وہ **”الی أجل مسمی“** دیا تھا۔ تو امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ یہ اجل شرط تھی، مقبول تھی قضاءً معتبر تھی اور حنفیہ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ وعدہ تھا نہ کہ بطور شرط۔

سوال : سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اجل بطور وعدہ ہونے کی دلیل کیا ہے؟

جواب: دلیل ایک تو یہ آثار ہیں اور دوسرا وہ یہ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی مانع نہیں ہے، کوئی ایسی حدیث نہیں ہے جو یہ کہے کہ قرض میں دیتے وقت وعدہ نہیں کرسکتا۔ اور جمہور کا کہنا یہ ہے کہ قرض جو ہے ایک تبرع ہے عقد معاوضہ نہیں اور اجل جو قضا میں ہوتی ہے وہ عقد معاوضہ میں ہوتی ہے نہ کہ عقد تبرع میں۔

۲۴۰۸ ۔ حدثنی عثمان : حدثنا جرير ، عن منصور ،عن الشعبي،عن ورادمولى المغيرةبن شعبة ، عن المغيرة بن شعبة قال : قال النبي ﷺ ان الله حرم عليكم حقوق الامهات ، ووأد البنات ، ومنع وهات وكره لكم قيل وقال ، كثرة السؤال ، واضاعة المال

[راجع: ۸۴۴]

اس حدیث میں جو **”منع وهات“** ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کے حقوق کو منع کریں ادا نہ کریں اور جب اپنا حق لینے کا معاملہ آئے تو کہتے ہیں کہ لاؤ یعنی یہ وہی بات ہے جو قرآن کریم میں بیان کی گئی ہے

﴿ اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ ﴾

”وكره لكم قيل وقال وكثرة السؤال“

اور **”قيل وقال“** سے بھی منع فرمایا، بلا وجہ کا مباحثہ جس میں ساری قوم مبتلا ہے۔ بلا وجہ کا بحث ومباحثہ جس کا کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا، ایسے معاملات میں بحث ومباحثہ کرنا جس کے اندر شریعت نے آپ کو کسی چیز کا پابند نہیں کیا، آپ سے آخرت میں سوال نہیں ہوگا اس میں قیل وقال سے منع فرمایا۔ اور کثرت سے سوال کرنا یعنی ایسے سوال جن کا آپ کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں تو ان فضولیات میں وقت ضائع کرنے سے نبی کریم ﷺ نے منع فرمایا۔

موضع ترجمہ واضاعۃ المال

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشاء یہی آخری لفظ ہے اور اسی سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات

پر استدلال کیا ہے کہ سفیہ پر حجر (روک) عائد کیا جا سکتا ہے۔ قاضی ایسے شخص کو جو سفیہ ہو اور مال ضائع کرتا پھرتا ہو اس پر حجر عائد کرسکتا ہے کہ آئندہ تم فلاں سے پوچھے بغیر خریداری نہیں کرو گے وغیرہ وغیرہ۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ عاقل بالغ پر حجر نہیں ہوتا۔

صاحبین رحمہما اللہ کا قول

صاحبین رحمہما اللہ کا قول یہ ہے کہ حجر ہوسکتا ہے۔

جمہور کا قول

جمہور کا بھی یہی قول ہے اور فتویٰ بھی اسی قول پر ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا قول مختار

اسی کو امام بخاری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور اضاعت مال کی حدیث سے استدلال کیا ہے، جس میں اضاعت مال سے منع کیا گیا ہے اور قاضی ولایت رکھتا ہے اور وہ حجر عائد کرسکتا ہے۔ قرآن کریم سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے یتامیٰ کے اموال کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِیْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِیٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِیْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاo وَابْتَلُوا الْیَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَیْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ ﴾[19]

ترجمہ: اور مت پکڑا دو بے عقلوں کو اپنے وہ مال جن کو بنایا ہے اللہ نے تمہارے گزران کا سبب اور ان کو اس میں سے کھلاتے اور پہناتے رہو اور کہو ان سے بات معقول اور سدھاتے رہو یتیموں کو جب تک پہنچیں نکاح کی عمر کو پھر اگر دیکھو ان میں ہوشیاری تو حوالہ کردو۔

یعنی صرف بالغ ہونے پر ان کو مت دو یہاں تک کہ ان سے رشد معلوم ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ رشد معلوم ہونے کے بعد دیا جائے گا۔ لہٰذا یہ قول واضح ہے۔

---

[19] [النساء: ۴]

كتاب الخصومات

٢٤١٠ - ٢٤٢٥

۴۴ ـ كتاب الخصومات

(۱) باب مايذكر فى الاشخاص والخصومات بين المسلم واليهود

۲۴۱۰ ـ حدثنا أبو الوليد: حدثنا شعبة قال: عبدالملک بن ميسرة أخبرني، قال: سمعت النزال بن سبرة: سمعت عبدالله يقول: سمعت رجلا قرأ آية، سمعت من النبی ﷺ خلافها فأخذت بيده فأتيت به رسول الله ﷺ فقال: كلاكما محسن، قال شعبة أظنه قال: لاتختلفوا فإن من كان قبلكم اختلفوا فهلكوا. [أنظر: ۳۴۷۶، ۵۰۶۲] [1]

اشخاص کے معنی ہیں قاضی کے پاس دعویٰ لے جانا۔ "شَخَصَ" کے معنی اُٹھنا۔ اشخاص کے معنی اٹھانا مطلب یہ ہے کہ قضیہ یا مدعی علیہ کو اٹھا کے قاضی کے پاس لے جانا۔ اس میں امام بخاری رحمہ اللہ چند حدیثیں لائے ہیں۔ اور ہر ایک میں آرہا ہے کہ لوگوں میں باہم تنازع پیدا ہوا تو معاملہ لے کر حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ معاملہ کیا تھا۔

اس حدیث میں بھی قرأت کی بات ہے قراءت کا اختلاف بالآخر حضور اکرم ﷺ کے پاس لیجایا گیا۔

۲۴۱۱ ـ حدثنا يحيى بن قزعة: حدثنا إبراهيم بن سعد، عن ابن شهاب: عن أبی سلمة وعبدالرحمٰن الأعرج، عن أبی هريرة ﷺ قال: استب رجلان، رجل من المسلمين ورجل من اليهود، فقال المسلم: والذی اصطفى محمدا على العالمين، فقال اليهودی: والذی اصطفى موسى على العالمين، فرفع المسلم يده عند ذلک فلطم وجه اليهوی. فذهب اليهودی إلى النبی ﷺ فأخبره بما كان من أمره وأمر المسلم، فدعا النبی ﷺ المسلم فسأله عن ذلک فأخبره، فقال النبی ﷺ لاتخيروني على موسى، فان الناس يصعقون يوم القيامة فأصعق معهم فأكون أول من يفيق فاذا موسى باطش جانب العرش فلاأدری أكان فيمن صعق فأفاق قبلی، أو كان ممن استثنى الله [أنظر: ۳۴۰۸، ۳۴۱۴، ۴۸۱۳، ۶۵۱۷، ۶۵۱۸، ۷۴۲۸] [2]

---

[1] مسند أحمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبدالله بن مسعود، رقم ۳۶۰۸، ۳۶۱۲، ۳۷۱۳، [illegible]

[2] و صحيح مسلم، كتاب الفضائل، باب من فضائل موسى، رقم: ۴۳۷۶، وسنن الترمذی، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة الزمر، رقم: ۳۱۶۸، وسنن أبی داؤد، كتاب السنة، باب فى التخيير بين الأنبياء عليهم الصلاة والسلام، رقم: ۴۰۵۱، ومسند احمد، باقی مسند المكثرين، باب مسند أبی هريرة، رقم: ۷۲۷۰، ۹۴۴۵.

تشریح

یہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان گالم گلوچ ہوگئی یعنی ایک دوسرے کو برا بھلا کہنے لگے۔ ان میں سے ایک صاحب مسلمان تھے اور دوسرے یہودی تھے۔ مسلمان نے کہا کہ قسم اس ذات کی جس نے نبی کریم ﷺ کو تمام عالموں پر فوقیت عطا فرمائی تو یہودی نے کہا قسم اس ذات کی جس نے موسیٰ علیہ السلام کو تمام عالموں پر فوقیت عطا فرمائی تو مسلمان نے تھپڑ مار دیا، تو یہودی معاملہ لے کر حضور اکرم ﷺ کے پاس چلا گیا، یہاں پر اشخاص سے یہی مقصود ہے۔

"لاتخیّرونی علی موسیٰ"

آپ ﷺ نے مسلمان کو بلایا اور پوچھا کیا قصہ ہے؟ تو انہوں نے واقعہ بتایا تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا **"لاتخیّرونی علی موسی** علیہ السلام" مجھے موسیٰ علیہ السلام پر فوقیت نہ دو۔ اس واسطے کہ قیامت کے دن سب صاعقہ کا شکار ہوں گے یعنی بے ہوشی کا، میں بھی ان کے ساتھ بے ہوش ہوں گا اور سب سے پہلا ہوش میں آنے والا میں ہوں گا۔ جب میں ہوش میں آؤں گا تو اچانک موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے کھڑے نظر آئیں گے۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ بھی بے ہوش ہوئے تھے اور مجھ سے پہلے ہوش میں آگئے یا وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کو اللہ جل جلالہ نے بے ہوشی سے مستثنیٰ کر دیا اور بے ہوش نہیں ہوئے تو اس واسطے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ ایک فضیلت حاصل ہے تو مجھے ان پر فوقیت نہ دو۔

۲۴۱۲۔ حدثنا موسی بن إسماعیل :حدثنا وھیب :حدثناعمرو بن یحیی عن أبیه، عن أبی سعید الخدری رضی اللہ عنہ قال : بینا رسول اللہ ﷺ جالس جاء یھودی فقال : یا أبا القاسم، ضرب وجھی رجل من أصحابک. فقال : من؟ قال رجل من الأنصار. قال : ادعوہ ، فقال: أضربته؟ قال : سمعته بالسوق یحلف والذی اصطفی موسی علی البشر قلت : أی خبیث علی محمد ﷺ ؟ فأخذتنی غضبة ضربت وجھه. فقال النبی ﷺ : ((لاتخیروا بین الأنبیاء إنّ الناس یصعقون یوم القیامة فأکون أول من تنشق عنه الأرض فاذا انا بموسی أخذ بقائمة من قوائم العرش، فلا أدری أکان فیمن صعق ، أم حوسب بصعقة الأولی)). [أنظر : ۳۳۹۸، ۴۶۳۸، ۶۹۱۶، ۶۹۱۷، ۷۴۲۷] [۳]

[۳] و صحیح مسلم ،کتاب الفضائل ، باب من فضائل موسی ، رقم : ۴۳۷۸ ، وسنن أبی داؤد ،کتاب السنة ، باب فی التخییر بین الأنبیاء علیھم الصلاة والسلام ،رقم : ۴۰۴۸ ، ومسند أحمد، باب مسند أبی سعید الخدری ، رقم : ۱۰۸۳۵، ۱۰۸۵۶، ۱۰۹۳۸ .

یہاں دو مسئلے ہیں

ایک مسئلہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نے ایک روایت میں فرمایا کہ **"لا تخیرونی"** حالانکہ دوسری روایت میں خود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا **"أنا سید وُلد آدم"** اور یہ واقعہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء علیہم السلام پر فضیلت حاصل ہے، جب فضیلت حاصل ہے تو آپ ﷺ نے اس فضیلت کو بیان کرنے سے منع کیوں فرمایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بعض نے کہا کہ تواضعاً آپ ﷺ نے ایسا فرمایا لیکن زیادہ صحیح بات مجھے یہ معلوم ہوتی ہے کہ مقصود درحقیقت یہ ہے کہ فی نفسہ نبی کریم ﷺ کو تمام انبیاء پر فضیلت حاصل ہے لیکن اس فضیلت کا بکثرت ذکر کرتے رہنا بسا اوقات دوسرے انبیاء علیہم السلام کے احترام کے منافی ہو جاتا ہے۔

جب دو چیزوں میں تفضیل دی جاتی ہے تو جو مفضول ہوتا ہے اس کے احترام کے خلاف کوئی بات زبان سے نکل ہی جاتی ہے جیسے واعظین کی عادت ہے کہ بڑی لمبی چوڑی تقریریں کرتے ہیں کہ دیکھو حضور اکرم ﷺ نے فرمایا **"لاتحزن ان اللہ معنا"** اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا **"ان معی ربی سیھدین"** موسیٰ علیہ السلام نے اپنا نام لیا اور نبی کریم ﷺ نے معنا فرمایا یعنی امت کو شامل کیا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بھی شامل کیا، تو یہ سب واعظین اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس نبی کے بارے میں مفضولیت کا دعویٰ کیا جارہا ہے اس کے احترام کے خلاف ہے، اس واسطے خواہ مخواہ اس بحث میں پڑنے کی ضرورت کیا ہے!

"التطبیق بین لا تخیروا وأنا سید ولد آدم"

ٹھیک ہے یہ بات مسلم ہے کہ عقیدے کے مطابق نبی کریم ﷺ افضل الخلائق اور افضل الانبیاء ہیں۔

اب تفصیلات حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ تم میرا دوسرے انبیاء کرام سے موازنہ اس انداز سے نہ کرو کہ دوسرے انبیاء کی معاذ اللہ تحقیر کا شائبہ پیدا ہو، یا اس میں جھگڑے نہ کرو یہ ایسی جھگڑنے والی بات نہیں ہے کیونکہ کسی نہ کسی نبی کو بعض اوقات کوئی جزوی فضیلت حاصل ہوتی ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں ہے۔ اس واسطے خواہ مخواہ اس موضوع کو موضوع بحث بنانا جسے کسی نبی کی شان میں احترام کی کمی کا شائبہ ہو یہ مناسب نہیں، یہ مقصد ہے **"لا تخیرونی علی ان لاتفضلونی علی الا نبیاء"** کا۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا **"لا یقول: أنا خیر من یونس بن متی"** مجھے یونس بن متی سے بھی بہتر مت کہو کیونکہ جب تم کہو گے تو حدود میں قائم نہ رہ سکو گے۔ اور اس میں اندیشہ ہے کہ کسی نبی کی شان میں کوئی بات اس کے خلاف نکل جائے۔[۴]

"فان الناس یصعقون یوم القیامۃ فأکون أول من تنشق عنہ الأرض فاذا أنا بموسی ......"۔

---

[۴] وصحیح مسلم، کتاب الفضائل، رقم: ۴۳۸۱۔

دوسرا مسئلہ جس میں شراح حدیث بڑے پریشان اور سرگرداں ہوئے وہ صعقہ والا مسئلہ ہے۔ قیامت کے دن یہ صعقہ ہوگا اور سب پر طاری ہوگا اور مجھ پر بھی طاری ہوگا پھر سب سے پہلے میں ہوش میں آؤں گا۔ قیامت کے دن جب صور پھونکا جائے گا تو جتنے لوگ اس وقت زندہ ہوں گے سب پر صعقہ طاری ہوگا جس پر ان کو موت آجائے گی اور ''افاقہ'' سے مراد ہے کہ جب دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔

اشکال:

اس تقدیر پر اشکال ہوتا ہے کہ جس وقت قیامت کے دن صعقہ آئے گا تو وہ سب زندوں پر ہوگا اور جن کے اوپر موت طاری ہو چکی (دنیا میں) وہ تو پہلے ہی سے میت ہیں ان پر دوبارہ صعقہ آنے کے کیا معنی اور پھر حضور اکرم ﷺ کا یہ کہنا کہ میں سب سے پہلے زندہ ہوں گا یا سب سے پہلے افاقہ مجھے ہوگا اس کا کیا مطلب ہے اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر موت ہی طاری نہیں ہوئی تو پھر موسیٰ علیہ السلام کو مستثنیٰ کہنے کا کیا معنی؟

جواب:

شراح نے اس میں لمبی چوڑی بحثیں کی ہیں لیکن حقیقت میں کوئی اشکال کا محل نہیں، حقیقت حال یوں ہے کہ اس صعقہ سے مراد وہ صعقہ ہے جو کہ احیاء پر بھی آئے گا اور اموات پر بھی آئے گا۔ احیاء پر اس طرح آئے گا کہ ان پر موت طاری ہو جائے گی اور اموات پر اس طرح کہ ان کی حیات برزخیہ جو کچھ بھی ہے یعنی ان کی جو ارواح ہیں ان پر بھی صعقہ طاری ہوگا کہ عالمِ برزخ میں ان کو جس درجہ کی حیات حاصل تھی وہ بھی سلب کر لی جائے گی۔

حیات برزخیہ کے بھی کئی درجات ہوتے ہیں:

عام مسلمانوں کے، شہداء کے اور انبیاء کرام علیہم السلام کے الگ الگ لیکن فی الجملہ حیات برزخیہ موجود ہے، روح فنا نہیں ہوتی، لہٰذا جن کو حیات برزخیہ حاصل ہے ان کی روح بھی سلب کر لی جائے گی اور پھر جو افاقہ ہوگا وہ بھی اسی حساب سے ہوگا کہ جو احیاء تھے اور موت طاری ہوئی تھی وہ دوبارہ زندہ ہو جائیں گے اور جن کو حیات برزخیہ حاصل تھی اور وہ سلب کر لی گئی تھی ان کو پھر دوبارہ حیات عطا فرما دی جائے گی اور حیات اب مع الجسم ہوگی۔ اس لئے کوئی اشکال کی بات نہیں۔

بعض لوگ اس حدیث کی بناء پر کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام پر موت طاری ہی نہیں ہوئی یہ بات خلاف بداہت اور خلاف واقعہ ہے۔

اب جو حضور اکرم ﷺ فرما رہے ہیں کہ میں سب سے پہلے افاقہ پانے والا ہوں گا لیکن موسیٰ علیہ السلام عرش کا پایہ پکڑے ہوئے نظر آئیں گے۔

اس کی توجیہ یہ ہے کہ یا تو ان پر صعقہ طاری ہی نہیں ہوا یعنی ان کی حیاتِ برزخیہ بدستور باقی رکھی گئی

یا طاری ہوا لیکن مجھ سے پہلے افاقہ ہوگیا۔ یہ فضیلت جزیہ ان کو حاصل ہے۔

اس روایت میں جو سب **"بصعقته الأولى"** کا مطلب علماء نے یہ بیان کیا ہے کہ کوہِ طور پر صعقہ آپ پر ہو گیا تھا تو اللہ ﷻ نے اس کا بدلہ ان کو یہ عطا فرمایا (واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم) باقی اس کی حقیقت کیا ہے سچی بات تو یہ ہے کہ ہم ادراک کرنے کے اہل ہی نہیں ہیں کہ صعقہ کیسا ہوگا اور اس کے افاقے کی کیا کیفیت ہوگی اور اس کی زیادہ تحقیق میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں، ہماری محدود عقل اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔

یہ جو کہا کہ مجھے سب سے پہلے افاقہ ہوگا، مطلب یہ ہے کہ میرے گمان کے مطابق میں سب سے پہلے کھڑا ہوں گا لیکن جا کے دیکھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کھڑے تھے تو معلوم ہوا کہ وہ پہلے ہیں۔

۲۴۱۳ ۔ حدثنا موسى : حدثنا همام ، عن قتادة ، عن أنس ﷺ : أن يهوديا رض رأس جارية بين حجرين ، قيل : من فعل هذا بك؟ أفلان أفلان؟ حتى سمي اليهودى فأومأت برأسها ، فأخذ اليهودى فاعترف فأمر به النبى ﷺ فرض رأسه بين حجرين. [انظر: ۲۷۴۶ ، ۵۲۹۵، ۶۸۷۶ ، ۶۸۷۷ ، ۶۸۷۹ ، ۶۸۸۴ ، ۶۸۸۵] [۵]

یہ حدیث حضرت انس ﷺ سے مروی ہے کہ ایک یہودی نے ایک جاریہ کا سر پتھروں میں کچل دیا، پھر آپ ﷺ نے بھی قصاصاً اس کا سر کچلا۔ اس میں جو قصاص سے متعلق موضوعات ہیں ان کا بیان ان شاء اللہ حدود و قصاص میں آئے گا۔ یہاں مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمان اور یہودی کے درمیان خصومت جس کا ذکر ترجمۃ الباب میں ہے وہ یہاں پائی گئی۔[۶]

(۲) باب من رد أمر السفيه والضعيف العقل، وإن لم يكن حجر عليه الإمام

"ويذكر عن جابر ﷺ أن النبى ﷺ رد على المتصدق قبل النهى ثم نهاه. وقال مالك : إذا كان لرجل على رجل مال وله عبد لاشئ له غيره فاعتقه لم يجز عتقه".

---

۵ وفى صحيح مسلم ، كتاب القسامة والمحاربين والقصاص والديات ، باب ثبوت القصاص فى القتل بالحجر وغيره من المحددات ، رقم : ۳۱۶۵، ۳۱۶۷ ، وسنن الترمذى ، كتاب الديات عن رسول الله ، باب ماجاء فيمن رضخ رأسه بصخرة ، رقم : ۱۳۱۴ ، وسنن النسائى ، كتاب القسامة ، باب القود من الرجل للمرأة ، رقم : ۴۶۵۹ ، ۴۶۶۰ ، وسنن أبى داؤد ، كتاب الديات ، باب يقاد من القاتل ، رقم : ۳۹۲۴ ، ۳۹۲۶ ، ۳۹۳۱ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب الديات ، باب يقتاد من القاتل كما قتل ، رقم : ۲۶۵۵ ، ۲۶۵۶ ، ومسند أحمد ، باب مسند أنس بن مالك ، رقم ۱۲۲۸۷ ، ۱۲۴۲۸ ، ۱۲۵۳۶ ، ۱۲۶۳۴ ، ۱۳۲۵۹ ، ۱۳۳۳۷ ، وسنن الدارمى ، كتاب الديات ، باب كيف العمل فى القود ، رقم : ۲۲۴۹

۶ والجواب عن الرض أنه كان تعزيراً ، و سياسة . (فيض البارى، ج:۳ ، ص: ۳۲۰)

اس ترجمۃ الباب میں سفیہ کے معاملات کا حکم بیان کرنا مقصود ہے (سفیہ کے معنی ہیں بیوقوف) جو آدمی سفیہ ہو معاملات غلط سلط کرتا ہے تو اس کے بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مذہب

امام ابوحنیفہؒ اور فقہاء کرامؒ کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ خواہ آدمی سفیہ ہی کیوں نہ ہو امام اس کے اوپر حجر عائد نہیں کرسکتا۔ ہر صورت میں اس کے جو تصرفات ہیں نافذ ہوں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حجر کے اسباب یہ ہوتے ہیں کہ کوئی آدمی صبی یا مجنون ہو تب تو اس پر حجر عائد ہوسکتا ہے باقی اور کسی سبب سے حاکم بھی حجر عائد نہیں کرسکتا۔ اور یہی مسلک بعض مالکیہ کا بھی ہے۔

صاحبین اور امام شافعی رحمہم اللہ کا مذہب

امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ سفاہت کی بنا پر بھی حجر عائد کرنے کا اختیار امام کو ہے۔ لیکن ان تصرفات میں حجر ہوسکتا ہے جو ہزل کے ساتھ صحیح نہیں ہوتے۔ بعض تصرفات ایسے ہیں جو ہزل (مذاق) میں بھی صحیح ہو جاتے ہیں جیسے طلاق، نکاح اور رجعت کہ **"جدھن جدو ھزلھن جد"** ان میں تو وہ بھی کہتے ہیں کہ حجر عائد نہیں ہوسکتا۔ لیکن اس کے علاوہ اور تصرفات جیسے ہزل والی بیع صحیح نہیں ہوتی اس میں تصرف کے اوپر حجر عائد کیا جاسکتا ہے۔ یہ صاحبین کا مسلک ہے۔

بعض مالکیہ کا مذہب

بعض مالکیہ کا مذہب یہ ہے کہ حجر مطلقاً عائد ہوسکتا ہے، ہر چیز میں چاہے وہ تصرفات ہزل والے ہوں یا جد والے ہوں ہر قسم کے تصرفات پر حجر عائد ہوسکتا ہے۔

یہ تینوں مذاہب تو امام کی طرف سے حجر عائد کرنے کے ہیں۔ [۷]

ایک چوتھا مذہب یہ ہے کہ چاہے امام نے حجر عائد نہ کیا ہو لیکن اگر آدمی کا سفیہ ہونا ثابت ہے اور سفیہ ہونے کی حالت میں اس نے کوئی معاملہ کرلیا جو بالکل بدیہۃ البطلان ہے۔ مثلاً ایک روپے کی چیز ایک ہزار روپے میں خرید لی تو یہ بالکل بدیہی طور پر غلط ہے اور نقصان دہ ہے۔ اس لئے امام کے حجر عائد نہ کرنے کے باوجود وہ

---

۷ واختار البخاری أن السفاهة أيضاً من اسباب الحجر، كماهو مذهب الصاحبين، ويمكن أن يكون مذهبه اوسع منهما [illegible] لم يحجر عتقه) وبه قال مالك، خلافا للحنفية (فيض الباری، ج ۳، ص ۳۲۱، وفتح الباری، ج [illegible]، ص [illegible] في كتاب البيوع، باب بيع المدبر).

صرف بھی نافذ نہیں ہوگا اور تصرف نافذ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا ولی جا کر اس تصرف کو منع کر سکتا ہے۔ حنابلہ اس کو خیار مسترسل کہتے ہیں۔ خیار مسترسل یہ ہے کہ کوئی ضعیف یا بھولا بھالا، بیوقوف آدمی اگر عقد کر لے تو پھر اس (ولی) کو منع کا اختیار ملتا ہے چاہے امام نے اس پر حجر عائد کیا ہو یا نہ کیا ہو۔

"باب من رد أمر السفيه............" سے امام بخاری اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ یہ ان لوگوں کی دلیل ہے جو یہ کہتے ہیں کہ سفیہ اور ضعیف العقل کے معاملات رد کئے جائیں گے اگرچہ امام نے حجر عائد نہ کیا ہو۔

آگے اسی کی دلیل میں **"ویذکر عن جابر ﷺ: النبی ﷺ ردعلی المتصدق قبل النهی ثم نهاه"** کہہ کر اس واقعہ کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو حضرت جابر ﷺ نے روایت کیا کہ ایک شخص نے اپنے مدبر غلام کو آزاد کر دیا، اس شخص کے پاس سوائے اس مدبر غلام کے کوئی اور مال نہیں تھا، اب وہی مدبر بنا دیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے خود اپنے نفس کا حق بھی ضائع کیا اور اپنے گھر والوں کا حق بھی ضائع کیا تو باوجود یہ کہ حضور اکرم ﷺ نے اس شخص پر باقاعدہ حجر کا حکم نہیں لگایا تھا لیکن چونکہ اس نے تصرف ایسا کیا جو بیوقوفی کا تصرف تھا اور اس تصرف کی وجہ سے اس نے اپنا اور اپنے گھر والوں کا حق ضائع کیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کے تصرف کو باطل کر کے مدبر بنانے کے باوجود اس کے غلام کو فروخت کر دیا اور متصدق پر واپس لوٹا دیا۔ پھر بعد میں اس کو منع کر دیا کہ آئندہ ایسا کام مت کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حجر کرنے سے پہلے بھی امام اس کے تصرفات کو ختم کر سکتا ہے۔[8]

بیع مدبر کے عدم جواز پر حنفیہ کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ کی اس تشریح سے بیع المدبر کے مسئلہ میں حنفیہ کی تائید ہوتی ہے، جس کا حاصل یہ کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے عقد تدبیر کو ختم کر دیا، جب عقد تدبیر ختم کر دیا تو اب وہ مدبر نہ رہا جب مدبر نہ رہا تو بیع مدبر کی نہ ہوئی بلکہ عام غلام کی بیع ہوئی۔

لہٰذا شوافع وغیرہ جو مدبر کی بیع کے جواز پر اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں ان کا استدلال اس وقت تام ہوگا جبکہ غلام کا مدبر ہونا ثابت ہو اور پھر بیع کی جائے لیکن یہاں امام بخاری رحمہ اللہ فرما رہے ہیں کہ اس کے عقد تدبیر کو ختم کر دیا۔ اس کو یہ اختیار ہی نہیں تھا کہ وہ ایسا کرے کیونکہ اول تو اس کے پاس کوئی اور مال نہیں تھا، اس کے ذمہ دیون بھی اور گھر والوں کے حقوق بھی تھے تو ایسی صورت میں اس کو تدبیر کا حق تھا نہیں اور اس نے تدبیر کر دی تو آپ ﷺ نے اس کی تدبیر کو باطل کر کے پھر بیچا۔ تو گویا مدبر کو نہیں بیچا بلکہ عام غلام کو بیچا۔ لہٰذا اس سے شافعیہ کا بیع مدبر کے جواز پر استدلال تام نہیں ہوتا۔[9]

"وقال مالک: إذا كان لرجل على رجل مال وله عبد ولا شئ له غيره

---

۸ تکملہ فتح الملهم، ج ۱، ص ۳۷۹۔

۹ وان والجواز مطلقاً مذهب الشافعي وأهل الحديث (فتح الباری، ج ۵، ص ۱۶۶، کتاب العتق)

فاعتقه لم يجز عتقه".

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ مال ہو اور اس کے پاس ایک غلام کے سوا کوئی اور مال نہ ہو اور وہ اس کو آزاد کردے تو اس کا آزاد کرنا جائز نہ ہوگا، اس سے وہ استدلال کر رہے ہیں کہ باوجود یہ کہ وہ مجور نہیں ہے لیکن امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ اس کی آزادی درست نہ ہوگی۔

ہم (احناف) اس کے اوپر ایک اضافہ کرتے ہیں کہ وہ یہ تصرف مرض الموت میں کر رہا ہو تو یہ تصرف کلی طور پر نافذ نہیں ہوگا کیونکہ اس سے ورثا اور دائنین کا حق متعلق ہوگیا لیکن اگر مرض الموت کی حالت نہیں ہے تو پھر اس کا تصرف نافذ ہو جائے گا۔

(۳) باب من باع على الضعيف ونحوه فدفع ثمنه إليه وأمره بالإصلاح والقيام بشأنه فان افسد بعد منعه

"لان النبيﷺ نهى عن إضاعة المال".

فرمایا کہ جس شخص نے کسی ضعیف العقل یعنی بیوقوف وغیرہ کا مال بیچ کر اس کی قیمت اس کو ادا کردی اور حکم دیا کہ بھئی اپنا خیال رکھنا، اپنے مفادات کا خیال رکھو اور آئندہ اگر فساد پھیلائے گا تو بعد میں اس کو روک دے گا اس سے بھی حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کی طرف اشارہ ہے کہ ایک شخص کا غلام تھا مدبر آپ ﷺ نے اس کو بیچ کر قیمت اسی کو دیدی اور حکم دیا کہ آئندہ اپنے معاملات کا خیال رکھنا اگر اس کے بعد فساد پھیلائے تو پھر روک دیں گے، تو یہ جو حجر بعد میں عائد کرنے کا حکم دیا وہ اس واسطے کہ آپ نے اضاعۃ المال سے منع فرمایا ہے۔

"وقال للذى يخدع فى البيع : إذابعت فقل : لاخلابة ولم يأخذالنبىﷺ ماله".

یہ حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ آپ نے ان سے کہا تھا کہ جب بیع کیا کرو تو یہ کہہ دیا کرو کہ دھوکہ نہیں ہوگا، تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں جب مدبر غلام کو بیچا تو اس کا مال بیچ کر اپنے قبضے میں نہیں لیا بلکہ اسی کو واپس کر دیا اسی طرح حضرت حبان بن منقذ رضی اللہ عنہ سے مال لینے کے بجائے انہی کے تصرف میں باقی رکھا، تو معلوم ہوا کہ امام خود اپنے پاس پیسے نہیں رکھے گا بلکہ واپس کر دے گا اور اس کو نصیحت کرے گا کہ آئندہ خیال رکھے۔

(۴) باب كلام الخصوم بعضهم فى بعض

۲۴۱۹ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف : أخبرنا مالک ، عن ابن شهاب ، عن عروة بن الزبير ، عن عبد الرحمٰن بن عبد القارى أنه قال : سمعت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ

يقول: سمعت هشام بن حكيم بن حزام يقرأ سورة الفرقان على غير ما أقرؤها، و كان رسول الله ﷺ اقرأنيها و كدت أن أعجل عليه ثم أمهلته حتى انصرف ثم لببته بردائه فجئت به رسول الله ﷺ فقلت : إني سمعت هذا يقراء على غير ما أقرأتنيها، فقال لي : "أرسله" ثم قال له : "اقرأ" فقرأ قال : "هكذا انزلت"، ثم قال لي : "إقرأ" فقرأت فقال : "هكذا أنزلت" إن القرآن أنزل على سبعة أحرف فاقرؤوا منه ما تيسر . [أنظر: ۴۹۹۲، ۵۰۴۱، ۶۹۳۶، ۷۵۵۰] [۱]

یہاں پر حدیث لانے کا منشاء یہ ہے کہ خصوم کا ایک دوسرے پر اعتراض کرنا۔ کہ یہاں پر بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ہشام بن حکیم رضی اللہ عنہ کے درمیان مناقشہ ہوا۔

(۵) باب إخراج أهل المعاصي والخصوم من البيوت بعد المعرفة

"وقد أخرج عمر أخت أبي بكر حين ناحت".

۲۴۲۰ ـ حدثنا محمد بن بشار: حدثنا محمد بن أبي عدي، عن شعبة، عن سعد بن ابراهيم عن حميد بن عبدالرحمٰن، عن أبي هريرة عن النبي ﷺ قال :((لقد هممت أن آمر بالصلاة فتقام ، ثم أخالف الى منازل قوم لا يشهدون الصلاة فأحرق عليهم)) [راجع : ۶۴۴]

اہل معاصی کو تادیباً گھروں سے نکالنے کا حکم

یہ باب قائم کیا کہ معلومات حاصل کر لینے کے بعد اہل معاصی اور خصوم کو گھر سے نکال دینا یعنی اگر کسی شخص کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ اس نے کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہے تو ان کو علی سبیل التادیب گھروں سے نکالا جا سکتا ہے اور اس واقعہ سے استدلال کیا کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ان کی

---

[۱] وفي صحيح مسلم ،كتاب صلوٰة المسافرين وقصرها،باب بيان أن القرآن على سبعة أحرف وبيان معناه ، رقم: ۱۳۵۴ ، وسنن الترمذي ،كتاب القراءات عن رسول الله ، باب ماجاء ان القرآن انزل على سبعة احرف ،رقم :۲۸۶۷، وسنن النسائي ، كتاب الافتتاح ، باب جامع ماجاء في القرآن ،رقم :۹۲۷ – ۹۲۹ ، وسنن ابى داؤد ،كتاب الصلوٰة ، باب انزل القرآن على سبعة احرف ،رقم : ۱۲۶۱ ، ومسند احمد، مسند العشرة المبشر بن بالجنة ، باب اول مسند عمر الخطاب،رقم: ۱۵۳ ، ۲۶۶ ، ۲۸۰ ، ۲۲۵۵ ، وموطأ مالك ،كتاب النداء للصلوة ، باب ماجاء في القرآن ،رقم :۴۲۳

بہن نوحہ کررہی تھیں تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو پہلے منع کروایا جب وہ نہ مانی تو کہا کہ ان کو گھر سے نکال دو۔ تو تادیباً انہوں نے گھر سے نکالا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شریعت کے خلاف کام کررہا ہو اور تنبیہ کے باوجود نہ مانے تو پھر اس کو گھر سے تادیباً نکال سکتے ہیں۔

اس حدیث میں فرمایا کہ جو نمازوں میں نہیں آتے میرا دل چاہتا ہے کہ ان کے گھر جلادوں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب جلادیں گے تو اپنے گھروں سے نکل جائیں گے، معلوم ہوا کہ اہل معاصی کو گھروں سے نکالنا تادیباً جائز ہے۔

(۶) باب دعوی الوصی للمیت

۲۴۲۱ ـ حدثنا عبداللّٰہ بن محمد :حدثنا سفیان ، عن الزهری، عن عروة، عن عائشة رضی اللہ عنها : أن عبد بن زمعة وسعد بن أبی وقاص اختصما إلى النبی ﷺ فی ابن امة زمعة. فقال سعد : یارسول اللہ ، أوصانی أخی : اذا قدمت ان انظرابن امة زمعة فاقبضه فانه ابنی. وقال عبد بن زمعة :أخی وابن أمة أبی ، ولدعلی فراش ابی فرأی النبی ﷺ شبها بینا بعتبة، فقال : "هولک یاعبد بن زمعة ، الولد للفراش، واحتجبی منه یاسودة" [راجع:۲۰۵۳]

میت کی طرف سے وصی کا دعویٰ جائز ہے

وصی بھی میت کی طرف سے دعویٰ کرسکتا ہے۔ دعویٰ دار تو مرگیا اگر اس نے کسی کو اپنا وصی بنایا ہے تو وہ اس کی طرف سے دعویٰ کرسکتا ہے۔ یہاں اس واقعہ میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے ان کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے وصیت کی تھی کہ تم جاکر اس عورت کے بچے کا دعویٰ کردینا اور سعد رضی اللہ عنہ نے اپنے بھائی کی طرف سے دعویٰ کیا تھا جبکہ بھائی کا انتقال ہوچکا تھا۔ معلوم ہوا کہ وصی کا دعویٰ بھی معتبر ہے، باقی حدیث پہلے گزری ہے۔ تفصیل ان شاء اللہ کتاب الطلاق میں آئے گی۔

(۷) باب التوثق ممن تخشی معرّته

"وقید ابن عباس عکرمة علی تعلم القرآن والسنن والفرائض"

فساد پھیلانے والے کو قید کیا جاسکتا ہے

"معرہ کے معنی فساد": جس شخص سے فساد کا اندیشہ ہو اگر اس کو کھلا چھوڑا جائے تو فساد مچائے گا تو امام

کے لئے اس کو باندھنا جائز ہے۔

اس میں اثر نقل کیا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے قرآن کی تعلیم کے سلسلے میں حضرت عکرمہ کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی تھی۔ عکرمہ غلام تھے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس آ گئے تھے، انہوں نے ان کو پڑھانا شروع کیا۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ وہ میرے پاؤں میں زنجیر ڈال دیتے تھے پڑھانے کے لئے تا کہ بھاگوں نہیں۔ یہ بچے اور غلام تھے اندیشہ تھا کہ بھاگ کر اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بھی نقصان ہوگا، اس واسطے زنجیر ڈال دی تھی، اسی حالت میں مجھے پڑھایا کرتے تھے معلوم ہوا کہ جس سے فساد کا اندیشہ ہو اس کو باندھنا بھی جائز ہے۔

لیکن معمول بنالینا اور ذراسی بات پر بچوں کو باندھ، باندھ کے پڑھانا یہ ٹھیک نہیں، ہاں جہاں بہت ہی اشد حاجت ہو تو ایسا کر سکتے ہیں۔

۲۴۲۲ ۔ حدثنا قتيبة :حدثنا الليث عن سعيد بن أبی سعيد : أنه سمع أبا هريرة رضی اللہ عنہ يقول : بعث رسول الله ﷺ خيلا قبل نجد فجاء ت برجل من بنی حنيفة يقال له:ثمامة بن أثال ، سيد أهل اليمامة فربطوه بسارية من سوارى المسجد فخرج إليه رسول الله ﷺ فقال: ((عندک ياثمامة ؟)) قال : عندی يامحمدخير، فذكر الحديث فقال : ((اطلقوا ثمامة)) [راجع : ۴۶۲]

یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے یہاں پر مقصود اس کا یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے اس (ثمامۃ بن اثال) کو ستون سے باندھ دیا تھا اور اسی باندھنے کی وجہ سے اللہ جل جلالہ نے ان کے دل میں اسلام ڈالا۔

(۸) باب الربط والحبس فی الحرم

واشترى نافع بن عبد الحارث داراً للسجن بمكة من صفوان بن أمية على أن عمر رضی اللہ عنہ فالبيع بيعه ، وإن لم يرض عمرفللصفوان أربعمائة دينار: وسجن ابن الزبير بمكة. [۱۱]

حرم مکہ میں قید کرنے کا حکم

مکہ مکرمہ کے اندر کسی کو قید کرنا اور باندھنا، یہ باب اس لئے قائم کیا کہ بعض فقہاء کرام مثلاً طاؤس بن

---

[۱۱] وفی صحيح مسلم ، كتاب الجهادوالسير، باب ربط الاسير وحبسه وجواز المن عليه ،رقم: ۳۳۱۰، وسنن النسائی، كتاب المساجد ، باب ربط الاسير بسارية المسجد ،رقم :۷۰۵ وسنن ابی داؤد ، كتاب الجهاد ، باب فی الاسير يوثق ،رقم :۲۳۰۴ ، ومسنداحمد ، باب باقی المسند السابق ،رقم : ۹۴۵۷.

کیسان سے منقول ہے کہ وہ کہتے تھے کہ مکہ مکرمہ میں کسی کو بھی قید کرنا جائز نہیں ہے **"من دخله کان امناً"** اس واسطے یہاں نہ کوئی قید خانہ ہوسکتا ہے اور نہ کسی کو قید کیا جا سکتا ہے۔ اگر کسی کو قید کرنا ہو تو حرم سے باہر لیجاؤ۔

جمہور فقہاء کرام کی رائے

جمہور کا قول یہ ہے کہ حرم کے اندر قتل تو جائز نہیں البتہ قید کرنے میں کوئی حرج نہیں، جب کسی کے فساد کا اندیشہ ہو تو حرم مکہ میں بھی قید کیا جا سکتا ہے۔

قید خانہ کی بنیاد

جمہور کے مذہب کو ثابت کرنے کے لئے امام بخاریؒ یہ اثر لے کر آئے ہیں کہ نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی طرف سے مکہ مکرمہ میں گورنر تھے انہوں نے صفوان بن امیہ سے مکہ مکرمہ میں قید خانہ بنانے کے لئے ایک گھر خریدا تھا اس شرط پر کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بیع پر راضی ہوئے تب تو یہ بیع نافذ ہو جائے گی اور اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بیع پر راضی نہ ہوئے تو صفوان کو چار سو دینار دیئے جائیں گے۔

یہاں مقصود اتنی بات ہے کہ جب نافع بن عبد الحارث رضی اللہ عنہ نے فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لئے قید خانہ باقاعدہ بنانے کے لئے گھر خریدا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ مکہ مکرمہ میں قید کرنا جائز تھا، تب ہی قید خانہ بنایا جا رہا ہے اگر جائز نہ ہوتا تو پھر مکہ میں قید خانہ بنانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

بیعانہ کی شرعی حیثیت

"بیع العربون یا بیعانہ": بیع العربان اس بیع کو کہتے ہیں جس میں مشتری بیعانہ کے طور پر کچھ رقم بائع کو دیتا ہے اور اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ دیکھو میں یہ پیسے دے رہا ہوں اور ساتھ میں اپنے لئے خیار لیتا ہوں کہ چاہوں تو اس بیع کو قائم رکھوں اور چاہوں تو اس بیع کو فسخ کردوں۔

اگر بیع کو قائم رکھا اور نافذ کردیا تب تو یہ رقم جس کو عربون یا بیعانہ کی رقم کہتے ہیں جزو ثمن بن جائے گی۔ فرض کرو کہ دس ہزار روپے کا سودا کیا اور پانچ سو روپے بیعانہ کے دیدیئے تو اس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر میں نے بیع کو نافذ کردیا تو یہ پانچ سو روپے جزو ثمن بن جائیں گے اور باقی ساڑھے نو ہزار روپے بعد میں ادا کروں گا اور اگر میں نے بیع کو نافذ نہ کیا تو پانچ سو روپے بیعانہ کے مشتری کے پاس سے گئے، بائع اس کا مالک ہوگیا۔ اس کو بیع العربون کہتے ہیں۔

جمہور کا مذہب

امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ کے نزدیک یہ شرط لگانا جائز نہیں کہ اگر بیع تام نہ ہوئی

تو بائع یہ پیسے ضبط کرلے گا کیونکہ یہ پانچ سو روپے بغیر کسی عوض کے بائع کے پاس چلے گئے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مذہب

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب میں بیع العربون جائز ہے، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ بائع جو پیسے ضبط کررہا ہے اس کا یہ پیسے ضبط کرنا درست ہے۔

جمہور کا استدلال

جمہور کا استدلال اس حدیث سے ہے جو امام مالکؒ نے موطأ میں روایت کی کہ **"نهى رسول الله ﷺ عن بيع العربان أو العربون"** اس میں نبی کریم ﷺ کی نہی منقول ہے[۱۲] اور پھر یہ روایت بیہقی وغیرہ کے اندر بھی آئی ہے۔[۱۳] اس وجہ سے جمہور کہتے ہیں کہ یہ بیع منع ہے، نہی بھی موجود ہے اور قواعد شرعیہ کا مقتضی بھی ہے کہ یہ بیع جائز نہ ہو کیونکہ بائع بلاوجہ پانچ سو روپے پر قبضہ کررہا ہے اس کا کوئی عوض نہیں دے رہا ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا استدلال

امام احمد بن حنبلؒ کا ایک استدلال مصنف عبدالرزاق کی ایک حدیث سے ہے جس میں مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ سے عربان کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ ﷺ نے اس کو حلال قرار دیا۔ اس حدیث کی سند بہت کمزور ہے اور اتنی کمزور ہے کہ اس سے استدلال کرنا مشکل ہے، کیونکہ اس کی سند میں ایک راوی ابراہیم بن ابی یحییٰ اسلمی ہیں، یہ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو بیشتر محدثین نے متروک قرار دینے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا ہے کہ وہ رافضی تھے۔ اس واسطے ان کی حدیثیں قابل استدلال نہیں ہیں۔[۱۴]

لیکن امام شافعی رحمہ اللہ نے ان سے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ ابراہیم بن یحیی کو پہاڑ کی چوٹی سے گر کر مرجانا زیادہ پسند ہے بنسبت اس کے کہ وہ جھوٹ بولیں۔ لہٰذا میں ان کی روایتوں کو قبول کرتا ہوں، اور یہ میرے اُستاد بھی ہیں۔ چنانچہ امام شافعیؒ کی جو "کتاب الام" ہے اس میں ابراہیم بن ابی یحییٰ کی حدیثیں بھری پڑی ہیں اور ان سے امام شافعیؒ استدلال کرتے ہیں اور اگر کبھی اس خیال سے کہ نام لینے سے لوگ بدگمانی میں مبتلا ہوں گے ان کا نام لئے بغیر **"حدثني من هو ثقة عندي"** کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ مجھے ایسے شخص نے حدیث سنائی جو میرے نزدیک ثقہ ہیں۔ باقی سارے محدثین نے ان کی حدیثوں کو رد کیا ہے۔ اس واسطے وہ

[۱۲] أن رسول الله ﷺ نهى عن بيع العربان. (موطأ مالک، ج: ۲، ص: ۲۰۹).

[۱۳] وسنن البيهقي الكبرى، ج: ۵، ص: ۳۴۲، باب النهي عن بيع العربان، رقم: ۱۰۶۵۲.

[۱۴] المجروحين لابي حاتم محمد بن حبان البستي، ج: ۱، ص: ۱۰۵-۱۰۷)

حدیث جمہور کے نزدیک قابل استدلال نہیں ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا دوسرا استدلال اس حدیث کے واقعہ سے ہے کہ نافع بن عبدالحارث نے صفوان بن امیہ سے حضرت عمرؓ کے لئے قید خانہ بنانے کی خاطر ایک گھر خریدا اور معاملہ یہ کیا کہ اگر حضرت عمرؓ راضی ہو گئے تب تو یہ بیع نافذ ہو جائے گی اور اگر حضرت عمرؓ راضی نہ ہوئے تو میں تمہیں چار سو دینار دیدوں گا۔ یعنی چار سو دینار تو دیدیئے تھے لیکن حضرت عمرؓ کی رضامندی پر موقوف رکھا کہ اگر راضی ہو گئے تو ٹھیک ورنہ یہ چار سو تمہارے۔ یہ وہی بیع العربون ہوئی یہ چار سو دینار جو دیئے تھے یہ بیعانہ کے طور پر تھے، امام احمد بن حنبلؒ نے اس حدیث سے عربون کے جواز پر استدلال کیا ہے۔

جمہور فقہاء کا استدلال

جمہور کہتے ہیں کہ ان کو بطور بیعانہ کے چار سو دینار اس لئے نہیں دیئے گئے تھے کہ بیع نافذ نہ ہونے کی صورت میں ضبط ہو جائیں گے، بلکہ چار سو دینار دینے کا منشأ یہ تھا کہ بیع ہی چار سو دینار کی تھی، چار سو پورا ثمن تھا لیکن یہ کہا تھا کہ اگر حضرت عمرؓ راضی ہو گئے تب تو یہ بیع حضرت عمرؓ کے لئے ہوگی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو اس صورت میں یہ بیع میرے (نافع بن الحارث کے) لئے ہوگی اس چار سو کے بدلہ میں یہ گھر تم مجھے دے دینا چنانچہ آپ یہاں پر دیکھیں کہ **"فلصفوان أربع مأة دينار"** کے الفاظ ہیں کہ صفوان کو چار سو دینار ملیں گے۔

بعض روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قیمت ہی چار سو دینار مقرر ہوئی تھی کہ اگر وہ راضی نہ ہوئے تو چار سو دینار صفوان بن امیہ کو ملیں گے، اور یہ محذوف ہے کہ اس کے بدلہ میں نافع بن الحارث اس مکان کو اپنے لئے لے لیں گے۔[۱۵]

اصل میں اس مسئلہ کے اندر روایات میں بڑا اختلاف ہے کہ اصل قیمت کیا تھی اور یہ رقم جو صفوان کو دی گئی تھی وہ کتنی تھی۔

بعض روایتوں[۱۶] سے معلوم ہوتا ہے کہ چار سو دینار قیمت تھی وہی دیدیئے گئے۔ اس صورت میں اس کو عربون قرار دینا ممکن نہیں۔ لیکن بعض روایتوں میں ہے کہ قیمت چار ہزار دینار تھی اور صفوان کو جو رقم دی گئی تھی وہ چار سو درہم تھی اس کے بارے میں معقول طور پر تصور کیا جا سکتا ہے کہ چار ہزار دینار کے مقابلے میں چار سو درہم بطور بیعانہ کے تھے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کو جو روایت پہنچی ہے وہ یہی تھی کہ اصل قیمت چار ہزار دینار تھی اور صفوان کو جو رقم دی گئی وہ چار سو درہم تھی، اور اس کی توجیہ انہوں نے یہ فرمائی کہ یہ بیعانہ تھا اور بیعانہ ضبط کرنے کی جو شرط لگائی یہ جائز ہے۔

۱۵، ۱۶ فتح الباری، ج: ۵، ص: ۷۵-۷۶.

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ چار سو دینار ہی قیمت تھی جو اسی وقت دیئے گئے اور بعض روایتوں میں ہے کہ چار ہزار درہم قیمت تھی اور چار سو دینار دیئے گئے، حاصل وہی ہوا کیونکہ چار ہزار درہم اور چار سو دینار ایک ہی چیز ہے، اس واسطے ہمارے پاس جو روایات ہیں ان میں بکثرت روایات جمہور کی تائید کرتی ہیں نہ کہ امام احمد بن حنبلؒ کی لیکن امام احمد بن حنبلؒ کے پاس غالباً ایسی روایت پہنچی کہ جس میں چار ہزار دینار قیمت تھی اور چار سو دینار بیعانہ کے دیئے گئے، اس کی بناء پر انہوں نے اپنے مذہب کی بنیاد رکھی۔

موجودہ حالات میں بیعانہ کا حکم

چونکہ معاملہ مجتہد فیہ ہے اس لئے عربون کو بالکلیہ باطل نہیں کہہ سکتے اور بسا اوقات اس قسم کے معاملہ کی ضرورت پیش آجاتی ہے، بالخصوص ہمارے زمانے میں جہاں ایک ملک سے دوسرے ملک میں بین الاقوامی تجارت ہوتی ہے وہاں ید اًبید معاملہ نہیں ہوتا اور نہ ہوسکتا ہے۔ لہٰذا فقہاء عصر کو اس پر غور کرنا چاہئے۔

اور اگر کوئی شخص دوسرے سے معاملہ کرلے کہ میں تم سے سامان منگوا رہا ہوں۔ بائع نے اس کے لئے سامان اکٹھا کیا سب کچھ کیا، لاکھوں روپے خرچ کئے بعد میں وہ مکر جائے کہ میں بیع نہیں کرتا تو اس صورت میں بائع کا بڑا سخت نقصان ہوتا ہے، ایسی صورت میں بائع اگر عربون کی شرط لگالے تاکہ مشتری پابند ہو جائے تو اس کی بھی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ اس صورت میں امام احمد بن حنبلؒ کے قول پر عمل کیا جائے، باقی جہاں ضرورت نہ ہو ویسے ہی لوگوں نے پیسے کمانے کا ذریعہ بنالیا تو وہ جائز نہیں۔

بیع تعلیق کو قبول نہیں کرتی

سوال: جمہور کے قول کے مطابق نافع بن عبد الحارث اور صفوان کا جو معاملہ ہوا تھا یہ بیعانہ کا نہیں تھا، بلکہ جمہور کا خیال یہ ہے کہ معاملہ اس طرح تھا کہ اگر حضرت عمرؓ راضی ہوگئے تو بیع حضرت عمرؓ کے لئے ہوگی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو بیع میرے (نافع بن عبد الحارث کے) لئے ہوگی تو کیا اس طرح بیع کرنا جائز ہے؟ یہ تو تعلیق ہوئی اور بیع تعلیق کو قبول نہیں کرتی کہ اگر ایسا ہوگیا تو بیع ہوگی ورنہ نہیں۔

اور دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یوں کہا جائے کہ یہ باطل معاملہ ہے تو حضرت نافع عبد الحارث نے یہ معاملہ کیوں کیا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بیع معلق نہیں ہوئی، بیع تو منجز ہی ہے کہ میں حضرت عمرؓ کے لئے خرید رہا ہوں البتہ خیار شرط رکھا تھا کہ اگر حضرت عمرؓ راضی ہوگئے تو بیع کو نافذ کردوں گا ورنہ نافذ نہیں کروں گا۔ لیکن اگر نافذ نہ کیا تو اپنی طرف سے ایک منفصل (علیحدہ سے) وعدہ کرلیا جس کا عقد سے کوئی تعلق نہیں ہے کہ اس

صورت میں میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں خریدوں گا۔

ایک تو شکل یہ ہے کہ عقد ہی کے اندر بیع کو دونوں شقوں میں دائر کر دیا جائے کہ اگر وہ راضی ہو گئے تو ان کی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو میری یہ عقد تو فاسد ہے لیکن اگر یہ کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے بیع کر رہا ہوں اور مجھے خیار ہے کہ اگر وہ راضی ہو گئے تب تو یہ بیع نافذ ہوگی اور اگر وہ راضی نہ ہوئے تو نافذ نہیں ہوگی یہ الگ معاملہ ہے۔

اب ایک منفصلاً وعدہ کیا کہ اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ راضی نہ ہوئے اور مجھے بیع کو فسخ کرنا پڑا تو اس صورت میں میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خریدلوں گا یہ وعدہ منفصل ہے، عقد سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لہٰذا یہ بیع بالتردید (معلق بیع) نہیں بلکہ بیع منجز ہے۔[۱۷]

موضع ترجمہ

"وسجن ابن الزبير بمكة"

فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے مکہ میں لوگوں کو قید کیا، لہٰذا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا کہ مکہ مکرمہ میں بھی لوگوں کو قید کرنا جائز ہے اور پھر حضرت ثمامہ کی حدیث دوبارہ نقل کی کہ ثمامہ کو مدینہ منورہ میں مسجد نبوی میں قید کیا تھا۔

اور بہت سے فقہاء کرام کے نزدیک مسجد نبوی حرم میں داخل ہے، اگرچہ حنفیہ کے نزدیک حرم میں داخل نہیں لیکن بہت سے فقہاء کرام اس کے اوپر حرم کے احکام جاری فرماتے ہیں، جب اس میں باندھا تو اس سے معلوم ہوا کہ حرم میں قید کرنا جائز ہے۔

(۹) باب فی الملازمة

۲۴۲۴ ـ حدثنا يحي بن بكير: حدثنا الليث، عن جعفر بن ربيعة، وقال غيره. حدثني الليث قال: حدثني جعفربن ربيعة، عن عبدالرحمٰن بن هرمز، عن عبدالله بن كعب بن مالك الأنصاري، عن كعب بن مالك رضي الله عنه: أنه كان له على عبدالله ابن أبي حدرد الأسلمي دين، فلقيه فلزمه فتكلما حتى ارتفعت أصواتهما فمربهما النبي ﷺ فقال: "ياكعب" وأشاربيده كأنه يقول: النصف، فأخذ نصف ماعليه وترك نصفا. [راجع: ۴۵۷]

---

[۱۷] فتح الباری، ج: ۵، ص: ۷۵-۷۶.

ملازمہ کا مطلب یہ ہے کہ دائن کو حق حاصل ہے کہ وہ مدیون کی جان کو آجائے یعنی جہاں بھی جائے وہ بھی ساتھ ساتھ جائے اس سے چمٹا رہے یہ بھی جائز ہے۔

یہاں ترجمۃ الباب کا موضوع **"فلزمه"** کا لفظ ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ وہ حضرت عبداللہ ابن ابی حدرد الاسلمی کے ساتھ چمٹ کے رہ گئے تھے وہ جہاں جا رہے تھے ساتھ ساتھ یہ بھی جا رہے ہیں یہاں تک کہ مسجد نبوی میں بھی آگئے۔

كتاب فى اللقطة

٢٤٢٦ - ٢٤٣٩

۴۵ ـ کتاب فی اللقطة

(۱) باب إذا أخبره رب اللقطة بالعلامة دفع إليه

۲۴۲۶ ـ حدثنا آدم: حدثنا شعبة. وحدثني محمد بن بشار: حدثنا غندر: حدثنا شعبة، عن سلمة: سمعت سويد بن غفلة قال: لقيت أبي بن كعب ﷺ فقال: أصبت صرة فيها مائة دينار فأتيت النبي ﷺ فقال: "عرفها حولا" فعرفتها، فلم أجد من يعرفها ثم أتيته فقال: "عرفها حولا" فعرفتها فلم أجد، ثم أتيته ثلاثا، فقال: "أحفظ وعاءها وعددها ووكاءها: فإن جاء صاحبها وإلا فاستمتع بها"، فأستمتعت فلقيته بعد بمكة فقال: لاأدري ثلاثة أحوال أو حولا واحدا. [أنظر: ۲۴۳۷] [۱]

حدیث باب کی تشریح

"کتاب اللقطة" لقطہ قاف کے فتح اور سکون کے ساتھ دونوں لغتیں ہیں۔ اس میں پہلا باب قائم کیا کہ جب لقطے کا مالک ملتقط کو علامتیں بتادے تو ملتقط کو چاہئے کو وہ اس کو دیدے۔

اس میں حضرت سوید بن غفلہ کی حدیث نقل کی جو مخضرمین میں سے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ میری ملاقات کعب بن مالک ﷺ سے ہوئی تو انہوں نے یہ واقعہ سنایا کہ مجھے ایک تھیلی ملی تھی جس میں سو دینار تھے، میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس لقطہ کی سال بھر تک تعریف (اعلان) کرو، فرمایا کہ سال بھر تک لوگوں کے اندر اعلان کرواور اس کے مالک کو تلاش کرو۔ میں نے سال بھر اس کی تعریف کی لیکن کوئی آدمی نہیں ملا جو اسے پہچانتا ہو پھر میں دوبارہ آیا تو آپ ﷺ نے پھر فرمایا کہ سال بھر تک تعریف کروتو پھر میں نے تعریف کی، لیکن کوئی آدمی نہ ملا۔ تیسری بار آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا وعاء

---

[۱] وفي صحيح مسلم، كتاب اللقطة، رقم: ۳۲۵۱، وسنن أبي داؤد، كتاب اللقطة، باب التعريف باللقطة، رقم: ۱۴۵۰، ۱۴۵۸، وسنن الترمذي، كتاب الأحكام عن رسول الله، باب ماجاء في القاضي كيف يقضي، رقم: ۱۲۴۹، وسنن ابن ماجة، كتاب الأحكام، باب اللقطة، رقم: ۲۴۹۷، ومسند أحمد، مسند الأنصار، باب حديث سويد بن غفلة عن أبي بن كعب، رقم: ۲۰۲۳۰، ۲۰۲۳۲، ۲۰۳۲۳.

یاد رکھو یعنی تھیلی کی ہیئت وغیرہ اور اس کی گنتی اور رسی یاد رکھو۔ اگر اس کا مالک آجائے تو ٹھیک ورنہ تم خود اس سے فائدہ اٹھالو، چنانچہ میں نے ان دنانیر سے فائدہ اٹھایا۔ بعد میں دوبارہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مکہ مکرمہ میں میری ملاقات ہوئی تو کہا کہ مجھے پتہ نہیں کہ انہوں نے تین سال تک تعریف کی تھی یا ایک سال تک تعریف کی تھی۔

لقطہ سے متعلق بحث کا خلاصہ

اس حدیث میں لقطہ سے متعلق تین بنیادی مباحث ہیں، جن کے لئے امام بخاریؒ نے آگے چل کر الگ الگ باب قائم کئے ہیں، خلاصہ ان مباحث کا یہ ہے کہ اگر کسی کو لقطہ مل جائے تو سب سے پہلے اس کے ذمہ تعریف واجب ہے، تعریف کتنی مدت تک ہونی چاہئے؟ اور اس چیز کا کیا حکم ہے؟

تعریف کا مدار لقطہ کی نوعیت پر ہے

بعض حضرات نے اس کی مدت ایک سال مقرر کی اور بعض نے زیادہ اور بعض نے کم لیکن قول فیصل اس باب میں یہ ہے کہ اس کا دارومدار لقطہ کی نوعیت پر ہے کہ کیا چیز ملی، اسی سے روایت میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے، اور بنیادی حکم یہ ہے کہ اس وقت تک تعریف کرنا جب تک یہ گمان ہو کہ اس کا مالک اس کو تلاش کر رہا ہوگا۔ اگر معمولی سی چیز ہے تو ہو سکتا ہے مالک آٹھ دس دن تلاش کر کے مایوس ہو جائے اس کو امید نہ رہے اور اس کی ضرورت محسوس نہ کرے، تب تو اس میں آٹھ دس دن کی تعریف کافی ہے لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن میں تین ماہ، چھ ماہ یا ایک سال تک تلاش کرنے کا احتمال ہوتا ہے اور بعض میں اس سے بھی زیادہ، تو نوعیت پر منحصر ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب تک یہ خیال ہو کہ اس کا مالک اس کو تلاش کرتا ہوگا تب تک تو تعریف واجب ہے، یہی حنفیہ کا مسلک ہے اور اس سے روایات میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے۔ جن میں ایک سال یا تین سال کا ذکر آیا کہ وہ لقطہ کی نوعیت پر محمول ہے۔[۲]

مالک کو لقطہ کب دیا جائے؟

دوسرا مسئلہ جس کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں باب قائم فرمایا وہ یہ ہے کہ لقطہ کا مالک اگر اس کی علامتیں صحیح صحیح بتادے تو کیا ملتقط کے ذمہ اس کا دینا واجب ہے؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں فرمایا کہ جب علامتیں بتادے تو ملتقط کے ذمے واجب ہے کہ وہ اس کو دیدے۔

---

۲ المبسوط للسرخسی، ج: ۱۱، ص: ۳، والهداية شرح البداية، ج: ۲، ص: ۱۷۵.

جمہور کا مسلک

حنفیہ اور جمہور کا مسلک یہ ہے کہ محض علامتیں بتا دینا کافی نہیں بلکہ اس وقت دینا واجب ہے کہ جب اس کے دل میں غالب گمان پیدا ہو جائے کہ ہاں یہی شخص اس کا مالک ہے۔ کیونکہ ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے شخص کو ان علامتوں کا علم ہوگیا ہو اور وہ آکر بتا دے اس لئے محض علامتیں بتا دینا کافی نہیں، بلکہ ملتقط کے دل میں غالب گمان ہو جائے کہ یہ اس کی چیز ہے تو پھر اس کو دیانۃً دینا واجب ہے۔ لیکن قضاءً اس وقت واجب ہوگا جب صاحب مال بیّنہ پیش کرے۔ اگر بینہ پیش کردے گا تو واجب ہوگا لیکن اگر بینہ پیش نہ کرسکا تو وہ دعویٰ کرکے نہیں لے سکتا۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ جو استدلال فرما رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس کا مالک آکر بتا دے کہ وعاء کیا ہے، گنتی کتنی ہے، رسی کیسی ہے تو دیدو۔

جمہور کے نزدیک یہ دیانت کا حکم ہے اور یہ اس تقدیر پر ہے کہ اس سے گمان غالب پیدا ہو جائے ورنہ دینا ضروری نہیں۔ [۳]

مالک نہ ملنے کی صورت میں لقطہ کا مصرف

تیسرا مسئلہ جو زیادہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اگر مالک نہ آئے تو اس صورت میں اس لقطہ کا کیا کیا جائے؟

اس میں ائمہ ثلاثہ اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ کے درمیان اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں ملتقط کے لئے استعمال کرنا جائز ہے چاہے وہ ملتقط غنی ہو یا فقیر ہو۔

اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر فقیر ہے تب تو استعمال کرسکتا ہے اور اگر غنی ہے تو خود استعمال نہیں کرے گا بلکہ ملتقط کی طرف سے صدقہ کردے گا۔ اس کے بعد اگر ملتقط آجائے تو پھر ملتقط کو اختیار ہوگا کہ چاہے تو وہ صدقے کو نافذ کردے اور اس کا ثواب اس کے لئے ہو جائے گا۔ اور اگر نافذ نہ کرے تو ملتقط (بکسر القاف) کے ذمہ اس کا ضمان دینا واجب ہوگا۔ اور جب ضمان دیدے گا تو صدقہ کا ثواب ملتقط کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ [۴]

---

۳ (وهذا على الديانة عندنا، فان وثق به وغلب على ظنه صدقه دفع اليه، ولا يجب عليه قضاءً، نعم يجب الأداء عند البينة. (فيض البارى، ج:۳، ص: ۳۲۴، وفتح البارى، ج:۵، ص: ۷۹).

۴ (وتفصيل مذهبنا أن الملتقط ان كان فقيراً يستمتع بها بعد التعريف الخ (فيض البارى، ج:۳، ص: ۳۲۴).

ائمہ ثلاثہ کا استدلال

ائمہ ثلاثہ حدیث باب سے استدلال فرماتے ہیں جہاں حضور اقدس ﷺ نے حضرت کعب ﷺ سے فرمایا کہ **"فاستمتع بها"** تم اس سے نفع اٹھاؤ۔ ائمہ ثلاثہ کا کہنا یہ ہے کہ حضرت ابی بن کعب ﷺ میاسر و اغنیاء صحابہ میں سے تھے، فقراء میں سے نہیں تھے ان کو جو نفع اٹھانے کا حکم دیا اس سے معلوم ہوا کہ غنی کے لئے بھی **"استمتاع باللقطه"** جائز ہے۔[۵]

احناف کا استدلال روایتاً

حنفیہ کا استدلال ایک تو اس روایت سے ہے جو سنن ابی داؤد[۶] اور ابن ماجہ میں بھی آئی ہے،[۷] اس میں نبی کریم ﷺ نے لقطہ کو **"مال الله"** سے تعبیر فرمایا، کہ اگر مالک نہ آئے تو **"مال الله يؤتيه من يشاء"** وہ اللہ کا مال ہے جس طرح چاہے اس کو خرچ کرے۔ ویسے تو سارا مال اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن یہ لفظ عام طور پر اس مال کے لئے استعمال ہوتا ہے جو واجب التصدق ہو، تو مال اللہ کے لفظ سے معلوم ہوا کہ یہ اللہ کا مال ہے اور واجب التصدق ہے اور لفظ **"يمسک"** استعمال ہوا ہے امساک کا لفظ عام طور پر فی سبیل اللہ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

دوسرا استدلال ابن ماجہ کی حدیث سے ہے جو حضرت عبداللہ بن الشخیر ﷺ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا ہے **"ضالة المسلم حرق النار"** مسلمانوں کا ضالہ یعنی لقطہ یہ آگ کا انگارہ ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کسی کو لقطہ مل جائے تو اس کے لئے اس کا استعمال جائز نہیں اس لئے کہ یہ آگ کا انگارہ ہے، اس سے بھی حنفیہ کا استدلال ہے کہ اس کو آدمی خود استعمال نہیں کرسکتا۔[۸]

ان دو احادیث سے حنفیہ نے استنباط کیا ہے، یہ اگرچہ قطعی الدلالۃ تو نہیں لیکن صحابہ کرام ﷺ کے بہت سے آثار ہیں کہ ان سب نے لقطہ کو صدقہ کرنے کا حکم دیا۔

میں نے یہ آثار **"تکملہ فتح الملهم"** میں جمع کردیئے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حدیثوں کا یہی مطلب ہے کہ اس کو صدقہ کردینا چاہئے۔[۹] ایک حدیث بھی مروی ہے جس میں براہ راست صدقہ کرنے

---

۵ وتمسک الشافعية باستمتاع أبي ، فإنه كان من أغنياء الصحابة (فيض الباری ، ج:۳ ، ص: ۲۲۴).

۶ سنن أبي داؤد، كتاب اللقطة ، باب التعريف باللقطة ، رقم : ۱۴۵۴ .

۷ سنن ابن ماجة كتاب الأحكام ، باب اللقطة ، رقم : ۲۴۹۶.

۸ سنن ابن ماجة ، كتاب الأحكام ، باب ضالة الإبل، والبقر والغنم ، رقم : ۲۴۹۳.

۹ تكملة فتح الملهم ، ج: ۲ ، ص: ۶۱۱.

کا حکم ہے لیکن وہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے، اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا۔ لیکن آثار صحابہ سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ **"ضالة المسلم حرق النار"** سے مقصود یہ ہے کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے۔

احناف کا استدلال درایتاً

اور قیاس کا مقتضی بھی یہی ہے کیونکہ کسی آدمی کے ہاتھ سے ایک چیز گر گئی تو محض اس کے گر جانے سے اس کی ملکیت تو ختم نہیں ہو جاتی، اس کی ملکیت برقرار رہتی ہے، اب اس تک پہنچانا ممکن نہیں تو اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ اس کو دنیا میں اگر نفع نہ ملے تو کم از کم آخرت میں ملے اور آخرت میں ملنے کا راستہ یہی ہے کہ وہ فقراء پر صدقہ کیا جائے۔ غنی پر صدقہ کرنے سے صدقہ نہیں ہوتا وہ تو ہبہ ہوتا ہے اور کیا پتہ وہ غنی پر ہبہ کرنے پر راضی ہو یا نہ ہو لیکن صدقہ کرنے پر راضی ضرور ہو گا اس لئے کہ آخرت میں ثواب مل جائے گا۔

ایک بڑھیا کا واقعہ

مشہور ہے کہ ایک بڑھیا کی پوٹلی کم ہو گئی تھی اور وہ بیٹھی ہوئی یہ دعا کر رہی تھی کہ یا اللہ! کسی مولوی کو نہ ملے۔ لوگوں نے کہا کہ مولوی کو ملنے یا نہ ملنے سے تیرا کیا فائدہ؟ کیا نقصان؟

کہنے لگی کسی اور کو مل گئی تو دنیا میں نہیں تو کم از کم آخرت میں ثواب وصول کرلوں گی لیکن اگر کسی مولوی کو ملی تو وہ اس کو کسی نہ کسی طرح حلال کر کے کھائے گا تو اس لئے آخرت میں ملنے کی بھی توقع نہیں۔

تو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ کم از کم اس کو آخرت میں صدقہ کا ثواب مل جائے، لہٰذا صدقہ کرنا ضروری ہے۔ جہاں تک حدیث باب کا تعلق ہے اس سے استدلال اس بات پر موقوف ہے کہ حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو غنی سمجھا جائے اور یہ درست ہے کہ آخر زمانے میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اغنیاء صحابہ رضی اللہ عنہم میں شمار ہوتے تھے لیکن ابتدائی زمانہ ان پر غنا کا نہیں گزرا بلکہ وہ ابتدائی زمانے میں فقراء صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے تھے، جس کی دلیل یہ ہے کہ جس وقت حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے کنوئیں کے بارے میں کہا تھا کہ میرے سب سے محبوب مالوں میں سے ہے۔ اسے میں اللہ کے راستے میں صدقہ کرنا چاہتا ہوں تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم اس کو اپنے اقارب میں صدقہ کر دو۔ انہوں نے جن لوگوں پر صدقہ کیا ان میں حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ بھی داخل ہیں۔

معلوم ہوا کہ یہ ہر دور میں غنی نہیں تھے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ اس دور کا واقعہ ہو جب حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ غنی نہیں تھے تو اس سے بھی استدلال درست نہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال

امام ترمذی رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہ کو ایک مرتبہ ایک دینار مل گیا تھا اور حضور اقدس ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو انتفاع کی اجازت دی۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ بنو ہاشم میں سے تھے اور بنو ہاشم کے لئے صدقہ حلال نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ اس کا مصرف زکوۃ کا مصرف نہیں ہے بلکہ اس سے عام لوگ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔[10]

اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ ہے وہ ابوداؤد میں تفصیل سے آیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق لقطہ کا نفع اٹھانے سے ہے ہی نہیں۔[11]

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں کھانا نہیں تھا اور فاقہ گزر رہا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ دونوں بچے بھوک سے بے تاب تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو راستے میں پڑا ہوا ایک دینار مل گیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے انہوں نے آکر ذکر کیا کہ ایک دینار مل گیا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپ اس دینار کو لے کر فلاں یہودی کے پاس جائیں اور اس سے آٹا لے آئیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اس یہودی کے پاس چلے گئے اور آٹا لیا۔ اس یہودی نے کہا کیا تم انہی صاحب کے داماد ہو جو اپنے آپ کو نبی کہتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا جی ہاں! یہودی نے کہا کہ پھر میں پیسے نہیں لیتا، آٹا ویسے لے جاؤ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آٹا لے آئے اور دینار بھی واپس لے آئے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ یہ دینار بچ گیا ہے۔ آپ ایسا کریں کہ اس سے گوشت لے آئیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ گوشت لینے گئے اور گوشت والے سے کہا کہ مجھے ایک درہم کا گوشت دے دو اور یہ دینار رہن رکھ لو، جب پیسے ہوں گے ایک درہم دے کر یہ دینار لے جاؤں گا۔ تو دینار رہن رکھا اور ایک درہم کا گوشت لے آئے۔

اتنے میں حضور اقدس ﷺ تشریف لے آئے تو سوچا کہ میں پوچھ لوں کہ یہ واقعہ پیش آیا ہے اور ہمارے لئے کھانا حلال ہے یا نہیں ہے؟

ابھی یہ پوچھ ہی رہے تھے کہ اتنے میں ایک آدمی آواز لگاتا ہوا آیا کہ میرا دینار گم ہوگیا، میرا دینار گم ہوگیا، یہ باہر نکلے اور پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟ اس نے کہا کہ میرا دینار کہیں گر گیا ہے اور میں اسے تلاش کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا تمہارا دینار میرے پاس ہے اور آخر حضور اقدس ﷺ کو بتایا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ تم گوشت

---

[10] سنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول اللہ، باب ماجاء فی اللقطة الخ، رقم: ۱۲۹۴۔

[11] سنن أبی داؤد، کتاب اللقطة، باب التعریف باللقطة، رقم: ۱۴۵۸۔

والے کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ درہم میرے یعنی حضور اقدس ﷺ کے ذمہ ہے اور دینار دے دو۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہ دینار لے کر آئے اور لا کر اس شخص کو دے دیا۔

یہ واقعہ ہے، اس میں کہاں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس دینار کو کھایا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ اس کو رہن رکھا اور رہن بھی بشرط ضمان اور پھر بعد میں ضمان ادا کر دیا۔ اس سے یہ کہنا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے دینار کو استعمال کیا درست نہیں۔ صرف یہ ہوا کہ دینار کو رہن رکھا اور اس کے ذریعے گوشت خرید لیا اور ظاہر ہے کہ جب کسی مسلمان کو یہ پتہ چلے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گھر میں فاقہ ہے اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ وحسین رضی اللہ عنہ بھوک سے بیتاب ہیں تو کون شقی القلب ایسا ہوگا جو اس بات کی اجازت نہ دے کہ ہمارے دینار رہن رکھ کر بعد میں ضمان ادا کر دینا۔ اس واسطے اس سے استدلال کا کوئی محل نہیں۔

لقطہ اور زکوٰۃ کے حکم میں فرق

یہاں یہ مسئلہ بھی عرض کر دوں کہ فقہاء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ لقطہ اور زکوٰۃ کے حکم میں تھوڑا سا فرق ہوتا ہے۔

زکوٰۃ کے اندر یہ حکم ہے کہ شوہر، بیوی کو زکوٰۃ نہیں دے سکتا اور بیوی، شوہر کو زکوٰۃ نہیں دے سکتی۔ باپ، بیٹے کو نہیں دے سکتا۔ بیٹا، باپ کو نہیں دے سکتا، لیکن لقطہ کا صدقہ شوہر، بیوی کو بھی کر سکتا ہے اور بیوی، شوہر کو بھی کر سکتی ہے۔ اس لئے کہ وہ صدقہ اس کی طرف سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ جس کا مال ہے اس کی طرف سے ہو رہا ہے اور اس کے ساتھ یہ رشتہ موجود نہیں ہے۔

اسی بنا پر بعض فقہاء نے یہ فرمایا ہے کہ بنو ہاشم پر لقطہ کا صدقہ کر سکتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کیونکہ بنو ہاشم کے لئے صدقات واجبہ تو ناجائز ہیں لیکن صدقات نافلہ جائز ہیں۔[۱۲]

۲۴۲۹ ۔ حدثنا عبداللہ بن یوسف : .... قال : فضالة الغنم ؟ "قال : هی لک أو لأخیک أو للذئب" فضالة الإبل ؟ قال : "مالک ولها؟ معها سقاؤها وحذاؤها، ترد الماء تأکل الشجر حتی یلقاها ربها". [راجع : ۹۱]

ضالۃ الغنم کے بارے میں فرمایا کہ **"لک أو لأخیک أو للذئب"** یا تمہاری ہوگی یا تمہارے بھائی کی ہوگی یا بھیڑیئے کی۔ ظاہر ہے اس کو نہیں اٹھاؤ گے تو کوئی بھیڑیا کھا جائے گا۔

بخلاف ضالۃ الابل کے **"مالک ولها ؟ معها سقاؤها و حذاؤها"** اس کو اللہ نے

---

۱۲ وقد أخذها علی بن أبی طالب، و هو یجوز له أخذ النفل دون الفرض، (کما ذکر فی فیض الباری و عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۱۵۹)

پاؤں دیئے ہیں اور پانی کا مشکیزہ دیا ہے، لہٰذا اس کے اندر ہلاکت کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، اس لئے اس کو پکڑنے کی ضرورت نہیں۔

(۵) باب إذا وجد خشبة فی البحر أو سوطاء أو نحوه

۲۴۳۰ ـ وقال الليث : .... لأهله حطبا فلما نشرها وجد المال و الصحيفة . [راجع :۱۴۹۸]

یہ پوری حدیث پہلے گزری ہے۔ یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ جب وہ لکڑی تیرتی ہوئی آرہی تھی تو اس نے وہ لکڑی لے لی تاکہ اپنے گھر میں ایندھن کے طور پر استعمال کرے حالانکہ وہ لقطہ تھا۔ اس نے کہا کہ یہ میرے لئے آرہی ہے۔ اس میں تو پیسے بھر کے بھیجے تھے لیکن اس کو پتہ نہیں تھا کہ اس میں پیسے ہیں۔ اس واسطے وہ لقطہ تھا یہ اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔

اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر سمندر کے اندر ایسی چیز مل جائے جو ایسی معمولی ہو جس کے بارے میں خیال ہو کہ اب اس کا مالک اس کو تلاش نہیں کرتا ہوگا اور کوئی اتنی زیادہ قیمتی چیز نہیں ہے تو پھر تعریف کے بغیر بھی استعمال کر لینا جائز ہے۔

ہمارے ہاں بھی یہی مذہب ہے کہ اگر وہ چیز معمولی ہے مثلاً ایک دو کھجوریں ہیں جیسے اگلا باب آرہا ہے، ایک کھجور پڑی مل گئی یا کوئی ایسی معمولی چیز جس کے بارے میں اس کو خیال ہے کہ اس کے مالک کو اس کی پرواہ نہیں ہوگی تو اس کو بغیر تعریف کے استعمال کرنا جائز ہے۔

(۶) باب إذا وجد تمرة فی الطریق

۲۴۳۱ ـ حدثنا محمد بن يوسف: حدثنا سفيان، عن منصور، عن طلحة، عن أنس ﷺ عنه قال : مر النبی ﷺ بتمرة فی الطریق قال : لولا أنی أخاف أن تكون من الصدقة أكلتها " [راجع: ۲۰۵۵]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اگر مجھے یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ یہ صدقہ کی کھجور ہے تو میں اس کو کھالیتا۔ تو آپ ﷺ نے کھانے سے پرہیز کیا۔ اس اندیشہ سے کہ اگر یہ صدقہ کی ہوگی تو آپ ﷺ کے لئے کھانا حلال نہیں لیکن اگر صدقہ کا اندیشہ نہ ہوتا تو فرمایا کہ میں اس کو کھالیتا۔ معلوم ہوا کہ اس کی تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۷) باب تعریف لقطة أهل مكة؟

"وقال طاؤس: عن ابن عباس رضی الله عنهما ، عن النبی ﷺ قال :"لايلقط لقطتها

إلا من عرفها" وقال خالد ، عن عكرمة عن ابن عباس رضي الله عنهما عن النبي ﷺ قال : "لايلتقط لقطتها إلا معرف".

۲۴۳۳ ـ وقال أحمد بن سعيد: حدثنا روح :حدثنا زكريا : حدثنا عمرو بن دينار، عن عكرمة ، عن ابن عباس رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ قال :((لايعضد عضاهها ، ولا ينفر صيدها ، ولاتحل لقطتها إلا لمنشد، ولايختلى خلاها)). فقال عباس : يارسول الله إلا الإذخر، فقال : ((إلا الإذخر)).[راجع : ۱۳۴۹]

۲۴۳۴ ـ حدثنا يحي بن موسى قال: حدثنا الوليد بن مسلم: حدثنا الأوزاعي: حدثني يحي بن أبي كثير قال: حدثنا أبو سلمة بن عبدالرحمن قال: حدثني أبو هريرة ﷺ قال: لما فتح الله على رسوله ﷺ مكة قام في الناس فحمد الله وأثنى عليه ثم قال: ((إن الله حبس عن مكة الفيل وسلط عليها رسوله والمؤمنين فإنها لاتحل لأحد كان قبلي ، وإنها أحلت لي ساعة من نهار، وإنها لن تحل لأحد من بعدي فلا ينفر صيدها ولا يختلى شوكها ولا تحل ساقطتها إلا لمنشد. ومن قتل له قتيل فهو بخير النظرين :إما أن يفدى وإما أن يقيد)). فقال العباس: إلا الإذخر فانا نجعله لقبورنا وبيوتنا ، فقال رسول الله ﷺ : ((إلا الإذخر)) فقام أبو شاه. رجل من أهل اليمن. فقال : أكتبوا لي يارسول الله ، فقال رسول الله ﷺ : ((اكتبوا لأبي شاه)). قلت للأوزاعي : ماقوله: اكتبوا لي يارسول الله ؟ قال : هذه الخطبة التي سمعها من رسول الله ﷺ . [راجع: ۱۱۲]

یہ لقطہ اہل مکہ کا ذکر ہے، اس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ **"لايلتقط لقطتها إلا من عرفها"** حرم کا لقطہ اٹھانا نا جائز ہے مگر وہ شخص اٹھائے جو اس کی تعریف کرے۔

آگے فرمایا **"لا تحل لقطتها إلا لمنشد"** اس کا لقطہ حلال نہیں ہے مگر تعریف یعنی اعلان کرنے والے کے لئے۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم تو غیر حرم میں بھی ہے یعنی غیر حرم میں بھی یہی حکم ہے کہ لقطہ تعریف کے بعد حلال ہوتا ہے۔ پھر حرم کی کیا خصوصیت ہوئی **"لا تحل لقطتها إلا لمنشد"**.

لقطہ حرم اور غیر حرم میں فرق؟

اس میں امام شافعی رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ حرم میں اور غیر حرم میں فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک غیر حرم کے اندر اگر تعریف کے بعد مالک نہ ملے تو ملتقط کے لئے اس کا استعمال جائز ہے لیکن حرم کے

بارے میں وہ فرماتے ہیں کہ حرم کے اندر نہ تعریف کی مدت مقرر ہے اور نہ ملتقط کے لئے کسی بھی حالت میں اس سے انتفاع جائز ہے بلکہ ساری عمر اس کی تعریف کراتا ہی رہے جب تک اس کا مالک نہ آئے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے **"لا تحل لقطتها إلا لمنشد"** کا یہی مطلب ہے۔[۱۳]

وہ کہتے ہیں کہ غیر حرم کا لقطہ جب تعریف کرنے کے بعد مالک نہ ملے تو اس کے لئے کسی نہ کسی وقت حلال ہو جاتا ہے۔ لیکن حرم کا لقطہ کسی وقت بھی حلال نہیں ہوتا ساری عمر تعریف کراتا ہی رہے اور وہ اسی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔

ائمہ ثلاثہ (مالکیہ، حنفیہ اور حنابلہ) تینوں یہ کہتے ہیں کہ حرم اور غیر حرم کے لقطہ میں حکم کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، لہٰذا جو لوگ ملتقط کے لئے لقطہ کو جائز قرار دیتے ہیں جیسے مالکیہ اور حنابلہ وہ کہتے ہیں کہ حرم میں بھی یہی حکم ہے کہ تعریف کرے اور تعریف کرنے کے بعد جب مایوسی ہو جائے تو خود استعمال کر سکتا ہے۔[۱۴]

حنفیہ کہتے ہیں کہ اس صورت میں صدقہ کرے گا گویا ان تینوں کے نزدیک حرم کے لقطہ اور غیر حرم کے لقطہ میں کوئی فرق نہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ حرم کے لقطہ کی تخصیص کیوں کی گئی کہ فرمایا: **"لا تحل لقطتها إلا لمنشد؟"**

اس کا جواب وہ یہ دیتے ہیں کہ اس کو حرم کے اندر خاص طور سے تاکید کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے کہ کوئی شخص یہ گمان نہ کرے کہ حرم کے اندر تعریف ضروری نہیں، کیونکہ کسی کو یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہاں تو ہر وقت لوگ آتے جاتے رہتے ہیں کہ آج آیا اور کل چلا گیا تو تعریف کرنے کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا تعریف نہ کرو تو کسی کو یہ گمان ہو سکتا تھا کہ یہاں پر تعریف کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس واسطے خاص طور پر حرم کی تاکید فرمادی کہ حرم کے اندر بھی اسی طرح تعریف کرنا ضروری ہے جس طرح غیر حرم میں ضروری ہے۔

اور اس بات کی بھی تاکید فرمادی کہ اور جگہوں پر آدمی تساہل بھی برت لے تو کوئی حرج نہیں کہ اٹھا تو لیا لیکن تعریف تین، چار دن یا ایک ہفتہ کے بعد شروع کریں لیکن حرم میں جب آدمی کوئی چیز اٹھائے تو فوراً تعریف کرنا ضروری ہے کیونکہ وہاں پر لوگ آتے جاتے رہتے ہیں تو ہو سکتا ہے کہ جس کا مال گرا ہو وہ دو چار دن میں چلا جائے اس واسطے خاص طور پر یہ کہا گیا۔

یہ اس حدیث کی تشریح ہے جس میں یہ کہا گیا ہے کہ **"لا تحل لقطتها إلا لمنشد"** لیکن بعض روایات میں **"الا لمنشد"** کا استثنا بھی نہیں آیا بلکہ مسلم شریف میں جو حدیث ہے اس میں یہ الفاظ ہیں کہ **"لاتلتقط لقطة الحاج"** حجاج کا لقطہ اٹھایا ہی نہ جائے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کہیں لقطہ مل گیا ہے تو اس

---

[۱۳] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۲۸.

[۱۴] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۲۸.

کو حج کے زمانے میں پڑا رہنے دے۔

اس کی حکمت یہ ہے کہ درحقیقت حجاج بے چارے ایسے ہوتے ہیں کہ صرف ضرورت کا سامان ساتھ رکھتے ہیں۔ ان کی ہر چیز چاہے وہ چھوٹی ہو ضرورت کی ہوتی ہے۔

ایک بات تو یہ ہے کہ فرض کریں اگر ایک سوئی گرگئی ہے تو سوئی بھی بے چارہ نے ضرورت کے تحت رکھی ہوئی ہے۔ اگر اس کو نہیں ملے گی تو بہت سخت تکلیف ہوگی۔ اگر چہ اس کی قیمت زیادہ نہیں کیونکہ سفر میں ضرورت کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی بہت اہمیت رکھتی ہیں۔ خاص طور پر سفر حج میں۔

دوسری بات یہ ہے کہ حاجی عام طور سے باہر جاتا ہے۔ وہ راستوں سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ حرم گیا اور حرم سے واپس اپنی قیام گاہ آگیا۔ اب اگر آپ چیز اٹھا کر بازاروں میں اس کی تعریف کرنا شروع کریں گے یا کہیں، اور تو عین ممکن ہے کہ آپ مکہ میں تعریف کر رہے ہوں اور وہ منیٰ میں گھوم رہا ہوں لور آپ منیٰ میں تعریف کر رہے ہوں اور وہ مکہ میں گھوم رہا ہو تو ہر انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ چیزوں کو وہیں تلاش کرتا ہے جہاں سے وہ ہو کر گزرا ہے، لہٰذا اگر آپ وہیں چھوڑ دیں گے تو وہ چیز اس کو مل جائے گی۔ تو بجائے اس کے کہ آپ اٹھائیں اور تعریف کریں۔ اس سے اندیشہ ہے کہ اس کو نہ ملے اس لئے وہیں پڑے رہنے دیں تاکہ جب وہ لوٹ کر آئے تو اس کو وہاں پالے۔ اس واسطے یہ حکم دیا گیا کہ حاجی کا لقطہ نہ اٹھایا جائے۔ [۱۵]

(۸) باب لا تحتلب ماشية أحد بغير إذنه

۲۴۳۵ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف : أخبرنا مالک ، عن نافع ، عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما : أن رسول الله ﷺ قال : ((لا يحلبن أحد ماشية امرئ بغير إذنه ، أيحب أحدكم أن تؤتى مشربته فتكسر خزانته فينتقل طعامه؟ فإنما تخزن لهم ضروع مواشيهم أطعماتهم ، فلا يحلبن أحد إلا بإذنه)).

حدیث باب کا مفہوم

فرمایا کہ کوئی شخص دوسرے کے مویشی، بکریاں وغیرہ کا دودھ بغیر مالک کی اجازت کے نہ دوھے اور پھر اس کی مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ **"أيحب أحدكم أن تؤتى"** کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اس کے مشربہ میں کوئی گھس جائے۔ مشربہ بالا خانہ کو کہتے ہیں۔ پہلے زمانہ میں عام طور پر جتنی قیمتی چیزیں ہوتی تھیں ان کو کمرے میں اوپر چھت کے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ اس کو اردو میں کوٹھا بولتے ہیں، تو کوٹھے میں قیمتی اناج وغیرہ

---

[۱۵] فيض الباری ، ج:۳ ، ص:۳۲۸ ، وتکملة فتح الملهم ، ج:۲ ، ص:۶۲۲.

ذخیرہ کر کے رکھ دیتے تھے۔ تو مراد یہ کہ کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ کوئی تمہارے بالاخانہ جہاں قیمتی اشیاء رکھی ہوئی ہیں وہاں گھس جائے **"فتكسر خزانته"** اور اس کی الماری توڑ دی جائے **"فينتقل طعامه"** اور اس کا کھانا وہاں سے اٹھا کے لے جائے؟ کیا کوئی یہ پسند کرے گا؟

کہا کہ پسند نہیں کرے گا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ مویشیوں کے جو تھن ہیں یہ بھی خزانے ہوتے ہیں۔ ان کے کھانے کا یعنی دودھ بے چاروں کی غذا ہوتی ہے اور وہ تھنوں کے اندر محفوظ رہتی ہے۔ تو ان کے تھنوں سے دودھ نکال کر لے جانا ایسا ہی ہے جیسا کہ گھروں کے مشربہ سے کوئی چیز اٹھا کر لے جانا۔

(۱۱) باب من عرف اللقطة ولم يدفعها إلى السلطان

۲۴۳۸ ـ حدثنا محمد بن يوسف: حدثنا سفيان، عن ربيعة، عن يزيد مولى المنبعث، عن زيد بن خالد ﷺ: أن أعرابيًا سأل النبي ﷺ عن اللقطة قال: ((عرفها سنة فإن جاء أحد يخبرك بعفاصها ووكاءها وإلا فاستنفق بها)). وسأله عن ضالة الإبل فتمعر وجهه وقال: ((مالك ولها؟ معها سقاؤها وحذاؤها، تردالماء، وتأكل الشجر، دعها حتى يجدها ربها)). وسأله عن ضالة الغنم فقال: ((هي لك أو لأخيك أوللذئب)). [راجع: ۹۱]

باب قائم کیا ہے **"من عرف اللقطة ولم يدفعها إلى السلطان"**.

مسلکِ امام اوزاعی رحمہ اللہ کی تردید

امام اوزاعی رحمہ اللہ کی تردید میں یہ باب قائم کیا ہے۔ امام اوزاعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ چیز جو ملتقط کو ملی ہے، معمولی ہے تب تو تعریف کرے اور تعریف کا وہی حکم ہے جو پہلے گزرا ہے۔ لیکن اگر وہ چیز زیادہ ہے، زیادہ بڑا مال ہے تو خود تعریف نہ کرے، بلکہ سلطان کو دیدے اور بیت المال میں داخل کرے۔ سلطان اس کی تعریف کرے یا پھر سارا کا سارا مال بیت المال میں جائے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تردید کر رہے ہیں کہ حدیث میں ایسی کوئی بات نہیں ہے بلکہ حدیث میں یہ ہے کہ چیز چھوٹی ہو یا بڑی ملتقط خود اس کی تعریف کرے اور تعریف کے بعد فقیر ہے تو استعمال کرے۔

(۱۲) بابٌ:

۲۴۳۹ ـ حدثني إسحاق بن ابراهيم: أخبرنا النضر: أخبرنا إسرائيل، عن أبي إسحاق قال: أخبرني البراء، عن أبي بكر رضي الله عنهما، ح.

حدثنا عبد اللّٰہ بن رجاء : حدثنا إسرائیل ، عن أبی إسحاق عن البراء ، عن أبی بکر رضی اللہ عنہما قال : ((انطلقت فإذا أنا براعی غنم یسوق غنمه فقلت : ممن أنت ؟ قال : لرجل من قریش ، فسماه فعرفته ، فقلت :هل فی غنمک من لبن؟ فقال : نعم ، فقلت : هل أنت حالب لی ؟ قال : نعم ، فأمرته فاعتقل شاة من غنمه ثم أمرته أن ینفض ضرعها من الغبار ، ثم أمرته أن ینفض کفیه فقال هکذا ، ضرب إحدی کفیه بالأخری فحلب کثبة من لبن وقد جعلت لرسول اللہ ﷺ إداوة علی فیها خرقة فصببت علی اللبن حتی برد أسفله ، فانتهیت إلی النبی ﷺ فقلت : إشرب یارسول اللہ ، فشرب حتی رضیت. [أنظر : ۳۶۱۵ ، ۳۶۵۲ ، ۳۹۰۸ ، ۳۹۱۷ ، ۵۶۰۷] [۱۶]

حدیث باب کا مفہوم

یہ ہجرت کا واقعہ ہے جب حضور ﷺ کے ساتھ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جا رہے تھے، راستے میں ایک آدمی ملا جس کے ساتھ بکریاں تھیں۔ حضور ﷺ نے کوئی کھانا نہیں کھایا اس لئے بھوک تھی تو حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اس سے اجازت لی اور کہا کہ اگر تم اجازت دو تو تھوڑا سا دودھ نکال لوں۔ دودھ نکالا اور اس کو صاف کیا اس میں یہ کہتے ہیں کہ **"وقد جعلت لرسول اللہ"** پہلے میں نے ایک پیالہ سا لیا اور اس کے اوپر ایک کپڑا سا باندھا **"فصببت علی اللبن"** میں نے اس کے اوپر ذرا پانی ڈالا تاکہ نیچے کا حصہ ٹھنڈا ہو جائے۔ **"فانتهیت إلی النبی ﷺ فقلت : اشرب یارسول اللہ ، فشرب حتی رضیت"** یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہی کہہ سکتے ہیں **"فشرب حتی رضیت"** اتنا پیا کہ میں خوش ہو گیا۔

امام بخاریؒ یہ روایت لائے ہیں، شراح حضرات پریشان ہیں کہ اس کا لقطے سے کیا تعلق اور بڑی لمبی چوڑی کھینچ تان کر کے اس کی مطابقت ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے کہ اس روایت کو لقطے پر کیسے منطبق کیا جائے۔

لیکن بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس کا تعلق پچھلے باب سے ہے۔ **"باب لا تحتلب ماشیة أحد لغیر إذنه"** جس میں یہ فرمایا کہ کسی کی ماشیہ سے بغیر اس کی اجازت کے نہ دوھا جائے۔ یہاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے بھی پہلے اجازت لی اور پھر دودھ دوھا تو معلوم ہوا کہ بغیر اجازت جائز نہیں تھا۔

لقطہ کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ وہاں تو مالک تھا اجازت لے لی۔ اگر مالک موجود نہ ہوتا تو پینا جائز نہ ہوتا۔

---

[۱۶] وفی صحیح مسلم ، کتاب الاشربة ، باب جواز شرب اللبن ، رقم : ۳۷۴۹ ، وکتاب الزهد والرقائق ، باب فی حدیث الهجرة ویقال له حدیث الرجل ، رقم : ۵۳۲۹ ، ومسند احمد ، کتاب مسند العشرة المبشرین بالجنة ، باب مسند أبی بکر الصدیق ، رقم : ۳، ۴۸.

لقطہ امانت میں داخل ہے

لقطے کا جو مال ہے وہ مدت تعریف میں ملتقط کے پاس امانت ہوتا ہے۔اس کے پاس جتنے دن رہے گا بطور امانت ہوگا۔تو اگر کسی کے پاس گائے ،بکری یا اونٹنی امانت رکھوادی ہوتو اس کے لئے اس کا دودھ پینا جائز نہیں ہوتا۔اگر دودھ نکالا تو اس کو نکالنے کے بعد فروخت کرے اور قیمت اپنے پاس رکھے۔جب مالک آجائے تو اس کو دے اور اگر استعمال کیا ہے تو اس کے پیسے ادا کرے۔

سوال: سیلاب کے اندر جو سامان بہتا ہوا آتا ہے،لوگ اس کو پکڑتے ہیں،کیا یہ بھی لقطہ کے حکم میں ہے؟

جواب: یہ بھی لقطے کے حکم میں ہے،اس کو استعمال کرنا جائز نہیں تعریف کرنا ضروری ہے۔لقطہ کے سارے احکام اس پر جاری ہوں گے۔

سوال: لقطہ کے لئے کتنے پیسے ہوں تو تعریف کرنا ضروری ہے؟

جواب: اس کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی جس کے بارے میں یہ خیال ہو کہ کوئی بیچارہ اس کو تلاش کرتا ہوگا،اس کی ضرورت کا ہے،اس کی تعریف کرنا ضروری ہے۔ایک آنہ یا ایک پیسہ ہو تو عام طور سے لوگ اس کو تلاش نہیں کرتے ،تو تعریف نہ کرے۔

كتاب المظالم

٢٤٤٠ - ٢٤٨٢

۴۶ ـ كتاب المظالم

فى المظالم والغصب

و قول الله تعالى :

﴿ وَ لاَ تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلاً عَمَّا يَعْمَلُ الظَّالِمُوْنَ ، إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْأَبْصَارُ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِىْ رُؤُوْسِهِمْ ﴾

رافعى رؤوسهم . المقنع و المقمح واحد.

قال مجاهد : مُهْطِعِيْنَ : مديمى النظر . و قال غيره : مُسْرِعِيْنَ ﴿ لا يَرْتَدُّ إِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَ اَفْئِدَتُهُمْ هَوَاءٌ ﴾ يعنى جوفا لاعقول لهم ﴿ وَ أَنْذِرِالنَّاسَ يَوْمَ يَأْتِيْهِمُ الْعَذَابُ فَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رَبَّنَا أَخِّرْنَا إِلٰى أَجَلٍ قَرِيْبٍ نُجِبْ دَعْوَتَكَ وَ نَتَّبِعِ الرُّسُلَ أَوْ لَمْ تَكُوْنُوْا اَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ ، وَ سَكَنْتُمْ فِيْ مَسَاكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا أَنْفُسَهُمْ وَ تَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ وَ ضَرَبْنَا لَكُمُ الْأَمْثَالَ . وَ قَدْ مَكَرُوْا مَكْرَهُمْ وَ عِنْدَ اللّٰهِ مَكْرُهُمْ وَ إِنْ كَانَ مَكْرُهُمْ لِتَزُوْلَ مِنْهُ الْجِبَالُ ، فَلاَ تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ مُخْلِفَ وَعْدِهٖ رُسُلَهٗ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴾[1]

﴿إِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْأَبْصَارُ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِىْ رُؤُوْسِهِمْ ﴾

"مُهْطِعِيْنَ" کی تشریح کی کہ ایک معنی تو ہیں تیز چلنے والے، جلدی جلدی چلنے والے۔ بعض لوگوں نے اس کے معنی "آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے والے" کے کئے ہیں۔

(۱) باب قصاص المظالم

۲۴۴۰ ـ حدثنا اسحاق بن ابراهيم : أخبرنا معاذ بن هشام :أبى ، عن قتادة ، عن أبى المتوكل الناجى ، عن أبى سعيد الخدرى رضی اللہ عنہ عن رسول الله ﷺ قال : إذا خلص المؤمنون من النار حبسوا بقنطرة بين الجنة والنار فيتقاصون مظالم كانت بينهم فى الدنيا

[1] [ابراهيم : ۴۲ ـ ۴۷]

حتی إذا نقوا وهذبوا أذن لهم بدخول الجنة فوالذی نفس محمد ﷺ بیده ، لأحد هم بمسكنة فی الجنة أدل بمنزله كان فی الدنیا وقال یونس بن محمد :حدثنا شیبان ، عن قتادة :حدثنا أبو المتوكل .[أنظر : ۶۵۳۵] [۲]

حدیث کی تشریح

جب مومن آگ سے نکال دیئے جائیں گے تو جنت اور نار کے درمیان کے ایک پل کے پاس روک دیئے جائیں گے۔ "**فیتقاصون مظالم**" وہاں ایک دوسرے سے ان مظالم کا بدلہ لیں گے جو دنیا میں ہوئے تھے۔ مقصد یہ ہے کہ جہنم میں جو کچھ بھگتا ہے وہ حقوق اللہ کے سبب بھگتا ہے۔ جو مظالم آپس میں ہوئے ان کا بدلہ وہاں سے نکلنے کے بعد لیا جائے گا۔

"**حتی اذا نقوا**" جب پاک صاف کر دیئے جائیں گے تو اس وقت جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے گی۔

"**فوالذی نفس محمد بیده**" جب جنت میں داخل ہوں گے تو وہاں جنت میں ہر انسان کا گھر ہوگا، ہر آدمی اس کا راستہ بہ نسبت دنیا کے گھر زیادہ پہچاننے والا ہوگا۔ یعنی جس طرح آدمی دنیا میں اپنے گھر کو پہچانتا ہے، جنت میں بنے ہوئے گھر کو اس سے زیادہ پہچانے گا۔

(۲) باب قول اللہ تعالیٰ : ﴿ أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾[هود:۱۸]

۲۴۴۱ ـ حدثنا موسیٰ بن اسماعیل :حدثنی قتادة ، عن صفوان بن محرز المازنی قال: بینما أنا أمشی مع ابن عمر رضی اللہ عنهما آخذ بیده ، إذ عرض رجل فقال :كیف سمعت رسول اللہ ﷺ فی النجوی ؟ فقال : سمعت رسول اللہ ﷺ یقول : ((إن اللہ یدنی المؤمن فیضع علیه كنفه ویستره فیقول : أتعرف ذنب كذا؟ أتعرف ذنب كذا؟ فیقول : نعم أی رب ، حتی قرره بذنوبه ورأی فی نفسه أنه هلك قال :سترتها علیك فی الدنیا ، وأنا أغفرها لك الیوم)). فیعطی كتاب حسناته. وأما الكافر والمنافقون فیقول الأشهاد: ﴿ هٰؤُلَاءِ الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ أَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴾ [۳] **[أنظر:۴۶۸۵ ، ۶۰۷۰ ، ۷۵۱۴]** [۴]

---

۲ مسند أحمد كتاب باقی مسند المكثرین، باب مسند أبی سعید الخدری ، رقم :۱۰۶۷۳ ، ۱۱۱۲۳ ، ۱۱۱۷۵ ، ۱۱۲۸۱ .

۳ [هود:۱۸]

۴ وفی صحیح مسلم ، كتاب التوبة ، باب قبول توبة القاتل وان كثر قتله ، رقم : ۴۹۷۲ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب المقدمة ، باب فی ما انكرت الجهمیة ، رقم : ۱۷۹ ، ومسند احمد ، رقم : ۵۱۷۹ ، ۵۵۶۲ .

ترجمہ اور تشریح

حضرت صفوان بن محرز فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ ان کا ہاتھ پکڑے ہوئے چل رہا تھا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا۔ اس نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے پوچھا کہ **"کیف سمعت رسول اللہ ﷺ فی النجوی؟"** آپ نے نجویٰ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے کیا بات سنی ہے؟

نجویٰ کے معنی سرگوشی کے ہیں۔ یعنی اللہ جل جلالہ کسی بندے سے سرگوشی فرمائیں گے، اس بارے میں آپ نے کیا بات سنی ہے؟

"یقول ان اللہ یدنی" اللہ جل جلالہ مؤمن کو قریب کریں گے۔ **"المؤمن"** میں الف لام عہد ذہنی کا ہے یعنی ایک مومن کو قریب کریں گے۔ **"فیضع علیہ کنفہ"** اس پر اپنا پہلو رکھیں گے **"کما یلیق بشانہ تعالیٰ"**۔

"ویسترہ" اور اس کے نفس سے اس کو چھپالیں گے **"فیقول أتعرف ذنب کذا؟ أتعرف ذنب کذا؟"** چپکے سے پوچھیں گے کہ وہ گناہ جانتا ہے جو تو نے کیا تھا **"فیقول نعم أی رب"** وہ کہے گا اے رب! میں جانتا ہوں، یہاں تک کہ اللہ جل جلالہ اس کو اس کے سارے گناہ دکھا دیں گے۔

"ورأی فی نفسہ أنہ هلک" وہ دل میں سوچے گا کہ آج مارا گیا کیونکہ واقعی اتنے گناہ کئے ہیں اور اللہ تعالیٰ مجھے بتا رہے ہیں۔ اس وقت اللہ جل جلالہ فرمائیں گے **"سترتها علیک فی الدنیا وأنا أغفرها لک الیوم"** دنیا میں بھی تیری پردہ پوشی کی اور آج بھی یہاں تیری مغفرت کر دیتے ہیں۔

اللہ جل جلالہ سے مغفرت کی امید پر گناہ کا ارتکاب کرنا

یہ ان کا فضل و کرم ہے کہ جو ان ہی کے شایان شان ہے لیکن بندے کا یہ کام نہیں کہ اس فضل و کرم کو مدنظر رکھتے ہوئے معاصی کا ارتکاب کرے اور جرأت کرے کہ چلو کرلوں بعد میں میرا بھی یہی انجام ہوگا۔ اس قسم کی احادیث میں بیان کردہ رحمت کی بنیاد پر معاصی پر جرأت کرنا یہ بندے کا کام نہیں ہے، اس واسطے کہ قانون وہی ہے کہ گناہ کی سزا ملے گی، عذاب ہوگا اور پتہ نہیں کس بندے کی عمل کیوجہ سے یہ معاملہ ہو رہا ہے اور پتہ نہیں کہ تم اس میں داخل ہو یا نہیں۔ اس واسطے اس قسم کی احادیث کی وجہ سے گناہوں پر جرأت نہ ہونی چاہئے العیاذ باللہ تعالیٰ۔ یہ ان گناہوں کا ذکر ہے جو غلطی و بھول چوک سے ہو گئے تو اللہ جل جلالہ کی رحمت سے اُمید ہے کہ اللہ جل جلالہ ان کو معاف فرما دیں گے لیکن جان بوجھ کر گناہ کرنا یہ بہت بری بات ہے۔ اللہ جل جلالہ ہر مسلمان کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

(۳) باب لایظلم المسلم المسلم ولا یسلمه

۲۴۴۲ ۔ حدثنا ....ومن ستر مسلما ستره الله یوم القیامة [أنظر : ۶۹۵۱]

''أسلم یسلم أسلم رجلاً'' یعنی اس کو بغیر مدد کئے چھوڑ دیا۔

(۱۰) باب من کانت له مظلمة عند الرجل فحللها له ، هل یبین مظلمته؟

۲۴۴۹ ۔ حدثنا آدم بن أبي إیاس :حدثنا ابن أبي ذئب :حدثنا سعید المقبری عن أبي هریرة ﷺ قال : قال رسول الله ﷺ ((من کانت له مظلمة لأخیه من عرضه أوشیء فلیتحلله منه الیوم قبل أن لا یکون دینار ولا درهم ، إن کان له عمل صالح أخذ منه بقدر مظلمته وإن لم یکن له حسنات أخذ من سیئات صاحبه فحمل علیه)) .

قال أبوعبدالله : قال اسماعیل بن أبي أویس : إنما سمیی المقبری لأنه کان ینزل ناحیة المقابر ، قال أبو عبدالله : وسعید المقبری هو مولی بنیی لیث وهو سعید بن أبی سعید ، وإسم أبي سعید کیسان . [أنظر : ۶۵۳۴]. [۵]

ظلم کی تلافی

یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ ''من کانت له مظلمة عندالرجل'' اگر کسی آدمی کی طرف سے کسی آدمی پر کوئی ظلم ہوا ہو ''فحللها له'' اور اس مظلوم نے اس کو معاف کر دیا ہو۔ ''حللها''، حلال کر دیا یعنی معاف کر دیا ''هل یبین مظلمته ؟'' تو کیا معافی طلب کرنے والا اپنے اس ظلم کو پہلے بیان کرے کہ میں نے یہ ظلم کیا تھا تب معافی طلب کرے یا اجمالاً اتنا معافی کرنا ہی کافی ہے کہ اگر میرا تمہارے ذمہ کوئی حق ہو یا میری طرف سے کوئی زیادتی ہوئی ہو، اس کو معاف کر دو۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کیا اور اس کا حکم نہیں بتایا، اس لئے کہ اس میں علماء کا اختلاف ہے یعنی اگر کسی شخص نے کسی دوسرے کے ساتھ زیادتی کی ہے تو اس کی دو صورتیں ہیں:

ایک صورت تو یہ ہے کہ زیادتی کو بیان کرے یعنی یہ کہے کہ میں نے فلاں زیادتی کی تھی تم مجھے معاف کر دو۔ اس صورت میں بالاتفاق معافی ہو جاتی ہے۔

---

۵ مسند أحمد ، کتاب باقی مسند المکثرین ، باب باقی المسند السابق ، رقم :۹۲۴۲ ، ۱۰۱۶۹ .

دوسری صورت یہ کہ اگر وہ بیان نہ کرے صرف اتنا کہہ دے کہ مجھ سے تمہاری کوئی حق تلفی ہوئی ہو تو معاف کردو، یہ نہیں بتایا کہ حق تلفی کیا ہے؟

زیادتی پر معافی اور اختلاف ائمہ

اس میں علماء کا اختلاف ہے۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ اس طرح معافی نہیں ہوتی بلکہ حق تلفی بیان کرنا ضروری ہے۔
بعض حضرات کہتے ہیں کہ مطلقاً بھی معاف کردے تو معافی ہوجاتی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ اس واسطے اس باب کے تحت وہ لائے ہیں: **"من كانت له مظلمة لاخيه"** کہ جس شخص کے ذمہ اپنے بھائی کا کوئی ظلم ہو اس کی آبرو کے متعلق یا کوئی اور حق ہو، **"فليتحلله"** تو اس سے آج حلت یعنی معافی طلب کرلے۔ **"قبل أن لايكون دينار ولا درهم"** قبل اس کے کہ دینار، درہم نہ ہوں گے یعنی آخرت میں اگر اس کے پاس نیکیاں ہوں گی تو جتنی زیادتیاں اس نے کی ہیں اس سے اتنی نیکیاں لے کر مظلوم کو دیدی جائیں گی۔ **"فان لم يكن له حسنات"** اگر نیکیاں نہ ہوئیں تو مظلوم کی سیئات لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی تو اس وقت سے پہلے پہلے معافی طلب کرو۔

یہاں حضور ﷺ نے کوئی قید نہیں لگائی کہ ہر زیادتی کو بیان کرکے پھر معافی مانگ لو بلکہ تم نے جو بھی ظلم کیا ہے یا تم پر کسی کا حق ہے، اس سے معاف کرالو۔ آپ ﷺ نے یہ بات مطلقاً ارشاد فرمائی۔ معلوم ہوا کہ مطلقاً معاف کردینا بھی جائز ہے۔

یہ اس وقت ہے جب مظلوم بیان کرنے کا مطالبہ نہ کرے لیکن اگر مظلوم مطالبہ کرے کہ تم مجھ سے جو معافی مانگ رہے ہو، بتاؤ وہ حق تلفی کیا ہے؟ پہلے غلطی بتاؤ پھر معاف کروں گا۔ اگر وہ یہ کہے تو اس کو یہ حق ہے، لیکن اگر وہ یہ کہے کہ چلو معاف کیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ معاف ہوگا۔

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کا طرزِ عمل

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب مجھ سے کوئی معافی مانگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ پہلے غلطی بتاؤ۔ وہ کہتا ہے میں نے آپ کی غیبت کی تھی۔ بتاؤ غیبت کیا تھی؟ پھر معاف کروں گا۔

کہتے ہیں کہ دل میں یہ نیت ہوتی تھی کہ ہوسکتا ہے یہ جو بات بتائے اس سے اپنی کوئی اصلاح ہوجائے۔ اس نے جو غیبت کی تھی بظاہر اس نے برائی بیان کی تھی۔ بہت سے لوگ سامنے تو برائی نہیں کرتے لیکن پیچھے بیان کرتے ہیں۔ جب پیچھے بیان کرتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لوگ میرے بارے میں کیا سمجھتے ہیں اور کیا

برائی بیان کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کوئی برائی ایسی بیان کریں جو واقعی موجود ہو تو اس سے اصلاح ہو جائے گی۔ اس نیت سے پوچھتا ہوں کہ بتاؤ، کیا غیبت کی تھی؟ پھر معاف کروں گا۔

کہا سنا معاف کرنا

ہمارے بزرگوں کا ایک جملہ قدیم سے چلا آتا ہے کہ جب آپس میں جدا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں "کہا سنا معاف کرنا" یہ وہی عمومی معافی طلب کرنا ہے یعنی اگر میں نے کوئی ایسی بات کہہ دی ہو جو غیبت کے زمرے میں آتی ہے یا برائی میں شامل ہے تو معاف کر دینا، اس سے بھی معافی ہو جاتی ہے بشرطیکہ مظلوم بیان کرنے کی شرط نہ لگائے۔

حقوق العباد کا خیال رکھنا چاہئے

حقوق العباد کا معاملہ بڑا خطرناک ہے۔ حقوق اللہ تو تنہا توبہ کر لینے سے معاف ہو جاتے ہیں لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک کہ صاحب حق معاف نہ کرے۔

اول تو اس کا اہتمام ہونا چاہئے کہ اپنی ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ زبان، ہاتھ یا کسی بھی عمل سے تکلیف نہ پہنچے اور اگر کبھی ایسا ہو جائے تو فوراً معافی مانگنے کا اہتمام کرے، اللہ تعالیٰ توفیق دے فرض کریں اگر کسی نے دوسرے سے یہ کہا کہ مجھ سے کوئی حق تلفی ہوئی ہو تو معاف کرنا مثلاً غیبت وغیرہ اور دل میں یہ خیال ہے کہ مالی حق بھی معاف کر دے تو اس طرح مالی حق کی معافی نہیں ہوگی۔

سوال: اگر کسی نے کسی شخص کی غیبت کی اور وہ شخص کہیں دور دراز علاقے میں چلا گیا اور رابطہ ممکن نہ ہو سکے یا اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے حقوق کی تلافی کیسے ہوگی؟

جواب: اگر ان کا انتقال ہو گیا ہے تو ان کا حق یہ ہے کہ ان کے حق میں دعا کرے۔ ان کی طرف سے صدقہ و ایصال ثواب کر دے اور اگر وہ زندہ ہیں تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کرے کہ یا اللہ ان کے دل میں ڈال دیجئے کہ وہ مجھے معاف کر دیں۔

سوال: کیا ظالم کی غیبت کرنا جائز ہے؟

جواب: ظالم کی غیبت اس حد تک جائز ہے جس حد تک آدمی پر ظلم ہوا ہے۔ اس کا تدارک کرنے کے لئے بتائے کہ مجھ پر کس حد تک ظلم ہوا ہے۔ ظالم نے مجھ پر فلاں ظلم کیا ہے یا کم از کم اپنی مظلومیت کا اظہار کرنے کے لئے اتنی بات کی اجازت ہے کہ ظالم کے ظلم کو لوگوں کے سامنے بیان کرے کہ مجھ پر یہ ظلم ہوا ہے، اس میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن بطور مشغلہ کے نہ کرے بلکہ یا تو ظلم کا تدارک کرنے کے لئے یا جو تکلیف پہنچی ہے اس پر لوگوں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے بیان کرے تو ٹھیک ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿لاَ یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ وَ کَانَ اللّٰہُ سَمِیْعاً عَلِیْماً o﴾[۶]

ترجمہ: ”اللہ کو پسند نہیں کسی کی بری بات کا ظاہر کرنا مگر جس پر ظلم ہوا ہو اور اللہ ہے سننے والا جاننے والا“۔

فاسق کی غیبت کا حکم

یہ جو مشہور ہے کہ فاسق کی غیبت جائز ہے، یہ بات علی الاطلاق درست نہیں بلکہ فاسق اور معلن کی غیبت اس حد تک جائز ہے جو وہ خود اعلانیہ کرتا ہو۔

فرض کریں ایک آدمی اعلانیہ شراب پیتا ہے۔ اب اگر کوئی کہے کہ فلاں شراب پیتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں کیونکہ وہ فاسق ہے خود اعلانیہ شراب پیتا ہے۔ اس واسطے اگر لوگوں کے سامنے ذکر کر دیا گیا تو وہ ناپسند نہیں کرے گا۔

لیکن جس کام کو وہ اعلانیہ نہیں کرتا اور چھپانا چاہتا ہے اس کے بارے میں غیبت کرنا فاسق کی بھی جائز نہیں۔

”سعید المقبری“ سعید المقبری روایتوں میں بکثرت آتا رہتا ہے۔ ان کا نام مقبری اس لئے رکھ دیا گیا تھا کہ **”أنه كان ينزل ناحية المقابر“** کہ یہ قبرستان کے پاس رہا کرتے تھے۔ آگے یہ بتایا کہ یہ بنو لیث کے مولیٰ ہیں۔ سعید ابن ابی سعید ان کا نام ہے اور ابو سعید کا نام کیسان ہے۔

(۱۱) باب إذا حلله من ظلمه فلا رجوع فيه

۲۴۵۰ ـ حدثنا محمد: أخبرنا عبدالله: أخبرنا هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة رضي الله عنها: ﴿وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضاً﴾[النساء: ۱۲۸] قالت: الرجل تكون عنده المرأة ليس بمستكثر منها يريد أن يفارقها فتقول: أجعلك من شأني في حل، فنزلت هذه الآية في ذلك. [أنظر: ۲۶۹۴، ۴۶۰۱، ۵۲۰۶][۷]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ آیت کریمہ **﴿وَ إِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضاً﴾** یہ اس طرح نازل ہوئی کہ ایک شخص کے پاس کوئی عورت ہے یعنی اس کی بیوی **”ليس بمستكثر منها“**

---

۶ [النسآء: ۱۴۸]

۷ وفي صحيح مسلم، كتاب التفسير، رقم: ۵۳۴۲، ۵۳۴۳، وسنن أبي داؤد، كتاب النكاح، باب في القسم بين النساء، رقم: ۱۸۲۳.

اور وہ اس کے ساتھ کچھ زیادہ نہیں رہتا۔

"استکثر" کے معنی زیادتی کرنا کہ اس کی زیادہ صحبت نہیں اٹھاتا، آپس میں زیادہ محبت نہیں ہے، شوہر کو بیوی سے محبت نہیں ہے، اس واسطے اس کے ساتھ زیادہ نہیں رہتا۔ **"یرید أن یفا رقھا"** اس کا ارادہ ہے کہ میں اس کو چھوڑ دوں **"فتقول"** وہ عورت کہتی ہے کہ **"أجعلک من شأني في حل"** کہ میں تمہیں اپنے معاملے میں آزادی دیتی ہوں۔ اپنے حقوق معاف کرتی ہوں کہ تم میرے پاس شب باشی نہ کرو یا میرا نفقہ نہ دو۔ تم مجھے طلاق نہ دو، نکاح میں برقرار رکھو، میں تمہیں اپنے حقوق معاف کرتی ہوں۔ اگر وہ اس طرح معاف کردے اور شوہر اس کی وجہ سے اس کو طلاق نہ دے تو جائز ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَ إِنْ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزًا أَوْ إِعْرَاضاً فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ط وَ الصُّلْحُ خَيْرٌ ط﴾

ترجمہ: "اور اگر کوئی عورت ڈرے اپنے خاوند کے لڑنے سے یا جی پھر جانے سے تو کچھ گناہ نہیں دونوں پر کہ کرلیں آپس میں کسی طرح صلح اور صلح خوب چیز ہے"۔

کہ اگر عورت کو اپنے شوہر سے نشوز کا اندیشہ ہو کہ وہ اس کے ساتھ نشوز کرے گا۔ نشوز کا مطلب ہے نافرمانی کرے گا۔ مراد یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک نہیں کرے گا یا اعراض کا برتاؤ کرے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ آپس میں مصالحت کرلیں۔

مصالحت یہ ہے کہ بیوی کہے کہ میں اپنے حقوق سے دستبردار ہوتی ہوں مجھے چھوڑو نہیں، تو ایسا کرنا جائز ہے۔

"والصلح خیر" اس طرح صلح کرنا بہ نسبت اس کے بہتر کہ وہ عورت کو طلاق دے دے اور عورت مطلقہ قرار پائے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے جو **"ترجمۃ الباب"** قائم کیا ہے کہا **"ذا حللہ من ظلمہ فلا رجوع فیہ"** کہ اگر کوئی مظلوم شخص ظالم کو ایک مرتبہ معاف کردے تو اب بعد میں رجوع نہیں کرسکتا۔ ایک مرتبہ جس کو معاف کردیا وہ معاف ہوگیا۔ اس حدیث سے اس طرح استدلال کیا کہ بیوی کہتی ہے میں اپنے معاملات میں آپ کو آزاد کرتی ہوں۔ اسی بنیاد پر صلح ہوئی اور اسی بنیاد پر وہ طلاق دینے سے باز رہا۔ اب بعد میں بیوی کہے کہ میں معاف نہیں کرتی تو اس صلح کا مقصد ہی فوت ہوجائے گا۔ اس واسطے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ معاف کردینے کے بعد معافی ہوجاتی ہے اور اس میں رجوع نہیں ہوتا۔

(۱۲) باب إذا أذن له أو أحله ولم يبين كم هو؟

۲۴۵۱ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف: أخبرنا مالک، عن أبي حازم بن دينار، عن سهل بن سعد الساعدی ﷺ: أن رسول الله ﷺ أتي بشراب فشرب منه وعن يمينه غلام وعن يساره الأشياخ فقال للغلام: ((أتأذن لي أن أعطي هؤلاء؟)) فقال الغلام: لا والله يارسول الله، لاأوثر بنصيبي منک أحدا، قال: فتله رسول الله ﷺ فی يده. [راجع: ۲۳۵۱] [۸]

یہ باب دوبارہ قائم کیا ہے کہ "إذا كان أذن له أو أحله ولم يبين كم هو؟" اگر کوئی شخص اجازت دیدے یا کوئی حق معاف کردے اور حق کی مقدار نہ بتائے۔

پہلے باب تھا کہ حق کی نوعیت ہی نہیں بتائی۔ کہا کہ اگر کوئی حق تلفی ہوئی ہو تو معاف کردینا۔

اس باب کا منشاء یہ ہے کہ حق تو بتادیا کہ فلاں حق ہے لیکن اس کی مقدار نہیں بتائی۔ تو آیا اس صورت میں اگر مظلوم معاف کردے تو معاف ہو جائے گا یا نہیں؟ اس میں جو حدیث ذکر کی ہے وہ آپ نے بار بار پڑھی ہے کہ آپ ﷺ نے پانی دینا چاہا تو دائیں طرف تو عمر لڑکا تھا اور بائیں طرف بڑے بڑے اشیاخ تھے۔

آپ ﷺ نے اس لڑکے سے پوچھا کہ مشائخ کو یہ دے دوں؟ اس نے کہا کہ میں تو اپنا حصہ کسی کو ایثار نہیں کرتا۔

اس سے اس طرح استدلال کیا کہ پانی، برتن میں تھا اور آپ ﷺ نے لڑکے سے کہا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو مشائخ کو دے دوں لیکن آپ ﷺ نے پانی کی مقدار نہیں بتائی کہ کتنا پانی ہے؟ اس نے تو نہیں دیکھا تھا کہ کتنا پانی ہے؟ تو مقدار بتائے بغیر آپ ﷺ نے اس سے اجازت طلب کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اجازت نہ دی لیکن ظاہراً اجازت طلب کرنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ اجازت دے دیتا تو آپ ﷺ وہ مشائخ کو دیدیتے۔ تو مقدار بتائے بغیر اجازت طلب کر لینا یا مقدار بتائے بغیر معافی طلب کر لینا جائز ہے۔

سوال: قیامت کے دن ظالم کی نیکیاں مظلوم کو دے دی جائیں گی۔ وہ نیکیاں زیادہ ہوں گی یا معاف کرنے کا اجر زیادہ ہوگا؟

جواب: یہ اس آدمی کی نیکیوں کی مقدار پر موقوف ہے کہ کتنی نیکیاں ہیں، لیکن بہر حال ہم یہاں اس کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یقیناً معاف کرنے کا اجر زیادہ ہوگا۔

---

۸ وفي صحيح مسلم، كتاب الأشربة، باب استحباب ادارة الماء واللبن ونحوهما عن يمين، رقم: ۳۷۸۶، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث أبي مالک سهل بن سعد الساعدی، رقم: ۲۱۷۵۸، ۲۱۷۹۷، وموطأ مالک، كتاب الجامع، باب السنة في الشرب ومناولته عن اليمين، رقم: ۱۴۵۰.

(۱۳) باب إثم من ظلم شيئامن الأرض

۲۴۵۲ ــ حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب ، عن الزهرى قال : حدثنى طلحة بن عبد الله : أن عبد الرحمٰن بن عمرو بن سهل : أخبره أن سعيد بن زيد رضى اللّٰه عنه قال : سمعت رسول الله ﷺ يقول : من ظلم من الأرض شيئا ، طوقه من سبع أرضين .[أنظر:۳۱۹۸] [۹]

۲۴۵۴ ــ حدثنا مسلم بن إبراهيم :............ قال الفربرى : قال أبو جعفر بن أبي حاتم : قال أبو عبدالله : هذا الحديث ليس بخراسان في كتب ابن المبارک أملى عليهم بالبصرة.[أنظر:۳۱۹۶]

پہلی حدیث میں ہے کہ جوشخص ظلماً کسی کی زمین لے گا تو اس کے گلے میں سات زمینیں طوق بنا کر ڈال دی جائیں گی ۔ زمینیں کیسے طوق بنائی جائیں گی؟ اس کی تفسیر بیان کی کہ قیامت کے دن اس کو سات زمینوں تک زمین میں دھنسا دیا جائے گا ۔ تو گویا وہ زمینیں اس کے گلے کا طوق بن جائیں گی ۔

"قال الفربری"

یعنی یہ حدیث حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے خراسان میں نہیں بیان کی بلکہ بصرہ میں بیان کی تھی ۔

اس کا مطلب تضعیف نہیں ہے صرف واقعہ کا بیان ہے کہ خراسان میں عبداللہ بن مبارک نے جو حدیثیں بیان کی تھیں ان میں یہ شامل نہیں بلکہ یہ بصرہ میں بیان کی تھی ۔

(۱۴) باب إذا أذن انسان لآخر شيئا جاز

۲۴۵۵ ـ حدثنا حفص بن عمر : حدثنا شعبة ، عن جبلة : كنّا بالمدينة في بعض أهل العراق فأصابنا سنة ، فكان ابن الزبير يرزقنا التمر ، فكان ابن عمر رضى الله عنهما يمر بنا فيقول : إن رسول الله ﷺ نهى عن الإقران إلا أن يستأذن الرجل منكم أخاه.

---

[۹] وفى صحيح مسلم ، كتاب المساقاة ، باب تحريم الظلم وغصب الارض وغيرها ، رقم : ۳۰۲۰ ، وسنن الترمذى ، كتاب الديات عن رسول الله ، باب ماجاء فيمن قتل دون ماله فهو شهيد ، رقم : ۱۳۳۸ ، ومسند أحمد ، رقم : ۱۵۴۲ ، ۱۵۴۷ ، وسنن الدارمى ، كتاب البيوع ، باب من اخذ شبراً من الارض ، رقم : ۲۴۹۲ .

[أنظر: ۲۴۸۹، ۲۴۹۰، ۵۴۴۶] [۱]

حدیث باب کی تشریح

حضرت جبلہ فرماتے ہیں کہ ہم عراق کے ایک شہر میں تھے۔ **"فاصابنا سنة"** کہ ہمیں قحط پڑ گیا۔ حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ ہمیں کھجوریں دیا کرتے تھے یعنی قحط کے زمانے میں کھجوریں تقسیم کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ ہم سے گزرتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اقران سے منع فرمایا ہے۔

اقران کے معنی یہ ہیں کہ ایک تھال میں کھجوریں رکھی ہیں اور مختلف مشترک لوگ بیٹھ کر کھا رہے ہیں۔ کوئی ایک آدمی ایک مرتبہ میں دو کھجوریں کھانے کے لئے اٹھالے، اس کو اقران کہتے ہیں۔ ایک ثمر کو دوسری ثمر کے ساتھ ملا کر کھائے۔ سب ایک ایک کھا رہے ہیں اور ایک شخص نے دو اٹھالیں، اس سے منع فرمایا۔ لیکن اگر کوئی شخص حاضرین سے اجازت لے لے کہ میں دو کھانا چاہ رہا ہوں اور وہ اجازت دے دیں تو یہ دوسری بات ہے لیکن خود سے اس کا اقدام نہیں کرنا چاہئے۔

یہ حکم خاص نہیں

اور یہ کھجور کی خصوصیت نہیں بلکہ جہاں پر بھی کچھ لوگ کوئی مشترک چیز استعمال کر رہے ہوں وہاں دوسروں سے زیادہ لینا ٹھیک نہیں۔ اس کا اطلاق دعوتوں پر بھی ہوتا ہے کہ دعوتوں میں کھانا سامنے رکھا ہوا ہے۔ اب دس آدمی بیٹھے ہیں تو آدمی کو لیتے وقت یہ خیال کرنا چاہئے کہ میرے علاوہ نو آدمی اور بھی ہیں۔ بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ سارا اپنے برتن میں لے لیا تو یہ بھی اقران میں داخل ہے بلکہ اس سے زیادہ ہے کہ کھجور میں تو ایک ہی بات ہے کہ زیادتی ہوئی اور یہاں اچھا اچھا کھانا سارا اپنے برتن میں ڈال لیا، یہ بدتمیزی، بدتہذیبی اور ناجائز ہے کیونکہ اپنے دوسرے ساتھیوں کا خیال نہیں کیا۔ ان کی رعایت نہیں رکھی۔

تو حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ نے خاص طور پر قحط کے زمانے میں یہ فرمایا کیونکہ قحط کے زمانے میں لوگ بھوک سے بے تاب ہوتے ہیں، کہیں بھوک کی وجہ سے زیادہ نہ لے لیں تو حضور اکرم ﷺ کا فرمان سنایا کہ آپ ﷺ

---

[۱] وفي صحيح مسلم، كتاب الاشربة، باب نهي الآكل مع جماعة عن قران تمرتين ونحوهما لقمة الا باذن اصحابه، رقم: ۳۸۰۹، وسنن الترمذي، كتاب الاطعمة عن رسول الله، باب ماجاء في كراهية القران بين التمرتين، رقم: ۱۷۴۶، وسنن أبي داؤد، كتاب الاطعمة، باب الاقران في التمر عند الأكل، رقم: ۳۳۳۷، وسنن ابن ماجة كتاب الاطعمة، رقم: ۳۳۲۲، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابه، باب مسند عبدالله بن عمر بن لخطاب، رقم: ۴۲۸۴، ۴۷۹۴، ۴۸۱۹، ۵۱۷۸.

نے بغیر اجازت اقران سے منع فرمایا۔

۲۴۵۶ ۔ حدثنا أبو النعمان : حدثنا أبو عوانة عن الأعمش عن أبی وائل، عن أبی مسعود: أن رجلا من الأنصاریقال له : أبوشعیب ،کان له غلام لحام فقال له أبوشعیب : إصنع لی طعام خمسة لعلی أدعو النبی ﷺ خامس خمسة ، وأبصر فی وجه النبی ﷺ الجوع فدعاه فتبعهم رجل لم یدع فقال النبی ﷺ : إن هذا قد أتبعنا أتاذن له؟ قال نعم. [راجع: ۲۰۸۱] [۱۱]

ابوشعیب کا غلام لحام تھا یعنی گوشت فروش تھا۔ابوشعیب نے ان سے کہا کہ میرے لئے پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کردو کیونکہ شاید میں حضور ﷺ کودعوت دوں ۔خامس خمسہ کہ پانچ میں پانچویں ہوں گے یعنی حضور اکرم ﷺسمیت کل پانچ آدمی ہوں گے۔

"**وابصرفی وجه النبی ﷺ نعم الجوع**" اورابوشعیب نے حضوراکرم ﷺ کے چہرہ انور پر بھوک کے آثار دیکھے تھےتو جا کر یہ کھانا بنوایا۔"**فدعاه**"حضور ﷺ کودعوت دی تو ساتھ ایک شخص لگ گیا جس کو دعوت نہیں دی گئی تھی۔

نبی کریم ﷺ جب ان کے دروازے پر پہنچےتو آپ ﷺ نے صراحتاًاس کے لئے اجازت طلب کی پھر لے گئے۔

بن بلائے مہمان کا حکم

معلوم ہوا کہ جس کو دعوت نہیں دی گئی اس کو بغیر اجازت ساتھ لے کر جانا جائز نہیں جب تک کہ صاحب طعام اجازت نہ دے۔اجازت بھی خوش دلی سے ہو، یہ نہیں کہ شرما شرمی سے مروتاًاس نے اجازت دے دی ہو۔

حدیث میں ہے کہ جوشخص بغیر دعوت کے کہیں جائے تو چور بن کر داخل ہوااور لٹیرا بن کر نکلا۔[۱۲] اس عمل پر کتنی سخت وعید ہے۔بعض پیر صاحب مقتداء یا پیراس معصیت کبریٰ کا سبب بن جاتے ہیں ،دعوت صرف پیر صاحب کی ہوتی ہے اور پیر صاحب مریدین کا لاؤلشکر لے کر پہنچ جاتے ہیں، میزبان بیچارہ مروت کے مارے کچھ کہہ بھی نہیں سکتا۔ یہ بہت خطرناک بات ہے۔

---

[۱۱] وفی صحیح مسلم ،کتاب الاشربة ، باب مایفعل الضیف اذا تبعه غیر من دعاه صاحب الطعام ، رقم : ۳۷۹۷، وسنن الترمذی ،کتاب النکاح عن رسول الله ، رقم : ۱۰۱۸.

[۱۲] سنن البیهقی الکبریٰ ، ج : ۷ ، ص : ۲۸ ، باب طعام الفجاة قال أبو العباس و نهی عن طعام ، رقم : ۱۳۱۹۰، ۱۴۳۲۳، وسنن أبی داؤد، ج :۳، ص : ۳۴۱، کتاب الاطعمة ، باب ما جاء فی اجابة الدعوة ، رقم : ۳۷۴۱، مطبوعة دارالفکر، بیروت.

(۱۵) باب قول الله تعالىٰ: ﴿وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ﴾ [۱۳]

۲۴۵۷ ـ حدثنا أبو عاصم، عن ابن جريج، عن ابن أبي مليكة عن عائشة رضي الله عنها، عن النبي ﷺ قال: إن ابغض الرجال إلى الله وهو الألد الخصم. [أنظر: ۴۵۲۳، ۷۱۸۸]

الألد الخصم

اللہ ﷻ کو وہ شخص بہت مبغوض ہے جو جھگڑالو ہے "الد" کے معنی ہیں جھگڑا کرنے والا۔ بات بات پر جھگڑا کر رہا ہے، بات بات پر بحث ومباحثہ کرنے کے لئے تیار ہے۔ تو ایسا آدمی اللہ ﷻ کو سخت مبغوض ہے۔ اللہ ﷻ کو وہ شخص پسند ہے جو نرم خو ہے، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ہو، اچھا برتاؤ کرنے والا ہو۔

(۱۶) باب إثم من خاصم فی باطل وهو يعلمه

۲۴۵۸ ـ حدثنا عبدالعزيز بن عبدالله قال: حدثنی ابراهيم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب قال: أخبرنی عروة بن الزبير: أن زينب بنت أم سلمة أخبرته أن أمها أم سلمة رضی الله عنها زوج النبی ﷺ أخبرتها عن رسول الله ﷺ: أنه سمع خصومة بباب حجرته فخرج إليهم فقال: إنما انا بشر، وأنه يأتينی الخصم فلعل بعضكم أن يكون أبلغ من بعض فاحسب أنه صدق فاقضی له بذلک، فمن قضيت له بحق مسلم فإنما هی قطعة من النار فليأخذها أوليتركها. [أنظر: ۲۶۸۰، ۶۹۶۷، ۷۱۶۹، ۷۱۸۱، ۷۱۸۵] [۱۴]

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے خصومت کی آواز سنی۔ دو آدمی آپ ﷺ کے حجرہ مبارکہ کے دروازے پر جھگڑ رہے تھے۔ آپ ﷺ ان کی طرف نکل گئے اور فرمایا "انما أنا بشرو أنه يأتينی الخصم" کہ میں ایک بشر ہوں۔ بعض اوقات کوئی خصم آتا ہے یعنی کوئی فریق آتا ہے کہ ہمارا جھگڑا ہے

[۱۳] [البقرة: ۲۰۴]

[۱۴] وفی صحيح مسلم، كتاب الأقضية، باب الحكم بالظاهر واللحن بالحجة، رقم: ۳۲۳۱، ۳۲۳۲، وسنن النسائی، كتاب آداب القضاة، باب الحكم بالظاهر، رقم: ۵۳۰۶، و سنن أبی داؤد، كتاب الاقضية، باب فی قضاء القاضی اذا اخطأ، رقم: ۳۱۱۲، وسنن ابن ماجة، كتاب الاحكام، باب قضية الحاكم لاتحل حراماً ولاتحرم حراماً، رقم: ۲۳۰۸، ومسند احمد، باقی مسند الأنصار، باب حديث أم سلمة زوج النبی، رقم: ۲۵۲۸۶، ۲۵۴۰۲، ۲۵۴۰۹، ۲۵۴۹۲، و موطأ مالک، كتاب الأقضية، باب الترغيب فی القضأ بالحق، رقم: ۱۲۰۵.

فیصلہ فرمادیں۔ **"فلعل بعضكم أن يكون أبلغ من بعض"** تو ہوسکتا ہے کہ تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے مقابلہ میں بہت زیادہ بلیغ ہو یعنی اس کے اندر فصاحت و بلاغت زیادہ ہو۔ بعض روایتوں میں ہے **"ان يكون الحق بحجته"** کہ اپنی حجت کو زیادہ چرب لسانی سے بیان کرنے پر قادر ہو۔ **"فاحسب أنه صدق"** میں یہ گمان کرلوں کہ اس نے سچ بولا ہے **"فأقضي له بذلك"** اور اس کے لئے فیصلہ کردوں **"من قضيت له بحق مسلم فانما هي قطعة من النار"** میرے فیصلے کے باوجود جو ناحق چیز اس کو مل گئی اور وہ جانتا ہے کہ یہ ناحق ہے تو یہ چیز اس کے لئے جہنم کا ٹکڑا ہے۔ **"فليأخذها أو ليتركها"** جب یہ جانتا ہے کہ جہنم کا ٹکڑا ہے تو چاہے تو لے لے اور نہیں لینا چاہتا تو چھوڑ دے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر میں نے کسی شخص کے حق میں اس کے ظاہری دلائل کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کردیا جبکہ نفس الامر میں وہ اس کا حق نہیں تھا تب بھی اس شخص کے لئے اس چیز کو ناحق استعمال کرنا جائز نہیں، سخت گناہ ہوگا۔

اگر قاضی نے ناحق فیصلہ کیا تو اس کا حکم

ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مسلک

اس حدیث سے ائمہ ثلاثہ" یعنی شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ تینوں اس بات پر استدلال کرتے ہیں کہ ناحق دعویٰ کی صورت میں قضاء صرف ظاہراً نافذ ہوتی ہے، باطناً نافذ نہیں ہوتی۔ [۱۵]

مثلاً قاضی نے کوئی فیصلہ کردیا کہ یہ مکان زید کا ہے تو ظاہراً اس کا فیصلہ نافذ ہوگا۔ ظاہراً کے معنی ہیں دنیا کے احکام میں، دنیا کے اعتبار سے کسی کو یہ حق نہیں ہوگا کہ اس مکان کو اپنا کہے لیکن باطناً نافذ نہیں ہوگا۔ یعنی اگر وہ مکان فی الواقع نفس الامر میں اس کا نہیں ہے تو اس کے لئے اس مکان سے انتفاع حلال نہیں ہوگا۔

اسی طرح مثلاً ایک شخص نے کسی عورت پر دعویٰ کردیا کہ یہ میری بیوی ہے اور اس پر جھوٹا بینہ قائم کردیا، اس بینہ کی بنیاد پر قاضی نے یہ فیصلہ کردیا کہ یہ اس کی بیوی ہے جبکہ نفس الامر میں نکاح نہیں ہوا تھا تو قاضی کا یہ فیصلہ ظاہراً نافذ ہوگا یعنی دنیا کے اندر اس کے ساتھ بیوی والا معاملہ کرنے سے کوئی نہیں روک سکے گا لیکن آخرت کے احکام کے اعتبار سے باطناً نافذ نہیں ہوگا، لہٰذا اس کے لئے حلال نہیں ہے کہ اس کے ساتھ بیوی والا معاملہ کرے۔

یہ ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ کا مذہب ہے اور اس کو اس طرح تعبیر کیا جاتا ہے کہ قضا قاضی ظاہراً نافذ ہوتی ہے باطناً نہیں ہوتی۔ [۱۶]

۱۵، ۱۶ به استدل الائمة الثلاثة على أن قضاء القاضي إنما ينفذ في الظاهر، ولا ينفذ في الباطن الخ تكملة فتح الملهم، ج: ۲، ص ۵٦٧.

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک ایسی صورت میں قضاءِ قاضی کے نافذ ہونے کے لئے چند شرائط ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ معاملہ عقود یا فسوخ کا ہو، مثلاً ایک شخص کہتا ہے کہ اس نے یہ کتاب مجھے بیچ دی تھی۔ دوسرا کہتا ہے کہ میں نے نہیں بیچی، یہ عقد کا معاملہ ہوا۔

ایک شخص کہتا ہے کہ اس عورت نے میرے ساتھ نکاح کیا ہے اور نکاح کو قبول کیا ہے۔ عورت کہتی ہے کہ میں نے اس کے ساتھ نکاح نہیں کیا، یہ معاملہ بھی عقد کا ہے۔

یا فسخ کا معاملہ ہو کہ ایک شخص کہتا ہے کہ اس نے میرے ساتھ اقالہ کرلیا۔ دوسرا کہتا ہے میں نے اقالہ نہیں کیا۔ عورت کہتی ہے کہ مجھے شوہر نے طلاق دے دی اور مرد کہتا ہے کہ میں نے طلاق نہیں دی، یہ فسخ کا معاملہ ہوا تو معاملہ عقود اور فسوخ کا ہو، تب قضاء قاضی ظاہراً و باطناً نافذ ہوتی ہے لیکن اگر معاملہ عقود و فسوخ کا نہیں ہے بلکہ املاک مرسلہ کا ہے تو قضاء قاضی صرف ظاہراً نافذ ہوگی، باطناً نہیں ہوگی۔ [۱۷]

املاک مرسلہ کا مطلب

املاک مرسلہ کا معنی یہ ہے کہ کسی شخص نے کسی چیز کا دعویٰ کیا کہ یہ میری ہے۔ میری ملکیت ہے، لیکن کا سبب نہیں بتایا مثلاً کہا کہ یہ مکان میرا ہے اور یہ کہاں سے آیا؟ اس کا ذکر نہیں ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ تیرا نہیں، میرا ہے تو یہ قضیہ املاک مرسلہ کا ہوا کیونکہ کسی عقد اور فسخ کا ذکر نہیں بلکہ مطلق ملک کا ذکر ہے۔ اس کو املاک مرسلہ کہتے ہیں۔

یا کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ یہ گھر میرا ہے، مجھے میرے باپ کی طرف سے میراث میں ملا تھا تو اس میں بھی عقد اور فسخ کا دعویٰ کوئی نہیں کر رہا ہے بلکہ ملک مرسل کا دعویٰ کر رہا ہے۔

تو املاک مرسلہ میں حنفیہ بھی اسی مسلک کے قائل ہیں جس کے ائمہ ثلاثہ قائل ہیں یعنی قضاء قاضی صرف ظاہراً نافذ ہوگی، باطناً نہیں ہوگی۔

دوسری شرط یہ ہے کہ قاضی نے فیصلہ بینہ کی بنیاد پر کیا ہو، مدعی نے بینہ پیش کیا کہ میری اس فلاں کے ساتھ بیع ہوئی تھی یا فلاں کے ساتھ نکاح ہوا تھا اور قاضی نے اس بینہ کی بنیاد پر فیصلہ کیا تب وہ ظاہراً و باطناً دونوں طرح نافذ ہو جائے گا۔ لیکن اگر قاضی نے فیصلہ بینہ کی بنیاد پر نہیں بلکہ یمین کی بنیاد پر کیا تو پھر وہ فیصلہ صرف ظاہراً نافذ ہوگا باطناً نہیں ہوگا۔

---

[۱۷] فیض الباری ج :۳، ص :۳۳۵ و تکملة فتح الملهم ، ج :۲، ص : ۵۶۷ .

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ اس بات میں ایک واقعہ سے استدلال کرتے ہیں جو امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے کتاب الخراج میں ذکر کی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک مقدمہ پیش ہوا۔ مرد دعویٰ کر رہا تھا کہ یہ عورت میری منکوحہ ہے، میں نے اس سے نکاح کیا ہے۔ عورت کہتی ہے کہ مجھ سے نکاح نہیں ہوا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مرد سے کہا کہ تم گواہ پیش کرو کہ نکاح ہوا ہے۔ اس نے دو گواہ پیش کر دیئے۔ جب دو گواہ پیش کئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مرد کے حق میں فیصلہ کر دیا کہ یہ تیری منکوحہ ہے۔ جب فیصلہ ہو گیا تو اس عورت نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضرت! آپ نے فیصلہ تو کر دیا، اب مجھے اس کے ساتھ رہنا پڑے گا جبکہ میں خوب اچھی طرح جانتی ہوں کہ میرا اس کے ساتھ نکاح نہیں ہوا۔ اس واسطے آپ میرا اس کے ساتھ باقاعدہ نکاح کرا دیجئے تاکہ میری زندگی حرام میں نہ گزرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **"شاھداک زوجاک"** تیرے دو گواہوں نے تیرا نکاح کر دیا یعنی اب مجھے نیا نکاح کرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح سے انکار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ ظاہراً و باطناً نافذ ہو گیا۔ اب اس عورت کے لئے اس مرد کے ساتھ رہنا خود بخود حلال ہو گیا۔ اس کے لئے نیا عقد کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ فیصلہ بڑا حکیمانہ فیصلہ ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے قاضی بنایا **"رافع خصومات"** اس کا تقاضا یہ ہے کہ جب قاضی کی طرف سے کوئی فیصلہ ہو جائے، جھگڑا نمٹ جائے، اس کے بعد پھر کوئی اجمال، ابہام اور اشتباہ باقی نہ رہے۔ لہٰذا جہاں تک ممکن ہو قاضی کے فیصلے کو دنیا اور آخرت دونوں کے اعتبار سے فیصلہ کن قرار دینا چاہئے ورنہ ساری عمر جھگڑا باقی رہے گا۔ [۱۸]

مثلاً اگر ہم یہ کہیں کہ یہ نکاح ظاہراً تو ہوا لیکن باطناً نہیں ہوا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ استمتاع شوہر کے لئے ظاہراً تو حلال ہے باطناً حلال نہیں، لہٰذا عورت کے لئے ظاہراً تمکین واجب ہے باطناً واجب نہیں۔ اگر کوئی اولاد ہو گی تو وہ ظاہراً ثابت النسب ہے باطناً ثابت النسب نہیں۔

اور اگر وہ عورت یہ دیکھ کر کہ باطناً میرا نکاح نہیں ہوا، بھاگ کھڑی ہو تو ظاہراً اس کو پکڑ لیا جائے گا کہ

---

۱۸ والتفصیل فی تکملة فتح الملهم ، ج : ۲ ، ص : ۵۶۸ .

اس کے پاس جا، لیکن باطناً پکڑنا جائز نہ ہوگا اور اگر جا کر کسی دوسرے مرد سے نکاح کرلے تو ظاہراً وہ مستوجب حد ہوگی اور باطناً نہیں ہوگی اور اگر اس دوسرے مرد سے اولاد پیدا ہوگئی تو وہ ظاہراً غیر ثابت النسب ہوگی اور باطناً ثابت النسب ہوگی۔ اگر یہ موقف اختیار کیا جائے کہ ظاہراً نافذ ہے اور باطناً نہیں ہے تو جھگڑے کا یہ لامتناہی سلسلہ ہے۔ قاضی کا فیصلہ جھگڑا ختم کرنے کا ذریعہ بننے کے بجائے الٹا غیر متناہی جھگڑا کھڑا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔

تو امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ فرماتے ہیں کہ جب قاضی کو اللہ تعالیٰ نے رافع خصومت بنایا ہے تو جب تک ممکن ہو اس کے فیصلے کو انتہائی قرار دینا ہوگا اور جہاں بینہ کے ذریعے معاملہ طے ہو وہاں یہ ممکن ہے کہ جب شوہر نے بینہ پیش کر دیا اور قاضی نے فیصلہ کر دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے نکاح نہیں بھی تھا تو اب ہو گیا، کیونکہ قاضی کو ولایت بھی حاصل ہے۔ اب اس نکاح کو ظاہراً و باطناً معتبر ماننا ہوگا، اس سے جھگڑا ختم ہوگا۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول پر اعتراض

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے خلاف اس مسئلے میں بڑا زبردست ہنگامہ ہوا کہ دیکھو انہوں نے یہ کہہ دیا کہ اگر کوئی دھوکہ سے جھوٹا گواہ بنا کر نکاح کرلے تو وہ عورت اس کے لئے حلال ہوگئی۔

درحقیقت امام صاحب رحمہ اللہ نے یہ اس لئے فرمایا تاکہ آئندہ کے لئے خصومت بند ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ لوگوں کو لائسنس دے دیا جائے کہ دو دو گواہ پیش کر کے نکاح ثابت کر لیا کرو۔ اس لئے کہ جھوٹے گواہ پیش کرنے کا گناہ اس پر ہر حال میں ہوگا۔ جھوٹا دعویٰ کرنے اور جھوٹے گواہ پیش کرنے کے گناہ کے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ منکر نہیں ہیں۔

تو جھوٹے گواہ پیش کرنے کا گناہ ہے۔ جھوٹا دعویٰ کرنے کا گناہ ہے، ایک عورت کو اس کی مرضی کے خلاف گھر میں رکھنے کا گناہ ہے، پتہ نہیں کتنے گناہ ہیں اور حضرت شاہ صاحب ؒ **"العرف الشذی"** میں فرماتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ نہیں ہے کہ ایک مرتبہ یہ گناہ ہو کر ختم ہو گیا بلکہ وہ گناہ ساری عمر جاری رہے گا اگرچہ اس نکاح کو ظاہراً و باطناً نافذ کر دیا گیا، اس کی اولاد کو ثابت النسب کہیں گے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن چونکہ اس عورت کو نکاح میں لانے کے لئے اس نے حرام طریقہ استعمال کیا، لہٰذا یہ خبث ساری عمر باقی رہے گا تاوقتیکہ اس نکاح کو فسخ کر کے مشروع طریقہ سے نکاح نہ کرے۔ جیسے کوئی شخص جھوٹ بول کر، دھوکہ دے کر کسی سے بیع کرلے تو بیع ظاہراً بھی ہوگئی اور باطناً بھی لیکن چونکہ اس نے حرام طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس واسطے اس حرمت کا خبث جاری اور باقی رہے گا تاوقتیکہ اس بیع کو فسخ نہ کرے اور فسخ کر کے پھر دوبارہ از سر نو عقد نہ کرے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے واقعہ پر ایک شبہ اور اس کا جواب

سوال: کتاب الخراج میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے کہ اس عورت نے کہا کہ آپ میرا باقاعدہ نکاح کرا دیجئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انکار کیا اور یہ کہا کہ **"شاهداک زوجاک"**.

جواب: حضرت علی رضی اللہ عنہ نے انکار اس لئے کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ خود قاضی تھے۔ اگر وہ نکاح کرتے تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ انہوں نے پہلے جو فیصلہ کیا تھا اس کو کالعدم قرار دے رہے ہیں، فسخ کر رہے ہیں اور قاضی کے لئے کوئی بھی اپنا فیصلہ فسخ نہیں کرتا، لیکن اسی حدیث میں یہ ہے کہ بعد میں میاں بیوی نے کسی اور ذریعے سے عقد جدید کرلیا۔ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے **"کتاب الخراج"** میں یہ بات بھی ذکر فرمائی ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عقد جدید کے بغیر خبث ساری عمر برقرار رہے گا۔ [۱۹]

اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو کتب حدیث میں کیوں نہیں؟

یہاں اعتراض کیا جاتا ہے کہ امام ابو یوسف رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جو واقعہ نقل کیا ہے، وہ کتب حدیث میں کہیں نہیں ہے۔ حافظ رحمہ اللہ نے کہہ دیا کہ **" لا أصل لہ "** اس کی کوئی اصل ہی نہیں کیونکہ یہ کتب حدیث میں کہیں نہیں ملتا۔ [۲۰]

جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ امام ابو یوسفؒ نے نقل کیا ہے اور امام ابو یوسفؒ ان مجتہدین میں سے ہیں کہ حنفیہ کے مخالفین جو امام ابوحنیفہؒ اور امام محمدؒ پر طعن کرتے ہیں وہ بھی امام ابو یوسفؒ کو حدیث میں ثقہ کہتے ہیں۔

یہاں تک کہ امام ابن حبانؒ جنہوں نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں العیاذ باللہ بڑے غصے کا اظہار کیا لیکن ساتھ لکھا ہے کہ ان کے اصحاب میں ابو یوسفؒ ایسے ہیں جو حدیث کے اندر بھی قوی اور ثقہ ہیں۔

تو امام ابو یوسفؒ کو وہ بھی ثقہ اور قوی مانتے ہیں جو امام ابوحنیفہؒ پر طعن کرنے والے ہیں، لہٰذا ان کا اس حدیث کو اپنی کتاب الخراج میں لکھنا اور اس سے استدلال کرنا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ حدیث ان کے پاس صحیح سند سے پہنچی تھی، لہٰذا اس سے استدلال درست ہوگیا۔

حدیث باب کا جواب

حدیث باب جس سے ائمہ ثلاثہ نے استدلال کیا ہے اس کی مختلف توجیہات ہیں:

---

[۱۹] حاشیہ ابن عابدینؒ، ج: ۵، ص: ۴۰۶، دار الفکر، بیروت.

[۲۰] روایت حدیث میں امام ابو یوسفؒ کا مقام۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ قضیہ، عقود یا فسوخ کا نہیں تھا بلکہ یہ املاک مرسلہ کا قضیہ ہے۔اس واسطے یہ محل نزاع میں داخل ہی نہیں۔بعض روایتوں میں اس کی صراحت آئی ہے کہ یہ میراث کا جھگڑا تھا اور میراث عقود وفسوخ میں نہیں آتا بلکہ املاک مرسلہ میں آتا ہے، اس لئے حنفیہ کا مذہب سرے سے اس سے متعلق ہی نہیں ہے اور اگر بالفرض اس کو عقود وفسوخ سے متعلق بھی مان لیا جائے تب بھی حضور اکرم ﷺ نے جو یہ فرمایا کہ اس کے لئے حلال نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اس کو اسی طرح رکھے اور ہم ابھی عرض کر چکے ہیں کہ اس کا خبث مستمر رہے گا اس لئے اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کو ختم کر کے از سر نو عقد صحیح کرے۔تو اس وعید کو خبث پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے۔

سوال: نکاح میں ایجاب وقبول ضروری ہے۔اگر وہ عورت ایجاب وقبول نہ کرے تو دو گواہوں کی گواہی سے نکاح کیسے درست ہوگا؟ یعنی سوال کا منشاء یہ ہے کہ ہم نے کہا تھا کہ اگر پہلے نکاح نہیں بھی تھا تو اب گواہوں کے ذریعے نکاح ہو گیا۔سوال یہ ہے کہ نکاح جب ہی ہوگا جب عورت قبول کرے اور گواہ اس عورت کے قبول کی گواہی دے۔ جب عورت نے قبول ہی نہیں کیا تو محض گواہ سے نکاح کیسے ہوگا؟

جواب: یہ ہے کہ یہاں پر قاضی عورت کا قائم مقام ہو گیا ہے جیسا کہ ہم جو نکاح پڑھاتے ہیں اس میں قاضی عورت کا وکیل اور قائم مقام ہوتا ہے۔تو قاضی اپنی ولایت عامہ کے ذریعے عورت کا قائم مقام ہو گیا۔ مرد تو پہلے سے راضی ہے، قاضی عورت کی طرف سے راضی ہو گیا اور دو گواہ موجود ہیں۔اس طرح نکاح منعقد ہو گیا۔

(۱۸) باب قصاص المظلوم إذا وجد مال ظالمه

وقال ابن سيرين : يقاصه ، وقرأ : ﴿وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهِ﴾[۲۱]

۲۴۶۰ ـ حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب ، عن الزهري قال حدثني عروة إن عائشة رضي الله عنها قالت : جاء ت هند بنت عتبة بن ربيعة فقالت : يارسول الله إن أبا سفيان رجل مسيك فهل علي حرج أطعم من الذي له عيالنا؟ فقال :"لا حرج عليك أن تطعميهم بالمعروف" . [راجع: ۲۲۱۱][۲۲]

"باب قصاص المظلوم"

یہ باب ہے مظلوم کے مقاصہ کرنے کے بارے میں (قصاص یہاں مقاصہ کے معنی میں ہے) جب

---

[۲۱] [النحل:۱۲۶]

[۲۲] وفي صحيح مسلم ، كتاب الا قضية ، باب قضية هند ، رقم :۳۲۳۳ - ۳۲۳۵ ، وسنن النسائي ، كتاب آداب القضاة ، باب قضاء الحاكم على الغائب اذا عرفه ،رقم :۵۳۲۵ ، و سنن أبي داؤد ، كتاب البيوع ، باب في الرجل يأخذ حقه من تحت يده ، رقم :۳۰۶۵ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب التجارة ، باب ماللمرأة من مال زوجها ، رقم : ۲۲۸۴ ، ومسند احمد ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم : ۲۲۹۸۸ ، و سنن الدارمي ، كتاب النكاح ، باب في وجوب نفقة الرجل على أهله ، رقم : ۲۱۵۹ .

مظلوم کو ظالم کا کوئی مال مل جائے تو کیا اس کو قصاص یعنی مقاصہ کا حق ہے؟

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کچھ مال واجب ہے اور وہ نہیں دیتا تو نہ دینے کی وجہ سے وہ ظالم ہو گیا اور جس کا مال ہے یعنی دائن وہ مظلوم ہو گیا کیونکہ وہ اس کا مال نہیں دے رہا ہے۔

اب اگر فرض کریں کہ اگر اس مدیون کا کوئی مال کسی اور طریقہ سے دائن کے پاس آ جائے تو کیا دائن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مدیون کا جو مال ہاتھ آیا ہے اس سے اپنا قرضہ وصول کرے جیسے زید کا دین مثلاً دو ہزار روپے عمرو کے ذمہ واجب تھا اور عمرو ادا نہیں کر رہا تھا۔ بعد میں ایسا ہوا کہ خالد آیا اور اس نے آ کر زید سے کہا کہ مجھے عمرو کو دو ہزار روپے دینے ہیں۔ میں تمہیں یہ بطور امانت دیتا ہوں، لے جا کر عمرو کو دیدینا۔ اب زید کو یہ رقم بہ طور امانت ملی ہے تاکہ عمرو کو پہنچائے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا زید کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ رقم عمرو کو پہنچانے کے بجائے اپنا دین دو ہزار روپے وصول کرلے یا کسی اور طریقے سے وصول کرلے؟ مثلاً زید کو عمرو کا لقطہ مل گیا تو کیا اس سے اپنا دین وصول کرسکتا ہے؟

''مسئلة الظفر'' اور ظفر کی وجہ تسمیہ

اس مسئلہ کو فقہاء کرام ''**مسئلة الظفر**'' کہتے ہیں کہ ''**إن الدائن ظفر بمديونه**'' کہ دائن کو مدیون کا مال ہاتھ آ گیا، اس کا مال پانے میں کامیاب ہو گیا۔

''مسئلة الظفر'' میں اختلاف فقہاء

اس بارے میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے اور اس میں تین مذاہب ہیں:

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

ایک مذہب امام مالک رحمہ اللہ کا ہے وہ یہ فرماتے ہیں کہ دائن کو مال مظفور بہ، جو اس کے ہاتھ آیا ہے اس کے مطابق زید پر واجب ہے کہ وہ دو ہزار روپے لے جا کر عمرو کو دے کہ یہ فلاں نے مجھے امانت دی تھی، تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اور جب وہ لے لے تو کہے کہ لاؤ میرا دین فوراً اپنے دین کا مطالبہ کرے لیکن اسے خود مال رکھ لینے کا حق نہیں ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل

امام مالک رحمہ اللہ اپنے مسلک پر اس حدیث سے استدلال فرماتے ہیں جو ترمذی میں آئی ہے کہ

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا" **أدالامانة إلى من ائتمنک ولا تخن من خانک** " امانت اس کو دو جس نے تجھے امین بنایا اور جس نے تمہارے ساتھ خیانت کی، اس کے ساتھ خیانت نہ کرو۔ تو فرماتے ہیں اگر مدیون نے خیانت کی ہے، دین نہیں ادا کر رہا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے مال میں خیانت کر لے اور خود اپنا دین نہ دے۔[۲۳]

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

دوسرا مذہب شافعیہ کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ دائن کو مطلقاً حق حاصل ہے کہ اپنے دین کے بقدر اپنا حق وصول کر لے اور اس میں ان کے نزدیک یہ تفصیل بھی نہیں ہے کہ دین کس جنس کا تھا اور جو مال ہے وہ کس جنس کا ہے؟

فرض کریں دین دس ہزار روپے تھا اور اس کو دس ہزار روپے کی کتابیں مل گئیں تو وہ یہ کتابیں بیچ کر اپنا دین وصول کر سکتا ہے اور اگر دس ہزار روپے یا کوئی اور چیز مل جائے وہ تب بھی وصول کر سکتا ہے۔[۲۴]

یہی مسلک امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے۔ چنانچہ ترجمۃ الباب میں انہوں نے محمد بن سیرینؒ کا اثر نقل کیا ہے کہ "**وقال ابن سیرین یقاصه**" امام محمد بن سیرین نے فرمایا کہ یہ مقاصہ کرے گا یعنی جو مال ملا ہے اس سے اپنا حق وصول کرے گا۔

ابن سیرین کا استدلال

انہوں نے اس آیت سے استدلال کیا ہے: ﴿ **و ان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به** ﴾[۲۵] کہ اگر تمہیں سزا دینی ہو تو جتنی سزا تمہیں دی گئی تھی اس کے مثل دو۔ اس نے تمہارے دین پر ناحق قبضہ کر لیا تھا تو تمہیں بھی حق حاصل ہے کہ اپنے دین کے بقدر اس کے مال پر قبضہ کر لو۔ امام ابن سیرین کا مذہب بھی یہی ہے۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے ہندہ بنت عتبہ کے واقعہ والی حدیث روایت کی ہے۔ ہندہ بنت عتبہ ابوسفیان کی بیوی تھی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ھندہ بنت عتبہ بن ربیعہ آئی اور انہوں نے آکر عرض کیا یا رسول اللہ! "**ان ابا سفیان رجل مسیک**" کہ ابوسفیان بخیل آدمی ہے۔

---

۲۳ استدل الحنابلة و المالكية على منع الظافر من أخذ حقه لما وجده ، بما أخرجه الترمذي في البيوع ، باب ۳۸، رقم ۱۲۶۴ ، وسنن ابی داؤد فی البیوع ، باب فی الرجل یأخذ حقه من تحت یده ، رقم ۳۰۶۵ ، كما ذكره فی تكملة فتح الملهم ، ج: ۲ ، ص: ۵۷۹.

۲۴ تكملة فتح الملهم ، ج: ۲ ، ص: ۵۷۸.

۲۵ [سورة النحل : ۱۲۶]

"مسیک" کے معنی ہیں بہت زیادہ روک کر رکھنے والا یعنی بخیل۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اتنا مسیک ہے کہ وہ میرا حق بھی نہیں دیتے۔ بیوی اور اولاد کا جو نفقہ واجب ہے وہ بھی نہیں دیتے۔

"فهل علي حرج" تو میرے اوپر اس بارے میں کوئی حرج ہے کہ میں اپنے عیال کو اس کے مال سے کھلاؤں یعنی ان کا جو مال میرے پاس آتا جاتا رہتا ہے، کیا میں اس سے ان کو کھلا سکتی ہوں؟ **"فقال لا حرج"** فرمایا کہ تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں اگر تم ان کو عرف کے مطابق کھلا دو جتنا بچہ کو کھلانے کا عرف ہے ان کو اتنا کھلانے سے کوئی حرج نہیں۔

یہاں ایک طرح سے ہندہ بنت عتبہ کا ابوسفیان پر حق واجب تھا اور وہ نہیں دے رہے تھے۔ پھر ان کا مال ان کے قبضے میں تھا اور وہ نہیں دے رہے تھے آنحضرت ﷺ نے حق وصول کرنے کی اجازت دی۔

معلوم ہوا کہ دائن اپنا حق مال مظفور بہ سے وصول کر سکتا ہے اور امام شافعیؒ کا مسلک اور استدلال یہی ہے۔[۲۶]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

تیسرا مذہب امام ابوحنیفہؒ کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ مال مظفور بہ میں تھوڑی سی تفصیل ہے۔ اگر ظافر یعنی دائن کو جو مال ملا ہے مظفور بہ اگر وہ اس کے دین کی جنس سے ہے تب تو حق لے کے رکھے اور اگر وہ دین کی جنس سے نہیں ہے تو پھر رکھنے کا حق نہیں وہ واپس کرنا ہوگا۔ بعد میں اپنا دین وصول کرے۔

گویا اگر مال مظفور بہ دین کی جنس سے ہے تو حنفیہ کا بھی وہی مذہب ہے جو شافعیہ کا ہے اور اگر مال مظفور بہ دوسری جنس ہے تو حنفیہ کا وہی مذہب ہے جو مالکیہ کا ہے یعنی اگر جنس ایک ہو تو حنفیہ کا مذہب شافعیہ کے مذہب کی طرح ہے اور استدلال بھی وہی ہے کہ یہاں نفقہ کا جنس مل گیا، لہٰذا آنحضرت ﷺ نے اجازت دیدی لیکن اگر اس جنس سے نہیں ملا، دوسری جنس سے ملا تو دائن کو اپنا دین وصول کرنے کے لئے مال کو فروخت کرنا پڑے گا اور فروخت کر کے جو پیسے حاصل ہوں گے اس سے اپنا حق وصول کرنا ہوگا۔

میں نے جو مثال دی تھی کہ پیسے کے بجائے کتابیں مل گئیں تو اس کو کتابیں فروخت کرنی پڑیں گی اور فروخت کر کے اپنا دین وصول کرنا ہوگا۔

امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں دوسرے کی ملکیت کو اس کی اجازت کے بغیر بازار میں بیچنا لازم آئے گا اور دوسرے کی ملکیت کو اس کی اجازت کے بغیر بازار میں نہیں بیچا جا سکتا، لہٰذا یہ عمل جائز نہیں۔

متاخرین حنفیہ کا فتویٰ

امام ابوحنیفہؒ کا اصل مذہب یہ ہے لیکن متاخرین حنفیہ نے اس مسئلے میں امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے اور وجہ یہ بیان کی ہے کہ اب لوگوں میں بددیانتی پھیل گئی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کا حق دبا کر بیٹھ جاتے

[۲۶] تکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۸۰.

ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگوں کو اپنا حق وصول کرنا بہت مشکل ہوتا ہے، پہلے زمانے میں تو قاضی کی عدالت میں جا کر مقدمہ دائر کر دیا جاتا تھا اور پورا حق وصول ہو جاتا تھا، لیکن آج کل کی عدالت کے ذریعہ اپنا حق وصول کرنا لوگوں کے اوقات وحقوق ضائع ہونے کا اندیشہ یقینی ہے اس لئے اگر دائن کو یہ گنجائش نہ دی جائے تو لوگوں کے حقوق پامال ہوں گے اور شافعیہ کے مذہب پر لوگوں کے حقوق کی ضمانت ہے۔ اس واسطے متاخرین حنفیہ نے امام شافعیؒ کے قول پر فتویٰ دیا ہے۔

علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ اب حنفیہ کا عمل وہی ہے جو امام شافعیؒ کا ہے۔ [۲۷]

۲۴۶۱ ۔ حدثنا عبداللہ بن یوسف :حدثنا اللیث قال: حدثني یزید ،عن أبي الخیر، عن عقبة بن عامر قال : قلنا للنبي ﷺ : إنک تبعثنا فننزل بقوم لایقروننا ، فما تری فیه ؟ فقال لنا : ((إن نزلتم بقوم فأمر لکم ینبغي للضیف فاقبلوا ، فإن لم یفعلوا فخذوا منهم حق الضیف)). [انظر: ۶۱۳۷] [۲۸]

حضرت عقبہ بن عامر ﷛ کی روایت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ ﷺ ہمیں کبھی جہاد وغیرہ کے لئے بھیجتے ہیں تو ہم ایسی قوم پر جا کر اترتے ہیں جو ہماری مہمانی نہیں کرتے۔ "**قری یقری**" کے معنی ہیں مہمانی کرنا یعنی لشکر جا کر اترتا ہے وہ لوگ کھانا وغیرہ کھلانے سے انکار کرتے ہیں۔ "**فما تری فیه؟**" تو آپ کی کیا رائے ہے؟ ہم کیا کریں؟ "**فقال لنا ان نزلتم .... منهم حق الضیف**

---

[۲۷] ولکن أفتی المتأخرون من الحنفیة بقول الشافعیة. یقول ابن عابدین فی کتاب الحجر من الرد المحتار، ۵:۱۰۵ : ((قال الحموی فی شرح الکنز ، نقلا عن العلامة المقدسی ، عن جده الأشقر، عن شرح القدوری للأخصب : إن عدم جواز الأخذ من خلاف الجنس کان فی زمانهم ، لا سیما فی دیارنا ، لمداومتهم العقوق)) .

وکذلک نقل ابن عابدین فی کتاب الحدود ۳: ۲۱۹ و ۲۲۰، عن القهستانی فی مذهب الشافعی : ((وهذا أوسع ، فیجوز الأخذ به ، وإن لم یکن مذهبنا ، فإن الإنسان یعذر فی العمل به عند الضرورة ، کما فی الزاهدی)) ثم نقل عبارة الحموی المذکورة . وإلیه یظهر میلان صاحب الدر المختار حیث قال فی الحظر والإباحة : ((لیس لذی الحق أن یأخذ غیر جنس حقه ، وجوزه الشافعی ، وهو الأوسع))، وعاد ابن عابدین رحمه الله تحته ۵ : ۳۰۰ ، فقال : ((أما الیوم ، فالفتوی علی الجواز)). (هذا ملخص مافی : تکملة فتح الملهم للشیخ القاضی محمد تقی العثمانی حفظه الله ، ۲: ۵۸۰ .

[۲۸] وفی صحیح مسلم ، کتاب اللقطة ، باب الضیافة ونحوها ، رقم : ۳۲۵۷ ، وسنن الترمذی ، کتاب السیر عن رسول الله ، باب مایحل من اموال اهل الذمة ، رقم : ۱۵۱۵ ، وسنن أبی داؤد ، کتاب الأطعمة ، باب ماجاء فی الضیافة ، رقم : ۳۲۶۰ ، وسنن ابن ماجة ، کتاب الأدب ، باب حق الضیافة ، رقم : ۳۶۶۶ ، ومسند أحمد ، مسند الشامیین ، باب حدیث عقبة بن عامر الجهنی عن النبی ﷺ ، رقم : ۱۶۷۰۶ .

فخذوا" ان سے مہمان کا حق لے لو یعنی زبردستی بھی لے سکتے ہو۔

حق الضیف کا حکم

اس حدیث کی بناپر بعض حضرات کا مذہب یہ ہے کہ اگر کسی کے گھر مہمان آجائے تو اس مہمان کو کھانا کھلانا گھر والے کے ذمہ شرعاً واجب ہے اور اس کی مدت کم از کم ایک دن اور ایک رات ہے۔

فقہاء کرام فرماتے ہیں یہ ان حقوق میں سے ہے جو انسان پر زکوٰۃ کے علاوہ واجب ہوتے ہیں جیسے حدیث میں ہے "**ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ**" مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں، ان میں سے ایک حق، حق الضیف بھی ہے کہ مہمان کو ایک دن اور ایک رات کھانا کھلانا اور اسے رکھنا واجب ہے۔ یہ لیث بن سعد کا مذہب ہے۔

دوسرے حضرات فقہاء فرماتے ہیں کہ ضیافت ایک امر مستحب ہے۔ حقوق واجبہ میں سے تو نہیں ہے لیکن مکارم اخلاق میں سے ہے کہ مہمان کو کھانا کھلایا جائے۔

جمہور کا یہی مذہب ہے، ائمہ اربعہ بھی اسی کے قائل ہیں اور فتویٰ بھی اسی پر ہے۔ [۲۹]

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ یہاں اس حدیث کو لیث بن سعد کے مذہب کی بنیاد پر لائے ہیں۔ لیث بن سعد حق الضیف کو واجب کہتے ہیں، شاید امام بخاریؒ بھی واجب کہتے ہوں۔

لیث بن سعد کے مذہب کے مطابق جب یہ حضرات صحابہ ؓ کسی بستی میں جا کر قیام کرتے تو ان بستی والوں پر حق الضیف واجب ہوتا تھا کہ ان کی ضیافت کریں، انہیں کھانا کھلائیں لیکن وہ کھانا کھلانے سے انکار کرتے تھے گویا کہ جو حق ان کے ذمے واجب تھا وہ اس کو ادا کرنے سے منکر تھے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "**خذوا منهم حق الضيف**" کہ ان سے "**حق الضیف**" جس طرح بھی ہاتھ آجائے لے لو۔

اس سے پتہ چلا کہ مسئلۃ الظفر میں امام شافعیؒ کا مذہب درست ہے۔ امام بخاریؒ نے امام شافعیؒ کے مذہب پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ اس سے بھی امام شافعیؒ کا مذہب ثابت ہوتا ہے کہ وہ لوگ کھانا دینے سے انکاری تھے۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو لینے کی اجازت دی۔

لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو شاید یہ استدلال نہیں بنتا، اس لئے کہ یہاں ایسا نہیں کہ ان کے ہاتھ کوئی مال آجائے اور پھر وہ اس سے لے لیں بلکہ یہاں جو بات دوسری روایات سے معلوم ہوتی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ زبردستی لینے کا ذکر ہے اور مسئلۃ الظفر میں زبردستی لے لینا کسی مذہب میں بھی جائز نہیں۔ نہ چوری کر کے لینا جائز ہے، نہ ڈاکہ مار کر لینا جائز ہے کہ پستول سر پر رکھ کر کہا جائے "دو! ورنہ گولی ماردوں گا"

---

[۲۹] راجع: تکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۶۲۹، ۶۳۰۔

پھر جائز کیا ہے؟

جائز یہ ہے کہ کسی جائز طریقہ سے اس کا مال خود بخود اس کے پاس آ گیا۔ پھر وہ اس سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے لیکن زبردستی کرنے اور اکراہ کا حق نہیں ہے اور حدیث باب میں اکراہ کا حکم دیا گیا ہے، لہٰذا اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ مسئلۃ الظفر کے باب سے متعلق نہیں ہے، لہٰذا اس سے پورا استدلال نہیں بنتا۔

جمہور کے مذہب پر اعتراض

حدیث باب میں آنحضرت ﷺ نے اجازت دی ہے کہ تم زبردستی لے لو۔

اب جو حضرات حق الضیف کو واجب نہیں کہتے یعنی جمہور، اس لئے کہ جمہور کہتے ہیں یہ مکارم اخلاق میں سے ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر لوگ کہیں جا کر اتر جائیں کہ۔

تو مان، نہ مان، میں تیرا مہمان

یہ کوئی شریعت کی بات تو نہ ہوئی کہ اگر تو میری مہمانی نہیں کرتا تو میں زبردستی لوں گا جب واجب نہیں ہے تو آپ ﷺ نے زبردستی لینے کی اجازت کیسے دی؟

اعتراض کا جواب

بعض حضرات نے اس کے جواب میں یہ فرمایا کہ درحقیقت یہ ان بستیوں کا ذکر کر رہے ہیں جن سے یہ معاہدہ تھا کہ جب کبھی مسلمانوں کا لشکر ان کے پاس سے گزرے گا یہ ان کی مدد کریں گے اور ان کی مہمانی کریں گے۔

لہٰذا اگرچہ اصلاً یہ حق واجب نہ ہو لیکن معاہدہ کی رو سے ان کے ذمہ واجب تھا کہ مسلمانوں کے لشکر کی مہمانی کریں چونکہ انہوں نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی اور انکار کیا اس واسطے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لے لو۔

میرے خیال میں اس توجیہ کی ضرورت نہیں ہے، اس واقعہ کی جو تفصیل امام ترمذیؒ نے جامع ترمذی میں روایت کی ہے، اس سے حقیقت حال واضح ہو جاتی ہے۔

وہ یہ ہے کہ اگرچہ ان سے معاہدہ نہیں تھا لیکن جب مسلمانوں کا لشکر آتا تو مسلمان یہ چاہتے تھے کہ اگر یہ لوگ ہماری مہمانی نہیں کرتے تو کم از کم ہمیں اپنا سامان خوراک بیچ دیں، پیسوں کے عوض ہمیں دیدیں۔

لیکن ہوتا یہ تھا کہ جب انہیں پتہ چلتا کہ مسلمانوں کا لشکر آرہا ہے تو یہ انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر اپنی دوکانوں کو تالا لگا کر بھاگ جاتے تھے تاکہ مسلمان آکر ان سے سامان نہ خرید سکیں۔

چنانچہ روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ نہ تو وہ ہماری مہمانی کرتے ہیں اور نہ ہمیں سامان فروخت کرتے ہیں۔

اب لشکر کو خوراک کی ضرورت ہے اور ان سے کوئی لڑائی بھی نہیں لیکن یہ صرف اس وجہ سے بیع سے انکار کر رہے ہیں تاکہ مسلمانوں کے لشکر کو نقصان پہنچائیں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ **"ان ابوا الا ان تاخذوا کرھا فخذوا"** اگر وہ انکار کریں سوائے اس کے کہ تم ان سے زبردستی لو، تو لے لو۔ زبردستی لینے کے معنی یہ ہیں کہ ان کو زبردستی بیع پر مجبور کرو اور پیسے دے کر اشیاء صرف لو۔ زبردستی مفت لینا مراد نہیں ہے بلکہ زبردستی یہ ہے کہ تم ہمیں اپنا سامان فروخت کرو تاکہ مسلمانوں کی ضروریات پوری ہوسکیں اور بیع میں اگرچہ اصل یہ ہے کہ وہ کرہاً نہیں ہوتی بلکہ تراضی سے ہوتی ہے:

" الاان تکون تجارۃ عن تراض منکم ".

چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿یا أیھا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل﴾ [۳۰]

ترجمہ: اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ الا یہ کہ وہ کوئی تجارت ہو جو تمہاری باہمی رضامندی سے ہوئی ہو۔

لیکن جہاں مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت داعی ہو خاص طور پر اگر مسلمانوں کے امیر کو دفاع کے لئے ضرورت ہے تو وہاں کسی شخص کو بیع پر مجبور کیا جاسکتا ہے کہ بیچو اور پیسے لو۔ وہاں چاہے تراضی نہ ہو، خوش دلی نہ ہو تب بھی ضرورت کے مطابق جائز ہے۔ [۳۱]

اجتماعی ضرورت کی وجہ سے کسی کو بیع پر مجبور کیا جاسکتا ہے؟

اسی حدیث سے فقہاء کرام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ جہاں مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت داعی ہو وہاں مالک کو اپنی ملکیت فروخت کرنے پر مجبور کیا جاسکتا ہے مثلاً کسی جگہ راستہ تنگ پڑ گیا، اب حکومت یہ چاہتی ہے کہ راستہ کو وسیع کرے یعنی اس کی توسیع کرے لیکن توسیع کرنے کے نتیجے میں بیچ میں کسی کا گھر آرہا ہے۔

اس صورت میں فقہا کرامؒ کہتے ہیں کہ معاوضہ دے کر وہ گھر لے سکتے ہیں اور اگر گھر والا انکار کردے کہ میں نہیں دیتا تو حکومت اس کو بیع پر مجبور کرسکتی ہے۔ شرط یہ ہے کہ معاوضہ انصاف کے ساتھ بازاری قیمت کے مطابق ادا کیا جائے اور فوراً ادا کیا جائے۔ یہ نہیں کہ من مانی قیمت مقرر کرلی جو بازاری قیمت سے بہت کم

---

۳۰ [النساء : ۲۹]

۳۱ سنن الترمذی ، کتاب السیر عن رسول اللہ ، باب ما یحل من أموال أهل الذمة ، رقم : ۱۵۱۵، وتکملة فتح الملهم ، ج : ۲ ، ص: ۶۳۰.

ہے، اس حدیث سے یہ بات نکلتی ہے۔

یہ جو قومی ملکیت میں لینے کا سوال پیدا ہوتا ہے تو جب ایسی شدید قسم کی ضرورت ہو تو معاوضہ دے کر لینے کی اجازت ہے۔

ایک بات اور سمجھ لیں کہ اس حدیث سے جو حکم نکل رہا ہے وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک واقعہ کے خلاف معلوم ہوتا ہے، جسے امام بیہقی رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔

وہ واقعہ یہ ہے کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں مسجد نبوی کی توسیع کا ارادہ فرمایا۔ اس توسیع میں بہت سے گھر آرہے تھے، حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو پیسے دیدے کر ان کے گھر مسجد کے لئے لے لئے۔ ان میں حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کا گھر بھی آرہا تھا جو حضور اکرم ﷺ کے چچا بھی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بھی نوٹس بھیج دیا کہ آپ اپنا گھر مسجد کے لئے بیچ کر پیسے لے لیجئے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں تو نہیں دیتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے لئے ضرورت ہے اور بحیثیت امیر المؤمنین مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں آپ کو کہوں کہ یہ گھر آپ مجھے مسجد کے لئے دیدیں اور پیسے لے لیں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا نہیں **"لا یحل مال امرئ مسلم الا بطیب نفس منه"**

اور آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ مجھے حق حاصل ہے۔ تو آپ کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی کی ملکیت پر دست درازی کریں اور اس کی ملکیت اپنے قبضے میں لے لیں، چاہے معاوضہ دے کر ہی کیوں نہ ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے حق حاصل ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کسی کو حکم بنا لو جو ہمارے درمیان فیصلہ کرے۔ انہوں نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو حکم بنالیا۔

اب یہ امیر المؤمنین ہیں لیکن ایک تیسرے شخص ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کو اپنا ثالث بنالیا، ان کے پاس جاکر مسئلہ پیش کیا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہیں اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ یہ کہتے ہیں۔

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے ان دونوں حضرات کی بات سنی اور سننے کے بعد کہا کہ عباس رضی اللہ عنہ ٹھیک کہتے ہیں اور اس کی دلیل میں انہوں نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ نے بیت المقدس کی تعمیر کا واقعہ سنایا تھا۔[۳۲]

بیت المقدس کی تعمیر کے واقعہ سے استدلال

بیت المقدس کی تعمیر کے موقع پر حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک لڑکے کی زمین زبردستی لے لی تھی، جس کے نتیجے میں حضرت سلیمان علیہ السلام پر عتاب ہوا۔ اس واسطے امیر المؤمنین! آپ کو یہ زمین لینے کا حق حاصل

[۳۲] سنن البیهقی الکبری، باب إتخاذ المسجد والسقایات وغیرها، ج:۶، ص:۱۶۸، رقم:۱۱۷۰۷، مکتبه دار الباز، مکة المکرمة.

نہیں ہے آپ پیسے دے کر بھی نہیں لے سکتے۔

حضرت فاروق اعظم ؓ ان کو حکم بنا چکے تھے، اس لئے فرمایا ٹھیک ہے، آپ نے فیصلہ کر دیا ہے تو میں نہیں لوں گا لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ مان لیا۔

حضرت عباس ؓ نے کہا دیکھو میری بات ٹھیک ثابت ہوگئی ہے یا نہیں؟ آپ کو حق ہے یا نہیں؟ انہوں نے کہا حق نہیں ہے، حضرت عباس ؓ نے کہا جب یہ بات ثابت ہوگئی ہے تو اب میں اپنا گھر بغیر کسی قیمت کے دیتا ہوں۔ میں نے یہ سارا جھگڑا اس لئے کھڑا کیا تھا تاکہ مسئلہ کی وضاحت ہو جائے ورنہ میں اپنا گھر مسجد نبوی کے لئے بے قیمت دینے کو تیار ہوں۔ امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں یہ واقعہ روایت کیا ہے۔[۴۳]

اس سے معلوم ہوا کہ حکومت کسی سے زبردستی زمین نہیں لے سکتی، چاہے معاوضہ دے کر ہو پھر بھی نہیں لے سکتی، مسجد نبوی جیسی عبادت گاہ کی تعمیر و توسیع کے لئے بھی نہیں لے سکتی جب اس کے لئے نہیں لے سکتی تو کسی اور کام کے لئے کیسے لے سکتی ہے؟

لہٰذا یہ واقعہ حدیث باب سے نکلنے والے مسئلہ کے خلاف و منافی ہے۔

مسجد حرام کی توسیع کے واقعہ سے استدلال

ایک واقعہ اور بھی ہے جو حضرت عثمان ؓ کے زمانے میں مسجد حرام کی توسیع کا واقعہ ہے۔

حضرت عثمان ؓ نے اپنے زمانے میں مسجد حرام کی توسیع کا ارادہ کیا۔ اس زمانے میں مسجد حرام ایسی تھی کہ بیچ میں کعبہ تھا، ارد گرد مسجد حرام کی تھوڑی سی جگہ تھی۔ مسجد حرام کی کوئی چار دیواری نہیں تھی بلکہ اس کی حد مختلف لوگوں کے مکانات تھے، لوگ اپنے مکانوں سے نیچے اتر کر حرم میں آتے اور طواف کر کے واپس اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ اس طرح چاروں طرف مکانات تھے، مشکل یہ تھی کہ کہاں سے توسیع کریں؟ کیونکہ چاروں طرف تو مکانات ہیں۔

لہٰذا حضرت عثمان ؓ نے اعلان کر دیا کہ مسجد حرام کی توسیع کی ضرورت ہے، اس لئے چاروں طرف کے مکانات ڈھائے جائیں گے اور جس جس کا گھر ہو وہ آکر اس کی قیمت لے جائے، کچھ لوگ تو اس پر راضی ہوگئے اور کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم تو آپ کو مکانات نہیں دیں گے۔

حضرت عثمان بن عفان ؓ نے ایک دن خطبہ دیا اور کہا کہ بعض لوگ مسجد حرام کی توسیع کے لئے مکانات دینے سے منکر ہیں۔

---

۴۳ سنن البیهقی الکبری، کتاب أحیا الموات، باب اتخاذ المسجد و السقایات و غیرها، ج: ۶، ص: ۱۶۸، رقم: ۱۱۷۱۱-۱۱۷۱۶.

یادرکھو! تم لوگوں نے میری نرمی سے بڑا ناجائز فائدہ اٹھایا ہے، اب میں سختی کروں گا، حجاج اور معتمرین کے لئے مسجد حرام کی توسیع کی ضرورت ہے، اس واسطے اب میں زبردستی تم لوگوں کے گھر ڈھاؤں گا اور جس کا گھر ڈھایا جا ئے گا اس کے گھر کی قیمت بیت اللہ کے دروازے پر رکھ دی جائے گی، اگر لینا چاہے تو وہاں آکر لے لے۔

لہٰذا گھر ڈھانے شروع کر دیئے اور قیمت بیت اللہ کے دروازے پر لے جا کر رکھنا شروع کر دی۔

لوگوں نے آکر کہا کہ حضرت! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ دوسروں کی املاک پر قبضہ کر رہے ہیں چاہے پیسے دے کر ہی سہی لیکن بہر حال یہ زبردستی ہے اور لوگوں کی مرضی کے بغیر ہے۔

حضرت عثمان ﷛ نے کہا کہ میں یہ اس لئے کر رہا ہوں کہ تم کعبہ کے پاس آکر اترے ہو، کعبہ تمہارے پاس آکر نہیں اترا۔ مطلب یہ ہے کہ اصل تو یہ جگہ کعبہ شریف کی ہے اور کعبہ کے زائرین کی ہے اور اصل بات یہ ہے کہ یہاں کسی کا ذاتی مکان ہونا ہی نہیں چاہئے تھا، اس واسطے تم نے جو مکانات بنائے ہیں مجھے ان کے لینے کا حق حاصل ہے اور انہوں نے صحابہ ﷛ کرام کی موجودگی میں یہ کام کیا، کسی صحابی ﷛ نے بھی اس پر اعتراض نہیں کیا، یہ دوسرا واقعہ ہے۔[۳۴]

واقعات میں تعارض

وہاں مسجد نبوی کی تعمیر میں ابی بن کعب ﷛ نے فیصلہ کیا اور اس پر حضرت عمر ﷛ بھی راضی ہو گئے اور یہاں حضرت عثمان ﷛ نے اس کے برعکس کیا تو یہ اس کے مخالف ہیں؟

حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کے واقعات میں تطبیق

حقیقت حال یوں ہے کہ اصل دین کا مسئلہ یہی ہے کہ کسی بھی شخص کی ملکیت اس کی مرضی کے بغیر لینا جائز نہیں، نہ معاوضۃً اور نہ بلا معاوضہ جیسا کہ ابی بن کعب ﷛ نے فیصلہ کیا تھا چونکہ بیع کے اندر قرآن کی نص کے مطابق تراضی بھی ضروری ہے، تراضی کے فقدان کی صورت میں بیع درست نہیں ہوتی، اصل مسئلہ یہی ہے، لیکن ضرورت کے تحت حکومت اسلامیہ کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ مفاد عامہ کی خاطر زبردستی بھی لے سکتی ہے۔

آج مفاد عامہ کی اصطلاح بہت استعمال ہوتی ہے لیکن شریعت میں یہ معتبر نہیں ہے بلکہ جہاں حاجت شدیدہ ہو عام مسلمانوں کو بہت زیادہ تنگی ہو اور اس تنگی کو دور کرنے کے لئے ایسا کیا جا رہا ہو تو پھر جائز ہے۔ حاجت شدیدہ متحقق ہے یا نہیں؟ اس میں دو رائے ہو سکتی ہیں۔

مسجد نبوی کے واقعہ میں حضرت ابی بن کعب ﷛ نے جو فیصلہ فرمایا اس کا حاصل یہ تھا کہ وہ حاجت

---

۳۴ سنن البیہقی الکبری، کتاب احیا الموات، باب اتخاذ المسجد والسقایات وغیرھا، ج:۶، ص:۱۶۸، رقم: ۱۱۷۱۶، مکتبہ دار الباز مکۃ المکرمۃ.

شدیدہ جس کی بنا پر دوسرے کی جائیداد لینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ وہ یہاں پر متحقق نہیں، لہٰذا انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ آپ کے لئے جائز نہیں ہے کہ آپ زبردستی لیں۔

حضرت عثمانؓ کے واقعہ میں حاجت شدیدہ متحقق تھی کہ حجاج کی آمد و رفت کی کثرت ہوگئی تھی اور دوسرا یہ کہ انہوں نے فرمایا کہ کعبہ تمہارے پاس آ کر نہیں اترا، تم کعبہ کے پاس اترے ہو۔ اصل تو یہ ساری جگہ کعبہ کے لئے وقف ہونی چاہئے تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے **"کتاب الحج"** میں اس پر باب قائم کیا ہے کہ مکہ مکرمہ میں کوئی گھر یا زمین کسی کی ملکیت ہو سکتی ہے یا نہیں؟

بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ مکہ مکرمہ میں کوئی شخص کسی گھر کا مالک نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ جگہ مباح عام ہے، یہ حجاج، زائرین اور معتمرین کے لئے ہے۔

جب لوگوں نے آ کر گھر بنا لئے، تو جگہ تنگ ہوگئی، لہٰذا وہاں حاجت شدیدہ متحقق تھی اس لئے حضرت عثمانؓ نے زبردستی کی۔

حدیث باب میں جو اجازت دی گئی ہے وہ حاجت شدیدہ کی بنا پر دی گئی ہے کہ جہاد کی حاجت ہے، دفاعی ضرورت ہے اس کے بغیر مسلمان جہاد نہیں کر سکتے۔ اس واسطے یہاں زبردستی بیع کرانے کی اجازت دی گئی۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ قومی ملکیت اور مفادِ عامّہ کے خاطر جس چیز کی ضرورت ہو اس میں حاجتِ شدیدہ کا ہونا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ حکومت ویسے ہی فیصلہ کرلے کہ ہمیں اس جگہ کی ضرورت ہے، یہ جائز نہیں بلکہ حاجتِ شدیدہ ہو، میں ضرورت کا لفظ استعمال نہیں کر رہا ہوں، بلکہ حاجت کا لفظ، کہ حاجت شدیدہ ہو جس کے بغیر عام مسلمانوں کو سخت تنگی پیش آئے جیسے راستہ تنگ ہو گیا ہو اور اس کو چوڑا کرنا ہو، مسجد تنگ ہوگئی ہو اس کو چوڑا کرنا ہو یا کوئی ڈیم بنانا ہو، تو پھر حکومت لے سکتی ہے کیونکہ اجتماعی حاجت ہے۔

لیکن اگر کوئی جگہ فلاں سرکاری افسر کو پسند آگئی ہے اور وہ وہاں پر اپنا محل تعمیر کرنا چاہتا ہے، اس کے لئے لے لی جائے اور اس کو مفاد عامہ کا نام دیدیا جائے تو یہ درست نہیں ہے۔ اگر لے تو رضامندی اور بازاری قیمت سے لے اور قیمت فوری طور پر ادا کرے چنانچہ اس صورت میں لینا جائز ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔[۳۵]

سوال: بعض علاقے جیسے افغانستان، مجاہدین جب تعاقب کے لئے جاتے ہیں تو راستہ میں مخالفین کی جو بستیاں خالی ہوتی ہیں ان کے گھروں میں خورد و نوش، اوڑھنے بچھونے اور دیگر ضروریات کا سامان پڑا ہوتا ہے۔ کیا مجاہدین اس کے مالک کی اجازت کے بغیر تمتع حاصل کر سکتے ہیں جبکہ یہ مال اکثر مسلمانوں کا ہوتا ہے؟

---

۳۵ حاشیہ ابن عابدین، مطلق فی الوقف إذا خرب ولم یکن عمارته، ج:۴، ص:۳۷۹، دار الفکر، بیروت.

جواب: یہ سامان لقطہ ہے، لہٰذا اس پر لقطہ کے احکام جاری ہوں گے، اگر چھوٹی موٹی چیزیں ہیں جن کے بارے میں خیال ہے کہ مالک تلاش نہیں کریں گے تو مجاہدین چونکہ عام طور سے ابن السبیل ہوتے ہیں اس لئے ان کے لئے استعمال کرنا جائز ہے لیکن اگر کوئی زیادہ قیمتی چیز ہو تو اس کو مالک تک پہنچا دینا ضروری ہے۔

سوال: بعض لوگ اس حدیث سے بجلی کے ناجائز استعمال کی دلیل پکڑتے ہیں، **"مسئلة الظفر"** کی بنیاد پر کہ حکومت ظالم ہے کیا یہ دلیل صحیح ہے؟

جواب: یہ دلیل صحیح نہیں، فرض کریں اگر یہ بھی ہو کہ حکومت نے ہمارا حق غصب کر رکھا ہے، تب بھی چوری جائز نہیں، **"مسئلة الظفر"** میں چوری داخل نہیں ہوتی، لہٰذا بجلی کی چوری جائز نہیں۔

ظالم کسے کہتے ہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے بارے جو میں روایت ذکر کی ہے تو کیا اس میں حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ پر ظالم ہونے کا اطلاق نہیں ہوگا؟ اگر ہوتا ہے تو پھر یہاں ظلم کے کیا معنی ہیں؟

جواب: ظلم بڑا عام لفظ ہے اس کے معنی ہیں **"وضع الشیءِ فی غیر محله"** یا کسی حقدار کو اس کا حق نہ دینا۔ بیوی کو اگر کوئی حق نہیں دے رہا ہے تو یہ واقعی ظلم ہے اس لئے اگر اس کو ظلم سے تعبیر کیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

(۱۹) باب ماجاء فی السقائف،

وجلس النبی ﷺ وأصحابه، فی سقیفة بنی ساعدة.

۲۴۶۲۔ حدثنا یحیی بن سلیمان قال: حدثنی ابن وهب قال حدثنی مالک ح. وأخبرنی یونس عن ابن شهاب قال: أخبرنی عبید الله بن عبدالله بن عتبة: أن ابن عباس أخبره عن عمر رضی اللہ عنہ قال: حین توفی الله نبیه ﷺ، إن الأنصار اجتمعوا فی سقیفة بنی ساعدة فقلت لأبی بکر: إنطلق بنا، فجئناهم فی سقیفة بنی ساعدة. [أنظر: ۳۴۴۵، ۳۹۲۸، ۴۰۲۱، ۶۸۲۹، ۶۸۳۰، ۷۳۲۳]

سقائف، سقیفہ کی جمع ہے، سقیفہ چھپر کو کہتے ہیں یعنی سائبان، عام طور سے اس زمانے میں اور دیہات وغیرہ میں اب بھی ہوتا ہے کہ کسی عام جگہ پر کوئی سائبان ڈال لیتے ہیں اور سائبان کے نیچے سب لوگ بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔ کوئی مشورہ کرنا ہو تو مشورہ کرتے ہیں، اس سائبان کو سقیفہ کہتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ باب قائم کرنے کا منشاء یہ ہے کہ ایسی عام جگہیں جو کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہیں، وہاں بیٹھنا اور بیٹھ کر باتیں کرنا جائز ہے اور یہ ظلم نہیں ہے۔[۳۶]

اس میں دلیل یہ پیش کی کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سقیفہ بنی ساعدہ میں تشریف فرما ہوئے۔

بنو ساعدہ، بنو خزرج کی ایک چھوٹی سی شاخ تھی اور یہ سقیفہ ان کا تھا۔ پندرہ بیس سال پہلے تک یہ جگہ واقع تھی وہاں بعض لوگوں نے ویسا ہی چھپر وہاں ڈال رکھا تھا۔ یہ وہی سقیفہ بنی ساعدہ ہے جہاں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بیعت بھی لی گئی، تو یہ ابھی تک موجود تھا اب مسجد نبوی کے اندر آ گیا ہے۔

سوال: حاجت عامہ کے لئے مسجد کو شہید کیا جا سکتا ہے مثلاً نہر کھودی جا رہی ہے اور راستہ میں مسجد ہے تو مسجد کو شہید کرنا کیسا ہے؟

جواب: حنفیہ کے مذہب میں یہ کسی بھی حالت میں جائز نہیں ہے جو جگہ ایک مرتبہ مسجد بن گئی ہے وہ قیامت تک مسجد ہی رہے گی۔ اگر نہر کھودی ہے تو اس کا راستہ بدل دو، اس کو موڑ کر لے جاؤ، البتہ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب میں ضرورت شدیدہ کی صورت میں گنجائش ہے۔

(۲۰) باب لا یمنع جار جاره أن یغرز خشبة فی جداره

۲۴۶۳ ـ حدثنا عبداللہ بن مسلمة، عن مالک، عن ابن شهاب عن الأعرج، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ أن رسول اللہ ﷺ قال: ((لا یمنع جار جاره أن یغرز خشبة فی جداره))، ثم یقول أبو هريرة: مالی أراكم عنها معرضین؟ و اللہ لأرمینها بها بین أكتافكم. [أنظر: ۵۶۲۷، ۵۶۲۸]

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو اپنی دیوار میں شہتیر رکھنے سے منع نہ کرے یعنی اگر تمہاری دیوار ہے اور پڑوسی یہ چاہتا ہے کہ اپنا شہتیر تمہاری دیوار پر رکھ دے تو اس کو منع نہ کرو۔

"**ثم یقول أبو هريرة**" جب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث سنائی تو دوسری روایت میں آتا ہے کہ جو لوگ سن رہے تھے انہوں نے اپنے سر جھکا لئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا "**مالی أراكم عنها معرضین؟**" کیا وجہ ہے کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں کہ تم شہتیر رکھنے کے عمل سے اعراض کر رہے ہو یعنی ایسا لگ رہا ہے کہ یہ سن کر تمہارے چہرے لٹک گئے ہیں کہ اب ہمیں ضرور اجازت دینی پڑے گی۔

"**و اللہ لأرمینها بها بین أكتافكم**" اللہ کی قسم! میں یہ خشبة کا حکم تمہارے درمیان پھینک

۳۶۔ فتح الباری، ج: ۵، ص: ۱۰۹۔

کر رہوں گا۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب مروان نے ان کو اپنی غیر موجودگی میں مدینہ منورہ کا گورنر بنا دیا تھا، یہ بے چارے صوفی اور ملاّ آدمی تھے۔ جب گورنر بن گئے تو سر پر لکڑیوں کا گٹھا رکھ کر بیچ بازار میں نکلا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہٹو، امیر المؤمنین آرہے ہیں، ہٹو، امیر المؤمنین آرہے ہیں۔ یہ اعلان کرتے جاتے تھے تاکہ سب دیکھیں، تو یہ حدیث اس زمانے میں سنا رہے کہ میں یہ حکم تمہارے کندھوں کے درمیان پھینک کر رہوں گا چاہے تمہیں ناگوار ہو کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ کوئی پڑوسی اپنے پڑوسی کو منع نہ کرے۔

اختلاف فقہاء

بعض حضرات نے کہا کہ یہ منع نہ کرنے کا حکم وجوبی ہے، لہٰذا اگر کوئی پڑوسی تمہاری دیوار پر اپنا شہتیر رکھنا چاہتا ہے تو تمہارے ذمہ واجب ہے کہ اس کو جگہ فراہم کرو اور منع نہ کرو۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ حکم استحبابی ہے، جمہور کا یہی قول ہے کیونکہ کوئی شخص بھی دوسرے کی ملکیت میں تصرف کرنے کا مجاز نہیں ہے۔

البتہ اگر کوئی آپ سے اجازت مانگے تو پھر حکم یہ ہے کہ اسے اجازت دیدیں آپ کے مکارم اخلاق کا بھی یہی تقاضہ ہے، اگر آپ اجازت دیدیں گے تو اس سے آپ کا کیا نقصان ہوگا؟ تو یہ ارشاد بطورِ مشورہ اور استحباب ہے، لیکن وجوب نہیں ہے، جمہور کا یہی قول ہے۔[۳۷]

سوال: بعض لوگ اپنی مارکیٹ بچانے کے لئے روڈ کے کنارے پر مسجد بناتے ہیں تاکہ دکانیں محفوظ رہیں، کیا اس کو ختم کیا جا سکتا ہے؟

جواب: اگر لوگوں نے مملوکہ غیر میں بغیر اجازت مسجد بنالی، ایک جگہ پر قبضہ کر کے ویسے ہی مسجد بنالی، تو شرعاً وہ مسجد نہیں ہے اس کو مسمار کیا جا سکتا ہے، کیونکہ مسجدیت ثابت ہی نہیں ہے، یہ گفتگو تو ہو رہی ہے جہاں مسجدیت ثابت ہو جائے۔

(۲۱) باب صب الخمر فی الطریق

۲۴۶۴ ۔ حدثنی محمد بن عبد الرحیم أبو یحیی: أخبرنا عفان: حدثنا حماد بن زید: حدثنا ثابت، عن أنس ﷺ: کنت ساقی القوم فی منزل أبی طلحة، وکان خمرهم

---

۳۷ فإن امتنع لم یجبر وهو قول الحنفیة وحملوا الأمر فی الحدیث علی الندب والنهی علی التنزیه جمعاً بینه و بین الاحادیث الدالة علی تحریم مال المسلم الا برضاه الخ (فتح الباری: ج۵، ص: ۱۱۰).

يومئذ الفضيخ ، فأمر رسول الله ﷺ منادیا ینادی: ألا ان الخمر قد حرمت، قال : فقال لی أبو طلحة : أخرج فأهر قها ، فخرجت فهرقتها فجرت فی سكك المدينة، فقال بعض القوم : قد قتل قوم وهی فی بطونهم ، فانزل الله: ﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوْا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا﴾ [۳۸] [أنظر: ۴۶۱۷، ۴۶۲۰، ۵۵۸۰، ۵۵۸۲، ۵۵۸۳، ۵۵۸۴، ۵۶۰۰، ۵۶۲۲، ۷۲۵۳] [۳۹]

حدیث باب کی تشریح

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ میں ابوطلحہ کے گھر میں قوم کا ساقی بنا ہوا تھا، لوگوں کو شراب پلا رہا تھا، **"وكان خمرهم يومئذ الفضيخ"** اور اس دن جو شراب پلائی جارہی تھی وہ کچی کھجور کی شراب تھی **"فضیخ"** کچی کھجور کی شراب کو کہتے ہیں۔

"فأمر رسول الله ﷺ منادیا ینادی: ألا ان الخمر قد حرمت، قال: فقال لی أبوطلحة: أخرج فأهر قها" ابوطلحہ نے مجھ سے کہا کہ جاؤ اور اس کو فوراً باہر بہادو **"فخرجت فهرقتها فجرت فی سكك المدينة"** وہ شراب مدینہ کی گلیوں میں بہتی رہی۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ **"صب الخمر فی الطريق"** یعنی راستے میں شراب کا بہا دینا جائز ہے حالانکہ راستہ مباح عام ہوتا ہے، اس سے عامتہ الناس کے حقوق متعلق ہوتے ہیں لیکن ضرورت کے وقت ایسا کرنا جائز ہے اور ظاہر یہ ہے کہ یہ شراب سڑکوں کے اوپر نہیں ، بلکہ کنارے کی نالیوں میں بہائی گئی ہوگی۔

البتہ یہ گنجائش اس وقت ہے جب لوگوں کو تکلیف نہ پہنچے، نیز اس وقت خاص طور پر اس لئے گوارا کیا گیا کہ یہ منظر دکھانا مقصود تھا کہ لوگ شراب سے اس طرح دستبردار ہو رہے ہیں لیکن اگر آج کوئی اس طرح سڑکوں پر بہادے تو یہ جائز نہیں ہے۔

---

۳۸ [المائدہ: ۹۳]

۳۹ وفی صحيح مسلم ، كتاب الأشربة ، باب تحريم الخمر وبيان انها تكون من عصير العنب ومن التمر والبسر والزبيب وغيرها مما يكسر ، رقم : ۳۶۶۲- ۳۶۶۵ ، وسنن النسائی، كتاب الأشربة ، باب ذكر الشراب الذی أهريق بتحريم الخمر ، رقم : ۵۴۴۷، وسنن أبی داؤد، كتاب الأشربة ، باب فی تحريم الخمر ، رقم :۳۱۸۸ ، ومسند احمد ، باقی مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالک ، رقم : ۱۲۴۰۴، ۱۲۸۹۷، وموطامالک ، كتاب الأشربة ، باب جامع تحريم الخمر ، رقم : ۱۳۳۵ ،وسنن الدارمی ، كتاب الأشربة ، باب فی تحريم الخمر كيف كان، رقم : ۱۹۹۷ .

(۲۲) باب أفنية الدور والجلوس فيها، والجلوس على الصعدات

"وقالت عائشة : فابتنى أبو بكر مسجدا بفناء داره يصلي فيه ويقرء القرآن فيتقصف عليه نساء المشركين وأبناء هم يعجبون منه والنبي ﷺ يومئذ بمكة".

۲۴۶۵ ــ حدثنا معاذ بن فضالة أبو عمر حفص بن ميسرة ، عن زيد بن أسلم ، عن عطاء بن يسار عن أبي سعيد الخدري رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ قال : ((إياكم والجلوس على الطرقات)) فقالوا : مالنابد ،" إنما هي مجالسنا نتحدث فيها ، قال : ((فإذا أتيتم إلى المجالس فأعطوا الطريق حقها)) قالوا : وماحق الطريق ؟ قال : ((غض البصر ، وكف الأذى، ورد السلام، وأمر بالمعروف ، ونهي عن المنكر)). [أنظر : ۶۲۲۹] [۴۰]

حدیث باب کی تشریح

" أفنية الدور" یعنی گھروں کے فنا، چبوترہ یا بیٹھنے کی جگہ، جو عام طور پر لوگ گھر کے باہر بنا لیتے ہیں جو ان کی اپنی ملکیت میں نہیں ہوتا، اس کو فنا کہتے ہیں۔ اور وہ گھر کی جز نہیں ہوتا، حقوقِ عامہ میں سے ہے لیکن اس میں بیٹھنا جائز ہے۔

"والجلوس على الصعدات" اور راستوں میں بیٹھنا "الصعدات، صعداء" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں راستہ، عموماً لوگ راستہ کے کنارے بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں اس کو "جلوس على الصعدات" کہہ رہے ہیں۔

"وقالت عائشة: فابتنى أبو بكر مسجدا بفناء داره"

یہ وہ واقعہ ہے جب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو ابن الدغنہ واپس لے کر آئے تو انہوں نے اپنے گھر کے فناء میں ایک مسجد بنالی تھی۔ "يصلي فيه ويقرء القرآن فيتقصف عليه نساء المشركين وأبناء هم ، يعجبون منه والنبي ﷺ يومئذ بمكة" .

حضور ﷺ مکہ میں داخل تھے اور آپ ﷺ نے فناءدار میں مسجد بنانے سے منع نہیں فرمایا۔

معلوم ہوا کہ گھر کے برابر والے حصہ سے اگر کوئی شخص کچھ حصہ اپنی حاجات کے لئے استعمال کرے تو

---

[۴۰] وفي صحيح مسلم ، كتاب اللباس والزينة ، باب النهي عن الجلوس في الطرقات واعطأ الطريق حقه ، رقم: ۳۹۶۰ ، وكتاب السلام ، باب من حق الجلوس على الطريق رد السلام ، رقم : ۴۰۲۰، ۴۰۲۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الأدب ، باب في الجلوس في الطرقات ، رقم : ۴۱۸۱، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي سعيد الخدري ، رقم : ۱۰۸۸۳، ۱۱۰۱۲، ۱۱۱۵۷.

جائز ہے۔ اس کا مدار عرف پر ہے، جس جگہ جیسا عرف ہو، بعض جگہ عرف ایسا ہوتا ہے کہ اس حصہ پر کوئی پھول، پھلواری لگادی تو یہ جائز ہے یا کچھ حصہ اپنے بیٹھنے کے لئے مخصوص کرلیا تو اگر عرف ہے تو جائز ہے، عرف نہیں ہے تو جائز نہیں ہے۔

"فإذا أتيتم الى المجالس" اول تو راستوں پر بیٹھنا پسندیدہ نہیں ہے **"اياكم والجلوس على الطرقات"** پہلے تو راستوں پر بیٹھنے سے منع فرمایا کہ اگر بیٹھنا ہی ہے تو پھر راستوں کا حق ادا کرو۔

صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا کہ حق کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ راستہ کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ **"غض بصر"** سے کام لو **"وكف الأذى"** اور دوسرے کو تکلیف سے بچاؤ۔

"ورد السلام، وأمر بالمعروف، ونهي عن المنكر" اگر ان حقوق کی رعایت کر سکتے ہو تو بیٹھو ورنہ نہیں۔

(۲۴) باب الآبار على الطرق إذا لم يتأذ بها

اگر راستے میں کنواں بنا ہوا اور لوگوں کو گزرنے میں کوئی تکلیف نہ ہو، تو جائز ہے۔

(۲۵) باب الغرفة والعلية المشرفة وغير المشرفة فى السطوح وغيرها

روشندان و بالاخانہ کی تفصیل

"غرفة" اصل میں بالاخانہ کے لئے وضع ہوا تھا یعنی چھت کے اوپر کوئی کمرہ بنالیا جائے، بعد میں اس کا اطلاق عام کمرہ پر ہونے لگا لیکن یہاں بالاخانہ ہی مراد ہے۔

"مشرفة" کے لفظی معنی ہیں جھانکنے والا اشرف یشرف اشرافا کے معنی جھانکنے کے ہوتے ہیں۔

"العلية المشرفة" کے معنی ہیں اُوپر کا وہ کمرہ جو کسی دوسرے کے گھر میں جھانکتا ہو یعنی جہاں کھڑے ہو کر دوسرے کے گھر کا منظر نظر آتا ہو۔

"وغير المشرفة" ہے یعنی وہ کمرہ جو دوسرے کے گھر میں جھانکتا نہ ہو یعنی جہاں سے دوسرے کا گھر نہ نظر آتا ہو۔

ترجمۃ الباب قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ غرفہ، بالاخانہ اور چھت وغیرہ پر ایسا کمرہ بنانا جس سے دوسرے کا گھر نظر آتا ہو یا نہ نظر آتا ہو یہ جائز ہے یا نہیں؟

اگر غیر مشرفہ ہے یعنی وہاں سے دوسرے کے گھر پر نظر نہیں پڑتی تب تو اس کے جواز میں کوئی اشکال ہی

نہیں، سب کے نزدیک جائز ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص ایسا کمرہ بناتا ہے جس سے کسی دوسرے کا نظر آتا ہو تو اس میں فقہاء کرامؒ کا اختلاف ہے کہ ایسا کمرہ بنانا جائز ہے یا نہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ اسی اختلاف کی طرف اشارہ کرنا چاہ رہے ہیں کہ بعض فقہاء اس کو جائز کہتے ہیں اور بعض ناجائز کہتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اس انداز میں بالاخانہ بنانا جس سے دوسرے کی خلوت میں خلل اندازی نہ ہو تو یہ جائز ہے لیکن اگر دوسروں کی خلوت میں خلل اندازی ہوتی ہے تو اس صورت میں اس کے لئے بنانا جائز نہیں ہے، البتہ اگر کوئی بنالے گا تو قاضی اس کو منہدم کرنے پر مجبور نہیں کرے گا، یہ کہے گا کہ تم نے یہ بنالیا ہے لیکن اب اس بات کا خیال رکھنا کہ یہاں سے دوسروں کی بے پردگی نہ ہو۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ سے اس باب میں دو قول مروی ہیں:

ایک قول ظاہر الروایۃ کا ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ملک میں تصرف کا حق حاصل ہے، اس واسطے اگر وہ بنانا چاہتا ہے تو اس کو روکا نہیں جائے گا، البتہ اگر وہ اس کو دوسروں کی بے پردگی میں استعمال کرنے کی کوشش کرے تو اس بے پردگی سے اس کو منع کیا جائے گا۔

بعض متاخرینؒ نے ظاہر الروایۃ کے خلاف فتویٰ دیا ہے کہ ہر انسان کو اپنی ملک میں اس وقت تک تصرف کا حق حاصل ہے۔ جب تک اس سے دوسرے کا حق پامال نہ ہو۔ اگر وہاں سے دوسرے آدمی کی بے پردگی ہو رہی ہے تو دوسرے کا حق پامال ہوگا، لہٰذا اس کو منع کیا جائے گا۔ اگر اس نے بنالیا ہے تو اس کو حق حاصل ہے کہ اس کو ڈھادے، منہدم کردے۔ حنفیہ کے دونوں قولوں میں بظاہر تضاد ہے، ظاہر الروایہ میں اور اس فتوی میں، لیکن علماء کرام نے فرمایا کہ دونوں قسم کے حکم مختلف حالات پر مبنی ہیں۔ اگر وہ شخص بالاخانہ یا روشندان اس طرف کھول رہا ہے، جہاں سے بے پردگی کا اندیشہ ہے لیکن یہ کھولنا خود اسکی اپنی ضرورت کے تحت ہے مثلاً اس کو رہائش کے لئے بالاخانہ کی ضرورت ہے، اس کے بغیر اس کا گزارا نہیں ہے، تب تو منع نہیں کیا جائے گا، صرف اس سے اتنا کہا جائے گا کہ ذرا خیال رکھنا کہ بے پردگی نہ ہو۔

لیکن اگر محض تفریحاً کھول رہا ہے، کوئی خاص ضرورت داعی نہیں ہے تو پھر متاخرین کے فتوی پر عمل کیا جائے گا کہ اس کو روکا جائے، یہ تفصیل ہے۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے چند حدیثیں اس بات کے جواز کے لئے پیش کی ہیں کہ غرفہ بنایا گیا اور آپ ﷺ نے اس کی اجازت دی۔

پہلی حدیث جو روایت کی وہ یہ ہے:

۲۴۶۷ ۔ حدثنی عبداللہ بن محمد : حدثنا ابن عیینة، عن الزهری ، عن عروة من أسامة بن زید رضی الله عنهما قال : أشرف النبی ﷺ علی أطم من آطام المدینة ، ثم قال : ((هل ترون ما أری ؟ إنی أری مواقع الفتن خلال بیوتکم کمواقع القطر)).[راجع :۱۸۷۸][۴۱]

حضرت اسامہ بن زید ﷺ کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کے قلعوں میں سے ایک قلعہ سے جھانکا اور پھر فرمایا" **هل ترون ما أری ؟**" کیا تم وہ دیکھتے ہو جو میں دیکھ رہا ہوں؟ میں "**مواقع الفتن**" دیکھ رہا ہوں۔

"**مواقع الفتن، ما أری**" سے بدل ہے کہ میں فتنوں کے گرنے کی جگہیں دیکھ رہا ہوں۔"**خلال بیوتکم**" تمہارے گھروں کے درمیان "**مواقع القطر**" فتنے اس طرح گریں گے جیسے بارش کے قطرے گرتے ہیں یعنی تمہارے گھروں میں فتنے بارش کے قطروں کی طرح گریں گے، "**فتنه حره**" وغیرہ کی طرف ارشاد تھا۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو یہ بتانے کے لئے لائے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ قلعے پر چڑھے اور وہاں سے مدینہ منورہ کے گھروں کی طرف دیکھ کر آپ ﷺ نے بات ارشاد فرمائی۔

جب عارضی طور پر ایک قلعہ پر چڑھنا اور گھروں کو دیکھنا جائز ہوا اور آپ ﷺ نے اس پر عمل فرمایا تو اسی پر یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسا کمرہ بنائے جس سے نیچے کی طرف دیکھا جا سکتا ہو تو یہ جائز ہوگا۔

دوسری حدیث جو امام بخاری رحمہ اللہ نے روایت فرمائی ہے وہ حدیث تخییر ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث ہے۔

۲۴۶۸ ۔ حدثنا یحیی بن بکیر : حدثنا اللیث ، عن عقیل ، عن ابن شهاب ، قال : أخبرنی عبید الله بن عبدالله بن أبی ثور ، عن عبدالله بن عباس رضی الله عنهما قال : لم أزل حریصا علی أن أسأل عمر ﷺ عن المرأتین من أزواج النبی ﷺ التین قال الله لهما : ﴿إِنْ تَتُوْبَا إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾[۴۲] **فحججت معه فعدل وعدلت معه بالإداوة فتبرز حتی جاء فسکبت علی یدیه من الإداوة فتوضا فقلت : یا أمیر المؤمنین ، من**

---

[۴۱] وفی صحیح مسلم ، کتاب الفتن و أشراط الساعة ، باب نزول الفتن کمواقع القطر، رقم :۵۱۳۵ ، و مسند احمد ، مسند الأنصار ، باب حدیث اسامة بن زید حب رسول الله ﷺ ، رقم :۲۰۷۵۳، ۲۰۸۰۹.

[۴۲] [التحریم : ۴]

المرأتان من أزواج النبي ﷺ اللتان قال الله عز وجل لهما : ﴿ إِنْ تَتُوْبَا إِلَى اللهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ﴾؟ فقال : واعجبا لک يا ابن عباس ، عائشة وحفصة . ثم استقبل عمر الحديث يسوقه. فقال : إني كنت وجار لي من الأنصار في بني أمية بن زيد، و هي من عوالي المدينة ، وكنا نتناوب النزول على النبي ﷺ ، فينزل هو يوما. فإذا نزلت جئته من خبر ذلک اليوم من الأمر وغيره وإذا نزل فعل مثله ، وكنا معشر قريش نغلب النساء ، فلما قدمنا على الأنصار إذ هم قوم تغلبهم نساؤهم فطفق نساؤنا يأخذن من أدب نساء الأنصار ، فصحت على إمرأتي فراجعتني فأنكرت أن تراجعني فقالت : ولم تنكر أن أراجعک ؟ فوالله إن أزواج النبي ﷺ ليراجعنه ، وإن احداهن لتهجره اليوم حتى الليل ، فأفزعتني فقلت: خابت من فعلت منهن بعظيم ، ثم جمعت على ثيابي فدخلت على حفصة، فقلت : أي حفصة ، أتغاضب إحداكن رسول الله ﷺ اليوم حتى الليل ؟ فقالت : نعم ، فقالت : خابت وخسرت ، أفتأمن أن يغضب الله لغضب رسوله ﷺ فتهلكين ؟ لا تستكثري على رسول الله ﷺ ولا تراجعيه في شيء ولا تهجريه ، وسليني ما بدالک ولا يغرنک أن كانت جارتک هي أوضأ منک وأحب إلى رسول الله ﷺ ــ يريد عائشة ـ وكنا تحدثنا أن غسان تنعل النعال لغزونا فنزل صاحبي يوم نوبته فرجع عشاء فضرب بابي ضربا شديدا، وقال : أثم هو ففزعت فخرجت إليه وقال : حدث أمر عظيم ، قلت : ماهو؟ أجاءت غسان؟ قال : لابل أعظم منه وأطول ، طلق رسول الله ﷺ نساءه .قال : قد خابت حفصة وخسرت ، كنت أظن أن هذا يوشک أن يكون فجمعت على ثيابي فصليت صلاة الفجر مع النبي ﷺ فدخل مشربة له فاعتزل فيها ، فدخلت على حفصة ، فإذا هي تبكي ، قلت : مايبكيک ؟ أولم أكن حذرتک ؟ أطلقكن رسول الله ﷺ ؟ قالت :لا أدري ، هو ذا في المشربة . فخرجت فجئت المنبر فإذا حوله رهط يبكي بعضهم فجلست معهم قليلا ، ثم غلبني ما أجد فجئت المشربة التي هو فيها فقلت لغلام أسود : استأذن لعمر. فدخل فكلم النبي ﷺ ثم خرج فقال : ذكرتک له فصمت .فانصرفت حتى جلست مع الرهط الذين عند المنبر . ثم غلبني ما أجد، فجئت فقلت للغلام ـ فذكر مثله ـ فجلست مع الرهط الذين عند المنبر. ثم غلبني ماأجد، فجئت الغلام فقلت : استأذن لعمر ـ فذكر مثله ــ فلماوليت منصرفا فإذا الغلام يدعوني قال : أذن لک رسول الله ﷺ ، فدخلت عليه ، فإذا هو مضطجع على رمال حصير ليس بينه وبينه فراش ، قد أثر الرمال بجنبه.

متكئ على وسادة من أدم حشوها ليف فسلمت عليه ، ثم قلت وأنا قائم : طلقت نسائك ؟ فرفع بصره إلي ، فقال : لا ، ثم قلت وأنا قائم أستأنس : يا رسول الله ، لو رأيتني وكنا معشر قريش نغلب النساء ، فلما قدمنا على قوم تغلبهم نساؤهم ... فذكره فتبسم النبي ﷺ . ثم قلت : لو رأيتني ودخلت على حفصة فقلت : لا يغرنك أن كانت جارتك هي أوضأ منك وأحب إلى النبي ﷺ ۔ يريد عائشة ۔ فتبسم أخرى . فجلست حين رأيته تبسم ثم رفعت بصري في بيته فوالله ما رأيت فيه شيئاً يرد البصر غير أهبة ثلاث ، فقلت : أدع الله فليوسع على أمتك ، فإن فارس والروم وسع عليهم وأعطوا الدنيا وهم لا يعبدون الله . وكان متكئا فقال : ((أو في شك أنت يا ابن الخطاب ؟ أولئك قوم عجلت لهم طيباتهم في الحياة الدنيا)) . فقلت : يا رسول الله ، استغفر لي ، فاعتزل النبي ﷺ من أجل ذلك الحديث حين أفشته حفصة إلى عائشة وكان قد قال : ((ما أنا بداخل عليهن شهرا)) من شدة موجدته عليهن حين عاتبه الله ، فلما مضت تسع وعشرون دخل على عائشة فبدأ بها فقالت له عائشة : إنك أقسمت أن لا تدخل علينا شهرا وإنا أصبحنا بتسع وعشرون ليلة أعدها عدا . فقال النبي ﷺ : ((الشهر تسع و عشرون)) ، وكان ذلك الشهر تسع وعشرون . قالت عائشة : فأنزلت آية التخيير فبدأ بي أول إمرأة فقال : ((اني ذاكر لك أمرا ولا عليك أن لا تعجلي حتى تستأمري أبويك)) . قالت : قد أعلم أن أبوي لم يكونا يأمراني بفراقك . ثم قال : ((إن الله قال : ﴿يَـٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ﴾ إلى قوله : ﴿عَظِيمًا﴾ [الأحزاب : ۲۸ ۔ ۲۹ قلت : أفي هذا أستأمر أبوي ؟ فإني أريد الله و رسوله و الدار الآخرة . ثم خير نساءه فقلن مثل ما قالت عائشة . [راجع : ۸۹] [۴۳]

تشریح

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں اس بات پر بہت حریص رہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ان دو عورتوں کے بارے میں پوچھوں جو نبی کریم ﷺ کی ازواج میں سے تھیں اور ان کا قصہ کیا تھا جن کے

---

[۴۳] وصحیح مسلم ، كتاب الطلاق ، باب في الايلاء واعتزال النساء وتخييرهن وقوله تعالى وان تظاهرا عليه ، رقم : ۲۷۰۴ – ۲۷۰۷ ، و سنن الترمذی ، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله ، باب ومن سورة النجم ، رقم : ۳۲۴۰ ، وسنن النسائي ، كتاب الصيام ، باب كم الشهر وذكر الاختلاف على الزهري في الخبر عن عائشة ، رقم : ۲۱۰۳ ، و مسند احمد ، مسند العشرة المبشرين بالجنة ، باب اول مسند عمر بن الخطاب ، رقم : ۲۱۷ .

بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ﴿إِنْ تَتُوْبَا إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ کہ اگر تم اللہ جل جلالہ کی طرف توبہ کرلو تو اچھا ہے کیونکہ تمہارے دل ٹیڑھے ہو چکے ہیں اور بعض مفسرین نے اس کی یہ تفسیر کی ہے کہ تمہارے دل توبہ کی طرف مائل ہو ہی چکے ہیں، یہ تفسیر ازواج مطہرات کے مجموعی مزاج سے قریب تر ہے۔

"فحججت معه" ایک دفعہ حج کے دوران، میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھا **"فعدل وعدلت معه بالإداوة"** کسی موقع پر وہ راستہ سے ہٹے، میں بھی ایک چھوٹا سا لوٹا لے کر راستے سے ہٹ گیا۔

"فتبرز" حضرت عمر رضی اللہ عنہ براز کے لئے جنگل میں تشریف لے گئے۔ پھر وہ واپس تشریف لائے تو **"فسكبت على يديه من الاداوة"** میں نے اس برتن سے ان کے ہاتھوں پر پانی ڈالا **"فتوضا"** انہوں نے وضو فرمایا تو میں نے کہا **"يا امير المؤمنين من الم اتان من أزواج النبي ﷺ اللتان قال الله عزوجل لهما إِنْ تَتُوْبَا إِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا فقال: وأعجبالك يا ابن عباس عائشة وحفصة"** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تعجب ہے تمہیں ابھی تک پتہ نہیں ہے، جن کے بارے میں یہ فرمایا گیا وہ عائشہ اور حفصہ تھیں۔

"ثم استقبل عمر الحديث يسوقه" پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے واقعہ سنانا شروع کیا۔

"جارلي من الأنصار في بني أمية .... النزول على النبي ﷺ" فرماتے ہیں کہ:

میں بنی امیہ بن زید کے محلے میں اپنے ایک انصاری پڑوسی کے ساتھ مدینہ کے عوالی میں تھا یعنی ان کے انصاری ساتھی اور یہ دونوں عوالی مدینہ کے ایک محلے میں مقیم تھے جو بنو امیہ بن زید سے تعلق رکھتا تھا۔

چونکہ ہم مدینہ سے دور تھے اس لئے ہم نبی کریم ﷺ کے پاس روزانہ دونوں اپنی مصروفیات کی وجہ سے نہیں جا سکتے تھے، لہٰذا ہم باریاں مقرر کرتے تھے تو ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ایک دن تم جاؤ گے اور ایک دن میں جاؤں۔ **"فينزل هو يوما وانزل يوما"** ایک دن وہ جائے اور ایک دن میں جاتا۔

"فإذانزلت جئته من خبر ذلك اليوم من الامر" وغیرہ۔ جس دن میں جاتا تو اس دن کی خبر لے کر آتا۔ نبی کریم ﷺ نے کوئی بات ارشاد فرمائی ہو یا کوئی خاص واقعہ پیش آیا ہو تو اس کی خبر اپنے انصاری صاحب کو پہنچاتا کہ آج نبی کریم ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی ہے **"وإذا انزل فعل مثله"** اور جب وہ جاتے تو وہ بھی ایسا ہی کرتے کہ آکر اس دن کے واقعات مجھے سناتے۔

آگے فرماتے ہیں **"وكنا معشر قريش نغلب النساء"** کہ ہم قریش لوگ اپنی عورتوں پر حاوی اور غالب تھے یعنی یہ بالا دست تھے اور عورتیں زیر دست تھیں۔

"فلما قدمنا على الأنصار" جب ہم مدینہ منورہ میں انصاری صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس آئے۔ **"اذا هم قوم تغلبهم نساء هم"** تو ہم نے دیکھا کہ ان کی عورتیں ان پر غالب آئی ہوئی ہیں یعنی عورتیں اپنے شوہروں پر زیادہ حاوی ہیں۔

"فطفق نساؤ نا يأخذن من أدب نساء الأنصار" جب ہماری قریشی عوتوں نے یہ دیکھا کہ یہاں کی عورتیں بڑی غالب اور حاوی ہیں تو انہوں نے بھی انصار کا طریقہ اختیار کرنا شروع کر دیا۔

"فصحت على امرأتي" ایک مرتبہ میں اپنی بیوی پر چیخا یعنی کسی بات پر اس کو غصہ کیا **"فراجعتني"** اس نے مجھے جواب دیا قریش کے زمانے میں کبھی نوبت نہیں آئی تھی کہ وہ مجھے پلٹ کر جواب دے لیکن وہاں اس نے جواب دیا۔

"فأنكرت أن تراجعني" مجھے یہ بات بری لگی کہ اس طرح جواب دے رہی ہے **"فقالت ولم تنكر أن أراجعك فوالله أن أزواج النبي ﷺ ليراجعنه".**

انہوں نے کہا کہ آپ میرے اس جواب دینے کو کیوں برا سمجھ رہے ہیں جبکہ اللہ کی قسم بعض اوقات نبی کریم ﷺ کی ازواج بھی آپ کے سامنے جواب دے دیتی ہیں۔ **"و إن أحداهن لتهجره اليوم حتى الليل"** اور بعض اوقات کوئی زوجہ مطہرہ ایسا بھی کرتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کو چھوڑ دیتی ہیں یعنی بات چیت کرنا چھوڑ دیتی ہیں سارا دن اور رات تک، کسی بات پر ناراضگی ہوگئی تو شام تک حضور اکرم ﷺ سے بات بھی نہیں کرتی۔ وہاں تو یہ ہوتا ہے اور آپ میرے جواب دینے پر ناراض ہو رہے ہیں **"فأفزعتني"** اس واقعہ نے مجھے گھبرا دیا۔

"فقلت" میں نے دل میں کہا **"خابت من فعلت منهن بعظيم"** ازواج میں سے جو عورت ایسا کرتی ہو کہ سارا دن حضور اکرم ﷺ سے بات نہ کرے وہ تو بڑی ناکام ہوگئی۔ یعنی وہ ایک بہت ہی سخت قسم کی بات کی وجہ سے ناکام ہوگئی یہ میں نے اپنے دل میں سوچا۔ **"ثم جمعت على ثيابي"** پھر میں نے اپنے کپڑے جمع کئے **"فدخلت على حفصة"** اور اپنی صاحبزادی حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پہنچا اور جا کر کہا **"أي حفصة أتغاضب احداكن رسول الله ﷺ اليوم حتى الليلة ؟"** کیا تم میں سے کوئی حضور اکرم ﷺ سے رات بھر کے لئے ناراض ہوتی ہے؟ **"فقالت : نعم"** انہوں نے کہا ہاں! کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ **"فقلت : خابت و خسرت"** ناکام اور نامراد ہو جو ایسا کرے **"أفتأمن أن يغضب الله لغضب رسوله ﷺ فتهلكين؟"** کیا تم اور وہ عورت جو ایسا کرتی ہے اس بات سے بے خوف ہو کہ اللہ ﷻ کا غضب اس کے رسول ﷺ کی وجہ سے نازل ہو؟ کہ حضور ﷺ ناراض ہو جائیں اور ان کے ناراض ہونے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو جائے۔

"فتهلكين" تم اللہ کے غضب سے برباد ہو جاؤ **"لاتستكثري على رسول الله ﷺ"** یعنی حد سے زیادہ نہ بڑھو زیادہ باتیں مت کیا کرو حضور اکرم ﷺ کے مقابلہ میں۔

"و لا تراجعيه في شي و لا تهجرية".

اور حضور ﷺ کے سامنے کسی بھی معاملے میں جواب مت دینا **"ولا تھجریہ"** اور کبھی بھی بات چیت مت چھوڑنا **"وسلینی مابدلک"** اور تمہیں جو کچھ چاہئے وہ مجھ سے مانگ لیا کرنا تمہاری جو خواہش ہو مجھ سے کہہ دیا کرنا لیکن ایسی حرکت کبھی نہ کرنا کہ حضور اکرم ﷺ سے اس طرح ناراض ہو کر بیٹھ جاؤ۔

امام مسلم رحمہ اللہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے تو تمہیں طلاق دے دی تھی اس وقت میں نے تمہیں چھڑایا اور میری وجہ سے آپ ﷺ نے دوبارہ رجوع فرمالیا۔[۴۴]

طبقات بن سعد کی روایت میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضور اقدس ﷺ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دی تھی۔ بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سفارش کی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ آئندہ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی، آپ ان سے رجوع فرمالیں۔ جبرئیل علیہ السلام وحی لے کر آئے اور کہا کہ **"راجع حفصة"** حفصہ سے رجوع کرو **"فانھا صوامة قوامة"** کیونکہ وہ روزے بہت رکھتی ہیں اور نمازیں بہت پڑھتی ہیں اس واسطے حضور اکرم ﷺ نے دوبارہ رجوع فرمایا۔

یہاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے والا حوالہ دے کر فرمایا کہ اس طرح پہلے بھی تمہارے ساتھ ہو چکا ہے اور اگر آئندہ کبھی ہوا تو بہت غلط بات ہوگی۔

"ولا یغرنک إن کانت جارتک ھی أوضا منک وأحب إلی رسول اللہ ﷺ یرید عائشة رضی اللہ عنہا" اور تمہیں یہ بات دھوکہ میں نہ ڈالے کہ تمہاری پڑوسن (یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) تم سے زیادہ خوبصورت ہے اور رسول اللہ ﷺ کو تم سے زیادہ محبوب ہے یعنی کبھی ان کا (حضرت عائشہؓ) مقابلہ کرنے کی کوشش نہ کرنا یعنی یہ سوچ کر کہ حضور اقدس ﷺ ان سے زیادہ محبت کرتے ہیں تو تم بھی ویسے ہی مطالبات کرو تاکہ تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی معاملہ کیا جائے، تو اس قسم کے چکر میں مت پڑنا کیونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مقام اور ہے اور تمہارا مقام اور ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت حفصہؓ کو یہ نصیحت کر کے چلے آئے۔

"وکنا تحدثنا أن غسان تنعل النعال لغزونا" ہم آپس میں یہ باتیں کیا کرتے تھے کہ غسان کا بادشاہ (جو عرب کے اندر نصرانی بادشاہ تھا) وہ ہم سے جنگ کرنے کے لئے گھوڑوں کے نعل لگا رہا ہے یعنی جنگ کرنے کی تیاری کر رہا ہے، مدینہ منورہ میں یہ خبریں مشہور ہو رہی تھیں۔

"فنزل صاحبی یوم نوبته" میرا انصاری پڑوسی اپنی باری کے دن حضور اقدس ﷺ کے پاس گیا **"فرجع عشاء"** عشاء کے وقت واپس آیا۔ **"فضرب بابی ضربا شدیدا"** اور میرے دروازے پر زور سے دستک دی۔ **"وقال: أثم ھو؟"** جب زیادہ دیر تک جواب نہ ملا تو کہا کیا سو رہا ہے؟ **"ففزعت"** میں گھبرایا **"فخرجت إلیه"** میں نکلا **"وقال حدث أمر عظیم"** اس نے کہا کہ بڑا مسئلہ ہو گیا، بڑا

---

[۴۴] تکملة فتح الملھم، ج: ۱، ص: ۱۷۹-۱۸۰۔

زبردست واقعہ پیش آگیا **"قلت : ماهو ؟ أجاء ت غسان؟"** میں نے کہا، کیا قصہ ہوا؟ کیا غسان کے بادشاہ نے حملہ کردیا **"قال : لابل أعظم منه وأطول"** اس نے کہا نہیں، اس سے بھی زیادہ لمبا چوڑا واقعہ ہو گیا، اور اس سے زیادہ خطرناک معاملہ ہوگیا **"طلق رسول الله ﷺ نساء ه"** رسول اللہ ﷺ نے اپنی ازواج کو طلاق دے دی ہے۔ **"قال : قد خابت حفصة و خسرت"** میں نے اسی وقت دل میں کہا یا میری زبان سے نکلا کہ حفصہ تو ناکام، نامراد ہوگئی۔

"کنت أظن أن هذا يو شك أن يكون" مجھے اس بات کا خطرہ تھا کہ یہ واقعہ پیش آنے والا ہے یعنی عنقریب پیش آئے گا **"فجمعت علی ثیابی"** میں نے کپڑے بدلے **"فصلیت صلاة الفجر مع رسول الله ﷺ"** میں نے فجر کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھی۔

"فدخل مشر فة له" (یہ ترجمۃ الباب کی جگہ ہے) آپ ﷺ اپنے مشرفہ یعنی بالا خانہ میں داخل ہوگئے۔ **"فاعتزل فيها"** اور وہاں کنارہ کش ہو کر بیٹھ گئے۔ **"فدخلت على حفصة"** میں حفصہؓ کے پاس گیا، **"فاذاهي تبكي"** وہ رو رہی تھی۔ **"قلت ما يبكيک ؟"** میں نے کہا، کیا بات ہے؟ کیوں رو رہی ہو؟

"أولم أكن حذرتک" کیا میں نے تمہیں پہلے اس بات سے خبردار نہیں کیا تھا کہ تم خیال رکھنا، کہیں ایسا نہ ہو جائے۔

"أطلقكن رسول الله ﷺ ؟" کیا رسول اللہ ﷺ نے تم لوگوں کو طلاق دے دی ہے؟

"قالت: لا ادری هو ذافی المشربة" انہوں نے کہا کہ مجھے پتہ نہیں ہے لیکن آپ ﷺ اپنے مشرفہ میں تشریف فرما ہیں۔

"فخرجت فجئت المنبر، فاذاحوله رهط يبكی بعضهم" میں منبر کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بھی بعض لوگ بیٹھے رو رہے تھے **"فجلست معهم قليلا"** تھوڑی دیر وہاں میں ان کے ساتھ بیٹھا **"ثم غلبنی ما أجد"** پھر میرے دل میں جو احساسات پیدا ہو رہے تھے وہ مجھ پر غالب آئے کہ میں جا کر حضور ﷺ سے بات کروں۔

"فجئت المشر بة التی هو فيها" تو میں آپ کے بالا خانہ میں داخل ہوا۔ **"فقلت لغلام أسود"** آپ ﷺ کے ایک سیاہ فام غلام تھے، دوسری روایت میں ان کا نام حضرت رافع ؓ آیا ہے ان سے جا کر کہا **"استاذن لعمر"** جا کر عمر کے لئے اجازت لے لو کہ میں حضور اقدس ﷺ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔

"فكلم النبی ﷺ ثم خرج" وہ بات کر کے واپس آئے۔ **"فقال ذكرتک له فصمت"** کہ میں نے جا کر آپ کا ذکر کیا تھا کہ آپ آنا چاہتے ہیں تو آپ ﷺ خاموش رہے، کوئی جواب نہیں دیا، یہ نہیں کہا کہ بلالو، **"فانصرفت"** میں واپس چلا گیا **"حتى جلست مع الرهط الذين عند المنبر"** دوبارہ ان

ہی لوگوں کے ساتھ منبر کے پاس جا کر بیٹھ گیا **"ثم غلبني ما أجد"** پھر دل میں جو خیال پیدا ہو رہے تھے وہ غالب آئے۔ **"فجئت الغلام فقلت: استأذن لعمر"** میں نے غلام سے کہا کہ پھر جا کر اجازت لے لو کہ عمر آیا ہے۔ **"فذكر مثله"** غلام نے وہی بات دہرائی کہ حضور اقدس ﷺ سے آپ کا نام لے کر ذکر کیا تھا، آپ ﷺ خاموش رہے۔

"فذكر مثله" تین مرتبہ ایسا ہی ہوا، جب میں پیٹھ پھیر کر واپس جانے لگا، **"فاذا الغلام يدعوني"** تو اچانک دیکھا کہ مجھے غلام پکار رہا ہے **"قال: أذن لک رسول الله ﷺ"** شروع میں آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی، بعد میں اجازت دی۔

علماء کرام نے فرمایا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ شروع میں یہ سمجھے کہ یہ سفارش کرنے کے لئے آئے ہیں، اس لئے آپ ﷺ نے فوری طور پر بات چیت کرنا پسند نہیں فرمایا۔

اور جب دو تین مرتبہ انکار کر دیا گیا تو حضور اقدس ﷺ نے محسوس فرمایا کہ اب بلانے میں اس لئے مضائقہ نہیں کہ ان کو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ آ کر ایسی کوئی بات نہ کریں جو ازواج مطہرات کی حمایت کی ہوگی، اب جب یہ آئیں گے تو ایسی کوئی بات نہ کریں گے، اس واسطے آپ ﷺ نے تین مرتبہ کے بعد اجازت دی۔

"فدخلت عليه" میں حاضر ہوا۔ **"فاذا هو مضطجع على رمال حصير"** تو میں نے دیکھا کہ آپ ﷺ چٹائی کے بان پر تشریف فرما ہیں۔ رمال کے معنی ہیں بان۔

"ليس بينه و بينه فراش" آپ ﷺ کے اور بان کے درمیان کوئی بستر نہیں تھا۔ **"قد أثر الرمال بجنبه"** اور بانوں کے نشان آپ ﷺ کے پہلو پر نظر آ رہے تھے۔ **"متكئ على و سادة من أدم حشوها ليف"** آپ ﷺ نے چمڑے کے ایک تکیے کے ساتھ ٹیک لگائی ہوئی تھی جس کے اندر کھجور کی چھال بھری ہوئی تھی۔

"فسلمت عليه" میں نے آ کر سلام کیا **"ثم قلت و انا قائم"** پھر میں نے کھڑے کھڑے ہی عرض کیا **"طلقت نساءک؟ يارسول الله"** کیا آپ ﷺ نے ازواج مطہرات کو طلاق دے دی ہے؟ **"فرفع بصرا إلى فقال: لا"** آپ ﷺ نے میری طرف نگاہ اٹھائی اور کہا کہ نہیں! **"ثم قلت وأنا"** قائم میں نے پھر کھڑے کھڑے ہی حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ **"استأنس يارسول الله ﷺ"** کہ کیا میں آپ ﷺ کا دل بہلانے کے لئے کچھ انس یعنی دل بہلانے والی باتیں کروں؟ استیناس کے معنی ہیں دل بہلانا۔

"لورايتني و كنا معشر قريش نغلب النساء فلما قدمنا على قوم تغلبهم نساؤ هم" یارسول اللہ ﷺ ہم قریشی لوگ عورتوں پر غالب ہوا کرتے تھے اور جب یہاں آئے تو ایسی قوم کے پاس آئے جن کی عورتیں ان پر غالب ہیں۔ **"فذكره"** اور وہی بات ذکر کی کہ میری بیوی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہے۔

"فتبسم النبي ﷺ" آپ ﷺ نے تبسم فرمایا **"ثم قلت: لو رايتني و دخلت حفصة**

فقلت : لا یغرنک أن کانت جارتک هی أوضأ منک و أحب إلی النبی ﷺ یرید عائشة رضی اللہ عنها "۔

پھر میں نے کہا کاش! آپ اس واقعہ کو دیکھتے جب میں حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس گیا تھا اور اسے کہا تھا کہ تمہیں یہ بات دھوکے میں نہ ڈالے کہ تمہاری پڑوسن یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور ﷺ کو زیادہ محبوب ہے اور تم سے زیادہ خوب صورت ہے۔

یہ جملہ کہہ کر یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں ان کی حمایت کرنے نہیں آیا ہوں۔ **"فتبسم أخری"** آپ ﷺ نے دوبارہ تبسم فرمایا۔ **"فجلست حین رأیته تبسم"** جب میں نے آپ کو تبسم فرماتے ہوئے دیکھا تو میں بیٹھ گیا۔ **"ثم رفعت بصری فی بیته"** پھر میں نے آپ کے گھر کی طرف نگاہ اٹھائی۔

"فواللہ ما رأیت فیه شیئا یرد البصر غیر أهبة ثلاث" اللہ کی قسم میں نے اس گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جو نگاہ کو لوٹا سکے، یعنی جس پر نگاہ جا کر ٹھہر جائے کہ یہ چیز قابل ذکر ہے سوائے تین کھالوں کے کہ تین کھالیں پڑی ہوئی تھیں۔ باقی دنیا کی کوئی چیز نہیں پڑی ہوئی تھی۔

"اهاب" کی جمع **"اهبة"** ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ قیصر و کسری تو کتنے عیش و آرام میں ہیں اور تنعم کی زندگی گزار رہے ہیں اور یہ دونوں جہانوں کے سردار اس حالت میں ہیں کہ چارپائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور اس کے اثرات کے نشان، آپ ﷺ کے پہلو پر نظر آرہے ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ **"ادع اللہ فلیوسع علی أمتک"** اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی امت پر کشادگی کرے اور فقر و افلاس کا دور ختم ہو جائے۔ **"فانا فارس والروم وسع علیهم"** کہ فارس اور روم کے اوپر تو بڑی وسعت ہے اور وہ بڑے مالدار لوگ ہیں۔ **"واعطوا الدنیا"** ان کو دنیا دی گئی ہے **"وهم لا یعبدون اللہ"** جبکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ **"وکان متکئا"** آپ ﷺ اس وقت تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ **"فقال أوفی شک أنت یا ابن الخطاب"** اے خطاب کے بیٹے کیا تم ابھی شک میں ہو کہ ان کو نعمتیں ملی ہوئی ہیں اور ہم کو نہیں ملی ہوئی ہیں۔

"أولئک قوم عجلت لهم طیباتهم فی الحیاة الدنیا" وہ لوگ ہیں جن کی اچھی چیزیں اللہ نے ان کو دنیا ہی میں دے دی ہیں، اور ان کی طیبات ان کو دنیا میں ہی مل گئی ہیں اور آخرت میں ان کا کچھ حصہ نہیں ہے۔ یہ بڑا خطرناک جملہ ہے **"أولئک قوم عجلت لهم طیبات فی الحیاة الدنیا"** سے پناہ مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہماری طیبات کو حیاۃ دنیا میں جلدی نہ عطا فرمائے جو ہمیں آخرت میں محروم کردے۔ **"ربنا آتنا فی الدنیا حسنة و فی الآخرة حسنة"** اللہ تعالیٰ ہمیں اس پر رکھے۔

"فقلت يا رسول الله استغفرلي" میں نے کہا یا رسول اللہ ﷺ میرے لئے استغفار کریں کہ میرے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا کہ ان کے پاس دنیا ہے اور ہمارے پاس نہیں ہے۔

"فاعتزل النبي ﷺ من أجل ذلک الحديث حين أفشته حفصة إلى عائشة" آنحضرت ﷺ نے اپنی ازواج سے اس بات کی وجہ سے کنارہ کشی اختیار فرمائی جو حضرت حفصہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ظاہر کردی تھی۔

"وكان قد قال: ما أنا بداخل عليهن شهر أمن شدة موجدته عليهن" آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ایک مہینہ تک ان کے پاس نہیں جاؤں گا۔ یہ قسم کھالی تھی **"من شده موجدته عليهن"** ان پر ناراضگی کی شدت کی وجہ سے آپ ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمادی تھی۔ **"موجدة"** کے معنی ہیں ناراضگی **"حين عاتبه الله فلماء مضت تسع و عشرون"** جب انتیس دن گزر گئے، تو **"دخل على عائشة"** آپ ﷺ عائشہؓ کے پاس تشریف لائے اور سب سے پہلے انہی سے بات کرنے کا آغاز کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا کہ آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ آپ ایک مہینہ نہیں آئیں گے اور آج ہمیں انتیس دن ہوئے ہیں، میں تو ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی ہوں، اس لئے مجھے یاد ہے کہ ابھی تیس دن پورے نہیں ہوئے۔

"فقال النبي ﷺ الشهر تسع و عشرون" کہ یہ مہینہ انتیس دن کا ہے۔ **"وكان ذلک الشهر تسع و عشرون قالت عائشة فانزلت آية التخيير"** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پھر بعد میں آیت تخییر نازل ہوئی۔

﴿ يَـٰٓأَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَ زِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَ أُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحاً جَمِيْلاً ٥ وَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللهَ وَ رَسُوْلَهُ وَ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَإِنَّ اللهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ أَجْراً عَظِيْماً ٥ ﴾ [۴۵]

ترجمہ: اے نبی! کہہ دے اپنی عورتوں کو، اگر تم چاہتی ہو دنیا کی زندگانی اور یہاں کی رونق، تو آؤ کچھ فائدہ پہنچادوں تم کو اور رخصت کردوں بھلی طرح سے رخصت کرنا اور اگر تم چاہتی ہو اللہ کو اور اس کے رسول کو اور پچھلے گھر کو تو اللہ نے

---

[۴۵] [الاحزاب: ۲۸، ۲۹]

رکھ چھوڑا ہے ان کے لئے جو تم میں نیکی پر ہے بڑا ثواب۔

یہ آیتیں نازل ہوئیں تو حضور اقدس ﷺ سب سے پہلے میرے پاس تشریف لائے اور کہا کہ میں تم سے ایک بات کا ذکر کرنے والا ہوں۔ اگر تم جلدی جواب نہ دو تو تمہارے اوپر کوئی حرج نہیں ہے، یہاں تک کہ اپنے والدین سے مشورہ کرلو۔

حضور اکرم ﷺ کو پتہ تھا کہ میرے والدین مجھے کبھی بھی حضور اکرم ﷺ سے جدائی کا اختیار نہیں دیں گے۔ یہاں پر فرق کا لفظ ہے جبکہ صحیح نسخہ بفراقہ ہے۔

میں نے کہا، کیا میں اس معاملے میں والدین سے مشورہ کروں؟ یہ کوئی ایسی بات تو نہیں ہے جس میں والدین سے مشورہ کرنے کی ضرورت ہو۔ **"فانی أرید اللہ و رسولہ و الدار الآخرۃ"** میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ثم خیر نساء ہ" پھر آپ ﷺ نے اپنی اور ازواج کو بھی اختیار دیا۔ **"فقلن مثلہ ماقلت عائشۃ"** تو انہوں نے بھی وہی بات کہی جو حضرت عائشہ صدیقہؓ نے کہی تھی۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کیا، یہ آیت تخییر ہے۔

یہ ایلاء نہیں تھا

یہاں پہلی بات تو یہ سمجھ لیں کہ حضور ﷺ نے ایک مہینہ ازواج سے علیحدگی کی قسم کھائی تھی۔ یہ ایلا شرعی فقہی نہیں تھا اگرچہ بعض روایات میں اس کو ایلاء سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن جن روایتوں میں ایلاء کا لفظ آیا ہے وہاں ایلاء لغوی مراد ہے بمعنی قسم کے کیونکہ ایلاء فقہی اس وقت متحقق ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص کم از کم چار مہینے تک اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائے۔

اس نتیجے میں اگر چار مہینے تک رجوع کرلیا تو ٹھیک ہے ورنہ طلاق بائن واقع ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ ایلاء شرعی ایلاء حقیقی نہیں تھا بلکہ یہ آپ ﷺ نے محض قسم کھائی تھی کہ میں ایک مہینہ تک اپنی ازواج کے پاس نہیں جاؤں گا۔ [۴۶]

اعتزال اور آیت تخییر کا سبب نزول

دوسرا مسئلہ یہ کہ اس اعتزال اور بعد میں اللہ جل جلالہ کی طرف سے آیت تخییر کے نزول کا سبب کیا تھا۔ اس میں مختلف روایات ہیں۔

عام طور سے اس بارے میں تین روایتیں بیان کی جاتی ہیں:

ایک روایت تو وہ ہے جس میں شہد کھانے کا مشہور واقعہ ہے۔

---

۴۶ عمدۃ القاری، ج: ۹، ص: ۲۳۱.

شہد کا واقعہ

حضور اقدس ﷺ عصر کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے جاتے تھے۔ حضرت زینبؓ کے پاس کچھ شہد آیا ہوا تھا وہ آپ ﷺ کو دے دیتی تھیں۔ اس واسطے حضور اقدس ﷺ کو وہاں اپنی عام عادت سے کچھ زیادہ دیر لگ جاتی تھی۔

آپ ﷺ کا روزانہ کا معمول تھا کہ عصر کے بعد تمام ازواج مطہرات کے گھروں میں تشریف لے جاتے۔ اور ہر ایک کے پاس تھوڑی دیر ٹھہرتے تھے۔ حضرت زینبؓ کے پاس معمول سے کچھ زیادہ دیر ہو جاتی تھی، ازواج مطہرات میں سے ہر ایک اس انتظار میں ہوتی تھیں کہ ہمارے پاس آپ تشریف لائیں گے، ان کے لئے ایک ایک لمحہ اور ایک ایک پل گراں ہوتا تھا۔

اب پوچھنے کی ہمت نہ ہوتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی کنیز سے کہا کہ کل جب حضور اقدس ﷺ حضرت زینبؓ کے گھر جائیں تو ذرا چھپ کر دیکھنا کہ کیا بات ہو رہی ہے؟ مطلب یہ کہ کس وجہ سے دیر لگ رہی ہے۔ اس نے دیکھا اور آ کر حضرت عائشہؓ سے کہا کہ حضرت زینبؓ کے پاس کہیں سے شہد آیا ہوا ہے اور وہ حضور اقدس ﷺ کو شہد پلاتی ہیں۔

حضرت عائشہؓ نے کہا اچھا ہم انتظام کرلیں گی چنانچہ وہ حضرت سودہؓ کے پاس گئیں اور ان سے کہا کہ حضرت زینبؓ کے ہاں دیر اس وجہ سے لگتی ہے کہ وہ شہد پلاتی ہیں تم ایسا کرو کہ اب جب ان سے فارغ ہونے کے بعد آپ کے پاس آئیں تو آپ ان سے یہ ظاہر کریں کہ آپ کے منہ سے مغافیر کی بو آ رہی ہے۔

''مغافیر'' ایک گھاس ہوتی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ کو یہ بات بہت ناپسند تھی کہ آپ کے منہ سے کسی قسم کی بو آئے تو جب آپ حضور اقدس ﷺ دیکھیں گے کہ شہد کے نتیجے میں بو آ رہی ہے تو یہ قصہ ختم ہو جائے گا۔

حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ مجھے خود سے تو یہ کام کرنے کی جرأت نہ ہوتی لیکن عائشہؓ میرے اوپر حاوی تھیں کہ گویا ان کی بات رد کرنا مجھے گوارا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ کیا کہ جا کر حضرت ام سلمہؓ سے یہ بات کہہ دی کہ جب ان کے پاس جائیں تو وہ بھی یہ بات کہیں۔

حضرت سودہؓ فرماتی ہیں کہ اس کے بعد جب میرے گھر تشریف لائے تو مجھ پر حضرت عائشہؓ کا اتنا ڈر تھا کہ آپ ﷺ نے گھر میں قدم رکھا ہی تھا، ابھی میرے قریب تشریف بھی نہیں لائے تھے، دل چاہا کہ فوراً کہہ دوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ بھول جاؤں اور بعد میں حضرت عائشہؓ مجھ پر ناراض ہوں۔ لیکن ایک دم سے میں سنبھل گئی اور سنبھلنے کے بعد جب آپ ﷺ تشریف لائے تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا آپ نے مغافیر کھایا ہے؟

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تو ابھی زینب رضی اللہ عنہا کے پاس سے شہد کھا کر آ رہا ہوں اور شہد میں تو مغافیر کی بو نہیں ہوتی۔

اس پر میں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ شہد کی مکھی اس درخت پر بیٹھی ہو گی اور اس کا رس چوسا ہو گا جس کی وجہ سے اس میں بو پیدا ہو گئی۔ اس پر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اچھا میں آئندہ نہیں کھاؤں گا۔ اس کے بعد جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئے تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی یہی بات کہی۔ آپ ﷺ نے فرمایا! اچھا آئندہ میں یہ شہد نہیں کھاؤں گا۔ اللہ جل جلالہ نے یہ سارا واقعہ بذریعہ وحی نبی کریم ﷺ کو بتا دیا جو سورہ تحریم میں نازل ہوا ہے:

﴿يَاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ۚ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾[۴۷]

ترجمہ: اے نبی! تو کیوں حرام کرتا ہے جو حلال کیا اللہ نے تجھ پر، چاہتا ہے تو رضامندی اپنی عورتوں کی، اور اللہ بخشنے والا ہے مہربان۔

جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو اس سازش کا راز فاش ہو گیا۔ حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ اور حضرت زینبؓ کا معاملہ واضح ہو گیا۔

اس وجہ سے آنحضرت ﷺ کے دل میں رنج پیدا ہوا اور اس کے نتیجے میں آپ ﷺ نے کنارہ کشی اختیار فرمائی اور اسی نتیجے میں اختیار بھی دیا گیا۔ ایک واقعہ یہ ہے۔

دوسری روایت یہ ہے جو سند کے اعتبار سے پکی نہیں، لیکن بہر حال روایتیں ہیں کہ حضور ﷺ، حضرت ماریہ قبطیہؓ کے پاس تشریف لے گئے۔ اتفاق سے حضرت حفصہؓ نے دیکھ لیا۔ اس کے نتیجے میں حضرت ماریہ قبطیہؓ کی طرف سے ان کے دل میں کچھ گرانی آ گئی۔ انہوں نے نبی کریم ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے حضرت ماریہؓ کو اپنے اوپر حرام کر دیا کہ اب آئندہ میں ماریہؓ کے پاس نہیں جاؤں گا، پھر آپ نے ان سے اعتزال فرمایا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، اس کے نتیجے میں آیت تخییر نازل ہوئی۔

تیسری روایت یہ ہے کہ ایک مرتبہ تمام ازواج مل کر حضور ﷺ سے نفقہ میں زیادتی کا مطالبہ کیا اور یہ خیبر کی فتح کے بعد کا واقعہ ہے کیونکہ خیبر کی فتح سے پہلے جو کچھ تنگی ترشی کا عالم تھا، اس میں ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے نبی کریم ﷺ کا بھر پور ساتھ دیا اور پورا تعاون کیا۔ ہر قسم کے حالت کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔ لیکن خیبر کی فتوحات کے بعد الحمد للہ وسعت پیدا ہوئی تھی اس واسطے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ساری دنیا

[۴۷] [التحریم: ۱]

کے اوپر وسعت ہو رہی ہے، اس لئے ہم بھی حضور ﷺ سے نفقہ میں کچھ زیادتی کا مطالبہ کریں۔

سب نے مل کر جو مطالبہ کیا وہ اگرچہ کوئی گناہ نہیں تھا لیکن نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے شایان و شان نہ تھا، اس وجہ سے آنحضرت ﷺ نے یہ سوچ کر کہ یہ دنیا کی فکر میں پڑ گئی ہیں ان سے اعتزال اختیار فرمایا اور آخر میں آیت تخییر نازل ہوئی۔

یہ تین مختلف قسم روایات ہیں ان میں سے پہلی اور تیسری روایت قوی ہیں لیکن حضرت ماریہؓ والی سند میں اتنی مضبوط نہیں ہے۔[۴۸]

روایات میں تطبیق

علماء کرام نے ان روایات میں تطبیق دیتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ یہ سب واقعات تخییر کا سبب بنے۔

پہلے عسل کا واقعہ پیش آیا، پھر حضرت ماریہؓ کا واقعہ پیش آیا، پھر نفقہ کی زیادتی والا واقعہ پیش آیا۔ جب یہ تین چار چیزیں اکٹھی ہوگئیں اور ان سے نبی کریم ﷺ کی طبیعت پر گرانی ہوئی تو آپ ﷺ نے اس گرانی کا اظہار اعتزال کر کے فرمایا اور جس کی انتہاء اس پر ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے تمام ازواج مطہرات کو اختیار دے دیا اور آیات تخییر نازل ہوئی۔

ازواج مطہرات پر اعتراض کرنا حماقت ہے

ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن میں سے ہر ایک ہمارے سر کا تاج ہیں، ان میں سے کسی کے بارے میں بھی کوئی کلمہ زبان سے نکالتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے لیکن یہ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تکوینی طور پر اس واقعہ کے ذریعہ یہ بتادیا کہ بشری طبیعت اعلیٰ سے اعلیٰ تقویٰ کے مقام پر پہنچنے کے باوجود بشریت ختم نہیں ہوتی اور بشریت کے تقاضے برقرار رہتے ہیں۔

ازواج مطہراتؓ اعلیٰ ترین مقام تک پہنچنے کے باوجود بشری تقاضوں سے بالکلیہ خالی نہیں تھیں، وہ انبیاء کی طرح معصوم تو نہیں تھیں، لہٰذا کبھی کبھی اس کی جھلک ان کے کسی عمل میں بھی آجاتی تھی۔

صحابہ کرام ﷺ کے بارے میں صحیح بات تو یہ ہے کہ وہ معصوم نہیں ہوتے، لیکن عام طور سے اللہ تعالیٰ گناہوں سے ان کی حفاظت فرماتے ہیں۔ کبھی کبھی بتقاضائے بشریت کسی غلطی کا سرزد ہوجانا ان کی مجموعی فضیلت وعدالت کے خلاف نہیں ہے، بشرطیکہ اس غلطی پر اصرار نہ ہو بلکہ ندامت ہو، اس پر توبہ واستغفار ہو۔

حضرت ماعز ؓ آخر صحابہ ہی میں سے تھے اور غامدیہ رضی اللہ عنہا بھی صحابیہ تھیں لیکن غلطی کے بعد توبہ کی اور ایسی توبہ کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سارے مدینہ کے لئے کافی ہوجائے۔

---

۴۸ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۲۲۸، ۲۲۹، و فیض الباری ج: ۳، ص: ۳۳۸.

اسی طرح ازواج مطہراتؓ سے بے شک غلطی ہوئی، اور غلطی کے بعد فوراً تنبیہ ہوئی، اس پر توبہ کی، استغفار کیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے توبہ قبول ہوئی۔ لیکن اگر پھر بھی کوئی اس بنیاد پر اعتراض کرے کہ غلطی کیوں ہوئی تھی تو یہ غلط بات ہے۔ اس واسطے کہ معصوم تو کسی نے نہیں کہا کہ معصوم تھیں۔

لہٰذا اگر غلطی ہوئی تو اس کی تلافی مشروع طریقہ کے مطابق ہوئی۔ حضور اقدس ﷺ نے معاف کر دیا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے معاف کر دیا، اب کون بے وقوف ہے جو یہ کہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے تو معاف کر دیا لیکن میں معاف نہیں کرتا، میں تو اعتراض کروں گا؟

خلاصہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ صحابہ کرامؓ اور ازواج مطہراتؓ سے غلطیوں کا صدور ہوا لیکن اس غلطی پر اصرار نہیں ہوا اور حدیث میں آتا ہے کہ جو شخص اپنے کسی بھی بھائی کو اس کے کسی گناہ کی بنا پر عار دلائے جس سے وہ تائب ہو چکا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو اسوقت تک موت نہیں دیں گے جب تک اسی گناہ میں مبتلا نہ کر دیں۔ العیاذ باللہ یہ اتنی خطرناک بات ہے۔[۴۹]

جب توبہ ہوگئی اللہ اور اس کے رسول نے معاف کر دیا، معاملہ صاف ہوگیا، اب اس کو لے کر بیٹھے رہنا یہ حماقت ہے اور کسی مسلمان کا شیوہ نہیں ہوسکتا۔

۲۴۶۹ ۔ حدثنی ابن سلام : أخبرنا الفزاری ، عن حمید الطویل ، عن أنس ﷺ قال : آلی رسول اللہ ﷺ من نسائه شهر أوکانت انفکت قدمه ، فجلس فی علیة له ، فجاء عمر فقال : اطلقت نساءک؟ فقال : ((لا ولکنی آلیت منهن شهرا)) فمکث تسعاوعشرین ثم نزل فدخل علیٰ نسائه .[راجع : ۳۷۸]

ایلاء سے لغوی معنی مراد ہیں "**وکانت انفکت قدمته**" یعنی ایک اور واقعہ میں آپ ﷺ کا پاؤں اتر گیا تھا، جس کی وجہ سے آپ ﷺ بالا خانہ میں مقیم رہے تھے۔

(۲۶) باب من عقل بعیره علی البلاط أو باب المسجد

۲۴۷۰ ۔ حدثنا مسلم حدثنا أبو عقیل : حدثنا أبو المتوکل الناجی قال : أتیت جابر ابن عبداللہ رضی اللہ عنهما قال : دخل النبی ﷺ المسجد فدخلت إلیه و عقلت الجمل فی ناحیة البلاط فقلت : هذا جملک ، فخرج فجعل یطیف بلجمل، قال : ((الثمن و الجمل لک)). [راجع : ۴۴۳]

---

[۴۹] من عیّر أخاه بذنب قد تاب منه لم یمت حتی یعمله ، تفسیر القرطبی ، ج : ۵ ، ص ۹۳ ، وفیض القدیر ، ج : ۶ ، ص ۱۸۳ ، والمجروحین، ج : ۲، ص : ۲۷۷.

یہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے، یہاں صرف اتنا مقصود ہے کہ جب وہ اونٹ لے کر آئے تو اس کو چبوترہ کے ایک کونے پر باندھ دیا۔

بلاط، پتھروں والی زمین کو کہتے ہیں، جہاں پتھر نصب کر دیئے گئے ہوں۔ مسجد نبوی ﷺ کے باہر تھوڑی سی جگہ ایسی تھی جہاں پر پتھر لگے ہوئے تھے جیسے چبوترہ بنا دیا جائے، اس قسم کے پتھر تھے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ وہاں جا کر اونٹ باندھا، وہ بلاط کسی فرد واحد کی ملکیت نہیں ہے نہ مسجد کا جز ہے بلکہ عام لوگوں کے بیٹھنے، کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس جگہ اونٹ کو لا کر باندھا اور نبی کریم ﷺ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا۔

امام بخاریؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ **"من عقل بعيره على البلاط أو باب المسجد"** مسجد کے دروازے پر کوئی جانور لا کر باندھ دے تو یہ جائز ہے، اس میں ظلم کی کوئی بات نہیں ہے۔

(۲۷) باب الوقوف و البول عند سباطة قوم

۲۴۷۱ ـ حدثنا سليمان بن حرب ، عن شعبة ، عن منصور ، عن أبي وائل ، عن حذيفة رضي الله عنه قال : لقد رأيت رسول الله ﷺ أو قال : لقد أتى النبي ﷺ سباطة قوم فبال قائما .

[راجع : ۲۲۴]

یہ حدیث کتاب الطہارۃ میں بار بار گزر چکی ہے، اس کو یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جس سباطہ پر پیشاب فرمایا، وہ کسی اور قوم کی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوا کہ کسی اور کی مملوک سباطہ پر پیشاب کرنا جائز ہے یا نہیں؟

آنحضرت ﷺ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ جائز ہے، اس لئے کہ اجازت متعارفہ ہے۔ سباطہ ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں گندگی وغیرہ ڈالی جاتی ہے، اس واسطے اس میں پیشاب کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ معلوم ہوا جہاں اجازت متعارفہ ہو وہاں تصرف کرنا جائز ہے۔

(۲۹) باب إذا اختلفوا في الطريق الميتاء. وفي الرحبة تكون بين الطريق. ثم يريد أهلها البنيان فترك منها للطريق سبعة أذرع

۲۴۷۳ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل : حدثنا جرير بن حازم، عن الزبير بن خريت، عن عكرمة ، سمعت أبا هريرة رضي الله عنه قال : قضى النبي ﷺ إذا تشاجروا في الطريق

المیتاء بسبعة أذرع. [۵۰]

یہ حدیث ہے کہ حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ جب لوگوں کا آپس میں راستہ کے بارے میں جھگڑا ہو جائے یا اختلاف ہو جائے تو سات ذراع کے برابر راستہ قرار دیا جائے گا۔

سات ذراع سے کیا مراد ہے؟

یہ حدیث جو راستہ کی مقدار سات ذراع بیان کرتی ہے، اس کے متعدد معنی ہو سکتے ہیں اور علماء میں سے مختلف حضرات نے اس کی مختلف توجیہات بیان کی ہیں:

پہلی توجیہ یہ ہے کہ ایک بہت بڑا میدان خالی پڑا ہوا ہے۔ لوگوں کو اجازت ہے کہ جو چاہیں اس میں اپنی تعمیر کریں، لوگ آکر اس میں عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں اور اس کے مالک بن رہے ہیں تو کس حد تک لوگوں کو عمارت تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے گی۔

فرض کریں ایک پورا رقبہ ہے اور لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ جس طرح چاہو گھر بناؤ، اب کوئی یہاں بنا رہا ہے، کوئی وہاں بنا رہا ہے تو لوگ اس طرح بنالیں کہ پورے میدان میں گھر ہوں اور چلنے کا راستہ بھی نہ رہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ یہ سمجھا یا جائے کہ بیچ میں ایک راستہ رکھو اور دائیں، بائیں عمارت تعمیر کرنے کی اجازت دی جائے۔

اب ایک شخص کہے کہ میں اور آگے تک بناؤں گا، دوسرا کہے کہ آگے نہ بڑھو کیونکہ راستہ کے لئے جگہ چھوڑنی ہے، اس نے کہا کہ راستہ کے لئے چار ذراع بھی کافی ہے۔ دوسرے نے کہا، نہیں! دس ذراع ہونا چاہئے تو آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ اس جھگڑے کی صورت میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا جھگڑا ہو جائے تو پھر معتدل بات یہ ہے کہ راستہ کی مقدار سات ذراع رکھی جائے، اگر اس کے بعد لوگ دائیں بائیں عمارتیں تعمیر کرنا چاہیں تو کرلیں یہ معنی ہیں جو امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں بیان کئے ہیں کہ **"إذا اختلفوا في الطريقة الميتاء"**۔

میتاء کے معنی ہیں وہ راستہ جس میں لوگ کثرت سے آتے جاتے ہوں، یہ **"أتی یأتی"** سے نکلا ہے جس کو شاہراہ بھی کہتے ہیں۔

---

[۵۰] وفي صحيح مسلم، كتاب المسافاة، باب قدر الطريق اذا اختلفوا فيه، رقم: ۳۰۲۶، وسنن الترمذی، كتاب الأحكام عن رسول الله، باب ماجاء في الطريق اذا اختلف فيه كم يجعل، رقم: ۱۲۷۶، وسنن أبي داؤد، كتاب الأقضية، باب في الحبس في الدين وغيره، رقم: ۳۱۴۹، و سنن ابن ماجة، كتاب الأحكام، باب اذا تشاجروا في قدر الطريق، رقم: ۲۳۲۹، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريره، رقم: ۲۸۲۹، ۹۱۷۲، ۹۶۳۱، ۹۷۵۱، ۱۰۰۱۴

اگر اس میں اختلاف ہو جائے وہ اس طرح کہ **"وفی الرحبة"** کہ ایک بڑا رحبہ ہے **"تکون بین الطریق"** جو راستہ کے درمیان آرہا ہے **"ثم یرید أھلھا البنیان"** لوگ عمارت تعمیر کرنا چاہتے ہیں **"فترک منھا للطریق سبعة اذرع"** تو راستہ کے لئے جو جگہ چھوڑی جائے گی وہ سات ذراع ہونی چاہئے نہ کم نہ زیادہ۔ اس کی ایک تفسیر یہ ہے جو امام بخاریؒ نے اختیار فرمائی ہے۔

دوسری توجیہ یہ ہے ایک زمین دو یا زیادہ آدمیوں کے درمیان مشاع ہے، مشترک ہے اور وہ اس زمین کو آپس میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں، حدود طے ہو جائیں کہ یہاں تک تمہاری ہے اور یہاں تک میری ہے، تو اس میں ایک راستہ تو یہ ہے کہ سب زمین تقسیم کرلیں اور گزرنے کی جگہ کسی کے لئے نہ رہے۔

اب ظاہر ہے کہ کوئی حصہ ایسا بھی رکھا جائے جس کو مشترک راستہ قرار دیا جائے۔ اگر تمام شرکاء مشترک راستہ کے لئے کسی مقدار پر متفق ہو جائیں تو ٹھیک ہے، بڑی اچھی بات ہے۔ سب مل کر طے کرلیں کہ دس ذراع ہم راستہ کے لئے چھوڑ دیں گے اور اس پر سب راضی ہو گئے تو اس میں کوئی جھگڑے کی بات ہی نہیں۔ دس ذراع راستہ چھوڑ دیا جائے گا۔

لیکن اگر آپس میں کوئی راضی نامہ نہ ہو سکا اور اختلاف برقرار رہا کہ کوئی کہہ رہا ہے چھوٹا راستہ چھوڑو، کوئی کہہ رہا ہے بڑا راستہ چھوڑو، تو اس وقت حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمادیا کہ سات ذراع کا راستہ چھوڑ دو اور یہ معتدل بات ہے۔ یہ اس حدیث کی دوسری توجیہ کی گئی ہے۔

تیسری توجیہ امام طحاوی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ بالکل ابتدائی آبادکاری کی بات ہے کہ جب کوئی گاؤں ابتداء میں آباد کیا جا رہا ہو اور لوگ عمارتیں تعمیر کر رہے ہوں، اس وقت یہ طے کرنا ہے کہ ہم کتنا راستہ چھوڑیں اور کتنی جگہ پر عمارتیں تعمیر کریں۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک معتدل معیار بتا دیا کہ سات ذراع راستہ چھوڑ دو۔

چوتھی توجیہ علامہ ابن جوزیؒ نے فرمائی۔ وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ ایک راستہ ہے، لمبی چوڑی سڑک ہے۔ اس کے کناروں پر بیٹھ کر بعض لوگ اپنا سودا فروخت کرنا چاہتے ہیں جیسے ہاکر لوگ کہتے ہیں کہ یہاں مت بیٹھو کیونکہ یہ راستہ ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے گزرنے کے لئے اچھی خاصی جگہ موجود ہے، ہم اس لئے بیٹھے ہیں۔ تو کتنی جگہ راستہ کے لئے چھوڑی جائے اور کتنی جگہ سامان بیچنے والوں کے لئے چھوڑی جائے اس جھگڑے کا تصفیہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سات ذراع راستہ چھوڑ دو اگر اس کے بعد کوئی کنارہ پر بیٹھنا چاہتا ہے تو بیٹھ جائے۔ [۵۱]

---

۵۱ راجع: تکملہ فتح الملہم ج: ۱ ص: ۶۸۰ و فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۳۹.

یہ کوئی تحدید شرعی نہیں

لیکن چاروں جہات میں یہ بات یاد رکھیں کہ حضور اکرم ﷺ کا سات ذراع کی تحدید فرمانا یہ کوئی تحدید شرعی ابدی نہیں ہے بلکہ مصلحت پر مبنی ہے اور زمان و مکان کے اختلاف سے اس کی مقدار میں اضافہ اور کمی ہو سکتی ہے اور اس پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

۲۴۷۵ ۔ حدثنا سعید بن عفیر قال : حدثنی اللیث : حدثنا عقیل ، عن ابن شھاب عن أبی بکر بن عبد الرحمٰن ، عن أبی ھریرة ﷺ قال : قال رسول اللہ ﷺ : ((لایزنی الزانی حین یزنی و ھو مؤمن ، و لا یشرب الخمر حین یشرب و ھو مؤمن و لا یسرق حین یسرق و ھو مؤمن و لا ینتھب نھبة یرفع الناس إلیه فیھا أبصارھم ، حین ینتھبھا و ھو مؤمن)) .

وعن سعید و أبی سلمة ، عن أبی ھریرة عن النبی ﷺ مثله إلا النھبة.

قال الفربری : وجدت بخط أبی جعفر : قال أبو عبداللہ : تفسیرہ أن ینزع منه ، یرید الإیمان. [أنظر : ۵۵۷۸ ، ۶۷۷۲ ، ۶۸۱۰]

حدیث میں یہ تشریح کر دی کہ ایمان نہیں ہوتا اس کا معنی یہ ہے کہ اس کے اندر ایمان کا نور نہیں ہوتا۔

(۳۱) باب کسر الصلیب وقتل الخنزیر

۲۴۷۶ ـ حدثنا علی بن عبداللہ : حدثنا سفیان : حدثنا الزھری قال : أخبرنی سعید ابن المسیب سمع أبا ھریرة ﷺ عن رسول اللہ ﷺ قال : ((لا تقوم الساعة حتی ینزل فیکم ابن مریم حکما مقسطا فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر ویضع الجزیة و یفیض المال حتی لا یقبله أحد)). [راجع : ۲۲۲۲]

تشریح

حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے فرمایا کہ **"لا تقوم الساعة حتی ینزل فیکم ابن مریم"** قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی جب تک تمہارے درمیان عیسیٰ ابن مریم حکم بن کر اور انصاف کرنے والا بن کر نازل نہ ہوں

"فیکسر الصلیب ویقتل الخنزیر" وہ صلیب کو توڑ دیں گے اور خنزیر کو قتل کر دیں گے۔

"یکسرا لصلیب" سے کیا مراد ہے؟

"صلیب کو توڑ دیں گے" بعض حضرات نے فرمایا کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں جہاں صلیبیں ہیں ان کے قلمرو کے اندر وہ توڑ دی جائیں گی۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ یہ عیسائی مذہب کے ختم ہونے سے کنایہ ہے کہ سارے عیسائی، مسلمان ہو جائیں گے کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام خود تشریف لے آئیں گے۔

"ویضع الجزیة" اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت تو کافروں کے لئے تین اختیار ہیں یا اسلام لائیں یا جزیہ ادا کریں یا ان سے قتال ہو۔ لیکن اس وقت جزیہ ختم ہو جائے گا۔ بس دو ہی باتیں رہ جائیں گی، **"إما الاسلام وإما السیف"**۔

"ویفیض المال" اور وہ لوگوں میں مال کو پانی کی طرح بہا دیں گے، یہاں تک کہ کوئی قبول کرنے والا نہ ہوگا۔

سوال: کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حکومت ساری دنیا پر ہوگی؟

جواب: روایات میں اس بات کی صراحت نہیں ہے۔ البتہ ظاہر روایات سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا پر ہوگی۔

(۳۲) باب هل تکسر الدنان التی فیها الخمر أو تخرق الزقاق؟ فإن کسر صنما أو صلیبا أو طنبورا أو مالا ینتفع بخشبه

"وأتی شریح فی طنبور کسر فلم یقض فیه بشیء"۔

اگر کہیں مٹکوں میں شراب رکھی ہے تو کیا ان کو توڑا جائے؟ یا مشکوں میں شراب رکھی ہے تو ان کو پھاڑ دیا جائے؟ **"هل تکسر؟"** **"هل"** کہہ کر اشارہ کر دیا کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

اختلاف فقہاء

اس کی تھوڑی سے تفصیل یہ ہے کہ اگر یہ مٹکا یا مشکیزہ جس میں شراب ہے خدانہ کرے کسی مسلمان کا ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

امام یوسف رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اگر کوئی شخص مسلمان کی شراب کا مٹکا توڑ دے یا مشکیزہ پھاڑ دے تو وہ ضامن

نہیں ہوگا۔ اس واسطے کہ اس نے ایک مشکیزہ یا مٹکے کو غلط چیز رکھنے کے لئے استعمال کیا تو دوسرے کے لئے جائز ہے کہ وہ نہی عن المنکر کے طور پر اس کو پھاڑ دے یا توڑ دے اور اس کی وجہ سے وہ ضامن بھی نہیں ہوگا۔[۵۲]

امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک

امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ضامن ہوگا، اس لئے کہ خرابی مٹکے یا مشکیزے میں نہیں تھی بلکہ شراب میں تھی اور شراب کو مٹکے توڑے اور مشکیزے پھاڑے بغیر بھی بہا دینا ممکن تھا۔ اس نے خواہ مخواہ مٹکا توڑا اور مشکیزہ پھاڑا، لہٰذا وہ ضامن ہوگا۔[۵۳]

اگر مٹکے ذمی کے ہوں تو؟

اور اگر یہ شراب کسی ذمی، غیر مسلم کی تھی یعنی اہل کتاب میں سے مثلاً تو ہمارے (احناف) نزدیک اگر کوئی شخص ذمی کی شراب کا مٹکا توڑ دے تو وہ مٹکے کا بھی ضامن ہوگا اور شراب کا بھی یعنی اس کی قیمت کا، کیونکہ اہل کتاب کے حق میں شراب متقوم ہے تو ان کے نقطۂ نظر سے اس شخص نے ان کا مال ضائع کیا، لہٰذا وہ ضامن ہوگا۔[۵۴]

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ ضامن نہیں ہوگا، اس واسطے کہ اگرچہ شراب ان کے حق میں متقوم ہے لیکن توڑنے والے کے حق میں متقوم نہیں۔ تو امام شافعیؒ نے توڑنے والے کا اعتبار کیا اور حنفیہ نے مالک کا اعتبار کیا۔ اس طرح سے اختلاف پیدا ہوا۔[۵۵]

---

۵۲ فان كان الدن علم ففيه الخلاف : فعند أبي يوسف و أحمد في رواية : لايضمن ، ويستدل مهما في ذلك بما رواه الترمذي الخ (عمدة القاري ، ج : ۹ ، ص: ۲۴۱).

۵۳ وقال محمد بن الحسن : يضمن ، وبه قال أحمد في رواية ، لان الاراقة بدون الكسر ممكنة الخ (عمدة القاري، ج : ۹ ، ص: ۲۴۱).

۵۴ وان كان الدن لذمي فعندنا يضمن بلاخلاف بين اصحابنا ، لان مال متقوم في حقهم ، وعند الشافعي واحمد : لايضمن لانه غير متقوم في حق المسلم. وقال جمهور العلماء ، منهم الشافعي : إن الأمر يكسر الدنان محمول على الندب (عمدة القاري ، ج : ۹ ، ص : ۲۴۲،۲۴۳).

۵۵ وان كان الدن لذمي فعندنا يضمن بلاخلاف بين اصحابنا ، لان مال متقوم في حقهم ، وعند الشافعي و أحمد: لايضمن لانه غير متقوم في حق المسلم. وقال جمهور العلماء ، منهم الشافعي : إن الأمر يكسر الدنان محمول على الندب (عمدة القاري ، ج :۹ ، ص : ۲۴۲،۲۴۳).

" کسر صنما أو صليبا ".

آگے فرمایا کہ کسی نے اپنے گھر میں بت رکھا ہوا ہے اور کوئی شخص جا کر اس کو توڑ دے یا صلیب رکھی ہوئی ہے جا کر اس کو توڑ دے یا طنبور یعنی آلات موسیقی رکھے ہوئے ہیں ان کو توڑ دے یا کوئی ایسی معصیت کی چیز ہے جو لکڑی سے بنی ہوئی ہے اگر اس کو توڑ دیا جائے تو اس کی لکڑی قابل انتفاع نہ رہے گی۔ تو اس کا کیا حکم ہے؟ ضامن ہوگا یا نہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کا حکم بیان نہیں کیا لیکن ایک اثر نقل کیا ہے کہ **"واتی شریح فی طنبور"** حضرت شریح ﷺ کے پاس مسئلہ لایا گیا کہ ایک شخص نے کسی کا طنبور توڑ دیا تھا تو انہوں نے اس پر ضمان عائد نہیں کیا۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ وہ ضامن نہیں ہوگا۔

حنفیہ کا اصول

حنفیہ کے ہاں اصول یہ ہے کہ اگر وہ معصیت کی چیز ایسی ہے کہ اس کے مادے سے انتفاع کیا جا سکتا ہے مثلاً لکڑی کا بت ہے اور لکڑی سے انتفاع کیا جا سکتا ہے یا پیتل کا ہے اور پیتل سے انتفاع کیا جا سکتا ہے تو ایسی صورت میں اس کا توڑ کر اس کے مادہ کو اگر ضائع کر دے گا مثلاً لکڑی چونکہ قابل انتفاع ہے اگر کوئی شخص اس کو توڑ کر ضائع کر دے گا تو اس کا ضامن ہوگا۔[۵۶]

واضح رہے کہ ضامن بت کا نہیں ہوگا بلکہ مادے کا ضامن ہوگا۔ بت میں جتنی لکڑی یا پیتل لگا ہوا ہے وہ اس کا ضامن ہوگا۔

۲۴۷۷۔ حدثنا أبو عاصم الضحاک بن مخلد، عن يزيد بن أبي عبيد، عن سلمة بن الأكوع ﷺ: أن النبي ﷺ رأى نيرانا توقد يوم خيبر. قال: ((علام توقد هذه النيران؟)) قالوا: على الحمر الإنسية، قال: ((اكسروها وهريقوها))، قالوا: ألا نهريقها و نغسلها؟ قال: ((اغسلوا)) قال أبوعبدالله: كان ابن أبي أويس يقول: الحمر الإنسية.
[أنظر: ۴۱۹۶، ۵۴۹۷، ۶۱۴۸، ۶۳۳۱، ۶۸۹۱][۵۷]

---

۵۶ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۲۴۲، ۲۴۳.

۵۷ صحيح مسلم، كتاب الصيد والذبائح ومايؤكل من الحيوان، باب تحريم أكل لحم الحمر الانسية، رقم: ۳۵۹۲، وسنن ابن ماجة، كتاب الذبائح، باب لحوم الحمر الوحشية، رقم: ۳۱۸۶، ومسند أحمد، أوّل مسند المدنيين أجمعين، باب حديث سلمة بن الاكوع، رقم: ۱۵۹۱۶، ۱۵۹۲۸.

ترجمہ وتشریح

یہ حضرت سلمہ بن الاکوع ﷺ کی خیبر کے واقعہ کی حدیث نقل کی ہے کہ خیبر کے موقع پر جو آگ جلائی جارہی تھی آنحضرت ﷺ نے اس کے بارے میں پوچھا کہ کس چیز پر آگ جلائی جارہی ہے۔ یعنی کیا پک رہا ہے؟

کھانا وغیرہ پک رہا تھا تو صحابہ کرام ﷺ نے جواب دیا کہ جو پالتو گدھے ہوتے ہیں ان کو ذبح کر کے پکایا جارہا ہے **"قال اکسروھا وھریقوھا"** آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ دیگیں جن کے اندر یہ پک رہا ہے ان کو توڑ دو اور جو کچھ کھانا پکایا جارہا ہے اس کو بہادو۔

"قالو" صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا کہ کیا ایسا نہ کریں کہ اصل خرابی تو گوشت میں ہے، گوشت کا جو سالن ہے ہم وہ بہادیں اور جو برتن ہیں ان کو بجائے توڑنے کے دھو کر استعمال کریں؟

"قال" آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! دھو لو اور دھو کر استعمال کرو۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشاء

امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث کو لانے کا منشاء امام محمد رحمہ اللہ کے مذہب کی تائید ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا شراب کا مٹکا توڑ دے تو مٹکے کا ضامن ہوگا کیونکہ اس کے لئے ممکن تھا کہ جس طرح اس حدیث میں نبی کریم ﷺ نے اجازت دی کہ جو چیز ناجائز ہے اس کو بہادیا جائے اور برتن کو باقی رکھا جائے اور دھو کر استعمال کرلیا جائے تو یہ بات شراب کے مٹکوں میں بھی ممکن ہے، اس واسطے اس کو توڑنا درست نہ ہوا۔ [۵۸]

شاید امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ جو چیز فی نفسہٖ معصیت والی ہو اسے توڑنے پر ضمان نہیں، چنانچہ طنبور پر ضمان نہیں اور جس چیز میں فی نفسہٖ معصیت نہیں مگر معصیت کی چیز کے لئے ظرف بن رہی ہے اسے توڑنے پر ضمان ہے۔

۲۴۷۸ ـ حدثنا علي بن عبداللہ : حدثنا سفیان : حدثنا ابن ابی نجیح ، عن مجاھد ، عن أبی معمر ، عن عبداللہ بن مسعود ﷺ قال : دخل النبی ﷺ مکة وحول البیت ثلاث مائة وستون نصبا ، فجعل یطعنھا بعود فی یدہ ، وجعل یقول : ﴿ جَاءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ﴾ (الإسراء : ۸۱) [أنظر : ۴۲۸۷ ، ۴۷۲۰]

اس حدیث سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ حضور اکرم ﷺ جب مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے تو بت توڑ دیئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کے بت توڑنا جائز ہے۔

---

۵۸ عمدة القاري ، ج : ۹ ، ص : ۲۴۷ .

یہ استدلال محل نظر ہے

اس حدیث سے استدلال محل نظر ہے کیونکہ جس وقت حضور اکرم ﷺ نے بت توڑے، اس وقت جنگ کی حالت تھی اور جنگ کی حالت میں حربیوں کا ہر مال مباح ہو جاتا ہے۔ اس سے کسی شخص کے حالت امن میں بت توڑنے کی اجازت ثابت نہیں ہوتی، لہٰذا یہ استدلال محل نظر ہے۔

۲۴۷۹ – حدثنا إبراهيم بن المنذر : حدثنا أنس بن عياض ، عن عبيد الله بن عمر، عن عبدالرحمٰن بن القاسم ، عن أبيه القاسم ، عن عائشة رضی الله عنها : أنها كانت اتخذت على سهوة لها سترا فيه تماثيل فهتكه النبی ﷺ فاتخذت منه نمرقتين فكانتا فی البيت يجلس عليهما. [أنظر: ۵۹۵۴، ۵۹۵۵، ۶۱۰۹] [59]

یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی معروف حدیث ہے کہ انہوں نے اپنے چبوترے پر یا اندرونی کمرے پر ایسا پردہ لٹکا لیا تھا جس میں تماثیل یعنی تصویریں تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو پھاڑ دیا، تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس سے دو تکیے بنا لئے جو گھر میں رکھے ہوئے تھے اور آنحضرت ﷺ ان پر ٹیک لگاتے تھے۔

اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ کسی شخص نے کوئی تصویر رکھی ہوئی ہے تو دوسرے کے لئے اس کو پھاڑ دینا جائز ہے یہ ظلم نہیں ہے اور بظاہر یہ حدیث یہاں لانے کا منشاء یہی ہے۔

لیکن یہاں بظاہر استدلال منطبق نہیں ہوتا، اس واسطے کہ حضور اکرم ﷺ نے جو پردہ پھاڑا تھا وہ دراصل حضور اکرم ﷺ کی ہی ملکیت تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا لے کر آئی تھیں لیکن حضور اکرم ﷺ کے گھر کا پردہ تھا تو اگر اس کو پھاڑ دیا تو یہ اپنی ملک کو پھاڑنا ہوا نہ کہ دوسرے کی ملک کو۔

(۳۴) باب إذا كسر قصعة أو شيئا لغيره

۲۴۸۱ ـ حدثنا مسدد : حدثنا يحيى بن سعيد ، عن حميد ، عن أنس ﷺ: أن النبی ﷺ كان عند بعض نسائه ، فأرسلت إحدى أمهات المؤمنين مع خادم بقصعة فيها طعام فضربت بيدها فكسرت القصعة فضمها وجعل فيها الطعام ، وقال : "كلوا" وحبس الرسول والقصعة حتى فرغوا فدفع القصعة الصحيحة وحبس المكسورة وقال ابن أبی

---

۵۹ سنن الترمذی ، كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله، باب منه ، رقم : ۲۳۹۲ ، و سنن النسائی، كتاب الزينة، رقم ۵۳۵۹ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب اللباس ، باب الصور فيما يوطأ ، رقم : ۳۶۴۳ ، و مسند أحمد ، باقی مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم : ۲۲۹۵۲، ۲۳۰۸۵، ۲۳۱۳۲، ۲۳۵۷۶۱.

مریم: أخبرنایحیی بن أیوب : حدثنا حمید : حدثنا أنس عن النبی ﷺ. [أنظر : ۵۲۲۵] [۶۰]

حضرت انس ﷺ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ اپنی بعض ازواج کے پاس تھے کہ دوسری امہات المؤمنین میں سے کسی نے اپنے خادم کے ہاتھ ایک پیالہ بھیجا جس میں کچھ کھانا تھا۔

" فضربت بیدھا " تو جن کے گھر آپ ﷺ قیام فرما تھے انہوں نے اس کے اوپر اپنا ہاتھ مار دیا اور پیالہ توڑ دیا۔

بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر آپ ﷺ تشریف فرما تھے اور جنہوں نے کھانا بھیجا تھا وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا تھیں۔

بعض دوسری روایات سے اس کی تفصیل یوں معلوم ہوتی ہے کہ ہوا یوں تھا کہ آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف فرما تھے حضرت عائشہؓ نے کچھ کھانا آپ ﷺ کے لئے بنایا تھا۔ ادھر حضرت حفصہؓ نے کچھ کھانا بنا کر بھیجا تو جیسے دو دوستوں کے اندر آپس میں چپقلش ہوتی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ان سے کہا کہ میں نے کھانا بنایا تھا اور میں اس بات کی زیادہ حقدار ہوں کہ نبی کریم ﷺ میرا کھانا تناول فرمائیں، لہٰذا تم نے جو کھانا بھیجا ہے، اب میں بھی لے کر آتی ہوں۔ تم بھی لا رہی ہو، میں بھی لا رہی ہوں، اگر میں نے پہلے کھانا رکھ دیا اور پھر تم لے کر آئیں تو تمہارا کھانا میں پھینک دوں گی یعنی اگر تم پہلے لے کر آ گئیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں پہلے لے آئی تو پھر اس کے بعد تمہیں حق نہیں ہوگا کہ تم کھانا رکھو، اگر لاؤ گی تو میں پھینک دوں گی۔

بعض روایات میں ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے لا کر رکھ دیا بعد میں جب انہوں نے لا کر رکھا تو حضرت عائشہؓ نے ہاتھ مار کر اسے ہٹا دیا۔ جیسا انہوں نے کہا تھا اس کے مطابق عمل کیا۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے جو خادمہ کھانا لے کر آ رہی تھی اس نے یہ دیکھا کہ اگر میرا کھانا پہلے نہ پہنچا تو حضرت عائشہؓ دھمکی دے چکی ہیں کہ میں کھانا پھینک دوں گی تو یہ کھانا پھینک دیا جائے گا۔ اس نے دور سے ہی پیالہ دسترخوان پر پھینک دیا چونکہ وہ دور سے پھینکا تھا اس لئے وہ ٹوٹ گیا۔ حضرت عائشہؓ نے نہیں توڑا بلکہ خود اس کے پھینکنے کی وجہ سے ٹوٹا۔ روایتوں میں یہ اختلاف ہے۔ واللہ اعلم۔

---

[۶۰] سنن الترمذی ، کتاب الأحکام عن رسول الله ، باب ماجاء فیمن یکسر له الشئی مایحکم له من مال ، رقم: ۱۲۷۹ ، و سنن النسائی ، کتاب عشرة النساء ، باب الغیرة ، رقم : ۳۸۹۳، وسنن أبی داؤد ، کتاب البیوع ، باب فیمن افسد شیئا یغرم مثله ، رقم : ۳۰۹۲، وسنن ابن ماجة ، کتاب الأحکام ، باب الحکم فیمن کسر شیئا ، رقم : ۲۳۲۵، ومسند أحمد ، باقی مسند المکثرین ، باب مسند أنس بن مالک ، رقم : ۱۱۵۸۹ ، ۱۳۲۷۳، وسنن الدارمی ، کتاب البیوع ، باب من کسر شیاء فعلیه مثله ، رقم ۲۴۸۵ .

آنحضرت ﷺ نے ان ٹکڑوں کو جوڑا اور جو کھانا گر گیا تھا اس کو دوبارہ اٹھا کر رکھا **"وقال کلوا"** اور فرمایا کہ کھاؤ اور جو کھانا لے کر آئی تھی آپ ﷺ نے اس کو کچھ دیر روکا اور پیالہ کو بھی، یہاں تک کہ جب کھانا کھا چکے تو حضرت عائشہؓ کے گھر میں جو صحیح پیالہ تھا وہ حضرت حفصہؓ کے گھر لے جانے کے لئے دیا کہ تم یہ واپس لے جاؤ اور جو پیالہ ٹوٹ گیا تھا وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں رکھ لیا تو یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ جو اشیاء مثلی نہیں ہوتیں بعض اوقات ان کا ضمان بھی بالمثل ہوسکتا ہے کیونکہ اس زمانے میں پیالے ذوات الامثال میں سے نہیں تھے۔ ہر پیالہ دوسرے سے مختلف ہوتا تھا۔ اب تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں، تفاوت نہیں ہوتا کیونکہ مشین کے ذریعہ بنے ہوئے ہیں، لہٰذا سب مثلی ہوگئے۔

تو یہاں آپ ﷺ نے ضمان بالمثل دلوایا اس استدلال کا جواب یہ ہے اولاً تو مسئلہ یہ ہے کہ دونوں پیالے حضور اقدس ﷺ کے تھے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تھے وہ بھی حضور ﷺ کی ملکیت تھا لیکن یہاں تبدیلی یہ فرمائی ہے کہ ایک جگہ رکھے ہوئے پیالہ کے بدلے دوسرا پیالہ دے دیا۔ یہاں دوسرے کے ضمان کا سوال ہی نہیں بلکہ اپنی مملوک اشیاء کی جگہ تبدیل کرنا ہے۔[۶۱]

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا قول

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے بھی فرمایا کہ پرانے زمانے کے بارے میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں کپڑا اور برتن قیمتی ہوا کرتے تھے، ذوات الامثال میں سے نہیں تھے یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے۔

اکثر بے شک ایسا ہی ہوتا تھا لیکن عین ممکن ہے کہ بعض برتن بالکل ایک دوسرے کے مثل ہوں یا کپڑے کے تھان میں دو تین گز بالکل ایک جیسے ہوں تو ایسی صورت میں ان کو مثلی میں شمار کیا جائے گا تو ہوسکتا ہے کہ وہ پیالہ اس پیالہ کے بالکل مثل ہو۔ ایسی صورت میں وہ مثلیات میں شمار ہوگا۔[۶۲]

(۳۵) باب إذا هدم حائطا فليبن مثله

۲۴۸۲ ـ حدثنا مسلم بن إبراهيم : حدثنا جرير هو ابن حازم ، عن محمد بن سيرين ، عن أبي هريرة ﷺ قال : قال رسول الله ﷺ ((كان رجل في بني إسرائيل يقال له:

---

[۶۱] احتج بهذا الحديث من قال : يقضى في العروض بالأمثال ، و هو مذهب أبي حنيفة و الشافعي و رواية عن مالك..... ان الظاهر ما يحويه بيته ﷺ ، أنه ملكه فقل من ملكه الى ملكه لا على وجه الغرامة بالقيمة. الخ (عمدة القاري ، ج : ۹ ، ص : ۲۵۳)

[۶۲] فيض الباري ، ج: ۳ ، ص: ۳۴۱.

جریج، یصلی فجاء ته أمه فدعته فأبى أن يجيبها فقال : أجيبها أو أصلي ؟ ثم أتته فقالت : اللهم لا تمته حتى تريه وجوه المومسات. وكان جريج في صومعته فقالت امرأة لأ فتنن جريجا ، فتعرضت له فكلمته ، فأبى فأتت راعيا فأمكنته من نفسها فولدت غلاماً فقالت : هو من جريج ، فأتوه وكسروا صومعته فأنزلوه وسبوه ، فتوضأ وصلى ثم أتى الغلام فقال: من أبوک یا غلام ؟ قال : الراعي ، قالوا : نبني صومعتک من ذهب. قال : لا ، إلا من طين)).[راجع : ۱۲۰۶]

یہ حدیث پہلے بھی گزری ہے۔ یہاں لانے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں نے جوش اور غصے میں آکران کی عبادت گاہ، ان کے مندر کو گرادیا تھا۔ بعد میں ضمان میں ادا کیا اور اس کو پھر دوبارہ تعمیر کیا۔ وہ سونے سے تعمیر کرنا چاہ رہے تھے انہوں نے کہا کہ طین (مٹی) سے ہی بناؤ جیسا کہ پہلے تھا۔ معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی کی دیوار یا عمارت گرادے تو اس کا ضمان یہ ہے کہ اس کو دوبارہ تعمیر کرے۔

كتاب الشركة

٢٤٨٣ - ٢٥٠٨

۴۷ ۔ کتاب الشرکة

(۱) باب الشرکة فی الطعام والنهد و العروض،

"و کیف قسمة ما یکال و یوزن مجازفة ، أو قبضة قبضة لما لم یر المسلمون فی النهد بأسا أن یأکل هذا بعضا و هذا بعضا ، و کذلک مجازفة الذهب و الفضة ' و القران فی التمر".

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ شرکت کے متعلق مختلف ابواب قائم فرما رہے ہیں۔

پہلا باب کھانے میں شرکت کے بارے میں ہے۔

"النهد"۔"نهد" [بفتح النون و بکسرها] کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ مختلف ساتھی اپنا اپنا کھانا اکٹھا کر کے بیٹھ جائیں اور کھانا شروع کر دیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر بہت سے لوگ آپس میں اپنا کھانا اکٹھا کر لیں اور ساتھ بیٹھ کر کھائیں تو ایسا کرنا جائز ہے۔ اس میں اس بات کا کوئی اعتبار نہیں کہ کس نے کتنا کھایا، ہوسکتا ہے کہ ایک شخص جتنا کھانا لے کر آیا مجموعہ میں سے اس سے زیادہ کھالیا ہو اور دوسرا شخص کھانا زیادہ لایا ہو اور اس نے خود کم کھایا ہو، تو اگر چہ کھانا لانے والے نے اپنے لائے ہوئے کھانے کی مقدار سے زیادہ کھایا ہو اس کے باوجود اس کے لئے ایسا کرنا جائز ہے، کیونکہ آپس میں بیٹھ کر کھانا، یہ شرکت باہمی تسامح کی بنیاد پر ہے اور اس کے نتیجے میں ایک دوسرے کا کھانا کھا رہے ہیں، یہ سب آپس کی رضامندی سے ہو رہا ہے۔

اس کا تعلق باب تسامح سے ہے، ورنہ اگر اس میں دقیق قسم کی منطقی موشگافی شروع کر دیں اور یہ کہیں کہ دیکھو بھائی اس نے اپنے کھانے کا وہ حصہ جو دوسرے نے کھایا ہے وہ اس کھانے کے مقابلے میں بیچا ہے جو اس نے اس کا کھایا تو یہ معاملہ جائز نہ ہونا چاہئے، اس لئے کہ کھانا عام طور سے مکیلات اور موزونات میں سے ہوتا ہے جو اموال ربویہ میں سے ہے۔ اگر کوئی کہے کہ میں نے اپنا کھانا دوسرے کے کھانے کے معاوضے میں بیچا ہے تو دونوں میں تفاضل کی وجہ سے حرام ہونا چاہئے۔ اس واسطے یہ معاملہ بھی ناجائز ہونا چاہئے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جائز ہے جس کی دلیل میں کئی حدیثیں روایت کی ہیں اور یہ جائز ہے، بر بنائے تسامح' یہ عقد معاوضہ نہیں ہے اور اموال

ربویہ کے احکام وہاں جاری ہوتے ہیں جہاں عقد معاوضہ ہو۔

لہٰذا جہاں عقد معاوضہ نہ ہو بلکہ باہمی مواسات اور مسامحۃ ہو وہاں اموال ربویہ کے احکام جاری نہیں ہوں گے۔

کمیٹی جائز ہے (مروجہ کمیٹی بی سی کا حکم؟)

اسی سے مسئلہ نکلتا ہے کہ لوگ کمیٹی ڈالتے ہیں۔ بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ یہ حرام ہے اس میں ایک آدمی کو زیادہ رقم دے دی جاتی ہے۔

اس میں اگر وہی منطقی موشگافی کی جائے کہ یہ قرض ہے بشرط القرض مثلاً میں نے آج سو روپے دیئے اور جس کے نام کمیٹی نکلی اس نے دوسروں سے قرض لیا تو قید یہ لگائی کہ میں تمہیں سو روپے اس شرط پر قرض دوں گا کہ تم سب مل کر پانچ ہزار روپے قرض دو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ **"قرض جر نفعا"** میں داخل ہو گیا اس واسطے ناجائز ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ یہ سرے سے عقد معاوضہ ہے ہی نہیں بلکہ عقد مواسات اور عقد تسامح ہے، لہٰذا اس میں منطقی موشگافی کی ضرورت نہیں۔ امام بخاری رحمہ اللہ یہاں پر یہی بات فرمانا چاہتے ہیں۔

یہاں تک تو امام بخاری رحمہ اللہ کی بات سولہ آنے درست ہے۔ آگے فرماتے ہیں **"کیف قسمته"** کہ جو مکیلات وموزونات ہوتی ہیں ان کی تقسیم مجازفۃً بھی جائز ہے اور **"قبضةً قبضةً"** بھی جائز ہے۔ یعنی باقاعدہ کیل اور وزن کر کے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اگر اشیاء مکیلہ اور موزونہ مشاع طور پر بہت سارے افراد کے درمیان مشترک ہوں۔ بعد میں اگر لوگ تقسیم کرنا چاہیں تو تقسیم مجازفۃ بھی جائز ہے اور اگر باقاعدہ کیل اور وزن کر کے کرنا چاہیں تو کیل اور وزن کر کے بھی تقسیم کرنا جائز ہے۔

کیل اور وزن کر کے اگر چاہیں تو اس کا جواب تو واضح ہے اور اگر مجازفۃ کرنا چاہیں تو اس پر امام بخاریؒ ان واقعات سے استدلال کر رہے ہیں جن میں سب نے مل کر کھانا جمع کر لیا اور پھر اکٹھا کھایا تو جس طرح وہاں پر باوجود تفاضل کے کھانا جائز ہو گیا اسی طرح اگر مکیلات اور موزونات کی باقاعدہ تقسیم کی جائے تو یہ بھی جائز ہے لیکن یہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک کے خلاف ہے۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا مسلک۔ یہ ہے کہ مکیلات اور موزونات اگر مشاع ہوں تو مشاع ہونے کی صورت میں اگر ان کی تقسیم کی جائے تو تقسیم کے اندر کیل اور وزن ضروری ہے۔ مجازفۃ تقسیم کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ حنفیہ کے نزدیک تقسیم بمنزلہ بیع ہے۔ اگر ایک شئے دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہے مثلاً ایک من گندم، دو آدمیوں کے درمیان نصفاً نصفاً مشترک ہے۔ بعد میں نصف، نصف تقسیم کرتے ہیں۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ ہر ایک اپنا حصہ دوسرے کے حصے کے عوض

بیچ رہا ہے کیونکہ گندم کے ہر دانہ میں دونوں کی شرکت ہے۔ تو گندم کے ہر دانے میں جو حصہ ہے اس کو اسی دانے کے اس حصے کے عوض فروخت کرتا ہے جو دوسرے کا ہے۔ تو حنفیہ کے نزدیک قسمت بحکم بیع ہے اور اموال ربویہ کی بیع مجازفۃ جائز نہیں کیونکہ اس میں تفاضل کا احتمال ہے۔[1]

قربانی کا گوشت مجازفۃ تقسیم کرنا جائز نہیں

اسی بنا پر یہ مسئلہ ہے کہ قربانی کا گوشت اگر گائے میں سات حصے ہیں تو وہ سات حصے سات آدمیوں میں مجازفۃ تقسیم کرنا جائز نہیں بلکہ وزن کر کے تقسیم کرنا ضروری ہے اور حنفیہ کے ہاں یہ مسئلہ تمام کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگرچہ تمام ساتھی راضی ہوں تب بھی مجازفۃ تقسیم کرنا جائز نہیں، وزن کر کے تقسیم کرنا ضروری ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے قسمت ہے اور قسمت بحکم بیع ہوتی ہے اور بیع کے حکم میں ہونے کی وجہ سے ہر شخص اپنا حصہ دوسرے کے حصے کے مقابلے میں بیچتا ہے۔ تو بیع مجازفۃ درست نہ ہوگی۔ اب اگر مجازفۃ کریں گے تو ربوا لازم آئے گا اور ربوا تراضی سے بھی جائز نہیں ہوتا۔ یہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔[2]

امام بخاری اور امام احمد رحمہما اللہ کا مسلک

امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ اگر مجازفۃ بھی تقسیم کرلیں گے تو جائز ہو جائے گا اور یہی امام احمد حنبلؒ کا مسلک بھی ہے۔

امام احمد حنبلؒ یہ فرماتے ہیں کہ تقسیم بحکم بیع نہیں، لہٰذا تقسیم پر بیع کے احکام جاری نہیں ہوں گے بلکہ تقسیم کے معنی ہیں افراز۔ لہٰذا اگر باہمی رضامندی سے لوگ مجازفۃ اپنے اپنے حصے مقرر کرلیں اور سب راضی ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں اور اس میں ربوا لازم نہیں آتا۔[3]

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا قول

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کی کتابوں میں جو یہ بات لکھی ہے کہ گوشت کی تقسیم تول کر کرنا ضروری ہے، اس میں دقت ہوتی ہے تو اس کے حیلے بھی نکالے جاتے ہیں۔

مثلاً سری پائے الگ کر لیتے ہیں، کلیجہ الگ کر دیا جاتا ہے، پھر کسی کے حصے میں کلیجہ ڈال دیا، کسی کے حصے میں سری پایہ ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ یہ جنس مختلف ہوگئی اس لئے مجازفۃ جائز ہوگا اور تفاضل جائز ہوگا۔

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اس حیلے کی کچھ ضرورت نہیں تھی۔ باہمی

---

[1]، [2] فیض الباری، ج: ۳ ص: ۳۴۲، ۳۴۳۔

[3] عمدۃ القاری، ج: ۹، ص: ۲۵۸۔

رضامندی اگر ہو تو مجازفۃ تقسیم کرلینا بھی جائز ہے۔اس حیلے کی ضرورت نہیں۔البتہ جہاں نزاع کا اندیشہ ہو وہاں تول کر تقسیم کرنا ضروری ہے۔وجہ یہ بیان فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک تقسیم میں منطقی موشگافی کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ تسامح پر مبنی ہے، عقد معاوضہ پر نہیں۔کوئی شخص بھی اس کو عقد معاوضہ نہیں سمجھتا بلکہ تسامح اور باہمی مواسات کے طور پر یہ کام ہوتا ہے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں اور جس طرح امام بخاری رحمہ اللہ **"شرکت فی النهد"** کر رہے ہیں تو اسی طریقے سے اس میں بھی ہو سکتی ہے۔البتہ جہاں معمولی سے نزاع کا بھی اندیشہ ہو وہاں یہ عقد معاوضہ بن جائے گا اور عقد معاوضہ بن جانے کے نتیجے میں وزناً تقسیم کرنا ضروری ہوگا۔

یہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنا خیال ظاہر فرمایا اگرچہ ہماری ساری کتابوں میں یہ لکھا ہے کہ مجازفۃ ناجائز ہے، وزن کرکے دینا ضروری ہے۔

آگے فرماتے ہیں میں جو یہ کہہ رہا ہوں کہ تقسیم کیلی اور وزن بھی مجازفۃ ہو سکتی ہے۔وہ اس وجہ سے کہہ رہا ہوں کہ مسلمانوں نے نہد کے اندر کوئی حرج نہیں دیکھا۔

(نہد سے مراد وہی ہے کہ لوگ اپنے اپنے کھانے لے آئے اور اکٹھے کرکے سب نے مل کر کھالیا۔)

"أن يأكل هذا بعضا و هذا بعضا" کہ یہ کچھ کھالے اور دوسرا کچھ کھالے اس پر بھی کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔**"و كذلك مجازفة"** کہتے ہیں کہ سونے اور چاندی کے اندر بھی مجازفۃ جائز ہے۔

سونا، چاندی کا معنی یہ ہے کہ ایک طرف سونا ہو اور ایک طرف چاندی ہو کیونکہ جنس مختلف ہوگئی اور جنس کے مختلف ہونے کی وجہ سے تفاضل بھی جائز ہوگیا اور مجازفۃ بھی ہوگی۔

لیکن اگر ذہب کا تبادلہ ذہب سے ہو یا فضہ سے ہو تو ہم جنس ہونے کی صورت میں مجازفۃ جائز نہیں۔

"والقران فی التمر" اور کھجوروں کے اندر قران کے سلسلے میں یعنی بہت ساری کھجوریں رکھی ہوئی ہیں اور بہت سارے لوگ بیٹھ کر کھا رہے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا ایک کھجور کھاؤ ایک ساتھ دو مت کھاؤ۔

اس کے بارے میں فقہاء فرماتے ہیں کہ یہ اس وقت ہے جب دوسرے کی دل شکنی کا اندیشہ ہو لیکن جہاں دوسرے کی طرف سے اجازت ہو، وہاں قران بھی جائز ہے۔معلوم ہوا کہ ان معاملات میں تسامح ہے، یہ عقود معاوضہ نہیں ہیں۔اس واسطے ان کے اندر تسامح کرنا ضروری ہے۔[۴]

۲۴۸۳ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف : أخبرنا مالك ،عن وهب بن كيسان ،عن جابر ابن عبدالله رضى الله عنهما أنه قال : بعث رسول الله ﷺ بعثا قبل الساحل ،فأمر عليهم أبا عبيدة بن الجراح وهم ثلاثمائة وأنا فيهم ،فخرجنا حتى إذا كنا ببعض الطريق فَنِيَ الزاد.

---

۴ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۳۹۔

فأمر أبو عبيدة بأزواد ذلک الجيش فجمع ذلک كله ،فكان مزودی تمر .فكان يقوتنا كل يوم قليلا قليلا حتى فنى ، فلم يكن يصيبنا إلا تمرة تمرة، فقلت : وما تغنى تمرة؟ فقال: لقد وجدنا حين فنيت .قال: ثم انتهينا إلى البحر فإذا حوت مثل الظرب فأكل منه ذلک الجيش ثماني عشرة ليلة ثم أمر أبو عبيدة بضلعين من أضلاعه فنصبا ثم أمر براحلة فرحلت ثم مرت تحتهما فلم تصيبهما .[۲۹۸۳، ۴۳۶۰ـ۴۳۶۲، ۵۴۹۳، ۵۴۹۴] [۵]

یہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے، اس میں وہی مواسات کا مسئلہ ہے یعنی یہ عقد معاوضہ نہیں تھا، کوئی ایسا حکم نہیں تھا کہ جو راضی ہو یا ناراض ہو ضرور کیا جائے، وہ تو سب ایک مشکل میں مبتلا ہیں، فقر و فاقہ میں ہیں، تو حکم دیا کہ سب جمع کرلو اور تھوڑا تھوڑا کر کے کھاؤ، یہ باہمی رضامندی سے ایک انتظام کیا گیا۔

امام بعض اوقات جبری فریضہ عائد کرسکتا ہے

مسئلہ یہ ہے کہ اگر ملک میں آدھے آدمی بھوکے ہیں تو امام لازم کرسکتا ہے کہ ہر آدمی اپنے ساتھ ایک آدمی کو کھلائے، یعنی لازمی اور ناگزیر حالات جس میں لوگوں کی جان جانے کا اندیشہ ہو، وہاں امام جبری طور پر بھی کوئی فریضہ عائد کرسکتا ہے۔

۲۴۸۴ ـ حدثنا ابن مرحوم: حدثنا حاتم بن إسماعيل ،عن يزيد بن أبيي عبيد ، عن سلمة رضی الله عنها قال: خفت أزواد القوم وأملقوا فأتوا النبی ﷺ فی نحر إبلهم فأذن لهم ، فلقيهم عمر فأخبروه فقال : مابقاؤكم بعد إبلكم ؟ فدخل على النبی ﷺ فقال : يا رسول الله ، ما بقاؤهم بعد إبلهم ؟ فقال رسول الله ﷺ : ((ناد فی الناس يأتون بفضل أزوادهم)). فبسط لذلک نطع و جعلوه على النطع فقام رسول الله ﷺ فدعا و برک عليه، ثم دعاهم بأوعيتهم فاحتثى الناس حتى فرغوا ثم قال رسول الله ﷺ : ((أشهد أن لا إله إلا الله وأنی رسول الله ﷺ)).[أنظر : ۲۹۸۲] [۶]

---

[۵] وفی صحيح مسلم ،كتاب الصيد والذبائح ومايؤكل من الحيوان ، باب اباحة ميتات البحر ، رقم : ۳۵۷۶ـ ۳۵۸۰،وسنن الترمذی ،كتاب صفة القيامة والرقائق والورع من رسول الله ، باب منه ، رقم : ۲۳۹۹، وسنن النسائی ، كتاب الصيد والذبائح ، باب ميتة البحر ، رقم :۴۲۷۶، ۴۲۷۹،وسنن ابن ماجة ،كتاب الزهد ، باب معيشة أصحاب النبی ﷺ ، رقم : ۴۱۴۹، ومسند احمد ، باقی مسند المكثرين ، باب مسند جابر بن عبدالله ، رقم : ۱۳۷۳۸، ۱۳۷۶۸، ۱۳۷۹۵، ۱۳۸۱۷، ۱۴۵۱۷، وموطأمالک ، كتاب الجامع ، باب جامع ماجاء فی الطعام والشراب ، رقم:۱۴۵۶، وسنن الدارمی ، كتاب الصيد ، باب فی صيد البحر ، رقم :۱۹۲۷ .

[۶] وفی صحيح مسلم ، كتاب اللقطة ، باب استحباب خلط الازواد إذا قلت والمؤاساة فيها ، رقم : ۳۲۵۹.

حضرت سلمہ بن الاکوع رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ **"خفت ازوا دالقوم"** ایک مرتبہ ایک سفر میں قوم کے پاس جو زادراہ تھا وہ ختم ہوگیا اور لوگ مفلس ہوگئے۔ تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے کہ یا رسول اللہ! کھانے کو کچھ نہیں تو کیا جن اونٹوں پر سوار ہو کے جا رہے ہیں ان میں سے ایک ایک اونٹ رفتہ رفتہ قربان کریں اور کھائیں؟ **"فأذن لهم"** آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجبوری ہے کھالو **"فلقيهم عمر رضی اللہ عنہ"** حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی تو لوگوں نے بتایا کہ ہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اونٹ ذبح کرنے کی اجازت لے لی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب سارے اونٹ ذبح کر کے کھا جاؤ گے تو دنیا میں کیسے رہو گے؟ جب اونٹ ختم ہوگئے تو تم کیسے باقی رہو گے؟ **"فدخل على النبي صلی اللہ علیہ وسلم"** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر سارے اونٹ کٹ گئے تو ہم کیسے رہیں گے؟

ایک معجزہ کا تذکرہ (کھانے میں برکت ہونا)

" فقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم " آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں میں اعلان کردو کہ جس کے پاس جو کچھ بھی تھوڑا بہت بچا ہو وہ سب لے آئے، ایک دسترخوان بچھا دیا گیا۔

" فقام رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم فدعا و برک عليه"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے برکت کی دعا فرمائی اور کہا کہ اپنے اپنے برتن لے آؤ۔ لوگوں نے مٹھیاں بھر بھر کے لینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سب فارغ ہوگئے، تھوڑے سے زاد راہ میں اتنی برکت ہوگی کہ وہ پورے لشکر کے لئے کافی ہوگیا۔

تو یہاں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکٹھا جمع کرنے کا حکم دیا۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ علیہ نہد پر استدلال کر رہے ہیں۔

۲۴۸۵ ـ حدثنا محمد بن يوسف : حدثنا الأوزاعي : حدثنا أبو النجاشي قال: سمعت رافع بن خديج رضی اللہ عنہ قال: ((كنا نصلي مع النبي صلی اللہ علیہ وسلم العصر فننحر جزوراً . فتقسم عشر قسم ، فنأكل لحما نضيجا قبل أن تغرب الشمس)). [۷]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہم عصر کی نماز پڑھتے۔ پھر ایک اونٹ ذبح کر کے اس کے دس حصے کرتے اور پھر ہم اس کا پکا پکا گوشت غروب سے پہلے کھاتے۔

شافعیہ کا استدلال

اس سے شافعیہ عصر کے مثل اول پر ہونے پر استدلال کرتے ہیں کہ اگر عصر مثل ثانی پر ہو تو پھر اتنا وقت نہیں ہوسکتا کہ اس میں یہ سارا دھندہ کیا جاسکے۔ [۸]

---

۷ صحیح مسلم ، كتاب المساجد و مواضع الصلوة ، باب استحباب التكبير بالعصر ، رقم : ۹۹۰ .

۸ وعند الشافعي ، من حديثه عن ابراهيم : لم نخرج الخ...... عمدة القاری ، ج: ۴ ، ص: ۷۸ .

حنفیہ کی طرف سے جواب

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر وقت میں برکت ہو تو سب کچھ ہو سکتا ہے اور بے برکتی ہو تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔[۹]

۲۴۸۶ ۔ حدثنا محمد بن العلاء : حدثنا حماد بن أسامة ، عن بريد ، عن أبي بردة ، عن أبي موسى قال : قال النبي ﷺ : ((إن الأشعريين إذا أرملوا في الغزو أو قل طعام عيالهم بالمدينة جمعوا ما كان عندهم في ثوب واحد ثم اقتسموه بينهم في إناء واحد بالسوية، فهم مني وأنا منهم)). [۱۰]

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اشعری لوگ جب جہاد کے دوران مفلس ہو جاتے ہیں اور مدینہ منورہ میں جب ان کے گھر والوں کے لئے کھانا کم ہو جاتا ہے تو جو کچھ ان کے پاس ہوتا ہے سب ایک کپڑے میں جمع کر لیتے ہیں اور پھر آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔

آپ ﷺ نے ان کے طریقے کو پسند کرتے ہوئے فرمایا **"فهم مني وأنا منهم"** کہ وہ مجھ سے ہیں اور میں ان سے ہوں۔ یعنی یہ بڑا اچھا طریقہ ہے اور مسلمانوں کو ضرورت کے وقت ایسا ہی کرنا چاہئے، تو یہ بھی نھد ہوا۔

(۳) باب قسمة الغنم

۲۴۸۸ ۔ حدثنا علي بن الحكم الأنصاري : حدثنا أبو عوانة ، عن سعيد بن مسروق ، عن عباية بن رفاعة بن رافع بن خديج ، عن جده قال : كنا مع النبي ﷺ بذي الحليفة . فأصاب الناس جوع فأصابوا إبلا و غنما . قال : و كان النبي ﷺ في أخريات القوم فعجلوا و ذبحوا و نصبوا القدور ، فأمر النبي ﷺ به لقدور فأكفئت . ثم قسم فعدل عشرة من الغنم ببعير فند منها بعير فطلبوه فأعياهم . و كان في القوم خيل يسيرة فأهوى رجل منهم بسهم فحبسه الله . ثم قال : ((إن لهذه البهائم أوابد كأوابد الوحش فما غلبكم منها فاصنعوا به هكذا)) ، فقال جدي : إنا نرجو ۔ أو نخاف ۔ العدو غدا وليست معنا مدى ، أفنذبح بالقصب ؟ قال : ((ما أنهر الدم ، و ذكر اسم الله عليه فكلوه ، ليس السن و الظفر ، وسأحدثكم عن ذلك : أما السن فعظم وأما الظفر فمدى الحبشة)) . [أنظر : ۲۵۰۷ ،

---

[۹] قلت : هذه لبيان جواز التأخير ، (عمدة القاري ، ج : ۴ ص : ۷۸)

[۱۰] وفي صحيح مسلم ، كتاب فضائل الصحابة ، باب من فضائل الاشعريين ، رقم : ۴۵۵۶ .

۵۵۴۴، ۵۵۴۳، ۵۵۰۹، ۵۵۰۳، ۵۴۹۸، ۳۰۷۵] [11]

حضرت رافع بن خدیج ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ذوالحلیفہ میں تھے (یہ ذوالحلیفہ میقات نہیں ہے بلکہ کوئی اور جگہ ہے) لوگوں کو بھوک لگ گئی۔ مال غنیمت ملا جس میں کچھ اونٹ اور کچھ بکریاں تھیں۔

"وکان النبی ﷺ فی أخریات القوم" حضور اکرم ﷺ پیچھے رہ گئے تھے اور صحابۂ کرام ﷺ جن کو یہ اونٹ وغیرہ ملے تھے وہ آگے تھے انہوں نے جلدی جلدی ان اونٹوں اور بکریوں کو ذبح کر دیا اور پکانے کے لئے دیگ چڑھا دیئے۔

اب یہ مال غنیمت تھا اور مال غنیمت میں بغیر تقسیم کے کسی کے لئے بھی تصرف کرنا جائز نہیں ہوتا۔ چاہئے یہ تھا کہ جمع کرتے اور حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں لاتے۔ آپ ﷺ تقسیم فرماتے' اس کے بعد جو چاہتے کرتے، پکاتے لیکن یہ سب کارروائی پہلے کر لی گئی۔

آپ ﷺ نے جب یہ دیکھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جتنی دیگیں پکائیں سب انڈیل دو۔

علماء فرماتے ہیں کہ **"اکفئت"** سے مراد یہ ہے کہ اس کا گوشت الگ الگ کر کے پھر اس کی تقسیم کیجئے ورنہ یہ بات حضور اکرم ﷺ سے بعید ہے کہ اتنی بڑی مقدار میں اتنے سارے گوشت کو ضائع کر دیں۔ لہٰذا اس کی یہ تفسیر کی گئی ہیں کہ اونڈھی کر دی گئیں تا کہ گوشت جمع ہو جائے اور جمع ہونے کے بعد شرعی قاعدے کے مطابق تقسیم کیا جائے۔[12]

"ثم قسم" چنانچہ آپ ﷺ نے یہی فرمایا کہ دس بکریوں کو ایک اونٹ کے برابر قرار دیا۔

امام اسحاق رحمہ اللہ کا استدلال

اس سے امام اسحاق رحمہ اللہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ اونٹ میں دس حصے ہو سکتے ہیں۔[13]

لیکن جمہور کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے تقسیم غنائم کے اندر برابر قرار دیا۔ تقسیم اضحیہ میں یہ بات نہیں ہے۔[14]

---

[11] وفی صحیح مسلم ،کتاب الأضاحی ، باب جواز الذبح بکل ما انهر الدم الا انس والظفر وسائر العظام ، رقم : ۳۶۳۸ ، وسنن الترمذی ، کتاب الاحکام والفوائد ، باب ماجاء فی الذکاۃ بالقصب وغیرہ ، رقم : ۱۴۱۱ ، ۱۴۱۲ ، وسنن النسائی ، کتاب الصید والذبائح ، باب الانسیة تستوحش ، رقم : ۴۲۲۳ ، وکتاب الضحایا ، باب النهی عن الذبح بالظفر ، رقم: ۴۳۲۷ ، ۴۳۲۸ ، ۴۳۳۳ ، ۴۳۳۴ ، وسنن أبی داؤد، کتاب الضحایا ، باب فی الذبیحة بالمروۃ ، رقم :۲۴۳۸ ، وسنن ابن ماجة ، کتاب الأضاحی ، باب کم تجزیٔ من الغنم عن البدنة ، رقم :۳۱۲۸ ، وکتاب الذبائح ، باب ذکاۃ الناد من البهائم، رقم :۳۱۷۴ ، ومسند احمد، مسند المکیین ، باب حدیث رافع بن خدیج ، رقم :۱۵۲۴۵ ، ۱۵۲۵۲ ، ۱۶۶۲۴ ، ۱۶۶۴۵ ، وسنن الدارمی ، کتاب الأضاحی ، باب فی البهیمة اذا ندت ، رقم : ۱۸۹۵ .

[12] فیض الباری ، ج :۳ ، ص : ۳۴۳ .

[13]، [14] فیض الباری ، ج :۳ ، ص : ۳۴۳ .

"**فندمنها بعير**" ان میں سے ایک (بڑے میاں) اونٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ "**فطلبوه**" صحابہ کرام ﷺ نے اس کی تلاش کی۔ اس نے ان کو تھکا مارا (تھکا دیا) یعنی وہ ہاتھ نہ آیا۔ "**وكان في القوم**" کچھ گھوڑے بھی تھے۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے گیا اور دور سے ایک تیر مارا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اونٹ کو مار دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کو تیر لگا اور وہ وہیں گر گیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ "**إن هذه البهائم**" ان بہائم میں بعض اس طرح بھگوڑے قسم کے ہوتے ہیں جو یہ کام کریں ان کے حق میں یہی کر سکتے ہو۔

اس سے فقہاء کرام نے استدلال کیا ہے کہ جن جانوروں کی ذکاۃ اختیاری ہوتی ہے اگر وہ قابو سے باہر ہو جائیں تو ذکاۃ اضطراری بھی جائز ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ یہ حدیث "**كتاب الذبائح والصيد**" میں آئے گی، وہاں کلام ہوگا۔

(۴) باب القران في التمر بين الشركاء حتى يستأذن أصحابه

۲۴۸۹ ـ حدثنا خلاد بن يحيى : حدثنا سفيان : حدثنا جبلة بن سحيم قال: سمعت ابن عمر رضي الله عنهما يقول :((نهى النبي ﷺ أن يقرن الرجل بين التمرتين جميعاً حتى يستأذن أصحابه)). [راجع : ۲۴۵۵]

۲۴۹۰ ـ حدثنا أبو الوليد: حدثنا شعبة عن جبلة قال :كنا بالمدينة فأ صابتنا سنة فكان ابن الزبير يرزقنا التمر. وكان ابن عمر يمر بنا فيقول : لا تقرنوا فان النبي ﷺ نهى عن الأقران إلا أن يستأذن الرجل منكم أخاه. [راجع : ۲۴۵۵]

دسترخوان پر بدتہذیبی نہ ہو

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے اس بات سے منع فرمایا ہے کہ کوئی شخص دو کھجوروں کے درمیان جمع کرے، یہاں تک کہ وہ اپنے اصحاب سے اجازت نہ لے لے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر ایک برتن میں بہت ساری کھجوریں رکھی ہوئی ہیں اور کھانے والے ایک سے زیادہ ہیں تو ہر ایک کو چاہئے کہ ایک ایک اٹھا کر کھائے۔ دو دو، تین تین اٹھا کر کھانے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے کیونکہ اس پلیٹ میں جو کھجوریں ہیں وہ سارے حاضرین کے لئے ہیں تو دوسروں کا خیال نہ کر کے زیادہ خود کھالینا یہ ادب کے خلاف ہے اور جائز نہیں ہے۔

یہ حکم اگرچہ صرف کھجوروں کے بارے میں دیا گیا ہے لیکن اس عموم میں ہر وہ چیز داخل ہے جو بہت سے

آدمیوں کے درمیان مشترک ہو اور بہت سے لوگوں کے لئے رکھی گئی ہو اس میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک شخص اس میں سے بہت چیز لے لے اور دوسرے کے لئے کچھ نہ بچے یا بچے تو بہت کم بچے۔

یہ معاملہ آج کل ان دعوتوں میں بہت پیش آتا ہے جہاں کھانا اکٹھا رکھا ہوتا ہے اور سب لوگ خود اپنا اپنا کھانا لے کر کھاتے ہیں۔ وہاں پر بھی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ بہت سارا کھانا اپنے برتن میں انڈیل لیتے ہیں۔ یہ دیکھے بغیر کہ باقی ماندہ دوسرے لوگوں کے لئے کچھ بچے گا یا نہیں بچے گا؟ اور کتنا بچے گا؟ تو یہ بھی قران کے اندر داخل ہے اور ناجائز ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دیکھے کہ دستر خوان پر کتنے آدمی بیٹھے ہیں اور کھانا کتنا ہے اور اسی تناسب سے لیں تاکہ کھانا سب کو مل جائے اور اگر اپنی اپنی پلیٹ بھر لیں اور دوسروں کے لئے نہ چھوڑیں تو یہ بدتہذیبی کی بات ہے۔ اس سے حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔[۱۵]

(۵) باب تقويم الأشياء بين الشركاء بقيمة عدل

۲۴۹۱ ـ حدثنا عمران بن ميسرة : حدثنا عبدالوارث : حدثناأيوب ، عن نافع ، عن ابن عمر رضى الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: ((من أعتق شقصا له من عبد ـ أو شرك أوقال: نصيبا. وكان له ما يبلغ ثمنه بقيمة العدل فهو عتيق وإلا فقد عتق منه ما عتق)).قال: لا أدرى قوله:((عتق منه ما عتق)) قول من نافع أو فى الحديث عن النبى ﷺ؟. [انظر : ۲۵۰۳ ، ۲۵۲۱ - ۲۵۲۵]

۲۴۹۲ ـ حدثنا بشر بن محمد : أخبرنا عبد الله : أخبرنا سعيد بن أبى عروبة ، عن قتادة ، عن النضر بن أنس ، عن بشيربن نهيك ، عن أبى هريرة ؓ عن النبى ﷺ قال:((من أعتق شقيصا من مملوكه فعليه خلاصه فى ماله. فإن لم يكن له مال، قُوِّمَ المملوك قيمة عدل،ثم استسعى غير مشقوق عليه)).[أنظر : ۲۵۰۴،۲۵۲۶، ۲۵۲۷]

(۶) باب هل يقرع فى القسمةو الا ستهام فيه؟

۲۴۹۳ ـ حد ثنا أبو نعيم: حدثنا زكريا قال: سمعت عامرا يقول: سمعت النعمان ابن بشير رضى الله عنهما عن النبىﷺ قال:((مثل القائم على حدود الله و الواقع فيها كمثل قوم استهموا على سفينة، فاصاب بعضهم أعلاها و بعضهم اسفلها، فكان الذين فى اسفلها إذا استقوا من الماء مروا على من فوقهم فقالوا: لوأنا خرقنا فى نصيبنا خرقاولم

---

۱۵ عمدة القارى ، ج :۹ ، ص : ۲۰۶،۲۷۱.

نؤذ من فوقنا' فإن يتركوهم و ما أرادوا هلكوا جميعاً ' و إن أخذوا على أيديهم نجوا ونجوا جميعاً)) ۔ [أنظر: ۲۶۸۶] [۱۶]

کیا تقسیم کے دوران قرعہ اندازی کرنا جائز ہے؟ اور استہام کے معنی بھی قرعہ اندازی کے ہیں۔ اگر تیر کے ذریعے کی جائے تو اس کو استہام کہتے ہیں۔

قرعہ اندازی اور حنفیہ

حنفیہ کے نزدیک اس میں حکم شرعی یہ ہے کہ قرعہ حقوق کو ثابت کرنے کے لئے کافی نہیں ہے یعنی یہ ثابت کرنے کے لئے کہ آیا فلاں شخص حقدار ہے یا نہیں؟ اس معاملے میں قرعہ اندازی جائز نہیں اور قرعہ سے کسی کا حق ثابت یا ساقط نہیں ہوتا۔

البتہ اگر حقوق ثابت ہوں اور صرف تعیین کا سوال ہو، کئی حصے ہیں اور قیمت میں مساوی ہیں، صرف اتنا طے کرنا ہے کہ کون سا حصہ کس کو دیا جائے؟ اس وقت قرعہ اندازی جائز ہے۔

جیسے ایک گھر تقسیم کر رہے ہیں اس میں چار شرکاء ہیں، چار مساوی حصے بنا دیئے اور شرکاء بھی مساوی حصہ دار ہیں۔ اب کون سے شریک کو کون سا حصہ دیا جائے؟ اس میں اگر وہ باہمی رضامندی سے خود طے کرلیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر باہمی رضامندی نہ ہو سکے تو قرعہ اندازی کر سکتے ہیں تعیین حصہ کے لئے نہ کہ حقوق کے اثبات کے لئے۔ [۱۷]

"نہی عن المنکر" کی اہمیت

یہ حدیث بھی اسی پر دلالت کرتی ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ **"مثل القائم على حدود الله"**.

اس شخص کی مثال جو اللہ کی حدود پر قائم ہو یعنی معصیتوں سے اجتناب کرتا ہو اور اس شخص کی مثال جو حدود اللہ میں واقع ہو جائے یعنی معصیتوں کا ارتکاب کرے، ان کی مثال ایسی ہے **"کمثل قوم"** کہ ایک قوم کو کشتی میں بیٹھنا تھا۔ اب کون کشتی کے اوپر والے حصے میں بیٹھے اور کون نیچے والے حصے میں بیٹھے اس پر قرعہ اندازی کی۔

"فاصاب" بعض کے حصے میں اوپر والا حصہ آیا اور بعض کے حصے میں نیچے والا حصہ آیا۔ تو نیچے والے لوگ جب پینے وغیرہ کے لئے پانی لینا چاہتے تو اوپر جاتے اور سمندر سے پانی لیتے۔

---

۱۶ وفي سنن الترمذي ، كتاب الفتن عن رسول الله، باب منه ، رقم : ۲۰۹۹ ، ومسند احمد ، اول مسند الكوفيين ، باب حديث النعمان بن بشير عن النبي ﷺ ، رقم : ۱۷۶۳۸ ، ۱۷۶۴۷ ، ۱۷۶۵۳ ، ۱۷۶۸۵ .

۱۷ عمدة القاري ، ج:۹ ص ، : ۲۷۹ ، ۲۸۰ .

"فقالوا لوأنا خرقنا فی نصیبنا" انہوں نے سوچا کہ ہمارے، اُوپر جانے سے اُوپر والوں کو تکلیف ہوتی ہے ان کو ہم تکلیف نہ پہنچائیں بلکہ نیچے سے سوراخ کر کے وہاں سے پانی لے لیں، تو اگر اوپر والے ان کو اپنے ارادہ پر عمل کرنے دیں یعنی کشتی کے اندر سوراخ کرنے دیں تو اس طرح سب ہلاک ہو جائیں گے اور اگر ان کے ہاتھ پکڑ لیں کہ بھائی ایسی حرکت نہ کرنا، نیچے سوراخ مت کرنا تو وہ بھی نجات پالیں گے اور اوپر والے بھی۔

تو مثال دینے کا مقصد یہ ہے کہ اگر غلط کام کا ارادہ نیچے والوں نے کیا اوپر والوں نے نہیں کیا وہ تو قائم علی حدود اللہ ہیں لیکن اگر اوپر والے ان کا ہاتھ نہیں پکڑیں گے ان کو غلط کام سے نہیں روکیں گے تو یہ بھی غرق ہو جائیں گے حالانکہ انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔

معلوم ہوا کہ اگر دوسرے لوگ معصیت کر رہے ہوں تو جو لوگ معصیت نہیں کر رہے ہیں ان کو چاہئے کہ ان کا ہاتھ پکڑیں یا ان کو سمجھائیں کیونکہ ان کی معصیت کی وجہ سے خود سے ان پر بھی عذاب آسکتا ہے۔ جب اللہ کا عذاب آتا ہے تو صرف ظالم پر نہیں آتا بلکہ ان لوگوں پر بھی آتا ہے جنہوں نے ان کو ظلم سے نہیں روکا۔

ترجمۃ الباب سے مناسبت

چونکہ یہاں قرعہ اندازی کا ذکر تھا کہ قرعہ اندازی کے ذریعے کشتی کے اوپر اور نیچے والے حصے لئے۔ اس لئے امام بخاریؒ یہ حدیث یہاں لائے ہیں۔

(۷) باب شرکة الیتیم وأهل المیراث

۲۴۹۴ ـ حدثنا عبد العزیز بن عبد الله العامری الأویسی : حدثنا إبراهیم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب قال : أخبرنی عروة أنه سأل عائشة رضی الله عنها . وقال اللیث : حدثنی یونس عن ابن شهاب قال : أخبرنی عروة بن الزبیر أنه سأل عائشة رضی الله عنها عن قولِ الله تعالی ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَا تُقْسِطُوْا ﴾ إلی قوله : ﴿ وَ رُبٰعَ ﴾ [۱۸] فقالت : یا ابن أختی، هی الیتیمة تکون فی حجر ولیها تشارکه فی ماله فیعجبه مالها وجمالها فیرید ولیها أن یتزوجها بغیر أن یقسط فی صداقها فیعطیها مثل ما یعطیها غیره، فنهوا أن ینکحوهن إلا أن یقسطوا لهن ویبلغوا بهن أعلی سنتهن من الصداق، وأمروا أن ینکحوا ما طاب لهم من النساء سواهن. قال عروة : قالت عائشة : ثم إن الناس استفتوا رسول الله ﷺ بعد هذه الآیة فأنزل الله : ﴿ وَ یَسْتَفْتُوْنَکَ فِی النِّسَاءِ ﴾ إلی قوله: ﴿ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْکِحُوْهُنَّ ﴾ [۱۹] والذی ذکر الله أنه یتلی علیکم فی الکتاب الآیة الأولی

۱۸ [النساء:۳] ۱۹ [النساء: ۱۲۷]

التی قال فیها : ﴿ وَ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ لا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتَامىٰ فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ ﴾ قالت عائشة : وقول الله فی الآیة الأخرى : ﴿ وَ تَرْغَبُوْنَ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ ﴾ هی رغبة أحدكم يتيمته التی تكون فی حجره حين تكون قليلة المال والجمال ‘فنهوا أن ينكحوا ما رغبوا فيی مالها وجمالها من يتامى النساء إلا بالقسط من أجل رغبتهم عنهن.
[أنظر : ۲۷۶۳، ۳۵۷۳، ۴۵۷۳، ۴۵۷۴، ۴۶۰۰، ۵۰۶۴، ۵۰۹۲، ۵۰۹۸، ۵۱۲۸، ۵۱۳۱، ۵۱۴۰، ۶۹۶۵] [20]

یہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے اس میں انہوں نے قرآن کریم کی ایک آیت کی تفسیر بیان فرمائی ہے اور وہ یہ ہے:

وَ إِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ. [21]

ترجمہ: اور اگر ڈرو کہ انصاف نہ کرسکو گے یتیم لڑکیوں کے حق میں تو نکاح کر لو جو اور عورتیں تم کو خوش آویں دو دو، تین تین، چار چار

"فانکحوا ما طاب لکم" کے معنی تو واضح ہیں کہ چار عورتوں سے نکاح جائز ہے لیکن اس کے شروع میں جو الفاظ ہیں **"وإن خفتم"** اس کا ایک خاص پس منظر ہے جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے اس حدیث میں بیان فرمایا۔ یعنی یہ جو کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں یتامی کے بارے میں اندیشہ ہو کہ انصاف نہیں کرو گے تو پھر نکاح کرو، دو دو، تین تین، چار چار عورتوں سے۔ حضرت عائشہؓ اس کا پس منظر بتا رہی ہیں۔

آیت کریمہ کا مطلب

بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ ایک لڑکی کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ نہ اس لڑکی کا والد ہے، نہ دادا ہے، نہ بھائی ہے اور نہ چچا۔ تو اس صورت میں اس لڑکی کا ولی ابن العم یعنی چچازاد بھائی بنتا ہے۔ جب چچازاد بھائی ولی بن گیا تو وہ اس کے مال کا بھی ولی ہے اور اس کے نفس کا بھی ولی ہے۔ لڑکی کے ماں باپ نے اچھا خاصا مال چھوڑا ہے اور لڑکی خوبصورت بھی ہے تو بعض اوقات یہ ابن عم ایسا کرتے کہ دیکھتے تھے کہ یہ لڑکی جو ہمارے زیر ولایت ہے یہ خوبصورت بھی ہے اور اس کے پاس مال بھی زیادہ۔ تو وہ یہ چاہتے کہ اس سے نکاح کر لیں۔ اس کی خوبصورتی اور اس

---

[20] وفی صحیح مسلم ، کتاب التفسیر ، رقم ۵۳۳۵-۵۳۳۸ ، وسنن النسائی ، کتاب النکاح ، باب القسط فی الاصدقة، رقم : ۳۲۹۴ ، وسنن ابی داؤد ، کتاب النکاح ، باب مایکره أن یجمع بینهن من النساء ، رقم : ۱۷۷۱.
[21] [النساء : ۳]

کے مال کی وجہ سے بھی اور چونکہ وہ خود اپنے زیر ولایت ہوتی تھی تو مہر مقرر کرنے کا حق ولی کو ہوتا ہے اس کا مہر کم مقرر کر لیتے تھے یعنی اپنے سے نکاح کیا اور مہر کم مقرر کیا۔ اگر اس جیسی لڑکی کا کسی دوسرے سے نکا کیا جاتا تو اس صورت میں جتنا مہر مقرر ہوتا اس سے کم مہر مقرر کر کے اپنے آپ سے نکاح کر لیتے۔

قرآن کریم نے اس طریقۂ کار پر نکیر فرمائی اور فرمایا کہ اگر تمہیں ان یتیم لڑکیوں کے بارے میں اندیشہ ہو کہ انصاف سے کام نہیں لو گے یعنی ان کا مناسب مہر مقرر نہیں کرو گے تو پھر ان سے نکاح نہ کرو بلکہ دوسری عورتوں سے نکاح کرو جو تمہارے لئے حلال ہیں۔ دو دو، تین تین اور چار چار سے بھی نکاح حلال ہے تو تقدیری عبارت یوں ہے:

" وَ إِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا
مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ".

تشریح حدیث

حضرت عروہ رضی اللہ عنہ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اللہ تعالیٰ کے قول **"وإن خفتم أن لا تقسطوا"** کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا یا ابن اختی میرے بھتیجے اس کا پس منظر یہ ہے کہ یتیمہ جو اپنے ولی کے زیر سر پرستی ہوتی تھی اور اس کے مال میں شریک ہوتی تھی اس کا اپنا مال بھی ہوتا تھا جو اس کو اپنے والدین سے ورثے میں ملا اور ولی کا مال بھی ہوتا تھا تو دونوں مل کر اس میں شریک ہو جاتے تھے۔ ولی کو لڑکی کا مال و جمال پسند آتا تھا **"فیرید"** اب اس سے شادی کرنا چاہتا تھا بغیر اس کے کہ انصاف کرے مہر کے معاملے میں **"فیعطیها"** اور مہر جتنا کہ دوسرے دیتے **"فنهوا أن ینکحوهن"** ان کو ایسی یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے سے منع کر دیا گیا۔ **"إلا ان یقسطوا"** مگر وہ ان سے انصاف کریں اور ان کو کہا گیا کہ **"صداق"** کا جو اعلیٰ طریقہ ہے وہ ان کے ساتھ اختیار کریں جتنا مہر دوسرے دیتے ہیں اتنا مہر دیں۔

"وأمر" اور حکم دیا ان کے علاوہ جو عورتیں ہیں وہ ان کے لئے حلال ہیں ان سے نکاح کریں، ان یتیم لڑکیوں سے نکاح نہ کریں۔

" قال عروةؓ قالت عائشةؓ " حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس آیت کریمہ کے بعد لوگوں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا تو دوسری آیت نازل ہوئی **"ویستفتو نک فی النساء"** لوگ آپ سے عورتوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان کے بارے میں جواب دیتے ہیں **"وما یتلی علیکم"** اور تمہارے اوپر جو حکم، یتامی النساء کے بارے میں نازل کیا گیا **"الی قوله و تر غبون أن تنکحو هن"**.

"قالت عائشةؓ وقول الله" اور آگے جو یہ فرمایا **"وتر غبون أن تنکحو هن هی رغبة"** یہاں تر

غبون اعراض کرنے کے معنی میں ہے کہ تم ان سے نکاح کرنے سے اعراض کرتے ہو۔

مراد یہ ہے کسی شخص کا اپنی یتامی کے بارے میں اعراض کرنا جو اس کی زیر تربیت ہو اُن کا مال و جمال کم ہونے کی صورت میں یعنی مال و جمال کم ہو تو اس سے اعراض کرتے تھے اور اگر مال و جمال زیادہ ہوتا تو اس کی طرف رغبت کرتے تھے۔ **"فنھوا"** تو یتامی النساء سے مال و جمال کی رغبت کرتے ہوئے نکاح کرنے سے منع کیا گیا۔

"إلا بالقسط.......عنهن"۔

اس حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تفسیر نے آیت کریمہ کا مطلب بالکل واضح کر دیا کہ **"فإن خفتم"** یہ اس پس منظر میں نازل ہوئی اور آگے **"وان خفتم"** ہے اس کی جزاء **"فانکحوا ما طاب"** نہیں ہے بلکہ یہ جملہ دال بر جزاء ہے یعنی **"ان خفتم"** کی جزاء اصلاً محذوف ہے۔

اسلام میں تعددِ ازواج کا مسئلہ

آج کل بہت سے لوگ تعدد ازواج کے خلاف ہیں کہ ایک سے زائد شادیوں کو اسلام نے جائز قرار نہیں دیا اس کی اجازت نہیں دی، وہ یہ کہتے ہیں کہ **"ان خفتم أن لا تقسطوا"** کے معنی یہ ہیں کہ دو دو، تین تین اور چار چار عورتوں سے نکاح صرف اس صورت میں جائز ہے جب یتامی کے ساتھ بے انصافی کا اندیشہ ہو کیونکہ **"فانکحوا ما طاب لکم"** کو **"إن خفتم أن تقسطوا"** کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

معلوم ہوا کہ ایک سے زائد عورتوں سے نکاح اسی وقت جائز ہے جبکہ یتیموں کے ساتھ ناانصافی کا اندیشہ ہو اور اس کا مطلب وہ لوگ یہ بیان کرتے ہیں کہ یتیموں سے بے انصافی کا معنی یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں چونکہ بہت غزوات ہوئے اور اس میں بہت سے لوگ شہید ہو گئے۔ اس کی وجہ سے یتیم عورتیں زیادہ ہو گئی تھیں، مردوں کی تعداد کم اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی تو اس کی طرف اشارہ ہے کہ اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ مردوں کی تعداد کم ہے اور عورتوں کی تعداد زیادہ ہے اور تم انصاف نہیں کر سکو گے یعنی ہر عورت کے لئے کوئی مرد نہیں تلاش کر سکو گے تو پھر دو دو، تین تین، چار چار سے نکاح کر لو۔

گویا انہوں نے تعدد ازواج کی اجازت کو اس حالت کے ساتھ مخصوص کیا جب معاشرے میں مردوں کی تعداد عورتوں کے مقابلے میں کم ہو۔ آیت تعدد ازواج میں بعض متجددین نے یہ تفسیر کی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی یہ حدیث ان کے اس تاویل کی صراحتاً تردید کر رہی ہے کہ نہ تو **"تقسطوا فی الیتامی"** سے عورتوں کا زیادہ ہو جانا مراد ہے اور نہ **"ان خفتم"** کی جزاء **"فانکحوا ماطاب لکم"** ہے بلکہ اس کی اصل جزاء **"فلا تنکحوھن"** ہے اور **"فانکحوا"** کا جملہ آگے دال بر جزا

ہے۔لہٰذا اس سے ان کی تاویل کا ابطال ہوجاتا ہے۔[۲۲]

(۱۰) باب الاشتراک فی الذهب والفضة وما يكون فيه الصرف

۲۴۹۷، ۲۴۹۸ ۔ حدثني عمرو بن علي :حدثنا أبو عاصم ، عن عثمان يعني ابن الأسود قال: أخبرني سليمان بن أبي مسلم قال:سألت أبا المنهال عن الصرف يدا بيد فقال : اشتريت أنا وشريك لي شيئا يدا بيد ونسيئة،فجاء نا البراء بن عازب فسألناه فقال : فعلت أنا و شريكي زيد بن أرقم و سألنا النبي ﷺ عن ذٰلک، فقال: ((ما كان يدابيد فخذوه، و ما كان نسيئة فردوه)). [راجع: ۲۰۶۰، ۲۰۶۱]

حدیث کی تشریح

ابوالمنہال سے صرف یداً بید کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے واقعہ سنایا کہ میں نے اور میرے شریک نے کوئی چیز "یداً ، بیدٍ" خریدی تھی اور کچھ چیزیں نسیئتاً خریدی تھیں۔

ہمارے پاس حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ آئے۔ ہم نے ان سے مسئلہ پوچھا۔انہوں نے کہا کہ میں نے اور میرے شریک زید بن ارقم رضی اللہ عنہ نے اس طرح سونے ، چاندی کی کچھ چیزیں یداً بیدٍ خریدی تھیں اور کچھ نسیئتاً،تو ہم نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو یداً بیدٍ ہے وہ لے لو اور جو نسیئۃ ہے وہ ادا کردو کیونکہ سونے ، چاندی کے باہم تبادلے میں نسیئۃ جائز نہیں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا منشاء

اس حدیث کو یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ سونے ، چاندی کی تجارت میں بھی شرکت ہوسکتی ہے، جیسے ان دونوں حضرات نے تجارت میں مشارکت کی۔

(۱۱) باب مشاركة الذمي والمشركين في المزارعة

۲۴۹۹ ۔ حدثنا موسى بن إسماعيل : حدثنا جويرية بن أسماء ،عن نافع ،عن عبدالله رضي الله عنه قال : أعطى رسول الله ﷺ خيبر اليهود أن يعملوها ويزرعوها ولهم شطر مايخرج منها .[راجع : ۲۲۸۵]

---

[۲۲] تكملة فتح الملهم ، ج : ۶ ، ص : ۵۴۰ – ۵۴۲.

حدیث باب کا مطلب

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس پر استدلال کیا ہے کہ دیکھو وہ لوگ اگر چہ یہودی تھے لیکن آپ ﷺ نے ان سے مزارعت کا معاملہ فرمایا جو ایک طرح سے مشارکت ہے اگر چہ اصطلاحی مشارکت نہیں ہے لیکن فی المعنی شرکت ہے۔ یعنی فی الجملہ جو پیداوار ہے وہ آدھی تقسیم ہوتی ہے جب غیر مسلم کے ساتھ مزارعت جائز ہے تو مشارکت بھی جائز ہوگی۔

(۱۲) باب قسمة الغنم والعدل فيها

۲۵۰۰ ۔ حدثنا قتيبة بن سعيد : حدثنا الليث ، عن يزيد بن أبي حبيب ، عن أبي الخير، عن عقبة بن عامر ؓ : أن رسول الله ﷺ أعطاه غنما يقسمها على صحابته ضحا يا فبقي عتود فذكره لرسول الله ﷺ فقال :((ضح به انت)). [راجع: ۲۳۰۰]

یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ان کو تقسیم کرنے کے لئے بکریاں دی تھیں ۔ اس پر ترجمۃ الباب قائم کیا کہ بکریوں کی تقسیم اور اس میں عدل سے کام لینا۔

یہاں یہ صورتحال نہیں تھی کہ بکریاں پہلے سے بہت سارے آدمیوں کے درمیان مشترک ہوں بلکہ آپ ﷺ نے اکٹھی دیدی تھیں کہ تقسیم کر دو۔ اس طرح تقسیم کرو کہ ہر ایک کو ایک بکری دے دو۔ اب یہ ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا کہ جس شخص کو جو بکری چاہیں دیدیں۔ انہوں نے عدل سے کام لیا کہ اپنے سوا جو دوسرے لوگ تھے، ان کو اچھی اچھی بکریاں دیدیں اور ان کے پاس صرف عتود یعنی بکری کا چھوٹا سا بچہ رہ گیا۔

مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو تقسیم پر مامور کیا جائے اس کو چاہئے کہ اپنے اوپر دوسروں کا ایثار کرے، دوسروں کو ترجیح دے۔

(۱۳) باب الشركة في الطعام وغيره

"ويذكر أن رجلا ساوم شيئا فغمزه آخر فرأى عمر أن له شركة".

۲۵۰۱، ۲۵۰۲ ــ حدثنا أصبغ بن الفرج قال: أخبرني عبدالله بن وهب قال: أخبرني سعيد ، عن زهرة بن معبد ، عن جده عبدالله بن هشام و كان قد أدرك النبي ﷺ وذهبت به أمه زينب حميد إلى رسول الله ﷺ قالت :يا رسول الله ، بايعه ، فقال :((هو صغير)) ، فمسح رأسه ودعا له. وعن زهرة بن معبد أنه كان يخرج به جده عبدالله بن

هشام إلى السوق فيشترى الطعام فيلقاه ابن عمر وابن الزبير فيقولان له : أشركنا، فإن النبى ﷺ قد دعا لک بالبركة فيشركهم ، فربما أصاب الراحلة كما هى فيبعث بها إلى المنزل. [الحديث: ۲۵۰۱، أنظر: ۷۲۱۰] ؛ [الحديث: ۲۵۰۲، أنظر: ۶۳۵۳] [۲۳]

کیا شرکت کے عقد کیلئے شرکت کا لفظ ضروری ہے؟

یہ ترجمۃ الباب قائم ہے کہ شرکت طعام وغیرہ کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور آگے تعلیقاً ایک روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کے ساتھ مساومت کی یعنی کسی چیز کو خریدنے کے لئے کسی معاملے کا سودا کرنا چاہا۔ بات چیت چل رہی تھی **"فغمزه آخر"** دوسرے نے اس کو غمز کیا جو آدمی تاجر سے معاملہ کر رہا تھا کسی نے اس کا ہاتھ دبا دیا۔

غمز کے معنی ہاتھ دبانے کے ہوتے ہیں یا بعض دفعہ آنکھ کے اشارے کو بھی غمز کہتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں یہ رائے دی کہ جس شخص نے ہاتھ دبایا وہ اس شخص کے ساتھ اس شئی کی خریداری میں شریک ہو گیا۔ یعنی ہاتھ دبانے کا منشاء یہ تھا کہ لے لو ہم دونوں مل کر اس کی قیمت ادا کر دیں گے اور ہم شریک ہو جائیں گے۔

تو زبان سے نہیں کہا کہ میں بھی تمہارے ساتھ مل کر یہ چیز خریدنا چاہتا ہوں لیکن اشارہ دیدیا کہ تم یہ خریدلو اور میں بھی شریک ہو جاؤں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ کر دیا کہ اس کا غمز کرنا یہ شرکت قائم کرنے کے مترادف ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے اس بات پر استدلال فرما رہے ہیں کہ شرکت کے عقد کے لئے شرکت کا تلفظ ضروری نہیں بلکہ اشارہ اور کنایہ سے جس میں شرکت کا مفہوم ہو شرکت قائم ہو جاتی ہے۔ [۲۴]

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ کا کہنا ہے کہ محض اشارہ سے شرکت قائم نہیں ہوتی بلکہ واضح اور صریح لفظ ہونا چاہئے تب شرکت متحقق ہوگی۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا جو اثر نقل کیا ہے کہ انہوں نے اشارہ کو شرکت قرار دیا۔ حنفیہ اس کو شرکت بالتعاطی پر محمول کرتے ہیں کہ اگرچہ اشارہ سے شرکت نہیں ہوتی لیکن بعد میں دونوں نے کچھ کہے بغیر پیسے ملا لئے یا اس شئی کو

---

۲۳ وفى سنن أبى داؤد ، كتاب الخراج والإمارة والفىء ، باب ماجاء فى البيعة ، رقم : ۲۵۵۳ ، ومسند أحمد ، مسند الشاميين ، باب حديث رجل ، رقم : ۱۷۳۵۴ .

۲۴ عمدة القارى ، ج: ۹ ، ص: ۲۹۱ .

آپس میں تقسیم کرلیا تو چونکہ عملاً تقسیم کرلیا اس لئے یہ عملی شرکت ہوگئی، محض اشارہ نہیں۔

آگے روایت ہے کہ عبداللہ بن ہشام ﷺ فرماتے ہیں اور انہوں نے نبی کریم ﷺ کو پایا یعنی صحابی ہیں۔

"وذهبت به أمه" ان کی والدہ زینب بنت حمید ان کو رسول ﷺ کی خدمت میں لے گئی اور لے جا کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ان کو بیعت کرلیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ بچہ ہے۔ آپ ﷺ نے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور برکت کی دعا فرمائی۔

اب اس برکت کا نتیجہ یہ نکلا کہ زہرۃ بن معبد کہتے ہیں **"ان كان يخرج"** زہرۃ بن معبد یہ عبداللہ بن ہشام ﷺ کے پوتے ہیں جن کے سر پر نبی کریم ﷺ نے ہاتھ پھیرا تھا۔

تو کہتے ہیں کہ ان کے دادا، عبداللہ بن ہشام ﷺ ان کو بازار کی طرف لے کر جایا کرتے تھے اور بازار سے کھانا وغیرہ خریدتے تھے۔

"فيلقاه" تو عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن عمر ﷺ وہاں بازار میں ان سے ملتے اور کہتے **"اشركنا"** ہمیں بھی اپنے کاروبار میں شریک کرلو اور یہ اس لئے کہتے تھے کہ حضور ﷺ نے ان کو برکت کی دعا دی تھی۔ جب یہ بازار میں تجارت کرتے تھے تو ان کی تجارت میں بہت نفع ہوتا تھا اور برکت ہوتی تھی۔ تو کہتے تھے کہ ہمیں بھی شریک کرلو۔ کیونکہ تمہیں نبی کریم ﷺ نے برکت کی دعا دی تھی تو یہ ان کو شریک کرلیتے تھے۔

"فربما أصاب" بعض دفع نفع میں پوری پوری اونٹنی حاصل کرلیتے تھے یعنی ایک معاملہ میں اتنا نفع ہوتا کہ ایک ہی سودے میں ان کو پوری پوری اونٹنی نفع میں مل جاتی اور اسے اپنے گھر بھیج دیتے۔ اتنی برکت حاصل ہوتی تھی۔

حدیث لانے کا منشاء

یہاں یہ حدیث لانے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر اور حضرت عبد اللہ بن زبیر کہتے تھے اشرکنا ہمیں شریک کرلو اور یہ منقول نہیں یہ کہ وہ جواب میں قبلت کہتے ہوں کہ اس شرکت کو میں نے قبول کیا بلکہ صرف یہ ہے کہ **"فيشركهم"**.

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ **"إذا قال الرجل لرجل اشركني"** کہ ایک شخص دوسرے شخص سے کہے کہ مجھے شریک کرلو اور دوسرا خاموش ہوجائے تو خاموشی کو قبول سمجھا جائے گا اور اس سے شرکت متحقق ہوجائے گی اور وہ شریک ہوجائے گا۔

حنفیہ کا جواب

حنفیہ کا مسلک اور اصول یہ ہے کہ **"لا ينسب إلى ساكت قول"** یعنی ساکت کی طرف کسی قول کو منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ محض سکوت سے قبول متحقق نہیں ہوتا، جب تک زبان سے نہ کہے کہ میں قبول کرتا ہوں یا

عمل سے نہ کہے۔ محض سکوت سے شرکت متحقق نہیں ہوگی۔

اور امام بخاری رحمہ اللہ جو استدلال فرمار ہے ہیں وہ اس لئے پورا نہیں ہوتا کہ آگے لکھا ہوا ہے **"فیشرکھم"** وہ ان کو شریک کر لیتے تھے۔

اب شرکت کرنے کے دو معنی ہو سکتے ہیں یا تو یوں کہہ دیتے تھے کہ ہاں بھائی! شریک کرلیا، زبان سے کہہ دیتے تھے یا اس کو عملاً شریک کر لیتے تھے۔ دونوں صورتوں میں ہمارے ہاں شرکت متحقق ہو جاتی ہے۔تو شرکت جو متحقق ہوئی وہ ان کے فعل یا قول سے ہوئی نہ کہ محض سکوت سے۔ [۲۵]

(۱۵) باب الا شتراک فی الهدی و البدن، و إذا أشرک الر جل رجلافی هدیه بعد ما أهدی

۲۵۰۵، ۲۵۰۶ ـ حدثناأبو النعمان: حدثنا حماد بن زید: أخبر نا عبد الملک بن جریج، عن عطاء ،عن جابر وعن طاؤ س ' عن ابن عباس رضی الله عنهما قالا: قدم النبی ﷺ صبح رابعة من ذی الحجة مهلین بالحج لایخلطهم شیء ' فلما قدمنا أمرنا فجعلنا ها عمرة و أن نحل إلی نسائنا ' ففشت فی ذٰلک القالة . قال عطاء فقال جابر ـ : فیروح أحدنا إلٰی منی و ذکره یقطر منیا، ـ فقال جابر بکفه ـ فبلغ ذٰلک النبی ﷺ فقام خطیبا فقال: ((بلغنی أن أقواما یقولون کذا و کذا' والله لأنا أبرو أتقی لله منهم، ولو أنی استقبلت من أمری ماا ستدبرت' ما أهدیت ولولا أن معی الهدی لأ حللت .فقام سراقة بن مالک بن جعشم فقال: یا رسول الله، هی لنا أو للأ بد ؟ فقال:((لا ' بل للأبد)). قال: وجاء علی بن أبی طالب فقال: أحدهما یقول : لبیک بما أهل به رسول الله ﷺ، وقال الا خر: لبیک بحجة رسول الله ﷺ، فأمر النبی ﷺ أن یقیم علی إحرامه وأشرکه فی الهدی.

[راجع : ۱۰۸۵، ۱۵۵۷]

حدیث باب کا پس منظر

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام ﷺ ذی الحجہ کی چوتھی تاریخ کی صبح کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔انہوں نے حج کا احرام باندھا ہوا تھا اور ان کے ساتھ کسی اور چیز کا خلط نہیں تھا یعنی انہوں نے تنہا حج کا احرام باندھا ہوا تھا، اس کے ساتھ عمرے کا احرام نہیں باندھا تھا۔

---

[۲۵] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۴۵، وشرح الأشباه والنظائر ج: ۱، ص: ۳۸۲.

اس کا پس منظر یہ ہے کہ بہت سے صحابہ کرام ؓ افراد کا احرام باندھ کر گئے تھے، یعنی صرف حج کا احرام تھا لیکن وہاں مکہ مکرمہ پہنچ کر حضور ﷺ کو یہ خیال ہوا کہ جاہلیت کے زمانے سے یہ عقیدہ چلا آتا ہے کہ اشہر حج میں عمرہ کرنا ناجائز ہے۔ وہ لوگ اشہر حج میں عمرہ کرنے کو بالکل ہی ناجائز سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جب تک حج کا زمانہ پورا نہ گزر جائے، اس وقت تک عمرہ جائز نہیں ہوتا، ان کا مقولہ بڑا مشہور تھا کہ **"اذا بـرات"** کہ جس اونٹ پر آدمی حج کرتا ہے جب اس کی پشت کا زخم ٹھیک ہو جائے اور حج کے آثار مٹ جائیں اور صفر کا مہینہ گزر جائے تو جو عمرہ کرنا چاہے اس کے لئے عمرہ کرنا حلال ہوگا۔

تو عاشورہ میں عمرہ کرنے کو ناجائز سمجھتے تھے۔ حضور اکرم ﷺ کو وہاں پہنچ کر یہ خیال ہوا کہ اہل جاہلیت کے اس عقیدہ کی عملی تردید ضروری ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے جو حج کا احرام باندھ کر آئے تھے فرمایا کہ اب تم اس حج کے احرام کو عمرہ کا احرام بنا لو اور عمرہ کر کے حلال ہو جاؤ۔ پھر جب حج کے ایام آئیں گے تو پھر حج کا احرام باندھنا۔

گویا اس افراد کو تمتع میں تبدیل کر لو اور حج کے احرام کو عمرہ کے احرام سے بدل دو اور عمرہ کر کے حلال ہو جاؤ لیکن حضور اکرم ﷺ خود اس لئے ایسا نہیں کر سکتے تھے کہ آپ ﷺ اپنے ساتھ ہدی لے کر آئے تھے۔ جو شخص اپنے ساتھ ھدی لے کر آئے وہ قارن ہو یا متمتع، عمرہ کر کے حلال نہیں ہو سکتا۔ اس واسطے آپ ﷺ خود تو حلال نہیں ہوئے لیکن صحابہ کرام ؓ کو حلال ہونے کا حکم دیا۔

تو فرماتے ہیں کہ جب ہم مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے تو ہمیں حکم دیا۔ ہم نے اس احرام کو عمرہ کا بنا دیا اور یہ بھی جائز قرار دیا کہ ہم عمرہ کر کے حلال ہونے کے بعد اپنی خواتین سے استمتاع بھی کر سکتے ہیں۔

آپ ﷺ کے اس ارشاد کے نتیجے میں لوگوں کے اندر چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ **"قـال عـطـاء: فقال جـابـر ؓ"** حضرت جابر ؓ نے یہاں تک کہہ دیا کہ **"فـيـروح"** کیا ہم میں سے ایک شخص اس حالت میں منٰی جائے گا کہ اس کے ذکر سے منی ٹپک رہی ہوگی۔

مطلب یہ ہے کہ منٰی جانے سے ذرا پہلے تک جب وہ حلال ہوگا تو بیوی سے جماع بھی کر سکتا ہے اور جب جماع کرے گا منی ٹپکے گی۔ تو اس حالت میں ہم منٰی جائیں گے۔ یہ کہتے ہوئے حضرت جابر ؓ نے اپنے ہاتھ سے بھی اشارہ کیا۔ **"فـبـلـغ ذلـک"** آپ ﷺ کو اس بات کی اطلاع ملی تو آپ ﷺ نے خطبہ دیا فرمایا کہ **"بـلـغـنـی"** یہ جو لوگ کہہ رہے ہیں کہ جب ابھی منی ٹپک رہی ہے، اس حالت میں جانا برا لگ رہا ہے۔ ان کی یہ بات صحیح نہیں ہے۔ میں اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہوں۔

"ولـو انـی" اگر میری رائے پہلے وہ ہوتی جو بعد میں ہوئی۔ یعنی اگر شروع سے ہی میری وہ رائے

ہو جاتی جو بعد میں ہوئی ہے تو میں اپنے ساتھ ہدی لے کر نہ آتا اور اگر میرے ساتھ ہدی نہ ہوتی تو میں بھی حلال ہو جاتا۔

"فقام سراقۃ" حضرت سراقہ بن مالک ؓ کھڑے ہوئے اور انہوں نے پوچھا کہ آپ جو حکم دے رہے ہیں کہ اشہر حرم میں عمرہ کرنا جائز ہو گیا ہے۔ یہ صرف ہمارے لئے ہے یا ہمیشہ لئے ہے؟

"فقال لا بل للأبد" فرمایا ہمیشہ کے لئے اشہر حرم میں عمرہ کرنا حلال ہے۔

"قال: وجاء علی ابن أبی طالب" حضرت علی ؓ یمن میں تھے، وہاں سے آئے **"وقال أحدهما"** تو انہوں نے جو احرام باندھا تھا، باندھتے ہوئے یہ کہا تھا کہ جو احرام رسول ﷺ نے باندھا ہوگا میں بھی وہی باندھنے کی نیت کرتا ہوں کیونکہ ان کو پتہ نہیں تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے کون سا احرام باندھا ہے۔ صرف یہ کہا کہ ہم حضور ﷺ کے حج کا احرام باندھتے ہیں۔

"فأمر النبی ﷺ" آپ ﷺ نے ان کو احرام پر باقی رہنے کا حکم دیا۔ دیگر صحابہ ؓ کو تو حلال ہونے کا حکم دیا تھا لیکن انہوں نے چونکہ وہی احرام باندھا تھا جو نبی کریم ﷺ کا تھا اور حضور ﷺ ہدی لے کر آئے تھے۔ حضرت علی ؓ بھی ہدی لے کر آئے تھے۔ اس واسطے آپ ﷺ نے ان کو احرام پہ باقی رہنے کا حکم دیا۔

مقصد امام بخاری رحمہ اللہ

"وأشرکه فی الهدی" اور ہدی میں ان کو شریک کر لیا۔ یہ وہ جملہ ہے جس کی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ اس حدیث کو یہاں لائے ہیں۔ اس کو **"اشراک فی الهدی"** سے تعبیر کیا ہے کہ ایک آدمی ہدی کے اندر کئی آدمیوں کو شریک کر سکتا ہے۔

حنفیہ کا جواب

یہاں یہ بات صحیح نہیں بنتی کیونکہ اشراک فی الہدی وہ ہوتا ہے کہ ایک ہی جانور میں کئی افراد شریک ہوں اور یہاں ایسا نہیں ہوا تھا، کیونکہ حضور اقدس ﷺ جو ہدی لے کر آئے تھے وہ ان کی اپنی تھی اور حضرت علی ؓ جو ہدی لے کر آئے تھے وہ ان کی اپنی تھی۔

تو ایک جانور میں دونوں شریک نہیں تھے بلکہ دونوں کے الگ الگ جانور تھے، لہٰذا اس کو اشراک فی الہدی سے تعبیر کرنا یہ محل نظر ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ استنباط درست نہیں معلوم ہوتا۔ [۲۶]

---

۲۶ باب "الاشتراک فی الهدی والبدن" الخ هذا ایضاً لیس من الشرکة فی شئ، فان النبی ﷺ جاء ببدنه علی حدة، وجاء بها علیّ علی حدة، لم لایدری أن تلک البدن لمن کانت، علی أن الشرکة فی العین لایتصور عند الحنفیة، إلاأن یبیع الخ. (فیض الباری، ج: ۳، ص ۳۴۵).

(۱٦) باب من عدل عشرة من الغنم بجزور فی القسم

۲۵۰۷۔ حدثنی محمد: أخبرنا وکیع، ...... قال: اعجل أو أرنی ما أنھر الدم.

یعنی اگر بانس سے ذبح کرنا ہے تو چونکہ بانس ذرا سخت ہوتا ہے، اس سے اگر دیر لگاؤ گے تو جانور کو تکلیف ہوگی اس لئے جلدی سے کرلو۔

كتاب الرهن

٢٥٠٨ - ٢٥١٦

۴۸ ـ كتاب الرهن

(۱) باب في الرهن في الحضر وقول الله عز و جل:

﴿ وَ إِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوْا كَاتِباً فَرِهَانٌ مَقْبُوْضَةٌ ﴾[۱]

۲۵۰۸ ـ حدثنا مسلم بن إبراهيم: حدثنا هشام، حدثنا قتادة، عن أنس ﷺ قال: ولقد رهن رسول الله ادرعه بشعير و مشيت إلى النبي ﷺ بخبز شعير و إهالة سنخة ولقد سمعته يقول: ((ما أصبح لآل محمد ﷺ إلا صاع ولا أمسى، وإنهم لتسعة أبيات)). [راجع: ۲۰۶۹]

منشاء یہ ہے کہ اس آیت کریمہ میں جہاں رہن کا ذکر آیا ہے اس میں سفر کا بھی ذکر ہے:

﴿ وَ إِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِباً فَرِهَانٌ مَقْبُوْضَةٌ ﴾[۲]

ترجمہ: اور اگر تم سفر پر ہو اور تمہیں کوئی لکھنے والا نہ ملے تو (ادائیگی کی ضمانت کے طور پر) رہن قبضے میں رکھ لئے جائیں۔

کیا رہن صرف سفر میں جائز ہے؟

اس سے بعض لوگوں کا یہ خیال ہوا کہ شاید رہن رکھنا صرف سفر کی حالت میں جائز ہے اور حضر کے اندر نہیں ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں کہ رہن جس طرح سفر میں جائز ہے اسی طرح حضر میں بھی جائز ہے۔

اور آیت کریمہ میں جو **"وان کنتم علی سفر"** کا لفظ آیا ہے اس کا مفہوم مخالف باجماع معتبر نہیں۔ اور اس کی دلیل حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث ہے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے اپنی زرہ رہن رکھی تھی اور یہ مدینہ منورہ کا واقعہ ہے جو حضر کا واقعہ ہے سفر کا نہیں۔

---

[۱] [البقرة: ۲۸۳] [۲] [البقرة: ۲۸۳]

معلوم ہوا کہ رہن رکھنا جس طرح حالت سفر میں جائز ہے، اسی طرح حضر میں بھی جائز ہے اور یہی حنفیہ کی دلیل ہے کہ مفہوم مخالف کا اعتبار نہیں۔[۳]

(۲) باب من رهن درعه

۲۵۰۹ ۔ حدثنا مسدد: حدثنا عبدالواحد: حدثنا الأعمش قال · تذاكرنا عند إبراهيم الرهن والقبيل فی السلف، فقال: إبراهيم : حدثنا الأسود عن عائشة رضی الله عنها: أن النبی ﷺ اشتری من یهودی طعاما إلی أجل و رهنه درعه .[راجع : ۲۰۶۸] [۴]

حضرت اعمش رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہمارا ابراہیم نخعی رحمہ اللہ کے پاس اس مسئلے میں مذاکرہ ہوا کہ آیا سلم کے اندر رہن رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟

مثلاً آج پیسے دے دیئے اور مسلم الیہ سے کہا کہ تم چھ مہینے کے بعد ہمیں اتنا گندم دے دینا تو وہ جو چھ مہینے کے بعد گندم دے گا، وہ گندم اس کے ذمہ دین ہے۔ اس دین کے عوض میں کچھ رہن رکھا جا سکتا ہے یا نہیں؟ ابراہیم نخعیؒ کے پاس اس مسئلہ کا ذکر ہوا۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا قول

یہ ذکر اس لئے ہوا کہ بعض فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ سلم کے اندر رہن نہیں ہے اور امام احمد حنبل رحمہ اللہ کا قول بھی یہی ہے کہ سلم میں رہن نہیں ہوسکتا۔ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ رہن پیسے کے عوض ہوتا ہے اور سلم میں جو چیز ذمہ میں دین ہوتی ہے وہ پیسہ نہیں ہوتا بلکہ مبیع ہوتی ہے۔ عروض ہوتا ہے تو عروض کے بدلہ کیا رہن ہوگا؟

کیونکہ رہن کا منشاء یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی مدیون پیسے ادا نہ کر سکے تو دائن اس رہن کو بیچ کر اپنا قرض وصول کرلے اور یہاں قرضہ نقد پیسہ نہیں ہے، بلکہ گندم ہے اور رہن کے طور پر کپڑا دیا ہے تو کپڑا بیچ کے کہاں سے گندم لے گا؟ تو ڈبل ڈبل بیع کرنے پڑے گی کہ پہلے کپڑا بیچ کر پیسے حاصل کرے اور پھر پیسے حاصل کرے

---

[۳] جمیع الفقهاء یجوزون الرهن فی الحضر والسفر، ومنعه مجاهد وداؤد فی الحضر، ونقل الطبری عن مجاهد و الضحاک انهما قالا : لا یشرع الرهن إلا فی السفر حیث لا یوجد الکاتب ، وبه قال داؤد (عمدة القاری، ج: ۹ ، ص: ۲۹۶. وتکملة فتح الملهم، ج: ۱ ، ص: ۶۵۰).

[۴] وفی صحیح مسلم ، کتاب المساقاة ، باب الرهن وجوازه فی الحضر والسفر ، رقم ۳۰۰۷، ۳۰۰۹ ، وسنن النسائی، کتاب البیوع ، باب الرجل یشتری الطعام الی أجل ویسترهن البائع منه ، رقم : ۴۵۳۰، ۴۵۷۱ ، وسنن ابن ماجة ، کتاب الأحکام ، باب الرهن ، رقم : ۲۴۲۷ ، ومسند احمد ، باقی مسند الأنصار ، باب حدیث السیدة عائشة ، رقم : ۲۳۰۱۷، ۲۴۱۱۳، ۲۴۷۴۴، ۲۴۸۰۵.

پیسوں سے گندم خریدے۔ تو یہ ڈبل ڈبل کام کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔
اس واسطے وہ کہتے ہیں کہ سلم میں رہن نہیں ہوتا۔[۵]

جمہور کا مسلک

یہ مسئلہ امام نخعیؒ سے پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا **"حدثنا الأسود عن عائشة رضی اللہ عنہا ان النبی ﷺ"** کہ آپ ﷺ نے ایک خاص مدت تک غلّہ خریدا تھا اور پھر زرہ رہن میں رکھی تھی۔

مراد یہ ہے کہ اگر چہ یہاں رہن قیمت کی توثیق کے لئے رکھا گیا لیکن جس طرح قیمت کی توثیق یا ثمن کی توثیق کے لئے رہن رکھا جا سکتا ہے، اسی طرح مبیع کی توثیق کے لئے رہن رکھنے میں کوئی مضائقہ اور کوئی مانع موجود نہیں ہے۔

لہٰذا انہوں نے ثمن کی توثیق پر سلم کی توثیق کے رہن کو قیاس کیا اور کہا کہ وہ بھی جائز ہے۔ چنانچہ جمہور کا مسلک یہ ہے کہ سلم کے اندر بھی رہن رکھا جا سکتا ہے۔[۶]

(۲) باب رهن السلاح

۲۵۱۰ ـ حدثنا علی بن عبد الله : حدثنا سفیان : قال عمرو : سمعت جابر بن عبد الله رضی الله عنهما یقول : قال رسول الله ﷺ : ((من لکعب بن الأشرف ؟ فإنه ء آذی الله و رسوله ﷺ)) . فقال محمد بن مسلمة : أنا ، فأتاه فقال : أردنا أن تسلفنا وسقا أو وسقین ، فقال : ارهنونی نساء کم . قالوا : کیف نرهنک نساءنا و أنت أجمل العرب ؟ قال : فارهنونی أبناء کم ، قالوا : کیف نرهنک أبناءنا فیسب أحدهم فیقال : رهن بوسق أو وسقین ؟ هذا عار علینا ، و لکنا نرهنک اللأمة ـ قال سفیان : یعنی السلاح . فوعده أن یأتیه فقتلوه ثم أتوا النبی ﷺ فأخبروه .
[أنظر : ۳۰۳۱ ، ۳۰۳۲ ، ۴۰۳۷] .[۷]

یہ حدیث مغازی میں گزر چکی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہتھیار کا رہن رکھنا بھی جائز ہے۔

۵، ۶ راجع ، تکملة فتح الملهم ، ج: ۱ ، ص: ۲۵۱.

۷ وفی صحیح مسلم ، کتاب الجهاد والسیر ، باب قتل کعب بن الاشرف طاغوت الیهود ، رقم : ۲۳۵۹ ، وسنن أبی داؤد ، کتاب الجهاد ، باب فی العدو یؤتی علی غرة ویتشبه بهم ، رقم : ۲۳۸۷.

(۴) باب الرهن مركوب و محلوب

" و قال مغيرة عن إبراهيم : تركب الضالة بقدر علفها ، و تحلب بقدر علفها ، و الرهن مثله ".

۲۵۱۱ ـ حدثنا أبو نعيم : حدثنا زكريا ، عن عامر ، عن أبي هريرة ﷺ عن النبي ﷺ أنه كان يقول :((الرهن يركب بنفقته، ويشرب لبن الدر إذا كان مرهونا)). [أنظر: ۲۵۱۲]. [۵]

۲۵۱۲ ـ حدثنا محمد بن مقاتل : أخبرنا عبدالله بن المبارك : أخبرنا زكريا، عن الشعبي، عن أبي هريرة ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ:(الظهر يركب بنفقته اذا كان مرهونا ' ولبن الدر يشرب بنفقته اذا كان مرهونا و على الذي يركب ويشرب النفقة) [راجع : ۲۵۱۱]

حضرت ابوہریرہ ﷺ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ فرمایا کرتے تھے کہ "الرهن يركب بنفقته" رہن اگر کوئی سواری ہو تو اس پر نفقہ کے بدلے میں سواری کی جاسکتی ہے۔"و يشرب لبن الدر" اور دودھ دینے والے جانور کا دودھ پیا جاسکتا ہے۔

اس حدیث کے ظاہر پر امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا عمل ہے۔

پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کی اس بات پر تو سب حضرات فقہاء متفق ہیں کہ جب مرتہن کے پاس کوئی چیز رہن رکھ دی گئی تو مرتہن کے لئے اس رہن کو بطور وثیقہ رکھنا تو جائز ہے لیکن اس رہن سے انتفاع جائز نہیں کیونکہ اگر اس سے انتفاع کرے گا تو کل **"قرض جر نفعا"** کے تحت آکر رباء میں داخل ہو جائے گا۔

شیءِ مرہون سے انتفاع کی جائز صورت

البتہ جو چیز رہن رکھ دی گئی ہے اگر وہ منافع والی ہے تو وہ ان منافع کو راہن کی اجازت سے اجرت دے کر استعمال کرے یا اجازت راہن سے قیمت دے کر استعمال کرے تو یہ بالاتفاق جائز ہے۔

مثلاً گھوڑا رہن رکھا ہے اور مرتہن نے راہن سے یہ طے کر لیا کہ جب تک گھوڑا میرے پاس رہے گا اس پر سواری کروں گا اور اس کی اجرت مثل ادا کروں گا اور راہن اس کی اجازت دے دے تو یہ بالاتفاق جائز ہے یا

---

۵ وفي سنن الترمذي ، كتاب البيوع عن رسول الله ، باب الإنتفاع بالرهن ، رقم ۱۱۷۵ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب البيوع ، باب في الرهن ، رقم : ۳۰۵۹ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب الأحكام ، رقم ۲۴۳۱ ، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي هريرة ، رقم :۶۸۲۸ ، ۹۷۲۹.

ایک بکری رہن رکھی ہے اور مرتہن نے راہن کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ جب اس کا دودھ نکلے گا تو وہ میں خود استعمال کروں گا اور اس کا جو ثمن مثل ہوگا وہ ادا کروں گا یا قرضے میں محسوب کرلوں گا، تو یہ بھی اگر راہن کی اجازت سے ہوتو بالاتفاق جائز ہے اس میں کسی کو کلام نہیں۔[9]

راہن کی اجازت کے بغیر شئی مرہون سے انتفاع میں اختلاف فقہاء

ائمہ ثلاثہ کا قول

کلام اس صورت میں ہے کہ جب راہن نے اجازت نہیں دی۔ راہن سے اس قسم کا معاملہ نہیں ہوا لیکن گھوڑا یا بکری رہن رکھ لی، اس کے بارے میں ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمہم اللہ تینوں حضرات یہ کہتے ہیں کہ اب مرتہن کے لئے انتفاع جائز نہیں ہے۔ اگر بکری کا دودھ نکلے تو وہ راہن کے پاس پہنچائے، اگر راہن تک پہنچانا ممکن نہیں ہے تو فروخت کرے اور اس کی قیمت اپنے پاس بطور امانت رکھے خود اس سے انتفاع نہیں کرسکتا۔[10]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا عمل

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ حدیث باب پر عمل کرتے ہوئے یہ فرماتے ہیں کہ اس صورت میں انتفاع کرسکتا ہے، جب اس کا خرچ بھی وہ برداشت کررہا ہے مثلاً گھوڑا یا بکری ہے اس کو چارہ کھلانا ہوتا ہے اور چارہ کھلانا راہن کی ذمہ داری ہے کیونکہ وہ اس کی ملکیت ہے۔

امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مرتہن اس کو اپنی جیب سے چارہ دے اور جتنا چارہ دیا ہے اس کی مقدار کا دودھ استعمال کرے جیسے دس روپے کا چارہ دیا ہے تو دس روپے کا دودھ پی لے یا گھوڑے کو دس روپے کا چارہ کھلایا ہے اس پر دس روپے کی مقدار سواری کرلے، تو جتنا نفقہ دیا ہے اس کے لئے اتنے نفقہ کی مقدار انتفاع جائز ہے بشرطیکہ اس میں انصاف سے کام لے یعنی جتنا چارہ دیا ہے اس سے زیادہ انتفاع نہ کرے، اسی حد تک منفعت حاصل کرے۔[11]

دوسرے حضرات فرماتے ہیں کہ بغیر اجازت یہ کام نہیں ہوسکتا اور مستدرک حاکم کی ایک حدیث سے

---

[9] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۴۶.

[10] عمدۃ القاری، ج: ۹، ص: ۳۰۳، وفیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۴۶.

[11] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۴۶.

استدلال فرماتے ہیں کہ جس میں ہے **"لا یغلق الرهن من الراهن له غنمه و علیه غرمه"** کہ رہن کو راہن سے بند کر کے نہیں رکھا جا سکتا **"له غنمه"** راہن کو ہی اس کے فائدے ملیں گے **"وعلیه غرمه"** اور اسی پر اس کے فرائض عائد ہوں گے یعنی جو کچھ خرچہ ہوگا وہ راہن برداشت کرے گا اور جو کچھ منافع ہوں گے ان سے بھی راہن ہی فائدہ اٹھائے گا۔

"له غنمه" یہ تقدیم **"ما حقه التأخیر"** ہے جو حصر کا فائدہ دیتی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ غرم اور غنم دونوں راہن کے ہیں۔ مرتہن کا نہ غرم میں حصہ ہے اور نہ غنم میں۔[12]

ائمہ ثلاثہ کی طرف سے حدیث باب کی توجیہات

حدیث باب میں جو فرمایا کہ **"الرهن یرکب بنفقته"** یہ بظاہر امام احمدؒ کے مذہب پر صریح ہے۔ ائمہ ثلاثہ کی طرف سے اس کی مختلف توجیہات کی گئی ہیں:

بعض نے یہ توجیہ کی ہے کہ یہاں مجہول کا صیغہ استعمال ہوا ہے **"الرهن یرکب"** رہن پر سواری کی جائے گی۔ اب یہ سواری کون کرے گا حدیث میں اس کی صراحت نہیں ہے۔

بعض حضرات نے کہا کہ یہاں سواری کرنے والے سے مقصود یہ ہے کہ راہن سواری کرے گا **"الرهن یرکب"** یعنی راہن سواری کر سکتا ہے **"بنفقته"** نفقہ ادا کر کے **"ویشرب لبن الدر"** اس میں بھی راہن مراد ہے کہ راہن کو دودھ دیا جائے۔ لیکن یہ توجیہ بالکل ظاہر کے خلاف ہے اور بعض روایتوں میں جو صراحت آئی ہے یہ اس کے بھی خلاف ہے۔ بعض روایتوں میں مجہول کا صیغہ نہیں استعمال ہوا بلکہ مرتہن کی تشریح کی گئی ہے کہ مرتہن سواری کرے گا، لہٰذا یہ توجیہ صحیح نہیں ہے۔

دوسری توجیہ یہ کی گئی ہے کہ **"ویشرب لبن الدر"** یہ اس صورت پر محمول ہے جو ماقبل میں ذکر کی گئی کہ راہن کی اجازت کے ساتھ ہو۔ راہن کے ساتھ یہ معاملہ ہو گیا کہ میں بکری رہن رکھ رہا ہوں۔ یہ دودھ دے گی اور متعین کیا کہ دودھ میں پیوں گا اور اس کے بدلے اس کا چارہ فراہم کروں گا اور اگر اس سے کچھ زیادہ ہوگا تو اس کا ضامن ہوں گا یعنی جتنا چارہ فراہم کیا ہے، اتنا دودھ پیوں گا اور اس سے زیادہ کی قیمت دوں گا۔ اگر دونوں کے درمیان باقاعدہ یہ معاملہ طے پا گیا ہو تو یہ جائز ہے اور اس حدیث سے یہی مراد ہے۔[13]

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی توجیہ

تیسری توجیہ حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ فرض کریں اگر

---

[12] رقم الحدیث: ۲۳۱۵، ۱۸۶، ۲۳۲۱، ۱۹۲، المستدرک علی الصحیحین، ج: ۲، ص: ۵۸-۶۰. مطبع دار الکتب العلمیة.

[13] عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۳۰۳.

راہن کی طرف سے اجازت نہیں ہے اور راہن ملتا بھی نہیں ہے، اس سے اجازت لینا ممکن نہیں اور یہ دونوں یعنی بکری کا دودھ اور گھوڑے کی سواری یہ ایسی چیزیں ہیں کہ اگر بکری دودھ دے رہی ہے اور اسے بیچنا بھی ممکن نہیں تو دودھ ایسی چیز ہے کہ اسے قیامت تک محفوظ نہیں رکھا جا سکتا۔ اب اگر اسے پیئے گا نہیں تو وہ سڑے گا، خراب ہوگا۔ تو ایسی مجبوری کی صورت میں دودھ پی سکتا ہے اور راہن سے کہے کہ چونکہ دودھ کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا اس لئے میں نے جتنا نفقہ دیا تھا اس کے عوض جو دودھ آتا تھا وہ میں نے پی لیا ہے اور جو باقی ہے اس کا ضمان ادا کر دے، یہ جائز ہے۔

اسی طرح گھوڑا ایسی چیز ہے کہ اسے گھر میں کھڑا کر دیا اور چلایا پھرایا نہیں تو خراب ہو جائے گا۔ وہ گھوڑا بیمار ہو جائے گا تو اس کو چلانا پھرانا بھی ضروری ہے۔ اب راہن موجود نہیں ہے کہ اس سے اجازت لے، لہٰذا اس مجبوری کی حالت میں امام احمدؒ کے مسلک پر عمل کرے اور اس نفقہ کے بدلے گھوڑے پر سواری کرے تو یہ جائز ہے۔ یہ اس مسئلہ کی مختصر تفصیل ہے۔[۱۴]

یہاں ایک مسئلہ اور مختصراً ذکر کر دوں کہ ائمہ ثلاثہ جو حدیث ذکر کرتے ہیں کہ **"لایغلق الرھن لہ غنمہ وعلیہ غرمہ"** اس حدیث میں یہ بات اُصول کے طور پر بتائی گئی ہے کہ شئی مرہون کے غنم اور غرم (فائدہ اور ذمہ داری) دونوں مالک کے اوپر ہیں۔

فلوٹنگ چارج (Charge Floating) کا حکم

اس سے ہمارے زمانے کا ایک مسئلہ نکل آیا ہے کہ آج کل بکثرت ایسا ہوتا ہے کہ بڑی بڑی تجارتوں میں رہن کی ایک نئی صورت متعارف ہوئی اور وہ یہ ہے کہ رہن میں شئی مرہون پر مرتہن قبضہ نہیں کرتا بلکہ اس کے بجائے اس کی ملکیت کے کاغذات قبضہ میں رکھتا ہے جیسے گھر رہن رکھا تو گھر اپنے قبضہ میں نہیں لیا بلکہ اس کی ملکیت کے کاغذات اپنے پاس رکھ لئے۔

یا بعض اوقات ملکیت کے کاغذات اپنے پاس نہیں رکھتے لیکن آج کل کے قانون میں ایک طریقہ ہے کہ اس پر اپنا حق ثابت کیا جاتا ہے جس کو اصطلاح میں چارج کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس مکان یا اس گاڑی پر چارج ہے۔

چارج کا مطلب یہ ہے کہ اس کو راہن استعمال کرتا رہے گا اور وہ راہن ہی کے قبضے میں رہے گی لیکن مرتہن کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وقت مقررہ پر اس کا دین وصول نہ ہو تو وہ اس چیز کو فروخت کر دے اور اپنا دین وصول کرے۔

آج کل کی اصطلاح میں اس کو **"فلوٹنگ چارج"** کہتے ہیں یعنی اس کے اوپر چارج عائد کر دیا گیا۔ اردو میں اس کا کوئی مناسب ترجمہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ اس کو غیر مقبوض رہن کہا جائے۔

---

[۱۴] راجع: فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۴۶، ۳۴۷.

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس پر چارج عائد کیا گیا ہے؛ راہن کو یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اس چیز کو بیچ دے، اس لئے کہ اس سے مرتہن کا حق وابستہ ہے۔

اور بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر راہن اس کو بیچے گا تو بیچنے کے بعد وہ چارج اس جیسی قیمت کی کسی دوسری چیز کی طرف منتقل ہو جائے گا۔ اس کو فلوٹنگ چارج کہتے ہیں۔ **"الرهن السائل"** یعنی بہتا ہوا رہن ہے جو کسی چیز سے دوسری چیز کی طرف اور دوسری چیز سے تیسری چیز کی طرف منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔

آج کل رہن کا یہ طریقہ بہت زیادہ متعارف ہے اور تمام قانونی حلقوں میں اسے معتبر سمجھا جاتا ہے۔

بعض معاصرین کا قول

بعض حضرات معاصرین کہتے ہیں کہ اس صورت میں شرعی طور پر رہن مکمل نہیں ہوا کیونکہ قرآن کریم میں رہن کے ساتھ **"مقبوضة"** کی قید ہے **" فرهٰن مقبوضة "** معلوم ہوا کہ رہن کے اندر ضروری ہے کہ اس پر مرتہن قبضہ کر لے۔

لیکن یہ نقطۂ نظر درست نہیں، اس لئے کہ جس طرح قرآن مجید میں **"وان کنتم علی سفر"** کا مفہوم مخالف معتبر نہیں۔ اسی طرح **" فرهٰن مقبوضة"** کا مفہوم مخالف بھی معتبر نہیں کیونکہ رہن کا اصل مقصد یہ ہے کہ کسی طرح دین کی توثیق ہو جائے۔ وہ توثیق اگر قبضہ سے ہوتی ہے تو قبضہ کر لیں اور اس کو اس کے اندر تصرف کرنے سے روک دے جب تک کہ دین وصول نہ ہو جائے۔ اور اگر قبضہ سے نہیں حاصل ہوتی اور یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ اسے یہ حق ہے کہ اپنے دین کو وصول کرنے کے لئے اسے بیچ دے تو اس میں شرعی اعتبار سے ممانعت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ [۱۵]

اور جو حدیث ذکر کی ہے **"له غنمه وعلیه غرمه"** اس کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب راہن کو اس کا غنم حاصل ہے اگر وہ اس کے منافع کو بھی استعمال کرنا چاہے تو کر سکتا ہے کیونکہ اسی پر اس کی ذمہ داری بھی ہے، لہٰذا اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں ضمان راہن پر ہوگا، مرتہن پر نہیں ہوگا اور اس میں دونوں کا فائدہ ہے۔

مرتہن کا فائدہ یہ ہے کہ وہ شئی اس کے ضمان میں نہیں رہتی اور راہن کا فائدہ یہ ہے کہ وہ اسے استعمال کرتا رہتا ہے اور خاص طور پر بین الاقوامی تجارت میں، جہاں بائع اور مشتری دونوں مختلف شہروں میں رہتے ہوں وہاں اس چارج کے علاوہ رہن کا دوسرا طریقہ مقرر کرنا بڑا مشکل اور دشوار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ شئی مرہون کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے میں بڑے اخراجات ہوتے ہیں ایسی صورت میں دین کی توثیق کی **"رھن سائل"** کے علاوہ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آئی۔ لہٰذا اس کے اندر حصر اور تضییق کی ضرورت نہیں اور ظاہراً یہ جائز ہے۔ [۱۶]

---

[۱۵]، [۱۶] تفصیل کے لئے دیکھئے: (وفی الهدایة شرح البدایة، ج: ۴، ص: ۱۴۸، وبدایة المبتدی، ج: ۱، ص: ۲۳۵، ۲۳۶، والبحر الرائق، ج: ۸، ص: ۲۷۱، والهندیة، ج: ۳، ص: ۱۵، والمبسوط للسرخسی، ج: ۲۱، ص: ۱۵۸، مطبع دار المعرفة، بیروت)۔

كتاب العتق

٢٥١٧ - ٢٥٥٩

۴۹ ـ کتاب العتق

(۱) باب في العتق وفضله

وقوله تعالیٰ:

﴿فَكُّ رَقَبَةٍ أَوْ إِطْعَامٌ فِي يَوْمٍ ذِي مَسْغَبَةٍ يَتِيمًا ذَا مَقْرَبَةٍ﴾ [۱]

۲۵۱۷ ـ حدثنا أحمد بن يونس: حدثنا عاصم بن محمد، قال: حدثني واقد بن محمد قال: حدثني سعيد بن مرجانة صاحب علي بن الحسين قال: قال لي أبو هريرة ﷺ: قال النبي ﷺ: ((أيما رجل أعتق امرءاً مسلما استنقذ الله بكل عضو منه عضوا من النار)). قال سعيد بن مرجانة: فانطلقت به إلى علي بن الحسين فعمد علي بن الحسين رضي الله تعالیٰ عنهما إلى عبد له قد أعطاه به عبد الله بن جعفر عشرة آلاف درهم، أو ألف دينار فاعتقه.[أنظر: ۶۷۱۵] [۲]

اعتاق کی فضیلت

یعنی وہ غلام ایسا تھا کہ اس کے بدلے میں عبداللہ بن جعفر ﷺ نے ان کو ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم کی پیشکش کی تھی کہ یہ لے لو اور وہ غلام مجھے دے دو۔ وہ اتنا مہنگا غلام تھا لیکن اس حدیث میں اعتاق کی فضیلت

[۱] [البلد: ۱۳-۱۵] [۲] وفی صحیح مسلم، کتاب العتق، باب فضل العتق، رقم ۲۷۷۵-۲۷۷۸، وسنن الترمذی، کتاب النذور والأیمان عن رسول الله، باب ماجاء فی ثواب اعتق رقبة، رقم ۱۴۶۱، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب باقی المسند السابق، رقم: ۹۰۷۲، ۹۱۷۵، ۹۳۹۷، ۱۰۳۸۲.

سننے کی وجہ سے اس کو آزاد کر دیا۔

(۲) باب: أی الرقاب أفضل ؟

۲۵۱۸ ۔ حدثنا عبیداللہ بن موسی ،عن هشام بن عروة ، عن أبیه ، عن أبی مراوح، عن أبی ذر رضی اللہ عنہ قال: سألت النبی ﷺ: أی العمل أفضل؟ قال: ((إیمان باللہ وجهاد في سبیله)). قلت: فأی الرقاب أفضل؟ قال: ((أعلاها ثمنا وأنفسها عند أهلها)). قلت: فإن لم أفعل؟قال: ((تعین ضائعا أوتصنع لأخرق)). قال: فإن لم أفعل؟قال: ((تدع الناس من الشر فإنها صدقة تصدق بها علی نفسک)). [۳]

فرمایا کہ سب سے زیادہ اس کا اعتاق افضل ہے **"أعلاها ثمنا وأنفسها عند أهلها"** جو زیادہ قیمتی ہو اور اپنے مالک کے ہاں نفیس ہو۔

"قلت: فإن لم أفعل؟" میں نے پوچھا کہ اگر میں یہ نہ کرسکوں تو پھر کون سا عمل افضل ہے؟

"قال تعین ضائعا أوتصنع لأخرق" آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم کسی کاریگر کی مدد کرو۔

بعض روایتوں میں "صانعا" کی جگہ **"ضائعاً"** کا لفظ آیا ہے۔ یعنی وہ آدمی جو ضائع ہو یعنی کوئی اس کا پرسان حال نہ ہو تو اس کی مدد کرو اور صانعا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی چیز بنا رہا ہے اور تم اس میں اس کی مدد کرو تو یہ بھی تمہارے لئے بڑے ثواب کا کام ہے۔ **اوتصنع لأخرق"** یا کسی اناڑی کے لئے کوئی چیز بنا دو۔ اردو میں اناڑی اس کو کہتے ہیں جو کوئی کام نہیں جانتا۔ اب وہ بےچارہ کسی کام کا نہیں ہے اور روزی کمانے کے لئے کوئی کام کرنا چاہتا ہے لیکن بےوقوف ہے تو تم اسے کوئی چیز بنا کر دو اور اس کی مدد کرو تاکہ اسے روزی حاصل ہو جائے یہ بھی صدقہ ہے۔

"قلت: فإن لم أفعل؟قال تدع الناس" میں نے کہا اگر یہ بھی نہ کرسکوں؟ تو فرمایا کم از کم ایسا کرو کہ لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھو۔ لوگوں کو شر سے محفوظ رکھنے کا معنی یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچاؤ۔

آداب معاشرت کا لحاظ بہت ضروری ہے

آداب معاشرت کی اصل یہ ہے کہ اپنی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف نہ پہنچے نہ جسمانی، نہ ذہنی اور نہ

---

[۳] صحیح مسلم ،کتاب الایمان ، باب بیان کون الایمان باللہ تعالیٰ افضل الاعمال ، رقم ۱۱۹ ، وسنن النسائی ، کتاب الجهاد ، باب مایعدل الجهاد فی سبیل اللہ عز وجل ، رقم :۳۰۷۸ ، وسنن ابن ماجة ،کتاب الأحکام ، باب العتق ،رقم ۲۵۱۴ ، ومسند احمد ، مسند الأنصار ، باب حدیث أبی ذر الغفاری ، رقم :۲۰۳۶۸, ۲۰۴۷۶ ، ۲۰۵۲۴ ، وسنن الدارمی،کتاب الرقاق ، رقم ۲۶۲۱ .

نفسیاتی۔ کسی بھی قسم کی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

یہ دین کا وہ باب ہے جس کو دین کا حصہ ہی نہیں سمجھا جاتا، اپنے زعم میں کچھ رسمیں بنائی ہوئی ہیں، ان رسموں کی پابندی کو ضروری سمجھ لیا ہے۔ احکام شریعت اور آداب شریعت سے ناواقف ہو گئے ہیں اور خاص طور پر ہمارے طبقوں میں تو یہ بات زیادہ ہوگئی ہے (اللہ بچائے) معاشرت کے احکام، دوسروں کو تکلیف سے بچانے کی فکر بالکل ختم ہوگئی ہے۔

موقعہ دیکھ کر مصافحہ کرنا چاہئے

ابھی کل میں جا رہا تھا، صحاح ستہ جو کسی نے ایک جلد میں شائع کی ہے بڑی اچھی کتاب ہے۔ یہ اتنی موٹی سی کتاب میرے ایک ہاتھ میں تھی، دوسرے ہاتھ میں دوسری کتاب تھی۔

ایک صاحب آئے اور مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیئے۔ اب ان سے مصافحہ کرنے کا راستہ یہ تھا کہ یا تو کتابوں کو نیچے پھینک دوں اور پھر ان سے مصافحہ کروں یا کسی طرح کتابوں کو سر پر رکھوں پھر مصافحہ کروں۔ مصافحہ کرنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا اور انہوں نے مستقل ہاتھ بڑھایا ہوا ہے۔

میں نے کہا، میں تم سے کیسے مصافحہ کروں؟ انہوں نے کہا جی آپ سے مصافحہ کرنے کی بہت خواہش ہے۔ تو مصافحہ کرنے کی خواہش اتنی زبردست ہے کہ اس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ مصافحہ کا وقت۔ ہے یا نہیں؟ موقعہ ہے یا نہیں؟ لیکن مصافحہ کرنا ہے۔ اب میں نے اس کی خواہش پوری کرنے کی خاطر کسی طرح اس کتاب کو بغل میں دبایا اور مصافحہ کیا، تب اس سے جان چھوٹی۔

ابھی آگے چلا تھا کہ دوسرا آ گیا اور ہاتھ بڑھایا ہمارے دماغ سے یہ بات نکل گئی ہے کہ آداب کیا ہیں؟ شریعت کے احکام کیا ہیں؟

مصافحہ کرنے اور سلام کرنے کی بے شک فضیلت ہے لیکن اس کے بھی کچھ آداب ہیں، اس کا بھی کچھ وقت ہے۔ کوئی راستہ میں جا رہا ہے اور کسی کام کی وجہ سے جلدی میں ہے، آپ آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کریں تو یہ سب باتیں آداب کے خلاف ہیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہیں کہ معاشرت کے احکام کو دین سے خارج سمجھ لیا ہے جو بہت ہی افسوس ناک بات ہے۔

تو **"تدع الناس من الشر"** کہ لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھو۔ شر کا مطلب یہی ہے کہ لوگوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچے۔

(۴) باب إذا أعتق عبدا بين اثنين أو أمة بين الشركاء

۲۵۲۱ ـ حدثنا علي بن عبدالله: حدثنا سفيان، عن عمرو، عن سالم، عن أبيه ﷺ

عن النبی ﷺ قال: ((من أعتق عبدا بین اثنین فإن کان موسراً قُوِّم علیه ثم یعتق)). [راجع: ۲۴۹۱] [۴]

یہ حدیث مختلف طریقوں سے پہلے بھی کئی ابواب میں آئی ہے۔ خاص طور سے شرکت کے باب میں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک غلام دو آدمیوں کے درمیان مشترک ہے۔ اور دونوں اس کے مساوی مالک ہیں۔ ایک نے اپنا حصہ آزاد کر دیا تو دوسرے آدمی کا کیا بنے گا، اس میں فقہاء کا کافی لمبا چوڑا اختلاف ہے۔ علامہ عینی رحمہ اللہ نے اس میں بہت سارے مذاہب بیان کئے ہیں لیکن مشہور مذاہب تین ہیں:

عبد مشترک کو آزاد کرنے کے بارے میں اختلاف ائمہ

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے آزاد کیا یعنی معتق کو دیکھا جائے گا کہ وہ مالدار ہے یا تنگ دست ہے۔

اگر وہ مالدار ہے تو دوسرے شریک کو تین باتوں میں سے ایک بات اختیار کرنے کا حق حاصل ہے۔

۱۔ وہ بھی اپنا حصہ آزاد کرے جس طرح اس نے ثواب کمایا یہ بھی ثواب کمالے۔

۲۔ یا اس شریک کو اپنے حصے کا ضامن قرار دے یعنی یہ کہے کہ تم نے آدھا آزاد کر دیا لیکن آدھا آزاد نہیں ہوتا بلکہ پوارہی آزاد ہوگا، لہٰذا تم نے میرا حصہ بھی ضائع کر دیا۔ مجھے اپنے حصے کی ملکیت سے محروم کر دیا، اس لئے اس کا ضمان ادا کرو، میرے حصے کی قیمت ادا کرو۔ اگر وہ غلام ایک ہزار کا تھا تو پانچ سو روپے ضمان کے طور پر مجھے ادا کرو۔

۳۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ وہ عبد سے سعایہ کرائے کہ تم جا کر محنت مزدوری کرو اور پیسے کماؤ اور مجھے میرے حصے کی قیمت لا کر دو۔ جب وہ لا کر دیدے گا تو مکمل طور پر آزاد ہو جائے گا۔

---

[۴] وفی صحیح مسلم، کتاب العتق، رقم: ۲۷۵۸، وکتاب الایمان، ب من اعتق شرکاله فی عبد، رقم: ۳۱۴۷-۳۱۵۱، وسنن الترمذی، کتاب الأحکام عن رسول الله، باب ماجاء فی العبد یکون بین الرجلین فیعتق احدهما، رقم: ۱۲۶۶، وسنن النسائی، کتاب البیوع، باب اشرکة بغیر مال، رقم: ۴۶۱۹، ۴۶۲۰، وسنن أبی داود، کتاب العتق، باب فیمن روی انه لایستسعی، رقم: ۳۴۳۵، وسنن ابن ماجة، کتاب الأحکام، باب من اعتق شرکا له فی عبد، رقم: ۲۵۱۹، ومسند احمد، مسند العشرة المبشرین بالجنة، رقم: ۳۷۴، مسند المکثرین من الصحابة باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب، رقم: ۴۲۱۹، ۴۳۶۱، ۴۴۰۶، ۴۶۶۶، ۴۹۰۳، ۵۲۱۷، ۵۵۵۸، ۵۶۵۰، ۵۷۶۵، وموطا مالک، کتاب العتق والولاء، باب من اعتق شرکا له فی مملوک، رقم: ۱۲۶۴.

یہ اس وقت ہے جب معتق موسر یعنی مالدار ہو۔ اگر معتق معسر ہو تو پھر ضمان عائد نہیں ہوتا کیونکہ بے چارہ خود تنگ دست ہے، وہ ضمان کہاں سے دے گا۔ باقی دونوں کاموں میں سے ایک کام کرے یا خود بھی آزاد کردے یا پھر غلام سے سعایہ کرائے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔[۵]

صاحبین رحمہم اللہ کا مسلک

امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ موسر ہے تب تو ایک ہی صورت متعین ہے کہ اس پر ضمان عائد کرے۔

اور اگر معسر ہے تو ایک ہی صورت متعین ہے کہ سعی کرائے یعنی امام صاحبؒ نے تو کہا تھا کہ اگر چاہے تو یہ بھی اپنا حصہ آزاد کرلے لیکن صاحبینؒ کہتے ہیں کہ یہ آزاد نہیں کرسکتا۔ اس لئے کہ جب شریک نے آدھا حصہ آزاد کردیا تو خود بخود پورا غلام آزاد ہوگیا کیونکہ ان کے نزدیک اعتاق تجزیٰ کو قبول نہیں کرتا اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اعتاق تجزیٰ کو قبول کرتا ہے، لہٰذا ان کے نزدیک آدھا اعتاق ہوا اور آدھا نہیں ہوا جس کی وجہ سے وہ اعتاق کرسکتا ہے اور صاحبین کے نزدیک چونکہ اعتاق تجزیٰ کو قبول نہیں کرتا اس لئے جوں ہی ایک نے آزاد کیا وہ پورا آزاد ہوگیا۔ جب پورا آزاد ہوگیا تو اب دوسرا آزاد نہیں کرے گا بلکہ دو ہی راستے ہیں اگر موسر ہے تو اس کو ضامن بنائے اور اگر معسر ہے تو غلام سے سعی کرائے۔[۶]

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

تیسرا مسلک امام شافعی رحمہ اللہ کا ہے۔ امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ سعی کسی صورت میں نہیں ہے۔ اگر موسر ہے تو اس صورت میں ضامن بنائے گا جیسے صاحبین کہتے ہیں اور اگر معسر ہے تو اس صورت میں غلام آدھا غلام رہے گا اور آدھا آزاد رہے گا۔

---

۵ واما أبوحنيفة فإنه كان يقول : إذا كان المعتق موسراً فالشريک بالخيار ، إن شاء أعتق والولاء بينهما نصفان ، وإن شاء استسعى العبد في نصف القيمة ، فإذا أداها والولاء بينهما نصفان ، وإن شاء ضمن المعتق نصف القيمة فإذا أداها عتق ورجع بها المضمن على العبد فاستسعاه فيها ، وكان الولاء للمعتق ، وإن كان المعتق معسراً فالشريک بالخيار إن شاء أعتق وإن شاء استسعى العبد في نصف قيمته ، فأيهما فعل فالولاء بينهما نصفان. عمدة القاری ، ج: ۹ ، ص: ۳۱۸ ، وفيض الباری ، ج: ۳ ، ص: ۳۴۸ ، وتكملة فتح الملهم ، ج: ۱ ، ص: ۲۷۳.

۶ وعند أبي يوسف ومحمد: يسعى العبد في نصيب شريكه الذي لم يعتق إذا كان معسراً ، ولا يرجع على العبد بشيء ، عمدة القاری ، ج: ۹ ، ص: ۳۱۸ ، وفيض الباری ، ج: ۳ ، ص: ۳۴۹ ، وتكملة فتح الملهم ، ج: ۱ ، ص: ۲۷۳.

ایک دن تو آرام کرے گا کہ میں آزاد ہوں اور دوسرے دن اس کی خدمت کرے گا تو **"یعتق یوما ویخدم یوماً"** کے نزدیک سعی کسی طرح بھی نہیں ہے۔ [۷]

اختلاف کی دوسری تعبیر

اس اختلاف کو اس طرح بھی تعبیر کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اعتاق علی الاطلاق تجزیٔ کو قبول کرتا ہے۔ صاحبین کے نزدیک علی الاطلاق تجزیٔ کو قبول نہیں کرتا اور امام شافعیؒ کے نزدیک یسر کی صورت میں تجزیٔ کو قبول نہیں کرتا۔

غلط فہمی کا ازالہ

لیکن اس مسئلہ میں ایک غلط فہمی ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور صاحبین رحمہما اللہ کے درمیان جو اختلاف ہے کہ اعتاق تجزیٔ قبول کرتا ہے یا نہیں۔ امام صاحبؒ کہتے ہیں کہ اعتاق تجزیٔ کو قبول کرتا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کے نزدیک کبھی ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ آدھا غلام آزاد ہو اور آدھا آزاد نہ ہو بلکہ جب بھی غلام آزاد ہوگا تو پورا آزاد ہوگا۔

اور صاحبینؒ جو کہتے ہیں کہ وہ عتاق تجزیٔ کو قبول کرتا اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ جب بھی غلام آزاد ہوگا تو پورا آزاد ہوگا۔

امام صاحب اور صاحبین رحمہم اللہ کے قول میں فرق

دونوں میں باریک سا فرق ہے اور وہ یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اعتاق تجزیٔ کو قبول کرتا ہے، لہٰذا اگر ایک شریک نے غلام آزاد کیا ہے تو ابھی غلام آزاد ہوا ہی نہیں، مکمل غلام ہے، البتہ جس نے آزاد کیا تھا اس کی ملکیت ختم ہوگئی۔ اعتاق کے تجزیٔ قبول کرنے کے یہ معنی ہیں کہ آدھا اعتاق ہوگیا اور آدھا نہیں ہوا لیکن جہاں تک عتق کا تعلق ہے تو عتق ابھی ہوا ہی نہیں۔ عتق اس وقت ہوگا جب معتق ضمان دیدے یا غلام سعی کرے

---

[۷] وبهذا الحديث احتج الشافعي واحمد وإسحاق وقالوا: إذاكان العبد بين اثنين فاعتقه أحدهماقوم عليه حصة شريكه، ويعتق العبد كله ولايجب الضمان عليه إلا إذا كان موسرا، وتقرير مذهب الشافعي ماقاله في الجديد: إنه إذا كان المعتق لحصته من العبد موسرا عتق جميعه حين أعتقه، وهو حر من يومئذيرث ويورث عنه، وله ولاؤه ولاسبيل للشريك على العبد، وعليه قيمة نصيب شريكه، كمالوقتله، فإن كان معسرا فالشريك على ملكه يقاسمه كسبه أو يخدمه يوما ويخلي لنفسه يوما، ولا سعاية عليه لظاهر الحديث. (عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۳۱۸، وفیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۵۰، و تكملة فتح الملهم، ج: ۱، ص: ۲۷۳-۲۷۵.

یا دوسرا شریک بھی آزاد کردے۔[۸]

اور صاحبینؒ کے نزدیک تجزیٔ قبول نہ کرنے کے معنی یہ ہیں وہ عتق بھی تجزیٔ قبول نہیں کرتا اور اعتاق بھی تجزیٔ قبول نہیں کرتا، لہٰذا جب ایک مرتبہ آدمی نے آزاد کیا تو اسی وقت پورا آزاد ہوگیا اور دوسرے کو یہ حق حاصل ہے کہ یا تو وہ ضمان دے یا سعی کرائے۔[۹]

مختلف حدیثیں آرہی ہیں، ان میں اگر آپ دیکھیں تو زیادہ تر امام ابوحنیفہؒ کی تائید ملے گی۔ اس واسطے کہ جگہ جگہ سعایہ کا ذکر ہے اور امام شافعیؒ سعایہ کے قائل نہیں۔

بعض شافعیہ یہ کہتے ہیں کہ جہاں ''سعایہ'' کا لفظ آیا ہے اس سے مراد ''ضمان دینا'' ہے۔

بعض کہتے ہیں اس سے مراد خدمت لینا ہے، آدھا دن خدمت لینا لیکن یہ تاویلات بالکل بعید ہیں اور الفاظ حدیث اس کی تردید کرتے ہیں۔

۲۵۲۲ ۔ حدثنا عبداللہ بن یوسف قال: أخبرنا مالک، عن نافع، عن عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنهما: أن رسول اللہ ﷺ قال: ((من أعتق شركا له في عبد فكان له مال يبلغ ثمن العبد قوم العبد عليه قيمة عدل فأعطى شركاءه حصصهم وعتق عليه العبد، وإلا فقد عتق منه ما عتق)). [راجع: ۲۴۹۱]

''**فقد عتق منه، ماعتق**'' امام شافعی رحمہ اللہ اس سے استدلال کرتے ہیں اور اس کا دوسرا حصہ لائے ہیں۔ ''**ورق منه مارق**'' کہ آدھا آزاد ہوگیا، آدھا باقی رہا۔[۱۰]

لیکن حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ دوسری حدیث میں اس کی صراحت آئی ہے کہ ''**عتق منه ماعتق**'' کے معنی ہیں جتنا آزاد ہوگیا تو ہوگیا باقی میں سعایہ کرے جیسا کہ اگلی حدیثوں میں آرہا ہے۔

۲۵۲۳ ۔ حدثنا عبيد بن إسماعيل، عن أبي أسامة، عن عبيد الله، عن نافع، عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: قال رسول الله ﷺ: ((من أعتق شركا له في مملوك فعليه عتقه

---

۸ وحاصل مذهب أبي حنيفة: أنه يرى بتجزئ العتق، وأن يسار المعتق لا يمنع السعاية، واحتج أبوحنيفة فيما ذهب إليه بما رواه البخاري عن عبدالله بن يوسف عن مالک عن نافع عن عبدالله رضي الله تعالىٰ عنهما، على ما يجيء عقيب الحديث المذكور، وبما رواه البخاري أيضا بإسناده عن أبي هريرة على مايجيء بعد هذا الباب، فإنهما يدلان على تجزي الإعتاق وعلى ثبوت السعاية أيضا. (عمدة القارى، ج: ۹ ص: ۳۱۸).

۹ والفصل عندي أن مذهب الصاحبين أقرب باعتبار النطق، ومذهب الإمام أقرب بحسب التفقه، وأما مذهب الشافعي، فبعيد عن النطق، وبعيد عن التفقه، ولذا لم يختره البخاري، ووافق الإمام الأعظم الخ. (فيض البارى، ج: ۳ ص: ۳۵۱).

۱۰ عمدة القارى، ج: ۹، ص: ۳۱۹.

کلـه إن كان له مال يبلغ ثمنه ،فإن لم يكن له مال يقوم عليه قيمة عدل على المعتق فأعتق منه ماأعتق)). [راجع: ۲۴۹۱]

حدثنا مسدد: حدثنا بشر، عن عبيد الله اختصره.

۲۵۲۴ ــ حدثنا أبو النعمان: حدثنا حماد، عن أيوب، عن نافع، عن ابن عمر رضى الله عنهما عن النبی ﷺ قال: ((من أعتق نصيبا له في مملوک أو شركا له في عبد فكان له من المال ما يبلغ قيمته بقيمة العدل فهو عتيق)). قال نافع: وإلا فقد عتق منه ماأعتق. قال أيوب: لاأدرى أشيء قاله نافع، أوشيء في الحديث.

یہاں خود امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ نافع نے کہا ''وإلا فقد عتق ماعتق'' ایوب سختیانیؒ کہتے ہیں کہ مجھے پتہ نہیں کہ ''فقد عتق منه ماحق''، یہ نافع نے اپنی طرف سے کہا یا حدیث کا مرفوع حصہ ہے۔

اس سے پتہ چلا کہ '' فقد عتق منه ما عتق'' کا رسول کریم ﷺ کی طرف منسوب ہونا یقینی نہیں، مشکوک ہے۔

(۵) باب إذا أعتق نصيبا في عبد وليس له مال استسعي العبد غير مشقوق عليه على نحو الكتابة

۲۵۲۶ ــ حدثني أحمد بن أبي رجاء: حدثنا يحيى بن آدم: حدثنا جرير بن أبي حازم قال: سمعت قتادة قال: حدثني النضر بن انس بن مالک، عن بشير بن نهيک، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: قال النبی ﷺ: ((من أعتق شقيصا من عبد........)). [راجع: ۲۴۹۲].

۲۵۲۷ ــ وحدثنا مسدد: حدثنا يزيد بن زريع: حدثنا سعيد، عن قتادة، عن النضر بن أنس، عن بشير بن نهيک، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ: أن النبی ﷺ قال: ((من اعتق نصيبا أو شقيصا فی مملوک فخلاصه عليه فی ماله إن كان له مال، وإلا قوم عليه فاستسعي به غير مشقوق عليه)). [راجع: ۲۴۹۲].

''تابعه حجاج بن حجاج وأبان وموسى بن خلف عن قتادة، اختصره شعبة''.

دیکھیں یہاں حدیث میں سعایا کا ذکر ہے۔

(۶) باب الخطأ والنسيان فی العتاقة والطلاق ونحوه، ولا عتاقة إلا لوجه الله تعالیٰ

''وقال النبی ﷺ: ((کل امرئ مانوی))، ولا نية للناسي والمخطئ''.

یہاں یہ اس باب کا منشاء یہ ہے کہ امام بخاریؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ اگر کسی کے منہ سے خطأً یا نسیاناً اعتاق یا طلاق کے الفاظ نکل جائیں تو ان سے اعتاق یا طلاق منعقد نہیں ہوگی۔

اگر کسی کے منہ سے خطأً طلاق کا لفظ نکل گیا تو اس سے طلاق واقع ہونی نہیں چاہئے یا خطأً اعتاق کا لفظ نکل گیا تو اس سے عتق نہیں محقق ہونا چاہئے کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے اس امت سے خطاء اور نسیان کو مرتفع قرار دیا ہے۔

نسیان کی حد تک تو حنفیہ بھی امام بخاریؒ کے ساتھ ہیں اس معنی میں کہ بعض جگہ حنفیہ نے نسیان کو معتبر مانا ہے یعنی نسیان سے کوئی حکم ثابت نہیں کیا جیسے نسیاناً اگر کوئی روزے میں کھالے تو روزہ نہیں ٹوٹتا اور طلاق اور اعتاق میں نسیان کا کوئی تصور نہیں ہے، بھول کر طلاق کیسے دے گا؟ یا بھول کر اعتاق کیسے کرے گا؟

اگر خطأً بھی طلاق دے تو طلاق ہو جائے گی

خطأً میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر خطأً بھی طلاق دے گا تو طلاق واقع ہو جائے گی اور خطأً بھی اگر زبان سے اعتاق کا لفظ نکال دے تو اعتاق ہو جائے گا۔

چنانچہ ہمارے فقہاء نے مسئلہ لکھا ہے کہ الحمد للہ کہنا چاہتا تھا اور منہ سے **"أنت طالق"** نکل گیا۔ کہتے ہیں کہ پھر بھی طلاق واقع ہو جائے گی۔

"ثلث جدھن جد وهزلهن جد"

حنفیہ نے اس بارے میں اس حدیث کو مدار بنایا ہے جس میں کہا گیا ہے **"ثلث جدھن جد وهزلهن جد النكاح، والطلاق والرجع"**۔

اس میں چونکہ مذاق کو بھی جد قرار دیا گیا اور مذاق کے معنی یہ ہیں کہ ایقاع مقصود نہیں تھا لیکن تلفظ کر لیا تو اس کو معتبر مانا ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ خطا میں بھی یہی ہوتا ہے کہ ایقاع مقصود نہیں؟ لیکن تلفظ ہو گیا، اس لئے طلاق واقع ہو جائے گی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مذہب پر استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں **"ولا عتاقة إلا لوجه الله تعالى"** کہ اعتاق تو وہی معتبر ہے جو اللہ کی رضا کے لئے ہو اور اللہ کی رضا کے لئے اسی وقت ہوگا جب آدمی جان بوجھ کر کرے۔ اگر خطأً کر لیا تو وہ اعتاق لوجہ اللہ نہ ہوا، جب لوجہ اللہ نہ ہوا تو اس کے اثرات بھی مرتب نہیں ہوں گے۔

آگے حدیث پیش کر رہے ہیں **"لكل امرئ مانوى"** کہ نیت کا اعتبار ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں جب طلاق دینے کی نیت نہیں ہوگی تو طلاق واقع نہیں ہوگی، لہٰذا محض خطأً طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوگی۔

لیکن یہ استدلال بڑا کمزور ہے، اس لئے کہ اس کا تقاضا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص خطأ نہیں بلکہ عمداً تلفظ بالطلاق الصریح کرے، پھر بھی بغیر نیت معتبر نہ ہو حالانکہ طلاق صریح کا معتبر ہونا چاہئے نیت ہو یا نہ ہو، اس پر فقہاء کا اجماع ہے، لہٰذا یہ استدلال بڑا کمزور ہے۔

۲۵۲۸ ـ حدثنا الحميدي: حدثنا سفيان: حدثنا مسعر، عن قتادة، عن زرارة بن أوفى، عن أبي هريرة ﷺ قال: قال النبي ﷺ: ((إن الله تجاوز لي عن أمتي ما وسوست به صدورها مالم تعمل أو تكلم)). [أنظر: ۵۲۶۹، ۶۶۶۴]. [۱۱]

یہ حدیث خود اس پر دلالت کر رہی ہے کہ اگر تکلم ہو گیا تو پھر اس پر احکام جاری ہو جاتے ہیں۔ محض وسوسے سے کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا، لیکن جب زبان سے تکلم ہو گیا تو پھر احکام جاری ہوں گے۔

"**ما لم تعمل أو تكلم**" تو اگر تکلم ہو گیا چاہے خطاءً ہی سہی تو حنفیہ کہتے ہیں کہ طلاق واقع ہو جائے گی، اگرچہ حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کاش! حنفیہ ایسا نہ کہتے اور خطاء کے باب میں اتنی شدت نہ کرتے۔ [۱۲]

(۷) باب إذا قال لعبده: هو لله، ونوى العتق، والإشهاد بالعتق

۲۵۳۰ ـ حدثنا محمد بن عبدالله بن نمير، عن محمد بن بشر، عن إسماعيل عن قيس، عن أبي هريرة ﷺ: أنه لما أقبل يريد الإسلام ومعه غلامه ضل كل واحد منهما من صاحبه فأقبل بعد ذلك وأبو هريرة جالس مع النبي ﷺ فقال النبي ﷺ: ((يا أبا هريرة، هذا غلامك قد أتاك)). فقال: أما إني أشهدك أنه حر، قال فهو حين يقول:

يا ليلة من طولها وعنائها — على أنها من دارة الكفر نجت

[أنظر: ۲۵۳۱، ۲۵۳۲، ۴۳۹۳] [۱۳]

---

۱۱ صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب تكاوز الله عن حديث النفس والخاطر بالقلب اذا لم تستقر، رقم: ۱۸۱، وسنن الترمذي، كتاب الطلاق واللعان عن رسول الله، باب ماجاء فيمن يحدث نفسه بطلاق امرأته، رقم: ۱۱۰۳، وسنن النسائي، كتاب الطلاق، باب من طلق في نفسه، رقم: ۳۳۷۹، ۳۳۸۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الطلاق، باب في وسوسة بالطلاق، رقم: ۱۸۸۸، سنن ابن ماجة، كتاب الطلاق، باب من طلق في نفسه ولم يتكلم به، رقم: ۲۰۳۰ ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۸۷۴۵، ۹۱۳۴، ۹۷۵۲، ۹۸۴۸، ۹۹۶۸.

۱۲ أنظر: في فيض الباري، ج: ۳، ص: ۳۵۳، باب الخطاء والنسيان في العتاقة.

۱۳ مسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۵۰۹.

حضرت ابو ہریرہ ﷺ جب اپنے قبیلے سے اسلام کے ارادے سے چلے تھے تو ان کے ساتھ ان کا غلام بھی تھا۔ **"ضل کل واحد منهما من صاحبه"** راستے میں ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ غلام کہیں اور چلا گیا اور یہ کہیں اور چلے گئے۔

"فاقبل بعد ذلک" بعد میں وہ غلام آیا۔ حضرت ابو ہریرہ ﷺ نبی کریم ﷺ کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔

"فقال النبی ﷺ یا أباھریرۃ" نبی کریم ﷺ نے فرمایا اے ابو ہریرہ! یہ تمہارا غلام آگیا ہے جو بچھڑا ہوا تھا۔ **"فقال أما إنی"** کہا میں آپ کو گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس کو آزاد کر دیا ہے۔

"قال فهو حین یقول" حضرت ابو ہریرہ ﷺ اس وقت یہ شعر پڑھ رہے تھے:

یالیلة من طولها وعنائها — علی أنها من دارة الکفر نجت

کہ وہ کیسی رات تھی اپنی لمبائی اور مشقت کی وجہ سے جو انہوں نے حالت کفر میں اسلام کی طرف آنے میں گزاری، وہ بڑی مشقت والی رات تھی اور اس میں یہ مشکل بھی پیش آگئی کہ غلام گم ہو گیا۔ **"علی أنها من دارة الکفر نجت"** لیکن اس نے مجھے کفر کے گھر سے نجات عطا کر دی۔

مطلب یہ ہے کہ مشقت تو اٹھائی لیکن اس کا نتیجہ بہت اچھا ملا کہ دار الکفر سے نجات حاصل کر کے دار الاسلام میں پہنچ گئے۔ تو مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نعمت عطا فرمائی ہے تو میں اس غلام کو آزاد کرتا ہوں۔

(۸) باب أم الولد

قال أبو هریرة عن النبی ﷺ: ((من اشراط الساعة أن تلد الأمة ربها)).

اس باب میں امام بخاریؒ نے جمہور سے تفرد اختیار کیا ہے کہ ان کے نزدیک ام ولد کی بیع جائز ہے۔

ائمہ اربعہ اس بات پر متفق ہیں کہ جب ایک مرتبہ جاریہ ام ولد بن گئی، اب اس کی بیع نہیں ہو سکتی۔ مدبر کے بارے میں اختلاف ہے جو آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ شافعیہ کے نزدیک مدبر کی بیع ہو سکتی ہے، حنفیہ کے نزدیک نہیں ہو سکتی لیکن ام ولد کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں، سب کے نزدیک ام ولد کی بیع جائز نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے نزدیک ام ولد کی بیع جائز ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے بظاہر تفرد اختیار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ ام ولد کی بیع بھی جائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاریؒ نے اس سے استدلال کیا ہے کہ **"من اشراط الساعة أن تلد الأمة ربها"** کتاب الایمان میں یہ حدیث گزری ہے کہ کنیز اپنے سید کو جنے گی۔ وہ کہتے ہیں کہ کنیز اپنے سید کو جنے گی اس کا معنی یہ ہے کہ کنیز کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو وہ ام ولد بن گئی۔ اس کے بعد اس کنیز کی بیع ہوتی رہی۔ مختلف افراد خریدتے رہے

یہاں تک کہ بالآخر نادانستگی میں اس کنیز کو اس کے بیٹے نے ہی خرید لیا تو یہ ہوا **"تلد الأمة ربها"**.

کہتے ہیں کہ یہ اس وقت ہوسکتا ہے جب ام ولد کی بیع جائز ہو۔ اگر بیع جائز نہ ہوتی تو پھر بالآخر یہ کنیز اپنے بیٹے یا بیٹی کی طرف منتقل نہ ہوتی۔

جمہور کے ہاں ام ولد کا حکم

جمہور کہتے ہیں کہ ام ولد کی بیع جائز نہیں۔

امام بخاری کی دلیل کا جواب

جمہور کہتے ہیں کہ یہ تو گویا الٹا معاملہ ہے کہ علامات قیامت بیان ہو رہی ہیں، اس میں جائز و ناجائز حلال وحرام کی کوئی تحقیق نہیں ہوگی۔

اگر بالفرض یہی صورت سمجھی جائے جو امام بخاریؒ نے بیان کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ علامات قیامت میں سے ہے کہ ام ولد کی بیع ہونے لگے گی اور بیع کے نتیجے میں وہ اپنے بیٹے یا بیٹی کی ملکیت میں آجائے گی۔ تو یہ اس کے جواز پر دلیل نہیں بن رہی ہے بلکہ اس کے عدم جواز کو بیان کیا جارہا ہے کہ لوگوں میں حلال وحرام کا فرق ختم ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ اولاد اپنی ماں کی مالک بن جائے گی۔ اس سے ام ولد کی بیع پر استدلال نہیں ہوسکتا اور سچی بات یہ ہے کہ یہ تو علامات قیامت کا بیان ہے۔ علامات قیامت میں سے بہت سی باتیں حلال ہو رہی ہیں اور بہت سی حرام ہو رہی ہیں۔

اور یہ گزر چکا ہے کہ اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اولاد نافرمان ہوجائے گی اور ماں کے ساتھ ایسا سلوک کرے گی جیسا کہ آقا اپنے غلام کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اس کا زیادہ واضح مفہوم ہے، لہٰذا اس سے ام ولد کی بیع پر استدلال کرنا کمزور ہے۔[۱۴]

۲۵۳۳ ۔ حدثنا أبو الیمان.................. وکانت سودة زوج النبی ﷺ .[راجع:۲۰۵۳].

یہ وہی واقعہ ہے جو کئی مرتبہ گزر چکا ہے، اس کی تفصیل **"کتاب الطلاق"** میں آئے گی۔ یہاں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ ہے کہ زمعہ کی جاریہ تھی۔ زمعہ کا انتقال ہو گیا اس کے باوجود اس پر ولیدہ کے لڑکے کا اطلاق کیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ام ولد کے مولیٰ کے مرنے کے بعد ضروری نہیں ہے کہ وہ آزاد ہی ہو جائے بلکہ اس کی بیع بھی جائز ہوگی۔

---

[۱۴] **والذی یترشح منه أن بیع أم الولد جائز عند المصنف کبیع المدبر عند الشافعی، قلت: أما بیع أم الولد ،فلم یذهب إلیه أحد من الفقهاء الأربعة الخ. (فیض الباری ، ج:۳ ، ص:۳۵۷ ، وعمدة القاری ، ج:۹ ، ص:۳۳۱).**

لیکن یہ استدلال بڑا کمزور ہے، اس میں آزادی اور غلامی کا کوئی ذکر نہیں ہے، صرف یہ ہے کہ ولیدہ زمعہ اس کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ لہٰذا اس سے ام ولد کی بیع کے جواز پر استدلال درست نہیں۔

(۱۰) باب بيع الولاء وهبته

۲۵۳۵ ۔ حدثنا أبو الوليد: حدثنا شعبة قال: أخبرني عبدالله بن دينار قال: سمعت ابن عمر رضي الله عنهما يقول: نهى النبي ﷺ عن بيع الولاء وعن هبته. [أنظر: ۶۷۵۶] [۱۵]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے ولاء کی بیع اور اس کے ہبہ سے منع فرمایا۔

عقد موالاۃ کی تعریف

"**ولاء**" یہ ایک رشتہ ہوتا ہے جو معتِق اور معتَق کے درمیان قائم ہو جاتا ہے جس کو ولاء عتاقہ کہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں "**آخر العصبات مولى العتاق آخر العصبات**" بن جاتا ہے اگر چہ اس کے دوسرے عصبات نہ ہوں تو یہ اس کا عصبہ ہو کر وارث ہوتا ہے۔

ایک اور ولاء ابتداءِ اسلام میں ولاء الموالات کے نام سے ہوا کرتی تھی، یعنی جب کوئی مسلمان ہوتا اور اس کے قبیلے کے لوگ وہاں نہ ہوتے تو وہ کسی کے ساتھ ولاء الموالات قائم کر لیتا تھا کہ اگر مجھ سے کوئی جنایت ہوئی تو تم دیت ادا کرنا اور میں مر گیا تو تم میرے وارث ہو گے۔

یہ ولاء الموالات وہی رشتہ ہوتا تھا جو ذوی الارحام کے بعد حصہ پاتا تھا۔ دونوں میں میراث کا یہ فرق ہے کہ ولاء اعتاق آخر العصبات ہوتا ہے، ذوی الارحام پر مقدم ہوتا ہے اور ولاء الموالات ذوی الارحام سے مؤخر ہوتا ہے۔

بہر حال یہ ایک رشتہ ہے اور اس سے ایک حق قائم ہوتا ہے کہ غلام اپنے مولیٰ کا وارث بنے۔ تو جاہلیت

---

۱۵ **وفي صحيح مسلم، كتاب العتق، رقم: ۲۷۷۰، وسنن الترمذي، كتاب البيوع عن رسول الله، باب ماجاء في كراهية بيع الولاء وهبة، رقم: ۱۱۵۷، وكتاب الولاء والهبة عن رسول الله، باب ماجاء في النهي عن بيع الاولاء وهبة، رقم: ۲۰۵۲، وسنن النسائي، كتاب البيوع، باب بيع الولاء، رقم: ۴۵۷۸، وسنن أبي داؤد، كتاب الفرائض، رقم ۲۵۳۰، وسنن ابن ماجة، كتاب الفرائض، باب النهي عن بيع الولاء وعن هبة، رقم: ۲۷۳۷، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب، رقم: ۴۳۳۲، ۵۲۳۹، ۵۵۸۶، و موطا مالك، كتاب العتق والولاء، باب مصير الولاء عن اعتق، رقم ۱۲۷۰، وسنن الدارمي، كتاب البيوع، باب في النهي عن بيع الولاء، رقم: ۲۴۵۹، وكتاب الفرائض، باب بيع الولاء، رقم: ۳۰۲۷.**

میں بعض دفعہ یہ رواج تھا کہ لوگ اپنی ولاء بیچ دیتے تھے۔ کسی سے کہتے ہیں کہ مجھے جو میراث کا حق حاصل ہے وہ میں تمہیں فروخت کرتا ہوں۔ اس کو بیع الولاء کہتے ہیں تو پیسے لے کر ان کے عوض میں ولاء بیچ دی کہ مجھے جو حق ملنے تھے وہ تم وصول کرنا مشتری اسے وصول کرتا تھا۔

یا بعض اوقات ایک دوسرے کو ہبہ کر دیتے تھے تو حضور اقدس ﷺ نے اس سے منع فرمایا۔ فرمایا کہ بیع بھی جائز نہیں اور اس کا ہبہ بھی جائز نہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنا میراث کا حق دوسرے کو فروخت کرنا چاہے اور یہ جائز نہیں۔

حقوق مجردہ کی خرید وفروخت

اس حدیث کی وجہ سے بعض فقہاء کرام نے یہ فرمایا ہے کہ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مجرد حقوق قابل بیع وشراء اور قابل انتقاع نہیں ہوتے بلکہ بیع کے لئے ضروری ہے کہ جس چیز کو بیچا جارہا ہے وہ چیز مال ہو، محض تنہا حق بیع کا محل نہیں ہوتا۔

اس حدیث کی بنا پر بیع الحقوق کے عدم جواز پر استدلال کیا گیا ہے۔[16]

لیکن ہمارے دور میں بے شمار ایسے حقوق ہیں جن کی بیع ہوتی ہے اور ان کی بیع متعارف ہے جیسے حقِ تالیف، جس میں مؤلف کو حق ہوتا ہے کہ وہ اپنی کتاب شائع کرے اور اس سے نفع کمائے۔ وہ اپنا یہ حق کسی کو فروخت کر دیتا ہے جس کو کاپی رائٹ **(Copy Right)** کہتے ہیں۔

یا کسی نے کوئی چیز ایجاد کی ہے اس کا حق، فروخت کر دیتا ہے یا کوئی خاص چیز اور اس کا نقشہ **(Design)** بنایا ہے وہ نقشہ فروخت کر دیتا ہے۔

آج کل امپورٹ لائسنس ہوتے ہیں کہ کسی کو باہر سے سامان درآمد کرنے کا لائسنس ملا ہے وہ آگے فروخت کر دیتا ہے۔ ایکسپورٹ لائسنس ہوتا ہے، اس کی بیع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کے بے شمار حقوق کی بیع آج کل بازار میں متعارف ہے۔ ان کے حکم کے سلسلے میں جب کتب فقہ کی طرف رجوع کیا جاتا ہے تو نظر آتا ہے کہ حقوق کی بیع سے فقہاء کرام نے منع فرمایا ہے اور اس کا بنیادی ماخذ یہ حدیث ہے۔

دوسری طرف بعض حقوق ایسے ہیں جن کی بیع کی اجازت فقہاء نے دی ہے۔ مثلاً راستے کی بیع کہ کسی شخص کو کسی راستے پر چلنے کا حق ہو اس کی بیع کی فقہاء حنفیہ میں سے بعض نے اجازت دی ہے۔

اسی طرح شرب کی بیع یعنی آبپاشی کا حق اس میں بھی فقہاء کا اختلاف ہے۔ بعض فقہاء نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔ تو یہ مسئلہ کہ کون سے حقوق کی بیع جائز ہے اور کون سے حقوق کی بیع ناجائز ہے، یہ بڑا پیچیدہ مسئلہ

[16] تکملة فتح الملهم، ج:۱، ص:۲۹۲، ۳۶۱.

ہے اور اس میں جو فقہاء کرام کی عبارتیں ہیں بعض اوقات ان میں تعارض معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہ بیع الحقوق سے بالکل منع کیا گیا ہے اور بعض جگہ خاص خاص حقوق کی بیع کی اجازت دی گئی ہے تو یہ مسئلہ کافی پیچیدہ ہے۔

اس مسئلے پر میں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے **"بیع الحقوق المجردة"** کے عنوان سے جس میں اس مسئلے کی تحقیق کی گئی ہے۔

حقوق کی متعدد قسمیں

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق کی متعدد قسمیں ہیں۔

یک حقوق وہ ہیں جو شرعی ہیں۔

دوسرے وہ حقوق ہیں جو عرفی ہیں۔

حقوق شرعیہ کی بیع جائز نہیں

جو حقوق شریعت نے دیئے ہیں اگر شریعت نہ ہوتی تو وہ حق نہ ہوتا۔ ان کی بیع جائز نہیں مثلاً میراث وشفعہ کا حق یہ سب حقوق شرعیہ ہیں۔

حقوق شرعیہ سے میری مراد وہ حقوق ہیں جن کو پیدا ہی شریعت نے کیا ہے، شریعت کے بغیر عرف میں وہ حقوق موجود نہیں تھے، ان کی بیع جائز نہیں ان میں یہ سب آجاتے ہیں۔ ولاء، میراث، شفعہ اسی طرح خیار مخیرہ کہ عورت کو طلاق کا اختیار دے دیا تو اس کو طلاق کا حق حاصل ہو گیا وہ اس کو فروخت نہیں کر سکتی۔

بعض حقوق کی صلح ہوسکتی ہے

البتہ ان میں سے بعض حقوق ایسے ہیں جن میں صلح ہوسکتی ہے یعنی صاحب حق یہ کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں اور اس کا اتنا معاوضہ لوں گا۔ مثلاً مرد کو حق حاصل ہے کہ جب تک چاہے بیوی کو اپنے نکاح میں رکھے۔ وہ بیوی سے کہہ سکتا ہے کہ میں اپنے اس حق سے دستبردار ہوتا ہوں اور اتنے مال کے عوض خلع کر لیتا ہوں، تو یہ خلع ہو گیا۔ اسی طرح کسی کو قتل عمد کا قصاص لینے کا حق ہے وہ صلح کر سکتا ہے کہ میں اپنے اس حق سے دستبردار ہوتا ہوں۔ مجھے اس حق کا معاوضہ دے دو۔ تو جو حقوق قابل صلح ہیں ان کے اندر صلح ہوسکتی ہے لیکن حقوق شرعیہ میں سے کسی بھی حق کی بیع نہیں ہوسکتی۔

دوسری قسم حقوق عرفیہ

حقوق عرفیہ سے یہ مراد ہے کہ وہ حقوق ایسے نہیں ہیں جو شریعت نے پیدا کئے ہوں بلکہ عرف میں پیدا

ہوئے ہیں یعنی لوگوں کو وہ حقوق عرفاً حاصل ہو گئے ہیں۔ ان حقوق کی بھی مختلف اقسام ہیں۔

حقوق عرفیہ کی اقسام

ان میں بعض اقسام وہ ہیں جن کا تعلق کسی عین کی منفعت سے ہو، جیسے راستے پر چلنے کا حق یا پانی سیراب کرنے کا حق، ان کا تعلق حقیقت میں منفعت سے ہے اور منفعت کا تعلق کسی عین سے ہے تو ان کی بیع شرعاً جائز ہے۔ جیسے راستے کا حق دے کر اس پر عوض لے سکتے ہیں۔ اسی طرح شرب کے اندر بیع وشراء ہو سکتی ہے۔

اسی میں حق اسبقیت بھی آجاتا ہے کہ کسی مباح عام جگہ پر پہلے جا کر قبضہ کر لے تو دوسروں کے مقابلے میں وہ زیادہ حقدار ہو جاتا ہے۔ جیسے ارض موات کے اندر کسی نے تحجیر کر لی، پتھر لگا دیئے تو وہ اس کے احیاء کا بہ نسبت دوسروں کے زیادہ حقدار بن گیا۔ اس کو حق اسبقیت کہتے ہیں۔ حنفیہ کے یہاں اس کا حکم یہ ہے کہ اس کا معاوضہ لینا جائز نہیں جیسے مثلاً احیاء کی تحجیر کا معاوضہ لینا جائز نہیں۔

لیکن امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کے مذہب میں اس کی اجازت ہے کہ اس کے بدلے میں معاوضہ لے لے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر مسجد میں بھی کوئی شخص پہلے سے صف اول میں جا کر بیٹھ گیا تو وہ اس کا زیادہ حقدار ہو گیا۔ اب اگر وہ دوسرے کے حق میں پیسے لے کر دستبردار ہو جائے تو یہ جائز ہے۔ یعنی یہ کہہ دے کہ تم مجھے اتنے پیسے دے دو، میں تمہیں یہ جگہ دینے کے لئے تیار ہوں۔ وہ کہتے ہیں یہ بھی جائز ہے۔

بعض وہ حقوق ہیں جن کا تعلق کسی عقد کے انشاء سے ہے یعنی یہ کہے کہ میں تم کو یہ حق دیتا ہوں، تم اس حق کو استعمال کر کے فلاں عقد کر لو۔ اس قسم کے بہت سے حقوق ہیں جیسا کہ ابھی گزرا کہ درآمد کا لائسنس، یہ بھی ایسا ہی حق ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں پاکستان سے سامان منگوانے کی اجازت ہے، باہر کے بیچنے والے سے شرکاء کا عقد کرنے کا حق حاصل ہے تو اس کی بیع تو نہیں ہو سکتی لیکن اس کا معاوضہ ان سے بطریق صلح لیا جا سکتا ہے۔ صاحب حق یہ کہے کہ میں تمہارے حق میں اپنے حق سے دستبردار ہوتا ہوں، تم استعمال کر لو، ایسا کرنا جائز ہے۔

اور اس کی نظیر میں فقہاء کرام نے ذکر کیا ہے کہ **"نزول عن وظائف بمال"** کہ کسی شخص کو تا زندگی حق ملازمت حاصل ہے، اب وہ دوسرے کے حق میں دستبردار ہو جاتا ہے کہ میں اپنی ملازمت سے تمہارے حق میں دستبردار ہوتا ہوں، تم کوشش کر کے یہاں ملازمت حاصل کر لو، تو **"نزول عن وظائف بمال"** فقہاء کرام نے جائز قرار دیا ہے، تو جس طرح یہ جائز ہے اس طرح وہ بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو حقوق شرعی نہیں ہیں اور قابل انتفاع ہیں اور ان کے انتقال میں یا تو ان کا تعلق کسی عین سے ہے یا کسی عقد کے انشاء سے ہے تو ایسے حقوق کا معاوضہ لینے کی فی الجملہ گنجائش ہے۔ لہٰذا اس تحقیق کی رو سے حق طباعت، کاپی رائٹ وغیرہ پر معاوضہ لینے کی گنجائش نکلتی ہے۔[۱۷]

---

[۱۷] راجع: تکملة فتح الملهم، ج: ١، ص: ٣٦١-٣٦٦.

پنشن کی فروخت کا مسئلہ

ہمارے زمانے میں ایک طریقہ اور معروف ہے اور وہ ہے پنشن کی فروخت۔ مثلاً ایک شخص کسی ملازمت سے ریٹائر ہوا اور ریٹائر ہونے کی وجہ سے اس کو پنشن کا حق مل جاتا ہے کہ تا عمر محکمے سے اپنی پنشن حاصل کرتا رہے۔ بعض اوقات وہ اپنی پنشن کسی کو فروخت کر دیتا ہے کہ میرے بجائے تم پنشن وصول کرو اور اس کے عوض مجھے اتنی رقم دے دو۔

یہ بالکل جائز نہیں ہے۔ اس میں غرر شدید ہے اور ربا ہے کیونکہ جو رقم لے گا اس کے معاوضے میں جو پنشن ملے گی، اس کی مقدار معلوم نہیں کہ کتنی ملے گی؟ کب تک ملے گی؟ جب اس کی مقدار معلوم نہیں تو غرر شدید ہے اور ربا کا بھی احتمال ہے، لہٰذا وہ جائز نہیں۔

البتہ بعض اوقات محکمہ جو پنشن جاری کرتا ہے اس سے صلح ہو جاتی ہے کہ میں اپنے اس حق سے دستبردار ہوتا ہوں آپ مجھے مختلف اوقات میں پیسے دینے کے بجائے اکھٹے پیسے دے دیجئے تو اس کی اجازت ہے۔ اس لئے کہ پنشن اس کا حق تھا اس نے خود اس پر صلح کر لی کہ مجھے اتنی مقدار دے دو، باقی کی بیشی معاف ہے۔

مصالحت کے حساب سے اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے لیکن تیسرے آدمی کو فروخت کرنا جائز نہیں۔

(۱۱) باب إذا أسر أخو الرجل أو عمه هل يفادى إذا كان مشركا؟

”وقال أنس: قال العباس للنبي ﷺ: فاديت نفسي وفاديت عقيلا، وكان علي له نصيب في تلك الغنيمة التي أصاب من أخيه عقيل وعمه عباس“.

قیدی کا فدیہ

اگر کسی شخص کا بھائی یا چچا قید ہو جائے تو کیا اس کا فدیہ لیا جا سکتا ہے جبکہ وہ مشرک ہو؟

اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد ایک فقہی مسئلہ میں حنفیہ کی تردید کرنا ہے۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کسی ذو رحم محرم غلام کا مالک بن جائے تو مالک بنتے ہی وہ ذو رحم محرم غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ جیسے کوئی اپنے باپ کو خرید لے، یا باپ بیٹے کو خرید لے، یا بھتیجا، چچا کو خرید لے تو جتنے بھی ذو رحم محرم ہیں ان میں سے کسی کو خریدتے ہی وہ غلام آزاد ہو جاتا ہے۔ [۱۸]

امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک

امام بخاری رحمہ اللہ اس مسلک کے قائل نہیں ہیں، ان کے نزدیک مطلق مالک ہونے سے آزادی متحقق

---

۱۸ فيض الباري، ج: ۳، ص: ۳۵۸، و عمدة القاري، ج: ۹، ص: ۳۳۷.

نہیں ہوتی جب تک وہ خود آزاد نہ کرے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کی دلیل

اپنے مسلک پر امام بخاری رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے استدلال کیا ہے۔ جب حضرت عباس رضی اللہ عنہ بدر میں قید ہو کر آئے تھے، بدر کے ستر قیدی تھے، ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ بن ابی طالب بھی داخل تھے۔ حضرت عباس حضور اکرم ﷺ کے چچا تھے اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب حضور ﷺ کے چچازاد بھائی تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حقیقی بھائی تھے۔

روایات میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جس طرح دیگر قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑا، اسی طرح حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بھی فدیہ لیا گیا۔ حضرت عباسؓ نے خود اپنا فدیہ بھی ادا کیا اور عقیل بن ابی طالب کا فدیہ بھی ادا کیا۔ پھر ان کو رہائی ملی۔

امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ جب قید ہو کر آئے تو گویا غلام ہو گئے۔ اسی طرح عقیل رضی اللہ عنہ ابن ابی طالب بھی جب قید ہو کر آئے تو وہ بھی غلام ہو گئے۔ اب یہ دونوں تمام مسلمانوں کے غلام ہو گئے۔ ان تمام مسلمانوں میں حضور ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ بھی تھے کیونکہ مال غنیمت میں ان کا بھی حصہ تھا، لہٰذا اپنے حصے کے بقدر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ پر نبی کریم ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ملکیت بھی ثابت ہوئی۔ چاہے وہ تھوڑی ہو، تین سو تیرہ مجاہدین تھے، لہٰذا تین سو تیرھواں حصہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور تین سو تیرھواں حصہ حضور ﷺ کی ملکیت میں ان کے اوپر ثابت ہو گیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ اصول درست ہوتا کہ ذورحم محرم کے مالک ہونے سے مملوک آزاد ہو جاتا ہے تو حضور ﷺ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہ کے تین سو تیرھویں حصے کے مالک بن گئے۔ تو پھر فدیہ لینا درست نہ ہوتا کیونکہ فدیہ تو تب لیا جائے جب وہ آزاد نہ ہوں۔ تو فدیہ لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو غلام قرار دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ مجرد ذورحم محرم کا مالک ہونے سے وہ آزاد نہیں ہوتا، یہ امام بخاریؒ کا استدلال ہے۔

فرمایا **"إذا أسر أخو الرجل أو عمه"** جب کسی کا بھائی یا اس کا چچا قید ہو جائے **"هل يفادى إذا كان مشركا؟"** تو کیا اس کا فدیہ ادا کیا جائے جبکہ وہ مشرک ہو یعنی غلام سمجھ کر اس کا فدیہ لیا جائے۔ **"وقال أنس"** حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے نبی کریم ﷺ سے عرض کیا تھا کہ میں نے اپنا فدیہ بھی دیا اور اپنے چچازاد بھائی عقیل رضی اللہ عنہ کا فدیہ بھی دیا۔ یہ حدیث کتاب الصلوٰۃ میں بھی گزر چکی ہے۔

"وكان على له نصيب فى تلك الغنيمة" اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا بھی اس مال غنیمت میں ایک

حصہ تھا، اور عقیل رضی اللہ عنہ اور عباس رضی اللہ عنہ کی طرف سے جو غنیمت ملی، اس میں ان کا بھی حصہ تھا، لہٰذا یہ مشاع طور پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور عقیل رضی اللہ عنہ کے مالک تھے۔ اس کے باوجود ان کو آزاد نہیں قرار دیا گیا۔

معلوم ہوا کہ ذو رحم محرم کے مالک ہونے سے آزادی متحقق نہیں ہوتی۔ یہ لمبا چوڑا امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کے استدلال کا جواب

امام بخاری رحمہ اللہ کے اس لمبے چوڑے استدلال کا مختصر سا جواب یہ ہے کہ وہاں ملکیت ثابت نہیں ہوئی تھی، اس لئے کہ ملکیت ثابت ہونے کے لئے دو باتوں کی ضرورت ہے۔

ایک یہ کہ امام فیصلہ کرے کہ جو قیدی ہیں ان کو رقیق بنایا جائے گا یعنی استرقاق کا فیصلہ کرے۔ پہلی بات یعنی استرقاق کا فیصلہ کرنا اس لئے ضروری ہے کہ آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ امام کو چار اختیار رہیں:

۱ ...... چاہے جنگی قیدیوں کو قتل کردے۔

۲ ...... چاہے ان کو ویسے ہی بغیر فدیہ لئے چھوڑ دے۔

۳ ...... چاہے فدیہ لے کر چھوڑ دے۔

۴ ...... اور چاہے غلام بنائے۔

تو پہلے امام کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ ان میں سے کون سا کام کرنا ہے، اس لئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محفل منعقد ہوئی۔ آپ ﷺ نے ان قیدیوں کا مسئلہ رکھا۔ کسی نے کہا قتل کریں، کسی نے کہا فدیہ لے کر چھوڑ دیں تو ابھی تک استرقاق کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔

دوسرا یہ کہ غلام بنا کر لوگوں میں تقسیم کردے کہ یہ فلاں کا ہے اور یہ فلاں کا ہے تب ملکیت ثابت ہوگی، اگر استرقاق کا فیصلہ ہو بھی جائے پھر بھی اس وقت تک ملکیت ثابت نہیں ہوتی، جب تک کہ تقسیم کا عمل نہ ہو اور یہاں تقسیم نہیں ہوئی تھی۔

لہٰذا یہ کہنا کہ حضور ﷺ اور حضرت علی، حضرت عباس اور حضرت عقیل رضی اللہ عنہم کے مالک بن گئے تھے۔ یہ درست نہیں، لہٰذا اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں کہ "**قال رسول اللہ ﷺ ثم من ملک ذا رحم محرم فھو حر**" یہ حدیث میں صراحتاً موجود ہے۔[19]

---

[19] واجیب : بأن الکافر لایملک بالغنیمة ابتداء ، بل یتخیر فیه بین القتل والاسترقاق والفداء ، فلایلزم العتق بمجرد الغنیمة. عمدة القاری ، ج: ۹ ، ص: ۳۳۹ ، وتکملة فتح الملهم ، ج: ۱ ، ص: ۲۹۸ ، والمستدرک علی الصحیحین ، ج: ۲ ، ص: ۲۳۳ ، وسنن الترمذی ، باب ماجاء فیمن ملک ذا رحم محرم ، رقم : ۱۳۶۵ ، ج: ۳ ، ص: ۶۴۶ ، بیروت .

۲۵۳۷ ـ حدثنا إسماعيل بن عبدالله: حدثنا إسماعيل بن إبراهيم بن عقبة، عن موسى بن عقبة، عن ابن شهاب قال: حدثني أنس ﷺ أن رجالا من الأنصار استأذنوا رسول الله ﷺ فقالوا: ائذن لنا فلنترک لابن أختنا عباس فداء ه، فقال: ((لا تدعون منه درهما)). (أنظر: ۳۰۴۸، ۴۰۱۸). [۲۰]

یعنی صحابہ کرام ﷺ نے یہ پیشکش کی تھی کہ یا رسول اللہ ﷺ اجازت دیجئے ہم اپنے بھتیجے عباس ﷺ کے فدیہ کو چھوڑ دیں یعنی اور قیدیوں سے تو فدیہ وصول کرلیں لیکن عباس ﷺ سے فدیہ وصول نہ کریں کیونکہ انصار نے کہا تھا کہ یہ ہمارے بھانجے ہیں، بھانجے اس اعتبار سے کہ بنونجار قریش کے ننھیال تھے۔ اس واسطے انہوں نے بھانجے کہا۔

"فقال لاتدعون منه درهما" آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایک درہم بھی مت چھوڑنا۔ پورا فدیہ لوتا کہ کوئی کہنے والا یہ نہ کہے کہ حضور ﷺ نے اپنے رشتہ دار کی رعایت کی۔

(۱۳) باب من ملک من العرب رقيقا فوهب وباع وجامع وفدى وسبى الذرية

وقول الله تعالىٰ ﴿عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلَى شَيْءٍ وَّمَنْ رَّزَقْنَاهُ مِنَّا رِزْقًا حَسَنًا فَهُوَ يُنْفِقُ مِنْهُ سِرًّا وَّجَهْرًا هَلْ يَسْتَوُوْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ [۲۱]

یہ باب عرب کے لوگوں کو غلام بنانے کے بارے میں قائم کیا ہے، اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ عربوں کو غلام بنانا جائز ہے یا نہیں؟

عربوں کو غلام بنانے کے بارے میں اقوال

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ عرب میں جو بالغ مرد ہیں ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا۔[۲۲] ان میں تو دو ہی باتیں ہیں یا تو وہ اسلام لائیں یا قتل ہو جائیں ان کو غلام نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ جزیرہ عرب میں جزیہ قبول نہیں۔ جزیرہ عرب کو اللہ تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کا قلعہ بنایا ہے، لہٰذا اس میں **"إما الإسلام إما السيف"** جزیہ کا ذکر نہیں، اس طرح جو گرفتار ہوں وہ یا تو اسلام لائیں یا قتل ہو جائیں استرقاق کی گنجائش نہیں لیکن یہ حکم بالغ مردوں کے لئے ہے، بچوں اور عورتوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔

۲۰ انفرد به البخاري. ۲۱ [النحل: ۷۵]

۲۲ فيض الباري، ج: ۳، ص: ۳۵۸، وفتح الباري، ج: ۵، ص: ۱۷۰.

امام شافعی اور امام بخاری رحمہما اللہ کا مسلک

امام شافعی اور امام بخاری رحمہما اللہ کا بھی مسلک ہے کہ عرب ہوں یا عجم، سب کو غلام بنانا جائز ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے " **باب من ملک من العرب رقیقاً** " کہ عرب میں سے کوئی کسی غلام کا مالک ہو جائے پھر وہ کسی کو ہبہ کر دے یا بیع کرے اگر کسی کنیز کا مالک ہوا ہے تو اس کے ساتھ جماع کرے یا فدیہ کرے یا اس کی اولاد کو غلام بنائے، یہ سب جائز ہے۔

یہاں مختلف باتیں ذکر کی ہیں، ہبہ، جماع، فدیہ، سبی ان میں سے ہر ایک پر آگے ایک ایک حدیث لے کر آرہے ہیں، کہیں عرب کو رقیق بنا کر ہبہ کرنے کا ذکر ہے، کہیں بیع کا ذکر ہے، کہیں فدیہ اور جماع کا ذکر ہے لیکن ان میں سے ہر ایک کا جواب حنفیہ کے پاس موجود ہے۔

جہاں ہبہ کا ذکر ہے وہ ہوازن کا واقعہ ہے اول تو وہ ہبہ ہی نہیں تھا، لیکن اگر ہبہ بھی ہو تو وہاں اس بات کی تصریح ہے کہ عورتیں قید ہوئی تھیں، کوئی مرد قید نہیں ہوا تھا۔

اسی طرح آگے ذکر ہے کہ آپ ﷺ نے بنو المصطلق پر حملہ کیا اور ان کے لوگوں کو ان کی ذریتوں کو قید کیا۔ اس میں بھی کہیں صراحت نہیں ہے کہ بالغ مرد قید کئے گئے' عورتوں کا ذکر آیا ہے بچوں کا ذکر آیا ہے۔ حضرت جویریہ رضی اللہ عنہا ان میں شامل تھیں لیکن بالغ مردوں کا ذکر نہیں ہے۔

آگے واقعہ ذکر کیا ہے کہ بنو تمیم کی ایک لڑکی' حضرت عائشہؓ کے پاس کنیز تھی۔ آپ ﷺ نے اس کو آزاد کرنے کا حکم دیا۔ یہاں پر بھی لڑکی کا ذکر ہے' بالغ مرد کا ذکر موجود نہیں۔

خلاصہ یہ کہ جتنی بھی احادیث آئی ہیں' ان سب میں سے کوئی بھی ایسی نہیں ہے جس میں اس بات کی صراحت ہو کہ عرب کے بالغ مرد کو قید کیا گیا۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے قرآن کریم کی آیت " **ضرب اللّٰہ مثلاً عبدا...... لا یعلمون** " سے استدلال کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عبد مملوک کی مثال دی جو کسی چیز پر قادر نہیں اور دوسری طرف وہ ہے جس کو ہم نے اپنے پاس سے رزق دیا ہے۔ رزق حسن اور وہ اسے کھلے عام اور پوشیدہ طریقے سے اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو وہ برابر نہیں ہوتے۔ یہاں عربوں کو مثال دی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ عبد مملوک کی مثال دیتے ہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اس میں عجمی، عربی کی تفریق نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ عرب ہو یا عجم، ہر ایک کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ استدلال بڑا کمزور ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال دی ہے کہ ایک غلام آدمی ہو تو اس

کی ملکیت میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور آزاد ہوتا ہے تو اس کے پاس مال و دولت ہے اور وہ اس میں سے خرچ کرتا ہے، تو اس میں یہ بات کہ عرب ہے یا عجم ہے اس کا ذکر ہونے کا کوئی موقع نہیں، کوئی محل نہیں، لہٰذا اس سے یہ استدلال کرنا کہ عرب کے بالغ لوگ بھی غلام بن سکتے ہیں، یہ بہت ہی بعید استدلال ہے۔[۲۳]

۲۵۳۹، ۲۵۴۰ ۔ حدثنا...... فاديت نفسي وفاديت عقيلا. [راجع: ۲۳۰۷، ۲۳۰۸]

اس حدیث میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے فدیہ کا معاملہ دوبارہ لائے ہیں کہ وہ غلام بن گئے تھے، ان کا فدیہ دیا گیا تھا اگر غلام نہ بنتے تو فدیہ کیوں دیا جاتا؟

اس کا جواب پہلے بھی دیا جا چکا ہے کہ استرقاق کا فیصلہ نہیں ہوا تھا اور تقسیم عمل میں نہیں آئی تھی۔

۲۵۴۱ ۔ حدثنا علي بن الحسن :أخبرنا عبدالله :أخبرنا ابن عون ،قال : كتبت إلى نافع فكتب إلى أن النبي ﷺ أغار على بني المصطلق وهم غارون وأنعامهم تسقي على الماء فقتل مقاتلهم وسبى ذراريهم ، وأصاب يومئذ جويرية ، حدثني به عبد الله ابن عمرو كان في ذلك الجيش.

نبی کریم ﷺ نے بنو المصطلق پر حملہ کیا **"وھم غارون"** اس حالت میں کہ وہ غفلت میں تھے **"أى على غره منهم"** یعنی ان کو پتہ نہیں تھا کہ ان پر کوئی حملہ آور ہونے والا ہے۔

(۱۵) باب قول النبي ﷺ :((العبيد إخوانكم فاطعموهم مما تأكلون))،

وقول الله تعالى:﴿وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلاَ تُشْرِكُوْ ابِهِ شَيْئًا وَبِالْوَ الِدَيْنِ إِحْسَاناًوَبِذِیْ الْقُرْبىٰ وَالْيَتَامىٰ وَالْمَسَاكِيْنِ وَالْجَارِ ذِیْ الْقُرْبىٰ وَالْجَا رِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ إِن اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَا نَ مُخْتَالًا فَخُوْراً ﴾[۲۴]

قال أبو عبد الله : ﴿ذى القربى﴾:القريب،﴿الصاحب بالجنب﴾:الغريب.

۲۵۴۵ ــ حدثنا آدم بن أبي أياس :حدثنا شعبة:حدثنا واصل الأحدب قال: سمعت المعرور بن سويد قال :رأيت أباذر الغفاري رضی اللہ عنہ وعليه حلة وعلى غلامه حلة، فسألناه عن ذلك فقال : إني ساببت رجلا فشكاني إلى النبي ﷺ فقال النبي ﷺ : ((أعيرته بامه ؟))ثم قال :((إن اخوانكم خولكم جعلهم الله تحت أيديكم ،فمن كان أخوه تحت يده فليطعمه مما يأكل وليلبسه مما يلبس، ولا تكلفوهم ما يغلبهم، فإن كلفتموهم ما يغلبهم فاعينوهم)). [راجع: ۳۰]

---

[۲۳] فيض الباري ، ج: ۳ ، ص: ۳۵۸ . [۲۴] [النساء:۳۶]

"إن اخوانكم خولكم" ۔ "خول" خدام کو کہتے ہیں یعنی خدام تمہارے بھائی ہیں ۔عبارت کا تقاضا یہ تھا کہ یوں کہا جاتا "إن خولكم اخوانكم" لیکن فرمایا "إن اخوانكم خولكم" "اخوان" کو مبتدا بنایا خول کو خبر بنایا، یہ اس بات کی مزید تاکید ہے کہ ان کا بھائی ہونا، ان کے خادم ہونے پر مقدم ہے ۔ گویا اصلاً وہ تمہارے بھائی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو تمہارا خادم بنایا ہے تو بظاہر یہ بتانے کے لئے کہ اخوت کا رشتہ خادمیت کے رشتے پر مقدم ہے، "اخوانكم" کو مقدم فرمایا "خولكم" مؤخر فرمایا۔

(۱٦)باب العبد إذا أحسن عبادة ربه ونصح سيده

۲۵۴۶ ـ حدثنا عبد الله بن مسلمة ، عن مالک ، عن نافع ،عن ابن عمر رضى الله عنهما :أن رسول الله ﷺ قال :((العبد إذا نصح سيده وأحسن عبادة ربه كان له أجره مرتين)). [أنظر: ۲۵۵۰]. [۲۵]

۲۵۴۷ ـ حدثنا محمد بن كثير : أخبرنا سفيان، عن صالح، عن الشعبى،عن أبى بردة عن أبى موسى الأشعرى رضى الله عنهما قال :قال النبى ﷺ:((أيما رجل كانت له جارية أدبها فأحسن تعليمها،وأعتقها وتزوجها فله أجران، وأيما عبد أدى حق الله وحق مواليه فله أجران)). [راجع :۹۷].

یعنی جو غلام ہو اور صالح ہو تو اس کے لئے دو اجر ہیں ۔ ایک صالح ہونے کا اور ایک خادم ہونے کی وجہ سے مالک کی خدمت کرنے کا دہرا اجر ہے۔

۲۵۴۸ ـ حدثنا بشر بن محمد : أخبرنا عبد الله : أخبرنا يونس، عن الزهرى سمعت سعيد بن المسيب يقول :قال أبو هريرة ؓ : قال رسول الله ﷺ : ((للعبد المملوک الصالح أجران))،والذى نفسى بيده لو لا الجهاد فى سبيل الله والحج وبر أمى لأحببت أن أموت وأنا مملوک.

حضرت ابو ہریرہ ؓ فرماتے ہیں کہ اگر جہاد فی سبیل اللہ، حج اور والدہ کی اطاعت یہ اعمال نہ ہوتے تو میں اس بات کو پسند کرتا کہ غلام ہو کر مروں، کیونکہ آپ ﷺ نے اس کی یہ فضیلت بیان فرمائی ہے کہ اس کو دہرا اجر ملے گا۔

---

[۲۵] وفى صحيح مسلم ، كتاب الأيمان ،باب ثواب العبد وأجره اذا نصح لسيده واحسن عبادة الله ، رقم : ۳۱۴۳، وسنن أبى داؤد ، كتاب الأدب ، باب ماجاء فى المملوک اذا نصح ، رقم : ۴۵۰۱، ومسند احمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب ، رقم : ۴۴۴۴، ۴۴۷۶، ۵۵۲۳، ۹۹۱، وموطأ مالک ، كتاب الجامع ، باب ماجاء فى المملوک وهبة ، رقم : ۱۵۵۴.

(۱۷) باب كراهية التطاول على الرقيق، وقوله: عبدي أو أمتي

وقال الله تعالى: ﴿وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ﴾ [۲۶] وقال ﴿عبداً مملوكا﴾ [النحل:۷۵] ﴿وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ﴾ [۲۷] وقال: ﴿مِنْ فَتَيَاتِكُمُ الْمُؤْمِنَاتِ﴾ [۲۸] وقال النبي ﷺ: ((قوموا إلى سيدكم))، ﴿وَاذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ﴾ [۲۹] عند سيدك. و((من سيدكم؟))

۲۵۵۲ ۔ حدثنا محمد: حدثنا عبد الرزاق: أخبرنا معمر، عن همام بن منبه: أنه سمع أباهريرة رضی اللہ عنہ يحدث عن النبي ﷺ قال: ((لا يقل أحدكم: أطعم ربك، وضئ ربك أسق ربك. وليقل: سيدي مولاي. ولا يقل أحدكم: عبدي أمتي، وليقل: فتاي وفتاتي وغلامي)). [۳۰]

"عبدی" یا "امتی" سے خطاب کا حکم

غلام کے ساتھ تکبر کے ساتھ پیش آنا جس سے اس کی توہین ہو "قوله عبدي وأمتي" اور غلام کو میرا غلام، میری امۃ (بندی) کہنا پسندیدہ نہیں اگر چہ جائز ہے لیکن اس میں کراہت تنزیہی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ عبدی اور امتی مت کہو بلکہ فتای وفتاتی کہو۔

کراہت کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک طرح سے ترفع اور تکبر پایا جاتا ہے کہ یہ میرا غلام ہے اور یہ بات پسندیدہ نہیں۔ معاملات میں تو "إخوانكم خولكم" کہہ کر بھائی بنا دیا، اب نام کا غلام رہ گیا تھا، آپ ﷺ نے اس نام کو بھی پسند نہیں فرمایا بلکہ فرمایا کہ فتای وفتاتی کہو۔

البتہ امام بخاریؒ کچھ ایسی آیات اور احادیث بھی لائے ہیں جن سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اگر چہ منع تو فرمایا گیا ہے لیکن وہ ممانعت تحریمی نہیں، تنزیہی ہے اور عبد اور امۃ کہنا بھی جائز ہے اور مولی کو سید کہنا بھی جائز ہے۔

البتہ مولیٰ کو رب کہنے سے منع کیا گیا ہے کہ مولیٰ کے لئے رب کا لفظ استعمال نہ کرو لیکن قرآن کریم نے رب کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے "واذ کرني عند ربك" معلوم ہوا کہ فی نفسہ کہنا جائز ہے لیکن عوام کے لئے پسندیدہ نہیں، کراہت تنزیہی ہے۔

---

[۲۶] [النور:۳۲] [۲۷] [یوسف:۲۵] [۲۸] [النساء:۲۵] [۲۹] [یوسف:۴۲]

[۳۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الالفاظ من الادب وغيرها، باب حكم اطلاق لفظة العبد والامة والمولى والسيد، رقم: ۴۱۷۷، وسنن أبي داؤد، كتاب الادب، باب لايقول المملوك ربي وربتي، رقم: ۴۳۲۴، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۷۸۵۰، ۹۱۰۵، ۹۳۵۲، ۹۵۸۵، ۹۸۹۱، ۱۰۰۳۲، ۱۰۰۱۹۶.

(۱۸) باب إذا أتى أحدكم خادمه بطعامه

۲۵۵۷ ـ حدثنا حجاج بن منهال: حدثنا شعبة قال: أخبرني محمد بن زياد قال: سمعت أبا هريرة ﷺ عن النبي ﷺ قال: ((إذا أتى أحدكم خادمه بطعامه، فإن لم يجلسه معه فليناوله لقمة أو لقمتين، أو أكلة أو أكلتين، فإنه ولي علاجه)). [أنظر: ۵۴۶۰] [۳۱]

"**فإنه ولي علاجه**" یعنی علاج الطعام سے مراد ہے کھانا بنانا، کھانے کو بنانے کی ذمہ داری اس بے چارے نے اٹھائی ہے۔ اس کی مشقت اس نے برداشت کی ہے، اس لئے یہ بری بات ہے کہ اس کھانے میں سے اس کو کچھ نہ کھلاؤ، لہٰذا اس کھانے میں سے اس کو بھی کچھ نہ کچھ کھلانا چاہئے۔

(۱۹) باب: العبد راع في مال سيده، ونسب النبي ﷺ المال إلى السيد

فرمایا "**ونسب النبي ﷺ المال إلى السيد**" اور استدلال فرما رہے ہیں "**الخادم في مال سيده راع**" مال کی اضافت سید کی طرف کی، معلوم ہوا کہ غلام کے قبضے میں جو کچھ بھی مال ہوتا ہے وہ اس کے مولیٰ کا ہوتا ہے، اس کی اپنی ملکیت میں کوئی چیز نہیں ہوتی۔

---

[۳۱] وفي صحيح مسلم، كتاب الأيمان، باب اطعام المملوك مما ياكل والباسه مما يلبس ولايكلفه، رقم: ۳۱۴۲، وسنن الترمذي، كتاب الاطعمة عن رسول الله، باب ماجاء في الأكل مع المملوك والعيال، رقم: ۱۷۷۶، وسنن ابن ماجة، كتاب الاطعمة، باب اذا اتاه خادمه بطعامه فليناوله منه، رقم: ۳۲۸۱، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۰۳۶، ۷۲۰۱، ۷۴۰۱، ۷۴۷۲، ۷۶۴۰، ۷۸۴۹، ۸۹۰۱، ۸۹۳۹، ۹۱۹۱، ۹۵۸۱، ۹۷۴۱، ۹۸۷۶، ۱۰۱۶۳، وسنن الدارمي، كتاب الاطعمة، باب في اكرام الخادم عند الطعام، رقم: ۱۹۸۴.

كتاب المكاتب

٢٥١٧ - ٢٥٥٩

۵۰ ۔ کتاب المکاتب

باب إثم من قذف مملوکه

(۱) باب المكاتب ونجومه، فی کل سنة نجم

وقوله: ﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ﴾[۱]

وقال روح، عن ابن جريج: قلت لعطاء: أواجب علی إذا علمت له ما لا أن أكاتبه؟ قال: ما أراه إلا واجبا. وقال عمرو بن دينار: قلت لعطاء: أتأثره عن أحد؟ قال: لا. ثم أخبرني أن موسى بن أنس أخبره أن سيرين سأل انساً المكاتبة وكان كثير المال فأبى، فانطلق إلى عمر رضی اللہ عنہ فقال: كاتبه فأبى فضربه بالدرة ويتلو عمر ﴿فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً﴾[۲] فكاتبه.

''نجم'' کے معنی ''قسط'' کے ہیں۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح مکاتبت بدل عقد کتابت سے ہوسکتی ہے، اسی طرح قسط وار بھی ہوسکتی ہے کہ مکاتَب قسط وار ادائیگی کرے۔

آیت کی تشریح

آیت کریمہ میں فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ يَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ مِمَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰكُمْ﴾[۳]

ترجمہ: ''اور تمہاری ملکیت کے غلام باندیوں میں سے جو

---

[۱] [النور:۳۳] [۲] [النور:۳۳] [۳] [النور:۳۳]

مکاتبت کا معاہدہ کرنا چاہیں، اگر اُن میں بھلائی دیکھو تو اُن
سے مکاتبت کا معاہدہ کرلیا کرو، اور (مسلمانو!) اللہ نے
تمہیں جو مال دے رکھا ہے، اُس میں سے ایسے غلام
باندیوں کو بھی دیا کرو''۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ایمان جن کے مالک ہیں یعنی غلام ان میں سے جو لوگ کتابت طلب کریں **"یبتغون الکتاب"** یعنی تمہارے غلاموں میں سے جو مکاتب بننا چاہیں، مکاتبت کا عقد کرنا چاہیں **"فکاتبوھم"** تو تم ان سے مکاتبت کرلو، اگر تم ان میں خیر دیکھو خیر پاؤ۔

خیر سے کیا مراد ہے؟

بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہاں خیر سے مراد مال ہے کہ اگر تم یہ دیکھو کہ یہ اچھے قابل غلام ہیں اور پیسہ کما سکتے ہیں اور کما کردے سکتے ہیں تو ان سے کتابت کرلو۔

بعض نے کہا کہ خیر سے مراد یہ ہے کہ اگر ان کے اندر صلاحیت کے آثار دیکھو تو اس صورت میں بہتر ہے کہ ان کو مکاتب بنا کر آزاد کردو۔

"وَّاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِيْٓ اٰتٰىكُمْ" پھر دوسروں کو حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال دیا ہے وہ ان کو دو تاکہ یہ اپنا بدل کتابت ادا کر کے آزاد ہوسکیں۔

آگے فرماتے ہیں **"وقال روح عن ابن جریج قلت لعطاء"** ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطا سے پوچھا کہ جب مجھے پتہ ہو کہ اس کے پاس مال ہے تو کیا مجھ پر واجب ہے کہ اس سے مکاتبت کرلوں؟ **"فکاتبوھم"** امر کا صیغہ ہے تو کیا میرے لئے مکاتبت بنانا واجب ہے۔

"قال ما أراه إلا واجبا" عطا نے کہا کہ میرا تو گمان یہ ہے کہ واجب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عطا کا مسلک یہ تھا کہ اگر غلام کے پاس مال ہو تو مولیٰ کے ذمہ واجب ہے کہ اس کو مکاتب بنائے اور اس سے عقد کتابت کرے۔

"وقال عمرو بن دینار" عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ میں نے عطا سے کہا **"أتأثره عن احد"** کہ کیا آپ اپنا یہ مسلک کسی سے روایت کرتے ہیں، اثر کے معنی ہیں روایت کرنا یعنی کیا آپ اپنا مسلک کسی صحابی رضی اللہ عنہ یا رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں؟ **"قال لا"** انہوں نے کہا کسی سے روایت نہیں کرتا۔

"ثم أخبرنی" بعد میں انہوں نے مجھے یہ روایت سنائی کہ موسیٰ بن انس رضی اللہ عنہ نے ان کو یہ خبر دی کہ سیرین نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مکاتبت طلب کی تھی۔ سیرین، حضرت انس رضی اللہ عنہ کے غلام تھے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ آپ مجھے مکاتب بنا دیجئے **"وکان کثیر المال"** اور وہ بڑے مالدار تھے **"فأبی"** حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مکاتب بنانے سے انکار کیا۔

سیرین نے تجارت سے بہت مال کما لیا تھا۔ انہوں نے چاہا کہ میں مکاتب بن جاؤں اور پیسے ادا کر کے آزاد ہو جاؤں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا کہ میں مکاتب نہیں بناتا۔

"فانطلق إلی عمر رضی اللہ عنہ" سیرین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ تم سے کتابت کرنا چاہ رہے ہیں ان سے مکاتبت کرلو۔ **"فابی"** حضرت انس رضی اللہ عنہ نے مکاتب بنانے سے انکار کیا۔ **"فضربه الدرة"** حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کے درہ لگایا **"ویتلو عمر رضی اللہ عنہ"** اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ ﴿**فَكَاتِبُوْهُمْ إِنْ عَلِمْتُمْ فِيْهِمْ خَيْراً**﴾ تلاوت کر رہے تھے۔ بعد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ نے سیرین سے مکاتبت کر لی۔

اس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے نزدیک بھی اگر غلام ایسا مطالبہ کرے تو مکاتب بنالینا چاہئے۔ گویا حضرت عطاءؒ نے اپنی تائید میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر پیش کیا۔

بعض لوگوں نے کہا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مذہب یہ نہیں تھا بلکہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے بے تکلفی میں محض انہوں نے مشورہ دیا اور جب انہوں نے مشورہ قبول نہ کیا تو جو درّہ لگایا وہ بھی بے تکلفی میں لگایا۔

(۴) باب بیع المکاتب إذا رضی

"وقالت عائشة: هو عبد ما بقي عليه شيء. وقال زيد بن ثابت: مابقي عليه درهم. وقال ابن عمر: هو عبد إن عاش وإن مات وإن جنى ما بقي عليه شيء".

۲۵۶۴ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف: أخبرنا مالك، عن يحيى بن سعيد، عن عمرة بنت عبد الرحمن: أن بريرة جاءت تستعين عائشة أم المؤمنين رضي الله عنها، فقالت لها: إن أحب أهلك أن أصب لهم ثمنك صبة واحدة وأعتقك فعلت. فذكرت بريرة ذلك لأهلها فقالوا: لا، إلا أن يكون الولاء لنا، قال مالك: قال يحيى: فزعمت عمرة أن عائشة ذكرت ذلك لرسول الله ﷺ: ((اشتريها وأعتقيها، فإنما الولاء لمن أعتق)). [راجع: ۴۵۶]

یہ مکاتب کی بیع پر باب قائم کیا ہے، جس میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مکاتب کی بیع جائز ہے۔

مکاتب کی بیع میں فقہاء کا اختلاف

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مکاتب کی بیع ہوسکتی ہے یعنی ایک شخص نے اپنے غلام کو مکاتب بنایا،

بعد میں کسی وقت اسے کسی اور کے ہاتھ فروخت کردے تو جب تک مکاتب نے بدل کتابت ادا نہیں کیا، فروخت کرسکتا ہے۔[۴]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کہتے ہیں کہ جب تک وہ اپنے عجز کا اعلان نہ کردے کہ جناب میں یہ پیسہ نہیں دے سکتا اس وقت تک اس کی بیع جائز نہیں ہے۔[۵]

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ ایک تو حضرت عائشہ اور بریرۃ رضی اللہ عنہما کے واقعہ سے استدلال فرمارہے ہیں کہ حضرت بریرۃؓ کو ان کی اولیاء نے مکاتب بنایا تھا۔ پھر ان سے حضرت عائشہؓ نے خریدلیا تو یہ مکاتب کی بیع ہوئی۔

حنفیہ کی جانب سے جواب

حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ بیع اس وقت ہوئی جب حضرت بریرۃؓ عاجز ہوگئی تھیں۔ پیچھے روایت میں گزر چکا ہے کہ ایک پیسہ بھی نہیں ادا کر پائیں اور خود ہی آکر کہا کہ آپ خرید لیجئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے اعلان کردیا کہ میں بدل کتابت ادا کرنے کی حالت میں نہیں ہوں۔ لہٰذا آپ مجھے خرید لیجئے تو جب انہوں نے عجز کا اعلان کردیا تب بیع ہوئی، لہٰذا اس سے استدلال نہیں ہوسکتا۔

آگے استدلال فرماتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ **"هو عبد ما بقي عليه شيء"** مکاتب عبد رہتا ہے جب تک کہ اسکے ذمہ ایک پیسہ بھی باقی ہو۔ سارا بدل کتابت ادا کردیا۔ صرف ایک روپیہ رہ گیا، تب بھی وہ عبد ہی ہے، اس سے استدلال کرتے ہیں کہ جب عبد ہے تو اس کی بیع بھی جائز ہے۔

حضرت زید بن ثابتؓ فرماتے ہیں **"مابقي عليه درهم"** جب تک ایک درہم بھی باقی ہو وہ عبد ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ **"هو عبد إن عاش وإن مات وإن جني ما بقي عليه شيء"** جب تک اس پر ایک پیسہ بھی باقی ہے اگر زندہ رہے تو عبد بن کر رہے گا جس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک شاید اس کی بیع بھی جائز ہو **"وإن مات"** اور اگر مرگیا تو غلامی کی حالت میں مرے گا۔

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر مکاتب مرجائے اور پیچھے اپنا مال چھوڑ کر گیا ہو تو اگر اس کا مال اتنا ہے جس سے بدل کتابت ادا کیا جاسکے تو اس کو زندگی کے آخری جز میں آزاد تصور کیا جائے گا اور اگر مال بدل کتابت سے

---

[۴]، [۵] فيض الباري، ج:۳، ص:۳۶۴.

زیادہ ہے تو وہ اس کے ورثاء میں تقسیم ہوگا۔ "**وإن جنی**" اور اگر وہ کوئی جنایت کرے تب بھی اس کے اوپر عبد کے احکام جاری ہوں گے، جب تک کہ اس کے ذمہ ایک پیسہ بھی باقی ہے۔

(۵) باب إذا قال المکاتب: إشترني وأعتقني، فاشتراه لذٰلک

۲۵۶۵ ـ حدثنا أبو نعیم: حدثنا عبد الواحد بن أیمن عن أبیه قال: دخلت علی عائشة رضی اللّٰہ تعالیٰ عنها فقلت: کنت غلا ما لعتبة بن أبی لهب ومات وورثنی بنوه، وإنهم باعو نی من ابن أبی عمرو فاعتقنی ابن أبی عمرو، واشترط بنو عتبة الولاء فقالت: دخلت بریرة و هی مکاتبة فقالت: اشترینی فأعتقینی. قالت: نعم، قالت: لا یبیعونی حتی یشترطوا ولائی. فقالت: لا حاجة لی بذٰلک، فسمع بذٰلک النبی ﷺ. أوبلغه. فذکر ذلک لعائشة، فذکرت عائشة ما قالت لها، فقال: ((اشتریها فأعتقیها ودعیهم یشترطوا ما شاؤا)) فاشترتها عائشة فأعتقتها واشترط أهلها الولاء. فقال النبی ﷺ: ((الولاء لمن أعتق وإن اشترطوا مائة شرط)).

یہ ایمن کا واقعہ ذکر کیا ہے کہ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس آیا میں نے کہا میں عتبہ بن ابولہب کا غلام تھا، وہ مر گیا اور اس کے بیٹے میرے وارث بن گئے۔ پھر انہوں نے مجھے ابن ابی عمرو المخزومی کے ہاتھ بیچ دیا۔ اس نے مجھے آزاد کر لیا۔

بنو عتبہ نے جب ان کے ہاتھ بیچا تھا۔ تو یہ شرط لگائی تھی کہ اس کی ولاء ہمیں ملے گی۔ اب ابن ابو عمرو نے مجھے آزاد کر دیا ہے تو عتبہ بن ابولہب کے بیٹے میری ولاء کا مطالبہ کر رہے ہیں، کیا ان کا یہ مطالبہ کرنا درست ہے یا نہیں؟

(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنا واقعہ سنایا جو کئی بار گزر چکا ہے)

كتاب الهبة وفضلها والتحريض عليها

٢٥٦٦ - ٢٦٣٦

۵۱ - کتاب الهبة وفضلها والتحریض علیها

(۱) باب فضل الهبة

۲۵۶۶ - حدثنا عاصم بن علی : حدثنا ابن أبی ذئب ، عن المقبری ، عن أبیه ، عن أبی هریرة ﷺ عن النبی ﷺ قال : ((یا نساء المسلمات ، لا تحقرن جارة لجارتها ولو فرسن شاة)). [أنظر: ۶۰۱۷] [۱]

کوئی پڑوسن اپنی کسی پڑوسن کے ہدیے کی تحقیر نہ کرے چاہے وہ ہدیہ بکری کا ایک کھر ہی کیوں نہ ہو یعنی اگر کسی پڑوسن نے ہدیے کے طور پر بکری کا کھر بھیجا ہے تو جس کے پاس بھیجا گیا ہے وہ اس کی تحقیر نہ کرے کہ میرے پاس کیا بھیجا ہے بلکہ اگر کوئی مسلمان ہدیہ بھیجے تو چاہے وہ مقدار میں تھوڑا ہی کیوں نہ ہو محبت سے اس کی قدر کرنی چاہئے۔

(۲) باب القلیل من الهبة

۲۵۶۸ - حدثنا محمد بن بشار : حدثنا ابن أبی عدی ، عن شعبة ، عن سلیمان ، عن أبی حازم ، عن أبی هریرة ﷺ عن النبی ﷺ قال : ((لو دعیت إلی ذراع أو کراع لأجبت ، ولو أهدی إلی ذراع أو کراع لقبلت)). [أنظر: ۵۱۷۸] [۲]

مطلب یہ ہے کہ یہ نہ دیکھنا چاہئے کہ ہدیہ اور دعوت شاندار ہے تو جائیں اور معمولی ہے تو نہ جائیں بلکہ اصل چیز دعوت دینے والے کا جذبہ اور خلوص ہے۔ اگر وہ جذبہ اور خلوص سے دعوت دے رہا ہے یا ہدیہ پیش کر رہا ہے تو اس کی قدر کرنی چاہئے، چاہے اس کی مقدار معمولی کیوں نہ ہو۔

---

[۱] وفی صحیح مسلم ، کتاب الزکاة ، باب الحث علی الصدقة ولو بالقلیل ولا تمتنع من القیصل ، رقم : ۱۷۱۱ ، وسنن الترمذی ، کتاب الولاء والهبة عن رسول الله ، باب فی حث النبی علی التهادی ، رقم : ۲۰۵۶ ، ومسند احمد ، باقی مسند المکثرین ، باب مسند أبی هریرة ، رقم : ۷۲۷۴ ، ۷۷۲۱ ، ۹۲۱۰ ، ۱۰۱۷۰ .

[۲] وفی مسند احمد ، باقی مسند المکثرین ، باب باقی المسند السابق ، رقم : ۹۱۲۱ ، ۹۸۲۲ ، ۹۸۵۳ ، ۱۰۲۳۹ .

(۳) باب من استوهب من أصحابه شيئا

"وقال أبو سعيد: قال النبی ﷺ": ((اضربوا لی معکم سهما)).

ہدیہ کب طلب کیا جا سکتا ہے

فرمایا کہ جو شخص اپنے ساتھیوں سے ہبہ طلب کرے۔

بعض حالات میں ساتھیوں سے ہبہ طلب کرنا جائز ہے اور وہ حالت یہ ہے کہ جب بے تکلفی ہو اور معلوم ہو کہ اگر میں اس سے ہبہ طلب کروں گا تو خوش ہوگا اور اس میں اپنی تذلیل کا بھی کوئی پہلو نہ ہو، ایسے میں بے تکلف دوست سے ہبہ مانگ لینا بھی جائز ہے لیکن جہاں ان شرطوں میں سے ایک شرط بھی مفقود ہو، اس آدمی کی طیب نفس نہ ہو یا اپنی تذلیل وتحقیر کا اندیشہ ہو تو اس صورت میں ہبہ طلب کرنا حرام ہے، وہ سوال کے حکم میں آجاتا ہے، لہٰذا صرف اس جگہ ہبہ طلب کرنا چاہئے، جہاں ان دو باتوں کا اطمینان ہو کہ دوسرا آدمی خوش ہوگا اور مجھے کوئی ذلت نہیں اٹھانی پڑے گی۔

آگے ہبہ طلب کرنے کی اجازت کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "**اضربوا لی معکم سهما**".

یہ وہ واقعہ ہے جب حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ نے سانپ کے کاٹنے کا دم کیا تھا اور پھر بکریاں لیکر آئے تھے، آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھا تھا کہ یہ میرے لئے حلال ہیں یا نہیں؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ حلال ہیں اور میرا حصہ بھی لگاؤ تو ایک طرح سے ان سے ہبہ طلب کیا۔[۳]

۲۵۶۹ ـ حدثنا ابن أبی مریم: حدثنا أبو غسان قال: حدثنی أبو حازم، عن سهل رضی اللہ عنہ: أن النبی ﷺ أرسل إلی امرأة من المهاجرين وكا ن لها غلام نجار، قال لها: ((مری عبدک فليعمل لنا أعواد المنبر)) فأمرت عبدها فذهب فقطع من الطرفاء فصنع له منبراً. فلما قضاه أرسلت إلی النبی ﷺ أنه قد قضاه، قال ﷺ: ((أرسلی به إلی))، فجاؤا به فاحتمله النبی ﷺ فوضعه حيث ترون. [راجع: ۳۷۷]

"**قضاه**" کے معنی ہیں بنوادیا۔ یہاں آپ ﷺ نے جو منبر بنوایا تھا وہ بغیر قیمت کے تھا اور پیچھے "کتاب الجمعۃ" میں گزر چکا ہے کہ شروع میں عورت نے خود کہا تھا کہ میں بنواتی ہوں۔ جب دیر ہوئی تو آپ ﷺ نے ان کے پاس پیغام بھیجا۔

---

[۳] فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۶۵۔

یہ پیغام بھیجنا ہبہ طلب کرنا ہوا کہ ہبہ طلب کیا جا سکتا ہے۔

۲۵۷۰ ـ حدثنا عبد العزيز بن عبد الله :.......... فقلت : نعم ، فناولته العضد فأكلها حتى نفدها وهو محرم .فحدثني به زيد بن أسلم ، عن عطاء بن يسار ، عن أبي قتادة عن النبي ﷺ . [راجع: ۱۸۲۱]

یہ حدیث تفصیل کے ساتھ کتاب الحج میں آئی ہے۔ یہاں پر اس سے صرف اتنا حصہ مقصود ہے کہ جب حضور ﷺ سے صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا کہ ہمارے لئے کھانا جائز ہے یا نہیں؟

آپ ﷺ نے نہ صرف یہ کہ اجازت دی بلکہ فرمایا کہ **"معكم منه شيء؟"** کیا اس کا کچھ حصہ تمہارے پاس باقی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر ہو تو مجھے بھی دے دو۔ حضرت قتادہ ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے پاس جو بازو تھا وہ میں نے حضور اکرم ﷺ کو پیش کیا۔ آپ ﷺ نے وہ تناول فرمایا۔ اب یہاں خود مانگنا منقول ہے۔

(۴) باب من إستسقى

۲۵۷۱ ـ .... قال: ((الأيمنون الأيمنون ، ألا فيمنوا)) قال أنس : فهي سنة ، فهي سنة ، ثلاث مرات. [راجع: ۲۳۵۲]

یمین کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ دائیں طرف سے شروع کرو۔

(۵) باب قبول هدية الصيد

"وقبل النبي ﷺ من أبي قتادة عضد الصيد".

۲۵۷۲ ـ حدثنا سليمان بن حرب : حدثنا شعبة ، عن هشام بن زيد بن أنس بن مالك ، عن أنس ﷺ قال : أنفجنا أرنبا بمر الظهران فسعى القوم فلغبوا فأدركتها فأخذتها فأتيت بها أبا طلحة فذبحها ، وبعث إلى رسول الله ﷺ : بوركها أوفخذيها. قال : فخذيها لا شك فيه. فقبله.قلت : وأكل منه؟ قال :وأكل منه ، ثم قال بعد :قبله. [أنظر : ۵۴۸۹، ۵۵۳۵]

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ **"انفجنا أرنباً بمر الظهران"** ہم نے مرالظہران میں ایک خرگوش بھگایا، یہ جگہ کا نام ہے، وہاں جھاڑیوں میں ایک خرگوش بیٹھا تھا، ہم نے پیچھے سے جا کر اس کو بھگایا۔

"انفج" کے معنی ہوتے ہیں برانگیختہ کرنا، بھگانا، **"فسعى القوم"** لوگوں نے اس کو شکار کرنے کی کوشش کی۔ **"فلغبوا"** تو تھک ہار کے بیٹھ گئے چونکہ خرگوش بہت تیز بھاگتا ہے، اس لئے لوگوں کو پتہ نہیں چلا کہ وہ کہاں گھس گیا تو تلاش کر کے سب تھک گئے **"فادركتها"** میں نے اس جا کر پکڑ لیا **"فأخذتها فأتيت بها

أبا طلحة" اور اٹھا کر ابوطلحہ ؓ کو دیا، حضرت ابوطلحہ ؓ نے اس کو ذبح کیا۔ "**وبعث إلى رسول الله ﷺ**" حضور اقدس ﷺ کے پاس اس کا ورک یا اس کے فخذین بھیجے۔

"**قال فخذيها لا شک فيه**" یہاں قال کا فاعل شعبہ ہے، وہ کہتے ہیں کہ فخذین میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ وہ بھیجے تھے لیکن ورک میں شک ہے کہ بھیجا تھا یا نہیں؟

آپ ﷺ نے وہ ہدیہ قبول فرمایا "**قلت وأكل منه؟**" میں نے پوچھا کہ کیا آپ ﷺ نے وہ خرگوش کا گوشت تناول بھی فرمایا "**قال فأكل منه**" پہلے تو شعبہ نے کہا کہ کھایا بھی لیکن پھر بعد میں کہا "**قبله**" کہ کھانے کی بات میں نہیں کرسکتا، روایت میں اتنا ہے کہ قبول فرمایا۔

کیا حضور ﷺ سے خرگوش کھانا ثابت ہے؟

اس سوال و جواب کی اہمیت اس لئے زیادہ ہوئی کہ خرگوش کی حلت و حرمت میں اختلاف ہے اور حضور اقدس ﷺ سے خرگوش کھانا ثابت ہے یا نہیں، اس بارے میں بڑا کلام ہوا ہے۔

صحیح بات یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا خرگوش کے گوشت کو قبول کرنا اور آپ ﷺ کے دسترخوان پر اس کا کھایا جانا تو ثابت ہے لیکن خود آپ ﷺ کا اس کو کھانا ثابت نہیں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری قوم کے اندر یہ نہیں ہوتا تھا، اس لئے مجھے یہ کھانے کی عادت نہیں۔ یعنی حرام تو نہیں ہے لیکن میں اس لئے نہیں کھاتا کہ مجھے یہ کھانے کی عادت نہیں، اس واسطے خرگوش کا گوشت حلال ہے۔[۴]

یہاں یہ مقصود ہے کہ کسی نے شکار کیا ہوا گوشت ہدیہ کیا تو اس کا قبول کرنا جائز ہے۔

(۶) باب قبول الهدية

۲۵۷۳ ـ حدثنا إسماعيل قال: حدثني مالک، عن ابن شهاب، عن عبيد الله بن عبد الله بن عتبة بن مسعود عن عبد الله بن عباس، عن الصعب بن جثامة ؓ: أنه أهدى لرسول الله ﷺ حمارا وحشيا وهو بالأبواء أو بودان فرد عليه، فلما رأى ما في وجهه قال: ((أما إنا لم نرده عليک إلا أنا حرم)). [راجع: ۱۸۲۵]

صعب بن جثامہ ؓ نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں ایک حمار وحشی ہدیہ کے طور پر پیش کیا تھا جبکہ آپ ﷺ ابواء یا ودان کے مقام پر حالت احرام میں تھے۔ "**فرد عليه**" آپ ﷺ نے وہ واپس کر دیا۔ جب آپ ﷺ نے حضرت صعب ؓ کے چہرہ پر رنجیدگی کے آثار دیکھے کہ رد کر دینے کی وجہ سے یہ رنجیدہ ہو رہے

[۴] تکملة فتح الملهم، ج: ۳، ص: ۵۳۷.

ہیں تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ **"أما إنا لم نرده علیک إلا أنا حرم"** ہم نے اس کو صرف اس وجہ سے رد کیا ہے کہ ہم حالت احرام میں ہیں، کسی اور وجہ سے رد نہیں کیا۔ اگر حالت احرام میں ہم شکار کا ہدیہ قبول کر لیں گے تو لوگ اس سے حالت احرام میں شکار کی حلت پر استدلال کر لیں گے۔ اس واسطے ہم نے انکار کر دیا ورنہ فی نفسہ آپ کے ہدیہ کو قبول کرنے میں کوئی انکار نہیں۔

(۷) باب قبول الھدیة

۲۵۷۴ - حدثنا إبراهیم بن موسی: حدثنا عبدة: حدثنا هشام، عن أبیه، عن عائشة رضی اللہ عنها: أن الناس کانوا یتحرون بهدایاهم یوم عائشة یبتغون بها، أو یبتغون بذٰلک مرضاة رسول الله ﷺ. [أنظر: ۲۵۸۰، ۲۵۸۱، ۳۷۷۵] [۵]

لوگ اپنا ہدیہ پیش کرنے کے لئے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی باری تلاش کیا کرتے تھے۔ یعنی اگر کوئی صحابی یہ چاہتے کہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں اپنا ہدیہ پیش کریں۔ وہ ایسے دن پیش کرنے کی کوشش کرتے تھے جس دن آپ ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف فرما ہوں، اس لئے کہ لوگوں کو پتہ تھا کہ آپ ﷺ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے محبت وتعلق زیادہ ہے۔

۲۵۷۵ - حدثنا آدم: حدثنا شعبة: حدثنا جعفر بن إیاس قال: سمعت سعید بن جبیر، عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: أهدت أم حفید خالة ابن عباس إلی النبی ﷺ أقطا وسمناً و أضباً، فأکل النبی ﷺ من الأقط والسمن وترک الأضب تقذراً. قال ابن عباس: فأکل علی مائدة رسول الله ﷺ ولو کان حراماً ما أکل علی مائدة رسول الله ﷺ. [أنظر: ۵۳۸۹، ۵۴۰۲، ۷۳۵۸]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ام حفید، جو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی خالہ ہیں، انہوں نے نبی کریم ﷺ کی خدمت میں تین چیزوں کا ہدیہ پیش کیا، وہ تین چیزیں یہ ہیں: پنیر، گھی اور گوہ، واضب یہ ضب کی جمع ہے بمعنی گوہ۔

"فأکله النبی ﷺ" آپ ﷺ نے پنیر تناول فرمایا اور گھی بھی استعمال فرمایا **"وترک الاضب"** لیکن گوہ کو چھوڑ دیا۔ تقذراً، اس سے گھن کرتے ہوئے یعنی آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

---

۵ وفی صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب فی فضل عائشة، رقم: ۴۴۷۱، وسنن الترمذی، کتاب المناقب عن رسول الله، باب من فضل عائشة، رقم: ۳۸۱۴، وسنن النسائی، کتاب عشرة النساء، باب حب الرجل بعض نسائه اکثر من بعض، رقم: ۳۸۸۸، ۳۸۸۹، ومسند احمد، باقی مسند الأنصار، باب حدیث أم سلمة زوج النبی ﷺ، رقم: ۲۵۳۰۴.

"قال ابن عباس ؓ فأكل على مائدة" حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے دستر خوان پر کھائی گئی اگر حرام ہوتی تو رسول اللہ ﷺ کے دستر خوان پر نہ کھائی جاتی۔

مطلب یہ ہے کہ اگر چہ حضور اقدس ﷺ نے خود تناول نہیں فرمائی لیکن آپ ﷺ کے دستر خوان پر کھائی گئی معلوم ہوا کہ جائز ہے۔

کیا گوہ (ضب) حلال ہے؟

عربوں کے ہاں گوہ کھانے کا بہت رواج تھا۔ بڑے ذوق وشوق سے کھاتے تھے۔ اسی واسطے فردوسی شاعر نے رستم کی زبانی شعر کہا ہے۔ جب مسلمانوں نے ایران پر حملہ کیا تو ایرانی بڑے ناراض ہوئے کہ عرب کے یہ صحرانشین ہمارے اُوپر حملہ کرنے آگئے ہیں، وہاں یہ شعر کہا۔

زشیر شتر خوردن وسو سمار
عرب را بجائے رسید است کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخ گردان تفو

یعنی اونٹنی کا دودھ پی کر اور گوہ کا گوشت کھا کر عربوں کی جرأت یہاں تک ہوگئی ہے کہ کسریٰ کے تخت کی آرزو کرنے لگے۔

حضرت ابن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دستر خوان پر گوہ کھائی گئی اگر حرام ہوتی تو نہ کھائی جاتی۔ اس سے ان حضرت نے استدلال کیا ہے جو گوہ کو حلال کہتے ہیں۔

حنفیہ کے نزدیک گوہ حلال نہیں اور وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ یہ ابتداء کی بات تھی۔ بعد میں اس کی حلت کے نسخ کا حکم آ گیا تھا۔[۶]

(۸) باب من أهدى إلى صاحبه ، وتحرى بعض نسائه دون بعض

۲۵۸۰ ـ حدثنا سليمان بن حرب : حدثنا حماد بن زيد ، عن هشام ، عن أبيه ، عن عائشة رضی الله عنها قالت : كان الناس يتحرون بهداياهم يومي ، وقالت أم سلمة: إن صواحبي إجتمعن فذكرت له فأعرض عنها. [راجع: ۲۵۷۴]

---

۶ فيض البارى ، ج: ۳ ، ص: ۳۶۶.

۲۵۸۱ - حدثنا إسماعيل : قال حدثني أخيي ، عن سليما ن ، عن هشام بن عروة، عن أبيه ، عن عائشة رضى الله عنها :أن نساء رسول الله ﷺ كن حزبين : فحزب فيه عائشة وحفصة وصفية وسودة. والحزب الآخر : أم سلمة وسائر نساء رسول الله ﷺ . وكان المسلمون قد علموا حب رسول الله ﷺ عائشة ، فإذا كانت عند أحدهم هدية يريد أن يهديها إلى رسول الله ﷺ أخرها حتى إذا كان رسول الله ﷺ فى بيت عائشة بعث صاحبة الهدية إلى رسول الله ﷺ فى بيت عائشة ، فكلم حزب أم سلمة فقلن لها : كلمى رسول الله ﷺ يكلم الناس فيقول : من أرادأن يهدى إلى رسول الله ﷺ هدية فليهدها حيث كان من نسائه' فكلمته أم سلمة بما قلن فلم يقل لها شيئاً ، فسألنها فقالت : ما قال لى شيئاً ' فقلن لها : فكلميه. قالت : فكلمته حين دار إليها أيضاً فلم يقل لها شيئاً. فسألنها فقالت : ماقال لى شيئاً ، فقلن لها :كلميه حتى يكلمک. فدار إليها فكلمته فقال لها:((لا تؤ ذينى فى عائشة ' فان الوحى لم يأتنى وأنا فى ثوب امرأة إلا عائشة)). قالت:فقلت : أتوب إلى الله من أذاک يا رسول الله. ثم إنهن دعون فاطمة بنت رسول الله ﷺ فأرسلت إلى رسول الله ﷺ تقول :إن نساء ک ينشد نک الله العدل فى بنت أبى بكر ، فكلمته فقال : ((يا بنية ألا تحبين ما أحب؟)) قالت : بلى ، فرجعت إليهن فأخبرتهن. فقلن : إرجعى إليه فأبت أن ترجع. فأرسلن زينب بنت جحش فأ تته فأ غلظت وقالت :إن نساء ک ينشدنک العدل فى بنت ابن أبى قحافة ' فرفعت صوتها حتى تناولت عائشة وهى قاعدة فسبتها حتى إن رسول الله ﷺ لينظر إلى عائشة : هل تكلم؟ قال : فتكلمته عائشة ترد على زينب حتى أسكتتها ' قالت : فنظر النبى ﷺ إلى عائشة فقال : ((إنها بنت أبى بكر)) . [راجع:۲۵۷۴]

"قال البخارى :الكلام الأخير قصةفاطمة ، يذكر عن هشام بن عروة ، عن رجل : عن الزهرى ، عن محمد بن عبد الرحمن. وقال أبو مروان ، عن هشام ، عن عروة : كان الناس يتحرون بهدايا هم يوم عائشة. وعن هشام ، عن رجل من قريش، ورجل من الموالى ، عن الزهرى ، عن محمد بن عبد الرحمن بن الحارث بن هشام ، قالت عائشة : كنت عند النبى ﷺ فاستأذنت فاطمة ". ے

ے وفى صحيح مسلم ، كتاب فضائل الصحابة ، باب فى فضل عائشة ، رقم : ۴۴۷۱ ، وسنن الترمذى ، كتاب المناقب عن رسول الله ، باب من فضل عائشة ، رقم : ۳۸۱۴ ، وسنن النسائى ، كتاب عشرة النساء ، باب حب الرجل بعض نسائه اكثر من بعض ، رقم :۳۸۸۸ ، ۳۸۸۹ ، ومسند احمد ، باقى مسند الأنصار ، باب حديث أم سلمة زوج النبى ﷺ ، رقم: ۲۵۳۰۴.

ترجمہ وتشریح حدیث عائشہؓ

امام بخاری رحمہ اللہ نے پہلے یہ حدیث مختصراً ذکر فرمائی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں **"کان الناس"** لوگ ہدیہ پیش کرنے کے لئے میرے دن کو تلاش کیا کرتے تھے یعنی جس دن آپ ﷺ میرے گھر میں ہوں اس دن ہدیہ پیش کرتے تھے۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ اس مسئلہ کے لئے میرے ساتھ بقیہ ازواج مطہرات جمع ہوئیں۔

"فذکرت لہ" حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے یہ بات حضور ﷺ سے ذکر کی کہ آپ ﷺ کے صحابہ ؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا والے دن ہدایا پیش کرتے ہیں۔ **"فاعرض عنہا"** حضور اقدس ﷺ نے ان کی اس بات سے اعراض فرمایا اور اس کو کوئی اہمیت نہیں دی۔

آگے دوسری حدیث میں حضرت عائشہؓ نے اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے کہ **"ان نساء رسول اللہ ﷺ کن حزبین"** حضور ﷺ کی ازوج مطہرات دوگروہوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ ایک گروہ حضرت عائشہ، حفصہ وصفیہ اور سوداء رضی اللہ عنہن کا تھا۔ دوسرا گروہ حضرت ام سلمہ اور دوسری ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کا تھا۔ ان گروہوں میں گویا آپس میں تھوڑی سی رقابت چلتی تھی۔

"وکان المسلمون قد علموا" مسلمانوں کو پتہ تھا کہ حضور اقدس ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے زیادہ محبت فرماتے ہیں۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گروہ نے بات کی۔ **"فقلن لھا"** ان کے گروہ کی خواتین نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے کہا **"کلمی رسول اللہ ﷺ یکلم الناس"** کہ آپ حضور اقدس ﷺ سے بات کریں کہ رسول اللہ ﷺ لوگوں سے کہیں کہ جب میں ایک ہی جگہ پر ہوتا ہوں تو ہدایا لاتے ہیں یہ طریقہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور لوگوں سے یہ کہیں کہ **"أراد أن یھدی إلی رسول اللہ ﷺ ھدیۃ فلیھدھا حیث کان من نسائہ"** جو ہدیہ پیش کرنے کا ارادہ کرے تو وہ پیش کردے میں جہاں بھی ہوں۔ **"فکلمۃ ام سلمۃ بما قلن"** حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس ﷺ سے وہ بات کہی جو خواتین نے کہی تھی۔ **"فلم یقل لھا شیئا"** تو آپ ﷺ نے ان کو کوئی جواب نہیں دیا **"فسألنھا"** دوسری خواتین نے پوچھا کہ کیا ہوا۔

"فقالت ماقال لی شیئا" انہوں نے کہا کہ مجھے کچھ نہیں کہا **"فقلن لھا فکلمیہ"** انہوں نے کہا کہ آپ دوبارہ بات کریں۔ **"فقالت : فکلمتہ حین دار إلیھا"** جب آپ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے تو حضرت ام سلمہؓ نے آپ سے بات کی۔ **"فلم یقل لھا شیئا"** آپ ﷺ نے دوبارہ کچھ نہیں فرمایا۔

"فدار إلیھا فکلمتہ" پھر ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے تیسری دفعہ بات کی **"فقال لھا

: لاتؤذینی فی عائشة" تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم مجھے عائشہ کے بارے میں تکلیف نہ پہنچاؤ **"فإن الوحی لم یأتنی و أنا فی ثوب امرأة إلا عائشة"** کیونکہ میرے پاس وحی نہیں آتی جبکہ میں کسی خاتون کے کپڑوں میں ہوں مگر عائشہ کے کپڑوں میں، تو اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی ان کی مقبولیت ہے۔ اس واسطے اس بارے میں زیادہ رنجیدہ نہ ہوں۔

"قالت: فقلت: أتوب إلی اللہ من اذاک یا رسول اللہ ثم إنهن دعون فاطمة بنت رسول اللہ ﷺ".

ان خواتین نے پھر بھی بس نہیں کیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو بلایا اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو رسول اللہ ﷺ کے پاس بھیجا، حضرت فاطمہؓ نے بھی بات کی اور کہا کہ آپ ﷺ کی ازواج اللہ کی قسم دیتی ہیں کہ آپ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی بیٹی کے بارے میں انصاف سے کام لیں۔ بیویوں نے کہا، دوبارہ جائیے حضرت فاطمہؓ نے جانے سے انکار کر دیا۔

"فارسلن: زینب بنت حجش" آخر انہوں نے مجبور ہو کر حضرت زینب بنت جحشؓ کو بھیجا۔ یہ حضور ﷺ سے زیادہ بے تکلف تھیں اس واسطے کہ ان کی حضور اقدس ﷺ سے رشتہ داری تھی، یہ آئیں اور سخت انداز میں گفتگو کی۔

"وقالت ان نسائک ینشدنک العدل فی بنت ابن أبی قحاف" آپ کی ازواج آپ کو اللہ کی قسم دیتی ہیں کہ بنت ابن ابی قحافہ کی بیٹی کے بارے میں انصاف سے کام لیں۔

یہ جملہ بظاہر بڑا خطرناک ہے کہ نبی کریم ﷺ سے یہ کہنا کہ آپ انصاف سے کام لیں۔ اس کا مفہوم مخالف بڑا خطرناک ہے۔ اگر کوئی دوسرا شخص اس طرح، جملہ کہے (اللہ بچائے) اور قائل کے اختلاف سے ان کے معانی بھی بدل جاتے ہیں۔[۸]

یہ زوجہ کا اپنے شوہر کے ساتھ معاملہ ہے، خدا نہ کرے کہ مقصود یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ ظلم فرما رہے ہیں بلکہ یہ ایک ناز کا انداز تھا۔ **"فرفعت صوتها حتی تناولت عائشة وهی قاعدة فسبتها"** اُن کی آواز بلند ہو گئی اور انہوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ حضرت عائشہؓ بیٹھی ہوئی تھیں، یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ حضرت عائشہ کی طرف دیکھنے لگے کہ یہ بھی کوئی بات کرتی ہیں یا نہیں؟ حضرت عائشہؓ نے گفتگو شروع کی اور حضرت زینب کو جواب دینا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت زینبؓ کو خاموش کر دیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر کی بیٹی ہے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ فصاحت و بلاغت میں معروف تھے اور یہ بھی ان کی بیٹی ہے، اس لئے انہوں نے ان کو خاموش کر دیا۔

---

۸ فیض الباری، ج:۳، ص:۳۶۷۔

اس قسم کے واقعات سے غلط استدلال کرنا

بعض لوگ اس قسم کے واقعات سے وسوسوں اور شبہوں میں پڑ جاتے ہیں کہ ازواج مطہرات کا مقام تو بہت بلند ہے ان میں گروہ بندی اور آپس میں رنجش اور اشتعال کا پیدا ہونا اور آپس میں اس طرح سخت بیانی کرنا ان کی شان کے لائق نہیں۔ لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے ازواج مطہرات کی شان پر کوئی حرف آئے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ازواج مطہرات بشر تھیں اور بشریت کے تقاضے ان میں بھی اپنی جگہ موجود تھے اور یہ بات عورت کی فطرت میں داخل ہے کہ وہ اپنے شوہر کے بارے میں غیرت مند ہوتی ہے، لہٰذا یہ باتیں اسی غیرت کا مقتضا تھیں۔

البتہ یہ غیرت کبھی بھی حدود شرعیہ سے آگے نہیں بڑھی، اس لئے اگر ازواج مطہرات میں بشری تقاضے یا غیرت کے تقاضے ابھرے ہیں تو یہ ان کی عظمت کی مزید دلیل ہے کہ ان بشری تقاضوں کے باوجود انہوں نے کسی بھی مرحلے میں حدود شرعیہ سے تجاوز نہیں کیا، اگر انسان میں بشری تقاضے نہ ہوں اور پھر وہ حدود شرعیہ کی پابندی کرے تو یہ کوئی کمال نہیں، کمال یہ کہ بشری تقاضے موجود ہوں اور ان بشری تقاضوں کا جوش بھی دل میں پیدا ہوتا ہو، لیکن اس کے باوجود انسان اپنی حدود و میں سر ہے اور حدود و شریعت سے تجاوز نہ کرے، یہ زیادہ کمال کی بات ہے۔ لہٰذا ان باتوں کی وجہ سے ازواج مطہرات کے بارے میں کسی بدگمانی میں مبتلا ہونا درست نہیں۔

(۱۰) باب من رأى الهبة الغائبة جائزة

۲۵۸۳، ۲۵۸۴ - حدثنا سعيد بن أبي مريم : حدثنا الليث قال : حدثنا عقيل ،عن ابن شهاب قال: ذكر عروة أن المسوربن مخرمة رضی اللہ عنهما و مروان أخبراه : أن البنی ﷺ حين جاء ه وفد هو ازن قام في الناس فأثنى على الله بماهو أهله ،ثم قال : ((أما بعد ، فإن إخوانكم جاؤناتائبين وإني ورأيت أن أردإليهم سبيهم ، فمن أحب منكم أن يطيب ذٰلک فليفعل ، ومن أحب أن يكون على حظه حتى نعطيه إياه من أول مايفيىء الله علينا .فقال الناس : طيبنا لک)). [راجع:۲۳۰۷، ۲۳۰۸]

امام بخاری رحمہ اللہ نے باب قائم کیا ہے کہ **"باب من رأى الهبة الغائبة جائزة"**.

مطلب یہ ہے کہ جو شئی موجود نہ ہو اس کا ہبہ درست ہے یعنی کوئی شخص کسی کو ایسی چیز ہبہ کر دے جو ہبہ کے وقت موجود نہیں ہے یہ بھی جائز ہے۔ تو فی نفسہ اس مسئلہ میں تو کوئی کلام نہیں کہ غائب شئی کا ہبہ بھی ہو سکتا ہے لیکن آگے اس میں کلام ہے ہبہ تام ہو گا یا نہیں؟

شیٔ غائب کا ہبہ کب تام ہوگا؟

جمہور کے نزدیک ہبہ قبضے سے تام ہوتا ہے بغیر قبضے کے تام نہیں ہوتا۔ اس واسطے غائب شیٔ کا ہبہ جائز تو ہے لیکن تام قبضہ سے ہوگا اور قبضہ کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

امام بخاریؒ نے یہاں شیٔ غائبہ کے ہبہ پر ہوازن کے واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ہوازن کے لوگوں کو ان کی عورتیں واپس کر دیں۔

امام بخاریؒ ہبہ کے باب میں جگہ جگہ اس واقعہ کو لے کر آئے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا ہبہ سے تعلق نہیں بنتا۔ اس واسطے کہ اس کا حاصل تو یہ تھا کہ صحابہ کرام ﷺ کے درمیان کنیزیں تقسیم ہوگئی تھیں۔ بعد میں یہ طے ہوا کہ ان کو واپس کیا جائے گا۔ یہاں واپس کرنے کے معنی یہ ہیں کہ سب نے آزاد کر دیا اور آزاد کرنے کے بعد ان کو ان کے اولیاء کی طرف لوٹا دیا تو اس میں کسی مرحلے پر ہبہ نہیں آتا۔[۹]

(۱۱) باب المكافأة في الهبة

۲۵۸۵ ـ حدثنا مسدد: حدثنا عيسى بن يونس، عن هشام، عن أبيه، عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان رسول الله ﷺ يقبل الهدية و يثيب عليها. لم يذكر وكيع و محاضر، عن هشام، عن أبيه، عن عائشة.

رسول اللہ ﷺ ہدیہ قبول فرماتے تھے اور اس کے بدلے بھی دیتے تھے۔ یعنی اگر کوئی ہدیہ لے کر آتا تو آپ ﷺ کسی مناسب موقع پر اس کی مکافات بھی فرما دیتے تھے کہ اسی جیسا ہدیہ کسی وقت دیدیتے۔ یہ آپ ﷺ کی سنت تھی۔ معلوم ہوا کہ جب کوئی ہدیہ لے کر آئے تو اس کی مکافات مسنون ہے اگرچہ واجب نہیں۔

اگر ہبہ کے ساتھ عوض مشروط ہو جیسے ہبہ بشرط العوض کہتے ہیں تو یہ بیع کے حکم میں ہوتا ہے لیکن اگر عوض مشروط نہ ہو ویسے ہی عوض دے دے تو ایک سنت ہے اور مکارم اخلاق سے ہے۔

(۱۲) باب الهبة للولد

"وإذا أعطى بعض ولده شيئا لم يجز حتى يعدل بينهم و يعطي الآخر مثله ولا يشهد عليه. وقال النبي ﷺ: ((اعدلوا بين أولادكم في العطية)). وهل للوالد أن يرجع في عطيته؟ وما يأكل من مال ولده بالمعروف ولا يتعدى. واشترى النبي ﷺ من عمر بعيرا ثم أعطاه ابن عمر وقال: ((إصنع به ماشئت)).

---

۹ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۶۸.

۲۵۸۶ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف :أخبرنا مالك ، عن ابن شهاب ، عن حميد بن عبدالرحمٰن، ومحمد بن النعمان بن بشير : أنهما حدثاه عن النعمان بن بشير : أن أباه أتى به إلى رسول الله ﷺ فقال: إني نحلت ابني هذا غلاما، فقال : ((أكل ولدك نحلت مثله؟)) قال، لا، قال: ((فارجعه)). [أنظر: ۲۵۸۷، ۲٦۵۰] [۱]

(۱۳) باب الاشهاد في الهبة

۲۵۸۷ ـ حدثنا حامد بن عمر : حدثنا أبو عوانة ،عن حصين،عن عامر قال:سمعت النعمان بن بشير رضي الله تعالىٰ عنهما وهو المنبر يقول: اعطاني أبي عطية، فقالت عمرة بنت رواحة : لا أرضى حتى تشهد رسول الله ﷺ ، فأتى رسول الله ﷺ ، فقال: إني اعطيت ابني من عمرة بنت رواحة عطية فأمرتني أن اشهدك يا رسول الله، قال: ((أعطيت سائر ولد مثل هذا؟)) قال: لا، قال: ((فاتقوا الله وأعدلوا بين اولادكم)).قال: فرجع فرد عطيته. [راجع: ۲۵۸٦].

ظلم پر گواہ نہ بنئے

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث آگے کئی طرح سے نکالی ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر کے والد بشیر ابن سعد نبی کریم ﷺ کے پاس حاضر ہوئے اور آکر کہا کہ میں نے اپنے اس بیٹے کو غلام ہدیہ میں دیا ہے۔آپ ﷺ نے پوچھا کہ آپ نے اپنے سارے بیٹوں کو اسی جیسا غلام دیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس سے یہ ہدیہ واپس لے لو۔ہدیہ دینا درست نہیں اور اگلی روایت میں آرہا ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کو یہ غلام دیا ہے اور میں آپ کو اس کا گواہ بنانے کے لئے آیا ہوں۔آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا، لہٰذا اس کو واپس لے لو۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس واقعہ سے کئی مسئلے مستنبط کئے ہیں اور ان تمام مسائل کو ترجمۃ الباب میں

[۱] وفي صحيح مسلم ،كتاب الهبات ، باب كراهة تفضيل بعض الاولاد في الهبة ، رقم :۳۰۵۲ ، وسنن الترمذي ، كتاب الأحكام عن رسول الله ، باب ماجاء في النحل والتسوية بين الولد ، رقم :۱۲۸۸ ، وسنن النسائي ،كتاب النحل ، باب ذكر الاختلاف الفاظ الناقلين لخبر النعمان بن بشير في النحل ، رقم :۳٦۱۲-۳٦۲۵ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب البيوع ، باب في الرجل يفضل بعض ولده في النحل ، رقم : ۳۰۷۵ ، وسنن ابن ماجة ،كتاب الأحكام ، باب الرجل ينحل ولده ، رقم : ۲۳٦٦، ومسند احمد ، أول مسند الكوفيين ، باب حديث النعمان بن بشير عن النبي ، رقم :۱۷۶۳۱ ، ۱۷۶۴۳ ، ۱۷۶۵۲ ، وموطا مالك ،كتاب الأقضية ، باب مالايجوز من النحل ، رقم : ۱۲۴۱ .

ذکر کیا ہے۔

پہلا مسئلہ ذکر کیا ہے **"باب الهبة للولد"** کہ ولد کو ہبہ کرنا **"فی نفسه"** درست ہے۔

اس سے امام بخاریؒ اس طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ یہ جو مشہور حدیث ہے کہ **" أنت ومالک لأبیک"** کے ظاہری معنی یہ نظر آتے ہیں کہ بیٹے کا تمام مال باپ کا ہوتا ہے یعنی باپ، بیٹے کے مال کا مالک ہوتا ہے۔ اگر یہ بات درست ہو کہ بیٹے کا سارا مال، باپ کا مملوک ہے تو پھر باپ کا بیٹے کو ہدیہ دینے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ جب باپ بیٹے کو ہدیہ کریگا تو خود اس کی اپنی ملکیت میں آجائے گا۔ تو ایسا ہوا جیسے آدمی اپنے آپ کو ہبہ کردے، لہٰذا امام بخاریؒ اس لفظ سے یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ **"أنت ومالک لأبیک"** والی حدیث سنداً کمزور ہے۔

لیکن حافظ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کی سند ایسی ہے کہ اس کو بالکلیہ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، بلکہ یہ مؤول ہے، اس کی تاویل یہ ہے کہ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بیٹے کا سارا مال باپ کا مملوک ہے بلکہ معنی یہ ہے کہ باپ کو یہ حق حاصل ہے کہ ضرورت کے وقت بیٹے کے مال سے فائدہ اٹھائے۔[۱۱]

دوسرا جملہ **"وإذا أعطى بعض ولده شيئا لم يجز"** اگر اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ دے تو یہ جائز نہیں ہے جب تک کہ سب کے درمیان برابری نہ کرے اور دوسروں کو بھی اسی جیسا مال نہ دے، اور اگر ایسا کرے کہ کسی کو زیادہ دے رہا ہو تو **"ولا یشهد علیه"** اس پر کسی کو گواہ بننا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ ظلم کا گواہ بننا درست نہیں۔

اولاد کو ہبہ کرتے وقت تساوی واجب ہے یا مستحب؟

اختلاف فقہاء

اس بات پر تو سب متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص اولاد کو ہبہ کرنا چاہے تو بہتر یہی ہے کہ سب کے درمیان برابری کرے اور کسی اولاد کو دوسرے پر فوقیت یا ترجیح نہ دے۔

لیکن کیا ایسا کرنا واجب اور اس کے خلاف کرنا حرام ہے؟ یا ایسا کرنا مستحب ہے؟ اس بارے میں فقہاء کرام کے درمیان اختلاف ہے۔

---

۱۱ ففي الترجمة إشارة إلى ضعف الحديث المذكور أو إلى تأويله ، وهو حديث أخرجه من حديث جابر ؛أن رجلا قال : يارسول الله إن لي مالا ولدا وإن أبي يريد أن يحتاج مالي فقال أنت ومالک لأبيک . (سنن ابن ماجة ، باب ماللرجل من مال ولده ص: ۱۶۵ ، وفتح الباری ، ج: ۵ ، ص: ۲۱۱ ،وعمدةالقاری ، ج: ۹ ص: ۴۰۰).

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور ائمہ ثلاثہ کا مسلک

امام ابوحنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ اولاد کے درمیان بلا عذر تفاضل کرنا مکروہ ہے، حرام نہیں۔

اور یہی قول امام شافعیؒ اور امام مالک کی طرف بھی منسوب ہے۔ گویا یہ ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ سب کے درمیان مساوات سے کام لے، البتہ اگر کوئی شخص مفاضلت کرے گا تو ہبہ نافذ ہو جائے گا اور جس کو زیادہ دیا گیا وہ اس کا مالک بن جائے گا۔[۱۲]

امام احمد رحمہ اللہ کا مسلک

امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ تفاضل کرنا حرام ہے، اگر کوئی شخص تفاضل کرے تو اس کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اس سے یہ ہبہ نافذ نہیں ہوگا۔ امام بخاریؒ کا رجحان بھی امام احمدؒ کے قول کی طرف معلوم ہوتا ہے۔[۱۳]

امام احمد رحمہ اللہ کا استدلال

ان حضرات کا استدلال اسی حضرت نعمان بن بشیرؓ کے واقعہ سے ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو بتایا کہ میں نے سب کو اتنا نہیں دیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ واپس کرو، میں اس ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔

ائمہ ثلاثہ کا استدلال

ائمہ ثلاثہ کا استدلال حضرت صدیق اکبرؓ کی حدیث سے ہے جو موطا امام مالکؒ کی کتاب القضاء میں آئی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنی صاحبزادی حضرت عائشہ کو اپنے باغ میں سے بیس وسق کھجور کا ہبہ فرمایا تھا لیکن ابھی حضرت عائشہ اس ہبہ پر قبضہ نہیں کر پائی تھیں کہ صدیق اکبرؓ کا مرض الوفات آ گیا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ان سے فرمایا بیٹی! اگر تم نے وہ بیس وسق وہاں سے کاٹ لئے ہوتے اور اپنے قبضے میں لے لئے ہوتے تو وہ تمہارے ہوتے لیکن تم نے ابھی تک انہیں کاٹا نہیں، ان پر قبضہ نہیں کیا۔ یہاں تک کہ میرا مرض وفات آ گیا، لہذا وہ ہبہ تام نہیں ہوا اس لئے کہ اب یہ میراث ہے اور تنہا تمہاری ملکیت نہیں ہیں بلکہ میرے انتقال کے بعد میرے تمام ورثاء میں تقسیم ہوں گے۔

اس کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو دوسروں سے زیادہ عطا فرمایا تھا۔ اگر دوسروں کو زیادہ دینا بالکل حرام ہوتا تو حضرت صدیق اکبرؓ اس کا اقدام کیسے کرتے؟[۱۴]

---

۱۲ تکملة فتح الملهم ج: ۲ ص: ۶۸، وعمدة القاری، ج: ۹ ص: ۴۰۶، ۴۰۷، وفتح الباری، ج: ۵ ص: ۲۱۴.

۱۳ موطا مالک، باب ما لا یجوز من النحل، رقم ۱۲۴۱، عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۰۶، و تکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۶۸، ۶۹.

۱۴ حوالہ بالا۔

* اس کے علاوہ بھی متعدد صحابہ کرام ﷺ سے ایسی روایتیں منقول ہیں کہ انہوں نے اپنے بعض بیٹوں کو دوسرں کے مقابلے میں زیادہ عطا فرمایا اور یہ روایتیں میں نے **"تکملة فتح الملهم"** میں جمع کردی ہیں۔[۱۵]

خلاصہ کلام

ان روایتوں کی بنیاد پر ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں تفاضل مکروہ ہے اور مکروہ بھی اس وقت ہے کہ جب بلا عذر ہو، اگر کسی خاص سبب سے ہو کہ ایک بیٹا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محتاج ہے، ایک بیٹا والدین کا زیادہ خدمت گزار ہے یا ایک بیٹا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ متدین ہے، اس وجہ سے اس کو زیادہ دیا جا رہا ہے تو اس صورت میں کراہت بھی نہیں ہے لیکن اگر تفاضل کی کوئی وجہ موجود نہ ہو تو پھر کراہت ہے، حرام پھر بھی نہیں اور ہبہ پھر بھی ہو جائے گا۔[۱۶]

واقعہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے جوابات

جہاں تک حضرت نعمان بن بشیر ﷺ کے واقعہ تعلق ہے۔ اس کے مختلف فقہاء کرام کی طرف سے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ راجح جواب یہ ہے کہ حضرت بشیر بن سعد ﷺ جو نعمان کے والد تھے، انہوں نے دو نکاح کئے تھے۔ کچھ اولاد پہلے نکاح سے تھی۔ دوسرا نکاح انہوں نے حضرت عمرہ بنت رواحہ سے کیا تھا۔

حضرت عمرہ بنت رواحہؓ یہ حضرت عبداللہ بن رواحہ ﷺ کی بہن تھیں۔ بڑی شان وشوکت والی عورت تھیں، زبردست شاعرہ بھی تھیں۔ ان کے اشعار زبان زد خلائق تھے۔ ابو الفرج اصفہانی نے ''الاغانی'' کے اندر ان کے اور ان کے بارے میں جو اشعار کہے گئے ہیں اس کی بڑی لمبی چوڑی تفصیل لکھی ہے اور ان کے بڑے عجیب قصے لکھے ہیں۔

ہوا یہ تھا کہ حضرت بشیر بن سعد ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔ جب پہلا بچہ پیدا ہوا یعنی حضرت نعمان بن بشیر ﷺ ان کے پیدا ہوتے ہی حضرت عمرہ بنت رواحہؓ نے اصرار کیا کہ یہ پہلا بچہ ہے ان پر آپ کوئی چیز ہبہ کریں۔ اپنی جائیداد میں سے کوئی جائیداد ان کو دیں۔

انہوں نے کہا کہ میں اپنا باغ ان کے نام کر دیتا ہوں۔ بعد میں حضرت بشیر بن سعد ﷺ کو خیال ہوا کہ یہ بڑا لمبا چوڑا باغ ہے اور میں چھوٹے سے بچے کو دے رہا ہوں۔ انہوں نے وہ باغ واپس لے لیا عمرہ بنت رواحہؓ پیچھے پڑ گئیں کہ واپس کیوں لیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اسے باغ کے بجائے ایک غلام دیتا ہوں، عمرہ بن رواحہؓ نے

---

۱۵ حوالہ بالا۔

۱۶ راجع :تکملة فتح الملهم، ج:۲ ،ص: ۷۱.

کہا کہ پہلے آپ نے باغ دیا تھا وہ واپس لے لیا۔ اب آپ غلام دے رہے ہیں، یہ بھی واپس نہ لے لیں، لہٰذا میں اس وقت مانوں گی جب آپ ﷺ کے پاس جا کر اس کا گواہ بنائیں گے۔ گواہ بنانے کے بعد پھر میں مطمئن ہوں گی۔ اس صورت میں یہ حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے۔

اس ساری تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ یہاں جو دیا جا رہا تھا اس دینے کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی اور اضرار مقصود تھا کہ ایک بیوی اپنے بچے کو زیادہ دلوا کر دوسرں کو محروم کرنا چاہ رہی تھی اور جب اضرار مقصود ہو تو بالاتفاق حرام ہے، اس کی حرمت میں کوئی اختلاف نہیں۔

گویا ہبہ کی تین حالتیں ہوگئیں۔

ایک یہ کہ ہبہ کسی معقول وجہ سے ہو یہ بالاتفاق جائز ہے۔

دوسری یہ کہ دوسروں کا اضرار مقصود ہو، یہ بالاتفاق حرام ہے۔

اختلاف اس صورت میں ہے کہ نہ تو اضرار مقصود ہے اور نہ ترجیح کا کوئی خاص سبب ہے، وہاں ائمہ ثلاثہ کے نزدیک مکروہ ہے اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک حرام ہے۔ اور حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں حضور اقدس ﷺ کو یہ بات معلوم تھی کہ اضرار مقصود ہے، اس لئے آپ ﷺ نے اس پر گواہ بننے سے انکار فرمایا اور کہا کہ واپس کرو۔ [۱۷]

دوسرا اختلاف

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فرض کریں، یہ عمل مکروہ یا ناجائز و حرام ہے۔ حرام ہونے کے باوجود ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ اگر باپ ہبہ کر لے اور متعلقہ لڑکا یا لڑکی اس پر قبضہ کر لیں گے تو ہبہ تام ہو جائے گا، لہٰذا اب اس کو واپس نہیں کر سکتے۔

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ ہبہ ہوگا ہی نہیں، لہٰذا واپس کرنا ضروری ہے اور اس میں بھی وہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا **"فارجعه"** کہ واپس لو۔

جمہور کی طرف سے اس کا جواب یہ ہے کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی تک بشیر بن سعد رضی اللہ عنہ نے ہبہ کیا ہی نہیں تھا بلکہ انہوں نے یہ کہا کہ میں حضور اکرم ﷺ کے پاس جاتا ہوں۔ حضور ﷺ نے اجازت دی تو میں ہبہ کروں گا۔

جب وہ حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے اور آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی تو ہبہ ہی نہیں ہوا، لہٰذا لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اس کی تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ انہوں نے کہا میں آپ کو اس ہبہ

---

[۱۷] تكملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۷۱-۷۵.

پر گواہ بنانے آیا ہوں تو گواہ اس وقت بنتا ہے جب کوئی عقد وجود میں لایا جارہا ہو، تو معنی یہ ہوا کہ پہلے عقد وجود میں نہیں تھا حضور اکرم ﷺ کو گواہ بنا کر ہبہ کا عقد کرنا چاہ رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ ابھی تک ہبہ نہیں ہوا تھا۔ جب ہبہ نہیں ہوا تھا تو لوٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ہبہ تام ہو چکا تھا اور پھر حضور اکرم ﷺ نے واپس کروایا تو اس کی یہ توجیہ ممکن ہے کہ اگرچہ ہبہ باوجود ناجائز ہونے کے تام ہو جاتا ہے لیکن امام کو بحیثیت ولی الامر کے یہ حق حاصل ہے کہ ایسے موقع پر ہبہ کو رد کروادے، تو آپ ﷺ نے جو رد کروایا وہ بحیثیت ولی الامر کے فرمایا ورنہ فی نفسہ ہبہ تام ہو چکا تھا۔

تیسرا مسئلہ یہ ذکر کیا ہے کہ **"وھل للوالد أن یرجع فی عطیته ؟"** کیا والد کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنے عطیہ سے رجوع کرلے؟

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کر رہے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے ان سے فرمایا تم نے اپنے بیٹے کو جو کچھ دیا ہے وہ واپس لے لو، معلوم ہوا کہ باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ واپس لے سکتا ہے۔ اگر نہیں لے سکتا ہے تو حضور اقدس ﷺ نے واپس لینے کا حکم کیوں فرماتے؟

والد بیٹے کو ہبہ کر کے رجوع کر سکتا ہے یا نہیں؟

اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے۔ اس کا ذکر آگے مستقل باب میں آرہا ہے۔

حنفیہ کے نزدیک واپس نہیں لے سکتا اور شافعیہ وغیرہ کے نزدیک لے سکتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں اور نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے استدلال کرتے ہیں۔

لیکن اس کا جواب ابھی دیا کہ یہ رجوع درحقیقت رجوع نہیں تھا، کیونکہ ابھی تک ہبہ منعقد نہیں ہوا تھا، تام نہیں ہوا تھا اور اگر تام ہوگیا تھا تو واپس لینے کا حکم بحیثیت ولی الامر کے دیا گیا، لہٰذا اس سے اس بات پر استدلال نہیں ہوسکتا کہ باپ اپنے بیٹے کو دئے ہوئے ہدیہ کو عام حالات میں واپس لے سکتا ہے۔

چوتھا مسئلہ یہ بیان فرمایا کہ **"وما یأکل من مال ولدہ بالمعروف ولا یتعدی"** باپ اپنے بیٹے کے مال سے عرف کے مطابق کھا سکتا ہے اور عرف سے تجاوز نہ کرے۔ یعنی اگر باپ کو اپنے بیٹے کا مال کھانے کی ضرورت پیش آئے تو عرف کے مطابق اس کو کھانا جائز ہے لیکن عرف سے بڑھ کر کھانا جائز نہیں۔[۱۸]

اس جملے کا تعلق بظاہر حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کے واقعہ سے نظر نہیں آتا کیونکہ یہاں باپ کا اپنے بیٹے کے مال کو کھانے کا ذکر نہیں ہے۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ اس کو طرداً للباب لے کر آئے ہیں کہ جیسے باپ اپنے بیٹے کو دیا ہوا ہبہ

---

۱۸ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۰۲.

واپس لے سکتا ہے اسی پر اس مسئلے کو بھی قیاس کر دیا کہ بیٹے کے مال سے باپ کے لئے معروف طور پر کھانا بھی جائز ہے ۔ آگے فرماتے ہیں **"وا شترى النبى ﷺ من عمر بعيرا"** کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے ایک اونٹ خرید **"ثم اعطاه ابن عمرؓ"** پھر حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کو دے دیا اور فرمایا کہ جو چاہو کرو ۔ یہ واقعہ پہلے گزر چکا ہے ۔

اس کو یہاں لانے سے امام بخاریؒ کا منشاء یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمرؓ سے اونٹ خرید کر ابن عمرؓ کو ہبہ فرمایا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عدل بین الاولاد کے خلاف کوئی معاملہ نہ ہو کیونکہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ آپ حضرت عمرؓ سے کہتے کہ تم ابن عمرؓ کو ہبہ کر دو لیکن اگر ایسا کرتے یعنی حضرت عمرؓ اپنے بیٹے ابن عمرؓ کو ہبہ کرتے تو یہ عدل کے خلاف ہوتا کیونکہ حضرت عمرؓ کے اور بھی بیٹے تھے ، اس لئے حضور اکرم ﷺ نے پہلے خود خریدا اور پھر اپنی طرف سے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو ہبہ کیا ۔

اسی واسطے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو یہاں ذکر کیا ، یہ بخاری کے مشکل تراجم میں سے ایک ترجمۃ الباب ہے ۔

(۱۴) باب هبة الرجل لامرأته والمرأة لزوجها

قال إبراهيم . جائزة ، و قال عمر بن عبد العزيز لا يرجعان . و استأذن النبي ﷺ نساءه في أن يمرض في بيت عائشة . و قال النبي ﷺ : ((العائد في هبته كالكلب يعود في قيئه)) . و قال الزهري فيمن قال لامرأته : هبي لي بعض صداقك أو كله ، ثم لم يمكث إلا يسيراً حتى طلقها فرجعت فيه ، قال : يرد إليها إن كان خلبها ؛ و إن كانت أعطته عن طيب نفس ليس في شئ من أمره خديعة جاز ، قال الله تعالىٰ : ﴿فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِنْهُ نَفْساً﴾ [19]

حدیث باب کی تشریح

"باب هبة الرجل" یہ بھی ایک پیچیدہ قسم کا ترجمۃ الباب ہے کہ شوہر اپنی بیوی یا بیوی اپنے شوہر کو ہبہ کرے تو یہ جائز ہے ۔

"قال ابراهيم جائزة" : ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ یہ ہبہ جائز ہے ، جائز ہونے کے معنی یہ ہے کہ ہبہ نافذ ہو جاتا ہے ۔

بعض حضرات نے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ چونکہ بیوی اور شوہر کے املاک میں باہم اتنی قربت ہوتی ہے شاید

---

۱۹ [النساء : ۴]

اس میں ہبہ نافذ نہ ہوتا ہو، اس شبہ کو دور کرنے لئے باب قائم کیا کہ شوہر اور بیوی کا آپس میں ہبہ نافذ ہو جاتا ہے۔ ابراہیم نخعیؒ کا قول ذکر کیا کہ ایسا ہبہ جائز ہے۔

جائز ہونے کا معنی یہ ہی ہے کہ جب شوہر نے بیوی کو دے دیا تو اب اس کے لئے جائز نہیں کہ واپس لے اور بیوی نے شوہر کو دے دیا تو اس کے لئے بھی جائز نہیں کہ واپس لے۔ اور حنفیہ کا مذہب آگے آرہا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے ذی رحم محرم کو دے تو پھر اس کا واپس لینا جائز نہیں ہوتا تو حنفیہ نے اس کی تصریح کی ہے کہ جو حکم ذی رحم محرم کا ہے وہی شوہر اور بیوی کا بھی ہے یعنی اس کو واپس نہیں لے سکتا۔

"وقال عمر بن عبد العزيز لا يرجعان" حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے فرمایا کہ شوہر اور بیوی آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کریں تو اس میں رجوع کرنا جائز نہیں۔

"واستأذن النبي ﷺ نساءه في أن يمرض في بيت عائشة" حضور ﷺ نے ازواج مطہرات سے اس بات کی اجازت لی تھی کہ آپ ﷺ کی تیمارداری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں کی جائے اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسری ازواج مطہرات نے اپنی باری کا ہبہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کر دیا تھا بلکہ امام بخاری رحمہ اللہ یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ازواج مطہرات نے حضور ﷺ کو ہبہ کر دیا تھا تو چونکہ یہ ازواج کی طرف سے ہبہ تھا۔ معلوم ہوا کہ زوجہ زوج کو ہبہ کر سکتی ہے۔

آگے فرمایا **"وقال النبي ﷺ "العائد في هبته كالكلب يعود في قيئه"** کہ جو شخص اپنے ہبہ کو واپس لے وہ اس کتے کی طرح ہے جو قے کر کے اس کو دوبارہ چاٹے۔

ہبہ کر کے دوبارہ رجوع کر سکتا ہے؟

یہاں دوسرا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر کوئی دوسرے کو ہبہ کرے تو اس کے لئے ہبہ کو رجوع کرنا جائز ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ بھی فقہاء کرام کے درمیان بڑا معرکۃ الآراء مسئلہ ہے، جس میں بڑا اختلاف ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک

امام شافعی، امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تینوں بزرگ یہ فرماتے ہیں کہ جب ایک مرتبہ ہبہ کر دیا تو وہ ہبہ نافذ ہو گیا۔ اب واہب کے لئے رجوع کرنا جائز نہیں۔ رجوع کرنا صرف ایک صورت میں جائز ہے کہ جب باپ نے بیٹے کو ہبہ کیا ہو تو اگر باپ واپس لینا چاہے تو لے سکتا ہے۔

ان حضرات کی دلیل یہ حدیث ہے کہ **"العائد في هبته"** اور ابوداؤد وغیرہ کی روایتوں میں ہے۔

"إلا الوالد يرجع فيما أعطاه لولده او كما قال" والد کا استثناء فرمایا۔ اس استثناء کی بناء پر یہ

تینوں حضرات کہتے ہیں کہ باپ، بیٹے کو جو ہبہ کرے اس میں رجوع جائز ہے باقی کسی اور کے لئے جائز نہیں۔[20]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ جب واہب نے کسی دوسرے کو ہبہ کر دیا ہو تو اب اس کے لئے واپس لینا مناسب نہیں، خلاف مروت ہے لیکن اگر وہ لینا چاہے تو قضاءً لے سکتا ہے اور اس میں صرف اس ہبہ کا استثناء ہے جو کسی شخص نے اپنے ذو رحم محرم کو کیا ہو جیسے بھائی، بیٹا، ماں، خالہ وغیرہ اور اسی میں بیوی اور شوہر بھی داخل ہیں، تب تو کسی بھی صورت میں واپس لینے کی گنجائش نہیں لیکن اگر غیر ذی رحم محرم کو ہبہ کیا گیا تو اس کا قضاءً واپس لینا درست ہے۔[21]

اس مسئلہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا استدلال مستدرک حاکم کی ایک روایت سے ہے جو حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مروی ہے،[22] اس میں نبی کریم ﷺ کا یہ قول منقول ہے کہ **"الواهب احق بهبته مالم یثب منها"** کہ واہب اپنے ہبہ کا زیادہ حق دار ہے جب تک کہ اس کو اس کا معاوضہ نہ دیا گیا ہو اور ذو رحم محرم کا جو استثناء کیا گیا ہے مستدرک حاکم میں سمرہ بن جندبؓ کی روایت ہے اس میں یہ استثناء موجود ہے کہ سوائے اس ہبہ کے جو اپنے کسی ذو رحم محرم کو کیا باقی میں واہب زیادہ حقدار ہے۔[23]

اگر چہ اس کی سند پر کلام کیا گیا ہے لیکن میں نے **"تکملة فتح الملهم"** میں اس کی تحقیق کی ہے کہ یہ حدیث متعدد طرق سے ثابت ہے اور وہ طرق ایک دوسرے کی تقویت کرتے ہیں۔

یہ کلام تو مرفوع طریق میں ہے اور جو اس کا موقوف طریق ہے حضرت عمرؓ پر، وہ بالکل بے غبار اور صحیح طریق ہے۔ اس کے صحیح ہونے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے۔

جہاں تک **"العائد فی هبته"** کا تعلق ہے تو حنفیہ کی طرف سے اس کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں، جن میں سے بعض انتہائی رکیک ہیں مثلاً یہ کہا گیا کہ کتے کیلئے قئی چاٹنا حرام تو نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ عمل بھی جائز ہے، حرام نہیں یہ بالکل بے ہودہ جواب ہے، اس لئے کہ محاورات میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ تو اس میں منطق و تدقیق نہیں چلتی کہ کتے کے لئے حلال ہے یا حرام ہے بلکہ اس کی شناعت بتانا مقصود ہوتا ہے، اس کا جو مناسب جواب دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ، حدیث دیانت کا حکم بیان کر رہی ہے کہ دیانتاً واہب کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے ہبہ کو واپس لے۔ اس میں قضاً کا حکم نہیں ہے۔ قضاً کا حکم اس حدیث میں ہے کہ **"الواهب احق بهبته ما لم**

---

[20] سنن أبی داؤد، کتاب البیوع، باب الرجوع فی الهبة، رقم ۳۰۷۲، وعمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۰۹، ۴۱۰، وتکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۷.

[21] عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۰۲، وتکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۸.

[22] عن ابن عمر رضی الله عنهما، عن النبی ﷺ قال: من وهب الخ، المستدرک رقم: ۲۳۲۳، ۱۹۴، ج: ۲، ص: ۶۰.

[23] المستدرک، رقم ۲۳۲۴/ ۱۹۵، کتاب البیوع، ج: ۲، ص: ۶۰، وتکملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۸، ۵۹.

یشب منها'' اس طرح دونوں روایتوں میں تطبیق بھی ہو جاتی ہے یعنی واہب کے لئے واپس لینا جائز نہیں لیکن اگر قاضی کے پاس جائے گا تو قاضی واپسی کا فیصلہ کر دے گا۔[۲۴]

اب مسئلہ باپ، بیٹے کا رہ گیا۔ شافعیہ کہتے ہیں کہ اگر باپ، بیٹے کو ہبہ کرے تو ہبہ واپس لے سکتا ہے۔ حنفیہ کہتے ہیں کہ نہیں لے سکتا، اس لئے کہ وہ ذو رحم محرم میں داخل ہے۔

جس حدیث میں باپ، بیٹے کو کیا ہوا ہبہ واپس لینے کا استثناء ہے اس کے بارے میں حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ ''**انت ومالک لأبیک**'' کے قبیل سے ہے یعنی کسی نے کسی کو ہبہ کیا تو واپس نہیں لے سکتا۔ البتہ اگر باپ نے بیٹے کو ہبہ کیا ہو اور بعد میں اس کو ضرورت لاحق ہو جائے تو بیٹے کا مال اگر ہبہ نہ کیا ہو تو ویسے بھی لے سکتا تھا جب ہبہ کیا ہو تو اس میں بطریق اولیٰ لے سکے گا۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور مسئلہ بیان فرمایا ہے ''**وقال الزهري فيمن قال لامرأته هبي لي بعض صداقك أو كله**''.

امام زہری رحمہ اللہ نے مسئلہ بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ مجھے اپنے مہر کا کچھ حصہ ہبہ کر دو یا پورا مہر ہبہ کر دو۔ اس عورت نے ھبہ کر دیا'' **ثم لم يمكث إلا يسيرا حتى طلقها**'' ابھی تھوڑی دیر گزری تھی کہ اس نے طلاق دے دی۔ ''**فرجعت فيه**'' بیوی نے بھی اس ہبہ پر رجوع کر لیا۔'' **قال: يرد إليها إن كان خلبها**'' امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ شوہر پر واجب ہوگا کہ وہ مہر لوٹائے اگر اس نے اپنی بیوی کو دھوکہ دیا ہو۔

''**وإن كانت أعطته عن طيب نفس**'' اور اگر اس نے خوش دلی سے دیا تھا، ''**ليس في أمره شيء من خديعة جاز**'' اس میں دھوکہ نہیں تھا تو ہبہ نافذ ہو گیا۔ واپس لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ ''**قال الله تعالى، فإن طبن لكم عن شيء منه نفسا فكلوه هنيئا مريئا**''.

حنفیہ کا مسلک بھی اس کے قریب قریب ہے یعنی ابھی مذکور ہوا کہ بیوی، شوہر کو ہبہ کرے یا شوہر بیوی کو ہبہ کرے تو اس کا رجوع نہیں ہوتا لیکن یہ حکم اس وقت ہے جب یہ ہبہ بغیر کسی اکراہ یا کسی دھوکے کے ہوا ہو اور واہب نے طیب نفس کے ساتھ کیا ہو۔[۲۵]

لیکن اگر قرائن سے یہ بات معلوم ہو رہی ہو کہ بیوی نے دھوکے میں آکر ہبہ کیا تھا۔ اصل میں اس کی مرضی نہ تھی اس کے ساتھ دھوکہ ہوا، یا اکراہ ہوا، تو پھر ہبہ ہوا ہی نہیں اور جب ہبہ ہی نہیں ہوا تو رجوع کا سوال نہیں ہوتا، اس لئے وہ اس کی ملکیت ہے۔

---

۲۴ تكملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۶۲.

۲۵ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۱۰.

(۱۵) باب

هبة المرأة لغير زوجها ، وعتقها إذا كان لها زوج فهو جائز إذا لم تكن سفيهة. فإذا كانت سفيهة لم يجز ، وقال الله تعالىٰ : ﴿وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمْ﴾ [٢٦]

۲۵۹۰ ـ حدثنا أبو عاصم ، عن ابن جريج ابن أبي مليكة، عن عباد بن عبد الله، عن أسماء رضي الله عنها قالت :قلت :يارسول الله ،ما لي مال إلا ما أدخل علي الزبير، فأتصدق؟ قال: ((تصدقي ولا توعي فيوعى الله عليک)).[راجع : ۱۴۳۴]

۲۵۹۱ ـ حدثنا عبيد الله بن سعيد: حدثنا عبدالله بن نمير: حدثنا هشام بن عروة ، عن فاطمة ، عن أسماء : أن رسول الله ﷺ قال: ((أنفقي ولا تحصي فيحصي الله عليک، ولا توعي فيوعي الله عليک)). [راجع : ۱۴۳۴]

حدیث باب کی تشریح

بیوی کوئی مال اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور کو ہبہ کرے یہ جائز ہے یا نہیں؟

بعض سلف کا مسلک یہ ہے کہ بیوی اگر چہ اپنے مال کی مالک ضرور ہے لیکن اگر وہ کسی کو ہبہ کرنا چاہے یا صدقہ کرنا چاہے تو شوہر کی اجازت کے بغیر نہیں کرسکتی۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت ناقصۃ العقل ہوتی ہے اور مرد کو اللہ تعالیٰ نے قوام بنایا ہے۔

كما قال الله تعالىٰ :

﴿ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ ﴾

ترجمہ: ''مرد حاکم ہے عورتوں پر''۔

تو ہوسکتا ہے کہ بیوی کسی ایسے شخص کو ہبہ کر رہی ہو جس کو ہبہ کرنا مناسب نہیں ہے مال ضائع کرنے کی طرح ہے تو شوہر اس کو روک سکتا ہے۔

عورت عاقل، بالغ ہو لیکن شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے مال میں ہبہ کا تصرف نہیں کرسکتی۔ یہ مسلک حضرت حسن بصریؒ اور حضرت طاؤس بن کیسان اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے۔

امام بخاریؒ ان کی تردید کرنا چاہتے ہیں کہ عورت اگر عاقلہ، بالغہ، رشیدہ ہے اور اس میں کوئی بیوقوفی کے آثار نہیں ہیں تو وہ اپنی ملک میں تصرف کرسکتی ہے جیسے ہر انسان اپنی ملک میں تصرف کرسکتا ہے جس کو چاہے ہبہ کرے۔

---

٢٦ [النساء:٥]

"وعتقها" اور اس کا عتق کرنا بھی جائز ہے اور جو لوگ ناجائز کہتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ شوہر کی اجازت کے بغیر غلام کو بھی آزاد نہیں کرسکتی تو اس کی تردید کردی کہ عتق کرنا بھی جائز ہے **"إذا كان لها زوج"** جبکہ اس کا شوہر موجود ہو، **"فهو جائز إذا لم تكن سفيهة"** لیکن جائز اس وقت ہے اگر وہ سفیہ نہ ہو، اور اگر وہ سفیہ ہو تو پھر شوہر کی اجازت کے بغیر جائز نہیں **"قال الله تعالىٰ لا تؤتوا السفهاء أموالكم"**.

اور ہمارے ہاں عورت سفیہ ہو یا نہ ہو اور سفیہ ہونے کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ اس کو یتامی پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ یتامی زیر ولایت ولی تھے اور ابھی نابالغ تھے، لہٰذا جب تک بلوغت کے بعد رشد کے آثار ان پر نمودار نہ ہو جائیں اس وقت تک ان کو دینے سے منع فرمایا لیکن یہاں تو بیچاری بالغہ ہے، عاقلہ ہے، اور کون یہ فیصلہ کرے گا کہ یہ سفیہہ ہے یا نہیں۔ ہر شوہر یہ کہے گا کہ میری بیوی بے وقوف ہے، لہٰذا میں اجازت نہیں دیتا۔ اس واسطے حنفیہ اس کے بھی قائل نہیں کہ اس کو ایسا کیا جائے۔

اس میں حضرت اسماء کی حدیث نقل کی ہے کہ **"مالي مال إلا ما ادخل علي الزبير"** کہ میرے پاس اس مال کے سوا کوئی اور مال نہیں ہے جو میرے شوہر حضرت زبیر بن العوام ﷺ نے دیا ہے۔ **"فأتصدق؟"** کیا میں صدقہ کرسکتی ہوں؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ **"تصدقي ولا توعي"** کہ صدقہ کرو اور برتن میں بند کر کے مت رکھو۔ تمہارے اوپر بھی برتن بند کر دیا جائے گا۔ بخیل آدمی جب برتن بند کر کے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ بخیل پر بھی بند کر دیتے ہیں۔

اس واسطے صدقہ کرو۔ یہاں آپ ﷺ نے صدقہ کرنے کی اجازت دی اور حضرت زبیر ﷺ سے اجازت لینے کی شرط نہیں لگائی۔ معلوم ہوا کہ شوہر کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا جائز ہے۔

۲۵۹۲ - حدثنا يحيى بن بكير، عن الليث عن يزيد عن بكير عن كريب مولى ابن عباس : أن ميمونة بنت الحارث رضي الله عنها أخبرته أنها أعتقت وليدة ولم تستأذن النبي ﷺ فلما كان يومها الذي يدور عليها فيه قالت: أشعرت يا رسول الله أني أعتقت وليدتي ؟ قال : ((أو فعلت ؟)) قالت : نعم .قال:((أما إنك لو أعطيتها أخوالك ،كان أعظم لأجرك)). وقال بكر بن مضر : عن عمرو ، عن بكير ، عن كريب : أن ميمونة أعتقت. [أنظر : ۲۵۹۴]. [۲۷]

یہ ام المؤمنین حضرت میمونہ بنت الحارث رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے کہ انہوں نے اپنی جاریہ کو آزاد کر دیا

---

[۲۷] وفي صحيح مسلم ،كتاب الزكاة ، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين والزوج والاولاد ، رقم : ۱۶۶۲، وسنن أبي داؤد ،كتاب الزكاة ، باب في صلة الرحم ، رقم : ۱۴۴۰ ، ومسند احمد ، باقي مسند الأنصار ، باب حديث ميمونة بنت الهارث الهلالية زوج النبي ، رقم : ۲۵۵۸۹.

اور حضور اقدس ﷺ سے اجازت نہیں لی۔

ترجمۃ الباب کا یہی مقصد ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر آزاد کردیا۔

"فلما كان يومها الذي يدور عليها فيه" جب ان کا وہ دن آیا جب حضور اقدس ﷺ ان کے پاس آئے تو انہوں نے عرض کیا **"أشعرت يا رسول الله ﷺ إني أعتقت وليدتي؟"** کیا اے رسول اللہ ﷺ آپ کو پتہ ہے کہ میں نے اپنی جاریہ کو آزاد کردیا ہے؟

"قال أوفعلت؟" حضور ﷺ نے پوچھا کیا واقعی آزاد کردیا؟ **"قالت نعم قال اما انک لو أعطيتها اخوالک كان اعظم لأجرک"** آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم یہ کنیز اپنے ماموؤں کو دے دیتیں تو زیادہ ثواب ہوتا۔

یہاں حضور ﷺ نے ان پر یہ اعتراض نہیں کیا کہ میری اجازت کے بغیر کیوں آزاد کردیا۔ البتہ ساتھ یہ بتادیا کہ اگر تم اس کو اپنے ننہیال میں دے دیتیں تو تمہارے لئے زیادہ ثواب کا سبب ہوتا۔ معلوم ہوا کہ صلہ رحمی کا ثواب اعتاق سے زیادہ ہے۔

۲۵۹۳ - حدثنا حبان بن موسى : أخبرنا عبد الله: أخبرنا يونس ، عن الزهري، عن عروة ، عن عائشة رضي الله عنها قالت: كان رسول الله ﷺ إذا أراد سفرا أقرع بين نسائه ، فأيتهن خرج سهمها خرج بها معه .وكان يقسم لكل امرأة منهن يومها وليلتها ،غير أن سودة بنت زمعة وهبت يومها وليلتها لعائشة زوج النبي ﷺ تبتغي بذلک رضا رسول الله ﷺ. [أنظر : ۲۶۳۷، ۲۶۶۱، ۲۶۸۸، ۲۸۷۹، ۴۰۲۵، ۴۱۴۱، ۴۶۹۰، ۴۷۴۹، ۴۷۵۰، ۵۲۱۲، ۶۶۶۲، ۶۶۷۹، ۷۳۶۹، ۷۳۷۰، ۷۵۰۰، ۷۵۴۵].

اس حدیث کو یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت سودہؓ نے اپنی باری حضرت عائشہؓ کو ہبہ کردی اور یہ منقول نہیں کہ حضور ﷺ سے اجازت لی۔ معلوم ہوا کہ شوہر کی اجازت کے بغیر ہبہ کرنا جائز ہے۔

(۱۷) باب من لم يقبل الهدية لعلة

"وقال عمر بن عبد العزيز : كانت الهدية في زمن رسول الله ﷺ هدية ، و اليوم رشوة".

۲۵۹۶ - حدثنا أبو اليمان :أخبرنا شعيب ،عن الزهري قال :أخبرني عبيد الله بن عبد الله بن عتبة : أن عبد الله بن عباس رضي الله عنهما: أخبره أنه سمع الصعب بن جثامة الليثي وكان من الأصحاب النبي ﷺ يخبر: أنه أهدى لرسول الله ﷺ حمار وحش وهو بالأبواء أو بودان وهو محرم فرده. فقال صعب : فلما عرف في وجهي رده هديتي قال:

((لیس بنا رد علیک ولکنا حرم)). [راجع: ۱۸۲۵].

۲۵۹۷ ۔ حدثنی عبداللہ بن محمد: حدثنا سفیان، عن الزھری، عز عروة بن الزبیر، عن أبی حمید الساعدی ﷺ قال: أستعمل النبی ﷺ رجلا من الأزد یقال لہ: ابن اللُتبیّة علی الصدقة، فلما قدم قال: ھذا لکم وھذا أھدی لی. قال: ((فھلا جلس في بیت أبیہ أو بیت أمہ ینظر أیھدی لہ أم لا؟ والذی نفسی بیدہ لا یأ خذ أحد منہ شیئا إلا جاء بہ یوم القیامة یحملُہ علی رقبة: إن کان بعیرا لہ رغاء، أوبقرة لھا خوار، أو شاة تیعر))، ثم رفع بیدہ حتی رأینا عفرة إبطیہ: ((اللّٰھم ھل بلغت، اللّٰھم ھل بلغت))، ثلاثا. [راجع: ۹۲۵].

فرمایا کہ ویسے تو ہدیہ قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اگر کوئی مسلمان محبت سے ہدیہ دے تو قبول کر لینا چاہئے۔

مسلمان کے ہدیہ میں برکت ہے

میرے والد ماجد (حضرت مفتی محمد شفیع صاحب) قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ مسلمان کا محبت سے پیش کیا ہوا ہبہ، آمدنی کے تمام ذرائع میں سب سے زیادہ برکت والا اور حلال مال ہے۔ اگر وہ خلوص سے دے رہا ہے تو بہت ہی برکت والی چیز ہے۔ اس واسطے جب اخلاص ظاہر ہو تو قبول کر لینا چاہئے لیکن اگر کسی علت کی وجہ سے رد کرنا پڑے تو رد کرنا بھی جائز ہے۔ یہاں امام بخاریؒ کا یہی مقصد ہے۔

چنانچہ پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا قول نقل کیا ہے جس کا پسِ منظر یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو ایک مرتبہ سیب کھانے کا دل چاہا، مگر وُسعت نہ تھی کہ خرید سکتے۔ اسی دوران کسی نے انہیں سیب سے بھرے ہوئے کئی طبق بھیجے، حضرتؒ نے انہیں سونگھ کر واپس کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ اب حکومت کے عُمال کو جو ہدیہ دیا جاتا ہے وہ عام طور پر رِشوت ہوتی ہے۔ (ذکرہ العینی عن ابن سعید)

یہاں ایک واقعہ ذکر کیا ہے جو پہلے گزرا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو حمار وحشی ہدیہ کے طور پر پیش کیا گیا تو آپ ﷺ نے رد کر دیا اور ساتھ ہی یہ فرمایا کہ ہم نے اس لئے رد نہیں کیا کہ آپ سے کوئی ناراضگی ہے بلکہ اس لئے رد کیا ہے کہ ہم حالت احرام میں ہیں۔

اور دوسرا واقعہ ابن اللتبیہ کا ذکر کیا ہے۔ ابن اللتبیہ کو آپ ﷺ نے صدقات وصول کرنے کے لئے بھیجا اور وہ بہت سے صدقات وصول کر کے لائے۔

آ کر کہنے لگے کہ یہ تو صدقات ہیں اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ **"فھلا جلس فی بیت أبیہ أو بیت أمہ"** اپنے ماں باپ کے گھر بیٹھ کر دیکھتا کہ کوئی ہدیہ دیتا ہے کہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ مصدق یا کسی آفیسر کو کوئی ہدیہ دے رہے ہیں تو اس میں رشوت کا غالب گمان ہے، اس لئے جہاں اس بات کا گمان ہو وہاں ہدیہ کو رد کر دینا درست ہوگا۔

(۱۸) باب إذا وهب هبة أووعد ، ثم مات قبل أن تصل إليه

" وقال عبيدة: إن ماتا و كانت فصلت الهدية والمهدى له حي فهي لورثته. وإن لم تكن فصلت فهي لورثة الّذي أهدى. وقال الحسن : أيهما مات قبل فهي لورثة المهدى له إذا قبضها الرسول".

یہ ترجمۃ الباب ہے "**با ب إذا وهب هبة اووعد** "اگر کسی شخص نے کوئی ہبہ کیا یا ہبہ کرنے کا وعدہ کیا "**ثم مات**" پھر وعدہ کرنے والے یا ہبہ کرنے والے کا انتقال ہوگیا۔ "**قبل أن تصل إليه**" ابھی "**مهدى له**" یا موہوب لہ کو وہ شئی موہوب نہیں دی گئی تھی۔اس سے پہلے واہب کا انتقال ہوگیا تو اس صورت میں کیا حکم ہے؟

اس ترجمہ سے اس مشہور مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ آیا ہبہ تام ہونے کے لئے قبضہ شرط ہے یا نہیں؟

ہبہ تام ہونے کے لئے قبضہ شرط ہے یا نہیں؟

جمہور کا مسلک

جمہور کا مسلک یہ ہے جس میں حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ داخل ہیں کہ ہبہ بغیر قبضہ کے تام نہیں ہوتا۔اگر کسی شخص نے کہہ دیا کہ میں نے تمہیں فلاں چیز ہبہ کردی تو ہبہ تو ہوا لیکن ابھی تام نہیں ہوا جب تک کہ موہوب لہ اس پر قبضہ نہ کرے۔[۲۸]

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہبہ تام ہونے کے لئے قبضہ شرط نہیں بلکہ جس طرح بیع مطلق ایجاب وقبول سے پوری ہو جاتی ہے۔اسی طرح ہبہ بھی مجرد ہبہ کا لفظ منہ سے نکال دینے سے یعنی ایجاب وقبول سے تام ہو جاتا ہے،اس کے لئے قبضہ شرط نہیں ہے،امام مالکؒ ہبہ کو بیع پر قیاس کرتے ہیں۔[۲۹]

جمہور کا استدلال

جمہور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس واقعہ سے استدلال کرتے ہیں جو موطا امام مالکؒ میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے ان کو بیس وسق کھجور ہبہ فرمائی تھیں لیکن ساتھ ہی جب انتقال ہونے لگا تو فرمایا کہ اگر تم نے اس کو کاٹ لیا ہوتا اور قبضہ میں لے آئی ہوتیں تو تمہارا قبضہ ہو جاتا لیکن تم نے اس کو نہیں کاٹا لہٰذا اب یہ میری میراث ہے۔[۳۰]

۲۸، ۲۹ عمدة القارى ، ج: ۹، ص: ۳۲۰.

۳۰ موطأ مالک ، كتاب الأقضية ، باب مالايجوز من النحل ، رقم : ۱۲۴۲.

اس بارے میں صریح ہے کہ ہبہ، قبضہ کے بغیر تام نہیں ہوتا۔ یہ تو ہبہ کا حکم ہے اور وعدہ ہبہ کا بطریق اولی ہوگا۔ یعنی اگر کسی نے ہبہ کا وعدہ کیا ہے تو محض وعدہ کر لینے سے ملکیت موعودلہ کی طرف منتقل نہیں ہوتی جب تک وہ اس وعدہ پر عمل نہ کرے۔

"وقال عبيدة: إن ماتا وكانت فصلت الهدية والمهدى له حي فهي لورثته" عبیدہ سلمانی جو مشہور فقہاء تابعین میں سے ہیں وہ فرماتے ہیں **"ان مات"** اور بعض نسخوں میں **"ان ماتا"** یہ زیادہ صحیح ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص کو ہبہ کیا تھا یا ہبہ کا وعدہ کیا تھا، پھر دونوں یعنی **"مهدی"** اور **"المهدی له"** کا انتقال ہوگیا **"وكانت فصلت الهدية"** اور ہدیہ کو جدا کر دیا گیا تھا جبکہ **"المهدی له"** زندہ تھا۔ یعنی **"مهدی"** نے **"المهدی له"** کی زندگی میں اس کو اپنی ملکیت سے جدا کر دیا تھا۔ **"فهي لورثته"** تو وہ ہدیہ اس **"المهدی له"** کے ورثہ کو ملے گا۔

اب جدا کرنے کا کیا معنی ہے؟ اگر یہ معنی ہے کہ **"مهدی"** نے وہ ہدیہ اپنی ملکیت سے نکال کر **"المهدی له"** کے قبضہ میں دے دیا یا مہدی لہ کے کسی وکیل کے قبضے میں دے دیا تب تو حنفیہ بھی اس فتوی سے متفق ہیں کیونکہ یا **"المهدی له"** کا قبضہ ہوگیا یا اس کے وکیل کا قبضہ ہوگیا۔ دونوں صورتوں میں قبضہ تام ہوگیا اور اگر فصل سے مراد یہ ہو کہ **"مهدی"** نے اپنی وہ رقم دوسری رقم سے الگ کر کے رکھ دی جس کو افراز کہتے ہیں لیکن ابھی **"المهدی له"** یا اس کے وکیل کی تحویل میں نہیں دی تو اس صورت میں ہبہ کے تام ہونے میں اختلاف ہے۔

حنفیہ کے نزدیک محض افراز سے علیحدہ کر لینے سے **"المهدی له"** کا قبضہ متحقق نہیں ہوتا اور ہبہ تام نہیں ہوتا، لہٰذا اگر اس صورت میں **"مهدی"** کا انتقال ہو جائے تو وہ رقم **"مهدی"** کی ہی رہے گی اور اس کے ورثے میں ترکہ کے طور پر تقسیم ہوگی۔

"وإن لم تكن فصلت فهي لورثة الذي أهدى وقال الحسن أيهما مات قبل لورثة المهدى له إذا قبضها الرسول".

حسن بصری نے فرمایا کہ ان میں سے جو پہلے مرجائے تو **"المهدی له"** کے ورثاء کو ملے گا جبکہ اس کو رسول نے قبضہ کر لیا ہو۔

یہاں اگر رسول سے **"المهدی له"** کا رسول مراد ہو تب تو حنفیہ بھی اس سے متفق ہیں کہ **"المهدی له"** کے رسول نے قبضہ کر لیا تو اس کا قبضہ گویا **"المهدی له"** کا قبضہ ہے تو ہبہ تام ہوگیا لیکن اگر رسول سے **"مهدی"** کا رسول مراد ہے تو پھر اس سے متفق نہیں کیونکہ **"مهدی"** کا رسول **"مهدی"** کا وکیل ہے، اس کے قبضے میں ہونا ایسا ہی جیسا کہ **"مهدی"** کے قبضے میں ہو تو چونکہ ابھی **"مهدی له"** کا قبضہ نہیں ہوا، لہٰذا ہبہ

تام نہیں ہوا۔

۲۵۹۸ ۔ حدثنا علي بن عبدالله : حدثنا سفيان : حدثنا ابن المنكدر : سمعت جابراً ﷺ قال: لي النبي ﷺ :((لو جاء مال البحرين أعطيتك هكذا)) ثلاثا. فلم يقدم حتى تو في النبي ﷺ فأرسل أبو بكر مناديا فنادى : من كان له عند النبي ﷺ عدة أو دين فليأتنا ' فأتيته فقلت: إن النبي ﷺ وعدني، فحثى لي ثلاثا. [راجع : ۲۲۹۶].

یہ واقعہ پہلے گزر چکا ہے۔ یہاں لانے کا منشاء یہ ہے کہ حضرت صدیق اکبر ﷺ نے یہ اعلان کیا تھا کہ جس کو حضور ﷺ نے کوئی ہدیہ دینے کا وعدہ کیا ہو وہ میرے پاس آجائے، میں دوں گا۔

ترجمۃ الباب میں یہ کہا ہے کہ ایک شخص ہبہ کا وعدہ کر کے مرجائے تو اس کے ورثہ پر واجب ہے کہ اس وعدہ کو پورا کرے لیکن جمہور کے نزدیک یہ بات درست نہیں اور حضرت صدیق اکبر ﷺ کے واقعہ سے اس لئے استدلال درست نہیں کہ حضرت صدیق اکبر ﷺ نے جو کچھ کیا اس کا منشاء یہ نہیں تھا کہ حضور اکرم ﷺ کے ورثاء پر وعدہ پورا کرنا واجب تھا کیونکہ حضور اکرم ﷺ کی تو میراث ہی نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق ﷺ نے حضور اقدس ﷺ کے کئے ہوئے وعدہ کے احترام کے طور پر بیت المال سے دینے کا وعدہ کیا۔ بیت المال میں سب مسلمانوں کا حق ہوتا ہے لیکن فرمایا کہ جن کے لئے حضور اقدس ﷺ نے وعدہ کیا تھا میں ان کو پہلے دوں گا، لہٰذا اس کو عام لوگوں کے وعدہ پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۹) باب كيف يقبض العبد والمتاع؟

" وقال ابن عمر : كنت على بكر صعب فاشتراه النبي ﷺ " وقال : ((هولك يا عبدالله)).

یہاں قبضہ کی کیفیت بتانا مقصود ہے کہ غلام یا متاع پر قبضہ کس طرح ہوتا ہے؟

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ میں ایک مشکل قسم کے اونٹ پر سوار تھا۔ حضور اقدس ﷺ نے وہ خریدا اور خرید کر مجھے دے دیا اور فرمایا **"هولك يا عبدالله"**.

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ پہلے سے اونٹ پر سوار تھے۔ آپ ﷺ نے اونٹ خرید کر ہبہ کیا تو ہبہ کرنے کے بعد قبضہ جدید کی ضرورت نہیں بلکہ پہلے جس طرح کا قبضہ تھا اسی کو ہبہ کا قبضہ بھی تصور کر لیا گیا۔

معلوم ہوا کہ اگر اس طرح کر لیا جائے تو جائز ہے۔

۲۵۹۹ ۔ حدثنا قتيبة بن سعيد : حدثنا الليث ، عن ابن أبي مليكة، عن المسور

بن مخرمة رضي الله عنهما أنه قال: قسم رسول الله ﷺ أقبية ولم يعط مخرمة منها شيئا فقال مخرمة: يا بني انطلق بنا إلى رسول الله ﷺ، فانطلقت معه فقال: ادخل فادعه لي، قال فدعوته له فخرج إليه وعليه قباء منها. فقال: ((خبأنا هذا لك)). قال: فنظر إليه فقال: رضي مخرمة. [۳۱]

حضرت سعد بن مخرمہ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کچھ قبائیں تقسیم فرمائیں "**ولم يعط مخرمة منها شيئا**" میرے والد مخرمہ کو کچھ نہیں دیا، یہ مخرمہ کچھ تند مزاج قسم کے بزرگ تھے۔

"**فقال مخرمة: يا بني أنطلق بنا إلىٰ رسول الله ﷺ**" بیٹے رسول اللہ ﷺ کے پاس چلو۔

"**فانطلقت معه فقال: ادخل فادعه لي**".

حضرت مخرمہ رضی اللہ عنہ نے کہا جاؤ اندر جا کے حضور اکرم ﷺ کو بلا کے لاؤ۔ دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضرت سعد بن مخرمہ رضی اللہ عنہ ذرا ٹھٹکے یہ کیا بات ہوئی کہ میں حضور اکرم ﷺ کو بلا کے لاؤں، حضور اکرم ﷺ کو بلانا ادب کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ مخرمہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا کہ بیٹے حضور اکرم ﷺ ان باتوں سے بالاتر ہیں یعنی وہ اس قسم کا کوئی خیال نہیں کرتے کہ مجھے کسی نے بلایا "**فدعوته له**............" آپ ﷺ تشریف لائے اور آپ ﷺ کے اوپر ایک قبا پڑی ہوئی تھی۔ "**فقال خبانا هذالک**" دیکھو ہم نے تمہارے لئے چھپا کر رکھی ہوئی تھی "**قال: فنظر اليه' فقال: رضي مخرمة**" پھر ان کو دے دی۔

(۲۰) إذا وهب هبة فقبضها الآخر ولم يقل: قبلت

۲۶۰۰ ـ حدثنا محمد بن محبوب: حدثنا عبدالواحد: حدثنا معمر، عن الزهري، عن حميد بن عبد الرحمٰن، عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: جاء رجل إلى رسول الله ﷺ فقال: هلكت. فقال: ((وما ذاك؟)) قال: وقعت بأهلي في رمضان. قال: ((أتجد رقبة؟)) قال: لا، قال: ((فهل تستطيع أن تصوم شهرين متتابعين؟)) قال: لا، قال: ((فتستطيع أن تطعم ستين مسكينا؟)) قال: لا، قال: فجاء رجل من الأنصار بعرق، والعرق المكتل فيه تمر، فقال: ((اذهب بهذا فتصدق به)). قال: على أحوج منا يارسول

---

[۳۱] وفي صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب اعطاء من سأل بفحش وغلظة، رقم: ۱۷۵۰، وسنن الترمذي، كتاب الأدب عن رسول الله، باب ماجاء في كراهية الحرير والديباج، رقم: ۲۷۴۳، وسنن النسائي، كتاب الزينة، باب لبس الأقبية، رقم: ۵۲۲۹، وسنن ابي داؤد، كتاب اللباس، باب ماجاء في الاقبية، رقم: ۳۵۱۰، ومسند احمد، اوّل مسند الكوفيين، باب حديث المسور بن مخرمة الزهري ومروان بن الحكم، رقم: ۱۸۱۶۵.

الله ؟ والذی بعثک بالحق مابین لا بتیها أهل بیت أحوج منا ، ثم قال: ((اذهب فاطعمه أهلک)).[راجع ۱۹۳۶].

یہ مشہور واقعہ ہے۔ یہاں امام بخاریؒ کا منشاء یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیا، انہوں نے لے لیا اور زبان سے قبلت نہیں کہا۔

معلوم ہوا موہوب لہ ہبہ پر قبضہ کرلے اور زبان سے قبلت نہ کہے تب بھی ہبہ تام ہوجاتا ہے۔

(۲۱) باب إذا وهب دينا على رجل

وقال : شعبة، عن الحكم : هو جائز. ووهب الحسن بن علی رضی الله عنهما دينه لرجل. وقال النبی ﷺ :((من كان له عليه حق فليعطه أوليتحلله منه. وقال جابر : قتل أبی وعليه دين فسأل النبی ﷺ غرماءه أن يقبلوا ثمر حائطی ويحللوا أبی.

۲۶۰۱ ۔ حدثنا عبدان : أخبرنا عبدالله :أخبرنايونس. وقال الليث: حدثنی يونس ، عن ابن شهاب أنه قال : حدثنی ابن كعب بن مالك :أن جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنهما أخبره: أن أباه قتل يوم أحد شهيدا فاشتد الغرماء فی حقوقهم فأتيت رسول الله ﷺ فكلمته فسألهم أن يقبلوا ثمر حائطی، ويحللوا أبی فأبوا .فلم يعطهم رسول الله ﷺ ولم يكسره لهم ولكن قال: ((سأغدو عليک إن شاء الله تعالى فغدا علينا حين اصبح فطاف فی النخل فدعا فی ثمره بالبركة ،فجددتها فقضيتهم حقهم وبقی لنامن ثمرها بقية.ثم جئت رسول الله ﷺ وهوجالس فأخبرته بذلک ،فقال رسول الله ﷺ لعمر : ((اسمع ۔وهو جالس۔ ياعمر)).فقال عمر : ألايكون قد علمنا أنک رسول الله ، واللہ إنک لرسول الله. [راجع :۲۱۲۷].

یہ ترجمۃ الباب ہے کہ ایک شخص کا دوسرے پر دین واجب ہے کیا وہ اس شخص کو دین ہبہ کرسکتا ہے؟

دین کے ہبہ کی تفصیل

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دین کے ہبہ کی دو صورتیں ہیں :

ایک صورت تو یہ ہے کہ خود مدیون کو دین کا ہبہ کردیا جائے، جس کا حاصل ابراء ہے، مثلاً دائن مدیون سے کہے کہ میں اپنا دین تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ میں اپنے دین سے تم کو بری الذمہ قرار دیتا ہوں۔ یہ

صورت بالا جماع جائز ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں جو واقعات ذکر کئے ہیں وہ سب اسی سے متعلق ہیں کہ مدیون کو دین ہبہ کر دیا گیا، جس کا حاصل **"ابراء المدیون عن الدین"** ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی آدمی کسی شخص سے یوں کہے کہ میرا جو دین زید پر واجب ہے میں وہ تم کو ہبہ کرتا ہوں۔ یہ جائز ہے یا نہیں اس میں فقہاء کا اختلاف ہے۔

فقہاء کرام میں سے بڑی جماعت یہ کہتی ہے کہ یہ صورت جائز ہے۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ جائز نہیں کیونکہ یہ **"تملیک الدین من غیر من علیه الدین"** ہے۔ یعنی اس شخص کو دین کا مالک بنانا جس پر دین واجب نہیں تھا جو غیر مدیون ہے، یہ نہ بطریق بیع جائز ہے اور نہ بطریق ہبہ جائز ہے **"عند الأحناف"**.

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہبہ کے تام ہونے کے لئے شرط ہے کہ موهوب لہ ہبہ پر قبضہ کرلے اور یہ تو دین ہے اس میں کسی قسم کے قبضے کا سوال ہی نہیں، لہٰذا محض یہ کہہ دینے سے کہ اپنا دین تمہیں ہبہ کر دیا، ہبہ منعقد نہیں ہوگا۔

ہاں! اگر کسی وقت مدیون اس کو وہ دین دیدے اور واہب یہ کہے کہ ٹھیک ہے رکھ لو، تو ہبہ ہو جائے گا۔[۳۲]

"وقال شعبة عن الحكم هو جائز ووهب الحسن بن علي رضي الله عنهما دينه لرجل" حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اپنا دین کسی شخص کو ہبہ کر دیا تھا مراد یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔

"وقال النبي ﷺ من كان له عليه حق فليعطه أو ليتحلله منه" حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جس کے اوپر کسی کا حق واجب ہو وہ یا تو اس کا حق ادا کرے یا اس سے معاف کرائے، معاف کرانے کا مطلب یہ ہے کہ معاف کرنے والا اپنا دین اس کو ہبہ کر دے گا تو معاف ہو جائے گا۔ اس سے **"هبة الدين ممن عليه الدين"** کا جائز ہونا معلوم ہوا۔

"وقال جابر رضی اللہ عنہ" حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا واقعہ دوبارہ ذکر کیا کہ میرے والد شہید ہوگئے تھے، ان پر دین تھا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے دائنین سے کہا کہ وہ میرے باپ کا پھل قبول کرلیں اور میرے باپ کو معاف کر دیں، تو آپ ﷺ نے معاف کرنے کی فرمائش کی اور معاف کرنے کا یہ معنی ہے کہ ان کے دائنین ان کے والد کو یا ان کے ورثہ کو دین ہبہ کر دیں۔ معلوم ہوا کہ **"هبة الدين ممن عليه الدين"** جائز ہے۔

(۲۲) باب هبة الواحد للجماعة

"وقالت أسماء للقاسم بن محمد وابن أبي عتيق : ورثت عن أختي عائشة

۳۲ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۲۵.

بالغابة، وقد أعطاني به معاوية مائة الف فهو لكما".

۲۶۰۲ - حدثنا يحيى بن قزعة : حدثنا مالک ، عن أبي حازم، سهل بن سعد ﷺ: أن النبي ﷺ أتي بشراب فشرب و عن يمينه غلام و عن يساره الأشياخ ، فقال للغلام: ((إن أذنت لي أعطيت هؤلاء)) ، فقال : ماكنت لأوثر بنصيبي منک يارسول الله أحدا ، فتله في يده. [راجع: ۲۳۵۱]

یہاں دوسرا مسئلہ چھیڑ دیا "**باب هبة الواحد للجماعة**" کہ اگر ایک آدمی ایک سے زائد آدمیوں کو ہبہ کرے، جس کو اصطلاح میں ہبۃ المشاع کہتے ہیں، یہ جائز ہے یا نہیں؟

ایک چیز ہو اور ایک سے زائد افراد کو ہبہ کردی جائے جیسے باپ کے پاس ایک مکان ہے، اس نے کہا میں یہ مکان تقسیم کئے بغیر مشاع حالت میں تمام بیٹوں کو ہبہ کرتا ہوں۔

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ھبۃ المشاع جائز نہیں اور امام شافعیؒ کے نزدیک مشاع کا ہبہ جائز ہے۔

ہبۃ المشاع میں امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک تفصیل

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تفصیل یہ ہے کہ جو چیز ہبہ کی جارہی ہے اگر وہ قابل تقسیم نہیں ہے یعنی ایسی چیز ہے کہ اگر اسے تقسیم کریں تو اس کا فائدہ ہی ختم ہو جائے گا جیسے کنواں، چکی یا مشین، تو ان کے بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ مشاع ہیں اس لئے ان کا ہبہ جائز ہے۔

اور اگر وہ چیز قابل تقسیم ہے جیسے زمین ہے تو اس کا ہبہ حنفیہ کے نزدیک مشاع حالت میں جائز نہیں۔ حنفیہ اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ جب تک تقسیم نہ ہو اس وقت تک قبضہ تام نہیں ہوسکتا اور جب قبضہ تام نہ ہو اس وقت تک ہبہ تام نہیں ہوتا۔

اس مسئلے میں بھی حنفیہ کا استدلال اس واقعے سے ہے جو موطأ میں آیا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو بیس وسق کھجور اپنے باغ سے ھبہ فرمائی تھیں مگر پھر وفات سے کچھ پہلے فرمایا:

"فلو كنت جددتيه واحتزتيه كان لک وانما هو اليوم مال وارث" [۳۳]

مطلب یہ ہے کہ وہ مشاع تھا، جب ان کو ہبہ کیا تو یہ مشاع کا ہبہ ہوا، اب فرمایا کہ اگر تم اس کو الگ کرکے لے لیتیں تو تمہارے لئے جائز ہوتا لیکن چونکہ الگ کرکے نہیں لیا اس لئے جائز نہیں۔ معلوم ہوا کہ مشاع کا ہبہ درست نہیں۔ [۳۴]

---

۳۳ موطأ مالک ، کتاب الأقضية ، باب مالا يجوز من النحل ، رقم : ۱۴۳۸ ، ج: ۲ ، ص: ۷۵۲ .

۳۴ عمدۃ القاری ، ج: ۹ ، ص: ۴۲۷ .

امام شافعیؒ ہبۃ المشاع کو جائز کہتے ہیں ۔ امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی اسی طرف ہے ۔ اور ھبۃ المشاع کے جواز پر پہلا استدلال حضرت اسماءؓ کے واقعہ سے کررہے ہیں ۔

حضرت اسماءؓ نے اپنے بھائی قاسم بن محمد اور ابن ابی عتیق سے کہا کہ **"ورثت عن أختي عائشة بالغابة"** مجھے اپنی بہن عائشہؓ سے غابہ میں میراث سے کوئی چیز حاصل ہوئی ہے ۔

غابہ ایک جگہ کا نام ہے، وہاں کوئی جائیداد تھی، حضرت اسماء کہہ رہی ہیں کہ مجھے وراثت میں کچھ جائیداد ملی ہے اور حضرت معاویہ ﷺ نے اس کے عوض مجھے ایک لاکھ درہم دینے کی پیشکش کی ہے کہ میں ان کو ایک لاکھ درہم میں بیچ دوں **"فهو لكما"** اے قاسم بن محمد اور اے ابن ابی عتیق ! میں یہ جائیداد تم کو ہبہ میں دیتی ہوں ۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا نے وہ جائیداد قاسم بن محمد اور ابن ابی عتیق دونوں کو اکٹھی ہبہ میں دے دی تو یہ مشاع کا ہبہ ہوا، لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ہبۃ المشاع جائز ہے ۔

حنفیہ کی جانب سے حضرت اسماءؓ کے واقعہ کی تاویل

حنفیہ نے اس کی تاویل یہ کی ہے کہ حنفیہ کے خلاف اس واقعہ کے حجت ہونے کے لئے پہلے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ یہ جائیداد قابل تقسیم تھی ۔ ہوسکتا ہے کسی وجہ سے قابل تقسیم نہ ہو، پھر اس صورت میں ہبۃ المشاع ہمارے نزدیک بھی جائز ہے ۔

دوسرا یہ کہ اگر قابل تقسیم تھی اور یہ کہہ دیا کہ یہ تمہاری ہے، ہوسکتا ہے کہ جب عملاً دی ہو تو تقسیم کردی ہو ۔ پھر یہ ہبۃ المشاع نہیں ہوگا ۔

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا قول

ہبۃ المشاع میں حنفیہ کے دلائل کچھ کمزور ہیں اس لئے فیض الباری میں حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ فرمایا ہے کہ ہبۃ المشاع کے مسئلے میں تشدد نہ کرنا چاہئے ۔ کہتے ہیں کہ حنفیہ نے اس مسئلہ میں بڑی سختی کی ہے اور امام بخاریؒ نے بہت توسع سے کام لیا ہے، حالانکہ معاملہ بین بین ہونا چاہئے ۔[۳۵]

وہ کہتے ہیں کہ اصل میں ہبۃ المشاع کی ممانعت کی وجہ یہ تھی کہ آگے چل کر کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو لیکن جہاں جھگڑے کا احتمال نہ ہو تو وہاں ھبۃ المشاع ہوجائے تو چلنے دینا چاہئے ۔ آج کل مسئلہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ باپ اپنی زندگی میں جائیداد تقسیم کرتے ہیں چونکہ مرنے کے بعد اکثر جھگڑے ہوتے ہیں ۔ لڑکیوں کو حصہ نہیں دیتے ۔ بہت سے باپ اپنی زندگی میں تقسیم اس طرح کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ جو دکان ہے وہ لڑکوں کی ہے اور مکان لڑکیوں کا ہے اور یہ مسئلہ ان کو معلوم نہیں کہ ہبۃ المشاع نہیں ہوتا، چنانچہ کہتے ہیں کہ پوری دکان میرے

---

۳۵ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۷۲ .

چاروں لڑکوں کی ہے۔اس کے بعد جب باپ کا انتقال ہوگیا، اب سوال پیدا ہوا کہ ہبہ تام ہوا ہے یا نہیں؟

اگر حنفیہ کے اصول پر دیکھا جائے تو ہبہ تام نہیں ہوا۔ اس کا تقاضا یہ ہوا کہ لڑکیوں کو والد کی زندگی میں مکان میں سے حصہ مل گیا۔ اب والد کے مرنے کے بعد دکان میں بھی ان کا حصہ ہونا چاہئے تو ناواقفیت کی وجہ سے بکثرت یہ صورتحال پیدا ہوتی ہے، اس لئے اس پر بہت زیادہ جمود بھی مناسب نہیں۔

اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ مشاع پر قبضہ نہیں ہوتا تو قبضہ **"کل شیء بحسبه"** ہر چیز کا قبضہ اس کے حساب سے ہوتا ہے، چنانچہ غیر مقسوم اشیاء کے بارے میں حنفیہ بھی کہتے ہیں کہ درست ہو جائے گا حالانکہ وہاں بھی قبضہ نہیں ہوتا۔

شاہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اتنا جمود نہ کرنا چاہئے، اس سے خرابی پیدا ہوتی ہے اور ایسے مواقع جہاں حاجت ہو وہاں ہبۃ المشاع کو جائز قرار دینا چاہئے۔

یہاں امام بخاری نے ہبۃ المشاع پر عجیب وغریب قسم کا استدلال کیا ہے کہ پانی پی رہے تھے دائیں طرف لڑکا بیٹھا تھا، بائیں طرف بڑے لوگ تھے، لڑکے سے کہا اگر تم اجازت دے دو تو میں ان کو دے دوں، اس نے انکار کر دیا۔ امام بخاری یہ استدلال کر رہے ہیں کہ آپ نے اس لڑکے سے کہا کہ تم اپنا حصہ ان اشیاخ کو ہبہ کر دو جو بیٹھے ہوئے ہیں تو چونکہ یہ سب کی طرف ہبہ ہوتا اس لئے یہ ہبۃ بالمشاع ہوتا۔

اب دیکھئے یہ کتنا کمزور استدلال ہے اس لئے کہ یہ کوئی اس لڑکے کی طرف سے ہبہ تو نہیں تھا، پانی تو حضور ﷺ دے رہے تھے، واہب حضور ﷺ تھے۔ اس کو کہہ رہے ہیں کہ ادھر منتقل کر دو۔ لہٰذا اس سے ہبۃ المشاع پر استدلال بہت ہی دور از کار استدلال ہے۔

(۲۳) باب الهبة المقبوضة وغير المقبوضة، والمقسومة وغير المقسومة

"وقد وهب النبي ﷺ وأصحابه لهوازن ما غنموا منهم وهو غير مقسوم".

یہ ہبہ مقبوضہ اور غیر مقبوضہ کی بات کہہ دی، ان کا رجحان اس طرف ہے کہ چاہے قبضہ ہو یا نہ ہو مگر ہبہ درست ہو جاتا ہے اور مقسوم ہو یا نہ ہو چاہے مشاع ہو، دونوں صورتوں میں ہو جاتا ہے۔

ہوازن کے واقعہ سے استدلال کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صحابہ کرام ﷺ کہتے ہیں کہ وہ ساری باندیاں ہوازن کو ہبہ کر دیں تو یہ ہبۃ المشاع غیر مقسوم ہوا۔

لیکن یہ استدلال بھی کمزور ہے۔ مغازی میں یہ ہے کہ یہ سب تقسیم کر دی گئیں تھیں اور ہر باندی ہر ایک کے حصہ میں آچکی تھی، اب اگر ان کو واپس کرنا ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر ایک نے آزاد کر دیا۔ لہٰذا ہبہ کا

کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۲۶۰۳ ۔ حدثني ثابت بن محمد : حدثنا مسعر، عن محارب، عن جابر ﷺ : أتيت النبي ﷺ في المسجد فقضاني وزادني. [راجع : ۴۴۳]

۲۶۰۴ ۔ حدثنا محمد بن بشار: حدثنا غندر: حدثنا شعبة ، عن محارب: سمعت جابر بن عبدالله رضي الله عنهما يقول : بعت من النبي ﷺ بعيرا في سفر فلما أتينا المدينة قال: ((ائت المسجد فصل ركعتين)) فوزن . قال شعبة : أراه : فوزن لي فأرجح، فما زال منها شيءٌ حتى أصابها أهل الشام يوم الحرة. [راجع: ۴۴۳]

یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال ہے فرماتے ہیں کہ حضرت جابر ﷺ کا حضور اکرم ﷺ پر کچھ دین واجب تھا یعنی بعیر کی قیمت، تو آپ ﷺ نے مجھے اس سے زیادہ دیا۔ تو کہتے ہیں جو زیادہ دیا، وہ اصل قیمت کے ساتھ ملا جلا تھا، الگ نہیں تھا۔ مثلاً ایک اوقیہ چاندی قیمت تھی فرض کریں ایک قیراط آپ ﷺ نے زیادہ دیا۔ تو وہ ایک قیراط ایک اوقیہ کے ساتھ مل گیا، تو مجموعہ مشاع ہو گیا، لہٰذا مشاع کا ہبہ ہو گیا۔

لیکن یہ استدلال بھی بڑا بعید ہے، اس لئے کہ زیادتی الگ چیز تھی جو حضرت جابرؓ نے اُٹھا کر الگ رکھ لی تھی۔ مسند احمدؒ کی حدیث میں آیا ہے کہتے ہیں کہ میرے پاس گھر میں رکھی رہی یہاں تک کہ فتنہ حرہ میں جا کر ضائع ہوئی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کو ہبۃ المشاع نہیں کہیں گے بلکہ یہ تو حسن قضاء ہے۔ اور زیادتی اس لئے دی جارہی ہے تاکہ دین میں کوئی کمی نہ رہے احتیاط کے طور پر دی جارہی ہے۔ لہٰذا اس کا ہبۃ المشاع سے کوئی تعلق نہیں۔

(۲۴) باب إذا وهب جماعة لقوم .

۲۶۰۷، ۲۶۰۸ ۔ حدثنا يحيى بن بكير : حدثنا الليث ، عن ابن شهاب ، عن عروة : أن مروان بن الحكم والمسور بن مخرمة أخبراه أن النبي ﷺ قال حين جاءه وفد هوازن مسلمين ، فسألوه أن يرد إليهم أموالهم سبيهم فقال لهم : ((معي من ترون وأحب الحديث إلي أصدقه، فاختاروا إحدى الطائفتين : إما السبي وإما المال وقد كنت استأنيت))، وكان النبي ﷺ انتظرهم بضع عشرة ليلة حين قفل من الطائف ، فلما تبين لهم أن النبي ﷺ غير رادّ إليهم إلا احدى الطائفين قالوا: فانا نختار سبينا ، فقام في المسلمين فأثنى على الله بما هو أهله ، ثم قال: ((اما بعد ، فإن إخوانكم هو لاء جاؤنا تائبين وإني رأيت أن أرد إليهم سبيهم : فمن أحب منكم أن يطيب ذلک فليفعل ومن أحب أن يكون على حظه حتى نعطيه أياه من أول مايفيء الله علينافيفعل)) ، فقال الناس :

طيبنا يارسول الله لهم ، فقال لهم : ((إنا لا ندري من أذن منكم فيه ممن لم يأذن فارجعوا حتى يرفع إلينا عرفاؤكم أمركم)) ، فرجع الناس، فكلمهم عرفاؤهم ، ثم رجعوا إلى النبي ﷺ فأخبروه أنهم طيبوا وأذنوا. بهذا الذي بلغنامن سبی هوازن، هذا آخر قول الزهري . يعني : فهذا الذي بلغنا. [۳۶]

دو صورتیں بیان کی ہیں کہ بہت سارے آدمی مل کر کسی ایک کو ہبہ دیں ، یہ صورت ہمارے نزدیک بھی جائز ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ایک آدمی بہت ساری جماعت کو ملکر دے تو یہ هبة المشاع ہے جس کا حکم گزر گیا۔ یہاں پھر ھوازن کا واقعہ ذکر کیا ہے جس کا حقیقت میں ہبہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲۵) باب من أهدى له هدية وعنده جلساؤه فهو أحق بها

"ويذكر عن ابن عباس أن جلساء ه شركاؤه ، ولم يصح".

جس شخص کو ہدیہ دیا جائے اور اسکے پاس کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوں تو جس کو ہدیہ دیا گیا ہے وہی اس کا زیادہ حقدار ہے۔

یہ باب اس لئے قائم کیا ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے ایک حدیث مروی ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ **"من أهدى له هدية فجلساؤه شركاء ه أو كما قال"** کہ کسی کو ہدیہ کیا جائے تو جو اس کے جلساء ہیں، اس کے پاس بیٹھے ہیں وہ بھی اس میں شریک ہیں۔ اسی کو بعض اوقات اس مقولہ سے تعبیر کیا جاتا ہے کہ **"الهدايا مشتركة"**.

امام بخاری رحمہ اللہ اس کی تردید کر رہے ہیں کہ یہ روایت صحیح نہیں ہے یعنی **"ويذكر عن عباس أن جلساء ه شركاؤه"** حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مرفوعاً اور موقوفاً دونوں طرح مروی ہے کہ اس کے جلساء اس کے ہدیہ میں شریک ہوں گے، فرمایا **"ولم يصح"** یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔

چونکہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے لہٰذا اصل بات یہ ہے جس کو ہدیہ دیا گیا وہی اس کا حقدار ہے۔ البتہ بعض لوگوں نے اس کو عبد اللہ بن عباسؓ سے بالکل صحیح قرار دیا ہے اگر چہ مرفوعاً یہ حدیث صحیح نہیں ہے، تو اس کا مطلب بھی امام ابو یوسفؒ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر کوئی کھانے پینے کی چیز کسی مجلس میں بھیجی گئی اگر چہ وہ ایک آدمی کو

---

[۳۶] وفي سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في فداء الاسير بالمال ، رقم : ۲۳۱۸، ومسند احمد ، أول مسند الكوفيين ، باب حديث المسور بن مخرمة الزهري ومروان بن الحكم ، رقم : ۱۸۱۵۶.

بھیجی گئی ہو، لیکن مروت کا تقاضا یہ ہے کہ دیگر جلساء کو بھی اس میں شریک کرے مگر ایسا کرنا واجب نہیں ہے۔ [۳۷]

(۲۶) باب إذا وهب بعيرا لرجل وهو راكبه فهو جائز

۲۶۱۱ - وقال الحميدی : حدثنا سفيان : حدثنا عمرو ، عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: كنا مع النبی ﷺ فی سفر وكنت على بكر صعب فقال النبی ﷺ لعمر : ((بعنيه)) فابتاعه، فقال النبی ﷺ : ((هو لک يا عبدالله)) . [راجع : ۲۱۱۵]

یہ ساری حدیثیں پیچھے گزر چکی ہیں اور سب میں یہی ہے جس کو ہدیہ دیا گیا وہی مالک قرار پایا۔

(۲۷) باب هدية مايكره لبسها

۲۶۱۲ - حدثنا عبدالله بن مسلمة، عن مالک ، عن نافع ، عن عبدالله بن عمر رضی الله عنهما قال: رأى عمر بن الخطاب حلة سيراء عند باب المسجد فقال : يا رسول الله لو اشتريتها فلبستها يوم الجمعة وللوفد. قال : ((إنما يلبسها من لا خلاق له فی الآخرة)) . ثم جاء ت حلل فأعطى رسول الله ﷺ عمر منها حلة فقال: أكسوتنيها وقلت فی عُطارِدٍ ماقلت ؟ فقال: ((إنی لم أكسُلها لتلسبها ، فكساها عمر أخا له بمكة مشر كا)). [راجع : ۸۸۶]

۲۶۱۳ - حدثنا محمد بن جعفر أبو جعفر : حدثنا ابن فضيل ، عن أبيه ، عن نافع ، عن ابن عمر رضی الله عنهما قال: أتى النبی ﷺ بيت فاطمة فلم يدخل عليها ، وجاء علی فذكرت له ذلک ، فذكر للنبی ﷺ قال : ((إنی رأيت علی بابها سترا موشيا)) ، فقال : ((مالی وللدنيا)) ، فأتاها علی فذكر ذلک لها فقالت : ليأمرنی فيه بماشاء ، قال: ((ترسلی به إلى فلان ، أهل بيت بهم حاجة)).

حدیث باب کی تشریح

آپ ﷺ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے، اندر داخل نہیں ہوئے، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ذکر کیا کہ آپ ﷺ تشریف لائے تھے اور واپس چلے گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات نبی کریم ﷺ سے ذکر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے ان (حضرت

---

[۳۷] فیض الباری، ج:۳، ص:۳۷۸۔

فاطمہؓ) کے دروازہ پر ایک پردہ دیکھا تھا جس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، یہ مترفین کی عادت ہے۔

"فقال" ((**مالي وللدنيا**)) فرمایا کہ میرا دنیا سے کیا کام، اس قسم کے پردے لٹکے ہوئے تھے اس لئے میں اچھا نہیں سمجھا۔

"فأتاها علی ﷺ فذكر ذلک لها" حضرت علیؓ نے جا کر حضرت فاطمہؓ سے ذکر کیا۔ **"فقالت"** انہوں نے فرمایا **"ليا مرني فيه ماشاء"** کہ حضور ﷺ اس کے بارے میں جو چاہیں حکم دے دیں کہ میں پردے کو ہٹا دوں یا کیا کروں؟

آپ ﷺ نے فرمایا((**ترسلي به إلى فلان أهل بيت بهم حاجة**)) کہ فلاں اہل بیت کو بھیج دو، وہ حاجت مند ہیں، اس کو بیچ کر اپنا کام پورا کرلیں گے۔

معلوم ہوا کہ جس چیز کو خود استعمال کرنا مکروہ ہے وہ دوسرے کو ہدیہ دی جا سکتی ہے اور امام بخاریؒ نے یہی ترجمۃ الباب قائم فرمایا ہے۔

۲۶۱۴ ـ حدثنا حجاج بن منهال : حدثنا شعبة قال: أخبرني عبدالملك بن ميسرة قال : سمعت زيد بن وهب عن علی ﷺ قال : أهدى إلى النبی ﷺ حلة سيراء فلبستها فرأيت الغضب في وجهه فشققتها بين نسائی. [انظر ۵۳۶۶، ۵۸۴۰] [۳۸]

نسائی سے مراد ہے، میرے گھر کی عورتیں، بیوی ہونا ضروری نہیں، کیونکہ حضور اقدس ﷺ کی حیات میں ان کی حضرت علیؓ کی اہلیہ صرف حضرت فاطمہؓ ہی تھیں، تو نسائی سے خاندان کی اور عورتیں مراد ہیں۔

(۲۸) باب قبول الهدية من المشركين

وقال أبو هريرة عن النبی ﷺ : ((هاجر إبراهيم عليه السلام بسارة فدخل قرية فيها ملک أوجبار ، فقال : أعطوها أجر)). واهديت للنبی ﷺ شاة فيها سم. وقال أبو حميد : أهدى ملک أيلة للنبی ﷺ بغلة بيضاء فكساه بردا وكتب إليه ببحرهم.

۲۶۱۵ ـ حدثنا عبدالله بن محمد : حدثنا يونس بن محمد : حدثنا شيبان عن قتادة : حدثنا أنس ﷺ قال : أهدى للنبی ﷺ جبة سندس ، وكان ينهى عن الحرير فعجب

---

[۳۸] وفي صحيح مسلم ، كتاب اللباس والزينة ، باب تحريم استعمال اناء الذهب والفضة على الرجال ، رقم :۳۸۶۲ ، وسنن النسائی ، كتاب الزينة ، باب ذكر الرخصة للنساء في لبس السيراء ، رقم :۵۲۰۳ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب اللباس، باب ماجاء في لبس الحرير ، رقم :۳۵۲۴ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب اللباس ، باب لبس الحرير والذهب للنساء ، رقم: ۳۵۸۶ ، ومسند أحمد ، مسند العشرة المشرين بالجنة ، باب من مسند علی بن أبي طالب ، رقم :۶۶۰، ۶۷۲ ، ۶۱۷ ، ۹۱۲، ۹۱۷، ۱۰۹۷، ۱۱۰۴، ۱۱۱۲، ۱۲۴۶.

الناس منها ، فقال ﷺ :((والذی نفس محمد بیده لمنادیل سعد بن معاذ فی الجنة أحسن من هذا)).[أنظر: ۲۶۱۶، ۳۲۴۸].

۲۶۱۶ ۔ وقال سعید عن قتادة عن أنس : إن أكیدر دومة أهدی إلی النبی ﷺ .
[راجع:۲۶۱۵]

حدیث باب کی تشریح

یہاں پر امام بخاری رحمہ اللہ نے مشرکین سے ہدیہ طلب کرنے کی متعدد احادیث نقل کی ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے مشرکین کا ہدیہ قبول کیا۔

یہ ترجمۃ الباب قائم کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے بعض مشرکین کے ہدایا رد فرمائے تھے۔ اور ترمذی میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے مشرکین کے ہدیہ قبول کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

لیکن ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے مشرکین کے ہدایا قبول فرمائے۔[۳۹]

روایات میں تطبیق

دونوں روایتوں میں تطبیق یہ ہے کہ جہاں مشرک سے ہدیہ قبول کرنے میں مسلمانوں کے خلاف، کسی خلاف مصلحت بات کا اندیشہ ہو کہ مشرکین دباؤ ڈالیں گے، یا ان کے ساتھ مداخلت کرنی پڑے گی۔ اس صورت میں ان سے ہدیہ قبول کرنا جائز نہیں۔

لیکن جہاں اس قسم کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو پھر ہدیہ قبول کرنا جائز ہے اور جو احادیث ہیں ان سب میں حضور اقدس ﷺ نے ہدایا ایسی صورت میں قبول فرمائے ہیں، جب اس قسم کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

۲۶۱۷ ۔ حدثنا عبداللہ بن عبدالوهاب :حدثنا خالد بن الحارث : حدثنا شعبة ، عن هشام بن زید، عن أنس بن مالک ﷺ: أن یهودیة أتت النبی ﷺ بشاة مسمومة فأكل منها، فجیئ بها فقیل : ألا نقتلها ؟ قال :((لا)) ، فمازلت أعرفها في لهوات رسول اللہ ﷺ.

یعنی اس زہر کا اثر حضور اقدس ﷺ کے لہوات میں محسوس ہوتا تھا۔

---

[۳۹] أنی نهیت عن زبد المشركین ،سنن الترمذی ،كتاب السیر عن رسول اللہ ،باب فی كراهیة هدایا المشركین، رقم :۱۵۰۲ ، وسنن أبی داؤد ، كتاب الخراج والإمارة والفئی ، باب فی الإمام یقبل هدایا المشركین ، رقم :۲۶۵۷، ومسند احمد ، مسند الشامیین ، رقم :۱۶۸۳۵ ، وعمدة القاری ، ج : ۹ ، ص: ۴۳۶ .

۲۶۱۸ ۔ حدثنا أبو النعمان : حدثنا المعتمر بن سليمان ، عن أبيه ، عن أبي عثمان، عن عبد الرحمٰن أبي بكر رضي الله عنهما قال: كنا مع النبي ﷺ ثلاثين ومائة فقال النبي ﷺ: ((هل مع أحد منكم طعام؟)) فإذا مع رجل صاع من طعام أو نحوه، فعجن ثم جاء رجل ثم جاء رجل مشرك مشعان طويل بغنم يسوقها فقال النبي ﷺ: ((بيعاً أم عطية؟)) أوقال : ((أم هبة؟)) قال : لا ، بل بيع . فاشترى منه شاة فصنعت وأمر النبي ﷺ بسواد البطن أن يشوى ، وايم الله مافي الثلاثين والمائة إلا وقد حزالنبي ﷺ له حزة من سواد بطنها إن كان شاهدا أعطاها إياه وإن كان غائبا خبأله. فجعل منها قصعتين فأكلوا أجمعون و شبعنا، ففضلت القصعتان فحملناه على البعير أوكما قال. [راجع : ۲۲۱۶].

یہ واقعہ کتاب البیوع میں گزر چکا ہے، وہاں مختصر تھا اور یہاں ذرا تفصیل سے ہے۔

حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایک سوتیس افراد تھے۔ آپ ﷺ نے پوچھا، کیا کسی کے پاس کھانا ہے؟ تو کسی کے پاس ایک صاع کھانا تھا یا اس کے جیسا، آپ ﷺ نے اسی کو گوندھوایا۔ پھر ایک مشرک شخص آیا جو مشعان تھا۔

"مشعان" کے معنی بعض لوگوں نے "پراگندہ بال" کئے ہیں اور بعض نے کہا کہ اس کے معنی ہیں "بہت لمبا، طویل"۔

"بغنم يسوقها ، فقال النبي ﷺ ((بيعا أم عطية؟))" نبی کریم ﷺ نے پوچھا کہ یہ بکری ہمیں بیچو گے یا ویسے عطیہ کے طور پر دو گے۔ **"أوقال أم هبة؟"** یہیں سے وہ بات ثابت ہے کہ جو ترجمہ میں ہے گویا آپ ﷺ نے پوچھا کہ اگر عطیہ دینا چاہتے ہو تو ہم لینے کو تیار ہیں۔

"أوقال أم هبة؟"

"قال لا، بل بيعا" آپ ﷺ نے اس سے بکری خریدی، وہ پکائی گئی، آپ ﷺ نے اس کے سواد بطن یعنی کلیجی کو بھوننے کا حکم دیا کہ کلیجی بھونی جائے اور اللہ کی قسم ایک سوتیس میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا **"إلا وقد حز النبي ﷺ له حزة من سواد بطنها"** کہ نبی کریم ﷺ نے اس کی کلیجی کے گوشت کا ٹکڑا ہر ایک کو کاٹ کر دیا۔ اگر وہ موجود تھا تو اسی وقت دے دیا اور اگر وہ غائب تھا تو اس کے لئے بچا کے رکھا۔ پھر اس سے دو پیالے بنائے وہ سب نے کھائے اور سب سیر ہوئے، پھر بھی دو پیالے بچ گئے۔ (سبحان اللہ)

(۲۹) باب الهدية للمشركين

۲۶۲۰ ۔ حدثنا عبيد بن إسماعيل : حدثنا أبو أسامة ، عن هشام ، عن أبيه ، عن

أسماء بنت أبي بكر رضي الله عنهما قلت: قدمت علي أمي وهي مشركة في عهد رسول الله ﷺ فاستفتيت رسول الله ﷺ، قلت: إن أمي قدمت وهي راغبة، أفاصل أمي؟ قال: ((نعم. صلي أمك)). [انظر: ۳۱۸۳، ۵۹۷۸، ۵۹۷۹] [۴۰]

حضرت اسماء رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میرے پاس رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں میری والدہ آئیں وہ مشرکہ تھیں، میں نے آپ ﷺ سے مسئلہ پوچھا اور میں نے عرض کیا **((وهي راغبة))** کہ وہ راغب ہیں۔

راغب ہونے کے معنی یا تو یہ ہیں کہ وہ کچھ ہدیہ لینے میں راغب ہیں، مجھ سے کچھ لینا چاہتی ہیں اور یہ معنی بھی ہوسکتے ہیں کہ **"هي راغبة الاسلام"** وہ اسلام قبول کرنے سے اعراض کرتی ہیں۔ **"افاصل أمي؟"** کیا پھر بھی میں ان کے ساتھ صلہ رحمی کروں؟ آپ ﷺ نے فرمایا **"نعم صلي أمك"**.

معلوم ہوا کہ ماں باپ اگر مشرک بھی ہوں تب بھی ان کے ساتھ صلہ رحمی کرنا اور ان کو ہدیہ دینا مناسب ہے۔

(۳۱) بابٌ:

۲۶۲۴ ـ حدثني إبراهيم بن موسى: أخبرنا هشام بن يوسف: أن ابن جريج أخبرهم قال: أخبرني عبدالله بن عبيد الله بن أبي ملكية: أن بني صهيب مولى ابن جدعان ادعوا بيتين وحجرة، أن رسول الله ﷺ أعطى ذلك صهيبا، فقال مروان: من يشهد لكما على ذلك؟ قالوا: ابن عمر، فدعاه فشهد: لأعطى رسول الله ﷺ صهيبا بيتين وحجرة، فقضى مروان بشهادته لهم. [۴۱]

عبداللہ بن ملیکہ کہتے ہیں کہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ (صہیب مولیٰ ابن جدعان، جن کو صہیب رومی بھی کہتے ہیں) کے بیٹوں نے دو کمروں اور ایک حجرہ کا دعویٰ کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمارے والد صہیب رضی اللہ عنہ کو دیئے تھے۔ مروان کا زمانہ تھا مروان نے کہا **"من يشهد لكما على ذلك؟"** اس پر تمہارا کون گواہ ہے کہ حضور ﷺ نے یہ کمرے دیئے تھے۔ انہوں کہا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ہیں۔

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کو بلایا گیا **"فشهد"** انہوں نے گواہی دی **"لا عطى رسول الله ﷺ صهيبا بيتين وحجرة"** کہ آپ ﷺ نے یہ دو کمرے اور حجرہ صہیب رومی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا **"فقضى مروان**

---

[۴۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الزكوة، باب فضل النفقة والصدقة على الاقربين والزوج والأولاد، رقم: ۱۶۷۰، وسنن أبي داؤد كتاب الزكوة، باب الصدقة على اهل الذمة، رقم: ۱۴۲۰، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث اسماء بنت أبي بكر الصديق، رقم: ۲۵۶۷۷، ۲۵۷۰۲، ۲۵۷۵۴.

[۴۱] انفرد به البخاري.

بشهادته لهم" مروان نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی شہادت کی بنیاد پر فیصلہ کر دیا کہ دونوں کمرے اور حجرہ ان کے بیٹوں کا ہے۔

سوال: یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک آدمی کی شہادت پر کیسے فیصلہ کر دیا، کم از کم دو گواہ ہونا چاہئیں؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ مروان حاکم تھا اور حاکم کو حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ جس کو چاہے، مناسب سمجھے بیت المال میں سے کچھ دیدے۔

عبداللہ بن عمرؓ کی شہادت کی بنیاد پر اس نے دو کمرے اس لئے دے دئے کہ ان کی شہادت درست ہے اور واقعی ان کو حضور اقدس ﷺ نے دیئے تھے تب تو یہ ہبہ حضور اقدس ﷺ کی طرف سے ہوگا۔

اور اگر شہادت درست نہیں اور حضور اقدس ﷺ نے بھی نہیں دیئے تھے تو اب وہ مروان نے اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے بیت المال سے دے دیئے، تو یہ ایک آدمی کی شہادت کی بناء پر فیصلہ نہیں ہے، بلکہ مستقلاً کسی کو عطیہ دینے کا معاملہ ہے۔

دوسرا احتمال یہ بھی ہے کہ مروان نے شاہد ویمین کی بنیاد پر فیصلہ کیا ہو اور وہ اس کے جواز کے قائل ہوں۔ [۴۲]

(۳۶) باب ما قيل في العمرى والرقبى

"أعمرته الدار، فهي عمرى، جعلتها له. ﴿ اسْتَعْمَرَكُمْ فِيهَا ﴾ [هود: ۶۱]، جعلكم عمارا".

۲۶۲۵ ـ حدثنا أبو نعيم: حدثنا شيبان، عن يحيى، عن أبي سلمة، عن جابر ﷺ قال: قضى النبي ﷺ بالعمرى: أنها لمن وهبت له. [۴۳]

۲۶۲۶ ـ حدثنا حفص بن عمر حدثنا همام: حدثنا قتادة قال: حدثني النضر بن أنس عن بشير بن نهيك، عن أبي هريرة ﷺ عن النبي ﷺ قال: ((العمرى جائزة)). وقال عطاء: حدثني جابر عن النبي ﷺ مثله.

---

[۴۲] عمدة القاري، ج: ۹، ص: ۴۵۰.

[۴۳] وفي صحيح مسلم، كتاب الهبات، باب العمرى، رقم: ۳۰۷۲، وسنن الترمذي كتاب الأحكام عن رسول الله، باب ماجاء في العمرى، رقم: ۱۲۷۰، وسنن النسائي، كتاب العمرىٰ، باب ذكر اختلاف الفاظ الناقلين لخبر جابر في العمرى، رقم: ۳۶۶۷، ۳۶۷۶، وسنن أبي داؤد، كتاب البيوع، باب في العمرى، رقم: ۳۰۸۲، وسنن ابن ماجة، كتاب الأحكام، باب مايذهن به المحرم، رقم: ۲۳۷۴، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند جابر بن عبدالله، رقم: ۱۳۶۱۲، ۱۳۶۵۶، ۱۳۸۲۱، ۱۴۴۸۶، ۱۴۶۹۵، وموطأ مالك، كتاب الأقضية، باب القضاء في العمرى، رقم: ۱۲۴۵.

عمریٰ کہتے ہیں کوئی شخص کسی سے کہے: **"اعمرتک ھذہ الدار"**.
اس کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں کہ یہ گھر میں تمہیں عمر بھر کے لئے دیدیا۔

عمریٰ کے بارے میں اختلاف ائمہ

جب کوئی شخص کسی کو یہ کہے تو جمہور کا مسلک یہ ہے کہ اس سے ہبہ ہو جاتا ہے۔

امام مالکؒ اس کو عاریۃ قرار دیتے ہیں وہ کہتے ہیں جب کہا **" اعمرتک ھذہ الدار"** تو یہ عاریت ہوگی اور جب تک موہوب لہ یا معمر لہ زندہ ہیں اس وقت تک اس سے فائدہ اٹھا سکے گا اس کے انتقال کے بعد وہ پھر معمر کی طرف واپس لوٹ جائیگا۔ یہاں تک کہ اگر یہ بھی کہہ دیا کہ **" اعمر تک ھذہ الدار الخ ھی لک و لعقبک "** یہ تمہارا ہے اور تمہارے ورثاء کا ہے، امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تب بھی عاریت ہے۔ جب تک اس کے ورثاء زندہ رہیں گے اس وقت تک فائدہ اٹھائیں گے، جب ورثاء بالکل ختم ہو جائیں گے پھر اگر معمر زندہ ہے تو اس کی طرف، ورنہ اس کے ورثاء کی طرف لوٹ جائیگا، وہ ہر حالت میں اس کو عاریۃ مانتے ہیں۔[۴۴]

اور جمہور جن میں حنفیہ بھی داخل ہیں وہ کہتے ہیں یہ ہبہ ہو جاتا ہے یعنی اب دوبارہ معمر کی طرف نہیں لوٹے گا، یہاں تک کہ اگر معمر نے یہ کہہ دیا کہ **"اعمر تک ھذہ الدار فإذامت فھی لی، فإذامت فھی راجعة إلی"** تب بھی یہ ہبہ ہوگا اور اس کا یہ کہنا **"فإذامت فھی راجعة إلی"** یہ شرط فاسد سمجھی جائیگی، جو لغو ہوگی۔

لیکن اگر عمری کے ساتھ لفظ سکنی استعمال کیا جیسے کہہ دیا کہ **"داری لک عمریٰ سکنی یا عمری"** کا لفظ استعمال نہیں کیا بلکہ کہا **"اسکنتک ھذہ الدار لمدة عمرک"** اس صورت میں عاریۃ ہوگی، اور مرنے کے بعد پھر واپس معمر کی طرف چلا جائے گا۔ اور حدیث باب جو آ رہی ہے اس میں ہے **" العمریٰ جائزة"** اس کے یہی معنی ہیں کہ عمرہ نافذ ہو جاتا ہے یعنی ہبہ بن جاتا ہے۔[۴۵]

مسند احمد کی روایت میں صراحت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جب کوئی عمرہ دے گا تو وہ سب اس کے سب ورثاء کو ملے گا یعنی اس کے اندر معمر لہ کی ملکیت ثابت ہو جائے گی۔ یہ حدیث جمہور کی دلیل ہے۔[۴۶]

---

[۴۴] تکملة فتح الملھم، ج: ۲ ص: ۸۰، وموطا مالک، کتاب الإقضیة، باب القضاء فی العمریٰ، رقم ۱۲۴۵، ۱۲۴۶.

[۴۵] تکملة فتح الملھم، ج ۲، ص: ۸۱.

[۴۶] أمسکوا علیکم اموالکم ولا تقسموھا فإنه من اعمر عمریٰ فھی الذی اعمر ھا حیاً ومیتاً ولعقبه تقسموھا مسند أحمد، باقی مسند المکثرین، رقم: ۱۴۶۰۴.

"رقبیٰ" اور اس کا حکم

رقبی کے معنی ہیں کہ کوئی یوں کہے "ارقبتک هذه الدار" اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ میں نے تمہیں اس گھر کا رقبہ دے دیا۔ اگر یہی معنی لیا جائے تو رقبی سے ہبہ ہو جاتا ہے۔ دوسرے معنی جو زیادہ معروف ہیں، یہ ہیں کہ کوئی شخص اس شرط کے ساتھ ہبہ کرتا تھا کہ اگر موہوب لہٗ کا انتقال پہلے ہو گیا تو یہ ہبہ فسخ ہو جائے گا، یہ شرط فاسد تھی۔ مگر ہبہ شرطِ فاسد سے فاسد نہیں ہوتا۔ اس لئے ہبہ تام ہو جاتا تھا اور شرط باطل ہو جاتی تھی، اسی کو حدیث میں "الرقبى جائزة لأهلها" فرمایا گیا۔

لیکن امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے زمانہ میں "ارقبتک هـذه الـدار" کے یہ معنی ہوتے تھے کہ میں تم کو رقبی کے طور پر یہ گھر دیتا ہوں۔ اگر تم مجھ سے پہلے مر گئے تو یہ گھر میرے پاس واپس آ جائے گا اور اگر میں تم سے پہلے مر گیا تو یہ گھر تمہارا ہو جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں ہبہ کو اس شرط سے معلّق کیا جاتا تھا کہ میں پہلے مر جاؤں اور ہبہ تعلیق کو قبول نہیں کرتا، اس لئے امام ابوحنیفہؒ نے اس کو ناجائز قرار دیا۔ اس کو رقبیٰ اس لئے کہتے تھے کہ ہر آدمی دوسرے کی موت کا انتظار کرتا رہتا تھا کہ یہ مرے تو یہ گھر میرا بنے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اس کو باطل قرار دیا اور فرمایا کہ یہ عقد صحیح نہیں ہے، لیکن "ارقبتک هـذه الـدار" اگر رقبہ کے طور پر کہے "داری لک رقبة" اور معنی یہ ہوں کہ میں نے اس کا گھر کا رقبہ تم کو دے دیا۔ تو امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک بھی ہبہ اور ہدیہ ہو جاتا ہے۔[۴۷]

(۳۳) باب من استعار من الناس الفرس

۲۶۲۷ ـ حدثنا آدم : حدثنا شعبة ، عن قتادة قال : سمعت أنسا يقول : كان فزع بالمدينة فاستعار النبي ﷺ فرسا من أبي طلحة يقال له: المندوب ، فركبه. فلما رجع قال: ((مارأينا من شيء وإن وجدناه لبحرا)). [أنظر : ۲۸۲۰، ۲۸۵۷، ۲۸۶۲، ۲۸۶۶، ۲۸۶۷، ۲۹۰۸، ۲۹۶۸، ۲۹۶۹، ۳۰۴۰، ۶۰۳۳، ۶۲۱۲][۴۸]

---

[۴۷] فيض الباري ، ج:۳ص: ۳۷۹.

[۴۸] وفي صحيح مسلم، كتاب الفضائل ، باب في شجاعة النبي عليه والسلام وتقدمه للحرب،رقم: ۴۲۶۶،۴۲۶۷، وسنن الترمذي ، كتاب الجهاد عن رسول الله ، باب ماجاء في الخروج عند الفزع ، رقم :۱۶۰۸ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الأدب ،باب ماروى في الرخصة في ذلك ، رقم :۴۳۳۶، وسنن ابن ماجة ،كتاب الجهاد ، باب الخروج في النفير ، رقم :۲۷۶۲، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالك ، رقم: ۱۲۰۳۷، ۱۲۲۰۲ ، ۱۲۲۸۳ ، ۱۲۳۸۶ ، ۱۲۴۵۵، ۱۳۳۶۲، ۱۳۳۹۷، ۱۳۵۸۶ .

مدینہ منورہ میں کچھ گھبراہٹ پیدا ہوئی یعنی کچھ شور سا ہوا، جس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید دشمن نے حملہ کردیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ایک گھوڑا عاریۃ لیا جس کا نام ''مندوب'' تھا۔ آپ ﷺ اس پر سوار ہوئے، دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ بغیر زین کے سوار ہوئے۔

''فلما رجع'' جب آپ ﷺ واپس تشریف لائے تو فرمایا **''مارأينا من شيء''** کہ کچھ بھی نہیں تھا **''وإن وجدناه لبحرا''** اور ہم نے اس گھوڑے کو سمندر پایا، مطلب یہ ہے کہ بہت تیز رفتار گھوڑا ہے۔

(۳۴) باب الإستعارة للعروس عند البناء

۲۶۲۸ ـ حدثنا أبو نعيم: حدثنا عبدالواحد بن أيمن: حدثني أبي قال: دخلت على عائشة رضي الله عنها وعليها درع قطر ثمن خمسة دراهم، فقالت: ارفع بصرك إلى جاريتي، أنظر إليها فانها تزهي أن تلبسه في البيت. وقد كان لي منهن درع على عهد رسول الله ﷺ فما كانت امرأة تقين بالمدينة إلا أرسلت إلى تستعيره. [۴۹]

عبدالواحد بن ایمن، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عائشہ کے پاس آیا **''وعليها درع قطر''** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے قطر کی ایک قمیص پہنی ہوئی تھی، یہ ایک خاص قسم کی قمیص ہوتی تھی۔ **''ثمن خمسة دراهم''** یعنی ثمن، پانچ درہم کی قیمت تھی۔

حضرت عائشہؓ نے فرمایا **''ارفع بصرك إلى جاريتي انظر إليها''** ذرا میری جاریہ کی طرف منہ اٹھا کر دیکھو۔ **''فإنها تزهي أن تلبسه في البيت''** یہ جاریہ اس بات سے بڑا تکبر کرتی ہے کہ جو قمیص پہنے ہوئے ہوں یہ اس کو گھر میں بھی پہنے۔

''تزهي'' یہ ہمیشہ مجہول استعمال ہوتا ہے، اس کے معنی ہیں تکبر کرنا۔ تو یہ قمیص کو گھر میں پہننے سے بھی تکبر کرتی ہے یعنی اپنی شان سے اس قمیص کو گرا ہوا سمجھتی ہے۔

''وقد كان لي منهن درع'' جب کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں میری قمیص اسی کپڑے کی بنی ہوئی تھی، **''فما كانت امرأة تقين بالمدينة''** مدینہ منورہ میں جب کسی عورت کو تیار کیا جاتا تھا۔ اس کی زینت کی جاتی تھی **''تقين''** بمعنی **''تنزين''** اس کو دلہن بنایا جاتا تھا۔ **''الا أرسلت الى تستعيره''** تو وہ مجھ سے عاریۃ لی جاتی تھی کہ ہم اپنی عورت کو دلہن بنا رہے ہیں اس لئے وہ قمیص بھیج دیجئے، ہم اس کو پہنائیں گے۔

تو ہمارے زمانہ میں تو دلہن اس کو عاریۃ لے کر پہنتی تھی اور اب یہ ہماری جاریہ اس کو گھر میں بھی پہننے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ میرے لائق نہیں ہے، ایسا زمانہ آگیا ہے، یہ جملہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اس وقت کہہ رہی ہیں کہ دیکھیں کیسا زمانہ آگیا ہے۔

---

[۴۹] انفرد به البخاری.

(۳۵) باب فضل المنيحة

۲۶۲۹ ـ حدثنا يحيى بن بكير: حدثنا مالك، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة ﷺ أن رسول الله ﷺ قال: ((نعم المَنِيحةُ اللِّقحة الصفي منحة، والشاة الصفي تغدو باناء وتروح باناء)).

حدثنا عبدالله بن يوسف وإسماعيل عن مالك قال: ((نعم الصدقة)). [أنظر: ۵۶۰۸]

یعنی اچھا ہدیہ یہ ہے کہ کسی کو کوئی دودھ دیتی اونٹنی دی جائے۔ **"منيحة"** عاریت کے طور پر کہ تم اس سے دودھ پی لو **"والشاة الصفي"** یا ایک اچھی بکری دی جائے، **"تغدو باناء وتروح باناء"** جو صبح کو ایک برتن دودھ دے اور شام کو ایک برتن دودھ دے۔

۲۶۳۰ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف: أخبرنا ابن وهب: حدثنا يونس، عن ابن شهاب، عن أنس بن مالك ﷺ قال: لما قدم المهاجرون المدينة من مكة وليس بأيديهم وكانت الأنصار أهل الأرض والعقار فقاسمهم الأنصار على أن يعطوهم ثمار أموالهم كل عام ويكفوهم العمل والمؤنة. وكانت أمه أم أنس أم سليم كانت أم عبدالله بن أبي طلحة. فكانت أعطت أم أنس رسول الله ﷺ عذاقا فأعطاهن النبي ﷺ أم أيمن مولاته أم أسامة بن زيد. قال ابن شهاب فأخبرني أنس ابن مالك أن النبي ﷺ لما فرغ من قتل أهل خيبر فانصرف إلى المدينة رد المهاجرون إلى الأنصار منائحهم التي كانوا منحوهم من ثمارهم، فرد النبي ﷺ إلى أمه عذاقها فأعطى رسول الله ﷺ أم أيمن مكانهن من حائطه. وقال احمد بن شبيب أخبرنا أبي، عن يونس بهذا، وقال: مكانهن من خالصه. [أنظر: ۳۱۲۸، ۴۰۳۰، ۴۱۲۰] [۵۰]

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ جب مہاجرین مکہ سے مدینہ آئے تو ان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور انصار زمین و جائیداد کے مالک تھے، **"فقاسمهم الأنصار"** تو انصار نے ان سے اس بات پر مقاسمت کی کہ وہ ان کو ہر سال اپنے اموال کے ثمرہ یعنی پھل دیا کریں گے۔ **"ويكفوهم العمل والمؤنة"** اور مہاجرین عمل کرنے اور مشقت اٹھانے میں ان کیلئے کافی ہو جائیں گے۔ یعنی زمین ان کی ہوگی، عمل مہاجرین کریں گے اور پھل دونوں کے درمیان مشترک ہوگا۔

"وكانت أم أنس أم سليم كانت أم عبدالله بن أبي طلحة" حضرت انس ﷺ کی والدہ ام

---

[۵۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب رد المهاجرون الى الانصار منائحهم من الشجر، رقم: ۳۳۱۸، ۳۳۱۹.

انس ﷺ جن کو ام سلیم بھی کہتے ہیں، وہ عبداللہ بن ابی طلحہ کی والدہ بھی تھیں، **"فكانت أعطت أم أنس رسول ﷺ عذاقا"** حضرت انس ﷺ کی والدہ نے رسول اللہ ﷺ کو کھجور کا ایک درخت دیا تھا۔ عذاق کے معنی کھجور کا ایک درخت کے ہیں۔ یعنی تمام انصار نے مہاجرین کو اپنے پھل میں کچھ نہ کچھ حصہ دار بنایا تھا حضرت انس ﷺ کی والدہ نے حضور ﷺ کو ایک عذاق دے دیا تھا۔

"فأعطاهن النبی ﷺ أم أيمن مولاته أم أسامة بن زيد" آپ ﷺ نے وہ درخت ام ایمن کو دے دیا جو آپ کی مولات اور اسامۃ بن زید کی والدہ تھیں کہ تم اس سے فائدہ اٹھاؤ۔

"قال ابن شهاب: فأخبرني أنس بن مالک أن النبی ﷺ لما فرغ من قتل أهل خيبر فانصرف إلى المدينة" جب خیبر کے غزوہ کے بعد آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو مہاجرین نے انصار کو ان کے منائح واپس کر دیئے تھے یعنی جس نے کسی کے جو درخت لئے ہوئے تھے وہ واپس کر دئے، کیونکہ خیبر کے غزوہ کے بعد مہاجرین کے پاس مال غنیمت کے طور پر کافی زمینیں آ گئی تھیں اس لئے اب انہیں ضرورت نہیں رہی تھیں۔

"فرد النبی ﷺ إلى أمه عذاقها" آنحضرت ﷺ نے حضرت انس ﷺ کی والدہ کو وہ درخت واپس کر دیئے جو انہوں نے دئے تھے۔ **"فأعطى رسول الله ﷺ أم أيمن مكانهن من حائطه"** چونکہ آپ ﷺ وہ درخت ام ایمن کو دے چکے تھے اور اب وہ واپس کرنے پڑے تو آپ ﷺ نے ان کے بدلے ام ایمن کو اپنے باغ میں سے کچھ حصہ دے دیا تھا تا کہ ان کی تلافی ہو جائے۔

۲۶۳۱ ۔ حدثنا مسدد: حدثنا عيسى بن يونس: حدثنا الأوزاعي، عن حسان بن عطية، عن أبي كبشة السلولي سمعت عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما يقول: قال رسول الله ﷺ: ((أربعون خصلة أعلاهن منيحة العنز. ما من عامل يعمل بخصلة منها رجاء ثوابها و تصديق موعدها إلا أدخله الله بها الجنة)). قال حسان: فعددنا ما دون منيحة العنز من رد السلام، وتشميت العاطس، وإماطة الأذى عن الطريق و نحوه، فما استطعنا أن نبلغ خمس عشرته خصلة. [۵۱]

عاریت کی فضیلت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ چالیس خصلتیں ہیں، ان

---

۵۱ وفي سنن أبي داؤد، كتاب الزكاة، باب في المنيحة، رقم: ۱۴۳۳، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبدالله بن عمرو بن العاص، رقم: ۶۲۰۰، ۶۵۳۷، ۶۵۵۷.

میں سے سب سے اعلیٰ درجہ کی خصلت کسی کو بکری منیحہ کے طور پر دے دینا ہے۔ یعنی کسی کو عاریت کے طور پر دینا کہ تم اس سے دودھ استعمال کرو۔

ایسی چالیس خصلتیں ہیں کہ اگر ان پر عمل کرنے والا کسی ایک خصلت پر بھی ثواب کی امید اور اس پر جو وعدہ کیا گیا ہے اس کی تصدیق کرتے ہوئے عمل کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل فرمائیں گے۔

حضرت حسان ﷺ فرماتے ہیں **"فعددنا مادون منيحة العنز"** ہم نے منیحہ العنز یعنی بکری عاریۃً دینے کے علاوہ جو خصلتیں ہیں وہ ہم نے گننا شروع کیں، تو معلوم ہوا کہ رد السلام، **"تشميت العاطس، إماطة الأذى عن الطريق"** وغیرہ ہے۔ **"فما استطعنا أن نبلغ خمس عشرة خصلة"** تو ہم کل پندرہ سے زیادہ شمار نہ کر سکے۔ یعنی حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ چالیس ہیں لیکن جب ہم نے خود شمار کرنا شروع کیں تو پندرہ سے زیادہ شمار نہ کر سکے۔

مطلب یہ ہے کہ اس وقت نبی کریم ﷺ نے چالیس متعین کر کے نہیں بتائی تھیں ہم نے اپنے حساب سے سوچنا شروع کیا کہ کیا خصلتیں ہونگی جن کی فضیلت حضور اقدس ﷺ پہلے بیان فرما چکے ہیں تو ہمیں ایسی پندرہ خصلتیں یاد آئیں اس سے زیادہ یاد نہ آئیں۔

لیکن شراح نے دوسری حدیثوں سے استنباط کرتے ہوئے چالیس کا عدد پورا کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ یہ خصلتیں ہیں جن پر ثواب کا وعدہ ہوا ہے۔[۵۲]

(۳۶) باب إذا قال : أخدمتك هذه الجارية ، على ما يتعارف الناس، فهو جائز.

وقال بعض الناس : هذه عارية. وإن قال : كسوتك هذا الثوب ، فهذه هبة.

۲۶۳۵ ۔ حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب : حدثنا أبو الزناد ، عن الأعرج ، عن أبي هريرة ﷺ : أن رسول الله ﷺ قال: ((هاجر إبراهيم بسارة فأعطوها آجر فرجعت فقالت: أشعرت أن الله كبت الكفر وأخدم وليدة؟)).

وقال ابن سيرين، عن أبي هريرة عن النبي ﷺ: ((فأخدمها هاجر)). [راجع : ۲۲۱۷].

فرمایا جب کوئی شخص یہ کہے کہ **"اخدمتك هذه الجارية"** میں نے یہ جاریہ تم کو خدمت کرنے کے لئے دے دی تو لوگوں کے عرف کے مطابق اس کا مطلب سمجھا جائے گا اور وہ ہبہ جائز ہوگا۔

---

۵۲ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۶۴، ۴۶۵

امام بخاری رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عرف یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ **"اخدمتک هذه الجارية"** اگر چہ بظاہر اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے تمہیں اس کی خدمت دے دی اور جاریہ خدمت کرنے کے لئے دی تو گویا یہ عاریت ہوئی لیکن عرفاً یہ لفظ ہبہ کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص کہے **"اخدمتک هذه الجارية"** اس سے ہبہ متحقق ہو جائے گا۔

"قال بعض الناس"

بعض لوگوں نے کہا کہ **"هذه عارية"** کہ **"اخدمتک هذه الجارية"** کہا تو اس سے عاریۃ ہوگی۔

اس سے امام ابوحنیفہؒ کی طرف اشارہ ہے کہ وہ فرماتے ہیں **"اخدمتک هذه الجارية"** سے ہبہ نہیں بلکہ عاریت ہوگی حالانکہ آگے روایت میں **"اخدم"** آرہا ہے معلوم ہوا کہ اس سے ہبہ ہو جاتا ہے۔

دلیل یہ پیش کی کہ حضرت ہاجرہ جو دی گئی تھیں اس میں **"اخدم وليدة"** کا لفظ ہے کہ بادشاہ نے ایک ولیدہ یعنی ایک جاریہ خدمت کے لئے دے دی اور ظاہر ہے کہ حضرت ہاجرہ علیہا السلام عاریۃً کے طور پر نہیں بلکہ ہبہ کے طور پر دی گئیں تھیں، معلوم ہوا کہ **"اخدم"** کے لفظ سے ہبہ متحقق ہو جاتا ہے۔

"قال بعض الناس" کا جواب

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پر جو اعتراض کیا ہے وہ اس لئے عائد نہیں ہوتا کہ امام بخاریؒ خود کہہ رہے ہیں **"على ما يتعارف الناس"** کہ اس کا فیصلہ عرف سے ہوگا۔ اگر عرف **"اخدم"** کہہ کر ہبہ کرنے کا ہے تو ہبہ حنفیہ کے نزدیک بھی متحقق ہو جائے گا، لیکن اگر عرف ہبہ کا نہیں بلکہ عاریۃً کا ہے تو پھر عاریت ہی ہوگی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے جو عاریت کا حکم لگایا ہے وہ عرف کی بنیاد پر لگایا ہے، جہاں عرف نہ ہو وہاں عاریۃ کا نہیں، ہبہ کا حکم ہوگا۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ سے استدلال اس لئے درست نہیں کہ اس میں صرف **"اخدم"** کا لفظ نہیں ہے بلکہ ساتھ **"اعطاها"** کا لفظ آیا ہے۔[۵۳]

---

۵۳ عمدة القاري، ج: ۹، ص: ۲۶۷.

(۳۷) باب إذا حمل رجل على فرس فهو كالعمرى و الصدقة

"وقال بعض الناس: له أن يرجع فيها".

۲۶۳۶ ـ حدثنا الحميدى: أخبرنا سفيان قال: سمعت مالكا يسأل زيد بن أسلم فقال: سمعت أبي يقول: قال عمر ﷺ: حملت على فرس في سبيل الله فرأيته يباع، فسألت رسول الله ﷺ فقال: ((لا تشتره ولا تعدفى صدقتك)). [راجع: ۱۴۹۰]

یہاں پر بھی وہی بات ہے کہ کوئی کہے "**حملتک علی فرس**" تو امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ عمریٰ اور صدقہ کی طرح ہو گیا، ہبہ متحقق ہو گیا۔

"**وقال بعض الناس**" اور بعض لوگ یعنی حنفیہ کہتے ہیں کہ اس کو رجوع کرنے کا حق حاصل ہے۔

"قال بعض الناس" کا جواب

یہاں بھی امام بخاری رحمہ اللہ کا اعتراض بالکل بے محل ہے، اس وجہ سے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس کا دارومدار عرف پر ہے "**حملتک علی فرس**" میں اگر ہبہ کا عرف ہے تو ہبہ ہوگا اور اگر عاریۃ کا عرف ہے تو عاریۃ ہوگی۔

اور اگر بالفرض ہبہ بھی ہو تو امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ پہلے ہی اس بات کے قائل ہیں کہ اس میں رجوع ہوسکتا ہے وہ ہبہ میں رجوع کے قائل ہیں، (پہلے بھی اس پر بحث گزر چکی ہے) اس لئے اس پر اعتراض کرنے کا کوئی محل نہیں۔

كتاب الشهادات

٢٦٣٧ - ٢٦٨٩

۵۲ ۔ كتاب الشهادات

(۱) باب ما جاء في البينة على المدعى،

لقولہ تعالیٰ : ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ إِلَى أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ﴾ [البقرة : ۲۸۲]. وقول الله عزوجل: ﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ الى قوله ﴿ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْراً﴾[1]

(۲) باب إذا عدل رجل رجلا

"فقال : لا نعلم إلا خيرا ، أو : ماعملت إلا خيرا".

"وساق حديث الإفك فقال النبیﷺ لأسامة حين إستشاره فقال : أهلک ولا نعلم إلا خيرا".

۲۶۳۷ ۔ حدثنا حجاج : حدثنا عبدالله بن عمر النميری: حدثناثوبان . وقال الليث: حدثنی يونس ، عن ابن شهاب قال: أخبرنی عروة بن الزبير وابن المسيب وعلقمة بن وقاص وعبيدالله بن عبدالله عن حديث عائشه رضی الله عنها ، و بعض حديثهم يصدق بعضا حين قال لها أهل الإفک ما قالوا ، فدعا رسول الله ﷺ علياً و أسامة حين استلبث الوحی يستأمر هما فی فراق أهله، فاما أسامة فقال : أهلک ولا نعلم إلا خيرا، وقالت بريرة: إن رأيت عليها أمرا أغمصه أكثر من أنها جارية حديثة السن تنام عن عجين أهلها ، فتأتی الدا جن فتأكله . قال رسول الله ﷺ : ((من يعذرنا فی رجل بلغنی أذاه فی أهل بيتی؟ فوا لله ما علمت من أهلی إلا خيرا، ولقد ذكروا رجلا ما علمت عنيه إلاخيرا)). [راجع: ۲۵۹۳].

شہادت کے باب میں تزکیۃ الشہود کی ضرورت پیش آتی ہے یعنی گواہوں کے بارے میں معلوم کرنا کہ یہ کیسے ہیں؟ جس کے لئے شرعاً مزکی مقرر ہوتے ہیں۔

اس باب میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ جب ان سے کسی گواہ کے بارے میں پوچھا جائے تو وہ کیا کہیں؟

---

[1] [النساء : ۱۳۵]

چنانچہ فرماتے ہیں کہ جب کوئی شخص کسی دوسرے کی تعدیل کرے یعنی اس کو عادل قرار دے تو یہ کہے **"لانعلم إلا خیرا"** ہمیں اس کے بارے میں سوائے خیر کے اور کوئی بات معلوم نہیں یا کہے **"ما علمت إلا خیرا"** کیونکہ ہر انسان اپنے علم کے مطابق ہی گواہی دے سکتا ہے، آگے اس کے باطن کی کیا حقیقت ہے یہ کسی کو نہیں پتہ چل سکتا۔

اس پر حدیث **"افک"** سے استدلال کیا کہ اس میں خود حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے بارے میں یہ فرمایا کہ **"ما علمت من أهلي إلا خیرا"** اور صفوان بن معطل کے بارے میں بھی یہ فرمایا کہ **"ما علمت علیه إلا خیرا"**.

(۳) باب شهادة المختبیء

"وأجاز عمرو بن حريث قال : وكذلک يفعل بالكاذب الفاجر ، وقال الشعبي وابن سيرين و عطاء و قتادة : السمع شهادة . و كان الحسن يقول : لم يشهدوني على شيئ ولكن سمعت كذا و كذا".

کہتے ہیں کہ ایسا شخص جو چھپا ہوا ہے، مختبی کے معنی ہیں چھپا ہوا، یعنی مشہود علیہ جس کے اوپر گواہی دی جارہی ہے اس سے پوشیدہ ہے تو آیا اس کی گواہی جائز ہے یا نہیں۔ اس پر یہ باب قائم کیا ہے، یعنی جس شخص کے خلاف گواہی دینی ہے۔ اس سے آدمی چھپ گیا تو آیا اس کی گواہی معتبر ہوگی یا نہیں؟

چھپے ہوئے شخص کی گواہی اور اختلاف فقہاء

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں اس مذہب کی طرف گئے ہیں کہ چھپے ہوئے شخص کی گواہی معتبر ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کی طرف بھی یہی قول منسوب ہے، ان کا قول قدیم یہ نہیں تھا لیکن مصر جانے کے بعد جدید قول یہی ہوا۔[۲]

امام مالک اور امام احمد رحمہما اللہ بھی اسی کے قائل ہیں کہ علی الاطلاق چھپے ہوئے آدمی کی شہادت معتبر ہے۔[۳]

حنفیہ کا جو مذہب بیان کیا جاتا ہے اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر آدمی اس طرح چھپا ہوا ہے کہ مشہود علیہ کو دیکھ رہا ہے اگرچہ مشہود علیہ اس کو نہیں دیکھ رہا ہے اور اس کی بات بھی سن رہا ہے، تب تو یہ شہادت جائز ہے۔

لیکن اگر صرف دیوار یا پردے کے پیچھے سے اس کی آواز سن رہا ہے، اس کو دیکھ نہیں رہا تو مشہور یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک ایسی شہادت معتبر نہیں۔ اس لئے کہ اگر اس وقت گواہی دے گا تو وہ صرف آواز کی گواہی ہوگی کہ اس نے فلاں بات کی ہے اور **"الصوت يشبه الصوت"** ایک آدمی کی آواز دوسرے آدمی کی آواز کے مشابہ ہوتی ہے، تو جب تک دیکھ نہ لے اس وقت تک اس کے لئے شہادت دینا جائز نہیں، یہ حنفیہ کا مشہور قول ہے۔[۴]

۲، ۳، ۴ عمدة القاری ج:۹ ، ص:۴۷۴، وفتح الباری ، ج:۵ ، ص:۲۵۰.

حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کا قول

حضرت علامہ انور شاہ کشمیری صاحبؒ نے ''فیض الباری'' میں فرمایا کہ اگر اس بات کا پورا اطمینان اور اس پر یقین ہو جائے کہ آواز کے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے تو ایسی صورت میں اس شہادت کو قبول کر سکتے ہیں۔[۵]

لیکن میرے خیال میں حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیریؒ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس کو باقاعدہ شہادت تو نہیں کہا جائے گا البتہ اس کو ایک قرینہ مویدۃ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے، ورنہ صرف آواز کی شہادت معتبر نہیں۔ مثلاً ٹیلیفون کی گفتگو ٹیپ کر لی، آج کل یہ کثرت سے ہو رہا ہے اور پھر بعض اوقات وہ عدالت میں سنائی جاتی ہے کہ ٹیلیفون پر فلاں نے یہ بات کی ہے تو یہ محض شہادت بالسمع ہوگی اور خاص طور سے ٹیلیفون کے اندر آوازیں ایک دوسرے کے ساتھ مشابہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا یہ مکمل ثبوت نہیں، اس کو مکمل شہادت نہیں کہیں گے، البتہ اس کو ایک قرینہ کے طور پر پیش کر سکتے ہیں، اگر دوسری شہادتیں موجود ہیں تو اس کو ان کی تائید میں پیش کرنے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے **''شهادة المختبئ''** کے جواز پر کچھ آثار نقل کئے ہیں:

''واجاز عمرو بن حريث'' عمرو بن حریثؓ صحابی ہیں، انہوں نے اس کو جائز قرار دیا (یعنی **''شهادة المختبئ''**) کو **''قال : فذلک يفعل بالكاذب الفاجر''** اور فرمایا کہ جو جھوٹا اور فاجر آدمی ہے اس کے ساتھ ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو آدمی کاذب اور فاجر ہے وہ کھلم کھلا تو اپنے خلاف کسی بات کا، اپنے جرم کا اقرار نہیں کرتا، اس کے ساتھ یہی حیلہ کیا جاتا ہے کہ مثلاً دو گواہوں کو لے گئے اور کہا کہ تم ذرا باہر بیٹھنا میں تنہائی میں جاکر اس سے بات کروں گا، وہ سمجھے گا کہ میں تنہا ہوں۔ میری بات کوئی نہیں سن رہا ہے، اس وقت وہ کوئی بات کہدے گا جو اقرار کی حد تک پہنچے گی تو تم اس کو باہر سے سن لینا اور پھر اس کی گواہی دے دینا تو کاذب اور فاجر سے اقرار حاصل کرنے کا سوائے **''شهادة المختبئ''** کے اور کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

''كان الحسن يقول : لم يشهد وني على شيء ولكن سمعت كذا وكذا'' حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے ان لوگوں نے باقاعدہ گواہ نہیں بنایا تھا۔ لیکن میں نے فلاں فلاں بات سنی۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ حسن بصریؒ نے فرمایا ہے **''لم يشهد وني''** ہوسکتا ہے حسن بصریؒ ساتھ ساتھ دیکھ بھی رہے ہوں، اور اگر ساتھ ساتھ دیکھ بھی رہے ہوں تو پھر ان کا یہ قول حنفیہ کے خلاف نہیں ہوگا۔

۲۶۳۸ ۔ حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب ، عن الزهري : قال سالم : سمعت

---

۵ فیض الباری، ج:۳، ص:۳۸۳.

عبدالله بن عمر رضی الله عنهما يقول : إنطلق رسول الله ﷺ و أبی كعب الأنصاری ويؤمان النخل التی فيها ابن صياد حتی إذا دخل رسول الله ﷺ طفق رسول الله ﷺ يتقی بجذوع النخل وهو يختل أن يسمع من ابن صياد شيئا قبل أن يراه ، وابن صياد مضطجع علی فراشه فی قطيفة له فيها رمرمة، أو زمزمة. فرأت أم ابن صياد النبی ﷺ وهو يتقی بجذوع النخل ، فقالت لابن صياد : أی صَافِ ، هذا محمد ، فتناهی ابن صياد . قال النبی ﷺ : ((لو تركته بين)). [راجع : ۱۳۵۵].

یہ ابن صیاد کا واقعہ کا ذکر کیا ہے، جس میں حضور اقدس ﷺ چھپ کر ابن صیاد کی بات سننے کے لئے تشریف لے گئے اس سے استدلال کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ مختبی تھے اور اس کی بات سن رہے تھے۔

لیکن یہ استدلال اس لئے درست نہیں کہ یہاں پر شہادت دینا منظور نہیں تھا بلکہ اپنے طور پر معلومات حاصل کرنا مقصود تھا۔

۲۶۳۹ ـ حدثنی عبد الله بن محمد : حدثنا سفيان ، عن الزهری ، عن عروة، عن عائشة رضي الله عنها قالت :جاءت امرأة رفاعة القرظی إلی النبی ﷺ فقالت :كنت عند رفاعة فطلقنی فأبت طلاقی ، فتزوجت عبدالرحمٰن بن الزبير ، إنما معه مثل هدبة الثوب. فقال : ((أتريدين أن ترجعی إلی رفاعة ؟لا، حتی تذوقی عسيلته ويذوق علسيلتک)) ، وأبو بكر جالس عنده وخالد بن سعيد بن العاص بالباب ينتظر أن يؤذن له. فقال : يا أبابكر، ألا تسمع إلی هذه ماتجهر به عند النبی ﷺ . [أنظر: ۵۲۶۰ ، ۵۲۶۱، ۵۲۶۵، ۵۳۱۷، ۵۷۹۲ ، ۵۸۲۵ ، ۶۰۸۴] [۶]

جس وقت امراۃ رفاعہ یہ بات کہہ رہی تھی کہ مجھے میرے شوہر نے طلاق دے دی ہے اور میں عبدالرحمٰن بن زبیر ؓ کے پاس چلی گی۔ "**إنما معه مثل هدبة الثوب**" حضرت ابوبکر صدیق ؓ اس وقت وہاں بیٹھے

[۶] وفی صحيح مسلم ، كتاب النكاح ، باب لا تحل المطلقة ثلاثا الخ ، باب لاتحل المطلقة ثلاثاً لمطلقها حتی تنكح زوجاً غيره يطأها ثم يفارقها وتنقضی عدتها ، رقم : ۲۵۸۶، وسنن الترمذی ، كتاب النكاح عن رسول الله ، باب ماجاء فيمن يطلق امرأته ثلاثاً فيتزوجها آخر ، رقم :۱۰۳۷ ، وسنن النسائی ، كتاب النكاح ، باب النكاح الذی تحل به المطلقة ثلاثاً لمطلقها ، رقم : ۳۲۳۱، وكتاب الطلاق، باب الطلاق البتة ، رقم :۳۳۵۶ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب النكاح ، باب الرجل يطلق امرأته ثلاثاً فتزوج فيطلقها قبل أن يدخل بها اترجع الی الاول ، رقم :۱۹۲۲ ، ومسند أحمد ، باقی مسند الأنصار ، باب حديث السيدة عائشة ، رقم :۲۲۹۲۹ ، ۲۲۹۶۹ ، ۲۳۰۲۰ ، ۲۳۵۱۰ ، ۲۴۴۲۷، ۲۴۷۰۵ ، ۲۴۷۳۱، وسنن الدارمی ، كتاب الطلاق ، باب مايحل المرأة لزوجها الذی طلقها فبت طلاقها ، رقم : ۲۱۶۷ ، ۲۱۶۸.

ہوئے تھے اور خالد بن سعید بن العاص ﷺ دروازہ پر اس انتظار میں تھے کہ ان کو حضور اقدس ﷺ کے پاس آنے کی اجازت دی جائے۔

حضرت خالد ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق ﷺ سے کہا **"الا تسمع إلى هذه ما تجهر به عند النبي ﷺ؟"** کہ حضور اکرم ﷺ کے سامنے کھلم کھلا کہہ رہی ہے کہ **"معه مثل هدبة الثوب"** یعنی یہ شرم کی بات ہے لیکن یہ عورت اس طرح کھل کر کہہ رہی ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہاں اس حدیث کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ خالد بن سعید بن عاص نے عورت کی بات پردے کے پیچھے سے سنی اور اس کی آواز پہچان کر اس پر حکم لگا دیا کہ دیکھیں رفاعہ کی بیوی اس قسم کی بات کر رہی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ عام حالات کی بات ہے، یہاں شہادت کا کوئی تصور نہیں کہ اس پر شہادت دیں کہ اس نے یہ بات کہی ہے۔

(۴) باب إذا شهد شاهد، أو شهود بشيء

"وقال آخرون: ماعلمنا بذلک، یحکم بقول من شهد"

قال الحمیدی. هذا کما أخبر بلال أن النبی ﷺ صلی فی الکعبة. وقال الفضل: لم یصل، فأخذ الناس بشهادة بلال. کذلک إن شهد شاهدان أن لفلان علی فلان ألف درهم وشهد آخران بألف وخمسمائة یقضی بالزیادة.

کہتے ہیں کہ ایک گواہ یا کچھ گواہوں نے کسی بات کی گواہی دی دوسروں نے کہا کہ ہمیں اس بارے میں علم نہیں تو **"یحکم بقول من شهد"** جس نے گواہی دی ہے اس کے قول کے مطابق فیصلہ دیا جائے گا۔ ظاہر ہے جو شخص جانتا ہے اور جان کر گواہی دیتا ہے تو یہ مثبت ہے اور نافی پر مقدم ہے۔

مثلاً: حضرت بلال ﷺ نے خبر دی کہ نبی کریم ﷺ نے کعبہ میں نماز پڑھی اور فضل نے کہا کہ نہیں پڑھی، تو لوگوں نے حضرت بلال ﷺ کی شہادت پر عمل کیا۔

اسی طرح دو آدمی گواہی دیں کہ فلاں کے اوپر فلاں کے ایک ہزار درہم ہیں اور دوسرے دو گواہ گواہی دیں کہ ایک ہزار پانچ سو ہیں، تو زیادہ والے گواہوں کی گواہی کا اعتبار کیا جائے گا۔[۷]

۲۶۴۰ ـ حدثنا حبان: أخبرنا عبد الله: أخبرنا عمرو بن سعید بن أبی حسین قال: أخبرنی عبد الله بن أبی ملیکة، عن عقبة بن الحارث: أنه تزوج ابنة لأبی إهاب ابن عزیز فأتته امرأة فقالت: قد أرضعت عقبة والتی تزوج، فقال لها عقبة: ما أعلم أنک

---

۷ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۴۷۹.

أرضعتني ولا أخبرتني ، فأرسل إلى آل أبي إهاب يسألهم ، فقالوا: ما علمناه أرضعت صاحبتنا ، فركب إلى النبي ﷺ بالمدينة فسأله ، فقال رسول الله ﷺ : ((كيف وقد قيل؟)) ففارقها ونكحت زوجا غيره. [راجع :۸۸]

یہ عقبہ بن حارث کا مشہور واقعہ ہے (جو بار بار آیا ہے) کہ انہوں نے نکاح کیا تھا، عورت آئی اور اس نے آکر کہا کہ میں نے عقبہ کو بھی دودھ پلایا ہے اور اس کی بیوی کو بھی پلایا ہے۔

عقبہ نے کہا کہ مجھے تو پتہ نہیں کہ تم نے دودھ پلایا ہے اور نہ تم نے پہلے بتایا ہے، ابی اہاب کے گھر والوں کو پیغام بھیجا اور ان سے پوچھا، تو انہوں نے کہا **"ماعلمنا ہ ارضعت صاحبتنا"** ہمارے علم میں نہیں ہے کہ اس نے ہماری لڑکی کو دودھ پلایا تھا حضور اقدس ﷺ کے پاس گئے اور جا کر سوال کیا۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا **"کیف و قد قیل؟"** کہ اب اس عورت کو اپنے پاس کیسے رکھو گے جب ایک بات کہہ دی گئی۔ پھر عقبہ بن حارث نے ان سے مفارقت اختیار کر لی اور اس عورت نے کسی اور سے نکاح کر لیا۔

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کا اس حدیث کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ عقبہ بن حارث اور ان کی بیوی ارضاع کی نفی کر رہے تھے، لیکن جب عورت نے گواہی دے دی تو آپ ﷺ نے اس کی گواہی کو قبول کرتے ہوئے ان کو مفارقت کا حکم دے دیا۔

اگرچہ جمہور کے نزدیک مفارقت کا حکم بطور احتیاط دیا گیا تھا ورنہ تنہا ایک مرضعہ کی شہادت کافی نہیں ہوتی، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ کا منشاء یہ ہے کہ احتیاط کے نقطہ نظر سے بھی کم از کم مثبت کو نافی پر مقدم رکھا گیا، معلوم ہوا کہ مثبت نافی پر مقدم ہے۔[8]

(۵) باب الشهداء العدول

وقول الله تعالى: ﴿وَأَشْهِدُوا ذَوَىْ عَدْلٍ مِنْكُمْ﴾[9] و ﴿مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ﴾[10]

۲۶۴۱ ـ حدثنا الحكم بن نافع، أخبرنا شعيب، عن الزهرى قال: حدثنى حميد ابن عبدالرحمٰن بن عوف : أن عبدالله بن عتبة قال : سمعت عمر بن الخطاب ﷺ يقول :

---

۸ احتج بظاهره من اجاز شهادة المرضعة وحدها، و من منع حمله على الورع دون التحريم ،...... قال جمهور العلماء : إن النبى ﷺ افتاه بالتحرز عن الشبهة ، وأمره بمجانبة الريبة خوفا من الا قدام على فرج قام فيه دليل أن المرأة أرضعتهما ، لكنه لم يكن قاطعا ولا قويا، لا جماع العلماء على أن شهادة المرأة الواحدة لا تجوز فى مثل ذلک ، لكن أشار عليه النبى ﷺ بالاحوط الخ .عمدة القارى ، ج : ۲، ص : ۱۴۳ .

۹ [البقرة: ۲۸۲] ۱۰ [الطلاق: ۲]

إن أناسا كانوا يؤخذون بالوحي في عهد رسول الله ﷺ وإن الوحي قد انقطع، وإنما نأخذكم الآن بما ظهر لنا من أعمالكم، فمن اظهر لنا خيرا أمناه وقربناه، وليس إلينا من سريرته شيء، الله يحاسب في سريرته، ومن أظهر لنا سوء الم نأمنه ولم تصدقه وإن قال: إن سريرته حسنة.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں تو وحی نازل ہوتی تھی اس کی بنیاد پر فیصلہ ہوجاتا تھا کہ یہ آدمی ٹھیک ہے یا غلط ہے اور اب ہمارے پاس وحی نہیں ہے، البتہ ظاہری اعمال ہیں ہم اسی کے مطابق فیصلے کریں گے، اگر ظاہری اعمال ٹھیک ہیں تو اس کی شہادت قبول کریں گے اگر ظاہری اعمال غلط ہیں تو شہادت کو رد کردیں گے اور باطن کی بات کو اللہ تعالیٰ کے حوالے کریں گے۔

(٦) باب تعديل كم يجوز؟

۲۶۴۲ ـ حدثنا سليمان بن حرب: حدثنا حماد بن زيد، عن ثابت، عن أنس رضى الله عنه قال: مرّ على النبي ﷺ بجنازة فأثنوا عليها خيرا، فقال: ((وجبت)). ثم مر بأخرى فأثنوا عليها شرا، أو قال: غير ذلك فقال: ((وجبت)) فقيل: يارسول الله، قلت لهذا: ((وجبت)) و لهذا: ((وجبت)) ولهذا: ((وجبت)) قال: ((شهادة القوم، المؤمنون شهداء الله في الارض)). [راجع: ۱۳۶۷]

اب یہاں ترجمۃ الباب تو یہ ذکر کیا کہ کتنے آدمیوں کی طرف سے کسی کی تعدیل کی جائے تو وہ کافی ہے لیکن یہاں حدیث میں کوئی تعداد مذکور نہیں ہے۔

۲۶۴۳ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل: حدثنا داؤد بن أبي الفرات: حدثنا عبدالله بن بريدة عن أبي الأسود قال: أتيت المدينة وقد وقع بها مرض وهم يموتون موتا ذريعا فجلست إلى عمر ﷺ فمرت جنازة فأثنى خيرا، فقال عمر: وجبت. ثم مر بأخرى فأثنى خيرا فقال: وجبت. ثم مر بالثالث فأثنى شرا فقال: وجبت، فقلت: ما (وجبت) يا أمير المؤمنين؟ قال: قلت كما قال النبي ﷺ: ((أيما مسلم شهد له أربعة بخير أدخله الله الجنة)). قلنا: و ثلاثة؟ قال: ((و ثلاثه))، قلنا: واثنان؟ قال: ((واثنان))، ثم لم نسأله عن الواحد. [راجع: ۱۳۶۸].

البتہ اسی حدیث میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا "**أيما مسلم شهد له أربعة بخير أدخله الله الجنة قلنا: وثلثة؟ قال و ثلثة قلنا: وإثنان؟ قال وإثنان ثم لم نسأله عن الواحد**" دو آدمی بھی اگر گواہی دیں تو کافی ہے، پھر ایک کے بارے میں سوال نہیں کیا۔

حنفیہ کے ہاں تعدیل

حنفیہ کے یہاں تعدیل کے لئے دو باتوں میں سے ایک بات ضروری ہے، عدد یا عدالت ۔ عدد یعنی دو آدمی گواہی دیں اور اگر ایک ہو مگر اس کے ساتھ عدالت ہو مکمل عدل ہو تو اس کی تعدیل کر دینا بھی کافی ہے۔[۱۱]

(۷) باب الشهادة على الأنساب والرضاع المستفيض والموت القديم

"وقال النبی ﷺ: ((أرضعتنی و أبا سلمة ثويبة))، والتثبت فيه".

۲۶۴۴ ـ حدثنا آدم: حدثنا شعبة: أخبرنا الحكم، عن عراک بن مال، عن عروة ابن الزبير، عن عائشة رضی الله عنها قالت: استأذن علی أفلح فلم آذن له. فقال: أتحتجبين منی وأنا عمک؟ فقلت: و كيف ذلک؟ فقال: أرضعتک امرأة أخی بلبن أخی. فقالت: سألت عن ذلک رسول الله ﷺ فقال: ((صدق افلح' ائذنی له)).[أنظر ۴۷۹۶، ۵۱۰۳، ۵۱۱۱، ۵۲۲۹، ۶۱۵۶][۱۲]

۲۶۴۵ ـ حدثنا مسلم بن إبراهيم: حدثنا همام: حدثنا قتادة، عن جابر بن زيد، عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قال النبی ﷺ فی بنت حمزة: ((لا تحل لی، يحرم من الرضاعة ما يحرم من النسب، هی ابنة أخی من الرضاعة)). [أنظر: ۵۱۰۰]

۲۶۴۶ ـ حدثنا عبدالله بن يوسف: أخبرنا مالک، عن عبدالله بن أبی بكر، عن عمرة بنت عبد الرحمٰن: أن عائشة رضی الله عنها زوج النبی ﷺ أخبرتها: أن النبی ﷺ كان عندها وأنها سمعت صوت رجل يستأذن فی بيت حفصة، قالت عائشة رضی الله عنها: فقلت: يارسول الله، أراه فلانا، لعم حفصة من الرضاعة. فقالت عائشة: يارسول الله، هذا رجل يستأذن فی بيتک. قالت: فقال رسول الله ﷺ: ((أراه فلانا لعم حفصة من

---

[۱۱] فيض البارى، ج:۳، ص:۳۸۴، و عمدة القارى، ج:۹، ص:۳۸۳.

[۱۲] وفی صحيح مسلم، كتاب الرضاع، باب تحريم الرضاعة من ماء الفحل، رقم: ۲۶۱۷، وسنن الترمذی، كتاب الرضاع، باب ماجاء فی لبن الفحل، رقم: ۱۰۶۷، وسنن النسائی، كتاب النكاح، باب مايحرم من الرضاع، رقم: ۳۲۴۹، وسنن ابی داؤد، كتاب النكاح، باب فی لبن الفحل، رقم: ۱۷۶۱، وموطاء مالک، كتاب الرضاع، باب رضاعة الصغير، رقم: ۱۱۰۲.

الرضاع، فقالت عائشة: لو كان فلان۔ حيا لعمها من الرضاعة دخل علي؟ فقال رسول الله ﷺ: ((نعم إن الرضاعة يحرم منها ما يحرم من الولادة)). [أنظر: ۳۱۰۵، ۵۰۹۹].

۲۶۴۷ ۔ حدثنا محمد بن كثير: أخبرنا سفيان، عن اشعث بن أبي الشعثاء، عن أبيه، عن مسروق: أن عائشة رضي الله عنها قالت: دخل علي النبي ﷺ و عندي رجل فقال: ((يا عائشة من هذا؟)) قلت: أخي من الرضاعة، قال: ((يا عائشة انظرن من إخوانكن فإنما الرضاعة من المجاعة)). تابعه ابن مهدي عن سفيان. [۵۱۰۲]

حدیث باب کی تشریح

کہتے ہیں کہ انساب اور ارضاع وغیرہ کے مسئلے پر شہادت بالتسامع بھی کافی ہے۔

یعنی اگر خبر مستفیض کے طور پر یہ بات لوگوں میں مشہور ہو کہ فلاں، فلاں کا بیٹا ہے یا فلاں نے فلاں کو دودھ پلایا ہے تو خبر مستفیض شہادت کے قائم مقام ہو جاتی ہے اور اس سے نسب بھی ثابت ہو سکتا ہے اور رضاعت بھی ثابت ہو سکتی ہے، اس کو "استلام الشهادة بالتسامع" کہتے ہیں۔ کیونکہ نسب بھی ایسی چیز ہے کہ کوئی شخص اس کی حقیقت پر گواہی نہیں دے سکتا کہ یہ فلاں فلاں کا بیٹا ہے۔ حقیقی گواہی اس وقت دے سکتا ہے جب وہ علوق کا مشاہدہ کرے اور علوق کا مشاہدہ کون کر سکتا ہے؟

لہٰذا محض تسامع کی شہادت کافی ہے کہ شہرت ہے اور یہی معاملہ رضاعت کا بھی ہے۔ اسی طرح کسی شخص کے بارے میں کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے؟ کس وقت زندہ تھا کب مر گیا؟ اس کے بارے میں بھی عام شہرت ہے کہ فلاں وقت وہ مر چکا تھا تو اس عام شہرت کی بنا پر اس وقت سے اس کو مردہ سمجھا جائے گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں رضاعت والی حدیث لائے ہیں کہ جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ثویبہ نے دودھ پلایا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ثویبہ کا دودھ پلانا خود حضور اقدس ﷺ کو تو یاد نہیں ہوگا کیونکہ وہ بچے تھے لیکن آپ ﷺ نے یہ بات تسامع کی بنا پر فرمائی۔

(۸) باب شهادة القاذف والسارق والزاني،

وقول الله عزوجل: ﴿وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا﴾ [۱۳]

وجلد عمر أبا بكرة و شبل بن معبد ونافعا بقذف المغيرة، ثم استتابهم. وقال: من

[۱۳] [النور: ۴-۵]

تاب قبلت شهادته. وأجازه عبدالله ابن عتبة، و عمر بن عبدالعزيز، و سعيد بن جبير، و طاؤس و مجاهد والشعبى و عكرمة والزهرى و محارب بن دثار و شريح ومعاوية بن قرة' وقال أبو الزناد: الأمر عندنا بالمدينة إذا رجع القاذف عن قوله فاستغفر ربه قبلت شهادته. وقال الشعبى و قتادة: إذا أكذب نفسه جلد و قبلت شهادته .وقال الثورى:إذا جلد العبد ثم أعتق جازت شهادته' وان استقضى المحدود فقضاياه جائزة، وقال بعض الناس: لا تجوز شهادة القاذف وإن تاب' ثم قال: لا يجوز نكاح بغير شاهدين فإن تزوج بشهادة محدودين جاز' و إن تزوج بشهادة عبدين لم يجز. و أجاز شهادة العبد و المحدود والامة لرؤية هلال رمضان وكيف تعرف توبته. و نفى النبى ﷺ الزانى سنة' و نهى النبى ﷺ عن كلام كعب بن مالك وصاحبيه حتى مضى خمسون ليلة.

یہ باب ہے **"شهادة القاذف والسارق والزانى"** یہ تینوں چونکہ عادل نہیں، فاسق ہیں اس لئے ان کی شہادت مقبول نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے تینوں کو ایک ساتھ اس لئے ذکر کیا ہے کہ ان کے نزدیک تینوں کا حکم ایک ہی ہے یعنی ان کی شہادت قبول نہیں، البتہ اگر سارق سرقہ سے، زانی زنا سے اور قاذف قذف سے توبہ کرلے تو توبہ کے بعد ان کی شہادت قبول ہو جاتی ہے۔

محدود فی القذف کی شہادت اور اختلاف ائمہ

یہاں اصل محدود فی القذف کا مسئلہ بیان کرنا مقصود ہے کہ محدود فی القذف کی شہادت ویسے تو قبول نہیں لیکن امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر وہ توبہ کرلے تو اس کی توبہ اور اس کی شہادت قبول ہو جاتی ہے۔ یہی مسلک امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ کا بھی ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک قاذف کی شہادت قبول نہیں ہوتی، چاہے وہ توبہ بھی کر چکا ہو۔[۱۴]

اختلاف کا مدار اصل میں آیت کریمہ کی تفسیر پر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿**وَلَا تَقْبَلُوا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا**﴾

اب یہاں ﴿**اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ**﴾ یہ استثنی کس چیز کے ساتھ لگ رہا ہے؟

ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ یہ استثنی ﴿**وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً**﴾ کے ساتھ لگ رہا ہے کہ ان کی شہادت کبھی قبول نہ کرو، الا یہ کہ وہ توبہ کرلیں، پھر قبول کرلو۔

---

[۱۴] وتفسير القرطبى، ج: ۱۲، ص: ۱۷۹، و عمدة القارى، ج: ۹، ص: ۴۹۲.

حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ ﴿وَاُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ کے ساتھ لگ رہا ہے، **"لا تقبلوا لهم شهادة ابدًا"** یہاں تک تو حد کا بیان ہو گیا، اس کے بعد فرمایا کہ ﴿وَاُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ یہ لوگ فاسق ہیں۔ **"اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا"** سوائے ان کے جو توبہ کرلیں تو پھر فاسق نہ رہیں گے۔

اس کے معنی یہ ہے کہ توبہ کرنے کا اثر آخرت کے احکام پر ظاہر ہوگا لیکن دنیا میں جو حد لگ چکی وہ لگ چکی ہے اور اس حد کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ان کی شہادت کبھی نہ قبول کی جائے گی۔

حنفیہ کے دلائل

حنفیہ اپنے اس مؤقف کی تائید میں کئی باتیں پیش کرتے ہیں۔

ایک یہ کہ استثناء کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس کو اس سے متصل جملے کے ساتھ لگایا جاتا ہے اور یہاں متصل جملہ ﴿اُولٰئِکَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ﴾ ہے اور **"لا تقبلوا لهم شهادة ابدًا"** کے ساتھ لگانے میں ایک فاصل موجود ہے اور یہ خلاف اصل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ یوں فرمایا گیا **"فاجلدو هم ثمانین جلدة ولا تقبلو الهم شهادةً ابدًا واولٰئک هم الفٰسقون إلا الذین تابوا"** اب **"إلّا الّذین تابوا"** کے استثناء کو اگر فاصلے کے باوجود لگایا جائے تو کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اس کا تعلق **"فاجلدو هم ثمانین جلدة"** سے بھی ہے کہ اسی کوڑے لگاؤ اور شہادت قبول نہ کرو مگر یہ کہ اگر وہ توبہ کرلیں تو اسی کوڑے بھی مت لگاؤ، حالانکہ اس بات کا کوئی بھی قائل نہیں ہے کہ توبہ کی وجہ سے حد ساقط ہو جائے گی' جب وہ ساقط نہیں ہوگی اور ہر حالت میں اسی کوڑے لگائیں جائیں گے تو حد کا جو دوسرا جز ہے **"لا تقبلوا لهم شهادة ابدًا"** وہ کیسے مستثنیٰ ہو جائے گا۔

تیسری بات یہ ہے کہ قرآن نے **" لا تقبلوا لهم شهادة أبداً "** کے ساتھ **" أبداً "** فرمایا ہے اگر توبہ کے بعد شہادت قبول ہوتی تو پھر **" أبداً "** کا لفظ استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی، صرف **"لا تقبلوا لهم شهادة"** کہہ دیتے لیکن **" أبداً "** کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ ان کی شہادت کسی بھی حالت میں قبول نہیں ہوگی، استثناء کو اس کے ساتھ لگانے کے نتیجے میں **" أبداً "** کا لفظ بالکل بیکار ہو جاتا ہے، اس لئے بھی اس استثناء کو **"اولٰئک هم الفٰسقون"** کے ساتھ لگایا جائے گا۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ اگر وہ مسلک اختیار کیا جائے جو امام بخاری رحمہ اللہ اور ائمہ ثلاثہ فرما رہے ہیں تو پھر محدود فی القذف میں اور دوسرے فاسقوں میں کوئی فرق نہ ہوگا، اس لئے کہ وہ بھی جب تک توبہ نہ کریں اس وقت تک ان کی گواہی بھی قبول نہیں ہوتی۔ چور ہے، زانی ہے اور شارب خمر ہے، ان کی گواہی بھی بغیر توبہ کے قبول نہیں لیکن اگر توبہ کرلیں تو پھر قبول ہے۔ تو محدود فی القذف کی کیا خصوصیت ہوئی؟ حالانکہ قرآن یہ کہہ رہا

ہے کہ محدود فی القذف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی گواہی قبول نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ محدود فی القذف کی وہ خاصیت جو اس کو دوسرے فاسقوں سے ممتاز کرتی ہے اسی وقت ثابت ہوسکتی ہے جب یہ کہا جائے کہ اس کی گواہی کبھی بھی قبول نہیں ہوتی' چاہے وہ توبہ بھی کرلے' بخلاف سارق اور زانی کے کہ ان کی شہادت اور گواہی توبہ کے بعد قبول ہوسکتی ہے۔

اس وجہ سے حنفیہ اس بات کے قائل ہیں کہ محدود فی القذف کی گواہی توبہ کے بعد بھی قبول نہیں۔

"لقولہ تعالیٰ": ﴿وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَداً وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا﴾ [۱۵]، [۱۶]

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکرۃ، شبل بن معبد اور نافع کو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر تہمت لگانے کی وجہ سے کوڑے لگائے۔

حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ پر تہمت کا واقعہ

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بڑے سیاست دان اور ذکی آدمی تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو عراق کا گورنر مقرر کیا تھا اور گورنر مقرر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عراق کے لوگ قابو میں نہیں آتے تھے۔ **"الکوفی لایوفی"** تو وہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ گڑبڑ کرتے رہتے تھے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ جتنے فساد پھیلے ہیں، ان میں سے اکثر عراق سے ہی پھیلے ہیں، اس لئے وہاں کے لئے کوئی بہت ذکی اور سمجھدار آدمی چاہئے تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو وہاں کا گورنر مقرر کردیا۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پورے عراق کے گورنر تھے اور حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ صرف بصرہ کے گورنر تھے۔

حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کے طور طریقے اچھے نہیں لگتے تھے' ان کے درمیان کچھ اختلاف بھی تھا۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے شہر میں گئے ہوئے تھے۔ صبح کے وقت ابھی اندھیرا تھا' فجر طلوع نہیں ہوئی تھی یا طلوع تو ہوچکی تھی، لیکن بالکل ابتدائی وقت تھا۔ ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ نے دیکھا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے نکلے اور کہیں جانے لگے۔ ان کو کچھ تجسس ہوا کہ یہ ایسے وقت کہاں جارہے ہیں؟ یہ ان کے پیچھے لگ گئے۔ دیکھا کہ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ ایک مکان میں داخل ہوئے۔ انہوں نے اندر جھانکا تو وہاں ایک عورت تھی اور حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ اس کے ساتھ مشغول ہوگئے۔

ان سے صبر نہ ہوا انہوں نے تین آدمی اور اکھٹے کرلئے۔ ایک شبل بن معبد، ایک نافع اور ایک حضرت

---

[۱۵] [النور: ۴، ۵] [۱۶] تفسیر القرطبی، ج: ۱۲، ص: ۱۷۹، وفتح الباری، ج: ۵، ص: ۲۵۵.

ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ کے ماں شریک بھائی زیاد۔ اور ان کو اکھٹا کر کے کہا کہ دیکھو یہ کیا حرکت کر رہے ہیں۔ انہوں نے جا کر جھانکا تو دیکھا کہ وہ جماع کر رہے ہیں تو چار آدمیوں نے دیکھ لیا۔ انہوں نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس شکایت بھیجی کہ یہ قصہ ہوا ہے اور جن کو آپ نے گورنر بنایا ہے وہ تو العیاذ باللہ زنا میں مبتلا ہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی تو انہیں بہت تکلیف ہوئی۔ سب کو بلایا مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ بھی آگئے اور ان کے خلاف جو گواہ تھے وہ بھی آگئے۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے بلا تو لیا لیکن ساتھ یہ دعا بھی کی کہ یا اللہ کسی طرح مغیرہ رضی اللہ عنہ کو حد سے بچالے کیونکہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کو گمان یہ تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ یہ کام نہیں کر سکتے۔

جب گواہی ہوئی تو گواہی میں تین آدمیوں یعنی ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ، شبل ابن معبد اور نافع بن الحارث نے صریح الفاظ میں گواہی دی کہ ہم نے ان کو زنا کرتے ہوئے دیکھا ہے، چوتھے آدمی یعنی زیاد نے کہا کہ میں نے ایک چادر میں دیکھا اور حرکت دیکھی سانس پھولا ہوا تھا اور ایسی آواز نکل رہی تھی جیسی جماع کے وقت ہوتی ہے تو انہوں نے صریح زنا کی گواہی نہیں دی۔

اب چونکہ چوتھا آدمی صریح زنا کی گواہی نہیں دے پایا' اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے حد کو منقطع کر دیا اور ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ، شبل بن معبد اور نافع تینوں کو حد قذف لگائی۔

اصل واقعہ کیا تھا؟

واقعہ تو یہ مشہور ہے اب اصل قصہ کیا تھا؟ حضرت علامہ انور شاہ صاحب کشمیری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کی بہت تحقیق کی، اس کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوئی کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے ایک عورت سے خفیہ طور پر نکاح کیا ہوا تھا۔

مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ بات مشہور ہے کہ یہ بہت نکاح کرتے تھے اور بہت طلاق دیتے تھے۔ بہت سی عورتوں سے نکاح کئے اور بہت سی عورتوں کو طلاق دی۔ تو انہوں نے خفیہ قسم کا ایک نکاح کر رکھا تھا، جس کا لوگوں کو پتہ نہیں تھا اور یہ واقعہ ان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے خود عذر اس لئے پیش نہیں کیا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خفیہ قسم کے نکاحوں پر پابندی عائد کر رکھی تھی کہ جو آدمی نکاح کرے وہ کھلم کھلا کرے، خفیہ نکاح نہ کرے، اس لئے انہوں نے سوچا کہ اگر میں یہ کہوں گا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم کی خلاف ورزی ہوگی، تو اس وجہ سے یہ قصہ پیش آیا۔[۱۷]

بہر حال امام بخاری رحمہ اللہ اس طرف اشارہ کر رہے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ پر تہمت لگانے کی وجہ سے ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ، شبل بن معبد اور نافع کو حد قذف لگائی۔

۱۷ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۳۸۶.

"ثم استتابهم" پھر ان سے توبہ طلب کی اور فرمایا کہ **"من تاب قبلت شهادته"** جو توبہ کرے گا، آئندہ اس کی شہادت کو قبول کروں گا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہ استدلال بڑا قوی ہے، اس لئے کہ حضرت عمرؓ نے سارے صحابہؓ کی موجودگی میں یہ فرمایا کہ اگر توبہ کرلے گا تو شہادت قبول کرلوں گا اور کسی نے اس پر نکیر نہیں فرمائی۔ یہ واقعہ امام بخاریؒ اور ائمہ ثلاثہ کی قوی ترین دلیل ہے۔ لیکن امام طحاویؒ فرماتے ہیں کہ توبہ کی یہ بات حضرت سعید بن المسیبؒ سے منقول ہے **كما رواه الشافعي في الأم**. لیکن خود سعید بن المسیبؒ کا مسلک یہ تھا کہ قاذف توبہ کرکے تب بھی اس کی شہادت قبول نہ ہوگی۔ اور ابوداؤد طیالسیؒ نے روایت کیا ہے کہ خود ابوبکرہؓ کو کوئی گواہ بنانا چاہتا تو فرماتے: "**اشهد غيري فان المسلمين فسقوني**. دوسری طرف امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی دلیل قرآن کریم کے نقطۂ نظر سے بڑی قوی اور مضبوط ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ امام صاحبؒ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ یہاں اس واقعہ میں اگر وہ توبہ کریں، تو کیا کریں؟ توبہ تو یہی ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو جھٹلائیں کہ ہم نے جھوٹی شہادت دی حالانکہ جھوٹی شہادت نہیں تھی۔ انہوں نے واقعی عمل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ ان کی بیوی تھیں اور ان کو پتہ نہیں تھا کہ یہ ان کی بیوی ہیں تو توبہ کس بات کی کریں؟

اگر کہیں کہ ہم نے جھوٹ بولا تھا تو اب ٹھیک ہو جائے گا اور اگر کہیں کہ جھوٹ نہیں بولا تھا تو پھر توبہ کیسے ہوگی؟ تو چونکہ یہاں توبہ کا تصور صحیح نہیں ہو پاتا، اس لئے یہ بات اتنی پکی نہیں ہے جیسا کہ قرآن کریم کے وہ دلائل ہیں جو ابھی ذکر کئے گئے ہیں۔

"وأجازه عبدالله بن عتبة، و عمر بن عبد العزيز و سعيد بن جبير، و طاؤس و مجاهد و الشعبي و عكرمة والزهري و محارب بن دثار و شريح و معاوية بن قرة" یہ سب حضرات کہتے ہیں کہ توبہ کے بعد شہادت قبول ہے۔

"وقال أبوالزناد: الأمرعندنا بالمدينة إذا رجع القاذف عن قوله فاستغفر ربه قبلت شهادته، وقال الشعبي و قتادة: إذا أكذب نفسه جلد و قبلت شهادته" شعبی اور قتادہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی تہمت لگانے کے بعد اپنے آپ کو جھوٹا قرار دے دے کہ میں نے غلط تہمت لگائی ہے تو حدِ قذف لگائی جائے گی اور ساتھ میں اس کی شہادت قبول کرلی جائے گی، کیونکہ اس نے اپنے آپ کو جھوٹا توبہ کرلی ہے۔

"وقال الثوري" سفیان ثوری کہتے ہیں **"إذاجلد العبد ثم أعتق جازت شهادته"** کہ اگر عبد کو کوڑے لگائے گئے پھر وہ آزاد ہو گیا تو اس کی شہادت قبول ہو جائے گی۔

"وإن استقضى المحدود فقضاياه جائزة" کہتے ہیں کہ اگر محدود فی القذف کو قاضی بنایا

جائے تو اس کے فیصلے بھی جائز ہوں گے کیونکہ جب شہادت قبول ہوگئی تو اس کا قاضی بننا بھی درست ہوگیا۔

یہاں تک امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنا مسلک بیان کیا۔

آگے حنفیہ پر تنقید فرمائی۔ فرمایا **"وقال بعض الناس لا تجوز شهادة القاذف وإن تاب"** بعض لوگ (مراد امام ابوحنیفہؒ ہیں) کہتے ہیں کہ قاذف کی شہادت جائز نہیں اگرچہ وہ توبہ بھی کرلے۔ ایک طرف تو یہ کہا دوسری طرف کہا کہ **"ثم قال لا يجوز نكاح بغير شاهدين، فإن تزوج بشهادة محدودين جاز"** دو گواہوں کے بغیر نکاح نہیں ہوتا اگر دو محدود بالقذف کی موجودگی میں نکاح پڑھ لیا تو نکاح ہوگیا۔ گویا یہاں محدود بالقذف کی شہادت کو معتبر مانا۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہ سمجھے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے دونوں قولوں میں تعارض ہے حالانکہ حقیقت میں کوئی تعارض نہیں، وہاں ادائے شہادت کے وقت شہادت کے قبول ہونے کی بات ہورہی ہے اور نکاح میں ادائے شہادت کی نہیں بلکہ تحمل شہادت کی بات ہورہی ہے یعنی نکاح کے وقت دو آدمی موجود ہونے چاہئیں۔ ان کے بغیر نکاح نہیں ہوتا تاکہ متعہ اور خفیہ آشنائی کے طریقے کو بند کیا جائے۔

اگر محدود بالقذف ہوں تو چونکہ موجودگی کی شرط پوری ہوگئی' اس لئے نکاح درست ہوگیا۔ یہ اور بات ہے کہ فرض کریں نکاح میں جھگڑا ہوگیا اور معاملہ عدالت میں پہنچ گیا اور اس محدود بالقذف نے جا کر گواہ دینی چاہی کہ ہماری موجودگی میں نکاح ہوا تھا تو وہاں ان کی شہادت قبول نہیں ہوگی لیکن نکاح کے انعقاد اور صحت کے لئے محدودین بالقذف کا موجود ہونا کافی ہے۔

اعتراض تو ائمہ ثلاثہ پر بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی سارق وزانی نکاح کے وقت موجود ہیں تو نکاح درست ہو جائے گا، یہ اور بات ہے کہ جب گواہی دینے جائیں گے تو ان کی گواہی کو قبول نہیں کیا جائیگا۔ تو یہ متفق علیہ بات ہے جیسے اور فساق کا حکم ہے وہی محدودین **"في القذف"** کا حکم ہے۔ [۱۸]

"وإن تزوج بشهادة عبدين لم يجز" امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ محدودین فی القذف کی موجودگی میں تو نکاح درست ہوجاتا ہے لیکن دو غلاموں کی موجودگی میں نہیں ہوتا۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ نکاح کے وقت شہادت ایک طرح کی ولایت ہے اور عبد ولایت کے اہل نہیں' لہٰذا نکاح کے لئے ان کی موجودگی کافی نہیں ہے۔ [۱۹]

"وأجاز شهادة العبد و المحدود و الأمة لرؤية هلال رمضان"

---

۱۸ عمدة القارى ج: ۹ ص: ۴۹۵.

۱۹ لأن العبد ليست له ولاية ، فإذا عتق حصلت له الولاية على نفسه ، وإذن لا بأس بعبرة شهادته . (فيض البارى ، ج : ۳ ، ص : ۳۸۷)

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نے دوسرا اتنا فرق یہ کیا کہ ہلال رمضان کی رویت کے لئے محدود بالقذف کی شہادت بھی مان لیتے ہیں، غلام اور باندی کی بھی، تو یہاں پر بھی بات یہی ہے:

سخن شناس نہ ای دلبرا خطا اینجاست

کہ درحقیقت ہلالِ رمضان کے ثبوت کے لئے شہادت کی شرط ہی نہیں بلکہ خبر کافی ہے۔ اگر کوئی ایک قابل اعتماد عادل آدمی بھی خبر دے دے تو اس سے بھی ثبوت ہو جاتا ہے، کیونکہ وہاں شہادت شرط نہیں اسی واسطے "**اشهد**" کا صیغہ بھی شرط نہیں ہے۔

آگے فرمایا "**وكيف تعرف توبته**".

یہ ترجمۃ الباب کا دوسرا حصہ ہے یعنی جب ہم نے مان لیا کہ محدود بالقذف کی شہادت توبہ کے بعد قبول ہو جائے گی تو اب اس کی توبہ کیسے پہچانیں گے کہ اس نے توبہ کرلی ہے، آگے اس کو بتاتے ہیں کہ "**ونفى النبي ﷺ الزاني سنة**" کہ نبی کریم ﷺ نے زانی کو سال بھر تک جلاوطن فرمایا تو سال بھر تک جلاوطن کرنے کے بعد حد پوری ہوگئی، ان کے خیال میں چونکہ جلاوطنی بھی حد کا ایک حصہ ہے اور حد پوری ہوگئی تو حد کفارہ ہے، لہٰذا ان کے نزدیک گناہ معاف ہوگیا اور توبہ کے حکم میں آگیا۔

اس کا دوسرا معنی یہ ہے کہ جب ایک سال تک جلاوطن کرنے کے بعد اس کے حالات سے اندازہ ہوا کہ اس نے اپنی اصلاح کرلی ہے تو اب اس کو واپس بلا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر قاذف کے قذف کرنے کے بعد ایک مدت تک اس کے حالات دیکھنے سے پتا چلے کہ یہ اپنے عمل سے تائب ہو چکا ہے تو سمجھ لیں گے کہ تائب ہوگیا اور اس کی شہادت قبول کرلیں گے۔

آگے فرمایا "**ونهى النبي ﷺ عن كلام كعب بن مالك وصاحبيه حتى مضى خمسون ليلة**".

کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی ہلال بن امیہ وغیرہ کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے بات چیت سے پچاس دن تک منع فرمایا تھا تو اس کے بعد آپ ﷺ نے ان کی توبہ قبول کرلی تھی۔

اب یہاں پچاس دن اس لئے رکھے گئے تاکہ ان کے طرز عمل کا اندازہ کیا جائے، اسی طرح محدود بالقذف کو ایک مدت تک دیکھا جائے گا کہ اس کا طرز عمل کیسا ہے؟ اگر طرز عمل درست معلوم ہو تو پھر اس کی توبہ قبول کر سکتے ہیں اور آئندہ اس کی گواہی بھی قبول کی جا سکتی ہے۔

(۹) باب: لا یشهد علی شهادة جور إذا أشهد

۲۶۵۱ ـ حدثنا آدم: حدثنا شعبة: حدثنا أبو جمرة: قال سمعت زهدم بن مضرب: قال سمعت عمران بن حصين رضي الله عنهما قال: قال النبي ﷺ: ((خيركم قرني، ثم

الذين يلونهم ، ثم الذين يلونهم)). قال عمران: لاأدرى أذكر النبي ﷺ بعد قرنين أو ثلاثة. قال النبي ﷺ: ((إن بعد كم قو ما يخونون ولا يؤ تمنون و يشهدون ولا يستشهدون و ينذرون ولا يفون' ويظهر فيهم السمن)). [أنظر: ۳۶۵۰، ۶۴۲۸، ۶۶۹۵].[۲۰]

"يظهر فيهم السمن" یعنی موٹے ہو جائیں گے، مطلب یہ ہے کہ ان کی ساری بھاگ دوڑ کا محور پیسے جمع کرنا اور کھانا پینا ہے' اس لئے وہ صحیح گواہی دے رہے ہیں یا غلط اس کی پرواہ نہیں کریں گے۔

(۱۱) باب شهادة الأعمى ونكاحه' وأمره، وإنكاحه، ومبايعته، وقبوله في التأذين وغيره، وما يعرف بالأصوات

"وأجاز شهادته القاسم والحسن وابن سيرين و الزهري و عطاء. وقال الشعبي: تجوز شهادته إذا كان عاقلا. وقال الحكم: رب شي تجوزفيه. وقال الزهري: أرأيت ابن عباس لو شهد على شهادة، أكنت ترده؟ وكان ابن عباس يبعث رجلا إذا غابت الشمس أفطر و يسأل عن الفجر، فإذا قيل: طلع' صلى ركعتين. وقال سليمان ابن يسار: استأذنت على عائشة رضى الله عنها فعرفت صوتي' فقالت: سليمان أدخل فإنك مملوك مابقى عليك شيء. أجاز سمرة بن جندب شهادة امرأة منتقبة".

یہ باب قائم کیا ہے کہ نابینا شخص کی شہادت معتبر ہے یا نہیں؟ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بارے میں ترجمۃ الباب قائم کیا ہے اور ان کا رجحان یہ ہے کہ اعمی کی شہادت مطلقاً مقبول ہے۔ یعنی ہر اس چیز میں اس کی شہادت مقبول ہے جس کو آواز سے پہچانا جا سکتا ہو۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ اعمی کی شہادت اور اس کے تمام "امور و نكاحه وانكاحه" خود بھی نکاح کر سکتا ہے اور دوسرے کا نکاح بھی کرا سکتا ہے۔ "ومبايعته" اور اس کی بیعت بھی لے سکتا ہے یا کر سکتا ہے اور اس کو اذان میں بھی قبول کیا جا سکتا ہے ہر اس چیز میں جو آواز کے ذریعے پہچانی جاتی ہو۔

اعمیٰ کی شہادت کے بارے میں اقوال ائمہ

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان یہ ہے کہ اعمی کی شہادت ان چیزوں میں علی الاطلاق قبول ہے جو آواز سے

---

[۲۰] صحيح مسلم ، كتاب فضائل الصحابة ، باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم ، رقم: ۴۶۰۳ ، وسنن الترمذي ، كتاب الفتن عن رسو ل الله، باب ماجاء في القران الثالث ، رقم: ۲۱۴۷ ، وسنن النسائي، كتاب الأيمان والنذور، باب الوفاء بالنذر ، رقم: ۳۷۴۹ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب السنة ، باب في فضل أصحاب رسول الله ، رقم: ۴۰۳۸، ومسنداحمد ، اوّل مسندالبصريين ، باب عمران بن حصين ، رقم: ۱۸۹۷۹ ، ۱۸۹۹۴ ، ۱۹۰۵۹ ، ۱۹۱۰۵ .

پہچانی جا سکتی ہوں۔

امام مالک رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام احمدؒ سے بھی روایت یہی ہے۔

جمہور یہ کہتے ہیں کہ اگر تحمل شہادت کے وقت وہ شخص بینا تھا تو ادائے شہادت جائز ہے، چاہے وہ نابینا ہو گیا ہو۔

لیکن اگر تحمل شہادت کے وقت ہی نابینا تھا تو اس کے بارے میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ عام حالات میں اس کی شہادت مقبول نہیں۔ البتہ کچھ استثنائی حالات ایسے ہیں جن میں قبول کی جا سکتی ہے۔ یعنی اصل حکم تو یہی ہے کہ اگر وہ تحمل شہادت کے وقت ہی نابینا ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں، البتہ اگر بعض ایسے حالات ہوں جہاں سوائے آواز کے پہچاننے کے کوئی اور چارہ نہ ہو تو اس کی شہادت کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ وہ مستثنیٰ حالات ہیں۔

امام بخاریؒ نے اپنے مسلک پر استدلال کیا ہے **"واجاز شهادته القاسم والحسن وابن سيرين و الزهرى و عطاء"** کہ ان تابعین کے اقوال سے کہ انہوں نے شہادۃ اعمیٰ کو جائز کہا ہے۔

"قال الشعبی: تجوز شهادته إذا كان عاقلا: وقال الحكم: رب شی تجوز فيه".

حکم نے کہا ہے کہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن میں اعمیٰ کی شہادت قبول ہے۔ گویا حکم کا قول حنفیہ کے قریب قریب ہوا کہ وہ بعض چیزوں میں قبول کرتے ہیں اور بعض چیزوں میں قبول نہیں کرتے۔

"قال الزهری أرأيت ابن عباس لو شهد على شهادة أكنت ترده؟"

امام زہریؒ نے اعمیٰ کی شہادت قبول کرنے پر استدلال فرمایا کہ یہ بتاؤ اگر عبداللہ بن عباسؓ اس چیز کی شہادت دیں کیا تم اس کو رد کرو گے؟ کیونکہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما آخر عمر میں نابینا ہو گئے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے نابینا ہونے کا واقعہ

ان کے نابینا ہونے کا واقعہ بھی عجیب ہے۔ ایک مرتبہ یہ اپنے والد کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایک صاحب کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اپنے والد سے پوچھا کہ یہ جو صاحب حضور اقدس ﷺ کے پاس بیٹھے ہوئے ہیں یہ کون ہیں؟

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ حضور اکرم ﷺ کے پاس تو کوئی بھی نہیں بیٹھا ہوا ہے، وہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو نظر نہیں آرہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ایک صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں کہ وہ کون ہیں۔

بعد میں پتہ چلا کہ وہ حضرت جبریل علیہ السلام تھے جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تو نظر نہیں آئے اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو نظر آ گئے۔ بعد میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے سے کہا کہ کیا واقعی تم نے ان کو دیکھا تھا کہا کہ ہاں! دیکھا تھا، اسی واسطے تو ان کے بارے میں پوچھا تھا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر تمہاری بینائی سلامت نہیں رہے گی یعنی اگر تم نے جبرئیل کو دیکھ لیا ہے

تو پھر تمہاری بینائی سلامت نہیں رہے گی، کسی نہ کسی وقت چلی جائے گی۔ بعد میں واقعی ان کی بینائی چلی گئی۔

امام زہریؒ کا یہ استدلال کہ اگر عبداللہ بن عباسؓ شہادت دیں تو کیا تم رد کردو گے؟ یہ تھوڑا سا جذباتی قسم کا استدلال ہے، اس لئے کہ شہادت کے قبول کرنے اور نہ کرنے میں اصول کا اعتبار ہے افراد کا نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قاضی شریح نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شہادت جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حق میں تھی رد کردی تھی۔ مشہور واقعہ ہے، یہودی کے ساتھ زرہ کا معاملہ پیش آیا تھا، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اپنے والد کی شہادت دے رہے تھے۔

اب اگر کوئی یوں کہے کہ کیا حضور اقدس ﷺ کے نواسے کی شہادت رد کردو گے؟ تو یہ کہنا اس لئے درست نہیں ہوگا کہ یہاں یہ مطلب نہیں ہیں کہ ان کو مطعون کیا جارہا ہے یا ان پر اتہام لگایا جارہا ہے بلکہ مقصود ہے کہ اصول کی بات یہ ہے کہ بیٹے کی شہادت باپ کے حق میں قبول نہیں۔

اسی طرح اگر اصول کے تحت اعمی کی شہادت قبول نہیں ہے تو وہ اعمی کوئی بھی ہو چاہے صحابی رضی اللہ عنہ ہو یا عورت اس کی شہادت قبول نہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ کیا حضرت عائشہؓ کی شہادت رد کرو گے؟ تو یہ بات اس لئے درست نہیں ہوگی کہ اصولاً حدود کے معاملات میں عورت کی گواہی معتبر نہیں، لہٰذا اس میں افراد کی خصوصیت کا اعتبار نہیں ہوتا۔

آگے فرماتے ہیں: **"وقال سلیمان ا بن یسار استأذنت علی عائشة رضی الله عنها فعرفت صوتی"** میں نے حضرت عائشہؓ سے اجازت طلب کی تو انہوں نے میری آواز پہچان لی۔ **"فقالت: سلیمان أدخل فإنک مملوک مابقی علیک شئ"** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا، سلیمان آجاؤ کیونکہ تم غلام ہو اور جب تک کتابت کی کوئی رقم تمہارے اوپر واجب ہو تم اس وقت تک غلام ہو۔

یہ اصل میں حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے غلام تھے۔ انہوں نے ان کو مکاتب بنایا ہوا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ جب تک بدل کتابت کی کوئی رقم تمہارے ذمے واجب ہے تم اس وقت تک غلام ہو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے غلام سے پردہ کیوں نہیں کیا؟

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مسلک یہ تھا کہ غلام چاہے اپنا ہو یا کسی اور کا ہو، اس سے پردہ نہیں ہے۔

جمہور کہتے ہیں کہ اگر اپنا غلام ہے تو پردہ نہیں ہے لیکن اگر دوسرے کا غلام ہو تو پردہ ہے۔ چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا مسلک یہ تھا کہ پردہ نہیں ہے، اس لئے انہوں نے غلام سے کہا کہ چونکہ تمہارے ذمہ ابھی تک بدل کتابت باقی ہے اس لئے ابھی تک تم غلام ہو، لہٰذا میرے پاس آسکتے ہو۔

یہاں استدلال صرف اس بات پر کررہے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سلیمان بن یسار کو آواز سے پہچان کر کہا کہ اندر آجاؤ، معلوم ہوا کہ صرف آواز پہچان کر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے، لہٰذا امام بخاری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ اعمی کی شہادت بھی قبول ہے اگر وہ آواز پہچان سکتا ہے۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے، اس لئے کہ یہاں شہادت کا کوئی امکان نہیں تھا، یہ محض آواز پہچان کرا پنے گھر میں داخل ہونے کی اجازت تھی، شہادت کا معاملہ نہیں تھا۔ شہادت الزام علی الغیر کے لئے ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص آواز پہچان کرا پنے حق میں کوئی فیصلہ کرلے تو یہ جائز ہے لیکن آواز کے ذریعے الزام علی الغیر درست نہیں کہ میں آواز پہچان گیا ہوں، لہٰذا اب میری بات تمہارے ذمہ بھی لازم ہے یہ شہادت کا حاصل ہے اور یہ نہیں ہوسکتا۔

"وأجاز سمرة بن جندب شهادة امرأة منتقبة" حضرت سمرۃ بن جندب ﷺ نے نقاب والی عورت کی شہادت کو جائز قرار دیا کہ اگر اس نے نقاب ڈالا ہوا ہو اور پھر وہ شہادت دے تو جائز ہے، اس سے وہ اعمی کی شہادت پر استدلال کر رہے ہیں کہ گویا اعمی کے اوپر بھی نقاب پڑا ہوا ہے اور وہ شہادت دے رہا ہے تو کہتے ہیں کہ اگر **"امرأة منتقبة"** تحمل شہادت کے وقت بھی منتقبہ تھی اور اس نے معاملہ اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا تو اس کی شہادت بھی جائز نہیں ہوگی لیکن تحمل شہادت کے وقت **"منتقبة"** نہیں تھی اور اپنی آنکھ سے معاملہ دیکھ لیا تھا بعد میں اگر انتقاب کی حالت میں شہادت دے تو یہ جائز ہے۔

یہی ہم اعمی کے بارے میں بھی کہتے ہیں کہ اگر تحمل شہادت کے وقت وہ بینا تھا اور ادائے شہادت کے وقت اگر وہ نابینا ہے تو جائز ہے۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے جتنے واقعات بطور استدلال ذکر کئے ہیں، وہ سب ایسے ہیں کہ ان سے شہادت پر استدلال نہیں ہوسکتا مثلاً یہ کہ عائشہؓ نے سلیمان بن یسار کی آواز پہچان لی۔ میں نے پہلے عرض کیا کہ آواز پہچاننے سے آدمی اپنے حق میں فیصلہ کرسکتا ہے۔

اسی طرح امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا کہ حضرت عبداللہ ابن ام مکتوم ﷺ کو آنحضرت ﷺ نے اذان کے لئے مقرر فرمایا تھا۔ تو اذان کے لئے مقرر فرمانے سے شہادت کا جواز لازم نہیں آتا۔ امام بخاریؒ کا استدلال یہ ہے کہ جو شخص اذان دے رہا ہے وہ گویا اس بات کی شہادت دے رہا ہے کہ نماز کا وقت ہوگیا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن ام مکتوم ﷺ خود اس وقت شہادت دیتے تھے جب لوگ ان کو کہہ دیتے تھے کہ صبح ہوگئی اور وقت ہوگیا (جیسا کہ پہلے بھی گزرا ہے اور آگے بھی آرہا ہے) اس لئے یہ شہادت نہ ہوئی۔ محض اعلان ہوا اور ایسی چیز کا اعلان ہوا جو بغیر شہادت اعمی کے پہلے ثابت ہو چکی ہے' اس لئے اس کو استدلال کے لئے نہیں لاسکتے۔

۲۶۵۵ ۔ حدثنا محمد بن عبيد بن ميمون : أخبرنا عيسى بن يونس ' عن هشام ' عن أبيه ' عن عائشة رضى الله عنها قالت : سمع النبي ﷺ رجلا يقرفي المسجد فقال : ((رحمه الله ' لقد أذكر كذا آية اسقطتهن من سورة كذاو كذا.))

وزاد عباد بن عبدالله عن عائشة : تهجد النبي ﷺ في بيتي فسمع صوت عباد يصلي في المسجد فقال: ۔((يا عائشة أصوت عباد هذا ؟)) قلت : نعم' قال : اللّٰهم ارحم عبادا (أنظر : ۵۰۳۷، ۵۰۴۲، ۶۳۳۵).

حضواقدس ﷺ نے ایک شخص کو مسجد میں قرآن پڑھتے ہوئے سنا۔آپ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے، انہوں نے مجھے وہ آیت یاد دلا دی جو میں نے فلاں سورت میں چھوڑ دی تھی، بھول گیا تھا۔

دوسری روایت میں آتا ہے کہ بعد میں آپ ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ یہ عباد کی آواز ہے، حضرت عائشہؓ نے فرمایا جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا "**اللّٰهم ارحم عباداً**" یہاں وہی بات ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت عبادؓ کی آواز پہچانی۔

(۱۳) باب شهادة الاماء والعبيد

"وقال أنس: شهادة العبد جائزة إذا كان عدلا. و أجازه شريح وزرارة بن أوفى. وقال ابن سيرين: شهادته جائزة إلا العبد لسيده' وأجازه الحسن و إبراهيم في الشي التافه : وقال شريح: كلكم بنو عبيد وإماء".

۲۶۵۹ ـ حدثنا أبو عاصم ـ عن ابن جريج، عن ابن أبي مليكة ، عن عقبته بن الحارث . ح وحدثنا علي بن عبدالله : حدثنا يحيى بن سعيد' عن ابن جريج قال: سمعت ابن أبي مليكة قال: حدثني عقبة بن الحارث أوسمعته منه: أنه تزوج أم يحيى بنت أبي اهاب' قال: فجاء ت أمة سوداء فقالت: قد ارضعتكما' فذكرت ذلک للنبي ﷺ فاعرض عني. قال: فتنحيت فذكرت ذلک له قال: وكيف وقد زعمت انها قد ارضعتكما؟ فنهاه عنها . [راجع:۸۸]

غلام کی شہادت کے بارے میں باب قائم کیا ہے اور امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف ہے کہ غلام اور باندی کی شہادت مقبول ہے۔

حضرت انسؓ کا بھی یہی مذہب بیان کیا ہے، شریح، زراۃ بن اوفی اور محمد ابن سیرین رحمہم اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

ابراہیم نخعیؒ کا یہ مذہب نقل کیا ہے کہ انہوں نے شہادۃ عبد کو جائز قرار دیا ہے "**في الشي التافه**" معمولی چیزوں میں اور اگر کوئی قیمتی چیز ہو تو اس میں معتبر نہیں "**وقال شريح كلكم بنو عبيد واماء**" اور شریح نے کہا کہ تم سب غلام ہو اور باندیوں کے بیٹے ہو، مطلب یہ ہے کہ سارے انسان اللہ کے بندے ہیں اور

عورتیں اللہ کی بندیاں ہیں، تو سب بندوں کے ہی بیٹے ہیں، لہٰذا اس کی شہادت قبول ہے۔ اور یہی امام احمدؒ کا مسلک ہے، اور شاید امام بخاریؒ کا بھی یہی مسلک ہے۔

ائمہ ثلاثہ کا مسلک

لیکن امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی رحمہم اللہ تینوں حضرات کہتے ہیں کہ شہادت ایک طرح کی ولایت ہے اور غلام کو کسی چیز پر ولایت حاصل نہیں ہوتی، غلام اہل ولایت نہیں ہے، اس لئے اس کی شہادت مقبول نہیں۔[۲۱]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے مسلک پر حدیثِ مرفوع سے استدلال کیا ہے اور وہ عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک باندی نے عقبہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے تمہیں اور تمہاری بیوی کو دودھ پلایا ہے، انہوں نے کہا ہمیں تو نہیں پلایا، اس نے کہا کہ نہیں پلایا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کے پاس مسئلہ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو، یعنی چھوڑنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ **"کیف وقد قیل؟"** جب ایک بات کہہ دی گئی تو اب اس کو کیوں رکھتے ہو۔

لیکن یہ مسئلہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے یہ حکم بطور احتیاط دیا تھا۔ **"کیف وقد قیل؟"** کے الفاظ بھی اس پر دلالت کر رہے ہیں کہ کیسے رکھو گے جب ایک بات کہہ دی گئی، یعنی اب خوشگواری نہیں باقی رہے گی، طبیعت میں شبہ پیدا ہو جائے گا۔ میاں، بیوی کے تعلقات میں خوشگواری ہوتی ہے وہ باقی نہیں رہے گی، اس لئے آپ ﷺ نے یہ حکم کیا ورنہ فی نفسہ ایک عورت کی شہادت (مرضعہ کی) قبول نہیں، لہٰذا اس سے استدلال درست نہیں۔ بعض نسخوں میں آگے حدیث افک کا عنوان ہے۔

(۱۴) باب شهادة المرضعة

۲۶۶۰ ۔ حدثنا أبو عاصم، عن عمر بن سعيد، عن ابن أبي مليكة، عن عقبة بن الحارث قال: تزوجت امرأة فجاءت امرأة فقالت: إني قد ارضعتكما، فأتيت النبي ﷺ فقال: ((و كيف و قدقيل ؟ دعها عنك أو نحوه)) [راجع: ۸۸]

(۱۵) باب تعديل النساء بعضهن بعضها

۲۶۶۱ ۔ حدثنا ابو الربيع سلمان بن داؤد وافهمني بعضه أحمد قال: .... وسل الجارية تصدقك فدعا رسول الله ﷺ بريرة فقال : ..... فتأتي الداجن فتاكله ....وكان رسول الله ﷺ.............يازينب ....وهي التي كانت تسامني فعصمها الله بالورع.

---

[۲۱] فيض الباري، ج:۳، ص:۳۸۷.

عورتیں ایک دوسری کی تعدیل کریں تو اس کا کیا حکم ہے؟

ایک عورت کی تعدیل دوسری عورت کے حق میں قبول کی جاسکتی ہے اور اس میں حدیث الافک نقل کی ہے کہ اس میں حضرت بریرۃؓ نے حضرت عائشہؓ کی تعدیل کی حضور اقدس ﷺ نے حضرت بریرۃؓ سے حضرت عائشہؓ کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے تعدیل کی اور آپ ﷺ نے اس کو قبول فرمایا، اسی طرح حضرت زینبؓ سے آپ ﷺ نے پوچھا تو حضرت زینبؓ نے بھی حضرت عائشہ کی تعریف فرمائی، تو اس کو قبول فرمایا، اس حدیث کو لانے کا مقصد یہ ہے اور اس کی تفصیل مغازی میں ہے۔

(۱۶) باب إذا زكى رجل رجلا كفاه

"وقال أبو جميلة : وجدت منبوذا فلما رآني عمر قال: عسى الغُوَير أبؤُساً ، كأنه يتهمني قال عريفي : إنه رجل صالح، قال: كذاك ، اذهب وعلينا نفقته ".

جب ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کا تزکیہ کردے تو پھر کافی ہے، مراد تزکیۃ الشہود ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی بھی کسی دوسرے آدمی، شاہد کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ قابل اعتماد ہے تو ایک آدمی کا تزکیہ کافی ہے۔

اختلاف فقہاء

یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

دوسرے حضرات جیسے شافعیہ، مالکیہ وہ کہتے ہیں کہ دو آدمی ہونے ضروری ہیں جو شہادت کا نصاب ہے وہی تزکیہ کا نصاب بھی قرار دیتے ہیں، حنفیہ میں سے امام محمدؒ کا بھی یہی قول ہے۔ [۲۲]

امام بخاری رحمہ اللہ کا جو مسلک ہے وہ امام احمد بن حنبلؒ کا بھی ہے کہ ایک کی شہادت پر اعتبار کرنے کو معتبر مانتے ہیں۔

حنفیہ کے یہاں مفتی بہ قول یہ ہے کہ تزکیہ کے لئے عدد یا عدالت شرط ہے یا تو دو مزکی ہوں یا اگر ایک ہے پورا عادل ہو، اگر پورا عادل ہے تو اس کی گواہی قبول ہوگی۔ [۲۳]

آگے اس واقعہ سے استدلال کیا ہے کہ ابو جمیلہ کہتے ہیں **"وجدت منبوذا"** میں نے ایک لقیط پایا **"منبوذ"** کے معنی ہیں ایک بچہ جو کہیں پڑا ہوا مل گیا۔ جس کو اصطلاح میں لقیط کہتے ہیں تو فرماتے ہیں وہ مجھے مل گیا۔

"فلما رآني عمر" جب مجھے حضرت عمرؓ نے دیکھا تو فرمایا کہ **"عسى الغوير ابؤسا"** یعنی میں اس کو اٹھا کر حضرت عمرؓ کے پاس لے گیا۔ ان کے پاس لے جانے کا منشاء یہ تھا کہ چونکہ وہ امیر المومنین تھے اس لئے ان کو بتا دوں کہ یہ بچہ مجھے ملا ہے اور میں اس کو اپنے پاس رکھ کر اس کی پرورش کرنا چاہتا ہوں۔

---

[۲۲] عمدة القاري ج: ۹، ص: ۵۳۰.

[۲۳] عمدة القاري ج: ۹، ص: ۵۳۰.

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب دیکھا تو ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ شخص محض دھوکہ دے کر مجھ سے بیت المال سے نفقہ جاری کرانا چاہتا ہے یعنی جب مجھ سے کہے گا یہ بچہ لقیط ہے اور مجھے ملا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لقیط کا بیت المال سے نفقہ جاری کرو اور جب بیت المال سے اس کے نام پر نفقہ جاری ہو جائے گا پھر اس میں جو اللّے تللّے چاہیں کریں اس لئے یہ بچہ لے کر آیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو دیکھ کر فرمایا کہ **"عسی الغویر ابؤسا"**.

یہ عرب میں ایک محاورہ ہے، غویر، غار کی تصغیر ہے اور ابوس، بوس کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں شدت اور مصیبت۔ تو لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ کچھ بعید نہیں یا یہ ہوسکتا ہے کہ چھوٹا سا غار بہت سی مصیبتوں کا سبب بن جائے۔

"عسی الغویر أبؤسا" کی اصل کیا ہے؟

اس مثل کی اصل یہ ہے کہ کچھ لوگ صحراء میں سفر کر رہے تھے کہ بارش آگئی۔ انہوں نے بارش سے بھاگ کر ایک غار میں پناہ لی، ابھی غار میں بیٹھے ہی تھے اور اس خیال میں تھے کہ بارش سے بچ گئے ہیں، بارش سے نجات مل گئی ہے کہ اوپر سے غار کے اوپر جو چٹان ہے، وہ ان کے اوپر گرگئی اور وہ مر گئے تو وہ غار جس کو انہوں نے نجات کا ذریعہ سمجھا تھا۔ بالآخر ان کے لئے ہلاکت کا سبب بنا تو اب عرب میں یہ مثل مشہور ہوگئی ہے، جب بھی کوئی ایسا معاملہ ہو جس کی ظاہری طور پر تو اچھائی نظر آتی ہو لیکن اس کا انجام خراب ہو اس وقت کہتے ہیں **"عسی الغویر ابؤسا"** کہ جس چیز کو تم اپنے لئے اچھا سمجھ رہے ہو ہوسکتا ہے کہ انجام کے اعتبار سے تمہارے لئے بری ہو۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر فرمایا **"عسی الغویر ابؤسا"** مطلب یہ ہے کہ یہ بچہ جو تم لائے ہو بظاہر تو یوں سمجھ رہے ہو کہ اس کے ذریعے بیت المال سے فائدہ حاصل کرو گے، لیکن یہ عین ممکن ہے کہ آپ کے لئے مصیبت کا سبب بن جائے یعنی اگر واقعی مجھ پر یہ بات ثابت ہوگئی کہ تم یہ نفقہ لے کر اپنے مصارف میں خرچ کر رہے ہو، بچے پر خرچ نہیں کر رہے یا ضرورت سے زیادہ خرچ کر رہے ہو تو پھر میں تمھیں سزا دوں گا۔ اس واسطے یہ چیز جو ظاہری طور پر تمہیں اچھی نظر آ رہی ہے ہوسکتا ہے انجام کے اعتبار سے تمہارے لئے بری ہو۔

"کانہ یتھمنی" یہ جملہ انہوں نے اس وجہ سے کہا کہ گویا وہ مجھ پر تہمت لگا رہے تھے کہ میں غلط سلط دعویٰ کر کے پیسے جاری کرانا چاہتا ہوں۔

تزکیہ کے لئے ایک کی شہادت کافی ہے

"قال عریفی" اتفاق سے میرے عریف بھی وہاں پر موجود تھے۔ عریف اصل میں قبیلے کے نمائندہ کو

کہتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ نے مختلف قبائل کے کچھ عرفاء مقرر فرمائے ہوئے تھے۔ حضرت ابو جمیلہ کہتے ہیں کہ میرے قبیلے کے عریف نے جب دیکھا کہ حضرت عمرؓ بھی اس پر تہمت لگا رہے ہیں تو اس عریف نے میرے بارے میں کہا **"أنه رجل صالح"** کہ ابو جمیلہ تو نیک آدمی ہیں ان کے بارے میں آپ ایسا گمان نہ کریں کہ دھوکہ بازی کریں گے۔

"قال كذلك" حضرت عمرؓ نے فرمایا اچھا ایسا ہے یعنی تم گواہی دیتے ہو کہ یہ اچھے نیک آدمی ہیں۔

"اذهب وعلينا نفقة" پھر مجھ سے فرمایا جاؤ اس بچے کو لے جاؤ اور اس کا نفقہ ہمارے ذمے واجب ہے یعنی اس کا نفقہ ہم بیت المال سے ادا کریں گے۔

یہاں حضرت عمرؓ نے ابو جمیلہ کی تعدیل میں صرف ایک عریف کی بات کو معتبر مانا۔ معلوم ہوا کہ ایک آدمی کا تزکیہ کرنا کافی ہے اور یہی ترجمۃ الباب کا مقصد ہے۔

۲۶۶۲ ـ حدثني محمد بن سلام: حدثنا عبدالوهاب: حدثنا خالد الحذاء، عن عبدالرحمن بن أبي بكرة عن أبيه قال: أثنى رجل على رجل عند النبي ﷺ فقال: ((ويلك، قطعت عنق صاحبك)) قطعت عنق صاحبك، مرارا. ثم قال: ((من كان منكم مادحا أخاه لا محالة فليقل: أحسب فلانا والله حسيبه، ولا أزكي على الله أحدا، أحسبه كذا و كذا، إن كان يعلم ذلك منه))[أنظر: ۶۰۶۱، ۶۱۶۲] [۲۴]

روایت نقل کی ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص کی تعریف کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم نے اس کی گردن توڑ دی۔ مطلب یہ کہ ہوسکتا ہے اس تعریف کے نتیجے میں وہ عجب میں مبتلا ہو جائے۔

تزکیہ کا طریقہ

بعد میں فرمایا کہ کسی کی تعریف کرنی ہو یا کسی کا تزکیہ کرنا ہو تو یوں کہنا چاہئے کہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ ایسا ہے، میں نے اس کے اندر کوئی برائی نہیں دیکھی۔

"ولا أزكي على الله أحداً" اور میں اللہ تعالیٰ کے اوپر کسی کا تزکیہ نہیں کرتا۔ یعنی یہ نہیں کہتا کہ میرا

---

[۲۴] وصحيح مسلم، كتاب الزهد والرقائق، باب النهي عن المدح اذا كان فيه افراط وخيف منه فتنة، رقم: ۵۳۱۹، ۵۳۲۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الأدب، كتاب الأدب، باب في كراهية التمادح، رقم: ۴۱۷۱، وسنن ابن ماجة، كتاب الادب، باب المدح، رقم: ۳۷۴۴، ومسند أحمد، أوّل مسند البصريين، باب حديث أبي بكرة نفيع بن الحارث بن كلدة، رقم: ۱۹۵۲۶، ۱۹۵۶۳، ۱۹۵۶۸، ۱۹۵۸۱، ۱۹۶۰۷.

فیصلہ ہی اللہ تعالیٰ کو ماننا ہوگا بلکہ میں یہ کہتا ہوں کہ میرے علم کے مطابق اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تو کسی کا تزکیہ کرنا ہو تو اس طرح کرنا چاہئے کہ آدمی کہے کہ میں نے اس کے اندر کوئی برائی نہیں دیکھی۔ ہوسکتا کہ باطن میں کوئی برائی ہو جو اللہ تعالیٰ جانتا ہو۔

(۱۸) باب بلوغ الصبيان و شهادتهم

وقول الله تعالى: ﴿وَ إِذَا بَلَغَ الْأَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاذِنُوا﴾ [۲۵]

و قال مغيرة: احتلمت اونا ابن ثنتيى عشرةسنة. و بلوغ النساء الى الحيض لقوله عز و جل: ﴿وَ اللَّائِي يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِسَائِكُمْ﴾ الى قوله: ﴿أَنْ يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ [الطلاق: ۴] و قال الحسن بن صالح: أدركت جارة لنا جدة بنت إحدى وعشرين.

اکیس سال میں نانی بن گئی

حسن بن صالح کہتے ہے کہ میں نے اپنی پڑوسن کو پایا جو اکیس سال کی عمر میں نانی بن گئی تھی۔ وہ اس طرح کہ نو سال کی عمر میں بالغ ہوگئی، اسی وقت نکاح ہوگیا۔ دس سال کی عمر میں بچی پیدا ہوئی۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا کہ نو سال کی عمر میں بالغ ہوگئی اور نکاح کر دیا۔ دس سال کی عمر میں اس کی بچی پیدا ہوگئی تو اس طرح یہ اکیس سال کی عمر میں نانی بن گئی۔ [۲۶]

تو لڑکی کی اقل مدت بلوغ نو سال ہے۔ اگر اس میں اس کو حیض آجائے تو وہ بالغ سمجھی جائے گی۔

۲۶۶۴ ۔ حدثنا عبيد الله بن سعيد: حدثنا أبو أسامة قال: حدثني عبيد الله قال: حدثني نافع قال: حدثني ابن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ عرضه يوم أحد وهو ابن أربع عشرة سنة فلم يجزني، ثم عرضني يوم الخندق وأنا ابن خمس عشرة فأجازني. قال نافع: فقدمت على عمر بن عبد العزيز وهو خليفة فحدثته هذا الحديث فقال: إن هذا الحد بين الصغير والكبير، وكتب إلى عماله أن يفرضوا لمن بلغ خمس

---

۲۵ [النور: ۵۹]

۲۶ عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۵۳۷.

عشرة .[أنظر:۴۰۹۷] [۲۷]

لڑکے کے لئے اقل مدت بلوغ

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ مجھے احد کے دن پیش کیا گیا جبکہ میں چودہ سال کے تھا۔ آپ ﷺ نے قبول نہیں فرمایا۔ پھر جب خندق میں پیش کیا گیا جبکہ اس وقت میری عمر پندرہ سال تھی۔ تو اس وقت آپ ﷺ نے قبول فرمالیا۔

حضرت عمر بن العزیز رحمہ اللہ نے اسی کو بالغ اور نابالغ کے درمیان معیار بنایا ہے اور حنفیہ نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ اگر علامات بلوغ پندرہ سال تک ظاہر نہیں ہوئی یعنی احتلام نہیں ہوا تو پندرہ سال کے بعد بچے کو بالغ سمجھا جائے گا۔

۲۶۶۵ ۔ حدثنا علی بن عبد الله: حدثنا سفيان : حدثنا صفوان بن سليم ، عن عطاء ابن يسار عن أبی سعيد الخدری ﷺ ، يبلغ به النبی ﷺ قال :((غسل يوم الجمعة واجب علی كل محتلم)) (راجع ۸۵۸)

یہاں بالغ کے لئے "**محتلم**" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے اس سے استدلال کیا کہ بلوغ احتلام سے ہوتا ہے۔

(۱۹)باب سؤال الحاكم المدعی:هل بينة لک قبل اليمين

حدیث باب پہلے بھی گزر گئی ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ حاکم، مدعی علیہ کو یمین دینے سے پہلے مدعی سے پوچھے کہ تمہارے پاس کوئی بینہ ہے یا نہیں ؟

(۲۰)باب اليمين علی المدعی عليه فی الأموال والحدود

وقال النبی ﷺ:((شاهداک أو يمينه)) وقال قتيبة،حدثنا سفيان، عن ابن شبرمة: كلمنی أبو الزناد فی شهادة الشاهد ويمين المدعی فقلت : قال الله تعالیٰ﴿ وَاسْتَشْهِدُوا

---

[۲۷] صحيح مسلم ،كتاب الإمارة ،باب بيان سن البلوغ ، رقم :۳۴۷۳، وسنن الترمذی ،كتاب الجهاد من رسول الله، باب ماجاء فی حد بلوغ الرجل ومتی يفرض له ، رقم :۱۶۳۳ ، وسنن النسائی كتاب الطلاق ، باب فی الغلام يصيب الحد ، باب متی يقع طلاق الصبی ، رقم : ۳۳۷۷ ، وسنن أبی داؤد ، كتاب الحدود ، باب فی الغلام يصيب الحد ، رقم : ۳۸۲۷، و سنن ابن ماجة ،كتاب الحدود ، باب من لايجب عليه الحد ، رقم: ۲۵۳۳ ، ومسند احمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب ، رقم : ۴۴۳۲ .

شَهِيدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ...﴾ [٢٨] [البقرة: ٢٨٢] قلت: اذا كان يكتفى و بشهادة شاهد و يمين المدعى فمايحتاج أن تذكّر إحدا هما الاخرى ،ماكان يصنع بذكر هذه الاخرى؟

۲۶۶۸ ـ حدثنا ابو نعيم: حدثنا نافع بن عمر، عن ابن أبى مليكة قال: كتب ابن عباس رضى الله عنهما إلى: أن النبى ﷺ قضى باليمين على المدعى عليه [راجع: ۲۵۱۴]

"قضاء بيمين و شاهد" کے عدم جواز پر احناف کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ **"اليمين على المدعى عليه فى االاموال والحدود يمين"** یعنی یمین مدعی علیہ پر ہوگی۔ چاہے اموال کا معاملہ ہو یا حدود کا معاملہ ہو کیونکہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔ **"شاهداک"** اور **"يمينه"** مدعی سے فرمایا کہ تم دو گواہوں کے پیش کر دو یا مدعی علیہ کو قسم دی جائیگی۔ آپ ﷺ نے گویا فیصلہ کر دیا کہ یمین ہمیشہ مدعی علیہ پر ہوگی۔

امام بخاری اس سے اس بات پر استدلال کر رہے ہیں **"قضى بشاهد و يمين"** جائز نہیں ہے جو حنفیہ کا مسلک ہے۔ یعنی اگر مدعی کے پاس دو گواہ نہیں ہیں تو وہ یہ کہے کہ میرے پاس دو گواہ نہیں ہیں، اس لئے میں ایک گواہ پیش کرتا ہوں۔ ایک گواہ کی جگہ میں خود قسم کھاؤں گا۔ کہتے ہیں یہ جائز نہیں کیونکہ یمین مدعی کا وظیفہ نہیں ہے بلکہ مدعی علیہ کا ہے۔ اس پر مزید اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ ابن شبرمہ جو کوفے کے قاضی تھے، وہ کہتے ہیں کہ مجھ سے ابوالزناد نے شاہد ویمین المدعی کے مسئلے میں گفتگو کی۔ **"ابو الزناد قضاء بشاهد و يمين"** کے قائل تھے اور ابن شبرمہ قائل نہیں تھے۔ ابن شبرمہ کہتے ہیں **"قلت"** میں نے اس سے کہا کہ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **"واستشهدوا شهيدين من رجالكم فإن لم يكونا رجلين فرجل وامر اءتان ممن ترضون من الشهداء أن تضل إحداهما فتذكر إحداهما الاخرى"** کہ اگر مرد نہ ہوں تو ایک مرد، دو عورتوں کی شہادت لے لو اور عورتوں کی شہادت کے بارے میں فرمایا کہ ان میں سے ایک بھول جائے گی تو دوسری اس کو یاد دلائے گی۔

"فقلت" میں نے کہا **"إذا كان ليكتفى بشهادة شاهد و يمين المدعى"** اگر مدعی کی ایک گواہی اور یمین سے فیصلہ کرنا کافی ہو تو اس بات کی کیا ضرورت تھی کہ ایک عورت، دوسری عورت کو یاد دلائے۔ **"ما كان يصنع بذكره الاخرى؟"** دوسری کو ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کی جگہ پر یہ کہہ دیتے کہ ایک عورت ہو اور ایک یمین ہو۔ میں نے ابوالزناد کے خلاف یہ استدلال کیا۔

گویا امام بخاری رحمہ اللہ کو یہ استدلال بھی پسند آیا اور انہوں نے اس مسلک پر اپنا رجحان ظاہر کر دیا کہ قضاء بشاھد ویمین جائز نہیں اور یہی حنفیہ کا مسلک بھی ہے۔

"قضاء بیمین و شاهد" کے جواز پر ائمہ ثلاثہ کا استدلال

ائمہ ثلاثہ یہ کہتے ہیں کہ " **قضاء بیمین و شاهد** " جائز ہے اور وہ صحیح مسلم کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں، جس میں آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا " **قضى بيمين و شاهد** ".[۲۸]

احناف کی طرف سے جواب

عام طور پر حنفیہ کی طرف سے اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے جو نصاب شہادت بیان کیا ہے "**فاستشهدوا شهيدين من رجالكم** " یہ حدیث اس کے خلاف ہے اور خبر واحد ہے جبکہ خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی، لہٰذا اس میں تاویل کی جائے گی کہ وہ " **قضاء بیمین و شاهد** " ایسے معاملات میں ہوگا جہاں ایک آدمی کی گواہی بھی معتبر ہو جاتی ہے مثلاً امان الاسیر کے معاملے میں کیونکہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "**ذمة المسلمين واحدة يسعى بها ادناهم**" اگر کوئی ایک آدمی کسی کافر کو پناہ دے دے تو سارے مسلمانوں پر اس کو پناہ دینا لازم ہو جاتا ہے۔ تو وہاں ایک آدمی کی گواہی معتبر ہے۔ ہوسکتا ہے آپ ﷺ نے فیصلہ وہاں پر کیا ہو۔

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ " **قضى بشاهد و يمين** " کسی ایسے معاملے میں جہاں آپ ﷺ نے صلح کرائی ہو باقاعدہ عدالتی فیصلہ نہ ہو۔ تو یہ تمام احتمالات موجود ہیں اور ان کی موجودگی میں خبر واحد سے کتاب اللہ پر زیادتی نہیں ہوسکتی۔ حنفیہ عام طور پر یہ کہتے ہیں۔[۲۹]

لیکن یہ کہنا کہ " **قضى بشاهد و يمين** " کی حدیث خبر واحد ہے، یہ بات تحقیق کے خلاف ہے۔ میں نے "**تكملة فتح الملهم**" میں اس کے تمام طرق جمع کئے ہیں۔[۳۰] اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ خبر واحد نہیں بلکہ مشہور ہے۔ اور اس سے کتاب اللہ کی تخصیص ممکن ہے تو وہاں میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اصل حکم تو وہی ہے جو قرآن میں مذکور ہے کہ نصاب شہادت پورا کرنا چاہئے لیکن بعض حالات ایسے ہو جاتے ہیں جن میں دو گواہوں کا موجود ہونا ممکن ہی نہیں ہوتا۔

---

۲۸ صحيح مسلم، كتاب الاقضية : باب اليمين على المدعى عليه، رقم : ۳۲۲۸.

۲۹ تكملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۵۳، وأحكام القرآن للجصاص، ج: ۲، ص: ۲۴۷.

۳۰ تكملة فتح الملهم، ج: ۲، ص: ۵۵۶.

ایسی صورت میں لوگوں کے حقوق کو ضائع ہونے سے بچانے کے لئے " **قضیٰ بشاهد و یمین**" کی اجازت دی گئی ہے اور بیہقی کی ایک روایت سے اس بات کی تائید بھی ہوتی ہے۔[۳۱]

تو گویا" **قضاء بشاهد و یمین**" یہ ایک استثنائی حالت ہے کہ جب کسی خاص جگہ دو گواہوں کی موجودگی ممکن نہ ہو اور لوگوں کے حقوق ضائع ہونے کا اندیشہ ہو اس وقت " **قضاء بشاهد و یمین**" کی گنجائش ہے۔

(۲۱) باب إذا ادعی أو قذف فله أن یلتمس البینة و ینطلق لطلب البینة

۲۶۶۸ ـ حدثنا أبو نعیم : حدثنا نافع بن عمر، عن ابن أبی ملیکة قال: کتب ابن عباس رضی الله عنهما الی : أن النبی ﷺ قضی بالیمین علی المدعی علیه [راجع: ۲۵۱۴]

(۲۲) باب الیمین بعد العصر

۲۶۷۲ ـ حدثنا علی بن عبدالله: حدثنا جریر بن عبدالحمید، عن الأعمش، عن أبی صالح، عن أبی هریرة ﷺ قال: قال رسول الله ﷺ : ((ثلاثة لا یکلمهم الله ولا ینظر إلیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب ألیم: رجل علی فضل ماء بطریق یمنع منه ابن السبیل ورجل بایع رجلا لا یبایعه إلا للدنیا : فان أعطاه ما یرید وفی له وإلا لم یف له، ورجل ساوم رجلا بسلعة بعد العصر فحلف بالله لقد أعطی بها کذا و کذا فاخذها)). [راجع: ۲۳۵۸]

حدیث کی تشریح

بعد العصر کی قید کوئی قید نہیں ہے بلکہ یہ شدت بیان کرنے کے لئے ہے کہ عصر کے بعد کا وقت ایسا ہوتا ہے جس میں ملائکہ لیل ونہار جمع ہوتے ہیں اور بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں اعمال اٹھائے جاتے ہیں ایسی حالت میں اگر کوئی قسم اٹھائے تو وہ قسم اور زیادہ موکد ہو جاتی ہے، اس لئے بعد العصر فرمایا' ورنہ اگر بعد العصر کے علاوہ کسی اور وقت میں جھوٹی قسم کھائے گا، تب بھی گناہ ہوگا۔

یہاں منشاء یہ ہے کہ یمین کے لئے زمانہ کے اندر تخصیص کرنا کہ قاضی یہ کہے کہ میں تم سے عصر کے بعد قسم لوں گا کیونکہ وہ وقت زیادہ مقدس ہے یا جمعہ کے دن لوں گا تو کہتے ہیں کہ ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔

حنفیہ کے ہاں تغلیظ بالزمان یا تغلیظ بالمکان نہیں بلکہ جیسا بھی موقع ہو قاضی قسم لے سکتا ہے۔

---

[۳۱] سنن بیهقی الکبری، ج: ۱۰، ص: ۲۵۲. (مکة المکرمة)

(۲۳) باب يحلف المدعى عليه حيثما وجبت عليه اليمين ، ولا يصرف من موضع إلى غيره.

"قضى مروان باليمين على زيد بن ثابت على المنبر فقال: أحلف له مكاني ، فجعل زيد يحلف وأبى أن يحلف على المنبر ' فجعل مروان يعجب منه وقال النبی ﷺ : ((شاهداک أو يمينه)) ولم يخص مكانا دون مكان".

اس ترجمۃ الباب سے امام بخاری رحمہ اللہ کا مقصد یہ ہے کہ مدعی علیہ پر تو بالا جماع یمین واجب ہو جاتی ہے جب مدعی بینہ نہ پیش کر سکے لیکن کیا قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یمین کو مغلظ کرنے کے لئے کسی خاص جگہ کا انتخاب کرے اور مدعی علیہ کو مجبور کرے کہ اس جگہ پر جا کر قسم کھاؤ' مثلاً مسجد میں منبر پر۔

حنفیہ کا مسلک

امام بخاری رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ **"یحلف المدعی علیه حیثما علیه الیمین"** جہاں پر یمین واجب ہوئی ہے، وہیں پر اس کو قسم دی جائے گی۔ **"لا یصرف من موضع الی غیره"** اور ایک جگہ سے دوسری جگہ اس کو نہیں لے جایا جائے گا۔ یہی حنفیہ کا مسلک بھی ہے۔

امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کا مسلک

امام شافعیؒ اور امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ قاضی کو تغلیظ کرنے کے لئے زمان کے منتخب کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے اور مکان کے منتخب کرنے کا بھی اختیار حاصل ہے۔

زمان کا ذکر پیچھے بعد العصر میں آیا اور مکان کا ذکر اس باب میں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا ہے کہ مروان نے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو منبر کے اُوپر یمین دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

زید بن حارث رضی اللہ عنہ کا ایک مقدمہ ان کے پاس آیا۔ وہ مدعی علیہ تھے، مروان حاکم تھا، اس نے کہا کہ منبر پر جا کر قسم کھاؤ۔ **"فقال احلف له مکانی"** زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں اپنی جگہ پر قسم کھاؤں گا۔ **"فجعل زید یحلف۔"** حضرت زید رضی اللہ عنہ وہیں اپنی جگہ پر قسم کھانے لگے۔ **"وأبى أن یحلف على المنبر ، فجعل مروان یعجب منه"** مروان اس سے تعجب کرنے لگا کہ زید بن ثابت رضی اللہ عنہ میری بات کیوں نہیں مان رہے ہیں۔

تو حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا جو مسلک تھا، وہ حنفیہ کا مسلک ہے اور مروان وغیرہ کا جو مسلک تھا وہ شافعیہ وغیرہ کا مسلک ہے۔[۳۲]

"وقال النبی ﷺ شاهداک أو يمينة" حدیث پیچھے گزر چکی ہے **"ولم يخص مكانا دون مكان"** آپ نے کی جگہ کی تخصیص نہیں فرمائی۔ معلوم ہوا کہ جگہ کی تخصیص کرنے کی ضرورت نہیں۔

(۲۴) باب اذا تسارع قوم فی الیمین

۲۶۷۴ ـ حدثنی اسحاق بن نصر: حدثنا عبد الرزاق: أخبرنا معمر، عن همام، عن أبی هريرة رضی اللہ عنہ**: أن النبی ﷺ عرض علی قوم اليمين فاسرعوا فأمر أن يسهم بينهم فی اليمين أيهم يلحف.**

یہ حدیث مشکل ترین حدیثوں میں سے ایک حدیث ہے۔ یہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک پوری قوم پر یمین پیش کی یعنی بہت سے آدمی تھے۔ **"فاسرعوا"** ان میں سے ہر ایک قسم کھانے کے سلسلے میں جلدی کرنے لگا آپ ﷺ نے حکم دیا کہ ان کے درمیان قرعہ کیا جائے، جس کا نام قرعہ میں نکل آئے، وہ پہلے قسم کھائے۔

"أيهم يحلف" کی کیا صورت ہے؟

"أيهم يحلف" اب ایسی صورت جس میں سب پر یمین واجب ہو تو قرعہ اندازی کی جائے کہ کون قسم کھائے؟ وہ کون سی صورت ہو سکتی ہے، یہ بڑا مسئلہ بن گیا، اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

بہت سے شراح نے بہت سی صورتیں تکلف کر کے نکالی ہیں۔ مثلاً یہ صورت بیان کی ہے کہ ایک ہی چیز دو آدمیوں کے مشترک قبضہ میں ہے۔ مدعی نے یہ دعویٰ کیا کہ میری ہے، دونوں مشترک طور پر مدعی علیہ بن گئے۔ دونوں پر یمین آگئی اب کسی ایک کی یمین کے لئے قرعہ اندازی کی گئی۔

مگر یہ بات حنفیہ اور اکثر فقہاء کے ہاں جو اصول ہے اس کے اعتبار سے بھی درست نہیں بنتی، اس واسطے کہ اگر دونوں کو قسمیں دی جائیں اور دونوں قسمیں کھالیں تو وہ چیز دونوں کے درمیان مشترک ہوگی، لہٰذا ایک کو قسم کے لئے منتخب کرنے کی یہ صورت بھی نہیں بنتی۔

تو پھر وہ کیا صورت بن سکتی ہے جس میں قرعہ اندازی کر کے فیصلہ کیا جائے؟

میری نظر میں واللہ اعلم یہ ہے کہ قسم تو دونوں پر واجب تھی اور دونوں سے لینی تھی لیکن قرعہ اندازی اس

---

[۳۲] عمدة القاری ج: ۹، ص: ۵۵۴.

لئے کی گئی کہ قسم دونوں میں سے پہلے کس سے لی جائے یہ درست ہے۔

(۲۵) باب: قول الله تعالى:

﴿ إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللهِ وَ أَيْمَانِهِمْ ثَمَناً قَلِيْلاً أُولٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللهُ وَ لَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴾ [۳۳]

۲۶۷۵ ـ حدثني اسحاق :أخبرنا يزيد بن هارون :أخبرنا العوام: حدثني أبراهيم أبو اسماعيل السكسكي :سمع عبدالله بن ابی أوفى رضی الله عنهمايقول :أقام رجل سلعته فحلف بالله لقد أعطى بها مالم يعطها. فنزلت ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِاللهِ وأَيْمَانِهِمْ ثَمَناًقَلِيْلاً﴾ وقال ابن أبي أوفى :الناجش آكل رباخائن. [راجع:۲۰۸۸]

"لقد اعطى بها مالم يعطها" یعنی اس نے اس چیز کوخریدنے کے لئے رقم دی ہے جوحقیقت میں اس نے نہیں دی یعنی یہ کہے کہ میں نے اتنے میں خریدی ہے حالانکہ اتنے میں نہیں خریدی تھی۔

(۲۶) باب: كيف يستحلف؟

قال تعالى: ﴿يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ [التوبة: ۶۲] وقول الله عزوجل :﴿ثُمَّ جَاؤُكَ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَاناً وَ تَوْفِيْقاً﴾ [۳۴] يقال : بالله ، وتالله وتالله . وقال النبي ﷺ :((ورجل حلف بالله كاذبا بعد العصر)). ولا يحلف بغير الله.

اس باب میں ہے کہ استحلاف میں صرف اللہ تعالیٰ کی قسم دی جائے گی۔ اب اس میں الفاظ ہیں باللہ، تاللہ و واللہ، یہ سب الفاظ قسم کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں۔

(۲۷) باب من أقام البينة بعد اليمين

"وقال النبي ﷺ :((لعل بعضكم ألحن بحجته من بعض)) وقال طاوس وابراهيم و شريح : البينة العادلة أحق من اليمين الفاجرة".

۲۶۸۰ ـ حدثنا عبدالله بن مسلمة ، عن مالک ، عن هشام به عروة ، عن ابي عن زينب، عن أم سلمة رضي الله عنها: أن رسول الله ﷺ قال : ((انكم تختصمون إلى و لعل بعضكم ألحن بحجته من بعض ، فمن قضيت له بحق أخيه شيًا بقوله فإنما أقطع له قطعة من النار فلا يأخذها)) [راجع : ۲۴۵۸]

[۳۳] [آل عمران: ۷۷] [۳۴] [النساء ۶۲]

فرمایا کہ جس نے یمین کے بعد بینہ قائم کردیا معنی یہ ہے کہ عدالت میں ایک مقدمہ پیش ہوا۔ قاضی نے مدعی سے مطالبہ کیا کہ تمہارے پاس بینہ ہے تو لاؤ، اس وقت مدعی کے پاس بینہ نہیں تھا۔ مدعی علیہ کو قسم دے دی گئی جب مدعی علیہ نے قسم کھالی تو مدعی علیہ کے حق میں فیصلہ کردیا گیا۔ بعد میں مدعی کہتا ہے کہ میرے پاس اس وقت بینہ نہیں تھا، اب آگیا ہے تو آیا اس سے دوبارہ بینہ لیا جائے گا یا نہیں؟ اس میں اختلاف ہے۔ اس واسطے امام بخاری رحمہ اللہ نے کسی بات پر جزم نہیں کیا کیونکہ اختلاف ہے۔

یمین کے بعد بینہ قبول ہوگا یا نہیں؟

حنفیہ کا مسلک

اس باب میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر وہ یہ کہے کہ اس وقت بینہ موجود نہیں تھا، اس واسطے نہیں پیش کرسکا، اب پیش کرتا ہوں تو اس کا بینہ قبول کرلیا جائے گا۔ [۳۵]

امام مالک رحمہ اللہ کا مسلک

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جس وقت اس پر بینہ پیش کیا گیا تھا، اس وقت اس کے علم میں تھا کہ فلاں گواہی دے سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اس نے گواہ کو پیش نہیں کیا تو اب فیصلہ کرنے کے بعد اس کو بینہ پیش کرنے کا حق نہیں۔ [۳۶]

لیکن اگر اس کو پتہ نہیں تھا کہ گواہی دینے کے لئے فلاں گواہ موجود ہے، اس لئے اس نے پیش نہیں کیا تھا تو پھر اس کا بینہ قبول کیا جا سکتا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان بھی یہی ہے کہ اگر بعد میں بھی بینہ مل جائے تو اس کو قبول کرلیا جائے گا۔ اس میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے ارشاد **"لعل بعضکم"** سے استدلال کیا۔

وہی ام سلمہ رضی اللہ عنہا والی حدیث ہے جو پہلے گزرچکی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کسی نے حجت پیش کرکے مجھ سے کوئی فیصلہ کرالیا اور اس کے حق میں، میں نے فیصلہ کردیا حالانکہ حقیقت میں وہ چیز اس کی نہیں تھی تو میں اس جہنم کا ایک ٹکڑا دینے والا ہوں گا یعنی اس کے حق میں وہ جہنم کا ٹکڑا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے یہ استدلال کررہے ہیں کہ باوجود یمین مدعی علیہ کو آگ کا ٹکڑا کھلایا جائے، اس سے بہتر ہے کہ اگر مدعی کا بینہ آگیا ہے تو اس کو پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔

[۳۵، ۳۶] عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۵۶۰.

اور طاؤس، ابراہیم اور شریح تینوں بزرگوں کا یہ کہنا ہے کہ **"البينة العادلة احق من اليمين الفاجرة"** بینہ عادلہ یمین فاجرہ کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے، کسی نے جھوٹی قسم کھالی۔ جس کی بنا پر فیصلہ کر دیا گیا ہے تو اس سے بہتر ہے کہ بینہ عادلہ جو بعد میں آیا ہے وہ پیش کر دیا جائے۔

(۲۸) باب من أمر بانجاز الوعد،

وفعله الحسن ﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ﴾ [مريم: ۵۴] وقضى ابن الأشوع بالوعد وأذكر ذلك عن سمرة بن جندب، وقال المسور بن مخرمة: سمعت النبي ﷺ و ذكر صهر اله فقال: وعدني فوفاني. قال أبو عبدالله: رأيت اسحاق بن إبراهيم يحتج بحديث ابن أشوع.

ترجمۃ الباب کا مطلب

یہ باب ان لوگوں کے موقف کو بیان کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے جو وعدہ کو پورا کرنے کا حکم دیتے ہیں۔

اس مسئلہ کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی دوسرے شخص سے کسی کام کا وعدہ کیا ہے تو آیا وہ وعدہ پورا کرنا واجب ہے یا نہیں اور اگر واجب ہے تو دیانتاً واجب ہے یا قضاءً واجب ہے اس میں فقہاء کرام کا اختلاف ہے۔

اختلاف فقہاء

عام طور پر ائمہ اربعہ کا یہ مسلک بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے نزدیک وعدہ کا پورا کرنا مکارم اخلاق میں سے ہے، مستحب اور مندوب ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی کراہت تنزیہہ شدیدہ رکھتی ہے۔ لیکن ایفاء وعدہ نہ دیانتاً واجب ہے نہ قضاءً واجب ہے۔

یہ مسلک عام طور پر ائمہ اربعہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اگرچہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی طرف اس مسلک کی نسبت مشکوک ہے۔

دوسرا مذہب یہ ہے کہ ایفاء وعدہ دیانتاً واجب ہے قضاءً واجب نہیں، اگر کوئی شخص نہ کرے تو گناہ گار ہوگا لیکن قاضی وعدہ کرنے والے کو وعدہ کے ایفاء پر مجبور نہیں کر سکتا۔

تیسرا مذہب جو امام بخاریؒ نے یہاں اختیار فرمایا ہے اور اس کو حضرت سمرہ بن جندب ؓ سے روایت کیا ہے اور ساتھ ابن الاشوع کا بھی یہی مسلک بیان کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وعدہ کا ایفاء دیانتاً بھی واجب ہے اور

قضاء بھی واجب ہے۔

امام مالکؒ کا جو مسلک پہلے مذہب والوں کے ساتھ نقل کیا گیا ہے، اس کے بارے میں، میں نے عرض کیا کہ وہ مشکوک ہے، اس لئے کہ امام مالکؒ کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔

لیکن عام طور سے مالکیہ نے جس کو اختیار کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اگر وعدہ کرنے والے نے موعودلہ کو کسی کام کے کرنے پر اپنے وعدہ کے ذریعے آمادہ کرلیا اور موعودلہ اس کے وعدہ کی بنیاد پر وہ کام کرگزرا تو اب واعد کے لئے وعدہ کا ایفاء دیانتاً بھی واجب ہے اور قضاء بھی واجب ہے۔

جیسے مثلاً کسی نے کہا کہ تمہارا مکان بہت بوسیدہ ہوگیا ہے، تم اس کو منہدم کرکے دوبارہ بنالو، کہنے لگا کہ میرے پاس پیسے ہی نہیں ہیں، میں کہاں سے بناؤں؟

اس نے کہا **"اھدم دارک وانا اصرف"** گھر ڈھادو پیسے میں دوں گا۔

اس نے اس کے کہنے پر گھر ڈھادیا تو کہتے ہیں کہ واعد کے ذمے ایفاء وعدہ دیانتاً بھی واجب ہوگیا اور قضاء بھی واجب ہوگیا۔ بعد میں اگر وہ کہے کہ میں تو پیسے نہیں دیتا تو صاحب مکان اسکو قاضی کے پاس لے جاکر قاضی کے ذریعے اس سے قرض وصول کرسکتا ہے۔ یہ امام مالکؒ کے ہاں تفصیل ہے۔

البتہ اگر اس کے وعدہ نے موعودلہ کو کسی خاص مسؤلیت میں نہیں مبتلا کیا تو پھر وعدہ کا ایفاء قضاء واجب نہیں ہوگا۔

اور میں نے عرض کیا تھا کہ پہلے قول کی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف بھی نسبت بھی مشکوک ہے۔ اس واسطے کہ امام ابوبکر جصاصؒ نے آیت کریمہ :

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللہِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o﴾ [۳۷] کے تحت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا یہ مسلک بیان کیا ہے کہ وعدہ کا ایفاء واجب ہے۔ [۳۸]

لیکن عام طور سے ہماری (حنفیہ کی) ساری کتابوں میں جو مسئلہ لکھا ہوا ہے وہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اگر واجب ہے تو دیانتاً واجب ہے، قضاء واجب نہیں۔

آج کل کی بیع وشراء کا ایک اہم مسئلہ آرڈر دینا

یہ مسئلہ اس لئے تفصیل سے ذکر کیا جارہا ہے کہ ہمارے زمانے میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے، بیع وشراء کے بڑے معاملات میں وعدہ کی بنیاد پر معاملہ کیا جاتا ہے۔

---

۳۷ سورة الصف، رقم الآية : ۲-۳.

۳۸ احکام القرآن للجصاص، ج:۵، ص: ۳۳۴.

پہلے زمانے میں بیع اس طرح منعقد ہوتی تھی کہ ایک نے کہا بعت دوسرے نے کہا اشتریت ،مبیع بھی موجود ہوتی ،تو موجود مبیع پر بیع وشراء کا معاملہ ہوگیا۔

لیکن موجودہ زمانے میں جو تجارتیں ہوتی ہیں خاص طور پر بین الاقوامی تجارت ، جہاں دوملکوں کے درمیان آپس میں تجارت ہوتی ہے،فرض کریں کہ ایک شخص جاپان سے بڑی تعداد میں کپڑا منگواتا ہے،اب ایک دم سے تو عقد منعقد نہیں ہوسکتا کیونکہ وہ پہلے آرڈر دیتا ہے کہ تم مجھے اتنا کپڑا روانہ کردو،جس وقت آرڈر دے رہا ہوتا ہے اس وقت بائع کے پاس اتنا کپڑا موجود نہیں ہوتا ، وہ اس کو کہیں سے فراہم کرے گا۔ پھر اس کو بھیجے گا اور ہماری فقہ کے اعتبار سے **"بیع مضاف الی المستقبل "** نہیں ہوسکتی کہ مستقبل میں فلاں تاریخ کے لئے آج سے بیع کرلی جائے یہ نہیں ہوسکتا۔ بیع کے لئے منجز ہونا ضروری ہے اور منجز ہونے کے لئے ضروری ہے کہ مبیع موجود ہو۔اب فرض کریں کہ مبیع موجود نہیں تو عقد تو نہیں ہوسکتا' لہٰذا محض عقد کا وعدہ ہوگا۔

کسی شخص نے کہا کہ مجھے روئی کی ایک لاکھ گانٹھیں چاہئیں ، وہ تم مجھے اس حساب سے بھیج دینا میں لے لوں گا۔اب اس کے پاس ایک لاکھ گانٹھیں موجود نہیں ہیں ۔ وہ کہیں سے لاکر جمع کرے گا اور پھر خریدار کی طرف بھیجے گا' اس لئے شروع میں ایک لاکھ گانٹھیں مہیا کرنے کا محض وعدہ ہوگا۔

اب وہ ایک لاکھ گانٹھیں مہیا کرنے کے لئے بڑی رقم خرچ کرے گا ، بڑی محنت کرے گا اور جب وہ گانٹھیں لے کر مشتری کے پاس آیا' اس نے کہا کہ میں نہیں خریدتا کسی کی تو جان گئی آپ کی ادا ٹھہری۔

تو ایک لمحہ کے اندر اس نے اس کی محنت کو غارت کردیا اگر ہر شخص کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ وعدہ کا ایفاء لازم نہیں ہے تو اس دوران بڑی بڑی تجارتوں میں سخت دشواری ہوگی۔

سپلائی کانٹریکٹ (supply contract)

آج کل ایک مستقل عقد ہوتا ہے جس کو عربی میں **"عقد التورید"** اور انگریزی میں ''سپلائی کانٹریکٹ'' **(Supply Contract)** کہتے ہیں۔

مثلاً ایک ہوٹل ہے اور ہوٹل والے کو روزانہ آٹا ، چاول وغیرہ کی ایک خاص مقدار کی ضرورت ہے۔ اب اس کو اس بات کی ضرورت ہے کہ وہ کسی سے مستقل معاہدہ کرلے کہ یہ مجھے روزانہ آٹا اور دوسری اشیاء کی اتنی مقدار فراہم کرے گا۔ایک شخص نے وعدہ کرلیا کہ ہاں بھائی میں فراہم کروں گا۔

لیکن جب فراہم کرنے کا وقت آیا تو وہ کہتا ہے کہ میں نہیں دیتا۔ ہوٹل میں گاہک کھانا کھانے کے لئے بھوکے بیٹھے ہیں اور یہ سامان بھی لے کر نہیں آیا تو ہوٹل والا حرج میں مبتلا ہوگیا۔

لہٰذا اگر عقود کے اندر وعدہ کے ایفاء کو لازم نہ کیا جائے تو اس سے شدید تنگی اور شدید حرج ہونے کا

اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اگر یہ کہا جائے کہ ہر وعدہ قضاءً لازم ہے تو اس میں بھی حرج ہے، اس لئے کہ بہت سے وعدے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کو عدالت تک لے جانا خواہ مخواہ کا طول عمل بھی ہے اور اس سے فریقین کو تکلیف بھی پہنچ سکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نے وعدہ کرلیا کہ میں تمہیں کل قرضہ دوں گا، اب وہ کسی وجہ سے نہیں دے سکا تو اس کو عدالت میں کھینچ کر لائے کہ اس نے قرضہ دینے کو کہا تھا اور نہیں دیتا۔ اسی طرح ایک شخص نے وعدہ کرلیا کہ میں تمہارے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کردوں گا بعد میں اس کی رائے بدل گئی۔ اپنی بیٹی کے مستقبل کی خاطر اس نے رائے بدل لی کہ میں اپنی بیٹی کا تمہارے ساتھ نکاح نہیں کرتا۔ اب اس کو پکڑ کر عدالت میں لے جائے کہ جی میرا نکاح کراؤ تو یہ سب ایسی باتیں ہیں کہ ان کو عدالت تک لے جانا ایک مستقل پریشانی کا سبب ہے۔ لہٰذا ہر وعدہ کو قضاءً لازم کرنا یہ بھی درست نہیں۔ چنانچہ فقہاء حنفیہ نے یہ کہا ہے کہ **"المواعید تلزم لحاجة الناس"** جہاں لوگوں کی حاجت ہو وہاں وعدہ کو لازم کیا جائے۔

آج کل اس کا معیار یہ ہوسکتا ہے کہ یا تو حکومت کی طرف سے کوئی قانون بنا دیا جائے کہ فلاں قسم کے وعدے لازم ہوں گے اس قانون کی پیروی کرنی ہوگی یا جس وقت فریقین آپس میں وعدہ کر رہے ہیں اس وعدہ کے اندر یہ طے کرلیا کہ یہ وعدہ ہم پر قضاءً بھی واجب ہوگا۔ اس کی جو کوئی تحریر تیار کی جاتی ہے اس میں اس بات کی صراحت کردیں اس صورت میں وعدہ لازم ہوجانا چاہئے۔

ترجمۃ الباب کی تشریح

فرمایا کہ **"باب من أمر بانجاز الوعد وفعله الحسن"**۔

کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے بھی یہی کام کیا یعنی وعدہ پورا کرنے کا فتویٰ دیا اور وعدہ پورا کرنے کو قضاءً لازم قرار دیا۔ بعض لوگوں نے کہا یہ فعلہ الحسن ہے مگر اس صورت میں بات نہیں بنتی **"فعلہ الحسن"** ہی صحیح ہے۔

آیت کریمہ ذکر کی

﴿ وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ ﴾

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف فرمائی کہ وہ صادق الوعد تھے۔

"وقضى ابن الأشوع بالوعد" اور ابن الاشوع یعنی سعید ابن عمرو ابن اشوع جو کوفہ کے قاضی تھے۔ انہوں نے وعدہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کیا۔

"وذكر ذلك عن سمرة بن جندب" رضی اللہ عنہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے انہوں نے یہی روایت کی کہ وعدہ کو پورا کرنا قضاءً واجب ہے۔

"وقال المسور بن مخرمة سمعت النبي ﷺ و ذكر صهرًا له" اور مسور بن مخرمہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ وہ اپنے ایک داماد (ابو العاص ؓ) کا ذکر رہے تھے۔ ان کے بارے میں آپ ﷺ نے تعریف کے طور پر فرمایا کہ "وعدني فوفاني" انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، پھر اس کو پورا کیا۔

"قال أبو عبدالله رأيت اسحق" امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اسحق بن ابراہیم کو دیکھا وہ ابن اشوع کی حدیث سے استدلال کرتے تھے یعنی ابن جندب ؓ والی حدیث سے تو ابن اشوع کے فیصلہ کو انہوں نے ایک طرح سے تسلیم کیا۔

آگے امام بخاری رحمہ اللہ نے متعدد احادیث نقل کی ہیں جن میں وعدہ کے ایفاء پر فضیلت ہے اور وعدہ کی خلاف ورزی پر وعید ہے۔ یہ سب اس بات پر دلالت کر رہی ہیں کہ وعدہ کی وفا لازم ہے۔

۲۶۸۴ ـ حدثني محمد بن عبد الرحيم : أخبرنا سعيد بن سليمان : حدثنا مروان بن شجاع ، عن سالم الأفطس ، عن سعيد بن جبير قال : سألني يهودي من أهل الحيرة : اى الأجلين قضى موسى؟ قلت : لا أدري حتى أقدم على حبر العرب فأساله. فقدمت فسألت ابن عباس فقال: قضى أكثرهما وأطيبهما ، إن رسول الله ﷺ إذا قال فعل. [39]

سعید بن جبیر ؓ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک یہودی نے پوچھا (جو حیرۃ کے رہنے والوں میں سے تھا) کہ موسی علیہ السلام نے دو مدتوں میں سے کونسی پوری کی تھی وہاں یہ فرمایا تھا کہ "ایما الاجلین قضیت فلاعدوان علی".

تو سعید بن جبیر ؓ کہتے ہیں کہ "قلت : لاأدری حتی أقدم علی حبر العرب فاسأله" مجھے تو پتہ نہیں ہے یہاں تک کہ میں عرب کے عالم کے پاس جاؤں اور ان سے پوچھوں اور مراد حضرت عبداللہ بن عباس ؓ تھے۔

کہتے ہیں کہ میں آیا اور آکر حضرت ابن عباس ؓ سے پوچھا تو انہوں نے کہا کہ "قضی اکثرهما واطیبهما" جو لمبی مدت تھی وہ پوری کی یعنی دس سال اور وجہ اس کی یہ بیان کی کہ "ان رسول الله ﷺ إذا قال فعل" اللہ کا رسول جب کوئی بات کہتا ہے تو کرتا ہے اور اس میں وہ کرتا ہے جو زیادہ افضل ہو اور افضل یہی تھا کہ دس سال پورے کرتے لہٰذا دس سال پورے کئے۔

(۲۹) باب: لا يسأل أهل الشرك عن الشهادة و غيرها

وقال الشعبي : لاتجوز شهادة أهل الملل بعضهم على بعض ، لقوله عزوجل : ﴿فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ [40] وقال أبو هريرة عن النبي ﷺ : ((لا تصدقوا أهل الكتاب ولا تكذبوهم. وقولوا : ﴿آمَنَّا بِاللهِ وَمَا أُنزِلَ﴾ [41])).

---

[39] انفرد به البخاري. [40] [المائدة: ۱۴] [41] [البقرة: ۱۳۶]

اس میں یہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ کافروں کی شہادت کس حد تک مقبول ہے اور کس حد تک نہیں؟

کافر کی شہادت میں فقہاء کرام کا مشہور اختلاف ہے

بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ کافر کی شہادت کسی بھی حالت میں قبول نہیں۔

بعض فقہاء فرماتے ہیں کہ کافر کی شہادت کافر کے خلاف معتبر ہے، مسلمان کے خلاف معتبر نہیں۔

پھر بعض کہتے ہیں کہ ہر کافر کی شہادت ہر کافر کے خلاف معتبر نہیں بلکہ اپنے اہل مذہب کے خلاف معتبر ہے مثلاً یہودی، یہودی کے خلاف گواہی دے تو معتبر ہے لیکن یہودی، نصرانی کے خلاف دے تو معتبر نہیں۔

بعض حضرات کہتے ہیں کہ مسلمان کے خلاف بھی اس وقت معتبر ہو سکتی ہے جب سفر میں کسی غیر مسلم کو گواہ بنایا گیا ہو، جہاں کوئی مسلمان موجود نہ ہو، خاص طور پر وصیت کے باب میں، چنانچہ قرآن کریم نے وصیت فی السفر کے بارے میں فرمایا **"و آخـران مـن غيـر كـم"** دو گواہ تمہارے مسلمانوں کے علاوہ تو کافروں کو بھی گواہ بنایا جا سکتا ہے۔[۴۲]

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وصیت فی السفر کے اندر غیر مسلموں کی گواہی مسلمان کے سلسلے میں بھی معتبر ہے۔[۴۳]

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کے ہاں مفتی بہ مسلک یہ ہے کہ مسلمان کے خلاف کسی حال میں معتبر نہیں اور کافر کے خلاف معتبر ہے۔[۴۴]

حدیث باب کی تشریح

"وقال الشعبی : لا تجوز شهادة أهل الملل بعضهم علىٰ بعض" جو مختلف مذاہب والے ہیں ان میں سے ایک کی شہادت دوسرے کے خلاف معتبر نہیں مثلاً نصاریٰ کی یہودیوں کے خلاف معتبر نہیں۔

"لقوله تعالىٰ: فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ".

کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے ان کے درمیان عداوت اور بغض پیدا کر دیا۔

اور حضرت ابو ہریرہ ﷺ نبی کریم ﷺ کا ارشاد نقل فرماتے ہیں کہ **" لا تصدقوا أهل الكتاب و**

[۴۲، ۴۳] عمدة القاری، ج:۹، ص:۵۶۵، وفیض الباری، ج:۳، ص:۳۹۴.

[۴۴] عمدة القاری، ج:۹، ص:۵۶۵، وفیض الباری، ج:۳، ص:۳۹۴.

لا تكذبوهم" یعنی اسرائیلیات جوخبریں دیتے ہیں ان میں نہ ان کی تصدیق کرو اور نہ تکذیب کرو۔

معلوم ہوا کہ ان کے کہنے سے کوئی علم حاصل نہیں ہوتا، جب علم حاصل نہیں ہوتا تو ان کی شہادت کیسے معتبر ہوگی، یہ مطلب ہے **"قولوآ آمنا بالله ومآ انزل الينا"** کہنے کا۔

۲۶۸۵ ۔ حدثنا يحيى بن بكير : حدثنا الليث ، عن يونس، عن ابن شهاب ، عن عبيد الله بن عبدالله بن عتبة ، عن عبدالله بن عباس رضى الله عنهما قال: يا معشر المسلمين، كيف تسألون أهل الكتاب ؟ وكتابكم الذى أنزل على نبيه ﷺ أحدث الأخبار بالله تقرؤنه لم يشب. وقد حدثكم الله أن أهل الكتاب بدلوا ما كتب الله و غيروا بأيديهم الكتاب فقالوا: ﴿هذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ لِيَشْتَرُوْا بِهِ ثَمَناً قَلِيْلاً﴾[۴۵] افلا ينهاكم ما جاء كم من العلم عن مساء لتهم ؟ ولا والله ما رأينا رجلا منهم قط يسألكم عن الذى أنزل عليكم. [أنظر: ۷۳۶۳، ۷۵۲۲، ۷۵۲۳][۴۶]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا، اے مسلمانو! تم اہل کتاب سے جاکر باتیں کیوں پوچھتے ہو۔ **"وكتا بكم الذى أنزل على نبيه ﷺ أحدث الأخبار بالله"** جبکہ تمہاری کتاب جوتمہارے نبی پر نازل ہوئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی سب سے آخری تازہ ترین کتاب ہے۔ **"تقرونه لم يشب"** اس کوتم پڑھتے ہوجس میں غلطی کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ **"وقد حدثكم الله"** اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتایا ہے کہ اہل کتاب نے توریت، انجیل میں جولکھا تھا اس میں تحریف کرڈالی ہے اور اپنے ہاتھوں سے کتاب میں تبدیلی کی ہے۔ انہوں نے خود کہا:

﴿ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللهِ لِيَشْتَرُوْا بِهِ ثَمَناً قَلِيْلا ﴾[۴۷]

ترجمہ: ''یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ لیویں اس پر تھوڑا سا مول''۔

مطلب یہ ہے کہ جوعلم تمہارے پاس کتاب اللہ کے ذریعے آیا ہے، کیا وہ تمہیں ان سے پوچھنے سے روکتا نہیں ہے؟

"والله ما راينا رجل منهم قط يسألكم عن الذى أنزل عليكم" توجب وہ تمہارے پاس آکر قرآن نہیں پوچھتے۔ توتم ان کے پاس پوچھنے کے لیے کیوں جاتے ہو۔

---

[۴۵] انفرد به البخارى. [۴۶] [البقرة: ۷۹] [۴۷] [البقرة: ۷۹]

(۳۰) باب القرعة في المشكلات

"وقوله عزوجل: ﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾ [۴۸] وقال ابن عباس: اقترعوا فجرت الأقلام مع الجرية وعال قلم زكريا الجرية فكفلها زكريا.

وقوله: ﴿فَسَاهَمَ﴾ أقرع ﴿فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِينَ﴾ [۴۹] من المسهومين. وقال أبو هريرة: عرض النبي ﷺ على قوم اليمين فاسرعوا. فأمر أن يسهم بينهم أيهم يحلف"

یہاں قرعہ کا ذکر اس لئے کیا کہ اس کو بھی بعض اوقات فی الجملہ فیصلہ کرنے میں کوئی نہ کوئی دخل حاصل ہو جاتا ہے۔

قرعہ کی حیثیت

قرعہ کے بارے میں قول فیصل یہ ہے کہ قرعہ کے ذریعے کوئی حق ثابت نہیں ہو سکتا: نہ کسی کا حق ثابت ہو سکتا ہے، نہ کسی کے حق کو اس کی بنا پر باطل کیا جا سکتا ہے۔

البتہ جہاں مختلف مستحقین موجود ہوں اور سب کا سبب استحقاق یکساں ہو، اور درجہ استحقاق بھی یکساں ہو اس وقت کسی ایک کو منتخب کرنے کے لئے قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے یا ایک شئ بہت سے افراد کے درمیان تقسیم کرنی ہے اور تقسیم میں درجہ کے اعتبار سے اور حق کے اعتبار سے سب برابر ہیں مثلاً ایک گھر ہے جو پانچ بھائیوں کے درمیان مشترک ہے اس کے پانچ مساوی حصے کر دیئے گئے، اب کون شخص کون سا حصہ لے اگر اس بارے میں باہمی رضامندی نہیں ہوتی (یا ابطال حق کے لئے قرعہ معتبر نہیں) لیکن تساوی کی صورت میں کسی ایک کو کسی خاص حصے کے لئے منتخب کرنے کی غرض سے قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں جتنے واقعات ذکر کئے وہ سب اسی پر محمول ہیں۔

پہلا واقعہ ذکر کیا کہ **﴿إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ﴾** حضرت مریم علیہا السلام کی کفالت کرنے کے لئے قرعہ اندازی کر رہے تھے کہ کون کفالت کرے گا، گویا ہر ایک کا سبب استحقاق تو مساوی تھا لیکن کفالت تقسیم نہیں کی جا سکتی تھی، اس لئے یہ طے کیا گیا کہ قرعہ اندازی کر کے یہ فیصلہ کیا جائے کہ کفیل کون بنے گا تو انہوں نے قرعے ڈالے۔

حضرت ابن عباس اس کی تفسیر فرماتے ہیں کہ **"فجرت الأقلام مع الجرية و عال قلم زكريا الجرية"** پانی میں قلم ڈالے تو سب کے قلم پانی کے ساتھ بہتے چلے گئے اور زکریا علیہ السلام کا قلم اوپر آ گیا۔ معلوم ہوا

---

۴۸ [آل عمران: ۴۴] ۴۹ [الصافات: ۱۴۱]

کہ زکریا علیہ السلام قرعہ اندازی میں جیت گئے "فکفلها زکریا و قوله فساهم ۔ اقرع".

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ کشتی میں سفر کر رہے تھے، ایک آدمی کو سمندر میں ڈالنا تھا، اب کس کو ڈالا جائے؟ اس کے لئے قرعہ اندازی کی گئی، "**فكان من المدحضين**" یعنی "**من المسهومين قال ابو هريرة** رضی اللہ عنہ ...." یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے کہ کئی لوگوں کو قسم کھانی تھی، آپ ﷺ نے ان کے درمیان قرعہ اندازی کی۔

حضرت یونس علیہ السلام کے واقعہ میں حق تو کشتی میں سوار ہونے کا سب کا تھا لیکن سب نے یہ بات بالتراضی طے کی کہ جب تک ایک آدمی کو نہیں نکالا جائے گا، تب تک سب کی جان نہیں بچ سکتی۔ آپس میں اس بات کی تراضی کرنی کہ ایک کو ڈوبنا ہے، اب جس کو ڈوبنا ہے اس کی تعیین کرنی ہے تو باہمی رضامندی سے یہ طریقہ طے کیا گیا کہ جس کا نام نکل آئے گا وہ اپنے حق سے دستبردار ہو جائے گا اور سمندر میں گر جائے گا۔ ایسا نہیں ہے کہ قرعہ اندازی کے ذریعے یہ کہا گیا ہو کہ تمہارا کشتی میں سوار ہونے کا حق نہیں ہے بلکہ قرعہ اندازی کے ذریعے اس آدمی کا انتخاب کیا جو اپنے حق سے دستبردار ہو جائے، جب نام نکل آئے گا تو وہ دستبردار ہوگا۔

۲۶۸۷ ۔ حدثنا أبو اليمان: ..... قالت: فنمت فأريت لعثمان عينا تجري فجئت إلى رسول الله ﷺ أخبرته فقال: ((ذلك عمله)). [راجع: ۱۲۴۳].

یہ حدیث پہلے جنائز میں گزر چکی ہے، البتہ جو اس کا آخری حصہ ہے اس میں کہتی ہیں کہ میں سوئی تو میں نے خواب میں حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا ایک چشمہ دیکھا جو بہہ رہا ہے۔ میں نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ کو سنایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ ان کا عمل ہے یعنی کوئی عمل ہے جو ان کے بعد بھی جاری ہے، صدقہ جاریہ سے آپ ﷺ نے تعبیر دی۔

باب سے اس حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کون کے گھر کا فیصلہ قرعہ سے کیا گیا تھا۔

كتاب الصلح

٢٦٩٠ - ٢٧١٠

۵۳۔ کتاب الصلح

(۱) باب ماجاء فی الاصلاح بین الناس

وقول الله عزوجل: ﴿لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّنْ نَجْوَاهُمْ إِلَّا مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا﴾[۱]۔

"وخروج الامام الى المواضع ليصلح بين الناس باصحابه".

۲۶۹۰ ۔ حدثنا سعيد بن أبى مريم :............من أصحابه يصلح بينهم.

یہ حدیث اس جملہ کی وجہ سے لائے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ صلح کرانے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔

۲۶۹۱ ۔ حدثنا مسدد : حدثنا معتمر قال : سمعت أبى أن أنساً ؓ قال: قيل للنبى ﷺ : لو أتيت عبدالله بن أبى، فانطلق إليه النبى ﷺ وركب حمارا فانطلق المسلمون يمشون معه ، وهى أرض سبخة. فلما أتاه النبى ﷺ فقال : إليک عنى، والله لقد أذانى نتن حمارک. فقال رجل من الأنصار منهم : والله لحمار رسول الله ﷺ أطيب ريحا منک ، فغضب لعبدالله رجل من قومه فشتما فغضب لكل واحد منهما أصحابه ، فكان بينهما ضرب بالجريد والنعال والأيدى، فبلغنا أنها نزلت ﴿وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا ۚ﴾[۲]، [۳]

"قال أبو عبدالله هذا مما انتخبت من مسدد قبل له يجلس ويحدث".

امام بخاریؒ فرماتے ہیں "حدثنا مسدد ......" یعنی مسدد سے یہ حدیث منتخب کرکے حاصل کر لی تھی۔ ان کے باقاعدہ محدث ہو کر بیٹھنے سے پہلے یعنی انہوں نے ابھی باقاعدہ درس دینا شروع نہیں کیا تھا۔

(۲) باب : ليس الكاذب الذى يصلح بين الناس

۲۶۹۲ ۔ حدثنا عبدالعزيز بن عبدالله: حدثنا ابراهيم بن سعد، عن صالح، عن ابن شهاب: أن حميد بن عبد الرحمن اخبره أن أمه أم كلثوم بنت عقبة أخبرته: أنها سمعت رسول

۱۔ [النساء:۱۱۴] ۲۔ [الحجرات: ۹]

۳۔ وفى صحيح مسلم ،كتاب الجهاد والسير ، باب فى دعاء النبى الى الله وصبره على اذى المنافقين ، رقم : ۳۳۵۷.

الله ﷺ يقول: ((ليس الكذاب الذى يصلح بين الناس فينمى خيرا أو يقول خيرا)). [۴]

یہ حدیث ہے کہ "ليس الكذاب الذى يصلح بين الناس" جو شخص لوگوں کے درمیان صلح کرائے وہ کذاب نہیں ہوتا "فينمى خيرا أو يقول خيرا" خیر کی بات ایک سے دوسرے تک پہنچائے یا یہ فرمایا کہ ایک وہ جو اصلاح کی غرض سے خیر کی بات کہے تو وہ جھوٹا نہیں ہوتا۔

مطلب یہ ہے کہ اگر دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کی غرض سے کوئی آدمی کوئی ایسی بات کہہ دے جو بظاہر خلاف واقعہ ہو تو یہ کوئی گناہ نہیں ہے۔

تین مواقع پر خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت ہے

تین مواقع ایسے ہیں جن میں حضور اقدس ﷺ سے خلاف واقعہ بات کہنے کی اجازت منقول ہے اور وہ تینوں باتیں امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت اسماء بنت یزید رضی اللہ عنہا کی روایت سے نقل کی ہیں۔ [۵]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کذب مباح نہیں ہوتا مگر تین چیزوں میں، ان میں سے ایک یہ فرمایا کہ "الرجل يحدث بامرا ته والمرأة تحدث زوجها" کوئی مرد اپنی بیوی سے کوئی ایسی بات کرے جو اسے خوش کرنے کے لئے ہو۔

دوسری مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے، تیسرے جنگ کے موقع پر دشمن سے اور جنگ کے لئے تو مستقل حدیث آئی ہے کہ "الحرب خدعة". [۶]

اختلاف فقہاء

کیا کذب صریح کی اجازت ہے؟ اب اس میں تھوڑا سا اختلاف ہے کہ ان تین مواقع پر جن میں کذب کی اجازت دی گئی ہے آیا کذب صریح کی اجازت ہے یا توریہ کرنے کی اجازت ہے؟

---

[۴] وفى صحيح مسلم ، كتاب البر والصلة والآداب ، باب تحريم الكذب وبيان المباح منه ، رقم : ۴۷۱۷ ، وسنن الترمذى ، كتاب البر والصلة عن رسول الله ، باب ماجاء فى اصلاح ذات البين ، رقم : ۱۸۶۱ ، وسنن ابى داؤد ، كتاب الأدب ، باب فى اصلاح ذات البين ، رقم : ۴۲۷۴ ، ۴۲۷۵ ، ومسند احمد ، من مسند القبائل ، باب حديث أم كلثوم بنت عقبة أم حميد بن عبدالرحمن ، رقم : ۲۶۰۱۰ ، ۲۶۰۱۵ .

[۵، ۶] سنن الترمذى ، كتاب البر والصلة عن رسول الله ، باب ماجاء فى اصلاح ذات البين ، رقم ۱۸۶۲ ، وسنن أبى داؤد ، كتاب الأدب ، باب فى اصلاح ذات البين ، رقم ۴۲۷۵ ، ومسند احمد ، من مسند القبائل ، رقم ۲۶۰۱۵ .

امام شافعی اور دیگر فقہاء کا قول

امام شافعیؒ اور دوسرے بہت سے فقہاء فرماتے ہیں کہ ان مواقع پر کذب صریح کی بھی اجازت ہے۔ [۷]

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور یہی کتب حنفیہ میں مذکور ہے کہ کذب صریح کی اجازت نہیں ہے، البتہ توریہ کی اجازت ہے۔ [۸]

توریہ کی تعریف

توریہ کے معنی ہیں کہ آدمی کوئی ایسی بات کہے جس کے ظاہری معنی کذب کے ہوں لیکن حقیقت میں اس کی مراد صحیح ہو جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے فلاں کو تمہارے لئے دعا کرتے ہوئے دیکھا ہے اور دل میں یہ نیت ہو کہ **"اللّٰھم اغفر للمومنین و المؤمنات"** کہتا ہے تو یہ توریہ ہوا اور یہ جائز ہے۔

یا مثلاً حضرت صدیق اکبرؓ نے ہجرت کو جاتے ہوئے حضور اقدس ﷺ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا تھا **"ھاد یھدینی السبیل"** رہنما ہیں جو مجھے راستہ دکھاتے ہیں تو مراد یہ تھی کہ دینی راہ نما ہیں اور ظاہری معنی یہ ہیں کہ یہ مجھے ظاہری راستہ دکھا رہے ہیں تو کذب سے اس قسم کا توریہ مراد ہے۔ اور یہ وہی ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حدیث میں فرمایا گیا کہ **"لم یکذب ابراھیم الا ثلاث کذبات"** وہاں بھی کذب سے توریہ مراد ہے۔

حدیث میں کذب سے توریہ مراد ہے اس کی دلیل میں یہ منقول ہے کہ **"المعاریض مندوحة عن الکذب"** کہ معاریض یعنی توریہ کرنے میں جھوٹ سے بچنے کا راستہ موجود ہے۔ جب راستہ موجود ہے تو پھر صریح جھوٹ کو نہیں اختیار کیا جائے گا۔ [۹]

حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا قول

البتہ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے اعلاء السنن میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کا قول نقل

---

۷ فیض الباری، ج:۳، ص: ۳۹۶.

۸ فیض الباری، ج:۳، ص: ۳۹۶.

۹ تفسیر القرطبی، ج:۹، ص: ۲۵۴، و صحیح البخاری، کتاب الأدب، (۱۱۶) باب: المعاریض مندوحة عن الکذب، و ابن حبان، ج:۱۳، ص: ۴۵.

فرمایا ہے کہ جھوٹ کا جائز نہ ہونا اس وقت ہے جب توریہ ممکن ہو لیکن جب توریہ ممکن نہ ہو تو اس وقت ان تین مواقع پر کذب صریح کی بھی اجازت ہے۔

یہ قول فیصل ذکر فرمایا کہ جب تک توریہ ممکن ہو کوئی ایسی بات سمجھ میں آ جائے جو صریح کذب نہ ہو، اس صورت میں کذب جائز نہیں، توریہ ہی کرنا ہوگا اور اگر توریہ ممکن نہ ہو تو پھر کذب صریح بھی جائز ہے۔

اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ویسے تو آپ ﷺ نے توریہ کی اجازت دی جیسے کعب بن اشرف کے قتل کے موقع پر حضرت محمد بن مسلمہؓ نے توریہ کیا تھا لیکن ایک موقع ایسا ہے جس میں کوئی تاویل نہیں ہو سکتی اور وہ حجاج بن علاط کا واقعہ ہے۔

جب وہ اجازت لے کر مکہ مکرمہ گئے تو انہوں نے جا کر اہل مکہ سے کہا کہ خیبر والوں نے مسلمانوں کو شکست دی ہے۔ مسلمان خیبر کی جنگ میں شکست کھا گئے ہیں، اب یہ ایسی چیز ہے جس میں توریہ کا کوئی امکان نہیں ہے، خالص خلاف واقع بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی اور صورت ممکن نہ ہو تو کذب صریح کی بھی اجازت ہو سکتی ہے۔

(۴) باب قول الله تعالىٰ:
﴿أَنْ يُّصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ﴾[۱۰]

۲۶۹۴ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد: حدثنا سفيان، عن هشام بن عروة، عن أبيه، عن عائشة رضي الله عنها ﴿وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوْزاً أَوْ إِعْرَاضاً﴾[۱۱] قالت: هو الرجل يرى من امرأته ما لا يعجبه كبرا أو غيره فيريد فراقها فتقول: أمسكني، واقسم لي ماشئت. قالت: ولا بأس إذا تراضيا. [راجع: ۲۴۵۰].

کوئی شخص اپنی بیوی کو بڑی عمر کی ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے پسند نہیں کرتا اور اس کو چھوڑنا چاہتا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ مجھے رکھ لو اور قسم میں جو چاہو مجھے دے دو۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی اور بیوی بھی رکھو اور مجھے بھی رکھو اور قسم کے اندر جو معاملہ میرے ساتھ چاہو کرو، یعنی میں مطالبہ نہیں کروں گی، اگر دونوں راضی ہوں تو صلح کا یہ طریقہ جائز ہے۔

(۵) باب إذا اصطلحوا على صلح جور فالصلح مردود

۲۶۹۵، ۲۶۹۶ ـ حدثنا آدم: حدثنا ابن أبي ذئب: حدثنا الزهري، عن عبيد الله بن عبدالله، عن أبي هريرة، وزيد بن خالد الجهني رضي الله عنهما قالا: جاء أعرابي فقال:

---

[۱۰] [النساء: ۱۲۸] [۱۱] [النساء: ۱۲۸]

يارسول الله، اقض بيننا بكتاب الله، فقام خصمه فقال: صدق' اقض بيننا بكتاب الله. فقال الأعرابي: إن ابني كان عسيفا على هذا فزنى بامرأته: فقالوا لي: على ابنك الرجم، ففديت ابني منه بمائة من الغنم ووليدة، ثم سألت أهل العلم فقالوا: إنما على ابنك جلد مائة و تعريب عام. فقال النبي ﷺ: ((لأقضين بينكما بكتاب الله، أما الوليدة والغنم فرد عليك. و على ابنك جلد مائة وتغريب عام. وأما انت يا أنيس ۔ لرجل ۔ فاغد على امرأة هذا فارجمها)). فغدا عليها أنيس فرجمها. [راجع: ۲۳۱۴، ۲۳۱۵].

یہاں شروع میں یہ ہوا تھا کہ انہوں نے کہا کہ تمہارے بیٹے پر رجم واجب ہے، انہوں نے رجم کو دور کرنے کے لئے ایک سو بکریاں اور ایک جاریہ دے کر صلح کر لی۔ یہ صلح شریعت کے خلاف تھی کیونکہ حد کے معاملے میں کوئی صلح نہیں ہوسکتی، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے **"باب إذا اصطلحوا على صلح جو رفهو مردود"** کہ اگر کوئی شخص صلح جور کرے تو وہ مردود ہے، صلح جور سے مراد ہے جو شریعت کے خلاف ہو۔

(۶) باب: كيف يكتب: هذا ما صالح فلان بن فلان و فلان بن فلان، وإن لم ينسبه إلى قبيلته أو نسبه

۲۶۹۹ ـ حدثنا عبيد الله بن موسى، عن إسرائيل، عن أبي اسحاق' عن البراء ﷺ قال: إعتمر النبي ﷺ في ذى القعدة فأبى أهل مكة أن يدعوه يدخل مكة، حى فاضاهم على أن يقيم بها ثلاثة ايام . فلما كتبوا الكتاب كتبوا: هذا ما قاضى عليه محمد رسول الله ﷺ ، فقالوا: لا نقر بها، فلو نعلم أنك رسول الله مامنعناك' لكن أنت محمد بن عبدالله. قال: ((أنارسول الله، وأنا محمد بن عبدالله))، ثم قال لعلي: ((امح: رسول الله)) قال: لا، والله لا أمحوك ابدا، فأخذ رسول الله ﷺ الكتاب فكتب: ((هذا ما قاضى عليه محمد بن عبدالله: لا يدخل مكة سلاح إلا في القراب، وأن لايخرج من أهلها بأحد إن أراد أن يتبعه' وأن لا يمنع أحدا من اصحابه أراد أن يقيم بها)). فلما دخلها ومضى الأجل أتوا عليا فقالوا: قل لصاحبك: اخرج عنا فقد مضى الأجل، فخرج النبي ﷺ فتبعتهم ابنة حمزة: يا عم يا عم ، فتنا ولها على فأخذ بيدها ، وقال لفاطمة : دونك ابنة عمك، احمليها، فاختصم فيها على وزيد و جعفر، فقال على: أنا أحق بها وهي ابنة عمي .وقال

جعفر: ابنة عمي و خالتها تحتي. وقال زيد: ابنة أخي، فقضى بها النبي ﷺ لخالتها، وقال: ((الخالة بمنزلة الأم)). وقال لعلي: ((أنت مني وأنا منك))، وقال لجعفر: ((اشبهت خلقي و خلقي))، وقال لزيد: ((أنت أخونا و مولانا)). [راجع: ۱۷۸۱].

حدیث کا مطلب

یہ صلح حدیبیہ کے لکھنے کا واقعہ ہے، اس میں یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ لفظ مٹا دو، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نہیں مٹاؤں گا۔ تو بظاہر یہاں حضور اقدس ﷺ کے حکم کی خلاف ورزی کی اور قاعدہ ہے کہ "**الأمر فوق الأدب**" امر کا درجہ ادب سے مقدم ہے۔

ادب کا تقاضا یہ تھا کہ رسول اللہ کا لفظ نہ مٹاتے اور امر یہ تھا کہ مٹاؤ۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی خلاف ورزی کیوں کی؟

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے رسول ﷺ کا لفظ کیوں نہیں مٹایا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ امر، امر ایجاب نہیں تھا، مطلب یہ ہے کہ مٹانا تو چاہتے تھے لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ ہی مٹائیں خاص طور پر یہ واجب کرنا مقصود نہیں تھا، اس واسطے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نہیں مٹاؤں گا۔

دوسرا جواب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات غلبۃ الحال میں کہی، وہ حضور اکرم ﷺ کی تعظیم اور تکریم میں اس درجہ مستغرق تھے کہ گویا اپنے آپ کو استطاعت سے خارج سمجھا کہ میں رسول اللہ کا لفظ مٹاؤں۔ ایسی صورت میں انسان معذور ہوتا ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ آپ کے مٹانے سے انکار کرنے کا ایک یہ فائدہ بھی تھا کہ مشرکین پر یہ بات واضح ہو کہ رسول اللہ ﷺ کے اصحاب آپ کے ایسے شیدائی ہیں کہ رسول اللہ کے لفظ کو مٹانے پر تیار نہیں۔

چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے خود مٹا دیا تو مقصد بھی پورا ہو گیا اور ساتھ ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا فدا کار ہونا، آپ ﷺ کا شیدائی ہونا یہ بھی کفار پر واضح ہو گیا۔

آگے ہے "**فکتب**" کتب کا فاعل حضور اقدس ﷺ ہیں کہ آپ ﷺ نے خود تحریر فرمایا "**هذا ما قاضى عليه محمد بن عبدالله**"۔

جب امی تھے تو پھر کیسے لکھا؟

اس میں کلام ہوا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ امی تھے تو پھر خود کیسے تحریر فرمایا؟

بعض حضرات نے یہ کہا ہے کہ امی ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ بالکل نہیں لکھ پاتے تھے بلکہ تھوڑا بہت لکھ سکتے تھے، البتہ جیسے ماہر کاتب لکھتا ہے، اس طرح نہیں لکھ پاتے تھے۔

بعض لوگوں نے یہ تاویل کی ہے کہ آپ ﷺ نے اس وقت تھوڑا بہت لکھ دیا۔

بعض حضرات نے کہا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ نے آپ کو معجزۃً لکھنے کی صلاحیت عطا فرمادی۔

لیکن زیادہ تر علماء کا رجحان یہ ہے کہ یہاں جو کتب کی نسبت رسول اللہ ﷺ کی طرف کی گئی ہے وہ اسناد مجازی ہے یعنی خود کسی دوسرے کو کہہ کر لکھوادیا۔ اس کو "کَتَبَ" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی قوی دلیل یہ ہے کہ اگر آپ ﷺ اس موقع پر خود لکھ دیتے تو مشرکین مکہ کو یہ کہنے کا بہانہ مل جاتا کہ آپ اپنے آپ کو امی کہتے ہیں حالانکہ آپ نے خود لکھ دیا۔ اس واسطے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے خود نہیں لکھا ہوگا بلکہ دوسروں سے لکھوایا ہوگا۔ اس کو راوی نے کتب سے تعبیر کر دیا۔[۱۲]

"لایدخل مکة سلاح إلا فی القراب" صلح یہ ہوئی تھی کہ آئندہ سال آ کر عمرہ کریں گے اور مکہ مکرمہ میں آئیں گے تو ہتھیار نیام میں ہوں گے اور اہل مکہ میں سے کسی کو نکال کر نہیں لے جائیں گے۔ اگر وہ ان کے ساتھ جانا چاہیں یعنی اگر مکہ مکرمہ کے مسلمانوں میں سے کوئی ساتھ جانا چاہے تو ساتھ نہیں لے جائیں گے۔

"وأن لایمنع أحدا من أصحابه أراد أن یقیم بها" اور ان کے اصحاب میں سے کوئی مکہ مکرمہ میں رہنا چاہیں تو روکیں گے نہیں۔ پھر جب آپ اگلے سال عمرۃ القضاء کے لئے تشریف لائے اور تین دن کی مدت پوری ہوگئی۔ تو یہ مشرکین حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور آ کر کہا کہ مدت گزر گئی ہے، لہٰذا اپنے صاحب سے کہو کہ چلے جائیں۔

آپ ﷺ نکلے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی حضور اقدس ﷺ کے ساتھ لگ گئی کہ میں بھی جانا چاہتی ہوں یا عم یا عم کہتے ہوئے۔ **"فتنا ولها علی"** حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو پکڑ لیا اور حضرت فاطمہؓ سے کہا ان کو لے لو یہ تمہارے چچا کی بیٹی ہے۔ میں نے اس کو اٹھا لیا ہے اب تم اس کی نگرانی کرو۔ **"فاختصم فیها علی وزید وجعفر"** بعد میں حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت زید رضی اللہ عنہ اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ تینوں کے درمیان اختلاف ہوا کہ اس کی ولایت کون لے اور کس ذریعے سے لے۔

---

۱۲ عمدة القاری ج: ۹ ص: ۵۸۸.

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **"أنا احق بها وهي ابنة عمي"** میں حقدار ہوں کیونکہ میری چچا کی بیٹی ہے۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **"ابنة عمي و خالتها تحتي"** میرے چچا کی بیٹی بھی ہیں اور ان کی خالہ میرے نکاح میں ہیں۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "ابنة اخی" یہ میرے بھائی کی بیٹی ہیں، میرے رضاعی بھائی کی بیٹی ہیں۔

"فقضى بها النبي ﷺ" نبی کریم ﷺ نے فیصلہ فرمایا کہ یہ اپنی خالہ کے پاس رہیں گی یعنی حضرت جعفرؓ کی اہلیہ کے پاس **"وقال: الخالة بمنزلة الأم"** اور فرمایا کہ خالہ، ماں کے درجہ میں ہوتی ہے۔

چونکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا دعویٰ قبول نہیں ہوا تھا، اس لئے آپ ﷺ نے ان سب کی دلجوئی فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا **"أنت مني وأنا منك وقال لجعفر أشبهت خلقي و خلقي"** اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ **"أنت أخونا و مولانا"**.

سوال: جب معاہدہ میں یہ بات طے ہوگئی کہ ساتھ کوئی نہیں جائے گا تو ان کو ساتھ کیسے لیا؟

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ وہ وعدہ مردوں سے متعلق تھا۔ عورتوں سے متعلق نہیں تھا، اس واسطے ساتھ رکھ لیا گیا۔

(۷) باب الصلح مع المشركين

" فيه عن أبي سفيان ، و قال عوف بن مالك عن النبي ﷺ : ((ثم تكون هدنة بينكم و بين بني الأصفر)) . و فيه سهل بن حنيف لقد رأيتنا يوم أبي جندل و أسماء و المسور عن النبي ﷺ ".

بنوالاصفر، رومیوں کو کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے قیامت کی ایک علامت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ کسی وقت تمہارے اور بنوالاصفر کے درمیان صلح ہوگی۔ معلوم ہوا کہ مشرکین سے صلح کرنا جائز ہے۔

۲۷۰۰ ـ و قال موسى بن مسعود : .... فجاء أبو جندل يحجل في قيوده فرده إليهم . [راجع : ۱۷۸۱]

آخر میں حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ آئے اس کی تفصیل کتاب الشروط میں ہے۔

باب قول النبي ﷺ للحسن بن علي رضي الله عنهما: ((إن ابني هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين))، وقوله جل ذكره: ﴿فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا﴾.

۲۷۰۴ ـ حدثنا عبد الله بن محمد : حدثنا سفيان عن أبي موسى قال: سمعت

الحسن يقول :استقبل والله الحسن بن علی معاوية بكتائب أمثال الجبال، فقال عمرو بن العاص:إنی لأری كتائب لاتولی حتی تقتل أقرانها. فقال له معاوية وكان والله خير الرجلين : أی عمرو، إن قتل هولاء هولاء وهولاء هولاء :من لی بأمور الناس ؟ من لی بنسائهم؟من لی بضيعتهم ؟ فبعث إليه رجلين من قريش من بنی عبد شمس : عبدالرحمن ابن سمرة،وعبدالله بن عامربن كريز، فقال :اذهبا إلی هذا الرجل فاعرضا عليه وقولا له واطلبا إليه، فأتياه فدخلا عليه فتكلما وقالا له وطلبا إليه .فقال لهما الحسن بن علی: إنا بنو عبدالمطلب قد أصبنا من هذا المال، وإن هذه الأمة قد عاثت فی دمائها قالا :فإنه يعرض عليک كذا وكذا، ويطلب إليک ويسألک . قال فمن لی بهذا؟ قالا: نحن لک به فماسألهما شيئاً إلا قالا: نحن لک به ،فصالحه فقال الحسن: ولقد سمعت أبابكرة يقول:رأيت رسول اللهﷺ علی المنبر والحسن بن علی إلی جنبه وهو يقبل علی الناس مرة وعليه أخری ويقول : ((إن ابنی هذا سيد ولعل الله أن يصلح به بين فئتين عظيمتين من المسلمين)). قال أبوعبد الله: قال لي علي بن عبدالله:إنما ثبت لنا سماع الحسن من أبی بكرة بهذا الحديث. [أنظر: ۳۶۲۹، ۳۷۴۶، ۷۱۰۹] [۱۳]

حدیث باب کی تشریح

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ **"استقبل والله الحسن بن علی معاوية بكتائب أمثال الجبال"** حضرت حسن رضی اللہ عنہ بن علی رضی اللہ عنہ، معاویہ رضی اللہ عنہ کے سامنے آئے تھے اور ان کا استقبال ایسے لشکروں سے کیا تھا جو پہاڑوں کی طرح تھے، بہت بڑی تعداد میں تھے۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو دیکھ کر کہا **"إنی لأری كتائب لاتولی"** کہ میں ایسے لشکر کو دیکھ رہا ہوں جو پیٹھ پھیر کر نہیں جاسکتے اور اگر **"لا تولی"** مجہول پڑھیں تو معنی ہوگا جن کا رخ نہیں پھیرا جاسکتا، **"حتی تقتل اقرانها"** جب تک کہ وہ اپنے اقران کو قتل نہ کردیں۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے لشکر کو دیکھ کر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کا یہ لشکر اتنا بڑا ہے کہ

---

[۱۳] وفی سنن الترمذی، كتاب المناقب عن رسول الله ، باب مناقب الحسن والحسين رضی الله عنهما ، رقم: ۳۷۰۶،وسنن النسائی ، كتاب الجمعة ، باب مخاطبة الامام رعيته وهو علی المنبر ، رقم :۱۳۹۳، وسنن أبی داؤد ، كتاب السنة ، باب ما يدل علی ترک الكلام فی الفتنة ، رقم :۴۰۴۳، ومسند احمد ، أول مسند البصريين ، باب حديث أبی بكرة نفيع بن الحارث بن كلدة ، رقم :۱۹۴۹۷ ، ۱۹۵۵۰ ، ۱۹۵۷۲ ، ۱۹۵۹۵ ، ۱۹۶۱۱ .

اب یہ شکست نہیں کھا سکتا بلکہ یہ اپنے اقران کو قتل کر کے ہی جائے گا۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا **"وکان واللہ خیر الرجلین"** اور یہ ان دونوں یعنی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بہتر آدمی تھے۔ انہوں نے فرمایا اے عمرو! **"إن قتل هولاء وهولاء وهولاء وهولاء"** اگر یہ ان کو قتل کریں اور وہ ان کو قتل کریں تو **"من لی بأمور الناس"** کون ہے جو مجھے لوگوں کے معاملات کا ذمہ دے۔ لوگوں کے معاملات ضائع ہوں گے تو میں کس پر حکومت کروں گا، کون لوگ ہوں گے جن کی میں کفالت کروں گا۔ **"من لی بنساء"** کون ہے جو مجھے ذمہ دے ان کی عورتوں کا کہ جب یہ خود قتل ہو جائیں گے تو ان کی عورتوں کا کیا بنے گا۔ **"من لی بضیعتهم"** کون ہے جو ان کی زمینوں کی دیکھ بھال کا ذمہ لے۔

"ضیعة" زمین کو کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ جب یہ قتل ہو جائیں گے تو ان کی زمینوں کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

مطلب یہ ہے کہ ان کو یہ خیال ہو رہا تھا کہ اتنے دنوں سے مسلمانوں کے درمیان خونریزی چل رہی ہے اور پھر دوبارہ یہی سلسلہ شروع ہو جائیگا کہ مسلمان ایک دوسرے کو قتل کریں گے تو اس کا انجام کیا ہوگا؟ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے خود اس موقع پر **"بعث إلیه رجلین من قریش"** حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے پاس قریش بنو عبد الشمس کے دو آدمی بھیجے۔ ایک عبد الرحمن بن سمرہ رضی اللہ عنہ دوسرا عبد اللہ بن عامر، **"فقال"** اور فرمایا **"اذهبا إلی هذا الرجل"** تم حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ **"فعرض علیه"** اور ان کے سامنے کچھ پیشکش کرو۔ **"وقولا له و اطلبا إلیه"** صلح کی پیشکش کرو اور ان سے صلح طلب کرو۔ **"فأتیاه فدخلا علیه وتکلما وقالا له و اطلبا إلیه فقال لهم الحسن بن علی"** حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ **"أنا بنوا عبدالمطلب"** ہم عبد المطلب کے بیٹے ہیں۔

معنی یہ ہے کہ بنو عبد المطلب کی یہ روایت ہے کہ وہ اپنے متعلقین کو نوازتے رہتے ہیں، احسانات سے لوگوں کی مدد کرتے ہیں، لوگوں کی ضروریات میں کھڑے رہتے ہیں، ان کے ہاں ھدایا پیش کرتے ہیں۔

"فقد اصبنا من هذا المال"۔ **"اصبنا"** کا مفعول محذوف ہے **"ای اصبنا الخلافة"** کہ ہم نے خلافت حاصل کی ہے اور صحیح طریقہ سے کی ہے یعنی ہم واقعی اس کے مستحق ہیں، **"من هذا المال"** بسبب اس مال کے جو ہم نے لوگوں پر صحیح طریقہ سے خرچ کیا یعنی ہم نے خلافت حاصل کی اور خلافت کے نتیجے میں بیت المال کا روپیہ جس طرح خرچ کرنا چاہئے تھا ہم نے اسی طرح خرچ کیا۔

بعض لوگوں نے اس کے دوسرے معنی یہ بیان کئے ہیں کہ ہم نے بنو عبد المطلب ہونے کے بعد اپنا جو مرتبہ حاصل کیا ہے، وہ اس طرح کیا ہے کہ اپنے طریقے کے مطابق لوگوں پر مال خرچ کرتے رہے ہیں۔ اب اگر

ہم خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو لوگوں کو ہم سے جو پیسے ملنے کی توقعات ہیں وہ پوری نہیں ہوں گی اور توقعات پوری نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ہماری خلافت سے دستبرداری پر راضی نہیں ہوں گے۔

"وإن هذه الامة قدعاثت في دمائها" اور یہ امت خون میں لتھڑی ہوئی ہے۔

"عاثت" کے معنی ہیں فاسد ہو جانا۔ اس امت میں خون کی وجہ سے فساد پیدا ہو گیا ہے یعنی آپس میں لڑائی کے نتیجے میں خونریزی ہوئی ہے اور ایک دوسرے کے خلاف قتل وقتال ہوا ہے۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے جذبات مشتعل ہیں۔ دوسری طرف اگر ہم خلافت سے دستبردار ہو جائیں تو اس کے نتیجے میں ان کو پیسے ملنا بند ہو جائیں گے تو وہ مشتعل جذبات پھر خونریزی شروع کر دیں گے۔

مقصد یہ ہے کہ اگر میں خلافت سے دستبردار ہو جاؤں گا تو مجھے جو مشتعل مزاج لوگ ہیں ان پر روپیہ پیسہ خرچ کرنا پڑے گا تا کہ ان کے جذبات ٹھنڈے کئے جا سکیں۔

"قالا فإنه يعرض عليك كذا و كذا" کہا تو پھر ٹھیک ہے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اتنے اتنے مال کی پیشکش کرتے ہیں کہ آپ یہ مال لے لیں اور اس کے ذریعے ان لوگوں کی امداد کریں۔

"ويطلب إليك و يسئلك قال فمن لي بهذا" حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس بات کا کون کفیل بنے گا کہ معاویہ رضی اللہ عنہ یہ ادا کر دیں گے **"قالا نحن لك به"** انہوں نے کہا کہ ہم کفیل ہیں۔

"فماسألهما شيئا إلاقالا نحن لك به" حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے جس چیز کا بھی مطالبہ کیا ان دونوں نے کہا کہ ہم کفالت لیتے ہیں **"فصالحه"** تو حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے صلح کر لی۔ دوسری روایات میں آتا ہے تین لاکھ اور ایک ہزار کپڑے اور کچھ غلاموں پر صلح ہوئی تھی۔[۱۴]

سوال: حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے جو رقم یا جو مال لیا ہے کیا ان کے لئے صلح پر مال کا لینا جائز تھا؟

جواب: علماء کرام نے اسی سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص دوسرے کے لئے اپنا حق چھوڑ دے تو حق سے دستبرداری کے معاوضے پر رقم وصول کر سکتا ہے اور اسی سے نزول عن الوظائف بمال کے جواز پر استدلال کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ حق سے دستبردار ہونے پر معاوضہ کا مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یہ رقم اپنی جیب سے ادا کی یا بیت المال سے ادا کی۔ اگر اپنی جیب سے ادا کی پھر تو ٹھیک ہے کہ **"نزول عن الوظائف بمال"** میں دوسرا شخص اپنے پیسے دے سکتا ہے۔

لیکن اگر بیت المال سے ادا کی تو پھر سوال یہ ہے کہ بیت المال تو مسلمانوں کا حق ہے۔ خود اپنی خلافت کے حصول کے لئے مسلمانوں کے بیت المال کو خرچ کرنا کیسے جائز ہوگا؟

جواب: بعض حضرات نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ انہوں نے یہ مال اپنے مال میں سے دیا تھا۔

---

[۱۴] **وأجاز معاوية الحسن بثلاث مائة ألف وألف ثوب وثلاثين عبدا ومائة جمل كماذكره في فتح الباري، كتاب الفتن، ج: ۱۳، ص: ۶۳، رقم ۷۱۰۹.**

لیکن روایات سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ روایات میں زیادہ تر یہ بات مذکور ہے کہ بیت المال سے ادا کیا تو شراح میں سے کسی نے اس سے تعرض نہیں کیا کہ بیت المال سے ادائیگی کا کیا جواز تھا؟ علامہ ابن بطالؒ کا قول صرف حافظ ابن حجرؒ نے کتاب الفتن، فتح الباری میں نقل کیا ہے اور وہاں ابن بطالؒ نے یہ بات فرمائی ہے کہ اصل میں نزول عن الوظائف اپنے ذاتی مال سے ہونا چاہئے، بیت المال سے نہیں ہونا چاہئے لیکن اگر کوئی یہ سمجھ کر کہ مسلمانوں کے درمیان سے فتنہ فرو کرنا ہے اور بیت المال کا مال استعمال کئے بغیر فتنہ فرو نہیں ہوسکتا تو اس صورت میں فتنہ فرو کرنے کے لئے بیت المال کا مال استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جو بیت المال سے مال دیا وہ اس لئے دیا، تا کہ فتنہ ختم ہو جائے اور مسلمانوں کی خونریزی بند ہو جائے۔ ظاہر ہے اگر ایسا نہ کرتے اور جنگ ہوتی تو جنگ میں ایک طرف خونریزی ہوتی اور دوسری طرف بیت المال کا روپے اس سے کہیں زیادہ خرچ ہوتا، لہٰذا اگر انہوں نے جنگ بند کرنے اور فتنہ کو ختم کرنے کے لئے بیت المال سے رقم دی تو اس میں کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے۔[۱۵]

آگے فرماتے ہیں **"قال الحسن"** یہ آپ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے بارے میں پہلے ہی بشارت دے دی تھی۔

(۱۱) باب فضل الإصلاح بين الناس والعدل بينهم

۲۷۰۷ - حدثنا إسحاق بن منصور: أخبرنا عبدالرزاق: أخبرنا معمر، عن همام، عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((كل سُلامَى من الناس عليه صدقة، كل يوم تطلع فيه الشمس، يعدل بين الناس صدقة)). [أنظر: ۲۸۹۱، ۲۹۸۹].

(۱۲) باب الصلح بين الغرماء وأصحاب الميراث والمجازفة في ذلك

"وقال ابن عباس: لا بأس أن يتخارج الشريكان، فيأخذ هذا دينا وهذا عينا، فإن توى لأحدهما، لم يرجع على صاحبه".

فرماتے ہیں کہ غرماء کے درمیان صلح کرنا اور اصحاب میراث کے درمیان صلح کرنا اور اس میں مجازفتہ کرنا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ:

"لا بأس أن يتخارج الشريكان فيأخذ هذا دينا وهذا عينا".

دو آدمی کاروبار میں شریک تھے۔ اب شرکت ختم کرنا چاہتے ہیں تو شرکت ختم کرنے میں یہ کر سکتے ہیں

---

۱۵ وفي فتح الباري، كتاب الفتن، رقم: ۷۱۰۹.

کہ ایک آدمی دین لے لے اور دوسرا عین لے لے۔ یعنی کاروبار کے دوسروں کے ذمے کچھ دیون ہیں، ایک آدمی کہتا ہے کہ میں دیون وصول کرلوں گا اور دوسرا آدمی اس کے بدلے عین لے لیتا ہے تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کے مطابق یہ کر سکتے ہیں۔

"فإن توی لأحدهما لم یرجع علی صاحبه" اگر دین توی ہو گیا یعنی دین وصول نہ ہوا تو پھر وہ اپنے صاحب سے رجوع نہیں کر سکے گا کیونکہ انہوں نے صلح کر لی تھی۔ ایک طریقہ شرکت کو ختم کر کے باقاعدہ تقسیم کرنے کا ہے اور یہ باقاعدہ تقسیم نہیں تھی بلکہ صلح تھی کہ میں دین لے لیتا ہوں، تم عین لے لو۔ اب اگر عین لینے کے بعد ہلاک ہو جاتا ہے تو دوسرا ذمہ دار نہیں۔ اسی طرح اگر دین لینے کے بعد وہ دین ہلاک ہو جائے تو دوسرا ذمہ دار نہیں ہے۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کا اس بارے میں یہ مسلک ہے کہ اگر معاملہ اس طرح ہوا کہ ایک شریک دوسرے کو کہتا ہے کہ جتنے واجب الوصول دیون ہیں وہ سب تمہارے، اور جتنے عین ہیں وہ سب میرے، تو یہ جائز نہیں۔ اس واسطے کہ یہ ایک طرح سے دین کی عین کے ذریعے بیع ہو گئی اور **"بیع الدین من غیر من علیه الدین"** جیسا کہ پیچھے گزرا ہے غرر ہونے کی وجہ سے ممنوع ہے۔

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دونوں شریک اس طرح کرلیں کہ بھائی کچھ عین تم لے لو اور کچھ میں لے لیتا ہوں اور کچھ دین تم لے لو، اور کچھ میں لے لیتا ہوں، تو دین میں بھی دونوں حصہ دار ہوتے ہیں اور عین میں بھی دونوں حصہ دار ہوتے ہیں۔ اگرچہ باقاعدہ ایک ایک پائی کا حساب کرنے کے بجائے مجازفۃً آپس میں تراضی سے کر لیتے ہیں کہ اتنے دین تم لے لو اور اتنے عین تم لے لو اور اتنے دین اور اتنے عین میں لے لیتا ہوں، اس کے بعد چاہے دین وصول ہو یا نہ ہو یہ تخارج جائز ہے۔

حنفیہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے اثر کا بھی یہی مطلب بیان کرتے ہیں کہ مکمل عین اور مکمل دین مراد نہیں ہے بلکہ کچھ عین اور کچھ دین دونوں شریک لے لیتے ہیں۔

اس صورت میں تخارج جائز ہے، اس کے بعد اگر دین وصول نہیں ہوتا تو کوئی بات نہیں، اس میں مبارات ہو گئی، تراضی کے ساتھ ایک نے دوسرے کو بری کر دیا صلح ہو گئی تو یہ جائز ہے۔

اور میراث میں بھی تخارج اسی طرح ہوتا ہے کہ ایک وارث کہتا ہے کہ میں صرف یہ چیز لے لیتا ہوں اور اپنے حصے سے دستبردار ہو جاتا ہوں یہ بھی جائز ہے۔[۱۶]

---

[۱۶] ویشترط عندنا عدم الزیادة والنقصان عند التجانس، وهذا في الحکم، وأما في الدیانة فکلها واسع. (فیض الباری، ج:۳، ص: ۳۹۹.

كتاب الشروط

٢٧١١ - ٢٧٣٧

۵۴۔کتاب الشروط

(۱) باب مایجوز من الشروط فی الإسلام والأحکام والمبایعة

۲۷۱۱، ۲۷۱۲ ـ حدثنا یحیی بن بکیر: حدثنا اللیث، عن عقیل،عن ابن شهاب قال: أخبرنی عروة بن الزبیر: أنه سمع مروان و المسور بن مخرمة رضی الله عنهما یخبران عن أصحاب رسول الله ﷺ قال: لما کاتب سهیل بن عمرو یومئذ کان فیما اشترط سهیل بن عمرو علی النبی ﷺ أنه لا یأتیک منا أحد وإن کان علی دینک إلا رددته إلینا وخلیت بیننا و بینه. فکره المؤمنون ذلک وامتعضوا منه، وأبی سهیل إلا ذلک فکاتبه النبی ﷺ علی ذلک فرد یومئذ أبا جندل إلی أبیه سهیل بن عمرو ،ولم یأته أحد من الرجال إلا رده فی تلک المدة وإن کان مسلما. وجاء ت المؤمنات مهاجرات وکانت أم کلثوم بنت عقبة بن أبی معیط ممن خرج إلی رسول الله ﷺ یومئذ وهی عاتق، فجاء أهلها یسألون النبی ﷺ أن یرجعها إلیهم فلم یرجعها إلیهم لما أنزل الله فیهن ﴿إِذَا جَاءَ كُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْ هُنَّ اللهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ﴾ إلی قوله: ﴿وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ﴾[1] [راجع: ۱۶۹۴، ۱۶۹۵]

حدیث کا مطلب

ام کلثوم بنت عقبہ بن معیط یہ مسلمان ہو کر آ گئی تھیں، ان کا باپ مسلمانوں کا زبردست دشمن تھا۔ ان کو اللہ ﷻ نے اسلام کی توفیق دی۔

"وهی عاتق" کے معنی ہیں نوجوان بالکل کم عمر تھیں۔ ان کے رشتہ دار حضور اکرم ﷺ سے ان کی واپسی کا مطالبہ کرنے آئے، آپ ﷺ نے ان کو واپس نہیں کیا۔ اور پہلے گزر چکا ہے کہ یہ معاہدہ مردوں کی حد تک تھا، عورتیں اس میں شامل نہیں تھیں، لہٰذا معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں پائی گئی۔

(۴) باب إذا اشترط البائع ظهر الدابة إلی مکان مسمی جاز

۲۷۱۸ ـ حدثنا أبو نعیم: حدثنا زکریا قال: سمعت عامرا یقول: حدثنی جابر ؓ:

[1] [الممتحنة: ۱۰]

أنه كان يسير على جمل له قد أعيا فمر النبي ﷺ فضربه فدعا له فسار سيرا ليس يسير مثله. ثم قال: ((بعنيه بأوقية)) قلت: لا ثم قال: ((بعنيه بأوقية)) فبعته فاستثنيت حملانه إلى أهلي. فلما قدمنا أتيته بالجمل و نقدني ثمنه ثم انصرفت فأرسل على أثري قال: ما كنت لآخذ جملك فخذ جملك ذلك فهو مالك. [راجع: ۴۴۳].

قال شعبة، عن مغيرة، عن عامر، عن جابر: أفقرني رسول الله ﷺ ظهره إلى المدينة. وقال اسحاق عن جرير، عن مغيرة: فبعته على أن لي فقار ظهره حتى أبلغ المدينة. وقال عطاء و غيره: ((ولك ظهره إلى المدينة)). وقال محمد بن المنكدر، عن جابر: شرط ظهره إلى المدينة. وقال زيد بن أسلم، عن جابر: ((ولك ظهره حتى ترجع)). وقال أبو الزبير، عن جابر: ((أفقرناك ظهره إلى المدينة)). وقال الأعمش عن سالم، عن جابر: ((تبلغ به إلى أهلك)).

قال أبو عبد الله: الا شتراط أكثر و أصح عندي. و قال عبيدالله و ابن إسحاق، عن وهب، عن جابر: اشتراه النبي ﷺ بأوقية. و تابعه زيد بن أسلم، عن جابر. و قال ابن جريج، عن عطاء و غيره عن جابر: أخذته باربعة دنانير، و هذا يكون أوقية على حساب الدينار بعشرة دراهم. و لم يبين الثمن مغيرة، عن الشعبي عن جابر. و ابن المنكدر و أبو الزبير عن جابر. و قال الأعمش عن سالم عن جابر: أوقية ذهب. و قال أبو إسحاق عن سالم عن جابر: بمائتي درهم. و قال داؤد بن قيس عن عبيد الله بن مقسم عن جابر: اشتراه بطريق تبوك أحسبه قال: بأربع اواق. و قال أبو نضرة: عن جابر: اشتراه بعشرين دينارا. و قول الشعبي: بأوقية اكثر؛ الاشتراط أكثر و أصح عندي، قاله أبو عبدالله.

یہ حضرت جابر ؓ کا واقعہ ہے جو پیچھے بار بار گزر چکا ہے۔ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کی بہت سی روایتیں جمع کر دی ہیں۔ ان مختلف روایتوں میں امام بخاریؒ دو باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں۔

ایک تو یہ کہ آپ ﷺ نے جو بیع کی تھی آیا اس میں ان کا مدینہ منورہ تک اونٹ پر سوار ہو کر جانا باقاعدہ بیع میں شرط تھی یا بیع مطلق کی تھی۔ پھر آپ ﷺ نے ان کو اجازت دے دی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے شروع میں اس کی مختلف روایتیں نقل کی ہیں اور اس میں صحیح اس کو قرار دیا ہے کہ بیع کے اندر شرط ہوئی تھی چنانچہ پیچھے جو الفاظ آئے ہیں اس میں "**اشترط ظهره المدينة**" کا لفظ آیا ہے، کہیں "**على أن لي ظهره المدينة**" آیا ہے۔ یہ سب الفاظ شرط پر دلالت کر رہے ہیں۔ امام بخاری رحمہ

اللہ فرماتے ہیں کہ جن روایتوں میں شرط آئی ہے وہ زیادہ کثرت سے ہیں اور میرے نزدیک زیادہ صحیح ہیں۔ یہ امام بخاریؒ کا اپنا خیال ہے۔[۲]

دوسرے حضرات حنفیہ وغیرہ نے یہ فرمایا کہ اصل بیع بغیر شرط کے ہوئی تھی، بعد میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو خود ہی اجازت دے دی تھی اور س کی دلیل پیچھے وہاں ذکر کی تھی، جہاں اس مسئلہ پر کلام ہوا ہے کہ مسند احمد میں روایت ہے جب یہ بیع ہوگئی تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ اونٹ سے اتر کر کھڑے ہوگئے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کیوں کھڑے ہوئے؟ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ آپ کا اونٹ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں **"ارکب"** اس پر سوار ہو جاؤ۔[۳]

اس روایت میں صراحت ہے کہ بیع کے بعد اتر گئے تھے، اگر بیع کے اندر شرط ہوتی تو اترنے کا سوال ہی نہیں تھا اور جن روایتوں میں **"اشترط ظهره"** وغیرہ آیا ہے اس میں یہ تاویل ہوسکتی ہے کہ راویوں نے بالمعنی روایت کرتے ہوئے یہ تصرف کیا کہ اس کو اشتراط سے تعبیر کر دیا۔ حقیقت میں اشتراط نہیں تھا اور حضور اقدس ﷺ کی شان رحمت سے یہ بات بعید بھی ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ باقاعدہ شرط لگائیں کہ میں مدینہ تک سواری کروں گا۔ گویا یہ خیال کریں کہ اگر میں شرط نہیں لگاؤں گا تو حضور اقدس ﷺ مجھے تنہا اس صحرا کے اندر چھوڑ دیں گے تو حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے یہ توقع کرنا بھی مشکل ہے کہ انہوں نے باقاعدہ یہ شرط لگائی ہوگی۔ اگرچہ روایتوں میں کثرت سے **"اشترط"** کا لفظ آیا ہے لیکن وہ راویوں کا تصرف ہے۔

دوسرا اختلاف جو امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں روایتوں میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ کس مقدار میں بیع ہوئی تھی؟ تو روایتوں میں مختلف الفاظ آئے ہیں۔ کہیں اوقیہ کا لفظ آیا ہے کہیں چار دینار کا لفظ آیا ہے کہیں دو سو درہم کا لفظ آیا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان میں اوقیہ والی روایت راجح ہے جس میں یہ کہا گیا کہ ایک اوقیہ پر سودا ہوا تھا، پھر انہوں نے وہ اوقیہ اپنے پاس محفوظ بھی رکھا جو حرہ میں جا کر غائب ہوا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک اوقیہ ہی تھا۔

---

۲ وبهذا استدل ابن أبي ليلى: أن من اشترى شيئا واشترط شرطا فالبيع جائز والشرط باطل، وفيه مذهب أبي حنفية: أن البيع والشرط كلاهما باطلان، ومذهب ابن شبرمة كلاهما جائزان، وقد ذكرنا هذا في كتاب البيوع في: باب إذا اشترط شروطا في البيع لا تحل. عمدة القاري، ج: ۹ ص: ۱۱۶.

۳ مسئلہ کی تحقیق کے لئے ملاحظہ فرمائیں، تکملہ فتح الملهم، ج: ۱ ص: ۶۳۴۔ اور مسند احمد کی روایت میں عبارت ہے "فنزل رسول الله ﷺ إلى البعير الخ" یہ نسخہ کی غلطی ہے، فليراجع: مسند احمد، مسند جابر بن عبدالله الأنصاري، رقم ۱۴۱۷۰، مطبع بيت الأفكار الدولية، الرياض.

(۶) باب الشروط فی المهر عند عقدة النكاح

"وقال عمر: إن مقاطع الحقوق عند الشروط، ولک ماشرطت. وقال المسور: سمعت النبی ﷺ ذکر صهرا له فأثنی علیه فی مصاهرته فأحسن، قال: حدثنی فصدقنی و وعدنی فوفی لی".

"إن مقاطع الحقوق عند الشروط، ولک ماشترطت" حقوق کی انتہا، مقاطع کے معنی انتہاء کے ہیں کہ جہاں کہیں شرط لگادی گئی وہاں حق ختم ہوجاتا ہے۔

۲۷۲۱ ۔ حدثنا عبدالله بن یوسف: حدثنا اللیث قال: حدثنی یزید بن أبی حبیب، عن أبی الخیر، عن عقبة بن عامر رضی الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((أحق الشروط أن توفوا به ما استحللتم به الفروج)). [أنظر: ۵۱۵۱].

یعنی جن شرطوں کے ذریعے تم نے فروج کو حلال کیا یعنی نکاح کی شرطوں کو پورا کرنا زیادہ احق ہے، اور ان کو پورا کرنے کا خیال کرنا چاہئے۔

(۸) باب مالا یجوز من الشروط فی النكاح

۲۷۲۳ ۔ حدثنا مسدد: حدثنا یزید بن زریع: حدثنا معمر، عن الزهری، عن سعید، عن أبی هریرة رضی الله عنه عن النبی ﷺ قال: ((لا یبیع حاضر لباد، ولا تناجشوا ولا یزیدن علی بیع أخیه، ولا یخطبن علی خطبته، ولا تسأل المرأة طلاق أختها لتستکفیٔ اناء ها)). [راجع: ۲۱۴۰]

ایک عورت اپنی بہن کی طلاق کا سوال نہ کرے یعنی میں آپ سے اس وقت شادی کروں گی جب اپنی پہلی بیوی کو طلاق دے دو۔ **"تستکفیٔ اناء ها"** تاکہ جو کچھ اس کے برتن میں ہے انڈیل لے یعنی شوہر کی طرف سے اس کو جو نفقہ مل رہا ہے وہ اس سے چھین کر خود اپنے قبضہ میں لے آئے، یہ کرنا جائز نہیں۔

(۱۱) باب الشروط فی الطلاق

وقال ابن المسیب والحسن وعطاء: إن بدأ بالطلاق أو أخر فهو أحق بشرطه.

۲۷۲۷ ۔ حدثنا محمد بن عرعرة: حدثنا شعبة، عن عدی بن ثابت، عن أبی حازم، عن أبی هریرة رضی الله عنه قال: ((نهی رسول الله ﷺ عن التلقی، وأن یبتاع المهاجر للأعرابی، وأن تشترط المرأة طلاق أختها، و أن یستام الرجل علی سوم أخیه، و نهی عن النجش، وعن التصریة)).

تابعه معاذ وعبدالصمد عن شعبة. وقال غندر و عبدالرحمٰن: نهى. وقال آدم: نهينا. وقال النضر و حجاج بن منهال: نهى. [راجع: ۲۱۴۰]

طلاق معلق

طلاق کو کسی شرط پر معلق کرنا، اس بارے میں سعید بن المسیب، حضرت حسن بصریؒ اور عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ طلاق کو پہلے ذکر کرے یا بعد میں دونوں صورتوں میں تعلیق ہو جاتی ہے یعنی یہ کہا کہ **"إن دخلت الدار فأنت طالق"** تو اس سے بھی تعلیق ہو جاتی ہے اور **"أنت طالق إن دخلت الدار"** کہا تب بھی تعلیق ہو جاتی ہے۔

اس مسئلہ میں اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **"وأن تشترط المراة طلاق أختها"** کہ عورت کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی بہن کی طلاق کی شرط لگائے، معنی یہ ہیں کہ شوہر سے یہ کہے کہ تم یوں کہو کہ **"إن نكحت هذا فانت طالق يا أنت طالق إن نكحت هذه"** تو اس شرط کو آپ ﷺ نے اگرچہ ناجائز قرار دیا ہے لیکن یہ ناجائز اس وقت ہو سکتی ہے جب یہ نافذ ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ طلاق معلق نافذ ہے۔

(۱۲) باب الشروط مع الناس بالقول

۲۷۲۸ ۔ حدثنا إبراهيم بن موسى: أخبرنا هشام: أن ابن جريج أخبره قال: أخبرني يعلى بن مسلم، و عمرو بن دينار، عن سعيد بن جبير، يزيد أحدهما على صاحبه، و غيرهما: قد سمعته يحدثه عن سعيد بن جبير قال: إنا لعند ابن عباس رضي الله عنهما قال: حدثني أبي بن كعب قال: قال رسول الله ﷺ: ((موسى رسول الله))، فذكر الحديث. قال: ﴿أَلَمْ أَقُلْ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا﴾ [۴] كانت الأولى نسيانا، والوسطى شرطا، والثالثة عمدا، ﴿قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا﴾ [۵] ﴿لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ فَانْطَلَقَا فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُرِيدُ أَنْ يَنْقَضَّ فَأَقَامَهُ﴾)) [۶] قرأها ابن عباس (امامهم ملک) [راجع: ۷۴].

یہ روایات اس لئے نقل کی ہے کہ لوگ آپس میں بات چیت کے اندر بھی ایک دوسرے پر شرطیں لگا سکتے ہیں کہ تم میرے ساتھ رہو گے تو ان شرطوں کی پابندی کرنی ہوگی۔ جیسے حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے شرطیں لگائی تھیں۔

(۱۳) باب إذا اشترط فی المزارعة: إذا شئت أخرجتک

مزارعت میں اگر زمین کا مالک مزارع سے یہ شرط لگائے کہ میں جب چاہوں گا تمہیں نکال دوں گا تو یہ

---

[۴] [الکهف: ۷۲] [۵] [الکهف: ۷۳] [۶] [الکهف: ۷۷]

شرط لگانا بھی جائز ہے۔

۲۷۳۰ ۔ حدثنا أبو احمد: حدثنا محمد بن يحيى أبو غسان الكناني: أخبرنا مالک، عن نافع، عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: لما فدع أهل خيبر عبدالله بن عمر قام عمر خطيبا فقال: إن رسول الله ﷺ كان عامل يهود خيبر على أموالهم وقال: ((نقركم ماأقركم الله))، وإن عبدالله بن عمر خرج إلى ماله هناک فعدى عليه من الليل ففدعت يداه و رجلاه وليس لنا هناک عدو غيرهم ، هم عدونا و تهمتنا، وقد رأيت إجلاء هم. فلما أجمع عمر على ذٰلک أتاه أحد بني أبي الحقيق فقال: يا أمير المؤمنين، أتخرجنا وقد أقرنا محمد ﷺ وعاملنا على الأموال و شرط ذٰلک لنا؟ فقال عمر: أظننت أني نسيت قول رسول الله ﷺ: ((كيف بک إذا أخرجت من خيبر تعدو بک قلو صک ليلة بعد ليلة؟)) فقال: كان ذٰلک هزيلة من أبي القاسم، فقال: كذبت يا عدو الله، فأجلاهم عمر وأعطاهم قيمة ماكان لهم من الثمر مالا وإبلا وعروضا من أقتاب وحبال و غير ذٰلک. رواه حماد بن سلمة، عن عبيد الله، أحسبه عن نافع، عن ابن عمر، عن عمر عن النبي ﷺ اختصره.

اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت نقل کی ہے کہ "**لما فدع أهل خيبر عبدالله بن عمر**" جب اہل خیبر نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاتھ مروڑ دیئے۔

واقعہ یہ ہوا تھا کہ حضرت عمرؓ نے عبداللہ بن عمرؓ کو باغات وغیرہ کی نگرانی، کرایہ اور بٹائی وغیرہ وصول کرنے کے لئے خیبر بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ وہاں گئے۔ رات کے وقت کسی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو پکڑ کر فصیل سے نیچے گرا دیا۔ نیچے گرنے کی وجہ سے ان کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہوگئے۔

"**فدع**" کے معنی ہیں ہاتھ پاؤں ٹیڑھے کر دینا۔ تو خیبر والوں نے جب ہاتھ پاؤں ٹیڑھے کر دیئے تو "**قام عمر خطيبا**" حضرت عمرؓ نے خطبہ دیا اور فرمایا کہ "**إن رسول الله ﷺ كان عامل يهود خيبر على أموالهم وقال نقركم ما أقركم الله**" آپ نے معاملہ فرمایا تھا اور ساتھ یہ فرمایا تھا کہ ہم ان زمینوں پر برقرار رکھیں گے جب تک اللہ تعالیٰ برقرار رکھے۔

"**وان عبدالله بن عمر خرج إلى ماله هناک**" عبداللہ بن عمرؓ وہاں گئے تھے اور رات کے وقت ان پر زیادتی کی گئی کہ ان کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے گئے۔ اور وہاں یہودیوں کے علاوہ کوئی اور دشمن نہیں ہے۔ ظاہر ہے یہ عمل انہوں نے ہی کیا ہے۔ وہ ہمارے دشمن ہیں اور ہماری تہمت انہی پر ہے کہ یہ حرکت انہوں نے ہی کی ہے۔ اب میں نے ان کو جلاوطن کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ ان کو خیبر سے نکال دیا جائے۔

"فلما اجمع عمر علی ذٰلک" جب حضرت عمرؓ نے اس کا فیصلہ کرلیا تو وہاں ابوالحقیق جو یہودیوں کا سردار تھا، اس کے بیٹوں میں سے کچھ لوگ آئے اور کہا کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے تو ہمیں برقرار رکھا تھا آپ ہمیں نکال رہے ہیں؟ اور ہم سے اموال کے بارے میں معاملہ کیا تھا؟

"فقال عمر ؓ" عمرؓ نے فرمایا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نبی کریم ﷺ کی بات بھول گیا ہوں جو حضور ﷺ نے تم سے کہی تھی کہ تمہارا کیا حال ہوگا جب تمہیں خیبر سے نکالا جائے گا، تمہاری اونٹنیاں تمہیں لے کر خیبر میں بھاگتی ہوں گی، ایک رات کے بعد دوسری رات۔ اس نے کہا یہ سب حضور اقدس ﷺ کی طرف سے مذاق کی بات تھی۔ **"ھذیلۃ"** کے معنی ہیں مذاق کی بات۔

"فقال" حضرت عمرؓ نے فرمایا: **"کذبت یاعدو اللہ فاجلاھم عمرؓ"**

بعد میں حضرت عمرؓ نے ان کو جلاوطن کردیا۔ **"واعطاھم قیمۃ ماکان لھم من الثمر"** اور ان کے کیل کا جو حصہ تھا اس کی قیمت میں ان کو مال ابل اور عروض دیئے۔ **"من اقتاب وحبال"** پالان اور رسیاں بھی جب ان کو خیبر سے جلاوطن کردیا تو یہ تیماء اور اریحا میں جاکر آباد ہوگئے۔

(۱۵) باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع أهل الحرب وكتابة الشروط.

یہ باب قائم کیا ہے کہ جہاد میں شرطیں لگانا اور اہل حرب کے ساتھ مصالحت کرنا اور لوگوں کے ساتھ زبانی شرطیں لگانے کے ساتھ ساتھ ان کی شرطوں کو تحریر کرنا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس میں صلح حدیبیہ کا واقعہ تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے اور صلح حدیبیہ والی یہ حدیث جتنی تفصیل کے ساتھ یہاں ذکر کی ہے مغازی میں بھی اتنی تفصیل سے نہیں آئی۔

۲۷۳۱، ۲۷۳۲ ـ حدثني عبد الله بن محمد: حدثنا عبد الرزاق : أخبرنا معمر قال: أخبرني الزهري قال: أخبرني عروة بن الزبير، عن المسور بن مخرمة ومروان، يصدق كل واحد منهما حديث صاحبه قالا: خرج رسول الله ﷺ زمن الحديبية حتى إذا كانوا ببعض الطريق قال النبي ﷺ: ((إن خالد بن الوليد بالغميم في خيل لقريش طليعة فخذوا ذات اليمين))، فوالله ماشعر بهم خالد حتى اذا هم بقترة الجيش فانطلق يركض نذير القريش، وسار النبي ﷺ حتى إذا كان بالثنية التي يهبط عليهم منها بركت به راحلته. فقال الناس: حل حل، فألحت فقالوا: خلأت القصواء، خلأت القصواء. فقال

النبی ﷺ : ((ماخلأت القصواء، وماذاک لها بخلق ولکن حبسها حابس الفیل))، ثم قال : ((والذی نفسی بیده لا یسألوننی خطة یعظمون فیها حرمات الله إلا أعطیتهم إیاها)). ثم زجرها فوثبت، قال: فعدل عنهم حتی نزل بأقصی الحدیبیة علیٰ ثمد قلیل الماء یتبرضه الناس تبرضا، فلم یلبثه الناس حتی نزحوه وشکی إلی رسول الله العطش. فانتزع سهما من کنانته ثم أمرهم أن یجعلوه فیه، فوالله مازال یجیش لهم با لری حتی صدروا عنه فبینما هم کذٰلک إذ جاء بدیل بن ورقاء الخزاعی فی نفر من قومه من خزاعة وکانو عیبة نصح رسول الله ﷺ من أهل تهامة فقال : إنی ترکت کعب بن لؤی وعامر بن لؤی نزلوا أعداد میاه الحدیبیة ومعهم العوذ المطافیل وهم مقاتلوک وصادوک عن البیت، فقال رسول الله ﷺ : ((إنا لم نجیء لقتال أحد ولکنا جئنا معتمرین، وإن قریشا قد نهکتهم الحرب وأضرت بهم فإن شاؤا ماددتهم مدة ویخلوا بینی وبین الناس فإن أظهر، فإن شاؤا أن یدخلوا فیما دخل فیه الناس فعلوا وإلافقد جموا. وإن هم أبوا فوالذی نفسی بیده لأقاتلنهم علی أمری هذا حتی تنفرد سالفتی، ولینفذن الله أمره)). فقال بدیل: سأبلغهم ماتقول. قال: فانطلق حتی أتی قریشا، قال: إن قدجئنا کم من هذا الرجل وسمعناه یقول قولا، فإن شئتم أن تعرضه علیکم فعلنا. فقال سفهاؤهم: لا حاجة لنا أن تخبرناعنه بشیء. وقال ذوو الرأی منهم : هات ما سمعته یقول، قال : سمعته یقول کذا وکذا، فحدثهم بما قال النبی ﷺ فقام عروة بن مسعود فقال : أی قوم، ألستم بالولد؟ وألست بالوالد قالوا: بلی، قال : فهل تتهموننی ؟ قالوا : لا، قال: ألستم تعلمون أنی استنفرت أهل عکاظ فلما بلحوا علی جئتکم بأهلی وولدی ومن أطاعنی ؟ قالوا : بلی، قال: فإن هذا قدعرض لکم رشد، اقبلوها ودعونی آته. قالوا : ائته، فأتاه فجعل یکلم النبی ﷺ فقال النبی ﷺ نحوا من قوله لبدیل. فقال عروة عند ذٰلک: أی محمد، أرأیت إن استأصلت أمر قومک، هل سمعت بأحد من العرب اجتاح أهله قبلک؟ وإن تکن الأخری، فإنی والله لأری وجوها وإنی لأری أشواباً من الناس خلیقا أن یفروا ویدعوک. فقال له أبوبکر ﷺ : امصص بظر اللات، أنحن نفر عنه وندعه؟ فقال : من ذا ؟ قالوا: أبو بکر، قال: أما والذی نفسی بیدی لولا ید کانت لک عندی لم أجزک بها لأجبتک. قال: وجعل یکلم النبی ﷺ فکلما تکلم کلمه أخذ بلحیته والمغیرة بن شعبة قائم علی رأس النبی ﷺ ومعه السیف وعلیه المغفر. فکلما أهوی عروة بیده إلی لحیة النبی ﷺ ضرب یده بنعل السیف وقال له : أخر

يدک عن لحية رسول الله ،فرفع عروة رأسه فقال: من هذا ؟ قال المغيرة بن شعبة ، فقال : أي غدر،ألست أسعى في غدرتک ؟ وكان المغيرة صحب قومافي الجاهلية فقتلهم وأخذا أموالهم ثم جاء فأسلم. فقال النبي ﷺ :((أما الإسلام فأقبل ، وأما المال فلست منه في شئ)) . ثم إن عروة جعل يرمق أصحاب النبي ﷺ بعينة،قال : فوالله ما تنخم رسول الله ﷺ نخامة إلا وقعت في كف رجل منهم فدلک بها وجهه وجلده. وإذا امر هم ابتدروا أمره. وإذا توضاء كادوا يقتتلون على وضوئه .وإذا تكلموا خفضوا أصواتهم عنده،ومايحدون إليه النظر تعظيما له .فرجع عروة إلى أصحابه فقال : أى قوم،والله لقد وفدت على الملوک ووفدت على قيصر وكسرى والنجاشي .والله إن رأيت ملكا قط يعظمه أصحابه ما يعظم أصحاب محمد ﷺ محمدا. والله إن يتنخم نخامة إلا وقعت في كف رجل منهم فدلک بها وجهه وجلده .وإذا أمرهم ابتدروا أمره،وإذاتوضأ كادوا يقتتلون على وضوئه،وإذا تكلموا خفضوا أصواتهم عنده، وما يحدون النظرإليه تعظيماله .وإنه قد عرض عليكم خطة رشد فاقبلوها،فقال رجل من بني كنانة: دعوني آته ، فقالوا: ائته. فلما أشرف على النبي ﷺ وأصحابه قال رسول الله ﷺ : ((هذا فلان وهو من قوم يُعظِّمون البدن فا بعثوها له))، فبعثت له،واستقبله الناس يلبون.فلما رأى ذٰلک قال:سبحان الله ، ماينبغي لهؤلاء أن يصدواعن البيت. فلما رجع ألى أصحابه قال:رأيت البدن قد قلدت وأشعرت،فماأرى أن يصدواعن البيت.فقام رجل منهم يقال له :مِكْرز بن حفص، فقال: دعوني آته،فقالوا:ائته. فلما أشرف عليهم قال النبي ﷺ :((هذا مكرز وهو رجل فاجر))، فجعل يكلم النبي ﷺ فبينماهو يكلمه إذ جاء سهيل بن عمرو، قال معمر: فأخبرني أى، عن عكرمة : أنه لما جاء سهيل بن عمرو قال البني ﷺ :((قد سهل لكم من أمركم)).قال معمر :قال الزهرى في حديثه :جاء سهيل بن عمروفقال:هات اكتب بيننا وبينكم كتابا، فدعا النبي ﷺ الكاتب فقال البني ﷺ اكتب :((بسم الله الرحمٰن الرحيم)): فقال سهيل: أما الرحمن فوالله ما أدرى ماهي،ولكن اكتب:باسمک اللّٰهم، كما كنت تكتب. فقال المسلمون :والله لانكتبها إلا بسم الله الرحمن الرحيم . فقال النبي ﷺ: ((أكتب: باسمک اللّٰهم)).ثم قال:((هذا ماقاضى عليه محمدرسول الله))،فقال سهيل: والله لوكنا نعلم أنک رسول الله ماصددناک عن البيت ولاقاتلناک. ولكن اكتب: محمد بن عبدالله، فقال النبي ﷺ :((والله إني لرسول الله وإن كذبتموني،اكتب:محمد بن عبدالله)).

قال الزهری : وذلک لقوله :((لایسألوننی خطة یعظمون فیها حرمات الله إلا أعطیتهم إیاها)). فقال له النبی ﷺ:((علی أن تخلوا بیننا وبین البیت فنطوف به)). فقال سهیل : والله لا تتحدث العرب أنا أخذناضغطة، ولکن ذلک من العام المقبل،فکتب. فقال سهیل: وعلی أنه لا یأتیک منا رجل وإن کان علی دینک إلا رددته إلینا قال المسلمون: سبحان الله،کیف یرد إلی المشرکین وقد جاء مسلما؟ فبینما هم کذلک إذدخل أبوجندل بن سهیل بن عمرو یرسف فی قیوده. وقدخرج من أسفل مکةحتی رمی بنفسه بین أظهرالمسلمین فقال سهیل : هذایا محمد أول من أقاضیک علیه أن ترده إلیّ. فقال النبی ﷺ :((إنا لم نقض الکتاب بعد)). قال: فوالله إذا لم أصالحک علی شئ أبدا. قال النبی ﷺ : ((فأجزه لی))،قال: ما أنا بمجیز ذلک لک. قال:((بلی فافعل)). قال: ما أنا بفاعل. قال مکرز: بل قد أجزناه لک . قال أبوجندل :أی معشر المسلمین، أرد إلی المشرکین وقد جئت مسلما؟ألاترون ما قد لقیت ؟ وکان قد عذب عذابا شدیدا فی الله ، قال: قال عمربن الخطاب : فأتیت نبی الله ﷺ فقلت : ألست نبی الله حقا ؟قال :((بلی))، قلت: ألسنا علی الحق وعدونا علی الباطل ؟قال ((بلی))، قلت : فلم نعطی الدنیة فی دیننا إذن ؟قال:((إنی رسول الله ولست أعصیه،وهو ناصری)). قلت: أولیس کنت تحدثنا أنا سنأتی البیت فنطوف به؟قال:((بلی،فأخبرتک أنا نأتیه العام؟)) قال: قلت :لا، قال: ((فإنک آتیه ومطوف به)). قال: فأتیت أبا بکر، فقلت: یاأبابکر، ألیس هذا نبی الله حقا، قال: بلی، قلت : ألسنا علی الحق وعدونا علی الباطل؟ قال: بلی، قلت فلم نعطی الدنیة فی دیننا إذن ؟ قال: أیها الرجل،إ نه لرسول الله ﷺ ولیس یعصی ربه وهو نا صره، فاستمسک بغرزه فوالله انه علی الحق ، قلت: ألیس کان یحدثنا أناسنأتی البیت فنطوف به؟ قال بلی، أفاخبرک أنک تأتیه العام؟قلت: لا. قال فإنک آتیه ومطوف به. قال: الزهری:قال عمر:فعملت لذلک أعمالا. قال:فلمافرغ من قضیة الکتاب قال رسول الله ﷺ لأصحابه:((قوموا فانحروا ثم احلقوا))،قال: فوالله ماقام منهم رجل حتی قال ذلک ثلاث مرات، فلمالم یقم منهم أحد دخل علی أم سلمة فذکر لها ما لقی من الناس فقالت أم سلمة: یا نبی الله،أتحب ذلک؟اخرج ثم لا تکلم أحد امنهم کلمة،حتی تنحر بدنک،وتدعو حالقک فیحلقک. فخرج فلم یکلم أحدا منهم حتی فعل ذلک. نحر بدنه،ودعا حالقه فحلقه. فلما رأوا ذلک قاموا فنحروا وجعل بعضهم یحلق بعضا

حتی کاد بعضهم یقتل بعضا غما. ثم جاء ه نسوة مؤمنات، فأنزل ا لله تعالیٰ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا جَاءَكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ﴾ [۷] حتی بلغ ﴿بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ﴾ فطلق عمر یومئذ امرأتین کانتا له فی الشرک. فتزوج إحداهما معاویة بن أبی سفیان، والأخری صفوان بن أمیة .ثم رجع النبی ﷺ إلی المدینة فجاء ه أبو بصیر رجل من قریش وهو مسلم ، فأرسلوا فی طلبه رجلین ،قالوا : العهد الذی جعلت لنا. فدفعه إلی الرجلین ،فخرجا به حتی بلغا ذا الحلیفة ،فنزلوا یأکلون من تمر لهم،فقال أبو بصیر لأحد الرجلین : والله إنی لأری سیفک هذا یا فلان جیدا، فاستله الآ خر فقال: أجل والله، إنه لجید، لقد جربت به ثم جربت .فقال أبو بصیر : أرنی أنظر إلیه، فأمکنه منه، فضربه حتی برد وفر الآخر حتی أتی المدینة، فدخل المسجد یعدو ،فقال رسول الله ﷺ حین رآه: ((لقد رأی هذا ذعرا))، فلما انتهی إلی النبی ﷺ قال: قتل صاحبی وإنی لمقتول. فجاء أبو بصیر فقال: یا نبی الله قد والله أوفی الله ذمتک، قد رددتنی إلیهم ثم أنجانی الله منهم .قال النبی ﷺ: ((ویل أمه مسعر حرب لو کان له أحد)). فلما سمع ذلک عرف أنه سیرده إلیهم، فخرج حتی أتی سیف البحر ،قال: وینفلت منهم أبو جندل بن سهیل فلحق بأ بی بصیر، فجعل لا یخرج من قریش رجل قد أسلم إلا لحق بأبی بصیر حتی اجتمعت منهم عصابة، فوالله ما یسمعون بعیر خرجت لقریش إلی الشام إلا اعترضوا لها فقتلوهم وأخذوا أموالهم .فأرسلت قریش إلی النبی ﷺ تناشده الله والرحم لما أرسل : فمن أتاه فهو آمن ،فأرسل النبی ﷺ إلیهم فأنزل الله تعالی ﴿وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُم بِبَطْنِ مَكَّةَ مِن بَعْدِ أَنْ أَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ﴾ حتی بلغ ﴿الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ﴾ [۸] کانت حمیتهم أنهم لم یقروا بسم الله الرحمٰن الرحیم. وحالوا بینهم و بین البیت.

[راجع : ۱۶۹۴، ۱۶۹۵]

قال أبو عبد الله: ﴿مَعَرَّةٌ﴾ (العر: الجرب، ﴿تَزَيَّلُوا﴾: تمیزوا، وحمیت القو م: منعتهم حمایة، واحمیت الحمی.

صلح حدیبیہ کی تفصیل مع تشریح حدیث

یہ حدیث حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ اور مروانؒ کی مشترک روایت ہے۔ یعنی کچھ حصہ مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے اور کچھ حصہ مروانؒ نے روایت کیا ہے۔ اور کچھ حصہ دونوں سے مروی ہے۔ "یصدق کل

---

[۷] [الممتحنة: ۱۰] [۸] [الفتح: ۲۴، ۲۶]

واحد منهما حديث صاحبه'' ان میں سے ہر ایک اپنے صاحب کی حدیث کی تصدیق کر رہا تھا۔

مروان چونکہ صحابی نہیں ہیں بلکہ تابعی ہیں اس لئے ان کی روایت مرسل ہے اور مسور بن مخرمہ ﷺ صحابی ہیں لیکن یہ صلح حدیبیہ کے وقت موجود نہیں تھے، لہٰذا ان کی روایت بھی یقیناً مرسل ہے۔ تو ایک مرسل صحابی ﷺ ہے اور دوسری مرسل تابعی ہے، لیکن امام بخاری رحمہ اللہ نے ان دونوں کے مجموعہ کو صحیح سمجھتے ہوئے یہاں روایت کیا ہے ''**قالا**'' یہ دونوں کہتے ہیں، ''**خرج رسول الله ﷺ زمن الحديبية حتى اذا كانوا ببعض الطريق**'' جب آپ ﷺ راستہ میں تھے تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا ''**إن خالد بن الوليد بالغميم في خيل لقريش طليعة**''.

واقعہ یہ تھا کہ جب آپ ﷺ سفر کے لئے روانہ ہوئے اور مکہ مکرمہ کے قریب دو تین مرحلے کے فاصلہ پر پہنچے، اس وقت آپ ﷺ کو آپ کے جاسوس نے یہ اطلاع دی کہ قریش مکہ ایک بڑا لشکر لے کر ذوطوی کے مقام پر جمع ہو گئے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ آپ ﷺ کو مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکیں۔

(پہلے کتاب الحج میں گزر چکا ہے کہ لوگ عام طور پر ذوطوی سے مکہ مکرمہ میں داخل ہوا کرتے تھے اور وہیں پر غسل بھی کیا جاتا تھا)۔

آپ ﷺ کو ساتھ ساتھ یہ اطلاع ملی کہ ان کا ہراول دستہ یعنی مقدمۃ الجیش خالد بن الولید کی سرکردگی میں غمیم کے مقام پر جمع ہے تو آپ ﷺ نے اس کی طرف اشارہ فرمایا کہ خالد بن الولید غمیم کے مقام پر قریش کے کچھ لشکر کے ساتھ موجود ہیں۔ ''**طليعة**'' بطور ہراول دستے یعنی ''**مقدمة الجيش**'' کے ''**فخذوا ذات اليمين**'' آپ ﷺ نے صحابہ کرام ﷺ سے فرمایا کہ اب آپ یہاں سے دائیں طرف کا راستہ پکڑ لیں یعنی مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے عام راستہ ذوطوی کا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ذوطوی کا راستہ چھوڑ دو اور دائیں طرف رخ کر کے کوئی دوسرا راستہ تلاش کرو جس سے ہم نکل جائیں۔ بلکہ روایتوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے پوچھا کہ کوئی ہے جو دوسرا راستہ بتائے؟ ایک صاحب نے کہا ہاں! میں بتاتا ہوں انہوں نے ایک بڑا دشوار گزار راستہ بتایا اور اس پر لے کر چلے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ حدیبیہ پہنچے ورنہ عام طور سے لوگ مدینہ منورہ سے آتے ہیں تو راستہ میں حدیبیہ نہیں پڑتا۔

(اب بھی اگر آپ براستہ سڑک مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جائیں تو راستہ میں ذوطوی پڑتا ہے، حدیبیہ نہیں پڑتا، حدیبیہ جدہ سے جاتے ہوئے راستہ میں پڑتا ہے)۔

اس واسطے آپ ﷺ راستہ کاٹ کر تشریف لے گئے۔

''**فوالله ما شعر بهم خالد حتى إذا هم بقترة الجيش**'' خالد اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، وہ کافروں کی طرف سے مقدمۃ الجیش کے طور پر نکلے ہوئے تھے، ان کو حضور اقدس ﷺ کے آنے کا احساس

نہیں ہوا، یہاں تک کہ اچانک ان کولشکر کا غبار نظر آیا۔ **"قترة"** سیاہ غبار کو کہتے ہیں، جب ان کو حضور اقدس ﷺ کے لشکر کا سیاہ غبار نظر آیا تب انہیں پتہ چلا کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لے آئے ہیں۔ **"فانطلق یرکض نذیر القریش"** وہاں سے قریش کو ڈرانے کے لئے بھاگ کھڑے ہوئے کہ دیکھو حضور اقدس ﷺ کا لشکر آ گیا۔ اور آپ ﷺ چلتے رہے، یہاں تک کہ جب آپ ﷺ اس گھاٹی پر پہنچے جس سے حرم کی طرف اترنا تھا تو اچانک آپ ﷺ کی اونٹنی بیٹھ گئی اور آگے نہیں چلی۔

"فقال الناس حل حل" لوگوں نے اونٹنی کو چلانے کے لئے آوازیں نکالیں، عام طور سے اونٹوں کو چلانے کے لئے **"حل حل"** کی آواز نکالی جاتی تھی یعنی چل چل تو لوگوں نے اس اونٹنی کو چلانے کے لئے مختلف آوازیں نکالیں حل حل یعنی چل چل، اس میں کئی لغتیں ہیں، سب استعمال ہوتی تھیں۔ **"فالحت"** وہ اونٹنی اصرار کرنے لگی، مطلب یہ ہے کہ وہ اونٹنی چلانے کی آواز دینے کے باوجود نہیں اٹھی، **"فقالوا خلات القصواء خلات القصواء"** قصواء حضور اقدس ﷺ کی اونٹنی کا نام تھا، لوگوں نے کہا کہ قصواء اڑ گئی یعنی ضد پر آگئی کہ اٹھ نہیں رہی اور چل نہیں رہی ہے۔

"فقال النبی ﷺ : ماخلات القصواء، وماذاک لها بخلق ولکن حبسها حابس الفیل" کہ قصواء نہیں اڑی اور نہ ایسا اڑنا اس کی عادت ہے۔

یہ قصواء حضور اقدس ﷺ کی خاص اونٹنی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی خاص ہدایات سے نوازا تھا اس واسطے فرمایا کہ یہ اڑی نہیں اور نہ یہ اس کی عادت ہے لیکن اس کو روکنے والے نے روک دیا جس نے ہاتھیوں کو روک دیا تھا مراد ہے کہ اللہ جل جلالہ نے روکا ہے۔

"حابس الفیل" کہنے کی حکمت

حابس الفیل کا لفظ اس لئے استعمال کیا کہ جس طرح اصحاب الفیل آئے تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو حرم میں داخل ہونے سے روک دیا تھا کیونکہ اگر وہ حرم میں داخل ہوتے تو قتل وقتال ہوتا اور اس مقدس خطے کی حرمت پامال ہوتی۔ اس لئے انہیں داخل ہونے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے روک دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اس قصواء کو یہاں روک دیا کیونکہ اگر آگے بڑھیں گے تو مشرکین سے مقابلہ ہوگا اور مقابلہ کے نتیجے میں خونریزی ہوگی جس سے حرم کی حرمت پامال ہوگی۔

"ثم قال............إلا اعطیتهم إیاها" پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ کافر و مشرک لوگ مجھ سے کسی بھی ایسے طریقہ کار کا سوال نہیں کریں گے جس میں اللہ کی حرمتوں کی تعظیم ہو مگر میں ان کو وہ دیدوں گا۔

معنی یہ ہے کہ میرا لڑنے کا ارادہ نہیں ہے اور میں اس وقت قتال کا ارادہ لے کر نہیں آیا بلکہ عمرہ کرنے آیا ہوں۔ اب اگر یہ لوگ بیچ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور رکاوٹ کے بعد صلح کی بات کریں اس میں مجھ سے جو مطالبہ چاہیں کریں میں اس کو قبول کرلوں گا بشرطیکہ وہ مطالبہ تعظیم حرمات اللہ کے خلاف نہ ہو۔ **"ثم زجرها فوثبت"** جب آپ ﷺ نے اپنا ارادہ ظاہر فرمایا کہ میرا لڑنے کا ارادہ نہیں بلکہ صلح کا ارادہ ہے اس کے بعد آپ ﷺ نے اونٹنی کو اٹھایا تو وہ کود کر کھڑی ہوگئی اور چلنے لگی۔ گویا یہ اس وقت اللہ جل جلالہ کی طرف سے اشارہ تھا کہ اس وقت اگر صلح کے ارادہ سے آگے بڑھ رہے ہیں تو ٹھیک ہے، لڑنے کے ارادہ سے آگے مت بڑھئے۔

"قال: فعدل عنهم" آپ ﷺ نے ان یعنی کفار کے لشکر سے اعراض فرمایا **"حتى نزل بأقصى الحديبية"** یہاں تک کہ آپ ﷺ حدیبیہ کی انتہا تک جا کر اتر گئے، **"على ثمد قليل الماء"** ایک چشمہ پر جو بہت کم پانی والا تھا۔

ایک معجزہ کا تذکرہ کہ چشمہ ابل پڑا

ثمد سے چشمہ مراد ہے جس میں بہت کم پانی تھا **"يتبرضه الناس تبرضا"** لوگ اس میں سے تھوڑا تھوڑا پانی لے رہے تھے، **"فلم يلبثه الناس حتى نزحوه"** اس کو لوگوں نے چھوڑا نہیں، لفظی معنی ہے ٹھہرایا نہیں، اس میں زیادہ انتظار نہیں کیا یہاں تک کہ پورا کا پورا کنواں خشک کر دیا، پورا پانی لے لیا۔

"وشكى إلى رسول الله ﷺ العطش" لوگوں نے آپ ﷺ سے شکایت کی کہ سارا پانی ختم ہوگیا ہے اور پیاس لگی ہوئی ہے۔

"فانتزع سهماً من كنانته ثم أمرهم أن يجعلوه فيه" آپ ﷺ نے اپنے ترکش سے تیر نکالا اور حکم دیا کہ یہ تیر لے جا کر اس میں ڈال دو۔

"فوالله مازال يجيش لهم بالري حتى صدروا عنه" اللہ کی قسم وہی کنواں جو خشک ہوگیا تھا آپ ﷺ کے تیر ڈالنے کے بعد جوش مارنے لگا "ری" سیراب کرنے والے پانی کے ساتھ خوب پانی نکلنے لگا یہاں تک کہ وہ اس سے نکلے۔

"فبينما هم كذلك اذجاء بديل بن ورقاء الخزاعي في نفرمن قومه..من خزاعة" ابھی آپ ﷺ اسی حالت میں تھے کہ اتنے میں بدیل بن ورقاء الخزاعی اپنی قوم خزاعہ کے لوگوں کیساتھ آئے۔

پہلے یہ بات گزر چکی ہے کہ خزاعہ کے ساتھ معاہدہ تھا تو وہ آئے اور یہ مسلمان ہوگئے تھے **"كانوا عيبة نصح رسول الله ﷺ من اهل تهامة"** اور یہ بدیل بن ورقاء الخزاعی رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے خیر خواہ، رازدار تھے۔

"عیبة" اصل میں پوٹلی کو کہتے ہیں، جس میں آدمی اپنی چیزیں چھپا کر رکھتا ہے، اس لئے یہ لفظ راز دار کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے جیسے آپ ﷺ نے انصار کے بارے میں فرمایا کہ **"هم کرشی وعیبتی"** اور نصح کے معنی ہیں خیر خواہی، یعنی خیر خواہی کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کے راز دار تھے اور اہل تہامہ میں سے تھے۔

تہامہ سے کیا مراد ہے؟

تہامہ اس علاقہ کو کہا جاتا ہے جو مکہ مکرمہ سے لے کر ساحل سمندر تک کا سطحی علاقہ ہے، اس میں پہاڑ نہیں ہیں، جدہ بھی اسی تہامہ کا حصہ ہے۔

تو وہاں کے لوگ آئے اور آکر کہا کہ میں کعب بن لوئی اور عامر لوئی قریش کے ان دونوں بڑے قبیلوں کو حدیبیہ کے بہت زیادہ پانی والے چشموں کے پاس چھوڑ کر آیا ہوں کہ وہ وہاں اترے ہوئے ہیں۔

"اعداد" **"عد"** کی جمع ہے اور **"عد"** یا **"عد"**، **"العِدُّ"** اس پانی کو کہتے ہیں جو بہت آسان سے بہہ رہا ہو۔[9] تو حدیبیہ کے مختلف چشمے ہیں ان میں سے جو بالکل تیار ہیں کثرت سے پانی دینے والے ہیں کعب بن لوئی اور عامر بن لوئی وہاں جا کر اتر گئے ہیں کہ انہوں نے حدیبیہ کے علاقے میں جو اچھے اچھے کنویں تھے ان پر قبضہ کر لیا تھا اور حضور اقدس ﷺ کے لئے چھوٹا سا چشمہ رہ گیا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے معجزہ ظاہر فرمایا کہ پانی میں برکت عطا ہوئی۔

"ومعهم العوذ المطافیل" اور ان کے پاس دودھ دینے والی اور بچے دینے والی اونٹنیاں بھی ہیں۔ عوذ، دودھ دینے والی اونٹنی کو اور **"مطافیل"** بچوں والی اونٹنی کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کا پورا سامان موجود ہے۔

"وهم مقاتلوک" وہ آپ سے لڑنے کے ارادہ سے آئے ہیں **"صادوک عن البیت"** اور آپ کو بیت اللہ سے روکنا چاہتے ہیں۔ **"فقال رسول اللہ ﷺ : انا لم نجیء لقتال احد"** کہ دیکھو بھائی ہم کسی سے لڑنے کیلئے نہیں آئے، قریش کی لڑائیاں چل رہی ہیں، اور ان لڑائیوں سے خود ان کو نقصان پہنچا ہے۔

"فان شاؤا ماددتهم مدة" اگر وہ چاہیں تو میں ان کے لئے جنگ بندی کی مدت مقرر کر دوں گا، اور وہ مجھے اور لوگوں کے ساتھ چھوڑ دیں یعنی میرے ساتھ جنگ بندی کا معاہدہ کر لیں تا کہ پھر میں یکسوئی کے ساتھ عرب کے دوسرے قبیلے میں دعوت و تبلیغ کا کام کروں۔ پھر اگر یہ قریش کے لوگ دین میں داخل ہونا چاہیں جس میں دوسرے لوگ شامل ہو چکے ہوں۔ یعنی دوسرے عرب مسلمان ہو گئے تو اگر یہ بھی مسلمان ہونا چاہیں گے تو ایسا کر لیں۔ اور اگر ان کا ارادہ اسلام لانے کا نہیں ہے تب بھی کم از کم جنگ بندی کی مدت کے دوران یہ آرام کر چکے ہوں گے۔

---

۹ وہ جاری پانی جو منقطع نہ ہو ، المنجد: ۶۳۴۔

"والا فقدجموا" کے اصل معنی ہیں جمع کرنا، خاطر جمع کرنا، مراد ہے راحت لے لینا، آرام لے لینا۔ تو ان کو کم از کم اتنا فائدہ ہوگا کہ اس عرصہ میں ان کو سانس لینے کا موقعہ مل جائے، آرام مل جائے گا، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ مجھ سے ایک مدت تک صلح کرنا چاہیں تو کر لیں۔

"وان هم ابوا" اور اگر یہ میری طرف سے صلح کی پیشکش کے باوجود انکار کریں اور صلح پر آمادہ نہ ہوں تو اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے میں ان سے اپنے اس معاملہ میں لڑتا رہوں گا یہاں تک کہ میری گردن الگ ہو جائے۔ **"حتى تنفرد سالفتي۔ سالفة"** اصل میں گردن کو کہتے ہیں اور تنفرد کے معنی ہیں منفرد ہو جائے یعنی الگ ہو جائے، یہ قتل سے کنایہ ہے۔ مطلب ہے یہاں تک کہ میں شہید ہو جاؤں اور قتل ہو جاؤں، میری گردن الگ ہو جائے۔ بعض لوگوں نے اس کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ تنہا بھی ہو جاؤں اور کوئی میرا ساتھ نہ دے تب بھی میں اس دین کے لئے قتال کرتا رہوں گا۔

"ولينفذن الله أمره" اور اللہ تعالیٰ اپنے امر کو نافذ کر کے رہے گا۔

"فقال بديل : سأبلغهم............ عنه بشيء" میں نے ان سے ایک بات سنی ہے اگر تم چاہو تو میں تمہیں پیش کر دوں۔ بیوقوفوں نے کہا کہ ہمیں نہیں چاہئے، جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں ہمیں نہ بتائیں، ان میں سے جو ذی رائے تھے انہوں نے کہا لاؤ، بتاؤ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

"قال سمعته.......... ألست بالوالد قالوا : بلىٰ" یہ عروة بن مسعود ثقفی ہیں۔ قریشی نہیں ہیں، طائف میں تھے وہاں سے مکہ مکرمہ چلے آئے تھے، انہوں نے کہا اے قوم کیا میں تمہارے لئے باپ جیسا نہیں ہوں؟ کیا تم میرے لئے اولاد کی طرح نہیں ہو؟

اور بعض روایتوں میں اس کے برعکس آیا ہے کہ اس نے کہا، **"ألست بالولد؟ : قالوا: بلى، قال ولستم بالوالد ؟ قالوا : بلىٰ"** یہ دوسری بات نسب کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہے اس لئے کہ عروة بن مسعود کی والدہ قریش سے تعلق رکھتی تھیں تو انہوں نے قریش کو والد اور اپنے آپ کو ولد قرار دیا۔

"قال : فهل تتهمو نی ؟" کیا تم مجھے متہم کرتے ہو کہ میں تمہاری خیر خواہی کے خلاف کوئی بات کہوں گا۔

"قالوا : لا، قال : ألستم تعلمون انی استنفرت أهل عكاظ فلما بلحوا على جنتكم بأهلي وولدي ومن أطاعني؟"

کیا تمہیں پتہ ہے کہ میں نے اہل عکاظ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ قریش کے پاس جاؤ اور انکی مدد کرو، یعنی جناب رسول اللہ ﷺ کے خلاف میں نے اہل عکاظ کو تمہاری مدد کے لئے ابھارا تھا، جب انہوں نے میری بات نہیں مانی اور انکار کیا تو میں خود اپنے گھر والوں کو اور اپنی اولاد کو اور جو میری اطاعت کرنے والے ہیں ان کو

لے کر آپ کے پاس آ گیا، یعنی ان کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر رہے ہیں کہ میں تو چاہتا تھا کہ سارے عکاظ کے لوگ آپ کی مدد کریں لیکن جب وہ آپ کی مدد سے منکر ہو گئے تو میں اور تو کچھ نہیں کر سکتا تھا، اپنی اولاد، گھر والوں اور اپنے متبعین کو لے کر آپ کے پاس آ گیا۔ اب اس نے کہا **"فان ھذا قد عرض لکم خطة رشد"** کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہارے سامنے ایک ہدایت اور مصلحت کا راستہ تجویز کیا ہے۔ اس کو قبول کرلو، یعنی صلح والے راستہ کو، اور مجھے ذرا ان کے پاس جانے دو، اس پر انہوں نے کہا کہ آپ جائیے، آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر بات کرنی شروع کی، آپ ﷺ نے ان سے وہی گفتگو فرمائی جو بدیل بن ورقاء سے فرمائی تھی کہ اگر وہ صلح کرنا چاہیں تو میں صلح کرنے کو تیار ہوں لیکن اگر نہیں تو پھر میں لڑنے کو بھی تیار ہوں۔

"فقال عروة عند ذلک" عروۃ نے اس موقعہ پر اپنا رعب جمانا چاہا اور کہا کہ دیکھیں، لڑائی میں دو ہی باتیں ہو سکتی ہیں ایک تو یہ ہو سکتی ہے کہ آپ کامیاب ہو جائیں اور اسکے نتیجے میں اپنی قوم کا بیج مار دیں، ان سب کا استیصال وخاتمہ کر دیں اگر ایسا ہے تو کیا آج تک آپ نے کسی قوم کی تاریخ میں دیکھا ہے کہ کسی شخص نے اپنی قوم کا بیج مار دیا ہو؟ تو یہ بدنامی آپ کے سر آئے گی کہ آپ نے اپنی قوم کا بیج مار دیا۔

اور اگر آپ کامیاب نہ ہوئے بلکہ قریش کے لوگ کامیاب ہو گئے اور ان کو فتح حاصل ہو گئی تو پھر آپ کا انجام بہت خراب نظر آتا ہے۔ اس واسطے کہ یہ جو لوگ آپ کے پاس جمع ہیں آپ کے صحابۂ کرام ؓ یہ مختلف قبیلوں اور مختلف علاقوں کے لوگ ہیں۔ جب یہ دیکھیں گے آپ مغلوب ہو گئے ہیں تو یہ سب آپ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ یہی کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آپ اپنی قوم کے معاملہ کو جڑ سے ختم کر دیں استیصال جڑ سے ختم کرنے کو کہتے ہیں **"ھل سمعت باحد من العرب"** کیا عرب کو آپ نے سنا ہے کہ **"اجتاح أھله قبلک"**، جس نے آپ سے پہلے اپنی جڑ ختم کر دی ہو۔

"وإن تکن الأخری" اور اگر صورت حال دوسری ہوئی یعنی آپ مغلوب ہو گئے **"فإني واللہ لأری وجوھا"** تو اللہ کی قسم مجھے آپ کے ساتھیوں میں ایسے چہرے نظر آ رہے ہیں، مختلف قبیلوں اور علاقوں کے ملے جلے لوگ نظر آ رہے ہیں، **"خلیقا أن یفروا ویدعوک"** جو اس بات کے زیادہ لائق ہیں کہ ایسی صورت میں بھاگ کھڑے ہوں گے اور آپ کو اکیلا چھوڑ دیں گے۔ اس نے صحابہ کرام ؓ کے بارے میں ایسی بات کہہ دی۔

صدیق اکبر ؓ کی غیرت ایمانی اور دفاع صحابہ ؓ

"فقال له أبو بکر ؓ" صدیق اکبر ؓ سے یہ بات برداشت نہ ہوئی اور شاید ساری زندگی میں

کسی کو ایسی سڑی ہوئی گالی نہ دی ہوگی، فوراً صدیق اکبرؓ نے کہا **"امصص بظر اللات انحن نفر عنه وندعه ؟"** یہ بڑی مغلظ گالی تھی، کیونکہ اہل عرب میں بھی جو عامی قسم کے لوگ تھے وہ یہ گالی دیتے تھے لیکن وہ بھی اسطرح کہ **"امصص بظر امک"**۔ **"بظر"** شرم گاہ کے اندر ایک بوٹی ہوتی ہے جو ختنہ کے اندر رہ جاتی ہے اس کو بظر کہتے ہیں۔ آج کل انگریزی میں اس کو کلائی ٹوریس **(clitoris)** کہتے ہیں اور **"امصص"** کے معنی ہیں "چوسو"۔

عام طور پر گالی دینے والے ماں کے لفظ کے ساتھ دیتے تھے کہ **"امصص بظر أمک"**، لیکن صدیق اکبرؓ نے اس کو اور زیادہ مغلظ کرنے کے لئے لات کی طرف منسوب کر کے گالی دی۔ لات انکا بت تھا اور کہتے تھے کہ یہ اللہ میاں کی بیٹی ہے تو صدیق اکبرؓ نے **"امصص بظر اللات"**.

اسلام میں سخت الفاظ کا استعمال اور اس کا حکم

معلوم ہوا کہ جہاں جہاد ہو اور مشرکین کے ساتھ مقابلہ ہو اور جہاں مسلمانوں کی غیرت کو للکارا جائے تو ایسے موقعہ پر اس قسم کے الفاظ کے استعمال کی گنجائش ہے ورنہ صدیق اکبرؓ جیسے نرم خو، خلیق اور با آدب آدمی کے منہ سے ایسا برا کلمہ نکلنا بالکل ہی غیر معمولی بات ہے، معلوم ہوا کہ اس موقعہ پر اس کی گنجائش ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ نے اس پر ٹوکا بھی نہیں کہ بھائی ایسی گالی کیوں دے رہے ہو۔

"فقال من ذا ؟" عروہ بن مسعود نے پوچھا کہ یہ کون بزرگ ہیں جو مجھے ایسی گالی دے رہے ہیں؟ کہا کہ یہ ابوبکرؓ ہیں۔ **"قال : أما والذی نفسی بیده لولا ید کانت لک عندی لم أجزک بها لاجبتک"** عرب کی شان ہے کہ کافر ہے اور کہتا ہے کہ اگر تمہارا مجھ پر ایک احسان نہ ہوتا جس کا میں نے ابھی تک تمہیں بدلہ نہیں دیا، تو تمہاری اس گالی کا جواب دیتا۔ لیکن چونکہ تمہارا ایک احسان میری گردن پر ہے اس لئے میں تمہاری گالی سن کر خاموش ہو رہا ہوں، جواب نہیں دیتا۔

وہ احسان یہ تھا کہ عروہ بن مسعود پر دیت آگئی تھی اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیت کی ادائیگی میں اس کی مدد کی تھی۔ عربوں کے اندر یہ ملکات تھے کہ باوجود کافر ہونے کے احسان کا ماننا کہ دوسرے شخص نے میرے ساتھ احسان کیا ہے اس لئے میں اس کے ساتھ کوئی بدسلوکی نہ کروں۔

حضور علیہ السلام عرب میں کیوں مبعوث ہوئے؟

اس کی ایک حکمت

اور حضور اکرم ﷺ کو عرب میں بلاوجہ نہیں مبعوث کیا گیا، ان کے اندر ملکات فطریہ بڑے اعلیٰ درجہ کے تھے، انکی ضیافت، عام طور سے سچ بولنا، جھوٹ نہیں بولتے تھے، امانت کا لحاظ رکھنا، دوسرے کا احسان ماننا، جس کے ساتھ معاہدہ ہو اس سے وفاداری کرنا، ان میں یہ ملکات تھے، اس لئے نبی کریم ﷺ کو بھیجنے کے لیے اس قوم کو منتخب فرمایا۔

"**قال: وجعل يكلم النبي ﷺ فكلما تكلم كلمة أخذ بلحيته**" بات کرتے ہوئے عروہ بن مسعود نے حضور اقدس کی لحیہ مبارکہ پر ہاتھ رکھا۔" **و المغيرة بن شعبة قائم على رأس النبي ﷺ ومعه السيف**" حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ تلوار لئے حضور اقدس ﷺ کے پاس کھڑے تھے جیسے حارس ہوا کرتا ہے۔"**وعليه المغفر**" اوران کے سر پر مغفر بھی تھا۔" **فكلما أهوى عروة بيده الى لحية النبي ﷺ**" جب بھی عروۃ حضور اقدس ﷺ کی داڑھی کی طرف ہاتھ بڑھاتا، یہ بھی ایک طریقہ ہوتا تھا کہ جب کسی کو راضی کرنا ہوتو بات کرتے ہوئے داڑھی کی طرف ہاتھ بڑھاتے، تو جب عروۃ اس طرح کرتا، "**ضرب يده بنعل السيف**" حضرت مغیرہ بن شعبہ ؓ تلوار کی نعل سے اس کے ہاتھ پر مارتے اور کہتے، "**اخر يدك عن لحية رسول الله ﷺ**" حضور اکرم ﷺ کی ریش مبارک سے ہاتھ ہٹاؤ۔ "**فرفع عروة راسه فقال من هذا؟**" عروۃ نے اپنا سر اٹھایا اور کہا یہ کون بزرگ ہیں جو مجھ سے یہ کہہ رہے ہیں۔"**قال: المغيرة بن شعبة**" بتایا کہ یہ مغیرۃ بن شعبہ ؓ ہیں۔

"**فقال : اى غدر، الست أسعى فى غدرتك**" اے غدار کیا میں نے غداری میں تمہارے ساتھ مدد نہیں کی تھی۔ آگے اس کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ مغیرۃ بن شعبہ جاہلیت میں کچھ لوگوں کے ساتھ تھے۔ "**فقتلهم**" ان کو قتل کیا "**و أخذ اموالهم**" اورانکے مال لوٹ لائے۔ اس وجہ سے یہ قوم کے اندر مشہور ہو گئے تھے کہ انہوں نے غداری کی ہے۔ تو یہ جاہلیت کا ایک واقعہ تھا جس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ تو غدار ہے، تمہاری غداری میں تمہاری جان بچانے کے لئے بھاگ دوڑ کرتا رہا، آج تم مجھے یہ کہہ رہے ہو۔

"**ثم جاء فأسلم . فقال النبي ﷺ أما الا سلام فأقبل**" جب مغیرہ بن شعبہ ؓ آئے اور اسلام لے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام تو میں قبول کرتا ہوں، اور جو مال تم نے لوٹا ہے میں اس کا ذمہ دار نہیں ہوں، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ ادا کرنا ہوگا، بغیر ادا کئے میں تمہیں اس سے بَری

نہیں کرسکتا۔ کافروں کا جو مال زمانہ جاہلیت میں لوٹا ہے میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہ واپس لوٹانا ہوگا۔

اندازہ لگائیے کہ جہاں دشمنی ہورہی ہے جن لوگوں کے ساتھ خونریزیاں ہورہی ہیں ان کا مال ایک شخص لوٹ کر آیا آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ دشمن کو واپس کرو۔

"ثم إن عروة جعل یرمق أصحاب النبی ﷺ بعینیه" ایک طرف عروۃ نے یہ دو نظارے دیکھے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یوں کہا اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے یوں کہا، اس کے بعد پھر اس نے اپنی آنکھوں سے بھی مسلسل ٹکٹکی باندھ کے حضور ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیکھنا شروع کیا۔

"قال : فوالله ماتنخم رسول الله ﷺ نخامة .... ووفدت علی قیصر وکسری والنجاشی" میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی ان سب بادشاہوں کے پاس گیا ہوں، لیکن آج ایسی قوم دیکھی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی، **"وانه قد عرض علیکم خطة رشد"** اور اس نے تمہیں ہدایت کا ایک راستہ بتایا ہے۔ **"فاقبلوها، فقال رجل من بنی کنانة"** بنوکنانہ کے ایک صاحب کے دل میں کچھ امنگ پیدا ہوئی، اس نے کہا: **"دعونی آته"** ذرا مجھے بھی ان کے پاس جانے دو۔ **"فقالوا ائته"** انہوں نے کہا تم بھی چلے جاؤ **"فلما اشرف علی النبی ﷺ وأصحابه قال رسول الله علیه ﷺ هذا فلان وهو قوم یعظمون البُدن"** کہ یہ جو آدمی آرہا ہے بنوکنانہ کا فلاں آدمی ہے اور یہ اس قوم سے تعلق رکھتا ہے جو قربانی کے جانوروں کی تعظیم کرتی ہے۔ **"فابعثوها له"** لہٰذا تمہارے ساتھ جو قربانی کے جانور ہیں وہ اس کے سامنے کھڑے کردو تاکہ اس کے دل میں انکی تعظیم پیدا ہو۔

"فبعثت له" تو جانور کھڑے کرکے آگے اس کے سامنے بھیج دیئے۔ **"واستقبله الناس یلبون"** ایک تو قربانی کے جانور بھیج دیئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تلبیہ پڑھنا شروع کردیا۔ **"لبیک اللّٰهم لبیک . فلمارای ذلک"** جب اس شخص نے آکر یہ منظر دیکھا کہ سب تلبیہ پڑھ رہے ہیں قربانی کے جانور ساتھ لے کر آئے ہیں۔

"فقام رجل منهم یقال له : مکرز بن حفص" یہ شخص تو یہ کہہ کر واپس آگیا، ایک اور شخص تھا مکرز بن حفص وہ کھڑا ہوا اور کہا۔ **"دعونی آته"** میں بھی ذرا جاکے دیکھوں، کیا ہوتا ہے۔ **"فقالوا ائته . فلما اشرف علیهم قال النبی ﷺ "هذا مکرز وهو رجل فاجر"**

معلوم ہوا کہ دشمن کے کسی فرد کے بارے میں اپنے لوگوں کو آگاہ کرنا یہ غیبت میں داخل نہیں۔

"فجعل یکلم النبی ﷺ فبینما هو یکلمه إذا جاء سهیل بن عمرو" ابھی بات کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں سہیل بن عمرو آگئے۔

"قال معمر فأخبرنی أیوب، عن عکرمة: انه لماجاء سهیل بن عمرو قال النبی

علیہ ﷺ قد سھل لکم من أمرکم" اب تمہارا معاملہ آسان ہوگیا۔ یعنی آپ ﷺ نے اس کے نام سے تفاؤل کیا کہ نام سہیل ہے اس لئے اب معاملہ بھی سہل ہوگیا۔

"قال معمر: قال الزھری فی حدیثہ فجاء سھیل بن عمرو فقال: ھات أکتب بیننا وبینکم کتابا، فدعا النبی ﷺ الکاتب"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطور کاتب کے بلا کر نبی کریم ﷺ نے فرمایا **"اکتب بسم اللہ الرحمٰن الرحیم فقال سھیل: اما الرحمٰن فو اللہ ماأدری ماھی، ولکن أکتب: باسمک اللّٰھم** پہلے یہ لوگ یہی لکھا کرتے تھے **"کما کنت تکتب"** جیسا کہ پہلے لکھا کرتے تھے۔

"فقال المسلمون: واللہ لا نکتبھا الا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم تو یہی لکھیں گے۔

"فقال النبی ﷺ: أکتب باسمک اللّٰھم" کیونکہ آپ ﷺ نے پہلے فرمایا تھا کہ یہ مجھ سے جو بات بھی منوائیں گے جس میں حرمات اللہ کی تعظیم ہو میں اس کو مان لونگا۔ اب آپ ﷺ نے سوچا کہ یہ الفاظ کا ہی فرق ہے **"باسمک اللّٰھم"** بھی ہمارے لئے غلط نہیں ہے، اس لئے اس کو قبول فرمالیا۔ **"ثم قال: ھذا ماقاضی علیہ محمد رسول اللہ .... اکتب محمد بن عبد اللہ"** آپ ﷺ نے فرمایا: اگرچہ حقیقت حال تو یہ ہے لیکن چلو محمد بن عبداللہ لکھ دو۔

"قال الزھری: وذلک لقولہ: لا یسألونی خطۃ یعظمون فیھا حرمات اللہ الا اعطیتھم إیاھا فقال لہ النبی ﷺ علی ان تخلوا بیننا وبین البیت فنطوف بہ" فرمایا کہ ٹھیک ہے ہم صلح کرتے ہیں مگر اس شرط پر کہ تم ہمیں چھوڑ دو تا کہ ہم بیت اللہ جا کر طواف کرلیں۔

"فقال سھیل: واللہ لا تتحدث العرب أنا أخذنا ضغطۃ" ہم عربوں کو یہ باتیں نہیں کرنے دیں گے کہ ہمیں زبردستی داؤ میں پکڑ لیا گیا۔ **"ضغطۃ"** کے معنی ہیں دباؤ، کہ ہم نے روکا تھا مگر مسلمان دباؤ ڈال کر عمرہ کرکے چلے گئے۔

"ولکن ذلک من العام المقبل" اگلے سال آنا **"فکتب"** آپ ﷺ نے فرمایا: لکھ لو **"فقال سھیل: وعلی أنہ لا یأتیک منا رجل وان کان علی دینک الا رددتہ، قال المسلمون: سبحان اللہ، کیف یرد الی المشرکین وقد جاء مسلما؟ فبینما ھم کذلک إذ دخل أبو جندل بن سھیل بن عمرو یرسف فی قیودہ"۔**

اندازہ کریں کہ جذبات کا کیا عالم ہوگا کہ ایک طرف تو وہ ایسی شرطیں عائد کررہے جو بظاہر بہت ہی سخت ہیں اوپر سے ابوجندل رضی اللہ عنہ آگئے۔ اپنے پاؤں کی بیڑیوں میں چلتے ہوئے کہ کفار نے ظلم وستم کی انتہا کرتے

ہوئے ان کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں۔

"وقد خرج من أسفل مكة حتى رمى بنفسه بين أظهر المسلمين" پتہ نہیں بیڑیوں کی حالت میں کس طرح چل کر آئے ہوں گے، انہوں نے آکر اپنے آپ کو مسلمانوں کے سامنے ڈال دیا۔

"فقال سهيل: هذايا محمد أول من أقاضيك عليه أن ترده إلي" میں سب سے پہلے ان کو واپس کرنے کا مطالبہ کرتا ہوں، جب شرط طے ہوگئی کہ جو بھی آئیگا آپ اس کو واپس کریں گے، اب یہ آدمی آیا ہے آپ اسے واپس کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ابھی تو معاہدہ پورا نہیں لکھا گیا۔

"قال: فوالله اذا لم اصالحک علی شیء أبدا. قال النبی ﷺ: فأجزه لی" آپ ﷺ نے فرمایا چلو آئندہ کے لئے یہ معاہدہ کرو۔ لیکن یہ جو آمی اس طرح آیا ہے۔ اس کو الگ سے مستثنیٰ طور پر اجازت دے دو۔

"قال: ماأنا بمجيز ذلک لک قال: بلى فافعل" آپ ﷺ نے فرمایا ہاں کردو۔ اجازت دیدو، **"قال: ما أنا بفاعل. قال مكرز: بل قد اجزناه لک"**

مکرز وہی آدمی ہے جس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ فاجر آدمی ہے، اس کو بھی کچھ ترس آ گیا کہ چلو ہم اجازت دے دیتے ہیں۔

"قال أبو جندل: أى معشر المسلمين، أرد إلى المشركين وقد جئت مسلما؟ ألا ترون ماقد لقيت؟"

میں مسلمان ہو کر آیا ہوں پھر لوٹا دیا جاؤنگا؟ کیا دیکھ نہیں رہے ہو کہ میں کس عذاب میں مبتلا ہوں۔

"وكان قد عذب عذابا شديدا فی الله" یہ منظر دیکھنے کے باوجود نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ قبول کرلیا کہ ٹھیک ہے واپس کردیں۔

"قال: قال عمر بن الخطاب: فأتيت نبی الله ﷺ فقلت: ألست نبی الله حقا؟ قال: "بلى" قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل؟ قال: "بلى" قلت: فلم نعطى الدنية فی ديننا إذن؟" ہم کیسے برداشت کرلیں کہ ہمیں اپنے دین کے معاملے میں ذلت دی جائے؟

"قال: إنی رسول الله ولست أعصيه وهو ناصری" میں اللہ کا رسول ہوں، اسکی نافرمانی نہیں کرسکتا۔

مقصد فتح تفاخر نہیں بلکہ اللہ کی اطاعت ہے

اس وقت یہی حکم ہے چاہے دب کر ہی سہی کسی طرح صلح کرلو، فتح پانا یا شہرت حاصل کرنا تو مقصود نہیں، مقصود اللہ جل جلالہ کی اطاعت ہے۔ جب وہ اس میں خوش ہے کہ ہم دب کر صلح کریں تو اسی میں میرے لئے خیر

ہے۔ **"وھو ناصری"** اور وہ ہماری مدد کرے گا۔

"قلت أوليس كنت تحدثنا انا سنأتي البيت فنطوف به؟" کیا آپ نے خبر نہیں دی تھی کہ ہم بیت اللہ جائیں گے اور طواف کریں گے۔ **"قال : بلی ، فأخبرتک أنا نأتيه العام؟"** کیا میں نے یہ خبر دی تھی کہ اسی سال کریں گے؟ **"قال : قلت لا قال : فإنك آتيه و مطوف به"** آؤ گے اور طواف کرو گے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ **"فأتيت أبابكر"** پھر بھی چین نہیں آیا اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا **"فقلت يا أبابكر ، أليس هذا نبي الله حقا، قال : بلى قلت: ألسنا على الحق وعدونا على الباطل ؟قال :بلى قلت : فلم نعطي الدنية في ديننا إذن ؟ قال :أيها الرجل إنه لرسول الله"**.

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا مقام

یہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں کہ جو بات زبان رسالت سے نکلی وہی بات یہ بھی کہہ رہے ہیں حالانکہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ حضور اکرم ﷺ نے یہی بات فرمائی ہے۔ فرمایا: **"وليس يعصي ربه وهو ناصره، فاستمسك بغرزه"** ان کا کنڈا پکڑ کر رکھو، کسی حالت میں بھی نہ چھوڑو۔

"فوالله أنه على الحق، قلت : أليس كان يحدثنا أنا سنأتي البيت فنطوف به ؟ قال: بلى افأخبرك أنك تأتيه العام ؟" جو جواب رسول ﷺ نے دیا تھا وہ جواب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی دے رہے ہیں **"قلت :لا قال: فإنك آتيه ومطوف به"**.

"قال الزهري :قال عمر :فعملت لذلك أعمالا" بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر بہت چکر کاٹے کہ یہ کیا ہو رہا ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسا انسان جو **"اشد هم في امر الله"** ہے اس کے سامنے یہ سب کچھ ہو رہا ہے کہ ابو جندل رضی اللہ عنہ جیسا شخص جو بیڑیاں پہنے ہوئے آیا تھا اسے واپس کیا جا رہا ہے۔ یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہی حوصلہ تھا کہ سرکار دو عالم ﷺ کے حکم پر برداشت کر جاتے تھے۔

لیڈر کیسا ہو؟

ہمارے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ لیڈر وہ ہے جو اگر عوام کو چڑھائے تو اتار بھی سکے، اگر جوش دلانے کے بعد ضرورت پیش آئے تو اس جوش کو ٹھنڈا بھی کر سکے اصل لیڈر وہ ہے۔

آج کل کے لیڈر جوش چڑھا تو دیتے ہیں لیکن اتارنا ان کے بس سے باہر ہوتا ہے پھر وہ خود عوام کے پیچھے بھاگتے ہیں کہ اگر ہم یوں کر دیں گے تو عوام ہماری جان کھا جائیں گے، تکہ بوٹی کر دیں گے، ہماری لیڈری تباہ ہو جائے گی۔

اب یہ مقام ایسا ہے کہ بظاہر سارے حالات دبنے کے ہیں اور لوگوں کا جوش وخروش کا پارہ چڑھا ہوا ہے اس موقعہ پر اس کو اتارنا یہ رسول اللہ ﷺ ہی کر سکتے ہیں۔

فرمایا کہ **"فلما فرغ من قضية الكتاب"** جب معاہدہ لکھا گیا، **"قال رسول الله ﷺ لاصحابه: قوموا فانحروا ثم احلقوا"** تو حضور ﷺ نے صحابہ ؓ سے فرمایا کہ کھڑے ہو کر قربانی کرو اور حلق کرو یعنی اب آگے طواف کرنے کے لئے نہیں جانا۔

"قال: فو الله ماقام منهم رجل" ساری سیرت طیبہ میں ایک تنہا واقعہ ہے کہ جس میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ کرو اور حلق کرانے کے لئے اور قربانی کرنے کے لئے کوئی کھڑا نہیں ہوا۔

اس وقت صحابہ کرام ؓ کی حالت کا ہم اور آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ان پر کیا گزر رہی ہوگی، معاذ اللہ ان کا مقصد معصیت یا نافرمانی نہیں تھا بلکہ یہ خیال تھا کہ شاید کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے اس لئے حلق میں جلدی نہ کریں، یہ انسان کی ایک کیفیت ہوتی ہے کہ ٹھیک ہے اب کرنا تو ہے پھر جلدی کیا ہے آرام سے کریں، شاید کچھ اور حالات پیش آجائیں۔ تو کھڑے نہیں ہوئے۔

"حتى قال ذلك ثلث مرات. فلما لم يقم منهم أحد" تین مرتبہ فرمایا، کوئی بھی کھڑا نہیں ہوا تو آپ ﷺ حضرت ام سلمہؓ کے پاس تشریف لے گئے اور بطور شکایت یہ واقعہ بیان فرمایا۔ ام المؤمنین ام سلمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ صلح مسلمانوں پر بہت شاق گزری ہے، جس کی وجہ سے افسردہ دل اور شکستہ خاطر ہیں اس وجہ سے تعمیل ارشاد نہیں کر سکے تو کیا آپ چاہتے ہیں کہ لوگ حلق اور نحر کریں۔

آپ کسی سے کچھ نہ کہئے۔ بس آپ خود باہر تشریف لے جائیں اور اپنے بدنہ کی قربانی کر دیجئے اور اپنا حلق کرا لیجئے پھر دیکھئے کیا ہوتا ہے؟

"فخرج فلم يكلم أحدا منهم حتى فعل ذلك............قاموا فنحروا" چنانچہ ایسا ہی ہوا آپ ﷺ کے قربانی کرتے ہی صحابہ کرام ؓ نے دیکھا تو سب نے شروع کر دیا کہ ایک دوسرے کا حلق کرنے لگے، حلق کرنے والوں کا اتنا ہجوم تھا کہ گویا قریب تھا کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیتے، یعنی دھکا پیل پڑ گئی۔

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی فراست دیکھئے کہ صحابہ کرام ؓ غم کی حالت میں تھے وہ جان گئیں کہ اس وقت زبانی کہنے سے اتنا اثر نہیں ہوگا، لیکن جب وہ آپ ﷺ کو دیکھیں گے کہ آپ کر رہے ہیں تو ان سے رہا نہیں جائے گا پھر وہی کریں گے جو آپ ﷺ کر رہے ہیں۔ اگر زبان سے سننے کے بعد تعمیل میں سستی کر رہے ہیں تو آپ ﷺ کو دیکھنے کے بعد نہیں رک پائیں گے۔

"ثم جاءه نسوة مؤمنات، فأنزل الله تعالى:

﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْٓا إِذَا جَآءَ كُمُ الْمُؤْمِنَاتُ

مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوهُنَّ ۖ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۖ لَاهُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَ لَاهُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۖ وَ اٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۖ وَ لَاجُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۖ وَ لَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ ﴾[۱۰]

ترجمہ: ''اے ایمان والوں جب آئیں تمہارے پاس ایمان والی عورتیں وطن چھوڑ کر تو ان کو جانچ لو اللہ خوب جانتا ہے ان کے ایمان کو پھر اگر جانو کہ وہ ایمان پر ہیں تو مت پھیرو، ان کو کافروں کی طرف، نہ یہ عورتیں حلال ہیں ان کافروں کو اور نہ وہ کافر حلال ہیں ان عورتوں کے لئے اور دے دو ان کافروں کو جو ان کا خرچ ہوا ہو اور گناہ نہیں تم کو کہ نکاح کرلو ان عورتوں سے جب ان کو دو ان کے مہر اور نہ رکھو اپنے قبضہ میں ناموس کافر عورتوں کے''۔

''فطلق عمر ﷺ یو مئذ امراتین کا نتاله فی الشرک'' جب یہ آیت نازل ہوئی کہ کافر عورتوں کو اپنے نکاح میں نہ رکھو تو حضرت عمر ﷺ نے دو عورتوں کو طلاق دی۔

''ثم رجع النبی ﷺ إلی المدینة'' پھر آپ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے۔ **''فجاء ہ أبو بصیر رجل من قریش وھو مسلم''** قریش کے ایک صاحب ابوبصیر مسلمان ہو کر آئے، **''فارسلوا فی طلبه رجلین''** وہ کم بخت ایسے تھے کہ اگر ایک آدمی چلا گیا تو چلا گیا، لیکن اس کی طلب میں بھی دو آدمی بھیجے کہ اس کو پکڑ کر لاؤ۔

''فقالوا: العھد الذی جعلت لنا'' حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ آپ نے عہد کیا تھا کہ اگر کوئی آدمی آئے گا تو آپ واپس کریں گے۔ تو ابوبصیر ﷺ کو ان دو آدمیوں کے حوالے کر دیا۔

''فخرجابه حتی بلغاذاالحلیفة'' یہ لے کر چلے یہاں تک کہ ذوالحلیفہ تک پہنچے۔ وہاں بیٹھ کر انہوں نے کھجور کھانی شروع کردی۔ تو ابوبصیر ﷺ نے ان میں سے ایک سے کہا کہ آپ کی یہ تلوار بڑی اچھی معلوم ہو رہی ہے۔ اگلے نے جوش میں آکر تلوار نکال کر کہا ہاں، ہم نے اس کا بہت تجربہ کیا ہے بڑی عمدہ تلوار ہے۔

---

[۱۰] [الممتحنة: ۱۰]

"فقال أبو بصیر: أرني انظر إليه" ابو بصیرؓ نے کہا مجھے دکھاؤ، تو اس شخص نے تلوار ابو بصیرؓ کو دے دی، ابو بصیرؓ نے فوراً اس پر وار کر کے اس کا کام تمام کر دیا۔ دوسرے نے جب یہ منظر دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا بھاگ کر مکہ جانے کے بجائے واپس مدینہ آیا حضور اقدس ﷺ کے پاس گویا شکایت کرنے کے لئے۔ دوڑتا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔

"فقال رسول الله ﷺ حين راه" آپ ﷺ نے جب اس کو آتا دیکھا تو فرمایا، اس نے کوئی گھبرانے والی بات دیکھی ہے، جو بھاگتا ہوا آرہا ہے۔ تو اس نے کہا کہ میرا ساتھی تو مر گیا میں بھی مرنے والا ہوں۔ اس کے بعد ابو بصیرؓ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذمہ داری پوری کر دی کہ آپ ﷺ نے مجھے واپس بھیج دیا تھا۔ اللہ نے مجھے بعد میں ان سے نجات دے دی۔ اس واسطے اب آپ کے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

"قال النبي ﷺ ويل أمه مسعر حرب لو كان له أحد" یہ پیغمبرانہ جملہ ہے۔ اس کا لفظی معنی ہے کہ اس کی ماں کا برا ہو، اس کی ماں پر افسوس، یہ بے تکلفی میں کہا جاتا ہے بد دعا مراد نہیں ہے۔ **"مسعر حرب لو كان له أحد"** اگر اس کے ساتھ کوئی مل جائے تو یہ جنگ کی آگ بھڑکانے والی ہے۔

اس جملہ سے آپ ﷺ نے بظاہر اس کافر کے سامنے جو سن رہا تھا ان کے اس فعل پر نکیر فرمائی کہ یہ تو بڑا جنگجو آدمی ہے، جنگ کی آگ کو بھڑکا دے گا، اگر یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو آج ایک کو مارا ہے، کل دوسرے کو مارے گا اور دوسری طرف حضرت ابو بصیرؓ کے لئے ایک خفیف سا اشارہ تھا کہ جب اللہ نے تیرے اندر صلاحیت رکھی ہے کہ اگر تو چاہے تو جنگ کی آگ کو بھڑکا دے، اگر کوئی اس کے ساتھ مل جائے اشارہ تھا کہ تم ہم سے کچھ نہ کہو لیکن کہیں جا کر اپنا مرکز بنا لو، وہاں تمہارے پاس دوسرے لوگ آ کر جمع ہو جائیں گے اور تم ان مشرکین کے ناک میں دم کر سکتے ہو۔

"فجعل لا يخرج من قريش رجل قد أسلم الا لحق بأبي بصير" جو بھی اسلام لاتا، وہ وہاں سے آ کر سیدھا ابو بصیرؓ کے لشکر میں شامل ہو جاتا۔ **"حتى اجتمعت منهم عصابة"** یہ چھاپہ مار دستہ تیار ہو گیا۔

"فوالله مايسمعون بعير خرجت لقريش إلى الشام إلا اعترضوا لها" اب قریش کا جو قافلہ بھی شام کی طرف جاتا یہ راستہ میں اس کی تواضع کرتے، ان کو قتل کر دیتے اور ان کے مال چھین لیتے۔ آخر میں عاجز آ کر قریشیوں نے نبی کریم ﷺ کے پاس پیغام بھیجا، اللہ کی قسم دیتے ہوئے، رشتہ داری کا واسطہ دیتے ہوئے **"لما أرسل"**۔ **"لما"** معنی میں **"الا"** کے ہے یعنی **"ينا شدك إلا أن تفعل كذا"** میں اللہ کو آپ کے خلاف پکارتا ہوں مگر یہ کہ آپ یہ کام کر دیں تو نہیں پکاروں گا کہ ان کے پاس پیغام بھیجیں۔

"فمن أتاه فهو آمن" کہتے ہیں کہ اس وقت ان کو پیغام دے دیں، خدا کرے کہ یہ ہمارے اوپر سے یہ عذاب ختم کریں اور ہماری جان چھوڑیں۔ اس کے بعد جو تمہارے پاس آئیگا، ہم واپس نہیں بلائیں گے سب امن کے ساتھ آسکیں گے۔ پھر جو حضور ﷺ کے پاس آئے گا وہ آمن ہوگا۔

"فارسل النبی ﷺ الیھم" آپ ﷺ نے ابوبصیر رضی اللہ عنہ کو پیغام بھیجا کہ اب کافی کام ہوگیا ہے اب چھوڑ دو تم بھی آجاؤ اور دوسرے لوگ بھی آجائیں گے۔

۲۷۳۳ - وقال عقيل عن الزهری : قال عروة : فأخبرتني عائشة أن رسول الله ﷺ كان يمتحنهن . وبلغنا أنه لما أنزل الله تعالى أن يردوا إلى المشركين ما انفقوا على من هاجر من أزواجهم وحكم على المسلمين أن لا يمسكوا بعصم الكوافر ،أن عمر طلق امرأتين قريبة بنت أبي أمية. وابنة جرول الخزاعي،فتزوج قريبة معاوية بن ابى سفيان ، وتزوج الأخرى أبو جهم .فلما أبى الكفار أن يقروا بأداء ما أنفق المسلمون على أزواجهم أنزل الله تعالى: ﴿وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ﴾[۱۱] والعقب ما يؤدى المسلمون إلى من هاجرت امرأته من الكفار، فأمر أن تعطى من ذهب له زوج من المسلمين ما أنفق من صداق نساء الكفار اللاتی هاجرن ، وما نعلم أحد من المهاجرات ارتدت بعد إيمانها. وبلغنا أن أبا بصير بن اسيد الثقفی قدم على النبی ﷺ مؤمنا مهاجرا في المدة ، فكتب الأخنس بن شريق إلى النبی ﷺ يسأله أبا بصير، فذكر الحديث.

[راجع: ۲۷۱۳]

اس کے بعد جو خواتین آتی تھیں، آپ امتحان لیتے تھے اور پھر بیعت فرماتے تھے۔ کیونکہ حضور اقدس ﷺ کی تعبیر کے مطابق مردوں کو واپس کرنے کا معاہدہ تھا، عورتوں کو واپس کرنے کا نہیں تھا۔

سورۃ ممتحنہ کے اندر جو آیات آئی ہیں ان میں ایک حکم یہ بھی تھا کہ اب کافر عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز نہیں ہے، اگر کوئی عورت مکہ مکرمہ میں کسی کافر شوہر کے نکاح میں تھی اور وہ مسلمان ہو کر ہجرت کر کے آئی ہے تو اس کا نکاح ختم ہوگیا لیکن یہاں مدینہ منورۃ میں جو مسلمان، اس عورت سے نکاح کرے تو اس عورت کے کافر شوہر نے اس پر جو کچھ خرچ کیا تھا مہر وغیرہ یہ مسلمان شوہر اس کو واپس کرے۔

اسلام کا انصاف دیکھیں کہ یہ حکم جاری کیا کہ جو عورت مکہ سے مہاجرہ بن کر آئی ہے اس کا نکاح تو ختم ہوگیا لیکن اس کے کافر شوہر کو ڈبل سزا نہ دی جائے گی اس نے جو مال خرچ کیا تھا وہ مسلمان جو اس عورت سے

---

۱۱ [الممتحنة: ۱۱]

نکاح کرے وہ اس کو واپس کردے۔

اس کا تقاضا یہ تھا کہ اس کے برعکس بھی ہو کہ اگر خدانہ کرے کوئی عورت مسلمانوں کے پاس سے کافروں کے پاس چلی گئی اور وہاں کسی کافر سے اس کا نکاح ہوگیا، تو اس کو چاہئے کہ وہ مسلمانوں کا نفقہ واپس کردے۔

ایسا تو بکثرت ہوا کہ عورتیں وہاں سے مسلمان ہوکر آئیں اور مسلمانوں کے نکاح میں آئیں، مسلمانوں نے پھر ان کا نفقہ واپس کیا، لیکن ایسا واقعہ کہ یہاں سے کوئی عورت گئی ہو صرف ایک کافر عورت جو مشہور کافر کی بیٹی تھی وہ چلی گئی تو مسلمانوں نے کہا کہ جس طرح ہم خرچہ بھیجتے ہیں تم بھی دو، انہوں نے کہا کہ ہم نہیں دیتے، انہوں نے خرچہ نہیں دیا، یہاں اسی کی طرف اشارہ کررہے ہیں کہ **"انه لما أنزل الله تعالى أن يردوا الى المشركين .... وتزوج لاخرى ابو جهم"** اور دوسری سے ابوجہم نے نکاح کرلیا۔

فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت میں بھی یہ آتا ہے کہ جب ان کو ان کے شوہر نے طلاق دی، تو کہتی ہیں **"فخطبني معاوية وأبو جهم"** انہی دونوں کا ذکر آتا ہے کہ انہوں نے پیغام نکاح دیا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ **"أما معاوية .... لا مال له. وأما أبو جهم فهو ...... للنساء"**.

یہاں پر بھی انہوں نے نکاح کرلیا **"فلما أبى الكفار .... وما نعلم أحدا من المهاجرات ارتدت بعد ايما نهن"** مہاجرات میں سے کوئی بھی مرتد نہیں ہوئی، ہم نے جو کہا تھا وہ ابو سفیان کی بیٹی ام الحکم تھی، بعد میں واپس آگئیں، اللہ جل جلالہ نے ان کو بھی ایمان کی توفیق دے دی۔

"ابلغنا أن أبا بصير بن أسيد الثقفي قدم على النبي ﷺ مومنا مهاجرا في المدة" یہ مدت میں ہی آگئے۔

(۱۶) باب الشروط في القرض

وقال ابن عمر وعطاء رضي الله عنهما : إذا أجله في القرض جاز.

۲۷۳۴ ـ وقال الليث : حدثني جعفر بن ربيعة، عن عبد الرحمٰن بن هرمز، عن أبي هريرة ﷺ عن رسول الله ﷺ : أنه ذكر رجلا سأل بعض بني إسرائيل أن يسلفه ألف دينار، فدفعها إليه إلى أجل مسمى. [راجع : ۱۴۹۸].

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے جو پہلے کئی مرتبہ گزر چکی ہے کہ ایک ہزار دینار کسی کے قرض دینے تھے بعد میں پھر سمندر میں پھینک دئے تھے۔

اس میں جو لفظ ہے **"أن يسلفه الف دينار، فدفعها إليه إلى أجل مسمّى"** اس سے اس

بات پر استدلال کیا ہے کہ قرض میں تاجیل جائز ہے اور قرض تاجیل کو قبول کرتا ہے۔ یعنی اگر قرض میں کوئی اجل مقرر کر لی جائے تو قرض مؤجل ہو جاتا ہے، جس کے معنی یہ ہیں کہ مقرض کو اس اجل کے آنے سے پہلے مطالبہ کا حق نہیں ہے، امام مالک رحمہ اللہ کا یہ مذہب ہے۔[۱۲]

قرض تاجیل کو قبول نہیں کرتا

مسلک جمہور وحنفیہ

لیکن جمہور کے نزدیک جن میں حنفیہ بھی داخل ہیں، قرض تاجیل کو قبول نہیں کرتا۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ چاہے ایک مرتبہ کوئی وقت مقرر کر لیا جائے اس کے باوجود مقرض کو ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اپنے قرض کا مطالبہ کر لے۔

اور حدیث میں جو **"الی أجل مسمی"** کا لفظ آیا ہے تو اس میں صرف اتنی بات ہے کہ قرض دینے والے نے ایک اجل مقرر کی تھی لیکن اس اجل کو مقرر کرنے کا قضاءً بھی اعتبار تھا اس پر حدیث میں دلالت نہیں ہے، لہٰذا مقرر کرنے کا حق تو حاصل ہے اور شاید میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ یہ دیانۃً ایک وعدہ ہے تو وعدہ ہونے کے اعتبار سے مقرض کو چاہئے کہ وہ اس اجل سے پہلے مطالبہ نہ کرے یہ مکارم اخلاق میں سے ہے۔

لیکن جو گفتگوئے نزاع ہے وہ قضاء کے اندر ہے کہ اگر قاضی کے پاس فیصلہ چلا گیا تو قاضی مقرض کے حق میں فیصلہ کر دے گا۔ تو اس موضوع پر حدیث مرفوع میں کوئی دلالت نہیں ہے۔ البتہ عبداللہ بن عمرؓ اور عطاء کا قول نقل کیا ہے کہ **"إذا أجله في القرض جاز"** قرض میں تاجیل کر دے تو جائز ہو جاتی ہے یہ بیشک ان کا مسلک ہے اور اسی پر امام مالکؒ کا بھی عمل ہے۔

لیکن حنفیہ اور جمہور کہتے ہیں کہ قرض ایک عقدِ تبرع ہے اور تبرع میں مقرض کو کسی بات کا پابند بنانا درست نہیں ہے۔[۱۳]

(۱۸) باب ما يجوز من الاشتراط، والثنيا في الإقرار، والشروط التي يتعارفه الناس بينهم.

"وإذا قال: مائة إلا واحدة أو ثنتين".

---

[۱۲] التاج والاكليل، ج:۴، ص:۵۴۲، والمدونة الكبرى، ج:۹، ص:۹۳، مطبع: دار صادر، بيروت.

[۱۳] لم أجله أجلا معلوما صار مؤجلا وكل دين حال إذا أجله صاحبه صار مؤجلا إلا القرض. (بداية المبتدى، ج:۱، ص:۱۳۹، وحاشيه ابن عابدين، ج:۵ ص:۳۱۸).

مطلب

اس ترجمۃ الباب میں امام بخاری رحمہ اللہ نے کئی مسائل بیان فرمائے ہیں۔

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی کے لئے اقرار کرے اور اس میں کوئی شرط لگائے' پھر آگے شرط کی تشریح کردی کہ استثناء کرے، تو آیا وہ استثناء جائز ہے یا نہیں؟

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ ایک اصولی مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو فقہاء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے، اور وہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی رقم کا اقرار کرے اور پھر اس مقر بہ میں سے کچھ استثناء کرے تو آیا یہ استثناء کرنا علی الاطلاق جائز ہے یا اس کے جائز ہونے کے لئے کچھ شرطیں ہیں؟

جمہور کا مسلک

جمہور کہتے ہیں کہ یہ استثناء علی الطلاق جائز ہے لیکن بعض مالکیہ جیسے ابن ماجشون وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ اگر استثناء قلیل کا کثیر سے ہو تب تو معتبر ہے، جیسے کہا **"لہ علی مائۃ إلا واحدۃ"** تو مستثنیٰ منہ مائۃ ہے جو کثیر ہے اور مستثنیٰ واحد ہے جو قلیل ہے، لہٰذا یہ استثناء جائز اور معتبر ہے۔[۱۴]

لیکن اگر کثیر کا استثناء قلیل سے ہو تو وہ غیر معتبر ہے۔ مثلاً کوئی شخص کہے **"لہ علی مائۃ إلا تسع وتسعون"** (۱۰۰) سو ہیں مگر ننانوے کم۔ تو مالکیہ جیسے ابن ماجشون یہ کہتے ہیں کہ یہ استثناء معتبر نہیں۔ کیونکہ یہ تو مذاق ہوا کہ سو مگر سو میں سے ننانوے کم۔ گویا ایک طرح اپنے ثابت اقرار سے رجوع کر رہا ہے کہ سو کا اقرار کر لیا تھا، اب ننانوے کا رجوع کر رہا ہے تو یہ معتبر نہیں ہوگا۔

دوسرے الفاظ میں ان کے اصول مسلک کی تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اگر استثناء قلیل کا کثیر سے ہو تب وہ استثناء ہے اور بیان تغییر ہے۔ اور اگر استثناء کثیر کا قلیل سے ہو تو اس کو بیان تبدیل یعنی نسخ قرار دیتے ہیں۔ گویا اس نے ثابت اقرار سے رجوع کر لیا، اس کو منسوخ کر لیا۔ اور آدمی ایک مرتبہ جو اقرار کر لے اس کو منسوخ نہیں کر سکتا۔ اس واسطے وہ اس کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یوں کہے۔ **"لہ علی مائۃ إلا تسع و تسعون"** تو پورے سو واجب ہوں گے، کیونکہ آگے جو کہہ رہا ہے وہ رجوع ہے جو جائز نہیں۔

اس کے برخلاف حنفیہ کا مسلک یہ ہے جو اصول فقہ وغیرہ میں مذکور ہے کہ استثناء کا مطلب ہوتا ہے **"تکلم بالباقی بعد الثنیا"** اس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ جب تک استثناء نہیں کیا تھا اس وقت تک کوئی چیز ثابت، لازم نہیں ہوئی، استثناء کے بعد جو چیز نکلے گی، اس کا تکلم ہوگا جب کہا **"لہ علی مائۃ الا تسع و تسعون"** تو باقی ایک رہا تو تکلم اور اقرار **"با لوحدۃ"** ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ پہلے (۱۰۰) سو کا اقرار ہوا اور پھر اس میں

---

[۱۴] عمدۃ القاری ج: ۹، ص: ۶۵۴.

سے ننانوے سے رجوع کرلیا گیا ہو بلکہ جو باقی بعد الثنیا ہے اس کا تکلم ہے، لہٰذا وہ قلیل ہو یا کثیر دونوں صورتوں میں جائز ہوگا۔[۱۵]

جمہور کا استدلال

جمہور اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں شیطان سے خطاب کرکے فرمایا ﴿**إلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ**﴾[۱۶] یہاں ان لوگوں کو مستثنیٰ کیا ہے جو شیطان کی اتباع کریں گے، گمراہ ہوں گے۔ یہ بات طے ہے کہ شیطان کے متبعین زیادہ ہیں۔ اب گمراہوں کی تعداد زیادہ ہونے کے باوجود قرآن کریم نے ان کا استثناء کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ کثیر کا استثناء قلیل سے بھی جائز ہے۔[۱۷]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ "**والثنيا في الإقرار، والشروط التي يتعارفه الناس بينهم، وإذا قال: مائة إلا واحدة أو ثنتين**".

"**وقال ابن عون، عن ابن سيرين، قال الرجل لكريه: أدخل ركابك، فإن لم أرحل معك يوم كذا وكذا فلك مائة درهم فلم يخرج، فقال شريح: من شرط على نفسه طائعا غير مكره فهو عليه. وقال أيوب، عن ابن سيرين: إن رجلا باع طعاما وقال: إن لم آتك الأربعاء فليس بيني وبينك بيع، فلم يجيء فقال شريح للمشتري: أنت أخلفت فقضى عليه**".

دوسرا مسئلہ بیان کررہے ہیں کہ ابن عون نے ابن سیرین سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے کہا "**قال الرجل لكريه: ادخل ركابك، فإن لم أرحل معك يوم كذا وكذا فلك مائة درهم فلم يخرج**" کہ ایک شخص نے اپنے کرّی سے کہا، کرّی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنی سواری کرایہ پر دیتا ہو۔

کوئی شخص سواری والے کو کہتا ہے کہ اپنی سواریوں کو تیار رکھو، کجاوے کسو، اگر میں تمہارے ساتھ فلاں فلاں دن تک سفر نہ کروں اور تمہاری سواری کو استعمال نہ کروں تو "**فلك مائة درهم**" تمہیں سو درہم دوں گا۔ مثلاً فرض کریں کسی سواری والے سے کہا مجھے جمعہ کے دن سفر میں جانا ہے تم میرے لئے سواری تیار کرو، اس نے کہا کہ مجھے کیا پتا کہ آپ جائیں گے یا نہیں۔ میں تیار کروں، کجاوہ کسوں، اس پر محنت کروں اور آپ پھر بھی نہ جائیں وہ کہتا ہے کہ اگر میں نہ گیا تو تمہیں سو درہم دوں گا۔

"**فلم يخرج**" بعد میں وہ اس دن نہیں گیا، تو قاضی شریح نے فیصلہ کیا کہ جس شخص نے اپنے ذمہ خوشی سے کوئی رقم واجب کرلی، اس کو اس پر مجبور نہیں کیا گیا تھا تو وہ اس کے ذمہ لازم ہوگی۔

---

۱۵ بحث كون الإستثناء من صور بيان التغيير، اصول الشاشي، ص: ۲۵۲.

۱۶ [الحجر: ۴۲] ۱۷ عمدة القاري، ج: ۹، ص: ۲۵۴.

گویا یہ وہ ہے جس کو عربون کا بیعانہ کا مسلک بنایا تھا کہ وہ اس طرح کی ایک بات ہے کہ اگر میں نہ نکلا تو تم کو اتنے پیسے دوں گا۔ یا تو اس کو عربون پر قیاس کرلیں یا وعدہ کے لازم ہونے پر قیاس کرلیں کہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جاؤں گا، اگر نہ گیا تو اتنے پیسے دوں گا۔ قاضی شریح نے اس کو جائز قرار دیا ہے۔

مالکیہ کے ہاں بھی اس پر عمل ہے۔ مالکیہ کہتے ہیں اگر کسی شخص نے اپنے وعدہ کے ذریعہ دوسرے کو مؤنت میں داخل کر دیا تو پھر وعدہ کا ایفاء لازم ہے، اگر اس صورت میں اس نے اپنے ذمہ کچھ پیسے لازم کر دیئے ہیں تو ان کی ادائیگی بھی ضروری ہوگی۔

لیکن حنفیہ جمہور کا کہنا یہ ہے کہ اس سے اس کے ذمہ قضاءً پیسے نہیں لازم ہوتے، اس لئے کہ حنفیہ اس کو قمار میں داخل کرتے ہیں۔ قمار کہتے ہیں **"تعليق التمليک علی الخطر"** کو تو یہ بھی **"تعليق التمليک علی الخطر"** ہے۔ اگر میں نہ گیا تو تمہیں سو (۱۰۰) درہم کا مالک بناؤں گا۔

حنفیہ کے نزدیک **"تمليک خطر"** پر معلق نہیں ہوتی، خطر پر معلق ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کسی ایسے واقعہ سے معلق کر دینا جس کے واقع ہونے اور نہ ہونے، دونوں کا احتمال ہو۔ اور یہاں پر یہی بات ہے، لہٰذا اس پر ایک طرح سے قمار کی تعریف صادق آتی ہے، اس لئے وہ اس کو جائز قرار نہیں دیتے۔

"وقال أيو ب عن ابن سيرين : إن رجلا با ع طعاما" محمد بن سیرینؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے طعام فروخت کیا، **"وقال : إن لم آتک الإربعاء فليس بيني و بينک بيع"**.

ابن سیرین کا قول حنفیہ کی تائید ہے

اس نے کہا اگر میں بدھ کے دن تک تمہارے پاس یہ چیز لینے کے لئے نہ آیا تو میرے اور تمہارے درمیان بیع نہیں۔ مثلاً گندم خریدی اور **"بعت و اشتريت"** کر کے بیع پوری ہو گئی لیکن مشتری نے گندم پر قبضہ نہیں کیا اور کہا کہ میں بدھ کے دن پیسے لا کر تمہیں دوں گا اور گندم اٹھالوں گا۔ لیکن اگر میں بدھ کے دن نہ آیا تو سمجھ لینا کہ بیع ختم۔

"خيار النقد"

اگر میں نے فلاں دن تک پیسے ادا نہیں کئے تو سمجھو بیع نہیں اگرچہ شروع میں بیع منعقد ہو گئی تھی لیکن بعد میں کہا کہ اگر فلاں تاریخ تک پیسے ادا نہ کئے، یا بائع کہے کہ اگر تم نے فلاں تاریخ تک پیسے ادا نہ کئے تو بیع ختم، اس کو حنفیہ کی اصطلاح میں **"خيار النقد"** کہتے ہیں۔

حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک **"خيار النقد"** جائز ہے۔ حنفیہ کا مسلک ابن سیرینؒ کے اسی قول کے مطابق

ہے جو یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تو حنفیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر بیع کے اندر یہ شرط لگائے تو جائز ہے اور اگر اس تاریخ تک وہ پیسے لے کر نہیں آیا تو بیع خود بخود فسخ ہو جائے گی۔ [۱۸]

شافعیہ اور مالکیہ کہتے ہیں کہ یہ شرط باطل ہے جو بیع ہوگئی وہ ہوگئی، اگر وہ اس دن تک نہ آیا تب بھی بیع لازم ہے اور اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ آ کر پیسے ادا کرے اور مبیع کو اٹھا کر لیجائے۔ آگے کہتے ہیں **"فقال شريح للمشتري"** جب قاضی شریح کے زمانہ میں یہ بات ہوئی اور ان کے پاس مقدمہ گیا تو انہوں نے مشتری سے کہا **"أنت أخلفت"** تو نے خلاف ورزی کی، تجھے بدھ کے دن تک پیسے لا کر دے دینے چاہئے تھے تو نے پیسے لا کر نہیں دیئے **"فقضی علیه"** قاضی شریح نے اس کے خلاف فیصلہ دیا کہ اب تمہاری بیع فسخ ہو چکی ہے۔ [۱۹]

۲۷۳۶ ۔ حدثنا أبو اليمان: أخبر شعيب: حدثنا أبو الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة ﷺ، أن رسول الله ﷺ قال: ((إن لله تسعة وتسعين اسما، مائة إلا واحدا من أحصاها دخل الجنة)). [أنظر: ۶۴۱۰، ۷۳۹۲] [۲۰]

یہاں **"مائة"** میں ایک کا استثناء فرمایا، گویا **"تکلم بالباقی"** ہوگیا، پہلے خود فرمایا **"تسعة وتسعين"** اور پھر اس کی تشریح کر دی **"مائة إلا واحدا"** یہ اس بات کی دلیل ہے کہ **"استثناء تکلم بالباقی بعد الثنيا"** ہوتا ہے۔

ننانوے اسماء حسنیٰ، **"من احصاها دخل الجنة"** جو ان کا احاطہ کر لے وہ جنت میں داخل ہوگا۔

"من احصاها" احاطہ کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس کی مختلف تشریحات ذکر کی گئی ہیں اور اس کے مختلف مدارج ہیں، **"احصاء الاسماء الحسنی"** کا سب سے اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ **"اسماء الحسنی"** میں جتنی صفات بیان کی گئی ہیں۔ آدمی ان سے

---

[۱۸] وهذا ايضا مذهب أبي حنيفة واحمد و إسحاق، وقال مالك والشافعي وآخرون : يصح البيع و يبطل الشرط، عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۶۵۵.

[۱۹] وهذا ايضا مذهب أبي حنيفة واحمد و إسحاق، وقال مالك والشافعي وآخرون : يصح البيع و يبطل الشرط، عمدة القاری، ج: ۹، ص: ۶۵۵.

[۲۰] وفي صحيح مسلم، كتاب الذكر و الدعاء و التوبة و الإستغفار، باب في اسماء الله تعالىٰ وفضل من احصاها، رقم: ۴۸۳۵، وسنن الترمذي، كتاب الدعوات عن رسول الله، باب ماجاء في عقد التسبيح باليد، رقم: ۳۴۲۸، ۳۴۲۹، وسنن ابن ماجة، كتاب الدعاء، باب أسماء الله عزوجل، رقم: ۳۸۵۰، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۳۰۴، ۷۷۹۹.

متصف ہونے کی کوشش کرے۔ سوائے اللہ کے، کہ اللہ اگرچہ اسماء حسنیٰ میں سے ہے لیکن یہ اسم ذات ہے، نہ یہ کسی دوسرے کی طرف منتقل ہوسکتا ہے اور نہ اس کی صفت براہ راست منتقل ہوسکتی ہیں۔ البتہ جو اسماء صفاتیہ ہیں جیسے رحمٰن، رحیم تو ان صفات کے اخلاق سے متخلق ہونا مراد ہے۔ اور یہ احصاء کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

بعض حضرات نے فرمایا کہ ''احصا'' سے مراد یاد کرنا ہے کہ جو یاد کرلے وہ بھی جنت میں داخل ہوگا۔

بعض نے کہا ہے کہ ان کو یاد کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے معانی کو بھی محفوظ کرنا۔ تو یہ سب تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔[۲۱]

---

[۲۱] فیض الباری، ج:۳، ص: ۴۰۷، وعمدۃ القاری، ج:۹، ص: ۶۵۷.

كتاب الوصايا

٢٧٣٨ - ٢٧٨١

۵۵- کتاب الوصایا

(۱) باب الو صايا

وقول النبی ﷺ :((وصية الر جل مكتوبة عنه)). وقال الله عزو جل :﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ اَحَدَ كُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْر اً الوَ صِيَّةُ لِلْوَ الِدَ يْنِ ﴾إلى ﴿جَنَفاً ﴾[۱]

﴿جنفا﴾ :ميلا، ﴿متجا نف﴾: متما يل.

۲۷۳۸ ــ حدثنا عبدا لله بن يو سف : أخبر نا مالك ، عن نافع، عبدالله بن عمر رضى الله عنهما:أن رسول الله ﷺ قال: ((ماحق امرئ مسلم له شيئ يو صى فيه يبيت ليلتين إلا ووصيته مكتو بة عنده)).

"تابعه محمدبن مسلم ، عن عمرو، عن ابن عمر عن النبی ﷺ "[۲]

فرمایا کہ "له شيئ يو صى فيه" یعنی اگر کوئی وصیت کی چیز موجود ہے تو آدمی کو جب تک وصیت نہ لکھی ہو نہیں سونا چاہئے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب کسی کے ذمہ کوئی مالی حق ہو یا عبادت کا کوئی حق ہو جیسے نمازیں یا روزے قضاء ہیں تو اس کی وصیت پہلے لکھ کر رکھے پھر سوئے ۔ دو راتیں بھی ایسی نہیں گزرنی چاہئیں جس میں وصیت نہ لکھی ہوئی ہو۔

جہاں اس قسم کی کوئی چیز اپنے ذمہ واجب ہو، وہاں وصیت کا لکھنا واجب ہے اور جہاں اس قسم کی کوئی چیز ذمہ میں واجب نہ ہو، وہاں وصیت لکھنا واجب تو نہیں مستحب ہے کہ اپنے مال میں سے کچھ حصہ محتاج لوگوں کو صدقہ کرنے کی وصیت کر دے۔

---

[۱] [البقرة:۱۸۰، ۱۸۲]

[۲] وفى صحيح مسلم ، كتاب الوصية ، رقم :۳۰۷۴،وسنن الترمذى ،كتاب الجنائز عن رسول الله ، باب ماجاء فى الحث على الوصية ، رقم : ۸۹۲ ، وكتاب الوصاياعن رسول الله ، باب ماجاء فى الحث على الوصية ، رقم :۲۰۴۴ ، وسنن النسائى ،كتاب الوصايا ، باب الكراهية في تأخير الوصية ، رقم : ۳۵۵۷ ، وسنن أبى داؤد ،كتاب الوصايا ، باب ماجاء فى مايؤمر به الوصية ، رقم : ۲۴۷۸ ، وسنن ابن ماجة، كتاب الوصايا ، باب الحث على الوصية ، رقم : ۲۶۹۰ ، و مسند احمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب ، رقم : ۴۲۳۹ ، ۴۳۵۰ ، وموطأمالك ،كتاب الاقضية، باب الأمر بالوصية ، رقم : ۱۲۵۶ .

۲۷۳۹ ۔ حدثنا إبراهيم بن الحارث : حدثنا يحيى بن أبي بكير : حدثنا زهير بن معاوية الجعفي : حدثنا أبو إسحاق ، عن عمرو بن الحارث ختن رسول الله ﷺ أخي جويرية بنت الحارث قال: ماترك رسول الله ﷺ عند موته درهما ولا دينارا، ولا عبدا ولا أمة ولا شيئا إلا بغلته البيضاء وسلاحه وأرضا جعلها صدقة .[أنظر : ۲۸۷۳، ۲۹۱۲، ۳۰۹۸، ۴۴۶۱].

۲۷۴۰ ۔ حدثنا خلاد بن يحيى : حدثنا مالك هو ابن مغول : حدثنا طلحة بن مصرّف قال : سألت عبد الله بن أبي أوفى رضي الله عنهما : هل كان النبي ﷺ أوصى ؟ فقال : لا ، فقلت : كيف كتب على الناس الوصية أو أمروا بالوصية ؟ قال: أوصى بكتاب الله . [أنظر: ۴۴۶۰، ۵۰۲۲]

امام بخاری رحمہ اللہ تینوں حدیثیں اس ترتیب سے لائے ہیں کہ پہلی حدیث میں وصیت لکھنے کو ضروری قرار دیا گیا، پھر آگے بتلایا کہ حضور اقدس ﷺ کوئی میراث چھوڑ کر نہیں گئے۔

تیسری حدیث میں بتایا کہ آپ ﷺ نے کوئی وصیت نہیں فرمائی۔

ان سب کے مجموعہ سے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب کوئی میراث چھوڑ کر نہیں جا رہا ہے تو وصیت لکھنا بھی ضروری نہیں۔

(۲) باب أن يترك ورثته أغنياء خير من أن يتكففوا الناس .

۲۷۴۲ ۔ حدثنا أبو نعيم: حدثنا سفيان ،عن سعد بن إبراهيم ، عن عامر بن سعد، عن سعد بن أبي وقاص رضی اللہ عنہ يقول: جاء النبي ﷺ يعودني وأنا بمكة وهو يكره أن يموت بالأرض التي هاجر منها .قال ((يرحم الله ابن عفراء)) قلت :يارسول الله ،أوصي بمالي كله ؟ قال: ((لا))،قلت: فالشطر؟قال: ((لا))،قلت: الثلث؟ قال : ((فالثلث والثلث كثير، إنك أن تدع ورثتك أغنياء خير من أن تدعهم عالة يتكففون الناس في أيديهم، وإنك مهما أنفقت من نفقة فإنها صدقة حتى اللقمة ترفعها إلى في امرأتك ، وعسى الله أن يرفعك فينتفع بك ناس ويضربك آخرون)). ولم يكن له يومئذ إلا ابنة .[أنظر: ۵۶، ۱۲۹۵، ۲۵۳۹، ۳۹۳۶، ۴۴۰۹، ۵۳۵۴، ۵۶۶۸، ۶۳۷۳، ۶۷۳۳]

یہ سعد بن خولہ ہیں ،ان کے والد کا نام خولہ اور والدہ کا نام عفراء ہے،اس لئے روایت میں ابن عفراء سے سعد بن خولہ مراد ہیں، جن کا پہلے ذکر آیا تھا کہ مکہ مکرمہ میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

(۳) باب الوصية بالثلث

"وقال الحسن: لا يجوز للذمي وصية إلا بالثلث: وقال الله عز وجل: ﴿وَ انِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ﴾ [۳]

"وصية بالثلث" کا باب قائم کرکے امام بخاری رحمہ اللہ نے جو اگلا مسئلہ بیان فرمایا ہے وہ یہ کہ حضرت حسنؒ بصری فرماتے ہیں ذمی کی وصیت بھی ثلث کی حد تک نافذ ہے۔ یعنی جس طرح مسلمانوں کے لئے یہ حکم ہے کہ وہ کوئی وصیت ایک تہائی سے زیادہ نہیں کرسکتے، اگر کریں گے تو باطل ہوگی۔ اسی طرح اگر اہل ذمہ میں سے کسی نے اپنے کسی شخص کے لئے ایک ثلث سے زائد کی وصیت کی اور مسلمانوں کے پاس مقدمہ آگیا تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر ان کے مذہب کے مطابق ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت جائز ہے تو اس کو نافذ کر دیا جائے گا۔

لیکن امام بخاری رحمہ اللہ یہ کہتے ہیں اور یہی جمہور کا مسلک ہے کہ اگر اہل ذمہ ہمارے پاس مقدمہ لائیں گے تو ہم اپنی شریعت کے مطابق فیصلہ کریں گے اور ہماری شریعت میں ایک ثلث سے زیادہ کی وصیت نہیں ہوسکتی۔ لہٰذا اس سے زیادہ کی جو وصیت کی ہوگی وہ نافذ نہیں ہوگی، باطل قرار دی جائے گی۔

اس پر استدلال کیا کہ نبی کریم ﷺ کو حکم دیا گیا ﴿وَانِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللهُ﴾ کہ ان کے درمیان اللہ کے نازل کئے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔

اگر وہ مقدمہ ہمارے پاس نہ لائیں، ہمارے قاضی سے فیصلہ نہ کرائیں تو پھر ان کو اختیار ہے۔ لیکن اگر ہمارے پاس لائیں گے تو ہم ایک تہائی سے زیادہ کی وصیت کو نافذ نہیں کریں گے۔[۴]

(۴) باب قول الموصى لوصيه: تعاهد لولدى، ومايجوز للوصي من الدعوى

یعنی موصی اپنے وصی سے یہ کہہ سکتا ہے کہ میرے بچوں کا خیال رکھنا ان کی نگرانی تمہارے سپرد ہے، تو اسی وصی کو کسی بچے کے نسب یا حضانت کا دعویٰ کرنے کا بھی حق حاصل ہے۔

(۵) باب إذا أومأ المريض برأسه إشارة بينة تعرف

۲۷۴۶ ۔ حدثنا حسان بن أبي عباد: حدثنا همام، عن قتادة، عن أنس ﷺ: أن يهوديا رض رأس جارية بين حجرين، فقيل لها: من فعل بك؟ أفلان أو أفلان؟ حتى سمى

---

[۳] [المائدة: ۴۹] [۴] عمدة القاري، ج: ۱۰، ص: ۱۲.

الیھودی، فاومات برأسہا فجیئ بہ فلم یزل حتی اعترف فأمر النبی ﷺ فرض رأسہ بالحجارۃ. [راجع:۲۴۱۳.]

وصیت بالاشارہ کاحکم

اس باب سے امام بخاری رحمہ اللہ یہ مسئلہ بیان کرنا چاہ رہے ہیں کہ وصیت جس طرح لفظوں سے ہوسکتی ہے اسی طرح اشارہ سے بھی ہوسکتی ہے۔

اگر کوئی مرضِ وفات میں ہے اور بیماری کی وجہ سے بولنے پر قادر نہیں ہے، ایسی حالت میں اگر وہ اشارہ کے ذریعہ کوئی وصیت کردے اور اشارہ سمجھ میں آرہا ہو تو کہتے ہیں، یہ وصیت جائز ہے۔

حنفیہ کے نزدیک یہ جائز نہیں ہوتی۔ حنفیہ کے نزدیک وصیت یا تو لفظوں میں ہو یا وہ خود لکھ کردے، تب تو جائز ہے، لیکن عام آدمی کی وصیت محض اشارہ کے ذریعے درست نہیں الا یہ کہ آدمی اخرس ہو، شروع ہی سے گونگا ہو، ساری زندگی اشاروں میں گزری ہو، اگر مرض الوفات میں وصیت بھی اشاروں کے ذریعے کرے تو وہ معتبر ہوگی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جو گونگا ہوتا ہے اس کے اشارے متعین ہوجاتے ہیں، اس کے اشاروں کی مستقل زبان ہوتی ہے، اس کو لوگ سمجھتے ہیں۔ لیکن جو گونگا نہیں ہے اس کا اشارہ ابہام پیدا کرسکتا ہے، اس میں جہالت ہے، اس واسطے اس کی وصیت معتبر نہیں۔[۵]

امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنے اس مسلک پر کہ اشارہ کے ذریعے وصیت ہوسکتی ہے اس مشہور واقع سے استدلال کیا ہے جو کئی جگہ آیا ہے کہ ایک یہودی نے ایک جاریہ (بچی) کا سر دو پتھروں کے درمیان رکھ کر کچل دیا تھا اور اس کے زیور لے کر بھاگ گیا تھا۔

حضور اقدس ﷺ جب اس بچی کے پاس پہنچے تو اس سے پوچھنا شروع کیا کہ تمہیں فلاں نے قتل کیا ہے؟ فلاں نے کیا ہے؟ یا فلاں نے کیا ہے؟ اس کے سامنے مختلف نام لئے۔ جب آپ ﷺ نے اس یہودی کا نام لیا تو اس نے اشارہ کردیا۔ بعد میں آپ ﷺ نے اس یہودی کو پکڑا اور پھر اس سے قصاص لیا گیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کر رہے ہیں کہ جب اشارہ کی بنیاد پر قصاص ہوگیا تو پھر اشارہ سے وصیت بطریق اولی ہوجانی چاہئے۔

لیکن یہ استدلال اس لئے درست نہیں ہے کہ وہاں جو قصاص ہوا تھا وہ محض اس لڑکی کے اشارہ کی بنیاد پر نہیں ہوا بلکہ روایت میں صراحت ہے کہ اس کو پکڑا اور پکڑنے کے بعد جب اس سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے

---

۵ عمدۃ القاری، ج: ۹، ص: ۱۴۱.

اعتراف کیا کہ ہاں میں نے کیا ہے تو قصاص اس کے اعتراف کی بنیاد پر لیا گیا نہ کہ اشارہ کی بنیاد پر۔[۶]

البتہ اس سے جو پوچھ گچھ کی جارہی تھی محض تفتیش کے لئے کی جارہی تھی، اس کے اشارہ نے تفتیش میں ایک راستہ پیدا کر دیا۔ اس حد تک کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن اس سے کوئی حکم شرعی وہاں پر بھی مرتب نہیں کیا گیا اور وصیت میں بھی نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح مار پٹائی جائز نہیں، جب تک کہ کسی آدمی کے اوپر جرم ثابت نہ ہو۔

(۶) باب لا وصية لوارث

"**باب لا صية لوارث**" ایک حدیث بھی انہیں الفاظ سے مروی ہے لیکن چونکہ وہ سنداً کمزور ہے، اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے اس کو حدیث کے طور پر ذکر نہیں کیا بلکہ ترجمۃ الباب بنا دیا اور اس لئے بنایا کہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے لیکن "**مؤید بتعامل الأمة**" ہے، تمام امت کا اس پر اجماع ہے کہ وارث کے لئے کوئی وصیت نہیں ہوتی۔[۷]

۲۷۴۷۔ حدثنا محمد بن یوسف، عن ورقاء، ابن أبی نجیح، عن عطاء، عن ابن عباس رضی اللہ عنهما قال: کان المال للولد، وکانت الوصية للوالدين؛ فنسخ اللہ من ذلک ما أحب فجعل للذکر مثل حظ الأنثيين، وجعل للأبوين لکل واحد منهما السدس، وجعل للمرأة الثمن والربع، وللزوج الشطر والربع. [أنظر: ۴۵۷۸، ۶۷۳۹][۸]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ شروع میں مال، اولاد کا ہوا کرتا تھا اور وصیت والدین کے لئے ہوا کرتی تھی۔ یعنی یہ حکم تھا کہ جو کچھ بھی بچے کا وہ اولاد میں تقسیم ہوگا اور اگر مرنے والا چاہے تو والدین کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ لیکن بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس میں سے جو چاہا منسوخ فرما دیا۔ اب آگے مستقل یہ اصول بیان کر دیا کہ "**للذکر مثل حظ الأنثيين**" باقاعدہ فرائض مقرر کر دیئے گئے۔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ فرائض کے نازل ہونے سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

(۷) باب الصدقة عند الموت

۲۷۴۸ ــ حدثنا محمد بن العلاء: حدثنا أبو اسامة، عن سفيان، عن عمارة، عن أبی زرعة، عن أبی هريرة ﷺ قال: قال رجل للنبی ﷺ: يا رسول اللہ، أی الصدقة أفضل؟

---

۶ والنبی ﷺ لم یکتف بإشارة الجارية فی قتل اليهودی، وانما قتله باعترافه، عمدة القاری، ج: ۹ص: ۱۴۱.

۷ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۴۰۹.

۸ وفی سنن الدارمی، کتاب الوصايا، باب الوصية الوارث، رقم: ۳۱۳۰.

قال :((أن تصدق وأنت صحيح حريص، تأمل الغنى ، وتخشى الفقر، ولاتمهل حتى إذابلغت الحلقوم قلت : لفلان كذاولفلان كذا ، وقد كا ن لفلا ن)).[راجع: ۱۴۱۹].

اتنا غلاموں کا اور اتنا فلاں کا ۔ جبکہ وہ مال کسی اور فلاں یعنی ورثہ کا ہو چکا۔ یعنی جب مال ورثہ کا ہو چکا تو اس وقت کہہ رہے ہیں کہ اتنا فلاں کا اور اتنا فلاں کا تو اس میں اتنا اجر نہیں۔

(۸) باب قول الله عزوجل: ﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِيْ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾[۹]

اس باب کے ذریعے دراصل امام بخاری رحمہ اللہ ایک مسئلہ میں حنفیہ کی تردید کرنا چاہتے ہیں۔

کہ اگر مرض وفات میں کوئی شخص دین کا اقرار کرے کہ میرے ذمے فلاں کا اتنا دین ہے تو امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ وہ اقرار علی الاطلاق معتبر ہونا چاہئے، بغیر کسی شرط وقید کے، مریض جس کے حق میں چاہے جتنا چاہے اقرار کرسکتا ہے اور وہ اقرار معتبر ہوگا۔

دوسری طرف امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں کسی نے یہ خبر پہنچائی کہ حنفیہ کے نزدیک مریض کا اقرار بالدین کسی بھی حالت میں معتبر نہیں۔ اس واسطے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کر کے مختلف آثار وغیرہ ان کی تردید کے لئے نقل کئے ہیں کہ یہ بات درست نہیں، اعتبار ہونا چاہئے۔

مریض کا اقرار بالدین اور مسلک حنفیہ

لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ حنفیہ کے نزدیک مریض کا اقرار بالدین نہ علی الاطلاق معتبر ہے اور نہ علی الاطلاق غیر معتبر ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے۔

وہ یہ ہے کہ اگر دین کا اقرار کسی اجنبی کے لئے کیا ہے تو وہ علی الاطلاق معتبر ہے کہ فلاں شخص کے اتنے پیسے میرے ذمے واجب ہیں، اور وہ دین اس کے کل مال سے ادا کیا جائے گا، اس میں ثلث کی بھی قید نہیں ہے۔

اور اگر اقرار بالدین اپنے ورثہ میں سے کسی وارث کے حق میں ہو کہ کوئی شخص یہ اقرار کرے کہ میرے فلاں بیٹے کے ایک لاکھ روپے میرے ذمے بطورِ قرضہ واجب ہیں، تو اس صورت میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ یہ اقرار بالدین اس وقت تک معتبر نہ ہوگا جب تک دوسرے ورثہ اس کی تصدیق نہ کرلیں یا وہ دین معروف ہو، لوگوں کو معلوم ہو لیکن اگر نہ تو معروف بین الناس ہے اور نہ دوسرے ورثہ اس کی تصدیق کرتے ہیں تو اس صورت میں حنفیہ کہتے ہیں کہ وہ اقرار بالدین معتبر نہیں ہوگا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ دین للاجنبی میں تو امام بخاری رحمہ اللہ اور حنفیہ کے درمیان کوئی

---

۹ [النساء : ۱۱]

اختلاف نہیں ہے، البتہ اختلاف اقرار الدین فی حق الوارث میں ہے اور وہ بھی اس وقت جب دین معروف نہ ہو اور دوسرے ورثہ تصدیق نہ کریں۔

اگر یہ ذہن نشین ہو جائے تو اب دیکھ لیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ کے اعتراضات کس حد تک درست ہیں؟

تو فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے فرمایا:

﴿ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِىْ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ﴾

اس آیت کونقل کرنے کا منشاء یہ ہے کہ دین کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے وصیت اور میراث دونوں پر مقدم کیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دین کا اقرار کر رہا ہے تو وہ معتبر ہونا چاہئے۔

"و يذكر ان شريحا، و عمر بن عبد العزيز، و طاؤسا، و عطا و ابن أذينة أجازوا إقرار المريض بدين. و قال الحسن: أحق ما تصدق به الرجل أخر يوم من الدنيا و أول يوم من الآخرة. و قال إبراهيم و الحكم: إذا أبرأ الوارث من الدين برئ. و أوصى رافع بن خديج أن لاتكشف امراءة الفزارية عما أغلق عليه بابها. وقال الحسن: إذا قال لمملوكه عند الموت: كنت أعتقتك، جاز. و قال الشعبي: إذا قالت المرأة عند موتها: إن زوجي قضاني و قبضت منه جاز. و قال بعض الناس لايجوز إقراره لسوء الظن به للورثة ثم استحسن فقال: يجوز إقراره بالوديعة و البضاعة و المضاربة. و قد قال النبي ﷺ: ((إياكم و الظن فإن الظن أكذب الحديث)). ولا يحل مال السلمين لقول النبي ﷺ: ((آية المنافق إذا ائتمن خان)). و قال الله تعالى: ﴿ إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا ﴾ [۱۰] فلم يخص وارثا و لاغيره. فيه عبداللّٰه بن عمرو عن النبي ﷺ.

"**ويذكر إن شريحا...... وابن أذينة أجازوا إقرر المريض بدين**" ان سب نے مریض کے اقرار بالدین کو جائز اور نافذ قرار دیا ہے۔

حنفیہ کی طرف سے کہا جائے گا کہ ہوسکتا ہے کہ "**إقرار بالدين لاجنبي**" ہو یا "**اقرار للوارث**" ہو مگر دین معروف ہو یا دوسرے ورثہ نے اس کی تصدیق کر دی ہو۔

"**وقال الحسن: أحق ماتصدق**" حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سب سے زیادہ آدمی تصدیق کئے جانے کا حقدار ہوتا ہے یعنی اس بات کا کہ اس کی بات کو سچ مانا جائے۔ اس وقت جب دنیا کا آخری دن اور آخرت کا پہلا دن ہو۔

---

[۱۰] [النساء:۵۸]

مطلب یہ ہے کہ جب پاؤں قبر میں لٹکائے بیٹھا ہے اور آخرت کی سیڑھی پر پاؤں رکھا ہے، دنیا سے باہر جا رہا ہے، اس وقت آدمی کسی دوسرے کو نفع پہنچانے کی خاطر کیا جھوٹ بولے گا، لہٰذا ایسی صورت میں اگر وہ اقرار کرلے تو اقرار معتبر ہونا چاہئے۔

آدمی کے ساتھ عام حالات میں یہی ہوتا ہے، لیکن جب وہ بالکل مرنے کے قریب ہوتا ہے تو اس وقت اس کے دل میں خدا کا خوف آجاتا ہے اور عام طور پر اس وقت جھوٹ نہیں بولتا لیکن محض اس مفروضے پر احکام شرعیہ کو متفرع نہیں کیا جاسکتا۔

کیا اگر کوئی شخص مرتے مرتے یہ کہہ دے کہ مجھے فلاں نے قتل کیا ہے تو مجرد اس کے کہنے سے اس شخص پر جس کا نام لیا ہے قصاص آئے گا۔ اس بنیاد پر کہ جاتے جاتے کیوں جھوٹ بولے گا؟

تو یہ صحیح ہے کہ عام طور سے ایسے وقت آدمی سچ بولتا ہے لیکن اس مفروضے کی بنیاد پر کسی کا حق ساقط نہیں ہوسکتا۔ کسی دوسرے پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کی جاسکتی۔ یا فرض کریں کہ کوئی شخص جاتے جاتے مرتے وقت یہ کہہ جائے کہ میرے ایک لاکھ روپے فلاں کے اوپر واجب ہیں تو کیا بغیر بینہ کے محض اس کے کہہ دینے سے اس کے ذمہ ایک لاکھ روپے واجب ہو جائیں گے؟

معلوم ہوا کہ یہ ایک عام بات کہی جارہی ہے کہ عام طور سے انسان مرتے وقت سچ بولتا ہے لیکن اس مفروضے کی بنیاد پر نہ کسی کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد کی جاسکتی ہے، نہ کسی کا حق چھینا جاسکتا ہے، نہ کسی کے اوپر کوئی جنایت عائد کی جاسکتی ہے۔

اور ہمارا عدالتی تجربہ یہ ہے خاص طور سے پنجاب اور سرحد کے بعض علاقوں میں بھی یہ صورتحال ہے کہ آدمی جاتے جاتے اپنے دشمنوں کو گھسیٹ کر لے جاتا ہے۔ یعنی یہ سوچتا ہے کہ میں تو جارہا ہوں، چلو اپنے دشمن کے خلاف بیان دیتا جاؤں کہ فلاں نے قتل کیا ہے۔

اصل قاتل کا بھی نام لے گا کہ فلاں نے قتل کیا ہے لیکن ساتھ میں کچھ دشمنوں کو بھی شامل کرلے گا کہ ؎

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

لہٰذا اگر اس طریقہ سے بیان کے اوپر اتنا بھروسہ کرلیا جائے تو پھر دینا کا کوئی کام ایسا نہیں ہے جو جاتے جاتے محض بیان کے اوپر نہ کیا جاسکے۔

آگے فرماتے ہیں **"وقال إبراهيم والحكم :إذا أبرأ الوارث من الدين برئ".**

ابراہیم نخعی اور حکم رحمہما اللہ کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص وارث کو دین سے بری کردے تو وہ بری ہو جائے گا یعنی ایک وارث جس کے ذمے قرضہ واجب تھا، مرتے وقت کہتا ہے کہ میں اس کو دین سے بری کرتا ہوں تو یہ حضرات کہتے ہیں کہ بری ہو جائے گا۔

حنفیہ کا مسلک

حنفیہ کہتے ہیں کہ بری نہیں ہوتا، اس واسطے کہ وارث کو بری کرنے کے معنی اس کے حق میں وصیت ہوئی یعنی اس کے ذمہ جو دین تھا اگر وہ ادا کرتا تو ترکہ میں شامل ہو کر تمام ورثاء میں تقسیم ہوتا لیکن اس نے دوسرے ورثاء کو محروم کر کے تنہا اسی کو نواز دیا۔ یہ لا وصیۃ لوارث کے مفہوم کے بالکل خلاف ہے، اس لئے ایسا کرنا بالکل جائز نہیں۔

ہاں! اگر غیر وارث کو دین سے بری کر دیں تو وہ بری کرنا ثلث کی حد تک معتبر ہوگا، جو وصیت کے حکم میں ہے۔

آگے فرمایا **"أوصى بن خديج أن لا تكشف امر أته الفزارية أغلق عليه بابها"**.

رافع بن خدیج ﷺ نے یہ وصیت فرمائی تھی کہ ان کی جو قبیلہ فزار سے تعلق رکھنے والی اہلیہ ہیں، ان کے گھر کو اس چیز سے نہ کھولا جائے جس چیز کے اوپر ان کا دروازہ بند ہے۔ یعنی ان کے گھر میں جو کچھ بھی ہے اس سے بالکل تعرض نہ کیا جائے۔

گویا امام بخاری رحمہ اللہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت رافع ﷺ نے اس بات کا اقرار کیا کہ ان کے گھر میں جو کچھ ہے، وہ میں نے ان کو دے دیا، اب وہ ان کی ملکیت ہے، اور ان کی اس وصیت کو معتبر مانا گیا۔ معلوم ہوا کہ جب یہ جائز ہے تو اس کا اقرار کرنا بھی جائز ہونا چاہئے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ درحقیقت اقرار نہیں ہے یہ تو صرف یہ کہا جا رہا ہے کہ امراۃ فزاریہ کے گھر میں جو کچھ ہے وہ ان کی ملکیت ہے، میری ملکیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، لہٰذا ان سے تعرض نہ کرنا۔

اقرار اس وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز ابتداءً موصی کی ملکیت میں سمجھی جا رہی ہو، ملکیت میں موجود ہو، پھر ملکیت سے خارج ہونے کا اقرار کرے لیکن جو چیز اس کی ملکیت میں ہی نہیں ہے اس کے بارے میں کہا کہ وہ اس کی ملکیت ہے اس کو میرے ترکہ میں شمار نہ کریں تو یہ ٹھیک ہے اور اس کا **"ما نحن فيه"** سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

آگے فرمایا **"وقال : الحسن إذا قال لمملوكه عند الموت كنت اعتقتك جاز"**.

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اگر کسی نے مرتے وقت اپنے غلام سے کہا کہ میں نے تجھے بہت پہلے آزاد کر دیا تھا یعنی اس نے اس کے عتق کا اقرار کیا تو فرماتے ہیں کہ یہ عتق کا اقرار کرنا جائز ہے، جب عتق کا اقرار کرنا جائز ہے تو دین کا اقرار کرنا بھی جائز ہے۔

حنفیہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں مانتے کہ یہ اقرار کرنا جائز ہے کیونکہ اس نے سوچا ہوگا کہ اعتاق تو نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ثلث میں ہوگا چلو پچھلے واقعہ میں اقرار کر لوں کہ میں نے دو سال پہلے آزاد کر دیا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر آزاد کر دیا تھا تو اس وقت آزادی کا اعلان کیوں نہیں کیا؟ آزادی کے حقوق کیوں نہیں دیئے تھے؟ مرتے وقت کیوں یاد آیا کہ دو سال پہلے میں نے آزاد کیا تھا؟ لہٰذا یہ قول معتبر نہیں ہے، یہ وصیت کے حکم میں ہوگا اور اقرار معتبر نہیں ہوگا "**إلامن الثلث**".

آگے فرمایا "**وقال الشعبی : إذا قالت المرأة عند موتها :أن زوجی قضانی وقبضت منه جاز**" بیوی اگر مرتے وقت یہ کہے کہ میرے شوہر نے مجھے میرا مہر ادا کر لیا تھا اور میں نے اس پر قبضہ کر لیا تھا تو اس کا یہ کہنا جائز ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنے شوہر کو دین مہر سے بری کر دیا۔

اس سے یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے وارث کو دین سے بری کرے تو وہ برات معتبر ہونی چاہئے۔ لیکن یہ قیاس قیاس مع الفارق ہے اس لئے کہ مہر میں اصل یہ ہے کہ شوہر ادا کر دے۔ اس دین کا ہمیشہ ثابت رہنا کوئی ضروری نہیں ہے، لہٰذا اگر عورت کہہ رہی ہے کہ میں نے مہر پر قبضہ کر لیا تھا تو یہ "**إبراء عن الدین**" نہیں ہے بلکہ ایک واقعہ کا ذکر ہے جو اصل کے مطابق ہے کہ شوہر کو مہر دے دینا چاہئے تھا، عورت کہہ رہی ہے کہ دے دیا تھا، اس لئے اس پر قیاس کرنا درست نہیں۔

"**وقال بعض الناس : لایجوز إقراره لسوء الظن به للورثة ثم استحسن**".

بعض الناس کہتے ہیں کہ مریض کا اقرار معتبر نہیں، یہ کس وجہ سے کہتے ہیں؟

"**بسوء الظن**" سوءِ ظن کرتے ہوئے، بدگمانی کرتے ہوئے کہ ورثہ کو محروم کرنا چاہتا ہے۔ اس واسطے اس نے یہ اقرار کیا ہے۔ آگے فرمایا "**وقد قال النبی ﷺ إیاکم والظن فإن الظن أکذب الحدیث**" اس حدیث کی بناء پر یہ بدگمانی نہیں کرنی چاہئے کہ آدمی مرتے دم بھی اپنے وارثوں کو محروم کرنے کے لئے جھوٹ بول رہا ہوگا۔ اور حنفی لوگ یہ بدگمانی کرتے ہیں اور اسی بدگمانی پر اپنے مذہب کی بنیاد رکھی ہے۔

آگے کہتے ہیں "**ولا یحل مال المسلمین**" مسلمان کا مال کسی شخص کے لئے حلال نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ذمے دین ہے تو اس نے دوسرے مسلمان کے مال پر قبضہ کر رکھا ہے، اس لئے اس پر شرعاً واجب ہے کہ مال واپس لوٹائے اور لوٹانے کا راستہ یہ ہے کہ اقرار کرے۔ آپ کہتے ہیں کہ اقرار معتبر نہیں گویا آپ نے مسلمانوں کا مال لوٹانے پر رکاوٹ عائد کر دی۔

"**لقول النبی ﷺ آیة المنافق إذا ائتمن خان**" منافق کی علامت یہ ہے کہ اگر اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔

اب یہ بے چارہ مرنے کے قریب ہے اور اس کے ذمے قرضہ ہے تو یہ اقرار کرے گا تب قرضہ ادا ہوگا اگر اقرار نہیں کرے گا تو خیانت ہوگی۔ آپ کہتے ہیں کہ اقرار نہ کر، خیانت کر جو "**إذا أؤتمن خان**" میں داخل ہے۔

"**إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا فلم یخص وارثا ولا غیره**".

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ امانات اہل کو واپس کرو، اس حکم میں وارث اور غیر وارث کی کوئی تفصیل نہیں کی تو امانت ہر ایک کو واپس کرنی ہے، اگر آپ اقرار کو معتبر نہیں مانیں گے تو امانت کیسے واپس ہوگی۔

"قال بعض الناس" سے کئے جانے والے اعتراض کا جواب

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں دو دلیلیں بیان فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ حنفیہ کا مسلک سوء ظن پر مبنی ہے۔

اول تو یہ مفروضہ غلط ہے سوء ظن پر مبنی نہیں بلکہ صورتحال یہ کہ پیچھے حدیث گزری ہے کہ جب انسان موت کے قریب ہوتا ہے، مرض الموت میں ہوتا ہے، اس وقت مال اس کا نہیں رہا، حدیث میں نبی کریم ﷺ نے صاف صاف بیان فرمادیا **"وقد کان لفلان"** اگر واقعۃً اس کے ذمے کوئی دین صحت کی حالت میں تھا تو اس وقت ہی قرآن کریم کے حکم کے مطابق اس کی تحریر لکھتا اور گواہ بناتا، اور اگر مرض وفات ہی میں دین پیدا ہوا تو چاہئے تھا کہ اس پر گواہ بناتا یا دوسرے ورثہ کے علم میں لاتا، جب یہ کام اس نے نہیں کئے اور دائن نے بھی نہیں کروائے تو دونوں خطا کار ہیں لہٰذا جب تک ورثہ تصدیق نہ کریں اس کا یہ تصرف معتبر نہیں۔

اب چونکہ مال اس کا نہیں رہا تو وہ اس میں آزادی کے ساتھ تصرف نہیں کرسکتا بلکہ تصرف کرنے کے لئے کچھ حدود و قیود کا پابند ہے یعنی ایک ثلث سے زائد میں تصرف نہیں کرسکتا۔

یہ بات تو صحیح ہے کہ مسلمانوں پر بدگمانی نہیں کرنی چاہئے: لیکن بدگمانی نہ کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ دوسرے کے مال میں تصرف نہ کیا جائے۔ اب جبکہ وہ مال ورثہ کا ہو چکا ہے تو مرنے والے کو اس میں ایک تہائی سے زیادہ میں تصرف کرنے کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ لہٰذا یہاں بدگمانی کا مسئلہ نہیں ہے، مسئلہ اہل حقوق کو حقوق دینے کا ہے۔

آپ کو مدیون صاحب حق نظر آرہا ہے اور اس کی وجہ سے ورثہ کا حق پامال کرنے کی فکر میں ہیں اور حنفیہ کو ورثہ کا حق نظر آرہا ہے جو نبی کریم ﷺ نے صاف صاف بیان فرمایا ہے **"وقد کان لفلان"** کہ ان کا حق ہوگیا۔ لہٰذا اس حق کو باطل کرکے کسی دوسرے کا حق نہیں دیا جاسکتا، اس میں سوء ظن کا سوال ہی نہیں۔

دوسری دلیل کا جواب

دوسری دلیل کا جواب یہ کہ بے شک امانت تو اہل امانت تک پہنچانی چاہئے اور دین، صاحب دین تک پہنچانا چاہئے لیکن امانت پہنچانے اور دین ادا کرنے کا جو طریقہ شریعت نے مقرر فرمایا ہے اُس کا لحاظ رکھ کر اور وہ طریقہ یہی ہے کہ نشوء دین کے وقت اس پر گواہ بنائے۔

اب جبکہ مال ورثہ کا ہو گیا اور آپ کہتے ہیں کہ ورثہ کے مال میں سے امانت ادا کرو۔

ظاہر ہے کہ اللہ ﷻ نے جس کو جو کچھ بھی مال عطا فرمایا ہے، اس کا اصل مالک اللہ ﷻ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس کی صحت والی زندگی میں اس میں تصرف کا حق دے رکھا تھا لیکن جب صحت کی زندگی ختم ہوگئی، بیماری کا وقت آ گیا تو اللہ ﷻ نے فرمایا اب یہ تمہارا نہیں رہا **"قد کان لفلان"** اب تو تمہارے ورثہ کا حق ہے، اس میں ایک تہائی تک جتنا تصرف کر سکتے ہو کرلو، اس سے زیادہ تصرف کرنے کا تمہیں حق نہیں ہے اور اس ایک تہائی میں بھی وارث کے حق میں تصرف نہیں کر سکتے، غیر وارث کے حق میں کر سکتے ہو۔

اس لئے ہم کہتے ہیں کہ غیر وارث کے حق میں معتبر ہے اور وارث کے حق میں معتبر نہیں۔

حنفیہ پر ایک اور اعتراض

درمیان میں امام بخاری رحمہ اللہ نے ایک اور اعتراض کیا کہ ایک طرف تو حنفیہ کہتے ہیں کہ دین کی وصیت جائز نہیں، دین کا اقرار جائز نہیں، دوسری طرف کہتے ہیں **"ثم استحسن فقال: یجوز إقراره بالودیعة والبضاعة والمضاربة"** یعنی دین کے بارے میں تو یہ کہہ دیا کہ دین کا اقرار جائز نہیں لیکن بعد میں استحسان کیا اور اسی استحسان کی وجہ سے حنفیہ کے اوپر بہت اعتراض بھی ہوئے۔

استحسان کا مطلب یہ ہے کہ یہ مجھے اچھا لگتا ہے یعنی اپنی رائے اور اپنے خیال سے جو چیز اچھی لگتی ہے اس کو پکڑ لیتے ہیں، اس لئے یہ لفظ استعمال کر کے تھوڑا سا طنز کیا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہہ دیا کہ **"إقرار بالدین"** معتبر نہیں، پھر بعد میں **"استحسان"** کیا۔

استحسان یہ کیا کہ یہ کہہ دیا ودیعت، بضاعت اور مضاربت کا اقرار درست ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص یوں کہے کہ مجھ پر فلاں شخص کا اتنا روپیہ واجب ہے تو یہ اقرار معتبر نہیں، لیکن اگر یہ کہے کہ اس نے میرے پاس اتنے روپے امانت رکھوائے تھے یہ معتبر ہے۔

اور اگر یہ کہے کہ اس نے مجھے اتنا روپے بضاعتاً دیا تھا، بضاعتا کے معنی ہیں تجارت کرنے کے لئے کہ جو نفع ہو وہ میں رکھوں اور اصل رقم اس کو واپس کر دوں یا مضاربت پر دیا تھا کہ میں اس سے تجارت کروں اور جو نفع ہو وہ ہم تقسیم کر دیں، اگر اس قسم کا کوئی اقرار کرلے تو حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ اقرار معتبر ہے۔

تو عجیب قصہ ہے کہ دین کا اقرار تو معتبر نہیں اور ودیعت، ضاعت اور مضاربت کا اقرار معتبر ہے۔

جواب: اولاً تو یہ سمجھ لیں کہ ان تینوں یعنی ودیعت، بضاعت اور مضاربت کے بارے میں حنفیہ کی عبارتوں میں فرق ہے بعض عبارات سے حنفیہ کا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اقرار اس وقت معتبر ہے جب ودیعت، بضاعت اور مضاربت معروف ہو یا کم از کم ان کا سبب معروف ہو اور اگر سبب معروف نہیں ہے تو پھر

ورثہ کی تصدیق کے بغیر معتبر نہیں ہے۔ اس صورت میں دین اور ودیعت وغیرہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔

دوسری بعض عبارتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امانات کا اقرار بہر صورت نافذ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ دین اور ان چیزوں میں بڑا لطیف اور باریک فرق ہے جب کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مجھ پر فلاں شخص کا دین واجب ہے تو معنی یہ ہیں میرا ترکہ ایک لاکھ روپے ہے لیکن میں اقرار کرتا ہوں کہ اس میں سے دس ہزار کا دین فلاں کا میرے اوپر ہے جو مجھے ادا کرنا ہے تو پہلے ایک لاکھ روپے اپنے ملکیت کا اثبات کیا اور پھر اس میں سے کچھ رقم کسی دوسرے کو ادا کرنے کی وصیت کی۔

لہٰذا اس کے اوپر پورا پورا یہ حکم عائد ہوتا ہے کہ جب ایک مرتبہ اپنی ملکیت تسلیم کر لی اب وہ وارث کے حق میں کوئی تصرف نہیں کر سکتا لہٰذا دین کا اقرار معتبر نہیں ہوگا۔ اس کے برخلاف اگر کوئی شخص ودیعت کا اقرار کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ شروع ہی سے اس حد تک اپنی ملکیت تسلیم نہیں کرتا کہ یہ میری ملکیت ہے۔ جب اس کی ملکیت ہی نہیں تو اس میں ورثہ کا حق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

گویا وہ کہہ رہا ہے کہ جو ایک لاکھ روپیہ ہے اس میں سے جو اتنی رقم الگ رکھی ہے وہ میری نہیں ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شروع سے ہی اس پر اپنی ملکیت ثابت نہیں کی اور ثلث والا یا **"لاوصیة لوارث"** والا قاعدہ۔ اس صورت میں جاری ہوتا ہے جب ابتداء میں ملکیت ثابت ہو پھر اس میں سے کوئی چیز نکالی جائے۔ لیکن ودیعت، بضاعت اور مضاربت، یہ سب امانات ہیں، ان کے اقرار کے معنی یہ ہیں کہ ان اموال پر شروع سے میری ملکیت آئی ہی نہیں ہے۔

لہٰذا ان میں اور دین میں فرق ہے اس لئے یہ اعتراض کرنا کہ وہاں تو آپ نے اقرار کو جائز کہا ہے اور یہاں نہیں کہا ہے یہ اعتراض برمحل نہیں ہے۔

سوال: آپ نے یہ فرمایا ہے کہ ودیعت میت کا مال نہیں ہے، اس لئے ودیعت کا اقرار درست ہے، اسی طرح اگر قرض کے بارے میں وصیت کرے تو وہ بھی درست ہونا چاہئے کیونکہ قرض بھی اس کا مال نہیں ہے بلکہ مقرض کا ہے؟

جواب: قرض جب مستقرض کو دے دیا جاتا ہے تو وہ مستقرض کی ملک بن جاتا ہے، لہٰذا قرض یا دین کا اقرار کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ میں جتنا مال چھوڑ کر جا رہا ہوں، وہ سارا میرا ہے، میری ملکیت ہے البتہ میرے ذمے میں کچھ حق واجب ہیں۔

پہلے وہ سارے ترکہ کو اپنا مال تسلیم کرتا ہے، دین کوئی معین چیز نہیں ہوتی بلکہ وہ فی الذمہ ہوتا ہے کہ میرے ذمے اتنا روپے واجب ہیں، لہٰذا جو کچھ موجود ہے اس نے پہلے سارا کچھ اپنی ملکیت قرار دیا اور پھر کہا کہ

اس کے اوپر ایک ذمہ داری واجب ہے اس کی وصیت کر رہا ہے کہ تم ادا کر دینا۔ تو گویا پہلے پورے مال پر اپنی ملکیت ثابت کی پھر دوسرے کے لئے دین کا اقرار کیا۔ جب اس نے اپنی ملکیت ثابت کی تو ثابت ہوتے ہی اس کے ساتھ ورثہ کا حق متعلق ہو گیا اب بعد میں اس کا یہ کہنا کہ میرے ذمے دین واجب ہے تو یہ ورثہ کا حق باطل کر رہا ہے اور یہ نسخ ہے کہ پہلے ثابت کیا اور پھر باطل کر رہا ہے، بیان تبدیل ہے۔

بخلاف ودیعت کے کہ ودیعت تو اس کے پاس جوں کی توں رکھی ہوگی تو وہ جو کہہ رہا ہے کہ جتنا مال رکھا ہے، اس میں سے فلاں فلاں چیز میری ملکیت نہیں ہے، فلاں کی ودیعت ہے تو اس شئی پر اس نے شروع ہی سے اپنی ملکیت کا اثبات نہیں کیا، ایسا نہیں ہے کہ پہلے ملکیت ثابت کی ہو پھر اس کو اپنی ملکیت سے نکالا ہو یا نکالنے کی وصیت کی ہو جب اس نے یہ کہہ دیا کہ میرا نہیں ہے تو وہ ترکہ میں شامل نہ ہوا اور ورثہ کا حق اس سے متعلق نہ ہوا، لہٰذا اس کو اقرار کرنے کا، اور کہنے کا حق ہے کیونکہ وہ اپنی ملکیت کا تعین کر رہا ہے (دونوں میں یہ فرق ہے)۔[۱۱]

(۹) باب تاویل قوله تعالیٰ:

﴿مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوْصِىْ بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ [۱۲]

ويذكر أن النبي ﷺ قضى بالدين قبل الوصية. وقوله عزوجل: ﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَى أَهْلِهَا﴾[النساء: ۵۸] فأداء الأمانة أحق من تطوع الوصية۔ وقال النبي ﷺ: ((لا صدقة إلا عن ظهر غنى))۔ وقال ابن عباس: لا يوصى العبد إلا بإذن أهله. وقل النبي ﷺ: ((العبد راع من مال سيده)).

دین وصیت پر مقدم ہے، آیت میں اس کے برعکس کیوں؟

آیت میراث میں یہ جملہ جگہ جگہ آیا ہے "**مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يوصى بِهَا أَوْ دَيْنٍ**" ہر جگہ یہ کہا گیا ہے کہ میراث کی تقسیم ان دو چیزوں کے بعد ہوگی۔ ایک وصیت نافذ کرنے کے بعد، دوسرے دین کی ادائیگی کے بعد۔

قرآن کریم نے وصیت کا ذکر پہلے کیا ہے اور دین کا بعد میں لیکن اس بات پر اجماع ہے کہ ترتیب میں دین وصیت پر مقدم ہے یعنی اگر میت کے ذمہ دین ہے تو پہلے ترکہ میں سے دین ادا کیا جائے گا، اس کے بعد اگر کچھ بچے گا تو وصیت نافذ کی جائے گی اور پھر میراث کی تقسیم کی جائے گی تو قرآن کریم میں ذکر کے اعتبار سے

---

[۱۱] راجع للتفصیل: عمدة القاری، ج: ۱۰، ص: ۲۲-۲۵، وفیض الباری، ج: ۳، ص: ۴۱۰۔ [۱۲] [النساء: ۱۱]

وصیت مقدم ہے اور دین مؤخر ہے لیکن ترتیب تقسیم کے دین مقدم ہے اور وصیت مؤخر ہے اور اس پر اجماع ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس مجمع علیہ مسئلہ پر کئی دلائل بھی بیان فرمائے ہیں مثلاً یہ فرمایا کہ **"ویذکر أن النبی ﷺ قضی بالدین قبل الوصیة"** یہ ذکر کیا جاتا ہے۔ روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے دین کا فیصلہ وصیت سے پہلے کیا۔ یہ بات ترمذی کی حدیث میں آئی ہے لیکن چونکہ اس کی سند کمزور تھی۔ اس کے ایک راوی حارث الاعور ہیں جو ضعیف ہیں اس لئے امام بخاری رحمہ اللہ کی شرط کے مطابق نہ تھی، لہٰذا اس کو ترجمۃ الباب میں **"تعلیقا بصیغة تمریض ویذکر"** کہہ کر ذکر کیا۔

﴿إِنَّ اللهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا﴾ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ تم امانتیں ان کے اہل تک پہنچاؤ۔ امانت کا ادا کرنا یہ واجب ہے اور زیادہ مقدم ہے بہ نسبت نفلی وصیت کرنے کے۔

وصیت ایک نفلی چیز ہے تو جو چیز اپنے ذمہ واجب ہے اس کا ادا کرنا مقدم ہوگا۔ گویا اصول یہ بیان کر رہے ہیں کہ فرض، تطوع پر مقدم ہوتا ہے اور ادائے دین فرض ہے، وصیت کرنا محض نفل ہے، لہٰذا دین مقدم ہوگا۔

"وقال النبی ﷺ لا صدقة إلا عن ظهر غنی" آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے ہاں کوئی صدقہ قبول نہیں ہوتا مگر وہ جو اپنے پیچھے غنی چھوڑ کے جائے۔ معنی یہ ہے کہ صدقہ وہ مقبول ہے جس کے بعد اتنا غنی موجود ہو کہ جس کے ذریعے انسان اپنے حقوق واجبہ ادا کر سکے لیکن اگر اتنا صدقہ کر دیا کہ حقوق واجبہ بھی ادا نہ کر سکا تو وہ صدقہ مقبول نہیں۔

یہاں اس حدیث سے یہ بھی پتا چلا کہ حقوق واجبہ مقدم ہوتے ہیں صدقہ تطوع کے اوپر، تو دین حقوق واجبہ میں سے ہے اور وصیت صدقہ تطوع میں سے ہے، اس لئے دین واجب صدقہ تطوع پر مقدم ہوگا۔

"وقال ابن عباس : لا یوصی العبد إلا بإذن أهله" حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ غلام وصیت نہیں کر سکتا مگر اپنے مالک کی اجازت سے یعنی غلام اگرچہ ماذون فی التجارہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کا سارا مال مولیٰ کی ملکیت ہوتا ہے اگر وہ مال تجارت میں وصیت کرنا چاہے کہ میرا اتنا مال فلاں کو دے دیا جائے تو وہ یہ کام نہیں کر سکتا جب تک کہ اپنے اہل یعنی مولی سے اجازت نہ لے لے۔ اس لئے کہ مولی کی طرف اس کی ذمہ داری واجب ہے جو کچھ ہے سب مولی کا ہے اور اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ مال مولی کو پہنچائے۔ گویا مولی کا دین اسکے ذمے ہے۔ اب اگر اس کی اجازت کے بغیر وصیت کرے گا تو اس کے مال میں تصرف کرنے والا ہوگا۔ معلوم ہوا کہ وصیت، ادائیگی واجب پر مؤخر ہے اور واجب مقدم ہے۔

"وقال النبی ﷺ العبد راع فی مال سیده" غلام اپنے سید کے مال میں نگہبان ہے۔ معنی یہ ہے کہ مال مولیٰ کا مملوک ہے اور یہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کرے اور مولیٰ تک

پہنچائے اور وصیت اس کے ذمے واجب نہیں ہے۔اس واسطے وصیت پر مقدم ہوگا۔

امام بخاری رحمہ اللہ ان تمام آثار وغیرہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ دین وصیت پر مقدم ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب دین وصیت پر مقدم ہے تو پھر وصیت کو پہلے کیوں ذکر کیا؟ وصیت کو مقدم کیوں کیا؟ یوں کہنا چاہئے تھا **"ممن بعد دين أو وصية"**.

اس کی حکمتوں کو

تو اللہ ﷻ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے کلام بلیغ کے اندر کیا حکمتیں ہیں، ایک انسان اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔

ظاہری طور پر جو بات سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ وصیت کا ذکر پہلے کرکے اس کے استحباب، تطوع اور اس کی فضیلت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اس کو نظر انداز نہ کرنا چاہے اگرچہ رتبۃً مؤخر ہے لیکن نظر انداز کرنے کی چیز نہیں ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ دین کی ادائیگی اگرچہ اس لحاظ سے تو مقدم ہے کہ وہ انسان کے ذمے واجب ہے لیکن جہاں تک اجر وثواب کا تعلق ہے وہ وصیت میں زیادہ ہے، اس لئے کہ دین کی ادائیگی کا معنی یہ ہے کہ ایک حقدار کا حق ہمارے ذمے واجب تھا جو ہم نے اس کو پہنچادیا تو حقدار کو اسکا حق پہنچادینا یہ **"لا علی ولا إلی"** ہے کہ اب میرے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں اور میری ذمہ داری کسی اور پر نہیں۔اب حقدار کو حق پہنچادینا یہ اسکے ذمے لازم تھا، اس پر ثواب یا تو ہے ہی نہیں یا ہے تو معمولی ہے۔

مثلاً ایک شخص نے آپ سے قرضہ مانگا تھا اور وقت پر اس نے اس قرضہ کو ادا کردیا تو آپ کا کیا خیال ہے کہ قرضہ ادا کرنے میں اس کو ثواب ملنا چاہیے؟ بلکہ ایک حق تھا جو اس نے ادا کردیا۔ہاں! اس حد تک ثواب کی امید کی جاسکتی ہے کہ اگر قرضہ ادا نہ کرتا تو بہت گناہ ہوتا، اس گناہ سے بچ گیا باقی براہ راست کوئی ثواب کا کام نہیں ہے۔

بخلاف وصیت کے کہ اگر وصیت کسی مستحق کے لئے کی جائے تو اس میں ثواب ہے، اس واسطے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ثواب والے فعل کو مقدم فرمایا۔

تیسری بات یہ ہے کہ اللہ ﷻ نے اس سے ایک اصولی مسئلہ بھی واضح فرمادیا کہ مجرد عطف چاہے ''واؤ'' کے ذریعے ہو یا ''او'' کے ذریعے ہو وہ ترتیب پر دلالت نہیں کرتا۔

یا تقدم ذکری تقدم طبعی کے لئے لازم نہیں بلکہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز ذکر پہلے کی ہو لیکن رتبۃً وہ مؤخر ہو۔

اور آخری بات کہ کلام کے اندر جو شوکت اور جزالت اسلوب کے لحاظ سے ہے وہ وصیت کو مقدم کرنے

میں ہی حاصل ہو رہی ہے، اسی کو الٹ پڑھ کر دیکھ لیں **"من بعد دین أو وصية يوصى بها"** تو اس میں وہ شوکت اور جزالت نہیں ہے اور کلام میں جو حسن **"من بعد وصية يوصى بها أو دين"** میں ہے وہ دین کے مقدم کرنے میں نہیں ہے۔

تو قرآن کریم ابلغ البلغاء کا کلام ہے، اس لئے اس میں بلاغت بھی ملحوظ رکھی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

۲۷۵۰ ـ حدثنا محمد بن یوسف: أخبرنا الأوزاعی، عن الزهری، عن سعید بن المسیب، وعروة بن الزبیر: أن حکیم بن حزام ﷺ قال: سألت رسول الله ﷺ فأعطانی، ثم سألته فأعطانی، ثم قال لی: ((یاحکیم، إن هذا المال خضر حلو، فمن أخذه بسخاوة نفس بورک له فیه، ومن أخذه بإشراف نفس لم یبارک له فیه، وکان کالذی یأکل ولا یشبع. والید العلیا خیر من الید السفلی)). قال حکیم: فقلت یارسول الله، والذی بعثک بالحق لا أرزأ أحدا بعدک شیئا حتی أفارق الدنیا. فکان أبو بکر یدعو حکیما لیعطیه العطاء فیأبی أن یقبل منه شیئا، ثم إن عمر دعاه لیعطیه فأبی أن یقبله، فقال: یامعشر المسلمین، إنی أعرض علیه حقه الذی قسم الله له من هذا الفیء فأبی أن یأخذه، فلم یرزأ حکیم أحدا من الناس بعد النبی ﷺ حتی توفی رحمه الله. [راجع: ۱۴۷۲]

حدیث کی تشریح

حضور ﷺ ان کو تالیف قلب کے طور پر کچھ دیا کرتے تھے، بعد میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو سخاوت نفس کے طور پر لے اس میں برکت ہوتی ہے اور جو اشراف نفس کے ساتھ لے تو پیٹ کبھی نہیں بھرتا اور فرمایا **"والید العلیا خیر من الید السفلی"** یہ سب باتیں جب فرمائی تو **"قال حکیم"** میں آپ کے علاوہ شخص سے پیسے لے کر اس کے مال میں کمی نہیں کروں گا چنانچہ صدیق اکبر ﷺ اور فاروق اعظم ﷺ کے زمانے میں انہوں نے لینے سے انکار کر دیا (پیچھے حدیث گزر چکی ہے)۔

یہاں اس کو لانے کا منشأ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ان کو تالیف قلب کے طور پر رقم دینی شروع کی تھی، جب دیکھا کہ اب اس کو اتنی ضرورت نہیں ہے اور دوسرے زیادہ مستحق ہیں تو آپ ﷺ نے ان کو دینا بند کر دیا کیونکہ دوسرے مستحقین کو دینا ایک طرح سے واجب ہو گیا اور ان کو دینا ایک مستحب ہو گیا، لہٰذا مستحب کو واجب پر مقدم فرمایا۔

(۱۰) باب إذا وقف ، أوأوصى لأقاربه، ومن الأقارب؟

"وقال ثابت: عن أنس ، قال النبي ﷺ لأبي طلحة :((اجعله لفقراء أقاربك))، فجعلها لحسان وأبي بن كعب ، وقال الأنصاري :حدثني ابي، عن ثمامة، عن انس بمثل حديث ثابت. قال: ((اجعلها لفقراء قربتك)).قال أنس :فجعلها لحسان وأبي بن كعب وكانا أقرب إليه مني ،و كان قرابة حسان وأبي من أبي طلحة ، واسمه زيدبن سهل بن الأسود ابن حرام بن عمرو بن زيد مناة بن عدي بن عمروبن مالك بن النجار، وحسان بن ثابت ابن المنذربن حرام، فيجتمعان إلى حرام وهو الأب الثالث. وحرام بن عمروبن زيدمناة بن عدي بن عمرو بن مالك بن النجار، وهو يجامع حسان وأباطلحة وأبي إلى ستة آباء إلى عمرو بن مالك وهو ابي بن كعب بن قيس بن عبيد بن زيد بن معاويۃ بن عمرو ابن مالك بن النجار. فعمروبن مالك يجمع حسان وأباطلحة وأبيا. وقال بعضهم: إذاأوصى لقرابته فهو إلى آبائه في الإسلام".

یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے "إذاوقف ، أوأوصى لأقاربه، ومن الأقارب؟" کہ اگر کوئی شخص اپنے اقارب یا کسی دوسرے کے اقارب کے لئے وصیت کرے کہ میں یہ مال دوسرے کے لئے وقف کرتا ہوں یا فلاں کے اقرب کے لئے وصیت کرتا ہوں۔ یہاں اقارب کے لفظ کا استعمال کیا اور اقارب میں بہت سارے رشتہ دار آجاتے ہیں۔

اقارب کی تعیین میں اختلاف فقہاء

اس لئے فقہا کرام رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان یہ مسئلہ مختلف فیہ ہوا کہ ایسی صورت میں کون سے اقارب معتبر ہوں گے؟

وہ اقارب جو موصی کے وارث ہیں وہ تو بالاجماع وصیت سے خارج ہوں گے کیونکہ لا وصیۃ لوارث لیکن جو اقارب ورثہ میں شامل نہیں وہ اقارب کے لفظ میں کس حد تک داخل ہوں گے؟ اس میں مختلف فقہاء نے مختلف معیار بیان فرمائے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے فرمایا ایسی صورت میں اقارب سے ذو رحم محرم

مراد ہوں گے، خواہ وہ باپ کی طرف سے ہوں یا ماں کی طرف سے ہوں جیسے باپ کی طرف سے چچا اور ماں کی طرف سے ماموں۔ [۱۳]

امام شافعی رحمہ اللہ

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جو بھی نسب میں کسی بھی لحاظ سے شریک ہو وہ اقارب میں داخل ہوگا۔ نسب میں شریک ہونے کے معنی یہ ہیں کہ باپ کی طرف کے لوگ داخل ہوں گے اور ماں کی طرف کے لوگ داخل نہیں ہوں گے۔ [۱۴]

امام مالک رحمہ اللہ

امام مالک رحمہ اللہ کا قول بھی قریب قریب ہے وہ کہتے ہیں کہ عصبات داخل ہیں۔ [۱۵]

امام ابو یوسف رحمہ اللہ

امام ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمام اقارب داخل ہوں گے۔ یہاں تک کہ موصی سے لے کر اس کے آباؤ اجداد میں جو آخری مسلمان ہے وہ اور اس کی تمام اولاد بھی شامل ہو جائیں گی۔

بعض فقہاء نے فرمایا کہ چار پشتوں تک کے لوگ شامل ہوں گے اور ان سے آگے کے شامل نہیں ہوں گے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا قول بظاہر امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہے کہ جتنے آباء فی الاسلام ہیں ان سے نکلنے والے رشتے اقارب میں داخل ہوں گے۔ ان میں سے جو بھی زندہ موجود ہوگا وہ وصیت کا حقدار ہوگا۔ [۱۶]

[۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶] اختلف الناس في الرجل يؤصي بثلث ماله لقرابة فلان ،من القرابة الذين يستحقون تلک الوصية ؟ فقال أبو حنيفة : هم كل ذى رحم محرم من فلان من قبل أبيه أو من قبل أمه .قلت ولا يدخل الوالدان والولد. قال الطحاوى : غير أنه يبدأ فى ذلک من كانت قرابته منه من قبل أبيه على من كانت قرابته من قبل أمه ،أما إعتبار الأقرب فلأن الوصية اخت الميراث الخ.........قلت ذكر الزيادات أنهما يدخلان ولم يذكر فيه خلافا،وذكر الحسن بن زياد عن أبى حنيفة أنهما لا يدخلان ،وهكذا روى عن أبى يوسف وهو الصحيح .وقال زفر : الوصية لكل من قرب منه من قبل أبيه أوأمه دون من كان أبعد منهم ،وسواء فى هذا بين من كان منهم ذا رحم محرم وبين من كان ذا رحم غير محرم ،وقال أبويوسف ومحمد : الوصية فى ذلک لكل من جمعه وفلانا أبو احد منذ كانت الهجرة ، من قبل أبيه أومن قبل أمه. وقال قوم من أهل الحديث وجماعة من الظاهرية : الوصية فى ذلک لكل من جمعه وفلانا أبوه الرابع إلى ماهو أسفل من ذلک ،وقال مالک والشافعى واحمد: الوصية فى ذلک لكل من جمعه وفلانا أب واحد فى الاسلام او فى الجاهلية، وتحقيق مذهب الشافعى ماذكره النووى. الخ ، عمدة القارى ،ج : ١٠ ، ص : ٢٩.

اس بارے میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے کہا بیرحاء کے بارے میں کہ **"إجعله لفقراء أقاربک فجعلها لحسان وأبی بن کعب"** انہوں نے حسان رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کا انتخاب کیا اب یہ بتا رہے ہیں کہ حسان رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے کیا رشتہ داری تھی ۔عبد للہ بن انصاری کہتے ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا **"فجعلها لحسان وأبی بن کعب وکان أقرب الیه منی"** کہ حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے مجھ سے زیادہ قریب تھے۔

آگے اس کی تفصیل بیان کی ہے کہ حسان رضی اللہ عنہ اور ابی رضی اللہ عنہ کی ابوطلحہ رضی اللہ عنہ سے اس طرح قرابت تھی کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا پورا نام ہے زید بن سہل بن الاسود ابن حرام بن عمرو بن زید بن مناۃ بن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار۔ یہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا نسب نامہ بیان کر دیا۔

اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کا پورا نام یہ ہے کہ حسان بن ثابت بن المنذر بن حرام جس کا مطلب یہ ہے **"فیجتمعان الی حرام"** کہ تیسرے باپ یعنی حرام پر جا کر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور حسان رضی اللہ عنہ اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے والد سہل ہیں، ان کے والد اسود اور ان کے والد حرام ہیں حسان رضی اللہ عنہ کے والد ثابت ہیں، ان کے والد منذر اور ان کے والد حرام ہیں تو تیسرے باپ میں جا کر دونوں جمع ہو جاتے ہیں ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کا حضرت حسان رضی اللہ عنہ سے یہ رشتہ ہوا۔

"وحرام بن عمرو بن زیدمناۃبن عدی بن عمرو بن مالک بن النجار" تو ابوطلحہ رضی اللہ عنہ، ابی رضی اللہ عنہ کے ساتھ چھٹے باپ یعنی عمرو بن مالک پر جمع ہوتے ہیں تو گویا چھٹی نسل میں جا کر حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے درمیان قرابت ثابت ہوتی ہے۔

"وهو أبی بن کعب بن قیس بن عبید بن زید بن معاویة بن عمرو ابن مالک بن النجار. فعمرو بن مالک یجمع حسان و أباطلحة وأبیا".

حضرت حسان رضی اللہ عنہ، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ اور ابی رضی اللہ عنہ تینوں عمرو بن مالک کے بالواسطہ بیٹے ہیں۔

اس سے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ چھٹے باپ میں جا کر جمع ہو رہے ہیں، اس کے باوجود ان کو اقارب میں شمار کیا گیا۔

آخر میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں۔

"وقال بعضهم :إذا أوصی لقرابته فهو إلی آبائه فی الإسلام" اس سے مراد امام ابو یوسفؒ ہیں کہ جب کوئی شخص قرابت کی وصیت کرے تو اس کے جتنے آباء اسلام میں رہے ہیں وہ سب قرابت

کے مفہوم میں شامل ہو گے۔

یہاں امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا قول تائیداً نقل کیا ہے۔ اس لئے **"قال بعض الناس"** نہیں کہا بلکہ **"قال بعضھم"** کہا ہے اور اسی کی تائید بھی فرمائی۔

یاد رکھنے کی بات

یہ حدیث اس سلسلے میں یاد رکھیں کہ لقطہ کے باب میں، میں نے عرض کیا تھا کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے لقطہ اٹھالیا تھا، اس کو کھانے کا حکم دیا تھا، اس پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ دولت مند صحابی تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے ان کو لقطہ کھانے کی اجازت دے دی۔ لیکن یہ حدیث صراحتاً بتارہی ہے کہ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے فقراء اقارب میں سے تھا جن پر صدقہ کیا گیا۔

۲۷۵۲ ۔ حدثنا عبد اللہ بن یوسف : أخبرنا مالک ، عن اسحاق بن عبداللہ بن أبی طلحة : أنه سمع أنسا رضی اللہ عنہ قال : قال النبی ﷺ لأبی طلحة : ((أری أن تجعلها فی الأقربین)) فقال أبو طلحة: أفعل یارسول اللہ ،فقسمها أبوطلحة فی أقاربه و بنی عمه . وقال ابن عباس : لما نزلت ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [۱۷] جعل النبی ﷺ ینادی : ((یابنی فهر، یابنی عدی))، لبطون قریش۔ وقال أبو هریرة: لما نزلت ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [۱۸] قال النبی ﷺ ((یامعشر قریش)) [راجع : ۱۴۶۱].

اس طرف اشارہ کررہے ہیں کہ جب آیت نازل ہوئی ﴿وَ أَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ تو آپ ﷺ نے قریش کے تمام بڑوں کو دعوت دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقربین کا لفظ ان سب کو شامل تھا۔

اس سے امام ابو یوسف رحمہ اللہ کے اس قول کی تائید ہوتی ہے کہ اوپر تک جتنی نسلیں ہوتی ہیں سب اس کے اندر شامل ہوں گے۔

(۱۱) باب: هل یدخل النساء والولد فی الأقارب؟

۲۷۵۳ ۔ حدثنا أبو الیمان : أخبرنا شعیب، عن الزهری قال : أخبرنی سعید بن المسیب، وأبو سلمة بن عبد الرحمٰن : أن أباهریرة رضی اللہ عنہ قال : قام رسول اللہ ﷺ حین أنزل اللہ عزوجل ﴿وَأَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْأَقْرَبِيْنَ﴾ [۱۹] قال: ((یا معشر قریش ۔ أو کلمة نحوها ۔ اشتروا أنفسکم ، لاأغنی عنکم من اللہ شیئا . یا بنی عبدمناف، لاأغنی عنکم من اللہ شیئا ،

---

[۱۷] ، [۱۸] ، [۱۹] [الشعراء : ۲۱۴]

یا عباس بن عبد المطلب ' لاأغنی عنک من اللہ شیئا . ویا صفیة عمة رسول اللہ ،لاأغنی عنک من اللہ شیئا. و یافاطمة بنت محمد ﷺ ، سلینی ماشئت من مالی ، لاأغنی عنک من اللہ شیئا)).

تابعه اصبغ ،عن ابن وهب ، عن یونس ،عن ابن شهاب. [أنظر : ۲۷۵۲، ۳۵۲۷، ۴۷۷۱]. [۲۰]

یہاں اس حدیث کو لانے کا منشاء یہ ہے کہ اقارب کے مفہوم میں اولاد بھی داخل ہے کیونکہ آپ ﷺ کو حکم دیا گیا تھا ﴿ وَ اَنْذِرْ عَشِیْرَتَکَ الْاَقْرَبِیْنَ ﴾ آپ ﷺ نے اس پر عمل کرتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے بھی خطاب کیا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا آپ کی اولاد میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اقربین میں اولاد بھی داخل ہے۔

اگر اقارب کے لئے وصیت ہو تو اولاد شامل نہیں ہوتی

مسلک حنفیہ

حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے اقارب کے لئے وصیت کرے تو اس میں اولاد شامل نہیں ہوتی، اولاد کے علاوہ اقارب شامل ہوتے ہیں، اس لئے کہ قرآن کریم نے والدین اور اقربین کو الگ الگ ذکر کیا ہے فرمایا: **"ان ترک خیر الو صیة للو الدین والاقربین"** یہاں والدین اور اقربین کو حرف عطف کے ذریعے الگ ذکر کیا اور عطف مغایرت پر دلالت کرتا ہے۔ معلوم ہوا کہ والدین اقربین میں داخل نہیں۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں فلاں کے اقارب پر صدقہ کرتا ہوں تو اس کے والدین اور اولاد، اقارب میں شامل نہیں ہوگی، ان کے علاوہ اقارب ہوں گے۔ [۲۱]

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو استدلال کیا ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت فاطمہ ؓ کو دعوت اسلام کے لئے اقربین میں شامل کیا، اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہاں درحقیقت حکم ہی اور تھا۔ وہاں انذار کا حکم تھا کہ اپنے قریب کے لوگوں کو انذار کرو۔

---

[۲۰] وفی صحیح مسلم ،کتاب الإیمان ، باب فی قوله تعالیٰ وانذر عشیرتک الاقربین ، رقم :۳۰۳، ۳۰۵،وسنن الترمذی ،کتاب تفسیر القرآن عن رسول اللہ، باب ومن سورة التوبة ، رقم :۳۰۱۹،وسنن النسائی ،کتاب الوصایا، باب اذا أوصی لعشیرته الاقربین ، رقم: ۳۵۸۴، ومسند أحمد ،باقی مسند المکثرین، باب باقی المسند السابق ، رقم: ۸۰۵۱ ، وسنن الدارمی ،کتاب الرقاق ، باب فی حسن الظن باللہ ، رقم :۲۶۱۶.

[۲۱] عمدة القاری، ج: ۱۰، ص: ۳۳.

آپ ﷺ نے بطور دلالت النص سمجھا کہ اقربین کے ساتھ ساتھ اولاد کو بھی کرنا چاہئے۔ لیکن وصیت کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا کیونکہ وصیت میں اللہ تعالیٰ نے والدین اور اقربین دونوں کو الگ الگ ذکر کیا ہے۔

اور اس کا مدار عرف پر بھی ہوتا ہے کہ عرفاً اولاد کو رشتہ دار نہیں کہتے، نہ باپ کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ میرا رشتہ دار ہے اور نہ بیٹے کے بارے میں کہتے ہیں، ان پر رشتہ دار کا اطلاق نہیں ہوتا بلکہ یہ رشتہ داری سے بلند تر چیز ہے، اس واسطے وصیت میں اس کا اعتبار نہیں۔

(۱۲) باب هل ينتفع الواقف بوقفه؟

"وقد اشترط عمر ﷺ: لا جناح على من وليه أن يأكل منها، وقد يلي الواقف و غيره. و كذلك كل من جعل بدنة أو شيئا لله فله أن ينتفع بها كما ينتفع غيره و إن لم يشترط".

۲۷۵۴ ۔ حدثنا قتيبة بن سعيد: حدثنا أبو عوانة، عن قتادة، عن أنس ﷺ: ((أن النبي ﷺ رأى رجلا يسوق بدنة فقال له: اركبها، فقال: يارسول الله إنها بدنة، فقال في الثالثة أو في الرابعة: اركبها ويلك أو ويحك)). [راجع: ۱۶۹۰]

فرمایا کہ واقف اپنے وقف سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یعنی اگر وقف میں یہ شرط لگالے کہ میں اس وقف سے فائدہ اٹھاؤں گا تو ایسا کرنا جائز ہے۔

حضرت عثمان ﷺ نے جب بیر رومہ خرید کر وقف کیا تھا، تو فرمایا تھا کہ میرا ڈول بھی دوسرے مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا یعنی جس طرح اور لوگ پانی پئیں گے میں بھی پیوں گا۔ معلوم ہوا کہ یہ شرط لگانا جائز ہے۔

اس پر حضرت عمر ﷺ کے وقف سے استدلال کیا کہ جس کے الفاظ یہ ہیں **"لا جناح على من وليه أن يأكل منها وقد يلي الواقف و غيره"** کہ جو وقف کا متولی ہوگا وہ اس سے کھا سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بعض اوقات واقف خود متولی بن جاتا ہے تو اس صورت میں واقف بحیثیت متولی کھائے گا، اپنے وقف سے نفع اٹھائے گا تو یہ جائز ہے۔

یہاں تک تو بات ٹھیک تھی، آگے اس پر ایک اور مسئلہ متفرع کیا جو حنفیہ کے لحاظ سے ٹھیک نہیں ہے۔ وہ یہ کہ **"و كذلك كل من جعل بدنة أو شيئا لله فله أن ينتفع بها كما ينتفع غيره"** اگر کوئی شخص کوئی بدنہ یا کوئی اور چیز اللہ کے لئے نذر مان لے۔ تو اس کے لئے جائز ہے کہ اس سے نفع اٹھائے۔

حنفیہ کا اس میں اختلاف ہے جو پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

استدلال میں وہ واقعہ بیان کیا جس میں یہ ہے کہ آپ ﷺ نے رکوب کی اجازت دی تھی، پہلے عرض کیا

جا چکا ہے کہ یہ حالتِ اضطرار میں ہے اور اس کے باوجود کفارہ بھی واجب ہے۔

(۱۳) باب إذا وقف شيئا قبل أن يدفعه إلى غيره فهو جائز،

أن عمر ﷺ أوقف فقال: لا جناح على من وليه أن يأكل، ولم يخص أن وليه عمر أو غيره. وقال النبي ﷺ لأبي طلحة: ((أرى أن تجعلها في الأقربين، فقال: أفعل،فقسمها في أقاربه و بني عمه)).

ایک شخص نے زبانی طور پر کوئی چیز وقف کر دی اور کہا "**وقفت لله**" لیکن ابھی وہ چیز نہ تو موقوف علیہ کو دی اور نہ کسی متولی کے حوالے کی تو آیا وقف تام ہو گیا یا نہیں؟

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ مسئلہ چھیڑ کر اپنا مسلک بیان کیا ہے کہ باوجود دوسرے کو قبضہ نہ دینے کے وقف صحیح ہو جائے گا۔

اختلاف فقہاء

اس مسئلہ میں امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کے درمیان اختلاف ہے۔

امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک

امام محمدؒ اس وقف کو ہبہ کے احکام پر قیاس کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح ہبہ میں جب تک شی موہوب پر موہوب لہ کا قبضہ متحقق نہ ہو جائے، ہبہ تام نہیں ہوتا۔ اسی طرح وقف میں جب تک واقف اپنے قبضے سے نکال کر موقوف لہ یا متولی کے قبضے میں نہ دے دے، اس وقت تک وقف تام نہیں ہوگا۔[۲۲]

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابو یوسفؒ فرماتے ہیں کہ وقف کے احکام ہبہ جیسے نہیں ہیں۔ اس واسطے کہ ہبہ میں اپنی ملکیت سے نکال کر کسی دوسرے کی ملکیت ثابت کرنی ہوتی ہے بخلاف وقف کے کہ وقف میں اپنی ملکیت سے تو نکال دیتے ہیں لیکن موقوف علیہ کی ملکیت میں نہیں آتا، اللہ کی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔

تو یہاں موقوف لہ کہیں یا منتقل الیہ کہیں، وہ اللہ ﷻ ہیں اور اللہ ﷻ کا قبضہ تو ہر چیز پر ہر وقت رہتا ہی ہے، الگ سے قبضہ کرانے کے کوئی معنی نہیں، لہٰذا یہاں پر قبضہ شرط نہیں۔[۲۳]

---

۲۲ وقالت طائفة لايصح الوقف حتى يخرجه عن يده، أو يقبضه غيره، وبه قال ابن أبي ليلى ومحمد بن الحسن. عمدة القاری، ج: ۱۰ ص: ۳۶.

۲۳ صحيح لايحتاج الى قبض الغير، وهو قول الجمهور منهم الشافعي وأبو يوسف ....وحجة الجمهور أن عمر وعليا وفاطمة الخ. عمدة القاری، ج: ۱۰، ص: ۳۶.

وہ اس کو عتق پر قیاس کرتے ہیں کہ جیسے کوئی شخص غلام آزاد کرے تو صرف یہ کہہ دے کہ **"أنت حر"** محض زبان سے یہ کہہ دینے سے حریت متحقق ہو جاتی ہے چاہے عملاً اس کو کمرہ میں بند کر رکھا ہو۔

اسی طرح وقف میں کہہ دیا کہ **" وقفت لله "** تو وقف ہو گیا اب کسی اور کی طرف منتقل کرنا شرط نہیں۔

امام بخاری رحمہ اللہ بھی اسی قول کے قائل ہیں اور اس سے استدلال کیا کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وقف کیا اور کہا **"لا جناح ..."**۔

"ولم یخص" وہاں وقف کے وقت یہ نہیں بتایا کہ متولی میں خود رہوں گا یا کوئی اور ہوگا، جب یہ نہیں بتایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کسی اور کی طرف منتقل نہیں کیا۔ جب منتقل نہیں تو محض وقف ہے تو محض وقف کرنے سے وقف ہو گیا اور حضور ﷺ نے اس کو وقف قرار دیا۔

"وقال النبی ﷺ لأبی طلحة: أری أن تجعلها فی الأقربین" میری رائے ہے کہ تم اس کو اقربین میں شامل کرلو، انہوں نے کہا **"افعل"** اس کا مطلب یہ ہوا کہ جس وقت حضور اکرم ﷺ کے پاس آئے تھے اس وقت تک کسی اور کے حوالے نہیں کیا تھا، جب کسی اور کے حوالے نہیں کیا تو محض وقف ہوا بغیر حوالے گئے۔ معلوم ہوا کہ یہ جائز ہے۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کے واقعہ کو یہاں لانا یہ امام بخاری رحمہ اللہ کا توسع ہے۔ اصل میں وہ وقف تھا ہی نہیں بلکہ صدقہ تھا۔ امام بخاری ؒ نے یہاں کئی جگہ ابواب میں خلط ملط کیا ہے اور صدقہ کو وقف کے ساتھ خلط کر دیا ہے؟

آپ کا اعتراض صحیح ہے کہ یہاں اس حدیث کو لانے کا موقع نہیں تھا، اس واسطے کہ یہ وقف تھا ہی نہیں اور گفتگو وقف کی ہو رہی ہے۔

(۱۴) باب إذا قال: داری صدقة لله ولم یبین للفقراء أو غیرهم فهو جائز. و یعطیها للأقربین أو حیث أراد،

"قال النبی ﷺ لأبی طلحة حین قال: احب اموالی إلی بیرحاء وإنها صدقة، فأجاز النبی ﷺ ذلک. وقال بعضهم: لایجوز حتی یبین لمن، والأول اصح"۔

جب کسی شخص نے کہا کہ یہ اللہ کے لئے ہے تو بس وہ وقف ہو گیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ کس کے لئے ہے؟ یعنی موقوف علیہم کون ہیں جب تک نہیں بتائے گا وقف صحیح نہیں ہوگا؟

حنفیہ کا کہنا یہ ہے کہ وقف تو ہو جائے گا اور اسی سے کہا جائے گا کہ بتاؤ موقوف علیہ کون ہے، اگر بتا سکا تو موقوف علیہ متعین ہو جائے گا اور اگر نہ بتا سکا مثلاً انتقال ہو گیا تو اس کو فقراء اور مساکین پر صرف کیا جائے گا۔

وقف کسی بھی انسان کی ملکیت نہیں رہتا بلکہ وہ اپنی جگہ پر اللہ کی ملک ہوتا ہے۔ البتہ موقوف علیہم کو اس کے منافع سے فائدہ اٹھانے کا حق دے دیا جاتا ہے۔

اور صدقہ کہتے ہی اس وقت ہیں جب کسی شخص کو مالک بنا کر دے دیا گیا ہو۔ مثلاً یہ دارالعلوم کی عمارت وقف ہے، یہ کسی کی ملکیت نہیں ہے، نہ مدرسہ کی، نہ مدرسے کے منتظمین کی، نہ اساتذہ کی، نہ طلباء کی لیکن طلباء اور اساتذہ کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے اور طالب علم کو جو وظیفہ ملے گا وہ وقف نہیں ہوگا کیونکہ طالب علم کو مالک بنا کر دے دیا گیا، لہٰذا وہ صدقہ ہوگا۔[۲۴]

(۱۵) باب إذا قال: أرضى أو بستاني صدقة لله عن أمي،

"فهو جائز وإن لم يبين لمن ذلك"

۲۷۵۶ ـ حدثنا محمد: مخلد بن يزيد: أخبرنا ابن جريج قال: أخبرني يعلى: أنه سمع عكرمة يقول: انبأنا ابن عباس رضي الله عنهما: أن سعد بن عبادة ﷺ توفيت أمه وهو غائب عنها فقال: يارسول الله إن أمي توفيت و أنا غائب عنها، أ ينفعها شيء إن تصدقت به عنها؟ قال: ((نعم))، قال: فإني أشهدك أن حائطي المخراف صدقة عليها. [أنظر: ۲۷۶۲، ۲۷۷۰][۲۵]

یہاں پر یہ کہہ دیا کہ اس کی طرف سے باغ کا صدقہ ہے، لیکن یہ نہیں بتایا کہ اس سے فائدہ کون اٹھائے گا تو صدقہ ہوگیا، یعنی وقف ہوگیا، البتہ موقوف علیہ کی تعیین کے بارے میں وہی تفصیل ہے جو اوپر گذری۔

---

[۲۴] وقال أبو حنيفة :إذا قال الرجل : ارضي هذه صدقة ،ولم يزد على هذا شيئاً أنه ينبغي له أن يتصدق باصلهاعلى الفقراء المساكين ،أويبيعها ويتصدق بثمنهاعلى المساكين، ولا يكون وقفا ،ولو مات كان جميع ذلك ميراثابين ورثته على كتاب الله تعالى ،وكل صدقة لاتضاف إلى أحد فهي للمساكين.(عمدة القاري، ج: ۱۰، ص: ۳۷)

[۲۵] وفي صحيح مسلم ،كتاب النذر ، باب الأمر بقضاء النذر ، رقم :۳۰۹۲،وسنن الترمذي ،كتاب الزكاة عن رسول الله ، باب ماجاء في الصدقة عن الميت ، رقم : ۶۰۵، وكتاب النذور والأيمان عن رسول الله ، باب ماجاء في قضاء النذر عن الميت ، رقم :۱۴۶۶ ،وسنن النسائي، كتاب الوصايا، باب فضل الصدقة عن الميت ، رقم :۳۵۹۴،و سنن أبي داؤد ،كتاب الوصايا، باب ماجاء فيمن مات عن غيروصية يتصدق عنه ، رقم :۲۴۹۶، و كتاب النذور والأيمان، باب في قضاء النذر عن الميت ، رقم :۲۸۷۶،وسنن ابن ماجه ، كتاب الكفارات، باب من مات وعليه نذر، رقم :۲۱۲۳، و مسند احمد ، ومسند بني هاشم ، باب بداية مسند عبدالله بن العباس ، رقم : ۱۷۹۵، ۲۸۹۱، ۲۹۱۹، ۳۳۲۴، وموطأ مالك، كتاب النذور والأيمان، باب مايجب من النذور في الشيء ، رقم: ۸۹۵ .

(۱۶) باب إذا تصدق أو وقف بعض ماله أو بعض رقيقه أو دوابه فهو جائز

۲۷۵۷ ـ حدثنا يحيى بن بكير: حدثنا الليث، عن عقيل، عن ابن شهاب قال: أخبرني عبد الرحمٰن بن عبد الله بن كعب أن عبد الله بن كعب قال: سمعت كعب بن مالک ﷺ يقول: قلت: يارسول الله، إن من توبتي أن أنخلع من مالي صدقة إلى الله وإلى رسوله ﷺ. قال: ((أمسک علیک بعض مالک، فهو خير لک))، قلت: فإني أمسک سهمي الذي بخيبر. [أنظر: ۲۹۴۷، ۲۹۵۰، ۳۰۸۸، ۳۵۵۶، ۳۸۸۹، ۳۹۵۱، ۴۴۱۸، ۴۶۷۳، ۴۶۷۶، ۴۶۷۷، ۴۶۷۸، ۶۲۵۵، ۶۶۹۰، ۷۲۲۵]. [۲۶]

"باب إذا تصدق أو وقف بعض ماله"

اس باب میں درحقیقت وقف المشاع کے جواز کا مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنے مال کا کچھ حصہ وقف کردے **"لاعلی التعیین"** کہ میں نے اپنے مال کا ربع وقف کردیا یا یہ کہے کہ دواب یا غلاموں کا ربع حصہ وقف کردیا تو کہتے ہیں کہ یہ بھی جائز ہے۔

وقف المشاع میں حنفیہ میں اختلاف

امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک

امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک ابھی ماقبل میں گزرا ہے کہ ان کے نزدیک وقف میں بھی قبضہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح ہبہ میں ضروری ہے۔

چنانچہ وہ جس طرح ہبہ میں کہتے ہیں کہ ہبۃ المشاع ناجائز ہے، اسی طرح وقف میں بھی کہتے ہیں کہ وقف المشاع ناجائز ہے۔ [۲۷]

---

[۲۶] وفي صحيح مسلم، كتاب التوبه، باب حديث توبة كعب من مالک وصاحبيه، رقم: ۴۹۷۳، وسنن الترمذي، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة التوبة، رقم: ۳۰۲۷، وسنن النسائي، كتاب الأيمان والنذور، باب اذا اهدى ماله على وجه النذر، رقم: ۳۷۶۴، وسنن أبي داؤد، كتاب الأيمان والنذور، باب فيمن نذر أن يتصدق بماله، رقم: ۲۸۸۴، ۲۸۸۵، ومسند احمد، مسند المكيين، باب حديث كعب بن مالک الأنصاري، رقم: ۱۵۲۱۰، ومن مسند القبائل، باب حديث كعب بن مالک، رقم: ۲۵۹۲۲.

[۲۷] عمدة القاری، ج: ۱۰ ص: ۳۹.

امام ابو یوسف رحمہ اللہ کا مسلک

امام ابو یوسف رحمہ اللہ ہبہ کے احکام اس پر جاری نہیں کرتے بلکہ عتق کے احکام جاری کرتے ہیں، چونکہ ان کے نزدیک ہبہ نہیں، اس لئے قبضہ بھی شرط نہیں۔

اور قبضہ شرط ہونے پر بھی وقف المشاع کا عدم جواز متفرع تھا، جب قبضہ نہ رہا تو وقف المشاع بھی ناجائز نہ رہا، لہٰذا ان کے نزدیک وقف المشاع جائز ہے۔ اس معاملے میں وہ امام بخاریؒ کے ساتھ ہو گئے۔ [۲۸]

باقی امام بخاری رحمہ اللہ نے وقف المشاع کے جواز پر جو استدلال کیا ہے وہ کمزور ہے۔

استدلال یہ ہے کہ غزوہ تبوک کے واقعہ میں جب حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی توبہ قبول ہوئی تو انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں صدقہ کر کے اپنے سارے مال سے دستبردار ہوتا ہوں۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ کچھ مال اپنے پاس چھوڑ کر رکھو۔ انہوں نے کہا میں اپنا خیبر والا مال روک کر رکھتا ہوں باقی سارا صدقہ کرتا ہوں۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے یہ استدلال کر رہے ہیں کہ اپنے مال میں سے انہوں نے کچھ حصہ تو باقی رکھا اور کچھ حصہ صدقہ کر دیا، لہٰذا یہ مشاع کا صدقہ ہوا کیونکہ جس وقت وہ یہ بات کہہ رہے تھے اس وقت سارا مال ان کے تصرف میں تھا، اب جب اس کا کچھ حصہ صدقہ کر دیا اور کچھ حصہ ان کی ملکیت میں رہا تو مشاع ہو گیا۔

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ یہ بڑا کمزور استدلال ہے، اس واسطے کہ صاف صاف کہہ رہے ہیں کہ میرا جو خیبر کا حصہ ہے اس کے علاوہ میں صدقہ کرتا ہوں، تو خیبر کا حصہ بالکل الگ کر دیا، اس لئے مشاع کب رہا؟ اس کو الگ کر دیا اور باقی سب کو الگ کر دیا۔ اس واسطے اس سے مشاع پر استدلال درست نہیں۔

(۱۷) باب من تصدق إلى وكيله ثم رد الوكيل إليه

۲۷۵۸ — وقال إسماعيل: أخبرني عبد العزيز بن عبد الله بن أبي سلمة، عن إسحاق بن عبد الله ابن أبي طلحة، لا أعلمه إلا عن أنس رضي الله عنه قال: لما نزلت: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ [۲۹]. جاء أبو طلحة إلى رسول الله ﷺ فقال: يارسول الله، يقول الله تبارك و تعالىٰ في كتابه: ﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْن﴾ [۳۰] وإن أحب أموالي إلى بيرحاء ـ قال: و كانت حديقة كان رسول الله ﷺ يدخلها ويستظل فيها ويشرب من مائها فهي إلى الله عزوجل وإلى رسوله ﷺ، أرجو بره و ذخره، فضعها أى

---

[۲۸] عمدة القاري، ج: ۱۰ ص: ۳۹. [۲۹] ، [۳۰] [آل عمران: ۹۲]

رسول اللہ حیث أراک اللہ. فقال رسول اللہ ﷺ : ((بخ یا أبا طلحة، ذٰلک مال رابح قبلناہ منک وردناہ علیک فاجعلہ فی الأقربین)). فتصدق بہ أبو طلحة علی ذوی رحمہ، قال: وکان منھم أُبَیٌّ وحسان، قال: وباع حسان حصتہ منہ من معاویة، فقیل لہ: تبیع صدقة أبی طلحة؟ فقال: ألا أبیع صاعا من تمر بصاع من دراھم؟ قال: وکانت تلک الحدیقة فی موضع قصر بنی حدیلة الذی بناہ معاویة. [راجع: ۱۴۶۱].

یہ وہی حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ والا واقعہ ہے، اس میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا **"ذٰلک مال رابح"** کہ تم سے لیا اور تمہیں پر واپس کر دیا۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب میں استدلال کیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے وکیل کو صدقہ دے کہ میں تمہیں وکیل بناتا ہوں، میرا یہ مال کہیں صدقہ کر دینا بعد میں وکیل خود مؤکل کو وہ رقم واپس کر دے کہ مجھے موقع نہیں ملا یا مناسب شخص نہیں ملا تم ہی کسی مناسب آدمی کو دے دینا تو ایسا کرنا جائز ہے۔

اس سے اس طرح استدلال کیا کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے لاکر حضور اقدس ﷺ کو دیا تھا کہ آپ اس کو جہاں چاہیں خرچ کریں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہم نے قبول کرلیا اور تمہیں لوٹا دیا کہ اس کو اپنے اقربین میں تقسیم کردو۔

"فتصدق بہ أبو طلحة علی ذوی رحمہ، قال: وکان منھم أبی و حسان، قال و باع حسان حصتہ منہ من معاویة"

حضرت حسان رضی اللہ عنہ نے اپنا بیرحاء کا حصہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کر دیا اور یہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وقف نہیں تھا اگر وقف ہوتا تو فروخت نہ کر سکتے یہ صدقہ تھا۔

"فقیل لہ: تبیع صدقة أبی طلحة؟" لوگوں نے اعتراض کیا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے آپ پر صدقہ کیا تھا، آپ فروخت کر رہے ہیں؟ **"فقال: ألا أبیع صاعا من تمر بصاع من دراھم؟"** انہوں نے کہا: کیا میں ایک صاع کھجور ایک درہم بھرے ہوئے سے نہ بیچوں یعنی اس کی قیمت مل گئی ہے۔

عام طور سے جو میں اس باغ سے حاصل کرتا ہوں وہ چند صاع کھجور کے ہوتے ہیں اور جب میں بیچ رہا ہوں تو اس کے مقابلے میں جو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ دے رہے ہیں وہ ایسا ہے کہ صاع میں درہم ہی درہم بھرتے جاؤ تو ایک صاع تمر کا بھر کر لے جانا بہتر ہے یا ایک صاع درہم کا لے جانا بہتر ہے؟ **"صاع من تمر"** کا یہ مطلب ہے۔

روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اس حصہ کو خریدنے کے لئے ایک لاکھ درہم دیئے۔ [۳۱]

---

[۳۱] عمدة القاری، ج: ۱۰، ص: ۴۱.

(۱۸) باب قول اللہ عزوجل: ﴿وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَ الْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ﴾ [۳۲]

۲۷۵۹ ۔ حدثنا محمد بن الفضل أبو النعمان: حدثنا أبو عوانة، عن أبی بشر، عن سعید بن جبیر، عن ابن عباس رضی اللہ عنہما قال: إن ناسا یزعمون أن هذه الآیة نسخت، ولا واللہ ما نسخت ولکنها مما تهاون الناس، هما والیان: وال یرث وذاک الذی یرزق، ووال لا یرث فذاک الذی یقول بالمعروف، یقول: لا أملک لک أن أعطیک. [أنظر: ۴۵۷۶]

قرآن کریم کی آیت کی تفسیر ہے، اللہ تعالیٰ نے میراث کی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿وَ إِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنُ فَارْزُقُوْهُمْ مِنْهُ وَ قُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلاً مَّعْرُوْفاً﴾ [۳۳]

ترجمہ: ''اور جب حاضر ہوں تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور محتاج تو ان کو کچھ کھلا دو اس میں سے اور کہہ دو ان کو بات معقول''۔

یعنی جب تقسیم کے وقت قریبی رشتہ دار یتامیٰ اور مساکین آ جائیں تو ان کو بھی اس میراث میں سے کچھ دو **''وقولوا لهم قولا معروفا''** اور ساتھ یہ بھی ہے کہ ان سے اچھی نیک بات کہو۔

یہاں وہ اولوا القربیٰ، یتامیٰ اور مساکین مراد ہیں جو میت کے وارث نہیں چونکہ وراثت میں تو ان کا حصہ نہیں ہے، البتہ ورثہ سے یہ کہا گیا کہ جب وراثت کی تقسیم کے وقت وہ بھی موجود ہوں تو ان کو بھی کچھ دے دو۔

بہت سے مفسرین یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ منسوخ ہوگئی ہے یعنی پہلے یہ حکم تھا کہ دوسرے یتامیٰ، مساکین اور اقارب کو دیا جائے لیکن بعد میں جب آیت میراث آ گئی ہر ایک کے حصے مقرر ہو گئے تو اب یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

لیکن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس کی تردید فرمائی۔ فرمایا کہ یہ آیت آج بھی باقی ہے، منسوخ نہیں ہوئی۔ البتہ لوگوں نے اس پر عمل کرنے میں سستی شروع کر دی ہے کہ عمل نہیں کرتے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ حکم وجوبی نہیں بلکہ استحبابی ہے۔ استحبابی ہونے کی حیثیت سے پہلے بھی قائم تھا اور آج بھی قائم ہے۔

---

۳۲ [النساء: ۸] ۳۳ [النساء: ۸]

اب آگے ایک اور بات کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم میں ان اولوالقربی، یتامی اور مساکین کے بارے میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ایک **"فارزقوھم منہ"** اور دوسری **"وقولوا لھم قولاً معروفا"** حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ دونوں حکم دومختلف لوگوں کو دیئے گئے ہیں یعنی ان دونوں حکموں کے مخاطب الگ الگ ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب میراث تقسیم ہورہی ہوتی ہے،اس وقت میت کے ولی دوقسم کے ہوتے ہیں۔

ایک میت کا ولی وہ ہے جو وارث بھی ہے اور ایک میت کا ولی وہ ہے جو وارث نہیں ہے مثلاً ایک شخص کا انتقال ہوا،اس کی بیوی، بچے ہیں اور ساتھ بھائی اور چچا بھی ہیں اب اولاد ولی ہے اور ساتھ ساتھ وارث بھی ہے لیکن بھائی اور چچا ولی تو ہیں لیکن اولاد کی موجودگی میں ان کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

تو جو پہلے ولی ہیں یعنی جو وارث بھی ہیں ان کو حکم دیا گیا ہے **"فارزقوھم منہ"** کہ اے وارثو! تم اس ترکہ میں سے تھوڑا بہت حصہ اولوالقربی، یتامی اور مساکین کو بھی دے دو۔

اور دوسرا ولی جیسے بھائی چچا وغیرہ جو وارث نہیں ہیں،ان کو حکم دیا گیا کہ **"وقولوا لھم قولا معروفا"** اے بھائیو اور چچاؤ جب تم دیکھو کہ تمہارے پاس یتامیٰ اور مساکین آرہے ہیں، چکر لگارہے ہیں کہ کچھ ہونے والا ہے یا صراحۃً آپ سے مانگ بھی رہے ہیں کہ ہمیں بھی کچھ دلوادو تو چونکہ آپ کو اس وراثت پر کوئی اختیار نہیں،اس لئے تم دے تو نہیں سکتے لہٰذا **"وقولوا لھم قولا معروفا"** ان سے سیدھی سادی بات کہہ دو کہ بھائی ہم ضرور دیتے لیکن کیا کریں ہمارا اس ترکہ پر اختیار نہیں ہے،اس لئے ہم نہیں دے سکتے۔

"ھما والیان" وہ وارث جو ولی ہے، وہ یتامیٰ اور مساکین کو دے گا۔دوسرا کہے گا کہ بھائی میری قدرت میں نہیں ہے کہ میں آپ کو دوں۔

(۱۹) باب مایستحب لمن توفی فجأة أن یتصدقوا عنه، وقضاء النذور عن المیت

۲۷۶۰۔ حدثنا إسماعیل قال: حدثني مالک، عن هشام، عن أبیه، عن عائشة رضی الله عنها: أن رجلا قال للنبي ﷺ: إن امی افتلتت نفسها وأراها لو تكلمت تصدقت، أفأتصدق عنها؟ قال: ((نعم، تصدق عنها)). [راجع: ۱۳۸۸].

۲۷۶۱۔ حدثنا عبد الله بن یوسف: أخبرنا مالک، عن ابن شهاب، عن عبید الله بن عبد الله، عن ابن عباس رضی الله عنهما: أن سعد بن عبادة ﷺ استفتی رسول الله ﷺ

فقال: إن أمي ماتت و عليها نذر، فقال: ((إقضه عنها)). [أنظر: ۶۶۹۸،۶۹۵۹]

جو نذر کر کے گئی تھی اس کو پورا کردو، پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اگر وصیت نہ کی ہو تو ورثہ کے ذمہ واجب نہیں ہے کہ اس کو پورا کرے۔ اور اگر وصیت کی ہو تو ثلث کی حد تک واجب ہے۔

باب وما للوصی أن يعمل فی مال اليتيم وما يأكل منه بقدر عمالته

یہ بتانا چاہتے ہیں کہ وصی کو یہ حق حاصل ہے کہ یتیم کا جو مال اس کی سرپرستی اور نگرانی میں ہے، اس میں سے وہ اپنے عمالہ کے بقدر رکھا سکتا ہے۔ اگر وہ محتاج ہے تو جتنا وہ یتیم کے لئے کام کر رہا ہے اس کے بقدر یتیم کے مال میں سے اپنا نفقہ لے سکتا ہے جیسا کہ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَانَ غَنِياً فَلْيَسْتَعْفِفْ ج وَ مَنْ كَانَ فَقِيْراً فَلْيَأْ كُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ﴾ [۳۴]

ترجمہ: "اور (یتیموں کے سرپرستوں میں سے) جو خود مال دار ہو وہ تو اپنے آپ کو (یتیم کا مال کھانے سے) بالکل پاک رکھے، ہاں اگر وہ خود محتاج ہو تو معروف طریق کار کو ملحوظ رکھتے ہوئے کھالے"۔ [۳۵]

۲۷۶۴ ـ حدثنا هارون بن الأشعث: حدثنا أبو سعيد مولى بنى هاشم: حدثنا صخر ابن جويرية، عن نافع، عن ابن عمر رضى الله عنهما: أن عمر تصدق بمال له على عهد رسول الله ﷺ و كان يقال له: ثمغ، و كان نخلا، فقال عمر: يارسول الله، إنى استفدت مالا وهو عندى نفيس فأردت أن أتصدق به. فقال النبى ﷺ: ((تصدق بأصله، لايباع ولا يوهب ولا يورث، ولكن ينفق ثمره)). فتصدق به عمر فصدقته تلك فى سبيل الله وفى الرقاب والمساكين والضيف وابن السبيل ولذى القربى. ولا جناح على من وليه أن يأكل منه بالمعروف، أو يؤكل صديقه غير متمول به. [راجع: ۲۳۱۳].

وہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث لائے ہیں، مقصود یہ جملہ ہے **"لاجناح على من وليه"** کہ جو وقف کا متولی ہے وہ معروف طریقہ سے کھا سکتا ہے، اسی پر یتیم کو بھی قیاس کیا کہ یتیم کا متولی بھی معروف طریقہ سے کھا سکتا ہے۔

---

۳۴ النساء: ۶

۳۵ یعنی یتیم کا مال ولی اپنے خرچ میں نہ لائے اور اگر یتیم کی پرورش کرنے والا محتاج ہو تو البتہ اپنی خدمت کرنے کے موافق یتیم کے مال میں سے تحقیق لے لیویں مگر غنی کو کچھ لینا ہرگز جائز نہیں۔ (ف ۲ تفسیر عثمانی صفحہ ۱۰۰)

وقف کے متولی اور یتیم کے متولی میں فرق

لیکن دونوں میں فرق بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یتیم کا متولی مال یتیم سے اسی وقت کھا سکتا ہے، جب وہ محتاج ہو، اگر غنی ہے تو اس کے لئے کھانا جائز نہیں کیونکہ قرآن کریم میں آیا ہے **"وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ج وَ مَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ"** نص نے تفصیل بیان کردی ہے۔

بخلاف وقف کے متولی کے کہ وقف کا متولی اپنی خدمات کے معاوضے کے طور پر وقف سے لے سکتا ہے، چاہے وہ غنی ہی کیوں نہ ہو۔

(۲۴) باب ﴿وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى ط قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَإِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ [۳۶] ﴿لَأَعْنَتَكُمْ﴾: لأحرجكم وضيق عليكم، و ﴿عنت﴾ خضعت.

۲۷٦٧ ـ وقال لنا سليمان بن حرب: حدثنا حماد، عن أيوب، عن نافع قال: ما رد ابن عمر على أحد وصيته و كان ابن سيرين أحب الأشياء إليه في مال اليتيم أن يجتمع إليه نصحاؤه وأولياؤه فينظروا الذي هو خير له. وكان طاؤس إذا سئل عن شيء من أمر اليتامى قرأ: ﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ﴾ وقال عطأ في يتامى الصغير والكبير: ينفق الولي على كل إنسان بقدره من حصته.

حدیث باب کی تشریح

فرمایا کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿وَيَسْأَلُوْنَكَ عَنِ الْيَتَامٰى ط قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ط وَإِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ ط وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ط وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ ط إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾

ترجمہ: ''اور لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ ان کی بھلائی چاہنا نیک کام ہے، اور اگر تم ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو (کچھ حرج نہیں

[۳۶] [البقرة: ۲۲۰]

کیونکہ) وہ تمہارے بھائی ہی تو ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ کون معاملات بگاڑنے والا ہے اور کون سنوارنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشکل میں ڈال دیتا۔ یقیناً اللہ کا اقتدار بھی کامل ہے، حکمت بھی کامل''۔

یعنی ان کی خیر خواہی اور ان کی اصلاح، یہ متولی کے ذمہ واجب ہے، ان کے لئے خیر ہے۔ لیکن جب یتامیٰ کے بارے میں مختلف شدید احکام آئے **"الذین یاکلون أموال الیتامی"** تو صحابہ کرام ﷺ نے اس معاملے میں بہت ہی زیادہ احتیاط شروع کر دی۔ یہاں تک کہ یتیم کا کھانا الگ پک رہا ہے اور ساتھ بیٹھ کر کھا رہے ہیں لیکن یتیم کا کھانا الگ برتن میں ہے تاکہ ہمارا نوالہ کہیں اس کے برتن میں نہ پڑ جائے، اتنا تکلف شروع کر دیا اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی **"وَإِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ"** اگر ان کے ساتھ مل جل کر رہو تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس میں اتنا مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے کھانے کو اپنے کھانے سے ممتاز رکھو بلکہ ملا جلا رکھ کر بھی کھا سکتے ہو۔

پھر فرمایا: **"وَاللهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ"** اور اللہ جانتا ہے کہ کون مفسد ہے اور کون مصلح ہے۔ تو ولی اور یتیم کو جو یہ سارا اختیار حاصل ہے وہ اس شرط کے ساتھ حاصل ہے کہ وہ اصلاح کا کام کرے نہ کہ افساد کا۔ اس سے اشارہ کیا کہ ایسے شخص کو ولی بنانا چاہئے جو مصلح ہو۔

"وَلَوْ شَآءَ اللهُ لَأَعْنَتَكُمْ" اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتے۔ اسی مشقت میں ڈال دیتے کہ خبردار! ایک حبہ ادھر کا ادھر نہ جائے تو ایک مصیبت میں پڑ جاتے۔ ان اللہ عزیز حکیم۔

"عن نافع قال: ماردابن عمر علی أحد" نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے آج تک کسی شخص کی وصیت رد نہیں کی۔ یعنی جب بھی حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو کسی نے وصی بنایا کہ میرے مرنے کے بعد میرا مال شریعت کے مطابق تقسیم کر دینا یا فلاں شخص کے بارے میں وصیت کرتا ہوں ان کو ادا کر دینا اور باقی میرے ورثے میں تقسیم کر دینا وغیرہ تو حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے رد نہیں کیا یہ سوچ کر کہ یہ بے چارے مسلمان کی خواہش ہے اور ثواب کا کام ہے اس لئے کر دو۔ معلوم ہوا کہ وصی بننا کوئی ناجائز بات نہیں اور نہ کوئی ایسی بات ہے جس سے بھاگا جائے۔

"وکان ابن سیرین أحب الأشیاء" محمد بن سیرینؒ کے نزدیک سب سے پسندیدہ بات یتیم کے مال کے بارے میں یہ ہے کہ اس کے خیر خواہ اور اس کے اولیاء جمع ہو جائیں پھر غور کریں **"الذی ھو خیر لہ"** اور مشورہ سے کسی ایسے آدمی کو ولی بنائیں جو اس کے حق میں بہتر ہو تا کہ ولی مصلح بنے، مفسد نہ بنے۔

"وکان طاؤس إذا سئل" طاؤس سے امر یتامیٰ کے بارے میں کوئی بات پوچھی جاتی تو یہ آیت پڑھتے تھے **"والله یعلم المفسد من المصلح"** مطلب یہ ہے کہ یتامیٰ کی اصلاح کے لئے ہر کام کرو، نہ کہ فساد کے لئے۔

"وقال عطاء فی یتامی الصغیر و الکبیر" اصل میں فی الیتامی ہونا چاہئے تھا اور الصغیر والکبیر اس سے بدل ہونا چاہئے تھا لیکن یہاں پتا نہیں کیوں نکرہ آ گیا؟

معرفہ نکرہ سے بدل دیا جو نحویین کے نزدیک قواعد کے خلاف ہے، درست نہیں لیکن ایک عام کلام میں بعض اوقات نحوی قواعد کی رعایت نہیں کی جاتی۔ بہر حال عطاء نے کہا کسی شخص کی زیر تربیت چھوٹے بڑے مختلف قسم کے یتامیٰ ہوں تو ولی کو چاہئے کہ ہر ایک پر اس کے حصہ سے اس کی مقدار کے مطابق خرچ کرے۔ اگر بچہ ہے تو تھوڑا کھانا کھائے گا، اس لئے اتنا ہی لے اور اگر بڑا آدمی ہے تو زیادہ کھائے گا، اس کے حصے سے اس کے مطابق لے تو یتیم کے ولی کو یہ سب کام کرنے پڑتے ہیں۔

(۲۵) باب استخدام الیتیم فی السفر و الحضر إذا کان صلاحا له، ونظر الأم أو زوجها للیتیم

۲۷۶۸ ۔ حدثنا یعقوب بن إبراهیم بن کثیر: حدثنا ابن علیة : حدثنا عبد العزیز، عن أنس رضی اللہ عنہ قال: قدم رسول الله ﷺ المدینة لیس له خادم فأخذ أبو طلحة بیدی فأنطلق بی إلی رسول الله ﷺ فقال: یارسول الله، إن أنسا غلام کیس فلیخدمک، قال: فخدمته فی السفر والحضر ماقال لی لشئ صنعته: لم صنعت هذا هکذا؟ ولا لشئ لم أصنعه: لم لم تصنع هذا هکذا؟ [أنظر: ۶۰۳۸، ۶۹۱۱] [۳۷]

کہتے ہیں کہ یتیم سے حضر وسفر میں خدمت لینا جائز ہے یا نہیں؟ **"إذا کان صلاحا له"** جبکہ اس عمل میں اس کے لئے بہتری ہو۔

یعنی اپنے زیرِ تربیت یتیم، بظاہر اس سے خدمت لینا **"عقود ضارّہ محضه"** میں سے ہے، لیکن اگر اس میں اس یتیم کی اصلاح ہو کہ کسی بزرگ کے پاس رہے گا، اس کی خدمت کرے گا، اس کے اخلاق سیکھے گا، تربیت حاصل کرے گا تو کوئی مضائقہ نہیں جیسا کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کو ان کی والدہ نے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں چھوڑ دیا تھا۔ آگے ان کا ہی واقعہ بیان کر رہے ہیں۔

---

[۳۷] وفی صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کان رسول الله احسن الناس خلقاً، رقم: ۴۲۶۹، وسنن الترمذی، کتاب البر والصلة عن رسول الله، باب ماجاء فی الخلق النبی، رقم: ۱۹۳۸، وسنن أبی داؤد، کتاب الأدب، باب فی الحلم واخلاق، رقم: ۴۱۴۳، ومسند احمد، باقی مسند المکثرین، باب مسند أنس بن مالک، رقم: ۱۱۵۳۶، ۱۱۵۵۰.

"ونظر الأم أو زوجها لليتيم"

اور ماں اور اس کے شوہر یعنی سوتیلے باپ کو شفقت کی نگاہ سے یتیم کو دیکھنا چاہئے یعنی ان کو یہ فیصلہ کرنا چاہئے کہ آیا اس پر شفقت کا تقاضا کیا ہے؟ ہم اس کو فلاں کے ساتھ بطور خادم سفر میں بھیج دیں یا نہیں؟

اگر وہ فیصلہ کریں کہ اس کے اوپر شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو فلاں کے ساتھ بھیج دیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

چنانچہ حضرت ام سلیم رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر دونوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کو حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں بطور خادم بھیج دیا تھا اور ان کا یہ عمل نظر وشفقت کے مطابق تھا۔

معلوم ہوا کہ ماں یا اس کے شوہر کی طرف سے شفقت کے مطابق جو عمل کیا جائے وہ شرعاً مقبول ہے۔

(۲۶) باب إذا وقف أرضا ولم يبين الحدود فهو جائز، وكذلك الصدقة

کہتے ہیں کہ زمین وقف کی لیکن اس کی حدود بیان نہیں کیں تو بھی جائز ہے۔

اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں:

ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ بالکلیہ سرے سے حدود بیان ہی نہیں کیں، نہ معروف تھیں اور نہ بیان کیں۔ کہتے ہیں کہ پھر بھی وقف جائز ہو گیا۔ تو یہ بات غلط ہے اور جمہور فقہاء کے خلاف ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک زمین معروف ہے، سب لوگ جانتے ہیں تو اس کی حدود متعین کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔

اب اگر کوئی کہے میں اپنی فلاں زمین دیتا ہوں، چاہے اس نے حدود بیان نہ کی ہوں کہ کتنے گز ہے؟ دائیں کیا ہے اور بائیں کیا ہے؟ حدود اربعہ بیان نہ کیئے ہوں، تب بھی وقف درست ہو جائے گا، مثلاً کوئی شخص یہ کہے کہ میرا مکان جو فلاں جگہ پر واقع ہے، میں وہ وقف کرتا ہوں۔ اب وہ مکان معروف ہے، اس کی حدود متعین ہیں، اس کی چار دیواری کھینچی ہوئی ہے تو اب اس کو الگ سے متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ویسے ہی جائز ہو جائے گا۔

آگے جو حدیث آرہی ہے اس سے یہی معلوم ہوتا ہے، امام بخاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے بیرحاء کا صدقہ کرتے وقت یہ نہیں بتایا کہ اس کی حدود کتنی ہے؟ اس کی پیمائش کیا ہے؟ دائیں کیا ہے اور بائیں کیا ہے؟ اس کے باوجود صدقہ درست ہو گیا۔

لیکن اس کا جواب یہ ہے کہ بیرحاء اور اس کا حدیقہ معروف ومشہور تھا۔ اس کی حدود معلوم تھیں۔ اس لئے اس کو عقد ہبہ میں یا صدقہ کے اندر صراحۃً بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔

(۲۷) باب إذا وقف جماعة أرضا مشاعاً فهو جائز

۲۷۷۱ ۔ حدثنا مسدد: حدثنا عبد الوارث، عن أبي التياح، عن أنس ﷺ قال: أمر النبي ﷺ ببناء المسجد، فقال: ((يا بني النجار ثامنوني بحائطكم هذا))، قالوا: لا والله لا نطلب ثمنه إلا إلى الله .[راجع: ۲۳۴]

مشاع کے وقف کے بارے میں دوبارہ یہ باب قائم کیا ہے لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی جگہ وقف کرنے والا ایک تھا اور مشاع طریقہ سے کررہا تھا اور اس باب میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ مل کر کسی ارض مشاع کو وقف کریں۔ اس میں مسجد نبوی ﷺ کی بناء کا واقعہ ذکر کیا کہ آپ ﷺ نے بنی نجار سے کہا تھا کہ یہ باغ مجھے قیمتاً دے دو۔ انہوں نے کہا تھا **"لا واللہ"** ہم تو اس کے پیسے اللہ سے مانگتے ہیں، ہمیں پیسے نہیں چاہئیں۔ اس کا معنی یہ ہوا کہ انہوں نے یہ زمین وقف کردی جبکہ یہ ان کے درمیان مشاع تھی۔

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے مشاع کے وقف کی صحت پر استدلال کیا ہے۔

اگرچہ بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں باوجود یہ کہ انہوں نے پیشکش کی تھی اور ان کا ارادہ ہوگیا تھا کہ یہ ہم بغیر پیسوں کے دے دیں، لیکن صدیق اکبر ﷺ نے پھر بھی قیمت ادا کی۔ معلوم ہوا کہ یہ بیع تھی ہبہ یا صدقہ نہیں تھا، لیکن انہوں نے وقف کی پیشکش کی تھی اور آنحضرت ﷺ نے اس پر اعراض نہیں فرمایا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر تمام شرکاء مل کر کسی ایک کو ہبہ کردیں تو یہ جائز ہے۔

(۳۱) باب وقف الدواب والكراع والعروض والصامت

جانور، گھوڑے اسباب، چاندی، سونا وقف کرنے کا بیان

اس باب سے اشیاء منقولہ وغیر منقولہ کے وقف کی صحت ثابت کرنا مقصود ہے۔

عام طور پر جو چیزیں وقف کی جاتی ہیں ان میں زمین و جائیداد ہوتی ہے گھر یا باغ اور کنواں وغیرہ ہوتا ہے جو جائیداد غیر منقولہ ہے۔

آیا اشیاء منقولہ کا وقف درست ہے کہ نہیں؟

اس بارے میں فقہاء کرامؒ کا اختلاف ہے۔

اشیاء منقولہ کا وقف اور اختلاف فقہاء

بہت سے فقہاء کرامؒ اشیاء منقولہ کے وقف کو جائز نہیں سمجھتے۔

حنفیہ کے اصل مذہب میں اشیاء منقولہ کا وقف جائز نہیں تھا، لیکن امام محمدؒ نے استحساناً ان اشیاء میں جائز قرار دیا ہے جن میں متعارف ہو جائے جیسے مسجد میں قرآن مجید، مسجد کی صفیں، مسجد کا چراغ وغیرہ۔[۳۸]

---

۳۸ واعلم أن وقف المنقول لا يصح على أصل المذهب ، وأجازه محمد فيما تعارفه الناس ، بقي حديث تصدق عمر بفرسه ، فهو التصدق دون الوقف. فيض الباري، ج: ۳ص: ۴۱۶.

"وقال الزهري فيمن جعل ألف دينار في سبيل الله' ودفعها إلى غلام له تاجر يتجر بها، وجعل ربحه صدقة للمساكين والأقربين، هل للرجل أن يأكل من ربح تلك الألف شيئا؟ وإن لم يكن جعل ربحها صدقة في المساكين، قال: ليس له أن يأكل منها".

امام زہریؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص نے ایک ہزار دینار اللہ کی راہ میں دیئے اور اپنے غلام کو جو تاجر تھا سپرد کردیئے کہ بھائی اس میں تجارت کرو اور کہا کہ اس میں جو نفع آئے گا وہ مساکین اور اقربین کو صدقہ کردیا جائے تو کیا اس شخص کو جس کے سپرد کئے گئے ہیں یہ حق حاصل ہے کہ اس ایک ہزار کے نفع میں سے کچھ کھائے اگرچہ اس نے مساکین کے لئے صدقہ نہ رکھا ہو؟

امام زہری رحمہ اللہ نے کہا کہ اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے یعنی یہاں صرف منقول کے وقف کا مسئلہ نہیں آیا بلکہ نقود کے وقف کا بھی آیا ہے کیونکہ امام بخاری رحمہ اللہ نے صامت کا لفظ استعمال کیا ہے اور صامت سے سونا، چاندی، چاندی کے نقود، دراہم اور دینار مراد ہیں۔ تو دراہم اور دینار کا وقف ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس میں مزید کلام ہوا ہے۔

دراہم اور دنانیر کا وقف

بعض لوگ منقول کا وقف ہی نہیں مانتے، وہ دراہم اور دنانیر کو کیسے مانتے۔ بالآخر مفتی بہ قول یہ ہے کہ دراہم اور دنانیر کا وقف بھی جائز ہے۔

لیکن اس وقف کے جائز ہونے کو بھی سمجھ لینا چاہئے لوگ اکثر و بیشتر اس کو غلط سمجھتے ہیں۔

دراہم اور دنانیر کے وقف ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جتنے دراہم اور دنانیر وقف کئے گئے ہیں، وہ تو اپنی جگہ ہمیشہ کے لئے برقرار رہیں، ان کو کوئی استعمال نہ کرے لیکن ان کو تجارت میں لگا دیا جائے اور جو نفع آئے وہ موقوف علیہم میں تقسیم ہو کیونکہ اگر وقف دراہم ور دنانیر کو آدمی ایک دفعہ بیٹھ کر کھا گیا تو وقف کا مقصد ہی فوت ہوگیا۔ وقف کا مقصد یہ ہے کہ ایک چیز باقی رہے اور اس کی منفعت موقوف علیہم کو جائے تو اس کی صورت دراہم اور دنانیر میں یہ ہے کہ اس کو کسی نفع بخش کام میں لگا دیا جائے جس سے نفع آتا رہے اور موقوف علیہم پر تقسیم ہوتا رہے اور جو اصل رقم ہے وہ ہمیشہ محفوظ رہے۔ یہ وقف الدراہم والدنانیر کی صورت ہے۔

کیا چندہ بھی وقف میں داخل ہے؟

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مدرسہ اور مسجد میں جو چندہ آتا ہے وہ بھی وقف ہوتا ہے حالانکہ چندہ وقف نہیں ہوتا بلکہ چندہ مسجد و مدرسہ کی ملکیت ہوتا ہے۔

وقف اس وقت ہوگا جب اس کام کے لئے رقم لے کر وقف کر دی گئی اور تجارت میں لگا دی گئی اور اس کا نفع اس کے موقوف علیہم یا مسجد پر خرچ کیا جائے۔

تیسری بات یہ سمجھ لیں کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے امام زہریؒ کا جو قول نقل کیا ہے وہ اسی وقف الدراہم والدنانیر کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ وقف الدراہم والدنانیر میں جب نفع مساکین کے لئے رکھ دیا تو کیا اس نفع سے خود بھی کھانے کی اجازت ہے یا نہیں؟ یعنی دراہم اور دنانیر کو وقف کر دیا اور کہا کہ اس کی تجارت کرو، اب اس سے جو نفع آیا کہتے ہیں کہ کیا واقف خود بھی اس میں سے کھا سکتا ہے یا نہیں؟

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اگر اس نے وقف میں یہ کہا تھا کہ جو نفع آئے گا وہ مساکین میں تقسیم ہوگا اور میں بھی تھوڑا بہت لے لوں گا تو یہ جائز ہے۔ لیکن اگر اس نے مساکین کو دیا ہی نہیں تھا، غلام کو دیا کہ بھائی تجارت کرو، میں نے یہ وقف کر دیا، یہ نہیں کہا کہ بعد میں جو نفع آئے وہ مساکین کو صدقہ کروں گا، بس یہ کہا کہ تجارت کرو جو نفع آئے گا کھاؤں گا۔ اب جو نفع آرہا ہے وہ کھا رہے ہیں تو یہ جائز نہیں، اس واسطے کہ وقف کی صحت کے لئے یہ ضروری ہے کہ بالآخر اس کا مال کسی جہت قربت کی طرف ہو۔ صرف اپنے کھانے کے لئے کوئی وقف نہیں کر سکتا۔

اس واسطے یہ کہنا ضروری ہے کہ یہ مساکین کے لئے ہے۔ پہلے مساکین کو دینا ضروری ہے اس کے بعد تھوڑا بہت اپنے خرچہ کے لئے لینا چاہیں تو لے لیں۔

چیز وقف کب بنتی ہے؟

مسجد اور مدرسہ میں جو اشیاء آتی ہیں، چندے سے خریدی جاتی ہیں یا کوئی شخص مسجد و مدرسہ میں دے جاتا ہے، ان کو سب لوگ بلا تمیز وقف سمجھ بیٹھتے ہیں حالانکہ یہ سب وقف نہیں ہوتیں جب تک کہ دینے والا یہ نہ کہے کہ یہ وقف ہے۔

فرض کریں مسجد یا مدرسہ کے چندہ سے قرآن شریف رکھنے کے لئے ایک الماری خرید لی، اب وہ الماری وقف نہیں ہے، وقف اس وقت ہوگی جب کہہ دیں گے کہ یہ وقف ہے۔ اگر وقف نہیں کہا اور پیسوں سے خرید لی تو یہ وقف نہیں ہے۔ یا کوئی دوسرا آدمی باہر سے لاکر رکھ دے تو جب تک اس نے وقف کی صراحت نہ کی ہو تو یہ چیز وقف نہیں ہوگی، بلکہ مسجد کی ملک ہوگی۔

اس مسئلہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ بڑی تنگی کا شکار ہوتے ہیں، اس لئے کہ وقف کی بیع کبھی نہیں ہو سکتی لیکن وہ اشیاء جو بطور چندہ مسجد کو دی گئی ہوں، ان کو جب چاہیں مسجد کی مصلحت کے مطابق فروخت بھی کر سکتے ہیں اور اس کے بدلے جو چاہیں خرید سکتے ہیں۔

دار العلوم کی زمین

دار العلوم کی زمین ستاون (57) ایکڑ ہے تو یہ دار العلوم کی ملکیت ہے اور جو دس (10) ایکڑ نیا میدان ہے وہ ملکیت تو نہیں ہے لیکن ننانوے سال کے لئے خاص طلبا کے کھیلنے کے لئے ملا ہوا ہے، اس لئے ملکیت نہیں ہے باقی (57) ایکڑ با قاعدہ ملکیت ہے۔

اس ستاون (57) ایکڑ میں سے کل ستائیس (27) ایکڑ زمین وقف ہے جو اصل واقف نے وقف کی تھی، باقی زمین خریدی ہوئی ہے اور جو خریدی ہوئی ہے وہ وقف ہونا ضروری نہیں جب تک کہ اس کو وقف نہ کر دیا جائے۔

(۳۲) باب نفقة القيم للوقف

۲۷۷۶ ۔ حدثنا عبدالله بن يوسف: أخبرنا مالك، عن أبي الزناد، عن الأعرج، عن أبي هريرة ﷺ: أن رسول الله ﷺ قال: ((لا تقتسم ورثتي دينارا ولا درهما، ماتركت بعد نفقة نسائي و مؤنة عاملي فهو صدقة)). [أنظر: ۳۰۹۶، ۶۷۲۹] [۳۹]

یعنی جو کچھ میرا ترکہ ہے ان میں سے پہلے تو میری ازواج کے نفقات ادا کئے جائیں اور جو زمینوں پر کام کرنے والے ہیں، ان کی تنخواہیں دی جائیں، باقی جو بچے وہ صدقہ ہے۔

(۳۳) باب إذا وقف أرضا أو بئرا، أو اشترط لنفسه مثل دلاء المسلمين

"ووقف أنس دارا، فكان إذا قدم نزلها. و تصدق الزبير بدوره، وقال للمردودة من بناته أن تسكن غير مضرة ولا مضر بها، فإن استغنت بزوج فليس لها حق. وجعل ابن عمر نصيبه من دار عمر سكنى لذوى الحاجات من آل عبد الله".

---

[۳۹] وفي صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب قول النبي لانورث ماتركنا فهو صدقة، رقم: ۳۳۰۶، وسنن أبي داؤد، كتاب الخراج والإمارة والفيء، باب في صفايا رسول الله من الاموال، رقم: ۲۵۸۲، ومسند أحمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۰۰۲، ۸۵۳۷، ۹۵۹۳، وموطأ مالك، كتاب الجامع، باب ماجاء في تركة النبي ﷺ، رقم: ۱۵۷۸.

”شرط الواقف كنص الشارع“

اس باب میں یہ مسئلہ بیان کیا کہ اگر آدمی کسی چیز کو وقف کرے تو اپنے لئے بھی شرط لگا سکتا ہے کہ میں بھی عام لوگوں کے ساتھ مل کر اس سے انتفاع کروں گا جیسے حضرت عثمان ﷺ نے شرط لگائی تھی۔ اس کی کئی مثالیں بیان کی ہیں۔

”**ووقف أنس دارا**“ حضرت انس ﷺ نے گھر وقف کیا تھا اور جب وہاں آتے تھے تو اسی میں ٹھہرا کرتے تھے۔

حضرت زبیر ﷺ نے اپنا گھر وقف کیا ”**وقال للمردودة من بناته**“ ان کی لڑکیوں میں سے ایک لڑکی لوٹ کر آ گئی تھی یعنی شوہر سے طلاق ہو کر آ گئی تھی، اس کے بارے میں کہا کہ ”**أن تسكن**“ وہ اس میں رہ سکتی ہے کہ نہ یہ دوسرے کو تکلیف پہنچائے اور نہ دوسرا اس کو تکلیف پہنچائے لیکن جب یہ شوہر کے ذریعے مستغنی ہو جائے یعنی نکاح ہو جائے تو پھر اس کو اس گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے، تو یہ شرط لگائی تھی۔

اسی واسطے فقہاءؒ نے فرمایا ہے کہ ”**شرط الواقف كنص الشارع**“ واقف، وقف میں جو شرط لگادے وہ شارع کی نص کی طرح ہوتی ہے۔ ”**وجعل ابن عمر**“ اور حضرت عمر ﷺ کے گھر میں جو حصہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا تھا انہوں نے وہ جگہ ذوالحاجۃ کے رہنے کی جگہ بنادی تھی۔

۲۷۷۸ ـ وقال عبدان: أخبرني أبي، عن شعبة، عن أبي اسحاق، عن أبي عبد الرحمٰن: أن عثمان ﷺ حيث حوصر أشرف عليهم وقال: أنشدكم الله ولا أنشد إلا أصحاب النبي ﷺ، ألستم تعلمون أن رسول الله ﷺ قال: ((من حفر رومة فله الجنة)) فحفرتها؟ ألستم تعلمون أنه قال: ((من جهز جيش العسرة فله الجنة)) فجهزته؟ قال: فصدقوه بما قال: وقال عمر في وقفه: لا جناح على من وليه أن يأكل. وقد يليه الواقف و غيره فهو واسع لكل.

یہاں بیر رومہ کھودنے کا ذکر ہے یا تو کسی راوی سے وہم ہو گیا ہے کہ یہ اصل میں کھودا نہیں تھا بلکہ خریدا تھا یا ”**حفر**“ اشتریٰ کے معنی میں ہے۔

یہاں اگرچہ اس میں یہ لفظ نہیں ہے لیکن ماقبل میں جہاں یہ واقعہ گزرا ہے وہاں مذکور ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ کون ہے جو اس رومہ کنوئیں کو خریدے؟ ”**ويكون دلوه كدلاء المسلمين**“ اور اس کا ڈول بھی دوسرے مسلمانوں کے ڈول کی طرح ہوگا یعنی اوروں کی طرح اس کو بھی انتفاع کا حق حاصل ہوگا اس سے امام بخاری رحمہ اللہ نے استدلال کیا۔

(۳۵) باب قول الله عزوجل:

﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ آخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ﴾

إلى قوله: ﴿وَاللهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ [۴۰] الأولیان: واحدهما أولى، ومنه أولى به. ﴿عثر﴾ ظهر، ﴿أَعْثَرْنَا﴾: أظهرنا۔

۲۷۸۰ ــ وقال لی علی بن عبدالله: حدثنا یحیی بن آدم: حدثنا بن أبی زائدة، عن محمد بن أبی القاسم، عن عبد الملک بن سعید بن جبیر، عن أبیه، عن ابن عباس رضی الله عنهما' قال: خرج رجل من بنی سهم مع تمیم الداری وعدی بن بداء، فمات السهمی بأرض لیس بها مسلم فلما قدما بترکته فقدوا جاما من فضة مُخَوَّصا من ذهب. فأحلفهما رسول الله ﷺ، ثم وجد الجام بمکة، فقالوا: ابتعناه من تمیم وعدی، فقام رجلان من اولیاء السهمی فحلفا لشهادتنا أحق من شهادتهما، وأن الجام لصاحبهم. قال: وفیهم نزلت هذه الآیة: ﴿يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ﴾ [۴۱]، [۴۲]

یہ آخر میں بڑا پیچیدہ مسئلہ آ گیا ہے۔ یہ سورہ مائدہ کی آیت قرآنیہ ہے، شاید تفسیر اور ترکیب کے اعتبار سے، اسلوب بیان وشان نزول کے اعتبار سے بھی اور مفسرین کی آراء کے اختلاف کے اعتبار سے بھی پورے قرآن کریم میں مشکل ترین آیت ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے جو اس کا شان نزول بیان کیا ہے امید ہے کہ اس کا سمجھ لینا کافی ہوگا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا بیان کردہ شان نزول

اس آیت کریمہ کا شان نزول یہ ہے کہ قبیلہ بنوسہم کے ایک مسلمان شخص جس کو حدیث میں سہمی سے تعبیر کیا گیا، دو نصرانیوں کے ساتھ سفر میں گئے، ان میں سے ایک تمیم داری تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے اور دوسرے عدی بن بدّاء تھے۔ یہ تینوں آدمی سفر میں نکلے، ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کوئی مسلمان نہیں تھا، سارا شہر غیر مسلموں

---

[۴۰] [المائدة: ۱۰۶۔۱۰۸] [۴۱] [المائدة: ۱۰۶]

[۴۲] وفی سنن الترمذی، کتاب تفسیر القرآن عن رسول الله، باب ومن سورة المائدة، رقم: ۲۹۸۶، وسنن أبی داؤد، کتاب الأقضیة، باب شهادة أهل الذمة وفی الوصیة فی السفر، رقم: ۳۱۲۹.

سے بھرا ہوا تھا۔ وہاں سہمی بے چارہ بیمار ہو گیا اور وہیں پر اس کا انتقال ہو گیا۔

یہ مسلمان تھے جب ان کو اندازہ ہوا کہ میں مرنے والا ہوں تو انہوں نے اپنے دو ساتھیوں سے جو نصرانی تھے کہا کہ میں مر رہا ہوں، میرا تمام سامان اور ترکہ لے جا کر گھر والوں کو دے دینا تا کہ ورثہ کو پہنچ جائے اور ساتھ ہی اس نے یہ ہوشیاری کی کہ اسی سامان کے اندر اپنے پورے سامان کی ایک (لسٹ) فہرست کہیں چھپا کر رکھ دی۔

اس وقت یہ دونوں نصرانی تھے۔ دونوں کی طبیعت میں چور آیا انہوں نے کہا سارا سامان تو لے جائیں گے لیکن سامان کے اندر ایک قیمتی پیالہ تھا وہ ان کی آنکھ کو بھا گیا۔ کہتے ہیں کہ سہمی کا تجارت کا حصہ تھا، وہ اس کو بیچنے آئے تھے تا کہ ان کو کچھ پیسے ملیں۔

ان دونوں نے کہا چلو یہ پیالہ پار کرلو، کسی کو پتا نہیں چلے گا چنانچہ وہ پیالہ بیچ کر کھا پی گئے اور باقی سامان جا کر دے دیا کہ ہمارا ساتھی بے چارہ مر گیا اور اس نے یہ ترکہ چھوڑا، اپنی امانت آپ لے لیں۔

گھر والوں نے جب سامان کھولا تو ان کو اس سامان کی لسٹ بھی ملی، اس میں پیالہ کا بھی ذکر تھا جبکہ پیالہ موجود نہیں تھا۔ انہوں نے کہا کہ بھائی اس میں ایک پیالہ بھی تھا؟ ان دونوں نے کہا ہم پیالہ وغیرہ نہیں جانتے، ہمیں جو کچھ دیا گیا وہ ہم نے دے دیا۔

مسئلہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں گیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ قصہ ہو گیا ہے، پیالہ تھا فہرست میں لکھا ہوا ہے اور یہ کہتے ہیں کہ ہمیں پتا نہیں ہے۔

اس کا حاصل یہ ہوا کہ ورثا ان پر پیالہ کا دعویٰ کر رہے تھے تو یہ مدعی تھے اور وہ مدعی علیہ منکر تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے ان کو بلا کر قسمیں دیں کہ بینہ تو تھی نہیں۔ انہوں نے قسم کھالی کہ ہم نے پیالہ نہیں لیا، یہ بے چارے چپ بیٹھ گئے، اس لئے کہ ثابت کرنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ جب یہ مکہ مکرمہ پہنچے تو وہی پیالہ ایک آدمی کے پاس رکھا نظر آیا، پوچھا کہ بھائی یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کہا ہمیں تو تمیم داری اور عدی نے بیچا تھا ہمیں وہاں سے ملا۔

تو حقیقت حال معلوم ہوئی کہ پیالہ میں انہوں نے اس طرح گڑ بڑ کی ہے اور بیچا ہے۔

انہوں نے آ کر حضور اقدس ﷺ سے ذکر کیا۔ آپ ﷺ نے تمیم داری اور عدی کو پھر بلایا اور پوچھا کہ کیا قصہ ہے؟

انہوں نے کہا کہ اصل میں بات یہ ہے کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ ہم نے آخر وقت میں مرحوم سے یہ پیالہ خرید لیا تھا اور اس کے پیسے بھی ادا کر دیئے تھے۔ جب آپ نے پہلے پوچھا تھا ہم نے اس وقت خریداری کا ذکر اس لئے نہیں کیا تھا کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی بینہ اور کوئی ثبوت نہیں تھا۔ اگر ہم یہ کہتے کہ ہم

نے خریدا ہے تو آپ کہتے کہ ثبوت لاؤ اور ہمارے پاس ثبوت نہ ہوتا، لہٰذا ہم نے سوچا کہ بہتر ہے کہ یہ کہہ دیا جائے ہمیں معلوم نہیں، تاکہ جان چھوٹے۔ اس واسطے ہم نے اس وقت یہ نہیں کہا تھا کہ ہم نے خریدا ہے۔

اب ورثہ بڑے ناراض ہوئے اور حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ یہ تو فضول باتیں کر رہے ہیں، ہم گواہی دیتے ہیں، قسم کھاتے ہیں کہ یہ پیالہ سہمی کا ہے، ان کا اس میں کوئی حق نہیں۔ یہ قسم کھائی پھر ان کے حق میں فیصلہ ہوا۔

اس واقعہ میں جو چیز فقہاء کے نزدیک موضع اشکال بنی ہے وہ ہے **"لشهادتنا أحق من شهادتهما"**.

اس لئے کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم شہادت پیش کریں گے حالانکہ اب وہ مدعیٰ علیہ ہیں۔ شروع میں تو تمیم داری اور عدی مدعیٰ علیہ تھے کہ بھائی پیالہ تمہارے پاس ہے لاؤ لیکن جب پتا چلا کہ مل گیا تو انہوں نے خود دعویٰ کیا کہ ہم نے خریدا تھا یعنی تمیم داری اور عدی نے تو یہ مدعی بن گئے اور سہمی کے ورثہ مدعیٰ علیہم ہو گئے۔

تو ہونا یہ چاہئے تھا کہ یا تو وہ شراء کا بینہ پیش کریں اگر وہ شراء کا بینہ پیش نہ کریں تو ورثہ کو قسم دی جائے۔ لیکن وہ کہہ رہے ہیں کہ **"لشهادتنا أحق من شهادتهما"** کہ ہم گواہی دیں گے تو یہ موضع اشکال بنا کر یہ بات کیسے صحیح ہوگئی۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کا ترجمہ اور جواب

اس کا جواب یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب رحمہ اللہ نے ترجمہ کیا ہے کہ **"لشهادتنا"** ہم بیان حلفی دیں گے تو بیان حلفی ترجمہ نے سارا قصہ ہی ختم کر دیا۔

انہوں نے کہا کہ لفظ شہادتنا میں اصطلاحی شہادت نہیں ہے بلکہ حلفی بیان مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ تو دعویٰ کر رہے ہیں کہ ہم نے خریدا تھا اور ظاہر ہے کہ بینہ پیش نہیں کر سکے، لہٰذا آپ ہم سے قسم لیجئے اور قصہ ختم کیجئے۔ **"لشهادتنا أحق من شهادتهما"** کا یہ معنی ہے تو شہادت اصطلاحی مراد نہیں ہے بلکہ شہادت بالمعنی الیمین مراد ہے۔

اور پچھلے زمانوں میں ایسا بکثرت ہوا ہے کہ شہادت پر یمین اور یمین پر شہادت کا اطلاق علیٰ سبیل التبادل والتوسع ہوتا رہا ہے تو اس کے بعد کوئی اشکال باقی نہیں رہتا۔

باقی اس سورہ میں جو آیت نازل ہوئی ہے اس کی ترکیب، ترجمہ اور ربط کی جو مباحث ہیں یہ اس کا موقع نہیں ہے، وہ تفسیر کا مسئلہ ہے۔

(۳۶) باب قضاء الوصي ديون الميت بغير محضر من الورثة

۲۷۸۱ — حدثنا محمد بن سابق، أو الفضل بن يعقوب عنه: حدثنا شيبان أبو معاوية، عن فراس قال: قال الشعبي: حدثني جابر بن عبدالله الأنصاري رضي الله

عنهما: أن أباه استشهد يوم أحد و ترک ست بنات و ترک عليه دينا فلما حضره جذاد النخل أتيت رسول الله ﷺ فقلت: يارسول الله، قد علمت أن والدی استشهد يوم أحد و ترک عليه دينا كثيرا، و إنی أحب أن يراک الغرماء. قال: ((اذهب فبيدر كل تمر على ناحية))، ففعلت ثم دعوته، فلما نظروا إليه أغروا بی تلک الساعة، فلما رأى مايصنعون طاف حول أعظمها بيدرا ثلاث مرات ثم جلس عليه ثم قال: ((ادع أصحابک)) فما زال يكيل لهم حتى أدى الله أمانة والدی وأنا والله راض أن يؤدی الله أمانة والدی، ولا أرجع إلى أخواتی تمرة. فسلم والله البيادر كلها حتى أنی أنظر إلى البيدر الذی عليه رسول الله ﷺ كأنه لم ينقص تمرة واحدة. قال أبو عبدالله: أغروا بی: يعنی هيّجوا بی. ﴿فَأَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ﴾ [راجع: ۲۱۲۷]

یہ حضرت جابر ﷺ کا واقعہ ذکر کیا۔ دوسرے ورثہ موجود نہیں۔ آپ ﷺ نے دوسرے ورثہ کی غیر موجودگی میں دین ادا کر دیا۔ معلوم ہوا کہ اداءِ دین کے وقت ورثہ کی موجودگی ضروری اور شرط نہیں ہے۔

كتاب الجهاد والسير

٢٧٨٢ - ٣٠٩٠

۵۶۔ کتاب الجهاد و السير

جہاد کی تعریف

لفظی معنی: لفظِ جہاد باب مفاعلہ سے ہے، اس کے معنی محنت کرنے اور مشقت اُٹھانے کے ہیں۔

اصطلاحِ شریعت میں: اللہ تعالیٰ کے راستہ میں اُس کی رضا کے لئے ہر محنت کو جہاد کہا جاتا ہے، خواہ وہ محنت زبان سے ہو، قلم سے ہو یا تلوار سے ہو، لہٰذا جہاد صرف جہاد بالسیف یا قتال فی سبیل اللہ کا نام نہیں بلکہ یہ ایک عام لفظ ہے جو قتال فی سبیل اللہ کو بھی شامل ہے اور اس کے دوسرے افراد بھی ہیں۔

ارشاد باری ہے:

﴿وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ﴾[1]

ترجمہ: ”اور لڑو اپنے مال سے اور جان سے اللہ کی راہ میں“۔

”وقال النبی ﷺ: جاهدوا المشركين باموالكم وأنفسكم والسنتكم“.[2]

جس طرح جہاد بالنفس ہے، اسی طرح جہاد بالمال بھی ہوتا ہے۔ تو جو کوشش بھی اللہ جل جلالہ کے راستہ میں کی جائے، اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے کی جائے، وہ جہاد ہے اور قتال اس کا ایک فرد ہے۔

لیکن جب مطلق جہاد کا لفظ استعمال ہو تو اس سے قتال فی سبیل اللہ مراد ہوتا ہے، جس کو **”ذروة سنامه“** یعنی دین کی چوٹی کہا گیا ہے۔[3]

جہاد کی ایک اور قسم

جہاد کا ایک معنی اور بھی ہے اور وہ ہے ”مجاہدۂ نفس“ کہ آدمی اپنے نفس کی خواہشات سے لڑائی کرے، نفس کی

---

۱ [التوبة: ۴۱]

۲ أبوداؤد، ص: ۱۴۰۸، رقم: ۲۵۴۰.

۳ اما رأس الأمر فالإسلام وأما عموده فالصلاةُ وأما ذروة سنامه فالجهاد. المستدرک ج: ۲ ص: ۸۶، رقم: ۲۴۰۹، ۳۴۰۴، وتكملة فتح الملهم، ج: ۳ ص: ۴۰۳.

خواہشات کو گناہ کی طرف لے جانے سے روکے یا گناہ کی طرف لے جانے والی خواہشات کو کچلے، اس کو بھی جہاد سے تعبیر کیا گیا ہے، حدیث میں کہا گیا ہے **"المجاهد من جاهد نفسه"**.

حدیث "رجعنا من الجهاد الأصغر"

حدیث شریف میں ایک روایت ہے، جس پر اگرچہ کلام ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک موقع پر جہاد سے تشریف لائے تو فرمایا **"رجعنا من الجهاد الأصغر إلى الجهاد الأكبر"** اس میں جہاد اکبر سے مجاہدۂ نفس مراد ہے، لیکن یہ جہاد کے مجازی معنی ہیں، حقیقی معنی نہیں ہیں، حقیقی معنی وہی ہیں جو اوپر گزرے ہیں۔[۴]

جہاد کے بارے میں پروپیگنڈہ کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے

معاندینِ اسلام کی طرف سے یہ پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے کہ جہاد کا مقصد تبلیغ اور دعوت اسلام ہے اور اسلام تلوار کے زور پر پھیلا ہے، اور جہاد اس لئے ہے کہ لوگوں کو بزور شمشیر مسلمان بنایا جائے، معاندین کا یہ خیال اور پروپیگنڈہ غلط ہے۔

جہاد کا مقصد

قرآن وحدیث میں جہاد کا مقصد دعوت وتبلیغ نہیں ہے، بلکہ جہاد کا مقصد کفر کی شوکت کو توڑ کر اللہ کا کلمہ بلند اور قائم کیا جائے۔

اس مقصود میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کسی کو اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا کیونکہ دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔

﴿ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ﴾

ترجمہ: "زبردستی نہیں دین کے معاملہ میں"۔

یعنی کسی شخص کی اپنے مذہب پر رہنے کی آزادی اس کی ذات تک محدود ہے، لیکن جہاں تک اللہ کی زمین کا تعلق ہے تو زمین اللہ کی ہے، اس لئے اس پر اللہ کا ہی قانون چلنا چاہئے، اس میں کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ وہ اپنے من مانے قوانین کے تحت اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنائے۔

---

۴ تکملہ فتح الملهم، ج:۳، ص:۴، جامع العلوم والحكم، ج:۱ ص: ۱۹۶، دار المعرفة، بيروت، وشرح سنن ابن ماجة، ج:۱، ص: ۲۸۲، رقم: ۳۹۳۴، قدیمی کتب خانہ کراچی، وتهذيب الكمال، ج: ۲، ص: ۱۴۴.

چنانچہ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب کسریٰ کے دربار میں پہنچے تو اس نے پوچھا کہ تم کیوں آئے ہو؟

انہوں نے جواب میں فرمایا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ **"لنخرج عباد اللّٰہ من عبدیّۃ الناس"** کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکالیں اور اللہ کی غلامی میں لائیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کافروں نے اپنے کفر کے بل پر جو احکام نافذ کئے ہوئے ہیں اور ان احکام کے نتیجے میں انسانوں کو غلام بنائے ہوئے ہیں، ان سے انسانیت کو نجات دلانا مقصود ہے۔[۵]

اعلاءِ کلمۃ اللہ کے دو فرض

اعلاءِ کلمۃ اللہ کے دو فرض ہیں: ایک فرض تو یہ ہے کہ کفار کی شوکت توڑی جائے اور دوسرا فرض یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا قانون نافذ ہو۔ نجی زندگی میں کوئی شخص اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہے تو کرے، لیکن اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا قانون نافذ ہونا چاہئے، یہ بنیادی ہدف ہے۔

پروپیگنڈہ کا جواب

جہاد کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کسی کو زبردستی مسلمان بنایا جائے اگر یہ مقصد ہوتا تو پھر جزیہ کا حکم کیوں ہوتا۔ جہاد کے موقع پر کافروں کے سامنے تین باتیں پیش کی جاتی تھیں، (۱) اسلام لاؤ۔ (۲) جزیہ ادا کرو۔ (۳) یا لڑو۔

اگر بزورِ شمشیر مسلمان بنانا مقصود ہوتا، تو پھر سیدھی بات یہ ہوتی کہ اسلام لاؤ یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جاؤ، جزیہ کا حکم نہ ہوتا۔

جزیہ کا حکم اس بات کی واضح دلیل ہے کہ زبردستی مسلمان بنانا مقصود نہیں، اصل مقصد یہ ہے کہ کفر کی شوکت ٹوٹے اور اسلام کی شوکت قائم ہو، اس لئے اگر کوئی مسلمان ہو جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ اگر جہنم میں جانا چاہے تو اُسے نہیں روکتے، لیکن ساتھ ساتھ جزیہ دینے کا حکم دیتے ہیں تاکہ اسلام کی شوکت قائم ہو۔

کافروں کے ساتھ حسن سلوک کا بے نظیر واقعہ

تاریخ اسلام اس بات کی گواہ ہے کہ آج تک کسی بھی فرد کو تلوار کے ذریعہ مسلمان نہیں کیا گیا، اگر وہ اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہتے ہیں تو ان کو نہ صرف چھوڑ دیا گیا بلکہ ان کی حفاظت اور ان کے ساتھ وہ حسنِ سلوک کیا کہ تاریخ میں جس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔

جب بیت المقدس پر جنگ کا مسئلہ آیا تو حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے وہاں کے سب غیر مسلموں کو بلایا اور

---

۵ تاریخ اسلام حصہ اول، ص: ۲۹۳ ، وتکملة فتح الملهم ، ج: ۳ ، ص: ۱۱ .

کہا کہ ہم آپ سے اس لئے جزیہ وصول کرتے ہیں تا کہ آپ کی جان و مال کی حفاظت کریں، اب چونکہ جنگ کا مسئلہ ہے کہ اس حالت میں ہم آپ کی حفاظت کرنے سے قاصر ہیں، لہٰذا آپ کا جزیہ واپس کیا جاتا ہے۔

دنیا کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش نہیں کرسکتی، غیر مسلموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی مثالوں سے ہماری تاریخ بھری پڑی ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا گیا کہ یہ محض اسلام کے خلاف پروپیگنڈہ ہے۔

غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے

اکبرالہ آبادی مرحوم جو بڑے شاعر گزرے ہیں، انہوں نے اس پروپیگنڈہ کا شعر شعر اور مذاق مذاق میں بہت بہترین جواب دیا ہے، کہتے ہیں ۔

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

یعنی بقول تمہارے اگر مسلمانوں نے اسلام تیغ سے پھیلایا ہے تو برائی تو نہیں پھیلائی۔ اسلام پھیلانے کا معنی ہے کہ حسنِ اخلاق پھیلایا، تہذیب پھیلائی، حسنِ معاشرت پھیلائی اور اچھائی پھیلائی۔

سوال یہ ہے کہ آپ نے توپ سے کیا پھیلایا؟ بددینی، عریانی، فحاشی، الحاد، بداخلاقی پھیلائی، توپ کے ذریعہ لوگوں کے دل و دماغ مسموم کیے۔ سارے عالم اسلام میں اکادکا ممالک کے سوا باقی تمام ممالک میں توپ اور تفنگ کے بل پر اپنا نظام زبردستی نافذ کیا۔

کیا مذہبی آزادی اسی کا نام ہے؟

آج بھی جہاں جہاں ان کی حکومتیں قائم ہیں، وہ کہنے کو تو سیکولر ہیں، ان کا دعویٰ تو یہ ہے کہ ہم مذہبی آزادی دیتے ہیں، لیکن اس مذہب کی آزادی کا یہ حال ہے کہ کسی کو اپنے نکاح، طلاق اور میراث کے فیصلے اپنے مذہب کے مطابق کرنے کی اجازت نہیں ہے، اذان زور سے دینے پر پابندی ہے، لیکن پھر بھی یہ دعویٰ ہے کہ ہم سیکولر ہیں، اور ہم مذہب کی آزادی دیتے ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

"انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا" یہ مشہور کتاب ہے، دنیا کی مانی ہوئی علمی کتاب سمجھی جاتی ہے، دنیا کی ہر قسم کی

معلومات کا مجموعہ ہے، اس میں ساری چیزوں کے مقالے لکھے ہوئے ہیں۔

ایک مقالہ "ایٹم بم" کے تعارف پر ہے، جس میں ایٹم بم کے بارے میں تفصیلات ہیں اور یہ لکھا ہے کہ یہ جاپان میں دو مرتبہ دو جگہ بدقسمت شہر "ناگاساکی" اور "ہیروشیما" پر استعمال کیا گیا، اور ایک اندازہ کے مطابق ان دو جگہوں پر ایٹم بم گرا کر ایک کروڑ انسانوں کی جان بچائی ہے، یہ اس میں لکھا ہوا ہے۔ یعنی ساری دنیا تو یہ کہتی ہے کہ ایٹم بم گرانے سے تباہی ہوئی، لیکن اس میں لکھا ہے کہ ایک کروڑ انسانوں کی جان بچائی۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اگر ایٹم بم نہ گرایا جاتا تو یہ جنگ اتنے سال جاری رہتی اور سالانہ اتنے انسان مرتے، لہٰذا ایٹم بم گرا کر لڑائی کا خاتمہ کر کے ایک کروڑ انسانوں کی جان بچائی گئی۔ تو خود اگر ایٹم بم بھی گرایا تو کہتے ہیں کہ امن کے لئے گرایا اور دوسرا بے چارہ اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی کھڑا ہو تو کہتے ہیں کہ دہشت گرد ہے، اور اگر دفاع کے لئے لاٹھی بھی اٹھالیں تو کہتے ہیں کیمیائی اسلحہ ہے۔ خیر یہ تو ان کا مزاج ہے کہ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔

اسلام کی ماڈرن لابی کا معذرت خواہانہ رویہ

ہمارے اپنے معاشرے میں ہر دور میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں کہ جہاں کہیں مغرب کی طرف سے اسلام کے کسی حکم پر اعتراض ہوا تو بجائے اس کے کہ اسلام کے حکم کی حقیقت سمجھ کر اس کو واضح کریں، ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ نہیں حضور! آپ کو غلط فہمی ہوگئی، ہمارا مقصد یہ نہیں تھا جو آپ سمجھتے ہیں اور اس کے نتیجے میں شریعت کے حکم میں تحریف اور ترمیم کا دروازہ کھول دیتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں یہ ایک طبقہ ہے، جس کو عام طور پر تجدّد پسند طبقہ یا اسلام کی ماڈرن لابی کہا جاتا ہے۔

یہ بیچارے اسلام کے ساتھ خود بڑا احسنِ سلوک کرتے ہیں کہ اسلام کے اوپر جو اعتراضات ہو رہے ہیں، ان کے جواب دینے کے لئے اسلام کی مرمت کرنے لگتے ہیں تاکہ وہ معترضین کی نگاہ میں خوش نما ہو جائیں اور اچھے لگنے لگیں۔

ایک بڑھیا کا قصہ

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے **"نفحة العرب"** میں ایک قصہ ہے کہ ایک بڑھیا تھی اس کے ہاتھ میں ایک مور آگیا، اس نے دیکھا کہ مور کے پنجے مڑے ہوئے ہیں، کہنے لگی کہ یہ بیچارہ کتنی تکلیف میں ہوگا، چلو اس کے پنجوں کو سیدھا کر دیتی ہوں، اس نے پنجے سیدھے کرنے شروع کئے، نتیجۃً اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیئے۔ یہ تجدّد پسند طبقہ بھی اسلام کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے کہ جہاں مغرب کو مڑا ہوا پنجہ نظر آتا ہے، یہ اس کی مرمت کی فکر کرنے لگتے ہیں۔

اقدامی جہاد کا انکار

جب اس قسم کے لوگوں سے کہا گیا کہ جہاد شدت پسندی اور دہشت گردی ہے۔ اس کے جواب میں انہوں نے کہا کہ جناب! آپ بالکل ناراض نہ ہوں ہمارا جہاد ہرگز جارحیت پر مشتمل نہیں ہوتا، ہمارا جہاد تو صرف دفاع کے لئے ہوتا ہے، اگر ہم پر کوئی حملہ آور ہو جائے تو ہم تب لڑتے ہیں، اسلام نے صرف دفاعی جہاد کی اجازت دی ہے، اقدامی جہاد یعنی کسی کے اوپر جا کر حملہ کرنا اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے، لہٰذا آپ بالکل ناراض نہ ہوں۔
لیکن یہ کتنا ہی ہاتھ جوڑیں، کتنا ہی انہیں کہیں کہ ناراض نہ ہوں اور کتنا ہی ان کے نظریات اختیار کر لیں، وہ ہرگز راضی ہونے والے نہیں:

﴿وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ﴾[۶]

ترجمہ: ”اور یہود و نصاریٰ تم سے اس وقت تک ہرگز راضی نہیں ہوں گے جب تک تم اُن کے مذہب کی پیروی نہیں کرو گے“۔

تجربہ شاہد ہے کہ آج ایک صدی گزر گئی ہے، اس طبقہ کو کوشش کرتے ہوئے اور یہ کہتے ہوئے کہ جہاد بری بات ہے، ہم اقدام نہیں کرتے، ہم تو صرف دفاع کرتے ہیں اور ساتھ ساتھ دوسرے احکامات کی تحریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سود بڑی اچھی چیز ہے، ہم بھی حرام نہیں کہتے وہ تو پہلے زمانے کا سود تھا، اس طرح قمار تو پہلے زمانے کا حرام تھا، اب جو قمار ہے وہ حرام نہیں ہے، بے فکر رہیں ہم بھی جائز سمجھتے ہیں، حرام نہیں سمجھتے۔
اسی طرح تعدد ازواج کے مسئلہ میں کہا کہ ہم بھی ایک بیوی کے قائل ہیں، پہلے زمانہ میں چونکہ جنگوں میں مردوں کی کمی ہوگئی تھی، اسی لئے تعدد ازواج کی اجازت دے دی گئی تھی، اب یہ اجازت نہیں ہے، آپ ناراض نہ ہوں وغیرہ وغیرہ، تو ایک صدی تک اس نے یہ مؤقف اختیار کر کے دیکھ لیا، لیکن جن کو راضی کرنے کے لئے ساری تدبیریں اختیار کیں، دین میں تحریف و ترمیم کا دروازہ کھولا، پھر بھی ان کو راضی کرنے میں ناکام رہے اور روز بروز ان سے مار پڑ رہی ہے۔

دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

جب انہوں نے جہاد کو دہشت گردی کہا، اس طبقہ نے جہاد اقدامی کا انکار کر کے کہا کہ ہم صرف دفاع کے لئے لڑتے ہیں، اس معذرت کے بجائے ہمت کر کے یہ جواب دینا چاہئے تھا کہ جو لوگ اپنی ملک گیری کی ہوس کی

---

۶ [البقرة: ۱۲۰]

خاطر دوسروں پر حملہ کرتے ہیں، ایٹم بم برساتے ہیں جس سے نسلیں بیمار اور برباد ہو رہی ہیں، وہ ان لوگوں کو کس منہ سے دہشت گرد کہتے ہیں، جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لئے، مسلمان ماؤں، بہنوں، بھائیوں اور مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے جان و مال کی قربانیاں پیش کرتے ہیں؟ ان کے لئے سیدھا سا جواب تو یہ تھا کہ:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت
دامن کو ذرا دیکھ ذرا بند قبا دیکھ

لیکن انہوں نے کہا کہ اسلام میں اقدامی جہاد نہیں، دفاعی جہاد ہے اور جب آدمی اپنے دل میں کوئی بات بٹھالے اور تہیہ کرلے کہ مجھے یہ بات ثابت کرنی ہے تو وہ قرآن وسنت کو بھی توڑ موڑ کر اپنے مقصد کے مطابق بنالیتا ہے، چنانچہ انہوں نے آیتیں بھی تلاش کرلیں کہ:

﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ﴾[7]

ترجمہ: "حکم ہوا ان لوگوں کو جن سے کافر لڑتے ہیں اس واسطے کہ ان پر ظلم ہوا"۔

یعنی جو مظلوم ہیں یا جن پر ابتداءً کسی نے حملہ کیا ہے ان کو اجازت دی گئی۔

﴿ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ ﴾[8]

ترجمہ: "اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے"۔

یعنی جو تم سے لڑے تم اس سے لڑو، اس سے پتا چلا کہ جہاد دفاعی ہے، اقدامی نہیں۔[9]

یہ ساری خرابی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ قرآن کریم کی آیتوں کو پورے تاریخی پس منظر کے ساتھ نہیں دیکھا، حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت مختلف مراحل سے گذری ہے۔

پہلا مرحلہ: صبر کا حکم

ایک دور وہ تھا جس میں بالکل ممانعت تھی، حکم تھا:

﴿ وَ اصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ وَ لَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَ لَا تَكُ فِيْ ضَيْقٍ مِّمَّا يَمْكُرُوْنَ ﴾[10]

---

۷ [الحج:۳۹] ۸ [البقرة:۱۹۰]

۹ من أراد التفصيل فليراجع : تكملة فتح الملهم ، ج:۳ ، ص:۳-۱۴. ۱۰ [النحل:۱۲۷]

ترجمہ: ”اور تو صبر کر اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے اور ان پر غم نہ کر اور تنگ مت ہو ان کے فریب سے“۔

﴿ خُذِ الْعَفْوَ وَ أْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ أَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ ﴾[۱۱]

ترجمہ: ”عادت کر درگذر کی اور حکم کر نیک کام کرنے کا اور کنارہ کر جاہلوں سے“۔

﴿ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ﴾[۱۲]

ترجمہ: ”سو سنا دے کھول کر جو تجھ کو حکم ہوا اور پرواہ نہ کر مشرکوں کی“۔

یعنی وہاں حکم یہ تھا کہ جہاد منع ہے، اس درجہ میں منع ہے کہ اگر کوئی تمہیں مار رہا ہے تو پلٹ کر جواباً مارنے کی اجازت نہیں۔

یہ ممانعت اس وجہ سے نہیں تھی کہ مسلمان کمزور تھے، بے شک کمزور تھے، لیکن اگر دوسرا دو ہاتھ مارتا تو ایک ہاتھ مار سکتے تھے اور قوت کی بات اگر دیکھیں تو بدر میں کون سی طاقت تھی کہ تین سو تیرہ نہتے ایک ہزار سے ٹکرا گئے اور وہ بھی اس حالت میں کہ آٹھ تلواریں، ستر اونٹ اور دو گھوڑے تھے، کسی نے لاٹھی اٹھالی، کسی نے پتھر اٹھالیا اور ایک ہزار مسلح لوہے سے غرق کافروں سے مقابلہ کر گئے۔

قوت تو بدر میں بھی نہیں تھی لیکن وہاں اجازت تھی، مکہ میں اجازت نہیں تھی، اور اتنی قوت تو مکہ میں مسلمان مہیا کر ہی لیتے کہ آٹھ دس افراد ایک دفعہ مل کر ابو جہل کو ٹھکانہ لگا لیتے، لیکن اس کی اجازت نہیں دی گئی۔

مکی زندگی میں جہاد کا حکم نہ ہونے کی حکمت

مکی زندگی میں یہ حکم اس لئے نہیں دیا کہ ابھی مسلمانوں کو مجاہدہ کی چکی میں پیسنا اور اس بھٹی میں سلگانا تھا، تاکہ اس بھٹی میں سے کندن بن کر نکلیں، وہاں صبر کی تعلیم دی جا رہی تھی، فضائل باطنی کی تعمیر ہو رہی تھی، روح کو غذا دی جا رہی تھی تاکہ انسانِ کامل بن جائیں۔

دوسرا مرحلہ: اجازتِ قتال

دوسرے مرحلہ میں جہاد فرض تو نہیں کیا گیا لیکن اتنی اجازت دے دی گئی کہ اگر تم پر کوئی ظلم کرتا ہے تو تم بھی بدلہ لے لو، چنانچہ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ آیت نازل ہوئی:

---

[۱۱] [الاعراف:۱۹۹] [۱۲] [الحجر:۹۴]

﴿ أُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقَاتَلُوْنَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ط وَ إِنَّ اللهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرٌ ۝ اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ط وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ط وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ط اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝ ﴾[۱۳]

ترجمہ: ”جن لوگوں سے جنگ کی جارہی ہے، اُنہیں اجازت دی جاتی ہے (کہ وہ اپنے دِفاع میں لڑیں) کیونکہ اُن پر ظلم کیا گیا ہے، اور یقین رکھو اللہ ان کو فتح دِلانے پر پوری طرح قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں صرف اتنی بات پر اپنے گھروں سے ناحق نکالا گیا ہے کہ اُنہوں نے یہ کہا تھا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے۔ اور اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ (کے شر) کو دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں اور کلیسا اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے ذکر کیا جاتا ہے، سب مسمار کردی جاتیں۔ اور اللہ ضرور اُن لوگوں کی مدد کرے گا جو اُس (کے دِین) کی مدد کریں گے۔ بلاشبہ اللہ بڑی قوت والا، بڑے اقتدار والا ہے“۔

یعنی اس آیت میں جہاد اور قتال کی اجازت دی گئی لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب دوسرا شخص تم پر ظلم کرے یا قتال کرے، اس کے جواب میں تمہارے لئے قتال کی اجازت ہے کہ تم بدلہ لے سکتے ہو۔

تیسرا مرحلہ: دفاعی جہاد کی فرضیت

تیسرا مرحلہ وہ ہے کہ جب جہاد وقتال فرض کیا گیا، لیکن اس کی فرضیت اس وقت ہے جب دوسرا حملہ آور ہو یعنی دفاعی جہاد فرض کیا گیا۔

---

۱۳ [الحج: ۳۹، ۴۰]

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ﴾ [14]

ترجمہ: ''اور لڑو اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جو لڑتے ہیں تم سے اور کسی پر زیادتی مت کرو، بے شک اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے زیادتی کرنے والوں کو''۔

یعنی اب یہاں وہی مدافعت امر مراد ہے جو وجوب کے لئے ہے، یعنی جہاد وقتال واجب ہے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے تم پر حملہ کیا ہے۔

چوتھا مرحلہ: اقدامی جہاد

چوتھا مرحلہ آیا کہ اب تم آگے بڑھ کر قتال کرو، اب صرف اس بات کے انتظار میں نہ رہو کہ دوسرا حملہ کرے گا تو تب آگے بڑھیں گے نہیں، بلکہ خود سے آگے بڑھو اور قتال کرو، تو حکم آیا کہ:

﴿ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ﴾ [15]

ترجمہ: ''فرض ہوئی تم پر لڑائی اور بری لگتی ہے تم کو''۔

اس آیت کے ذریعہ یہ حکم دیا کہ آپ ابتداً بھی قتال کرنا ہے، اب صرف دفاع کی حد تک قتال محدود نہیں۔ اس طرح حکم آیا کہ:

﴿ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ لَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ لَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ لَا یَدِیْنُوْنَ دِیْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰی یُعْطُوا الْجِزْیَةَ عَنْ یَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ﴾ [16]

ترجمہ: ''لڑو ان لوگوں سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ حرام جانتے ہیں اس کو جس کو حرام کیا اللہ نے اور اس کے رسول نے اور نہ قبول کرتے ہیں دین سچا ان لوگوں میں سے جو کہ اہل کتاب ہیں یہاں تک

---

[14] [البقرة: ۱۹۰] [15] [البقرة: ۲۱۶] [16] [التوبة: ۲۹]

کہ وہ جزیہ دے اپنے ہاتھ سے ذلیل ہو کر"۔

یعنی اب ابتداً بھی قتال کا حکم ہے۔

اس کے بعد سورت توبہ کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿فَإِذَا انسَلَخَ الْأَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدتُّمُوهُمْ وَخُذُوهُمْ وَاحْصُرُوهُمْ وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَإِن تَابُوا وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ فَخَلُّوا سَبِيلَهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ﴾ [۱۷]

ترجمہ: "چنانچہ جب حُرمت والے مہینے گذر جائیں تو ان مشرکین کو (جنہوں نے تمہارے ساتھ بدعہدی کی تھی) جہاں بھی پاؤ، قتل کرڈالو، اور انہیں پکڑو، انہیں گھیرو، اور انہیں پکڑنے کے لئے ہر گھات کی جگہ تاک لگا کر بیٹھو۔ ہاں اگر وہ توبہ کرلیں، اور نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں تو اُن کا راستہ چھوڑ دو۔ یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے"۔

اور یہ مرحلہ ۹ ھ کا ہے جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر بھیجا، تو اس وقت حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کا یہ پیغام لوگوں کو پہنچایا کہ جن کے ساتھ مسلمانوں کے معاہدے ہیں، ان کو معاہدوں کی حد تک مہلت دیتے ہیں اور جن کے ساتھ معاہدے نہیں ہیں ان کو چار مہینے کی مہلت دیتے ہیں۔ وہ لوگ چار مہینے کے اندر جزیرہ عرب کو خالی کردیں ورنہ ان سے اعلان جنگ ہے۔

ان آیات کے نازل ہونے کے بعد ابتدائی جہاد بھی جائز ہوگیا۔ اب اگر کوئی شخص ابتدائے اسلام میں نازل ہونی والی آیات لے کر یہ حکم لگادے کہ جہاد تو جائز ہی نہیں ہے، مسلمانوں کو تو صبر کا حکم ہے کہ جب مشرکین تکلیف پہنچائیں تو صبر کرو، تو ظاہر ہے کہ یہ قول غلط ہے۔ بالکل اسی طرح اگر کوئی شخص صرف مدافعت والی آیات لے کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ مسلمانوں کے لئے مدافعت کرنا تو جائز ہے، ابتدائی جہاد کرنا جائز نہیں۔ تو یہ قول ایسا غلط ہے جس کو چودہ سو سال سے آج تک فقہاء امت میں سے کسی نے بھی اس کو اختیار نہیں کیا کہ جہاد مدافعت کے طور پر جائز ہے، ابتداً جہاد کرنا جائز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ابتداً جہاد جائز ہے۔

تو یہ سارے احکام آخری مرحلہ میں آئے ہیں۔ اب اس صورت میں اس بات کی قید باقی نہیں رہی کہ

---

[۱۷] [التوبة:۵]

کوئی دوسرا حملہ کرے گا تو تب ہم جواب دینگے اور آگے بڑھ کر حملہ کریں گے۔

دفاع میں اقدام بھی داخل ہے

اگر وسیع معنی میں دیکھا جائے تو اقدام بھی ایک طرح کا دفاع ہے، یعنی ظاہری طور پر تو اقدام معلوم ہو رہا ہے، لیکن دوسرے معنی میں دفاع ہے۔ وہ اس طرح کہ اقدامی جہاد کا مقصد کفار کی شوکت کو توڑنا ہے، کیونکہ جب تک کفار کی شوکت قائم ہے اس وقت تک اس شوکت سے امت مسلمہ کو ہر وقت خطرہ ہے کہ کافر کسی بھی وقت حملہ کر سکتے ہیں۔

دوسرا یہ کہ ان کی شوکت قائم ہونے کی صورت میں لوگوں پر ان کا رعب طاری ہوگا، جس کی وجہ سے ان کے دل و دماغ کھلے انداز میں حق بات سننے سمجھنے پر تیار نہیں ہوں گے اور اگر سن بھی لیں تو قبول کرنے میں رکاوٹ ہوگی، کیونکہ یہ قاعدہ شروع سے چلا آیا ہے کہ **"الناس علی دین ملوکهم"** جس کا اقتدار اور غلبہ ہوتا ہے اسی کے افکار و تصورات، اس کی ثقافت، اس کی تہذیب لوگوں پر چھا جاتی ہے اور اس سے ان کے دل و دماغ مرعوب ہو جاتے ہیں اور اس طرح متاثر ہو جاتے ہیں کہ وہ انہی کی بات کو بہتر اور دوسروں کی بات کو غلط سمجھتے ہیں، چاہے کتنے ہی مضبوط دلائل کی روشنی میں بات کی جائے، چونکہ دل و دماغ متاثر ہیں اس لئے وہ حق بات سننے کے لئے آمادہ نہیں ہوتے، لہٰذا جب تک کفر کی شوکت نہیں ٹوٹتی، لوگوں تک حق کی بات پہنچانے کا راستہ نہیں ہے، یا کم از کم اس راستہ میں رکاوٹیں ہیں، اس لئے کفر کی شوکت کو توڑنا حقیقت میں حق کا دفاع ہے۔

اس لئے بسا اوقات اقدام کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں کہ بیٹھے دیکھتے رہیں اور دشمن تیاری میں مصروف ہو، وہ میزائل و ایٹم بم بنائے، اپنی قوت میں اضافہ کرے اور ہم کہیں کہ چونکہ اس نے ابھی تک حملہ نہیں کیا، اس لئے ہمارے لئے اجازت نہیں ہے، ہم بیٹھے ہوئے ہیں اور جب وہ ساری طاقت جمع کر کے دروازہ پر آ کھڑا ہو، پھر ہم تیاری کے لئے کھڑے ہوں، یہ کوئی عقل کی بات نہیں ہے۔

شریعت نے حدود مقرر کی ہیں

شریعت نے اجازت کے ساتھ ساتھ اس کی کچھ حدود مقرر فرمائی ہیں کہ **"لا تقتلوا ولیدًا ولا امرأة"** بچے کو نہ مارنا، عورتوں کو نہ مارنا، بوڑھوں کو نہ مارنا، جو لوگ عبادت کرنے والے ہیں اور جنگ میں شریک نہیں ہیں ان کو نہ مارنا، مثلہ نہ کرنا ایسی پابندی کر کے دکھائی کہ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے۔ [۱۸]

---

۱۸ سنن أبی داؤد، رقم: ۲۶۶۸، ۲۶۷۲.

لیکن پھر بھی ہم دہشت گرد ہیں، وہ بچوں کو ماریں، عورتوں کو ماریں تو امن کے علمبردار، اور ہم جنگ کی حالت میں بھی عورتوں کو بچانے کا حکم دیں، تب بھی دہشت گرد، العیاذ باللہ العظیم۔

امریکی قونصلر سے مکالمہ

یہاں جو امریکہ کا قونصلر برائے معاشی اُمور، واشنگٹن وزارت خارجہ کا ذمہ دار افسر ہے اور جنوب مشرقی ایشیا کے معاملات کا ڈائریکٹر ہے، وہ کبھی کبھی میرے پاس آجاتا ہے۔

پہلی دفعہ جب وہ مجھ سے ملنے آیا تو میں نے اس سے کہا کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، مجھ سے کیوں ملنے آئے ہیں؟ آپ سیاسی آدمیوں سے جا کر ملیں۔

کہنے لگا: کہ میں آپ سے ایک اسکالر کی حیثیت سے ملتا ہوں۔

(ایک مرتبہ آیا تو اس کے بعد ہر پانچویں چھٹے مہینے آتا ہے، اور کوئی نیا قونصلر آئے تو وہ بھی ملنے آجاتا ہے اور خوب کھری کھری سن کر جاتا ہے، لیکن آتا پھر بھی ہے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ آنے کے بعد بہت ساری باتیں کرنے لگا، میں نے کہا کہ میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں، مجھے اس کا جواب دیں)۔

میں نے کہا: کہ انڈونیشیا سے لے کر مراکش تک سارے عالم اسلام میں ایک تأثر ہے کہ امریکہ ان کا دشمن ہے اور ان کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے اور ان کے مفادات کے خلاف کام کرتا ہے۔

میرا سوال یہ ہے کہ یہ بات جو پورے عالم اسلام کے دلوں میں ہے یہ آپ کے حق میں نقصان دہ ہے یا فائدہ مند ہے؟ آپ اس کو اپنے لئے مفید سمجھتے ہیں یا نقصان دہ سمجھتے ہیں؟

کہنے لگا: اگر یہ تأثر ہے تو یہ ہمارے حق میں نقصان دہ ہے، مگر ہمارے خیال میں عوام میں یہ تأثر نہیں ہے۔

میں نے کہا: اگر آپ کی معلومات میں یہ ہے کہ آپ کے بارے میں عوام میں اس قسم کا تأثر نہیں ہے تو مجھے آپ کی معلومات پر حیرت ہے، آپ کی سی آئی اے تو معلومات حاصل کرنے میں بہت مشہور ہے، اگر اس نے آپ کو یہ رپورٹ دی ہے کہ لوگوں میں آپ کے خلاف نفرت نہیں ہے، تو یہ بڑی حیرت کی بات ہے۔

کہنے لگا: ہمارے خلاف صدام، خمینی اور قذافی نے پروپیگنڈہ کیا ہے، ورنہ عام لوگوں میں یہ بات نہیں۔

میں نے کہا: کہ مجھے اس پر پہلی بات سے بھی زیادہ حیرت ہے، اس واسطے کہ وہ صدام ہو، خمینی ہو یا قذافی ہو، آپ کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ یہ سب لوگ پاپولرسٹ (Popularist) یعنی عوام کے اندر اپنی وجاہت اور اپنی مقبولیت چاہتے ہیں، اور جو آدمی عوام میں مقبولیت چاہتا ہے وہ ایسا نعرہ لگاتا ہے جس سے عوام خوش ہو۔

چونکہ انہوں نے دیکھا کہ امریکہ کے خلاف عوام کے دلوں میں نفرت ہے، اس لئے ان لوگوں نے امریکہ کے خلاف آواز اٹھائی، اگر عوام کے اندر امریکہ کی نفرت نہ ہوتی تو یہ کبھی بھی امریکہ کے خلاف آواز نہ اٹھاتے، گالی نہ دیتے۔

دشمن نمبر ایک کون؟

میں نے کہا: کہ میرے کہنے پر آپ ایک تجربہ کر لیجئے کہ جب آپ یہاں سے جانے لگیں تو گاڑی سے جھنڈا اتار کر گاڑی کسی بھی معروف جگہ پر کھڑی کر کے کسی بھی راستہ پر چلتے ہوئے آدمی سے پوچھئے کہ تمہارا دشمن نمبر ایک کون ہے؟ اگر جواب میں وہ یہ نہ کہیں کہ دشمن نمبر ایک امریکہ ہے تو میں اپنی بات سے رجوع کرلوں گا، اس لئے اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ نفرت نہیں ہے تو یہ خیال غلط ہے۔ نفرت ہے بلکہ شدید نفرت ہے۔

امریکہ سے نفرت کے اسباب

کہنے لگا: کہ یہ نفرت کیوں ہے؟ اس کے اسباب کیا ہیں؟

میں نے کہا: کہ آپ کے طرزِ عمل کی وجہ سے یہ نفرت ہے۔

کہنے لگا: کہ وہ طرزِ عمل کیا ہیں؟

میں نے کہا: آپ مسلمانوں کے راستہ میں ہر جگہ روڑے اٹکاتے ہیں، جہاں کہیں بھی کوئی اسلامی بات ابھرنا چاہتی ہے تو آپ اس کو دبانے کے لئے ساری توانائیاں صرف کرتے ہیں، آپ نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کو کمیونزم (Communism) کے لئے ڈھال کے طور پر استعمال کیا، کمیونزم سے لڑنے کے لئے مسلمانوں کو آگے کر دیا اور جب اپنا مقصد حاصل ہوگیا اور کمیونزم پیچھے دفع ہوگیا تو اب اسی کو آپ نے نشانہ بنالیا۔

افغانستان میں مجاہدین جب تک روس سے لڑ رہے تھے اس وقت تک فریڈم فائٹرز (Freedom Fighters) تھے یعنی مجاہدین کو آزادی تھی، اور جوں ہی روس دفع ہوگیا تو اب وہ دہشت گرد ہیں، آپ کا یہ طریقہ غلط ہے۔ آپ جمہوریت جمہوریت کا نعرہ لگاتے ہیں، الجزائر میں جب مسلمانوں کی پارٹی غالب آگئی، اور ان کی حکومت آنے لگی تو آپ نے کہا کہ جمہوریت دشمن آگیا۔

میں نے تو پہلے ہی آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں، لہٰذا مجھے سیاسی اندازِ گفتگو بھی نہیں آتا، میں تو ایک طالب علم ہوں، اگر کوئی بات ناگوار گزرے تو میں پہلے ہی آپ سے معذرت خواہ ہوں، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ آپ کو مسلمانوں سے ڈر لگتا ہے۔ انہوں نے پوچھا، کیا ہمارا یہ ڈر صحیح ہے یا نہیں؟

اگر آپ کا طریقہ کار یہی رہا تو پھر یہ خطرہ بالکل صحیح ہے، لیکن اگر آپ اپنے اس طریقۂ کار میں تبدیلی کرلیں تو پھر کوئی خطرہ نہیں۔

کہنے لگا: کہ کیا تبدیلی کریں؟

میں نے کہا: کہ ہم ایک مصالحت کرلیں، اس سے انسانیت کو بڑا فائدہ پہنچے گا۔ ہمارا قرآن کہتا ہے کہ

مشرق ومغرب کی کوئی تفریق نہیں **"لا شرقية ولا غربية"** ایک مصالحت کرلیں اور وہ یہ کہ ایک چیز آپ کے پاس ہے وہ ہمارے پاس نہیں یا کم ہے، اور ایک چیز ہمارے پاس ہے وہ آپ کے پاس نہیں ہے، تو جو چیز ہمارے پاس ہے وہ ہم آپ کو دیں اور جو چیز آپ کے پاس ہے وہ آپ ہمیں دیں، تبادلہ کرلیں اور پھر دونوں مل کر ساری دنیا کی خدمت کریں۔

کہنے لگا: وہ کیا ہے؟

میں نے کہا: جو چیز آپ کے پاس ہے ہمارے پاس نہیں ہے یا کم ہے، وہ ٹیکنالوجی ہے، یعنی ایجادات وغیرہ، اگرچہ ہمارے پاس بھی آرہی ہیں لیکن اتنی نہیں ہیں جتنی آپ کے پاس ہیں اور ایک چیز جو ہمارے پاس ہے اور آپ کے پاس نہیں ہے وہ **"روحانی اقدار"** ہیں۔ آپ کا سارا معاشرہ مادیت پر مبنی ہے اسی وجہ سے تباہی کے کنارے پر پہنچا ہوا ہے، آپ کا خاندانی نظام تباہ ہے، آپ کے لوگ مادی وسائل رکھنے کے باوجود روحانی سکون سے محروم ہیں، خودکشی کا بازار گرم ہے، نشہ پھیل رہا ہے، اس کے نتیجے میں آپ روحانی اقدار سے محروم ہیں، تو آپ روحانی اقدار ہم سے لیجئے اور ٹیکنالوجی ہمیں دیجئے اور دونوں مل کر انسانیت کی خدمت کریں۔ ایک طرف آپ کی ٹیکنالوجی ہو اور دوسری طرف ہماری روحانی اقدار ہو تو انسانیت کے امن وسکون کے لئے اس سے زیادہ بہتر کوئی اور راستہ نہیں ہوسکتا۔

آپ کے پاس ہتھیار تو ہے، لیکن ہتھیار کو کس موقع پر کس حد تک استعمال کرنا چاہئے، اس کے اصول آپ کے پاس نہیں ہیں، آپ وہ ہم سے لیجئے، پھر دیکھئے کس طرح ساری دنیا میں امن قائم ہوتا ہے، آپ امن کی بات کرتے ہیں، امن صرف اسی راستے سے ہوسکتا ہے، کسی دوسرے راستے سے نہیں ہوسکتا۔

تو بات یہ ہے کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے اقدامی جہاد بھی مشروع ہے، ۹ھ کے بعد کی ساری کی ساری آیتیں اس پر دلالت کرتی ہیں۔

کیا دوسری آیات منسوخ ہوگئی ہیں؟

اس میں کلام ہوا ہے کہ کیا پچھلی آیات منسوخ ہوگئی ہیں یا اب بھی محکم ہیں؟

صحیح بات یہ ہے کہ وہ اب بھی محکم ہیں، حالات کے لحاظ سے جہاں مسلمانوں کے پاس قوت نہ ہو، وہاں اب بھی صبر کا حکم ہوگا، اور اس صبر کی حالت میں وہی کام کرنا ہوگا جو مکی زندگی میں صحابہ کرام ﷺ نے کیا اور قوت آجائے اور دوسرے حملہ آور ہوجائیں تو دفاع واجب ہوگا۔ اور اگر مزید قوت آجائے تو پھر اقدام بھی واجب ہوگا، تو یہ سب احکام اپنی جگہ پر محکم ہیں۔[ف]

[ف] تكملة فتح الملهم، ج: ۳، ص: ۹.

فرضِ عین اور فرضِ کفایہ

البتہ جب کوئی دوسرا حملہ آور ہو جائے تو اس صورت میں دفاع فرضِ عین ہو جاتا ہے، اسی کے لئے فقہاء کرام نے لکھا ہے **"تخرج المرأة بغير إذن زوجها"** اور جہاں دفاعی صورت نہ ہو بلکہ اقدامی جہاد ہو تو وہاں فرضِ علی الکفایہ ہے بشرط القوّۃ، اگر قوت ہے تو فرضِ کفایہ ہے۔

جہاد سے پہلے دعوت

سوال: اگر جہاد سے مقصد دعوت نہیں ہے بلکہ اعلاء کلمۃ اللہ ہے، تو پھر جہاد کے موقع پر پہلے دعوت الی الاسلام کیوں دی جاتی ہے؟

جواب: جہاد سے پہلے دعوت اسلام دینا کوئی فرض یا واجب نہیں بلکہ سنت ہے، کیونکہ جب ایک مرتبہ دعوت عامہ ہو چکی ہے اور لوگوں کو پتا چل گیا ہے، اس لئے عین جہاد کے وقت دعوت دینا فرض نہیں اور یہ سنت بھی اس لئے ہے کہ ہو سکتا ہے کہ کوئی کافر اسلام قبول کر لے، اگر اسلام قبول کر لے تو یہ بنسبت جزیہ قبول کر لینے کے افضل اور اعلیٰ ہے، جزیہ قبول کرنے کے معنی یہ ہے کہ وہ حالتِ کفر میں رہے گا، اگر چہ ہمارے زیرِ نگین ہو، تو کفر میں رہنے سے اسلام قبول کرنا افضل اور اعلیٰ ہے، لیکن اگر وہ مسلمان نہیں ہوتا تو پھر کم از کم ان کے سامنے جزیہ کا راستہ پیش کیا جائے، اگر مقصد دعوت ہوتی تو پھر جزیہ نہ ہوتا بلکہ دعوت ہی دعوت ہوتی۔

ایک بہت بڑی غلط فہمی اور اس کا ازالہ

بعض لوگوں نے یہ کہا کہ جہاد صرف اس وقت اور اس قوم سے مشروع ہے جو دعوت کے راستہ میں رکاوٹ بنے، اگر ان کے ملک میں دعوت وتبلیغ کے لئے جائیں تو وہ اجازت نہ دیں، گویا اصل مقصد دعوت ہے، اگر کوئی ملک اس دعوت کے پھیلانے میں رکاوٹ بنتا ہے تو اس سے جہاد مشروع ہے، اگر کوئی ملک دعوت کے راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتا اور اس کی اجازت دیتا ہے تو پھر ہمیں ان سے لڑائی کرنے سے کوئی سروکار نہیں۔

یہ بڑی خطرناک بات ہے، اس لئے کہ محض تبلیغ کی اجازت دیدینے سے جہاد کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اس لئے کہ جہاد کا مقصد کفر کی شوکت کو توڑنا اور اللہ کے کلمے کو بلند کرنا ہے، ارشاد باری ہے۔

"وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة"

فتنہ کے معنی تمام مفسرین نے کفر وشرک کے کئے ہیں، مراد یہ ہے کہ جب تک کفر وشرک کی ہیبت اور قوت برقرار رہے اس وقت تک قتال جاری رکھو۔

اور واقعہ یہ ہے کہ جب تک کفر وشرک کی ہیبت دلوں میں رہتی ہے، اس وقت تک حق کا پیغام مؤثر نہیں ہوتا، جیسے آج کل کفروشرک کی، امریکہ ویورپ کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں موجود ہے، اس لئے ان کی ہر بات مؤثر ہوتی ہے، ان کے مقابلے میں اگر صحیح بات بھی کہی جائے تو وہ بھی مؤثر نہیں ہوتی۔

اور اگر کوئی بات قوت اور شوکت کے ساتھ کہی جائے تو مؤثر ہوتی ہے، اس لئے کفروشرک کی ہیبت کو توڑ کر اللہ کا کلمہ بلند کرنا یہ جہاد کا مقصد ہے۔ اگر کسی ملک نے دعوت وتبلیغ کی اجازت دیدی تو اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ اب اس سے جہاد کی ضرورت نہیں رہی اور جہاد کا مقصد حاصل ہوگیا ہے، یہ بہت بڑی غلط فہمی ہے۔

موجودہ دور میں جہاد اقدامی ہے یا دفاعی؟

سوال: آج کل جو جہاد ہو رہا ہے وہ اقدامی ہے یا دفاعی ہے؟

جواب: آج کل کشمیر، بوسینیا میں جو جہاد ہو رہا ہے یہ دفاعی جہاد ہے، بوسینیا کے مسلمانوں پر خود کفار نے حملہ کرکے ان پر ظلم کیا تھا، اس کے نتیجے میں مسلمانوں نے ان کے خلاف ہتھیار اٹھائے، اسی طرح کشمیر پر بھی ہندوستان نے زبردستی قبضہ کیا ہوا ہے، اس لئے کہ تقسیم کے وقت یہ طے ہوا تھا کہ مسلم اکثریت والے علاقے پاکستان میں شامل ہوں گے، اس اصول کے اعتبار سے کشمیر پاکستان کا حصہ تھا لیکن ہندوستان نے اس پر زبردستی قبضہ کرلیا، اس لئے وہ مقبوضہ علاقہ کہلاتا ہے۔

اب اگر وہاں کے لوگ آزادی کے لئے اور کافروں کے تسلط کو ختم کرنے کے لئے لڑائی شروع کرتے ہیں تو یہ دفاعی جہاد ہے۔

یہ جہاد کی حقیقت، اس کے اہداف ومقاصد اور اس پر ہونے والے چند اعتراضات اور ان کے جوابات کا خلاصہ ہے۔

(۱) باب فضل الجهاد والسیر،

وقوله تعالىٰ: ﴿إِنَّ اللّٰهَ اشْتَرَى مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْداً عَلَيْهِ حَقاً فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيْلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ﴾ إلى قوله: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [۱۹]

---

۱۹ [التوبة: ۱۱۱ ـ ۱۱۲]

الجهاد والسير۔

جہاد اور مغازی میں فرق

دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتاب الجہاد میں جہاد کے احکام بیان کرنا مقصود ہے کہ جہاد کس صورت میں فرض ہوتا ہے؟ اس کا طریقۂ کار کیا ہوتا ہے؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز ہے؟ مالِ غنیمت کیسے اور کس بنیاد پر تقسیم ہوگا وغیرہ وغیرہ۔

اور مغازی کے اندر واقعات کا بیان کرنا مقصود ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک میں کیا کیا غزوات پیش آئے؟ ان کے اسباب کیا تھے؟ ان کی تفصیلات کیا ہیں؟

۲۷۸۴ ۔ حدثنا مسدد : حدثنا خالد : حدثنا حبيب بن أبي عمرة ، عن عائشة بنت طلحة ، عن عائشة رضى الله عنها أنها قالت : يا رسول الله نرى الجهاد أفضل العمل ، أفلا نجاهد ؟ قال : ((لكن افضل الجهاد حج مبرور)) . [راجع: ۱۵۲۰]

عورتوں کے لئے چونکہ صرف نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہوتا ہے، اس کے علاوہ اور کسی حالت میں بھی ان پر جہاد فرض نہیں ہوتا، اس لئے فرمایا کہ تمہارے لئے افضل یہ ہے کہ حج کرو، یہی تمہارا جہاد ہے۔

۲۷۸۵ ۔ حدثنا إسحاق : أخبرنا عفان : حدثنا همام ، حدثنا محمد بن جحادة قال : أخبرني أبو حصين أن ذكوان حدثه أن أبا هريرة رضی اللہ عنہ حدثه قال : جاء رجل الى رسول الله ﷺ فقال : دلني على عمل يعدل الجهاد ، قال : ((لا أجده)) . قال : هل تستطيع اذا خرج المجاهد أن تدخل مسجدك فتقوم و لا تفتر ، و تصوم و لا تفطر ؟)) قال : و من يستطيع ذلك ؟ قال : أبوهريرة : ان فرس المجاهد ليستن في طوله فيكتب له حسنات . [راجع: ۱۵۲۰]

"دلني على عمل يعدل الجهاد".

یعنی کسی نے پوچھا کہ ایسا عمل بتائیں جو جہاد کے برابر ہو۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ مجھے ایسا عمل معلوم نہیں جو جہاد کے برابر ہو۔

"هل تستطيع ......أن تدخل مسجدك".

کیا تمہارے اندر اتنی استطاعت ہے جب مجاہد نکلے جہاد کے لئے پھر تم مسجد میں داخل ہو جاؤ اور کھڑے رہو بالکل بھی آرام نہ لو روزہ رکھتے رہو اور افطار نہ کرو۔ یعنی جب تک وہ جہاد میں رہے تم اس وقت نماز اور روزہ

رکھتے رہو۔

"ومن يستطيع ذلك؟" ایسا کون استطاعت رکھے گا؟

مطلب جو آدمی جہاد میں رہے وہ ایسا ہے جیسا کہ وہ مستقل نماز میں ہے اور روزہ میں ہے۔

بعض روایتوں میں آتا ہے کہ عشرۃ ذی الحجہ کے روزہ کے بارے میں کہ یہ سب سے افضل عمل ہے۔ تو سوال کیا کہ کیا جہاد فی سبیل اللہ بھی اس کے برابر نہیں ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! جہاد فی سبیل اللہ بھی اس کے برابر نہیں ہے۔

اس سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ یہاں پر فرمایا گیا کہ کوئی بھی عمل نہیں اور وہاں فرمایا کہ عشرۂ ذی الحجہ کے روزے افضل ہیں۔ تو ایک بات تو یہ ہے کہ وہاں حدیث میں ساتھ ہی استثناء بھی ہے کہ **"إلا من خرج بنفسه وماله ولم يرجعه بشيء أو كما قال** ﷺ" مگر وہ شخص جو جہاد کے لئے نکلا اور کچھ بھی واپس نہ لے کر آیا، آپ ﷺ نے اس کو مستثنیٰ فرمایا۔

میری رائے

دوسری بات یہ ہے کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ وقت وقت کی بات ہے کہ کسی وقت کوئی عمل زیادہ فضیلت رکھتا ہے، اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس فضیلت کو حاصل کریں۔

عشرۂ ذی الحجہ میں روزے رکھنے کی زیادہ اور خصوصی فضیلت ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس فضیلت کو حاصل کرے اور جہاد چونکہ عشرۂ ذی الحجہ کے علاوہ دوسرے اوقات میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے، اس لئے جہاں تعارض ہو جائے کہ عشرۂ ذی الحجہ کے روزے رکھوں یا جہاد کروں، تو اس صورت میں اس کے لئے روزے رکھنا افضل ہوگا اور جب فارغ ہو جائے تو دوسرے اوقات میں جہاد کے لئے جائے۔ اس طرح دونوں فضیلتوں کو جمع کر دے۔

وہاں عشرۂ ذی الحجہ کی خصوصیت ہے اور اس حدیث میں عام حکم بتایا جا رہا ہے کہ اصل عمل کے اعتبار سے جہاد کا عمل افضل ہے، صوم وصلوٰۃ سے بھی افضل ہے۔

یہ وقت کی بات ہے اور دین کا فہم بھی اسی کو کہتے ہیں کہ کس وقت کیا عمل کیا جائے؟ کونسا عمل افضل ہوگا؟ مثال کے طور پر رمضان المبارک میں اعتکاف کا زمانہ آگیا، اب اعتکاف کا سارے سال میں وہی موقع ہوتا ہے جس میں اعتکاف مسنون ہے، احیاء لیلۃ القدر کا سارے سال میں وہی موقع ہوتا ہے۔

کوئی شخص کہے کہ اعتکاف اور لیلۃ القدر کے احیاء کو چھوڑ کر جہاد کو چلو، کیونکہ یہ زیادہ افضل ہے، تو اس کا یہ کہنا اس لئے درست نہیں ہوگا کہ جہاد کا عمل دوسرے وقت میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے، بخلاف اعتکاف کے کہ

یہ ایک خاص وقت کے ساتھ مخصوص ہے، اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی فضیلت حاصل کی جائے، لہٰذا اس وقت لوگوں کو دعوت دینا کہ جہاد کے لئے نکلو، درست نہیں ہوگا الا یہ کہ جہاد فرضِ عین ہو جائے اور نفیرِ عام ہو۔

یہ میں نے اس لئے واضح کر دیا کہ اس میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، حدیث میں آتا ہے **"تدارس فی العلم ساعة من اللیل خیر من احیاء ها"** کہ علم کا مذاکرہ تھوڑی دیر بھی کیا جائے تو وہ ساری رات جاگ کر عبادت کرنے سے بہتر ہے۔

اب کوئی شخص کہے کہ ہمیشہ کے لئے تہجد چھوڑ دوں اور اس کے بجائے مطالعہ کیا کروں، تو بظاہر دیکھنے میں یہ بات صحیح معلوم ہو رہی ہے کہ وہ عمل افضل ہے اور یہ اس کے مقابلے میں مفضول ہے۔

مقصد یہ ہے کہ فی نفسہ دونوں عملوں کا تقابل کیا جائے گا تو وہ عمل افضل ہوگا، لیکن وقت کا تقاضا یہ ہے کہ رات کے آخری حصہ میں وہ فضیلت حاصل کی جائے، جو اس وقت کے ساتھ مخصوص ہے، جبکہ **"تدارس فی العلم"** اس کے علاوہ دوسرے وقت میں بھی کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا اس وقت کا تقاضا یہ ہوگا کہ آدمی شب بیداری کرے یا نماز پڑھے، اور علم کے مذاکرہ کو دوسرے وقت کے لئے منتقل کر دے، اسی طرح کوئی شخص کہے کہ پلاؤ اور بریانی بنسبت دال کے بہتر ہے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ساری عمر پلاؤ اور بریانی ہی کھائی جائے اور دال کبھی بھی نہ کھائے، بلکہ وقت وقت کی بات ہے، کسی وقت پر یہ اور کسی وقت پر وہ، اسی طرح فضائلِ اعمال کی بات ہے کہ اس وقت کون سا عمل مناسب ہے؟ اور وقت کا عمل کیا ہے؟

ہمارے بعض بھائی اعتکاف کے زمانہ میں کہتے ہیں کہ چلو چلّہ کے لئے، جب حاجی حج کو جاتے ہیں ان سے کہتے ہیں کہ حرم میں ایک لاکھ کا ثواب ملتا ہے اور وہاں (تبلیغی جماعت میں) انچاس کروڑ کا ثواب ملے گا، تو یہ تقابل درست نہیں، اس لئے کہ وقت وقت کی بات ہے۔

اعتکاف کے وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اعتکاف کیا جائے، جبکہ دعوت و تبلیغ کا کام دوسرے وقت میں بھی انجام دیا جا سکتا ہے، اسی طرح ایک آدمی جو ساری عمر تمنائیں کر کر کے حرم میں گیا ہے، اس کے لئے تقاضا یہ ہے کہ جتنا ہو سکے اپنا وقت حرم میں گزارے، تبلیغ کا کام دوسرے وقت میں بھی کر سکتا ہے، جہاد اور ٹریننگ دوسرے وقت میں بھی کی جا سکتی ہے، اس واسطے نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے والدین ہیں؟

"فیهما فجاهد" فرمایا کہ ان میں جہاد کرو، یعنی اس وقت کا تقاضا یہ ہے کہ تم والدین کی خدمت کرو، یہی تمہارا جہاد ہے۔

جہاد اور تبلیغ دونوں دین کے کام ہیں

حقیقت یہ ہے کہ دعوت کا کام ہو یا جہاد کا کام ہو، دونوں دین کے کام ہیں، ان میں سے کسی کو

بھی بے ضرورت نہیں کہا جا سکتا، اور ایک کام کی وجہ سے دوسرے کی بے توقیری نہیں کی جا سکتی، لہٰذا دونوں اپنی اپنی جگہ دین کے کام ہیں اور دونوں مطلوب ہیں، اور دونوں کرنے کے ہیں، یہ کہنا کہ ایک کام مقاصد میں سے ہے صرف اس میں جان لگانا چاہیے اور دوسرے کام کو بالکل ہی بیکار سمجھنا یہ بڑی زیادتی کی بات ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول

میرے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ دین کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک منزل تک پہنچنا چاہتے ہیں لیکن منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں: اب کوئی ایک راستہ اختیار کرتا ہے، کوئی دوسرا راستہ اختیار کرتا ہے تو منزل سب کی ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا، اب اگر کوئی یہ کہے کہ جس راستہ پر میں چل رہا ہوں دوسرا بھی اسی راستہ پر چلے ورنہ گمراہ ہے تو یہ کہنا اور سمجھنا زیادتی ہے۔

یہی معاملہ ہمارے یہاں ہے جس نے معاشرہ میں فساد برپا کیا ہوا ہے کہ مختلف راستوں کو منزل بنایا ہوا ہے، راستے سب ہیں اور سب دین کی طرف جانے والے ہیں لیکن ہر ایک نے ہر راستہ کو منزل بنا کر دین کو اُسی کے اندر منحصر کر دیا اور دوسرے کو غلط ثابت کرنا شروع کر دیا، اس زیادتی اور تعدی سے پرہیز کرنا چاہئے۔

ایک زمانہ تھا کہ مجھے اس قسم کی باتیں سننے کو ملتی تھیں کہ تبلیغی جماعت کے حضرات جہاد کے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں، لیکن میں نے کوشش کر کے ان کے ذمہ دار حضرات سے بات چیت کی، پتا چلا کہ اب وہ بات نہیں رہی، پہلے جو کچھ مغالطے تھے وہ اب نہیں رہے۔

لہٰذا اس میں بحث و مباحثہ کرنے سے معاملہ اور زیادہ خراب ہوتا ہے، حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی تبلیغ والا نہ بالکلیہ جہاد کا منکر ہے، اور نہ کوئی جہاد والا بالکلیہ تبلیغ کا منکر ہے، صرف یہ کہ دونوں نے اپنے اپنے مؤقف میں کچھ غلو اور تعدی اختیار کر لی ہے، اس کی وجہ سے بعض ناواقف لوگوں نے اس قسم کی باتیں کر کے دوسروں کو بھی بدنام کیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی دین کا کام ہے، دونوں کو مل جل کر کام کرنا چاہئے اور فضول باتوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔

(۳) باب الدعاء بالجهاد والشهادة للرجال والنساء،

"وقال عمر: اللّٰهم أرزقني شهادة في بلد رسولك".

۲۷۸۸، ۲۷۸۹ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف، عن مالك، عن إسحاق ابن عبد الله بن أبي طلحة، عن أنس بن مالك ﷺ: أنه سمعه يقول: كان رسول الله ﷺ يدخل

على أم حرام بنت ملحان فتطعمه، وكانت أم حرام تحت عبادة بن الصامت. فدخل عليها رسول الله ﷺ فأطعمته وجعلت تفلي رأسه فنام رسول الله ﷺ ثم استيقظ وهو يضحك. قالت: فقلت: وما يضحكك يا رسول الله؟ قال: ((ناس من أمتي عرضوا على غزاة في سبيل الله يركبون ثبج هذا البحر ملوكا على الأسرة، أو مثل الملوك على الأسرة)) ، شك إسحاق. قالت: فقلت: يا رسول الله ادع الله أن يجعلني منهم، فدعا لها رسول الله ﷺ. ثم وضع رأسه ثم استيقظ وهو يضحك: فقلت: وما يضحكك يا رسول الله؟ قال: ((ناس من أمتي عرضوا على غزاة في سبيل الله)). كما قال في الأول. قالت: فقلت: يا رسول الله ادع الله أن يجعلني منهم، قال: ((أنت من الأولين)). فركبت البحر في زمن معاوية بن أبي سفيان فصرعت عن دابتها حين خرجت من البحر فهلكت. [الحديث: ۲۷۸۸، أنظر: ۲۷۹۹، ۲۸۷۷، ۲۸۹۴، ۶۲۸۲، ۷۰۰۱]؛ [الحديث: ۲۷۸۹، أنظر: ۲۸۰۰، ۲۸۷۸، ۲۸۹۵، ۶۲۸۳، ۷۰۰۲]. [۲۰]

الفاظ حدیث کی تشریح

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ **"كان رسول الله ﷺ يدخل على أم حرام بنت ملحان"** آپ ﷺ ام حرام بنت ملحانؓ کے پاس تشریف لے جایا کرتے تھے، یہ حضرت انس ﷺ کی خالہ اور حضور اکرم ﷺ کی رضاعی خالہ تھیں، لہٰذا حضور اکرم ﷺ کی محرم تھیں۔

"فتطعمه" وہ آپ کو کھانا کھلاتی تھیں **"وكانت أم حرام تحت عبادة بن صامت"** اور ام حرام حضرت عبادہ بن صامت ﷺ کے نکاح میں تھیں، جس وقت کا یہ واقعہ ہے اس وقت کا نہیں، بعد میں نکاح میں آئیں تھیں۔

"فدخل عليها رسول الله ﷺ فأطعمته" انہوں نے کھانا کھلایا۔

---

۲۰ وفي صحيح مسلم، كتاب الأمارة، باب فضل الغزو في البحر، رقم: ۳۵۳۵، وسنن الترمذي، كتاب فضائل الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء في غزو البحر، رقم: ۱۵۶۹، وسنن النسائي، كتاب الجهاد، باب فضل الرحة في سبيل الله عز وجل، رقم: ۳۱۲۰، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب فضل الغزو في البحر، رقم: ۲۱۳۱، وسنن ابن ماجة، كتاب الجهاد، باب فضل الغزو في البحر، رقم: ۲۷۶۶، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۱۳۲۹۰، وموطأ مالك، كتاب الجهاد، باب الترغيب في الجهاد، رقم: ۸۸۲، وسنن الدارمي، كتاب الجهاد، باب في فضل غزاة البحر، رقم: ۲۳۱۴.

"وجعلت تفلی رأسه" اور پھر آپ ﷺ کے سر میں جوئیں تلاش کرنے لگیں۔

"فنام رسول الله ﷺ ثم استيقظ وهو يضحک" آپ ﷺ سوئے اور جب بیدار ہوئے تو آپ ﷺ ہنس رہے تھے۔

"قالت: فقلت: وما يضحكك يا رسول الله ﷺ؟" یا رسول اللہ! آپ کس بات سے ہنس رہے ہیں؟ **"قال: "ناس من أمتي عرضوا علي غزاة في سبيل الله يركبون ثبج هذا البحر"** فرمایا: کہ میری امت کے کچھ لوگ مجھ پر پیش کئے گئے جو اللہ کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے سمندر کے بیچ میں سوار تھے۔

"ثبج البحر ای وسط البحر" ۔ **"ثبج"** وسط کو کہتے ہیں، بعضوں نے کہا کہ **"ثبج"** سے موج مراد ہے یعنی سمندر کی موجوں پر سوار ہو رہے تھے، **"ملوكا على الأسرة"** ایسے بادشاہوں کی طرح جو تخت پر بیٹھے ہوں۔

"ملوكاً على الأسرة" کی تشریح

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ **"ملوكا على الأسرة"** کی دو تفسیریں کی جاسکتی ہیں:

ایک تفسیر یہ کہ اس جہاد کا انجام یہ ہوگا کہ بالآخر وہ فتوحات حاصل کرنے کے بعد بادشاہوں کی طرح تخت پر بیٹھیں گے۔

دوسری تفسیر یہ ہے کہ اس جہاد کا آخرت میں یہ نتیجہ ہوگا کہ ان کو بادشاہوں کی طرح تخت پر بٹھایا جائے گا۔[۲۱]

روایت کے الفاظ سے ایسا لگتا ہے **(واللہ اعلم)** کہ اُس سمندر پر اس طرح سفر کر رہے ہیں جیسا کہ بادشاہ تخت پر بیٹھتے ہیں یعنی بے خوف ہو کر سکون و اطمینان کے ساتھ، اور یہ اس لئے فرمایا کہ اس زمانہ میں سمندر کا سفر بڑا خطرناک سفر سمجھا جاتا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت کے یہ لوگ بے خوف و خطر، اطمینان کے ساتھ سفر کریں گے۔

"قالت: فقلت: يا رسول الله ادع الله أن يجعلني منهم" حضرت ام حرامؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! (ﷺ) میرے لئے دعا فرمائیں کہ میں ان میں شامل ہو جاؤں۔

"فدعا لها" آپ ﷺ نے ان کے لئے دعا فرمائی اور اپنا سر رکھ لیا، یعنی پھر نیند آئی، دوبارہ جب بیدار ہوئے تو **"وهو يضحک. فقلت: وما يضحكك يا رسول الله؟"** وہی پہلے والی بات فرمائی۔

حضرت ام حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دوبارہ ان میں شامل ہونے کی دعا کی درخواست کی، تو آپ ﷺ

---

[۲۱] فتح الباری، ج: ۱۱، ص: ۷۴، دار المعرفة.

نے فرمایا کہ تم پہلے والوں میں شامل ہو۔

''فرکبت البحر فی زمن معاویة بن أبی سفیان''

حضور اکرم ﷺ کی یہ بشارت تھی کہ میری امت کے لوگ سمندر میں سفر کرکے جہاد کریں گے، بالآخر خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں یہ واقعات پیش آئے۔

لشکرِ اسلام کا سب سے پہلا سمندری سفر اور فتح قبرص

پہلا واقعہ جس کی طرف آپ ﷺ نے اشارہ فرمایا تھا وہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں پیش آیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی اجازت سے سمندر کے راستہ لشکر لے کر گئے اور قبرص پر حملہ کیا۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو شوق تھا کہ سمندر کے راستہ بھی جہاد کیا جائے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں ان سے کئی مرتبہ اجازت طلب کی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منع فرما دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خشکی کی مہمات میں، روم و ایران کے ساتھ جہاد میں اس قدر مصروف تھے کہ وہاں سے پھرنا آسان نہیں تھا دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ سمندر کے سفر کو پُرخطر سمجھتے تھے۔

جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا تو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے اجازت طلب کی۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اجازت تو دیدی لیکن ساتھ ساتھ یہ شرط لگائی کہ تم باقاعدہ لوگوں سے ان کی مرضی معلوم کرلو، جو خوشی سے جانے کو تیار ہو اس کو لے جاؤ، کسی کے ساتھ زبردستی والا معاملہ نہ کرنا اور نہ بہت زیادہ ترغیب دینا۔ چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کچھ لوگوں کا لشکر تیار کیا اور پھر جا کر قبرص پر حملہ کیا۔

اگر دیکھا جائے تو قبرص کا جدہ سے سمندری راستہ تقریباً دو ڈھائی ہزار میل ہوگا، انہوں نے اتنی مسافت طے کرکے قبرص پر حملہ کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو فتح عطا فرمائی، قبرص کے لوگ زیرنگین آگئے اور وہاں ان کی حکومت قائم ہوگئی، صلح ہوئی اور انہوں نے جزیہ دینا منظور کیا۔ جب سارا شہر صلح کے لئے تیار ہوگیا اور لشکر کے لوگوں کو اس کی خوشخبری دی گئی تو لوگوں نے کہا کہ چلیں ذرا شہر کو اندر سے دیکھ لیں کہ کیسا ہے؟ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا بھی اس ارادہ سے جہاز سے اتر کر اپنی دابہ پر سوار ہو رہی تھیں کہ اچانک گھوڑا بدک گیا، اور اس نے آپ کو زمین پر گرا دیا آپ زخم سے جانبر نہیں ہوسکیں اور وہیں پر جام شہادت نوش کیا۔ آج بھی ان کا مزار قبرص میں ہی ہے۔ [۲۲]

اسی واقعہ کو ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ:

''فرکبت البحر فی زمن معاویة بن أبی سفیان فصرعت عن دابتها حین خرجت من البحر فهلکت''

---

۲۲ عمدة القاری ج: ۱۰ ص: ۸۸، وجہان دیدہ ص: ۳۱۹۔

قسطنطنیہ پر حملہ اور بشارت

دوسری بار آپ ﷺ کو جو بشارت دی گئی کہ لشکر جارہا ہے، معروف روایات کے مطابق یہ یزید کا لشکر تھا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے گورنر تھے اس وقت قسطنطنیہ فتح کرنے کے لئے یہ لشکر بھیجا گیا تھا، اس لشکر کے سربراہ یزید تھے، اور اس میں حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بھی تھے، اور اس دوران آپ بیمار ہو کر وفات پا گئے اور قسطنطنیہ کی دیوار کے نیچے مدفون ہوئے۔ بعض روایتوں کے مطابق حضرت حسین رضی اللہ عنہ بھی اس لشکر میں شامل تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ سے منقول ہے کہ قسطنطنیہ پر جو پہلا لشکر حملہ کرے گا وہ **"مغفور لهم"** ہے، آپ ﷺ نے ان کی مغفرت کی بشارت دی ہے، اور جس شخص کے ہاتھ قسطنطنیہ فتح ہو، اس کے لئے بھی آپ ﷺ نے بشارت دی تھی، فتح تو بالآخر سلطان محمد فاتح کے ہاتھوں پر ہوا، لیکن اس کی ابتداء یزید سے ہوئی تھی، اور یوں سب سے پہلا حملہ قسطنطنیہ پر یزید کی قیادت میں ہوا تھا، اس کی وجہ سے بعض لوگوں نے کہا کہ یزید کی تو بڑی فضیلت ہے کیونکہ حدیث میں پہلے حملہ کرنے والے کو **"مغفور لهم"** کہا گیا ہے۔[۲۳]

بعض حضرات کی توجیہ

بعض حضرات نے کہا کہ جس روایت میں یہ ہے کہ سب سے پہلا شخص جس نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا وہ یزید ہے، اس روایت میں کلام ہے، کیونکہ دوسری بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلا لشکر سفیان بن عوف کی سرکردگی میں بھیجا تھا، بعد میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے یزید کو بھیجا، لیکن اکثر روایات میں یہی ہے کہ جس لشکر نے سب سے پہلا حملہ کیا اس کا سربراہ یزید تھا۔[۲۴]

"مغفور لهم" کے بارے میں معتدل بات

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ نے "تراجم بخاری" میں اس بارے میں سب سے معتدل بات فرمائی ہے، انہوں نے فرمایا کہ **"مغفور لهم"** سے مراد یہ ہے کہ جو بھی اس لشکر میں شامل ہوگا اس کے سابق گناہوں کی مغفرت کر دی جائے گی، لہٰذا جو بھی اس لشکر میں شامل تھے سب کے سابق گناہوں کی مغفرت ہوگئی، لیکن اگر اس کے بعد کسی نے غلط اقدام کیا ہے تو وہ اس حدیث کے منافی نہیں ہے۔

---

۲۳ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں "جہان دیدہ" ص: ۳۱۹ - ۳۲۹۔

۲۴ تکملة فتح الملهم، ج: ۳، ص: ۳۵۶۔

اس لئے اگر یزید سے کچھ غلطیاں بعد میں سرزد ہوئیں اور اس کے معاملات میں کچھ خلاف شریعت امور ظاہر ہوئے تو یہ بعد کی بات ہے، اور "**مغفور لھم**" کا معاملہ ماقبل سے متعلق تھا۔

اس بحث میں نہیں پڑنا چاہیے

باقی یہ بات کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ اس بحث میں پڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتے ہیں وہ چاہیں تو مغفرت کر دیں، چاہیں تو نہ کریں، ہم اس بارے میں فیصلہ کرنے والے کون ہوتے ہیں؟ البتہ کسی شخص کے عمل کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا یہ عمل شریعت کے مطابق تھا یا نہیں تھا؟ بیشک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا جو واقعہ پیش آیا، اس کی ذمہ داری یزید پر عائد ہوتی ہے، اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، ان کا یہ عمل خلاف شرع تھا، ان کے اس عمل کو غلط کہا جائے گا، لیکن مغفرت ہوگی یا نہیں؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں۔

﴿تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ
مَّا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [۲۵]

ترجمہ: "وہ ایک جماعت تھی جو گذر چکی ان کے واسطے ہے جو انہوں نے کیا اور تمہارے واسطے ہے جو تم نے کیا، اور تم سے پوچھ نہیں ان کے کاموں کی"۔

(۵) باب الغدوة والروحة فی سبیل الله. وقاب قوس أحدکم فی الجنة

۲۷۹۲ ـ حدثنا معلی بن أسد : حدثنا وهیب : حدثنا حمید ،عن أنس بن مالک رضی اللہ عنہ عن النبی ﷺ قال : ((لغدوة فی سبیل الله أو روحة خیر من الدنیا وما فیها)). [أنظر: ۲۷۹۶،۶۵۶۸]

"**غدوة**" اصل میں جہاد کے لئے وارد ہوا ہے، صبح کو جانا اور شام کو جانا، لیکن چونکہ الفاظ عام ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ دین کے کسی بھی کام کے لئے نکلنے کی توفیق دیں، سب اس میں داخل ہیں، کسی کے ساتھ تخصیص نہیں ہے۔

(۷) باب تمنی الشهادة

۲۷۹۷ ـ حدثنا أبو الیمان: أخبرنا شعیب ، عن الزهری: أخبرنی سعید بن

---

۲۵ [البقرة: ۱۳۴]

المسيب : أن أبا هريرة ﷺ قال : سمعت النبی ﷺ يقول : ((والذی نفسی بيده لولا أن رجالا من المؤمنين لا تطيب أنفسهم أن يتخلفوا عنی ولا أجد ما أحملهم عليه ما تخلفت عن سرية تغدو فی سبيل الله. والذی نفسی بيده لو ددت أنی أقتل فی سبيل الله ثم أقتل ثم أحيا، ثم أقتل ثم أحيا،ثم أقتل)). [راجع: ۳۶].

حدیث کا مطلب

حضرت ابو ہریرۃ ﷺ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ سے سنا کہ وہ فرمارہے تھے، اگر مجھے کچھ ایسے لوگوں کا خیال نہ ہوتا جن کے دل اس بات پر راضی نہیں ہوتے کہ وہ مجھ سے الگ رہیں اور میں ان کو اپنے ساتھ لے جانہیں سکتا تو پھر ساری زندگی جہاد ہی کرتا رہتا، لیکن چونکہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو میرے ساتھ نہیں جاسکتے تو ان کی دل شکنی ہوتی ہے، ان کو تعلیم بھی دینی ہے، اس واسطے میں ہر سریّہ میں نہیں جاتا، ورنہ ہر سریّہ میں جاتا۔

(۸) باب فضل من يصرع فی سبيل الله فمات فهو منهم

وقول الله عز وجل: ﴿وَمَنْ يَخْرُجْ مِنْ بَيْتِهِ مُهَاجِراً إِلَى اللهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللهِ﴾[۲۶] وقع : وجب.

۲۷۹۹، ۲۸۰۰ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف قال : حدثنی الليث : حدثنا يحيی، عن محمد بن يحيی بن حبان ، عن أنس بن مالک ، عن خالته أم حرام بنت ملحان قالت : نام النبی ﷺ يوماً قريباً منی ثم استيقظ يتبسم ، فقلت ما أضحكک؟ قال : ((أناس من أمتی عرضوا علی ، يركبون هذا البحر الأخضر كالملوک علی الأسرة)). قالت : فادع الله أن يجعلنی منهم ، فدعا لها، ثم نام الثانية ففعل مثلها. فقالت مثل قولها فأجابها مثلها. فقالت: ادع الله أن يجعلنی منهم، فقال : ((أنت من الأولين)).

فخرجت مع زوجها عبادة بن الصامت غازيا أول ماركب المسلمون البحر مع معاوية فلما انصرفوا من غزوتهم قافلين فنزلوا الشام فقربت إليها دابة لتركبها فصرعتها فماتت)). [راجع : ۲۷۸۸، ۲۷۸۹]

اس میں کسی راوی سے وہم ہوگیا ہے، یہ ایک خاتون کا واقعہ ہے جو بعد میں پیش آیا تھا کہ جب واپس آنے لگے اور ملک شام میں اترے وہاں ان کے پاس دابۃ لایا گیا اور وہ بدک گیا اس سے گرکر انتقال ہوگیا، ورنہ

۲۶ [النساء : ۱۰۰]

اصل واقعہ حضرت ام حرام رضی اللہ عنہا کا ہے جو قبرص میں ان کے ساتھ پیش آیا تھا، راوی کو خلط ہو گیا ہے۔

(۱۲) باب قول الله عز وجل :

﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهُ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيلاً ﴾[۲۷]

۲۸۰۵ ـ حدثنا محمد بن سعيد الخزاعي : حدثنا عبد الأعلى ، عن حميد قال : سألت أنساً قال وحدثني عمرو بن زرارة : حدثنا زياد قال : حدثني حميد طويل عن أنس ﷺ قال : غاب عمي أنس بن النضر عن قتال بدر فقال : يا رسول الله ، غبت عن أول قتال قاتلت المشركين ، لئن الله أشهدني قتال المشركين ليرين الله ما أصنع. فلما كان يوم أحد، وانكشف المسلمون قال: اللّهم اني أعتذر إليك مما صنع هؤلاء ـ يعني أصحابه ـ وأبرأ إليك مما صنع هؤلاء ـ يعني المشركين ـ ثم تقدم فاستقبله سعد بن معاذ ، فقال: يا سعد بن معاذ! الجنة ورب النضر، إني أجد ريحها من دون أحد. قال سعد: فما استطعت يا رسول الله ما صنع . قال أنس : فوجدنا به بضعاً وثمانين ضربة بالسيف أو طعنة برمح أو رمية بسهم ، ووجدناه قد قتل وقد مثل به فما عرفه أحد إلا أخته ببنانه . قال أنس : كنا نرى أو نظن أن هذه الآية نزلت فيه وفي أشباهه : ﴿ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَاعَاهَدُوْا اللّٰهَ عَلَيْهِ﴾ إلى آخر الآية . [أنظر : ۴۰۴۸، ۴۷۸۳][۲۸]

"**الجنة ورب النضر**" پروردگار کی قسم جنت سامنے نظر آرہی ہے، جیسے کہا تھا"**فزت ورب الكعبة**" کہ تیر لگ رہا ہے، خون کا فوارہ نکل رہا ہے، ایسی حالت میں لوگ ہائے ہائے کرتے ہیں، لیکن وہ کہہ رہے ہیں"**فزت ورب الكعبة**"رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا۔ اسی طرح جہاد میں جب جنت کا منظر نظر آیا تو کہا"**الجنة ورب النضر**".

"**إني أجد ريحها من دون أحد. قال سعد : فما استطعت يا رسول الله ما**

---

[۲۷] [الأحزاب: ۲۳]

[۲۸] وفي صحيح مسلم ، كتاب الامارة ، باب ثبوت الجنة للشهيد ، رقم : ۳۵۲۳، وسنن النسائي ، كتاب القسامة ، باب ذكر حديث عمرو بن حزم في العقول واختلاف الناقلين ، رقم : ۴۷۶۴، وسنن أبي داؤد ، كتاب الديات ، باب القصاص من السن، رقم : ۳۹۷۹، وسنن ابن ماجة ، كتاب الديات ، باب القصاص في السن ، رقم : ۲۶۳۹، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالك ، رقم : ۱۱۸۵۴، ۱۲۳۴۳، ۱۲۵۴۵، ۱۲۶۱۲، ۱۳۶۱۵، ۱۳۵۱۷،

صنع" حضرت سعد بن معاذ ﷺ فرماتے ہیں، واقعی میں وہ کام نہ کرسکا جو انہوں نے کیا تھا۔

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم نے اُن کے جسم پر تلوار، تیر اور نیزوں کی اسّی سے زیادہ ضربیں پائیں، اور اس کے اوپر طرّہ یہ کہ مشرکین نے ان کا مُثلہ کیا، کہتے ہیں کہ "**فما عرفه أحد إلا أخته ببنانه**" سوائے بہن کے کوئی پہچان بھی نہیں سکا، اور بہن نے بھی انگلیوں کے پوروں سے پہچانا۔

(۱۳) باب: عمل صالح قبل القتال

وقال أبو الدرداء: إنما تقاتلون بأعمالكم، وقوله عزوجل: ﴿ يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتاً عِنْدَ اللهِ أَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِهِ صَفّاً كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوْصٌ ﴾ [۲۹]

۲۸۰۸ ـ حدثني محمد بن عبد الرحيم: حدثنا شبابة بن سوار الفزاري: حدثنا إسرائيل عن أبي إسحاق قال: سمعت البراء ﷺ يقول: أتى النبي ﷺ رجل مقنع بالحديد فقال: يارسول الله أقاتل أو أسلم؟ قال: ((أسلم ثم قاتل)) ـ فأسلم ثم قاتل فقتل، فقال رسول الله ﷺ: ((عمل قليلاً وأجر كثيرا)). [۳۰] [۳۱]

ایک شخص نبی کریم ﷺ کے پاس آیا "**مقنع بالحديد**" جو لوہے میں غرق تھا یعنی لوہے کا خود وغیرہ پہنا ہوا تھا، "**فقال: يارسول الله أقاتل أو أسلم؟**" اس نے آکر پوچھا کہ یارسول لڑوں یا اسلام لاؤں؟

آپ ﷺ نے فرمایا کہ پہلے اسلام لاؤ، پھر قتال کرو۔ چنانچہ وہ ایمان لایا اور قتال کیا، پھر اُسی میں شہید ہوگیا، "**فقال رسول الله ﷺ**": **((عمل قليلاً وأجر كثيرا)).**

(۱۴) باب من أتاه سهم غرب فقتله

۲۸۰۹ ـ حدثنا محمد بن عبد الله: حدثنا حسين بن محمد أبو أحمد: حدثنا شيبان، عن قتادة: حدثنا أنس بن مالك: أن أم الربيع بنت البراء، وهي أم حارثة بن سراقة أتت النبي ﷺ فقالت: يا نبي الله، ألا تحدثني عن حارثة؟ وكان قتل يوم بدر، أصابه سهمٌ غَرْبٌ، فإن كان في الجنة صبرت، وإن كان غير ذلك اجتهدت عليه في

---

۲۹ [الصف: ۲-۴] ۳۰ لا يوجد للحديث مكررات.

۳۱ وفي صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب ثبوت الجنة للشهيد، رقم: ۳۵۱۹، ومسند احمد، اول مسند الكوفيين، باب حديث البراء بن عازب، رقم: ۱۷۸۳۰، ۱۷۸۵۲.

البكاء . قال : ((يا أم حارثة ، إنها جنان في الجنة وإن ابنك أصاب الفردوس الأعلى)).

[أنظر : ۳۹۸۲، ۶۵۵۰، ۶۵۶۷] [۳۲]

"سهم غرب" وہ تیر جس کا پھینکنے والا معلوم نہ ہو۔

حضرت حارثہ ؓ کو بدر کے دن ایک ایسا تیر لگا جس سے وہ شہید ہو گئے، ان کی والدہ نے کہا کہ مجھے بتا دیجئے! اگر وہ جنت میں ہیں تو پھر میں صبر کروں اور اگر اس کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو "اجتهدت عليه في البكاء" میں اس کے اوپر روؤں۔

"قال" حضور اقدس ﷺ نے فرمایا "يا أم حارثة ، إنها جنان في الجنة وإن أبنك أصاب الفردوس الأعلى".

۲۸۱۵ ۔ حدثنا علي بن عبد الله : حدثنا سفيان عن عمرو : سمع جابر بن عبدالله رضي الله عنهما يقول : اصطبح ناس الخمر يوم أحد : ثم قتلوا شهداء ، فقيل لسفيان : من آخر ذلك اليوم ؟ قال : ليس هذا فيه .[أنظر: ۴۰۴۴، ۴۶۱۸] [۳۳]

حضرت جابر ؓ نے فرمایا کہ جس دن احد کی لڑائی ہوئی اس دن صبح کچھ لوگوں نے شراب پی لی تھی، (اس وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی) پھر وہ شہید ہوئے، اللہ ﷻ نے ان کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمایا، اور شراب نوشی ان کی شہادت میں کوئی نقص واقع نہ کر سکی کیونکہ اس وقت حلال تھی۔

"فقيل لسفيان" سفیان بن عیینہ سے ان کے شاگرد نے کہا، "من آخر ذلك اليوم؟" کہ اُس دن شام میں وہ شہید ہوئے؟ "قال: ليس هذا فيه" حضرت ابن عیینہ نے کہا کہ یہ لفظ حدیث میں نہیں ہے۔

(۲۰) باب ظلّ الملائكة على الشهيد

"حتى رفع" جب تک ان کا جنازہ اٹھایا نہ گیا اُس وقت تک فرشتے اُن پر سایہ کئے رہے۔

۲۸۲۱ ۔ حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب، عن الزهري قال : أخبرني عمر بن محمد بن جبير بن مطعم : أن محمد بن جبير قال : أخبرني جبير بن مطعم : أنه بينما هو يسير مع رسول الله ﷺ معه الناس مقفله من حنين فعلقت الناس يسألونه حتى اضطروه إلى سمرة فخطفت رداءه، فوقف النبي ﷺ فقال : ((أعطوني ردائي ، لو كان لي عدد هذه

[۳۲] وفي سنن الترمذي ، كتاب تفسير القرآن عن رسول الله ، باب ومن سورة المؤمنين ، رقم : ۳۰۹۸، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالك ، رقم : ۱۱۸۰۴، ۱۲۷۲۳، ۱۲۷۷۳، ۱۳۲۴۴، ۱۳۲۸۷، ۱۳۳۶۸، ۱۳۵۰۰، ۱۳۵۰۴.

[۳۳] انفرد به البخاري.

العضاه نعم لقسمته بينكم ثم لا تجدوني بخلا ولا كذوبا ولا جبانا)) . [أنظر : ۳۱۴۸] [۳۴]

حضرت جبیر بن مطعم ﷺ فرما رہے ہیں کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چل رہے تھے اور لوگ بھی ساتھ چل رہے تھے "**مقفله من حنين**" (مقفل) مصدر میمی ہے یعنی آپ کے حنین سے لوٹنے کے وقت، "**فعلقت الناس يسئلونه**" جو اعرابی تھے وہ آپ کے ساتھ لٹک گئے، مانگنے کے لئے یعنی مال غنیمت مانگنے کے لئے۔

"**حتى اضطروه إلى سمرة**" یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ کو درخت تک دھکیل دیا، "**فخطفتْ رداء ه**" اس نے حضور اقدس ﷺ کی چادرا چک لی، یعنی اس درخت میں کانٹے تھے، اس لئے چادر اس میں پھنس گئی۔

آپ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا "**اعطوني ردائي**" کہ میری چادر دیدو، اگر کانٹوں والے درخت کے کانٹوں کی تعداد کے برابر مویشی ہوتے تو میں سب تمہارے درمیان تقسیم کر دیتا۔

"**ثم لا تجدوني بخيلاً ولا كذوبا ولا جبانا**"

اب بظاہر یہ بے ادبی تھی کہ حضور اقدس ﷺ کو وہاں تک دھکیل کر لے گئے کہ آپ ﷺ کی چادر بھی اتر گئی، لیکن چونکہ اعرابی تھے اور حضور اقدس ﷺ اعرابیوں کی حرکات کی رعایت فرماتے تھے اور ان کی حرکات پر صبر فرماتے تھے، اسی لئے آپ ﷺ نے اس پر کوئی ناراضگی کا اظہار نہیں فرمایا اور زبان حال سے فرمایا "**ثم لا تجدوني بخيلاً ولا كذوبا ولا جبانا**"۔

(۲۶) باب من حدث بمشاهده في الحرب،

"قال أبو عثمان عن سعد"

۲۸۲۴ ـ حدثنا قتيبة بن سعيد : حدثنا حاتم عن محمد بن يوسف ، عن السائب ابن يزيد قال : صحبت طلحة بن عبيد الله وسعدا والمقداد بن الأسود و عبد الرحمن بن عوف ﷺ فما سمعت أحدا منهم يحدث عن رسول الله ﷺ إلا أني سمعت طلحة يحدث عن يوم أحد . [أنظر : ۴۰۶۲] [۳۵]

کوئی شخص جنگ میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات یا جن کا اس نے مشاہدہ کیا ہے وہ لوگوں کو بتائے کہ جنگ میں یہ واقعہ ہوا، میں نے اس طرح حملہ کیا، دشمن کا اس طرح مقابلہ کیا، تو ایسا بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، بشرطیکہ مقصد ریا نہ ہو بلکہ ایک واقعہ کا بیان ہو اور اللہ کا شکر ادا کرنا ہو۔

---

[۳۴] وفي مسند احمد ، اول مسند المدنيين اجمعين ، باب حديث جبير بن مطعم ، رقم : ۱۶۱۵۵ ، ۱۶۱۷۴ .

[۳۵] وفي سنن ابن ماجة ، كتاب المقدمة ، باب التوقي في الحديث عن رسول الله ، رقم : ۲۹ ، وكتاب الأدب ، باب اطفاء النار عند المبيت ، رقم : ۳۷۶۱ ، وسنن الدارمي ، كتاب المقدمة ، باب من هاب الفتيا مخافة السقط ، رقم : ۲۸۰ .

"قا له أبو عثمان عن سعد"

اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کررہے ہیں جو مغازی میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص ﷛ نے فرمایا **"أنا أول"** انہوں نے یہ بات ذکر کی ہے کہ میں نے سب سے پہلا تیر چلایا، اگر ممنوع ہوتا تو یہ ذکر نہ کرتے۔ معلوم ہوا کہ واقعات کا ذکر کرنا ممنوع یا بُری بات نہیں بشرطیکہ دکھلا وامقصود نہ ہو۔

"عن السائب ابن یزید قال: صحبت طلحة" یعنی میں نے اتنے صحابۂ کرام ﷡ کی صحبت اٹھائی، طلحہ بن عبداللہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت مقداد بن الاسود، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷡ لیکن ان میں سے کسی کو رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کوئی حدیث سناتے ہوئے نہیں دیکھا، اس لئے کہ صحابہ کرام ﷡ حدیث بیان کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کوئی کمی یا زیادتی نہ ہوجائے۔ البتہ میں نے حضرت طلحہ ﷛ کو سنا کہ وہ یوم اُحد کا واقعہ بیان کرتے تھے۔ معلوم ہوا کہ لڑائی کا واقعہ بیان کرنا جائز ہے۔

(۲۸) باب الکافر یقتل المسلم ثم یسلم فیسدد بعد ویقتل

۲۸۲۶ ـ حدثنا عبد الله بن یوسف : أخبرنا مالک ، عن أبی الزناد ، عن الأعرج ، عن أبی هریرة ﷛ ، عن رسول الله ﷺ قال : ((یضحک الله إلی رجلین : یقتل أحدهما الآخر ، یدخلان الجنة یقاتل هذا فی سبیل الله فیقتل ثم یتوب الله علی القاتل فیستشهد)). [۳۶، ۳۷]

ایک شخص ایمان کی حالت میں جہاد کرتا ہے اور شہید ہوجاتا ہے، پھر اللہ ﷻ اس کافر قاتل کو بھی توبہ کی توفیق دیدیتے ہیں، وہ بھی ایمان لے آتا ہے، اور شہید ہوجاتا ہے، تو قاتل اور مقتول دونوں جنت میں چلے جاتے ہیں۔

اللہ ﷻ ایسے دو آدمیوں پر تعجب فرماتے ہیں اور وہ تعجب اللہ ﷻ کی شان کے مطابق ہے کہ دونوں کو اجر عطا فرماتے ہیں۔

۲۸۲۷ ـ حدثنا الحمیدی : حدثنا سفیان : حدثنا الزهری قال : أخبرنی عنبسة بن

---

۳۶ لایوجد للحدیث مکررات.

۳۷ وفی صحیح مسلم ، کتاب الامارة ، باب بیان الرجلین یقتل احدهما الآخر یدخلان الجنة ، رقم : ۳۵۰۴ ، و سنن النسائی ، کتاب الجهاد ، باب تفسیر ذلک ، رقم : ۳۱۱۵ ، وسنن ابن ماجة ، کتاب المقدمة ، باب فیما انکرت الجهمیة ، رقم ۱۸۷ ، ومسند احمد ، باقی مسند المکثرین ، باب مسند أبی هریرة ، رقم : ۷۰۲۳ ، ۷۷۲۸ ، ۹۵۹۷ ، ۱۰۲۲۵ ، وموطأ مالک ، کتاب الجهاد ، باب الشهداء فی سبیل الله ، رقم : ۸۷۲.

سعيد ، عن أبي هريرة ﷺ قال : أتيت رسول الله ﷺ وهو بخيبر بعد ما افتتحوها فقلت : يا رسول الله أسهم لي ، فقال بعض بني سعيد بن العاص : لا تسهم له يا رسول الله ، فقال أبو هريرة : هذا قاتل ابن قوقل ، فقال بن سعيد بن العاص : واعجبا لوبر تدلى علينا من قدوم ضان ينعى على قتل رجل مسلم أكرمه الله على يدي ولم يهني على يديه ، قال : فلا أدري أسهم له أم لم يسهم. قال سفيان ، وحدثنيه السعيدی عن جده ، عن أبي هريرة . السعيدی هو عمرو بن يحيى بن سعيد بن عمرو إبن سعيد بن العاص . [أنظر : ۴۲۳۷، ۴۲۳۸، ۴۲۳۹] [۳۸]

حضرت ابو ہریرہ ﷺ فرماتے ہیں کہ "**أتيت رسول الله ﷺ وهو بخيبر**" میں رسول اللہ ﷺ کے پاس خیبر میں حاضر ہوا، جب آپ ﷺ خیبر فتح کر چکے تھے، جنگ ختم ہو چکی تھی، اور یہ اسی وقت اسلام لائے تھے۔

"**فقلت : يا رسول الله ﷺ أسهم لي !**" میں نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ مجھے بھی مال غنیمت میں حصہ دیجئے۔

"**فقال بعض بني سعيد بن العاص : لا تسهم له يا رسول الله**"، سعید بن العاص کے بیٹوں میں سے وہاں پر کوئی موجود تھا، دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابان بن سعید ﷺ تھے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ ان کو حصہ نہ دیجئے مطلب یہ ہے کہ یہ اس جنگ میں شامل نہیں تھے، بعد میں آئے ہیں۔

"**فقال أبو هريرة : هذا قاتل إبن قوقل**" یہ صاحب جو یہ کہہ رہے ہیں کہ حصہ نہ دیجئے یہ ابن قوقل کے قاتل ہیں۔

ابن قوقل ﷺ صحابی تھے، جنگ بدر میں ابان بن سعید نے ان کو شہید کر دیا تھا، اس وقت ابان بن سعید مسلمان نہیں ہوئے تھے اور ابن قوقل مسلمان تھے۔

جب ابان بن سعید ﷺ نے کہا کہ ان کو حصہ نہ دیجئے تو حضرت ابو ہریرہ ﷺ نے کہا کہ یہ تو وہی شخص ہے جس نے ابن قوقل کو قتل کیا تھا، آج یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ حصہ نہ دیجئے، اس نے تو ایک مسلمان کو شہید کیا تھا۔

"**فقال إبن سعيد بن العاص : واعجبا لوبر**" اس نے جواب میں کہا کہ عجیب معاملہ ہے، ایک ایسے "**وبر**" پر جو ہمارے اوپر پہاڑوں کے کنارے سے اتر کر آئی ہے۔

"**وبر**" بلی جیسا کوئی جانور ہوا کرتا تھا۔ "**ينعى علي**" اور وہ میرے اوپر عیب لگا رہی ہے کہ میں نے ایک ایسے مسلمان کو قتل کیا ہے، جس کو اللہ ﷻ نے میرے ہاتھوں عزت دی، یعنی میں نے اس کو قتل کیا تو اللہ ﷻ نے اس کو شہادت کا مرتبہ دیا۔

"**ولم يهني**" اور اللہ ﷻ نے اس کے ہاتھوں میری اہانت نہیں فرمائی، یعنی اس کے ساتھ بھی اچھا

---

۳۸ وفي سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب فيمن جاء بعد الغنيمة لاسهم له ، رقم : ۲۳۴۷، ۲۳۴۸.

معاملہ فرمایا اور مجھے بھی اسلام کی توفیق دے دی کہ میں مسلمان ہوگیا۔

"قال : فلا أدری" راوی کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ آپ ﷺ نے ان کو حصہ دیا یا نہیں۔

(۳۰) باب الشهادة سبع سوى القتل

۲۸۲۹ ـ حدثنا عبد الله بن يوسف : أخبرنا مالك ، عن سمى ، عن أبى صالح، عن أبى هريرة ﷺ، أن رسول الله ﷺ قال :((الشهداء خمسة : المطعون ، والمبطون، والغرق، واصاحب الهدم، والشهيد فى سبيل الله)). [راجع : ۶۵۳]

شہید کی پانچ اقسام

شہید کی پانچویں قسم دنیا اور آخرت دونوں کے لحاظ سے شہید ہے۔ باقی جو چار قسمیں ہیں جیسے مطعون، جس کا طاعون میں انتقال ہوا ہو، یا جس کا پیٹ کی بیماری میں انتقال ہوا ہو، یا جو پانی میں غرق ہو کر مرا ہو، یا جس کے اوپر دیوار وغیرہ گری ہو اور وہ مر گیا ہو تو وہ آخرت کے احکام کے اعتبار سے شہید ہیں، لیکن دنیا کے احکام کے اعتبار سے شہید نہیں ہیں، لہٰذا ان کو غسل وکفن دیا جائے گا، اور دوسرے تمام احکام میں بھی وہ عام اموات کی طرح ہوں گے۔ یہاں پر پانچ کا ذکر ہے، دوسری روایتوں میں چند اور کا بھی ذکر ہے، تو عدد کا مفہوم معتبر نہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے فتح الباری میں جو روایتیں نقل کی ہیں، ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً چھبیس انواع ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ آخرت کے احکام کے اعتبار سے شہید قرار دیتے ہیں۔

ایک روایت میں سات کا ذکر ہے، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ ایسا کرتے ہیں کہ جو روایت ان کی شرط کے مطابق نہیں ہوتی ہے، اس کو ترجمۃ الباب میں ذکر کر دیتے ہیں، اس واسطے اس کو ترجمۃ الباب میں ذکر کر دیا، فرمایا: **"الشهادة سبع سوى القتل"** اشارہ کر دیا کہ سات والی روایت بھی ہے۔[۳۹]

۲۸۳۲ ـ ...... "وفخذه على فخذى" یعنی وحی کا اتنا ثقل تھا کہ ان کی ران پھٹنے لگی۔

۲۸۳۹ ـ حدثنا سليمان بن حرب : حدثنا حماد هو ابن زيد ، عن حميد عن أنس ﷺ: أن النبى ﷺ كان فى غزاة ، فقال :((إن أقواما بالمدينة خلفنا ماسلكنا شعبا ولا واديا إلا وهم معنا فيه ، حبسهم العذر)). [راجع : ۲۸۳۸]

"وقال موسى : حدثنا حماد ،عن حميد ، عن موسى بن أنس ، عن أبيه ، قال النبى ﷺ. قال أبو عبد الله : الأول أصح".

یعنی پہلی سند جس میں حمید عن انس ﷺ ہیں اور عن موسیٰ بن انس کا واسطہ نہیں ہے وہ زیادہ صحیح ہے۔

---

[۳۹] فتح البارى ، ج: ٦ ، ص: ۴۲-۴۴.

(۳۹) باب التحنط عند القتال

۲۸۴۵ ـ حدثنا عبدالله بن عبد الوهاب : حدثنا خالد بن الحارث : حدثنا إبن عون، عن موسى بن أنس قال : ذكر يوم اليمامه قال : أتى أنس بن مالك ثابت بن قيس وقد حسر عن فخذيه وهو يتحنط فقال : ياعم ، ما يحبسك ألا تجىء؟ قال : ألآن يا إبن أخي، وجعل يتحنط ، يعني من الحنوط ، ثم جاء فجلس فذكر في الحديث انكشافا من الناس فقال : هكذا هن وجوهنا حتى نضارب بالقوم ، ماهكذا كنا نفعل مع رسول الله ﷺ، بئس ماعودتم أقرانكم. رواه حماد عن ثابت عن أنس. [۴]

جنگ یمامہ جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مسیلمہ کذاب کے ساتھ لڑی گئی تھی۔

حضرت موسیٰ بن انس رضی اللہ عنہ اس جنگ یمامہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ **"أتى أنس بن مالك"** حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اس دن حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے پاس آئے **"وقد حسر عن فخذيه"** حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے اپنی رانوں سے کپڑا اٹھایا ہوا تھا اور حنوط کی خوش بو استعمال کی ہوئی تھی۔

"فقال : يا عم ما يحبسك" حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: اے چچا! آپ کو جہاد میں شامل ہونے سے کیا چیز روک رہی ہے؟ آپ کیوں نہیں آتے؟

"قال : الآن يا ابن اخي" انہوں نے کہا: اے میرے بھتیجے! میں ابھی آتا ہوں، **"وجعل يتحنط"** یعنی **"من الحنوط"** اور وہ حنوط کی خوش بو لگاتے رہے۔

"ثم جاء فجلس" پھر وہ آبیٹھے اور حدیث میں انس بن مالک رضی اللہ عنہ ذکر کیا کہ اس دن مسلمان کھل گئے تھے یعنی صفیں منتشر ہوگئیں تھیں، ورنہ عام طور پر صف بنا کر لڑتے ہیں، لیکن اُس دن مسلمانوں کی صفیں منتشر ہوگئی تھیں، ایک دوسرے کے اندر گھس گئی تھیں، اور کافروں کے ساتھ بالکل گتھم گتھا ہوگئے تھے، اس کو **"انکشافاً"** سے تعبیر کیا ہے۔ یمامہ کی جنگ بڑی زبردست ہوئی کہ کسی بھی طرح فتح نہیں ہو رہی تھی۔

جذبۂ ایمانی کی عجیب مثال

آخر کار ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے منجنیق میں رکھ کر اندر پھینک دیا جائے، چنانچہ انہیں منجنیق میں رکھ کر اندر پھینکا، انہوں نے اندر جا کر قلعہ کا دروازہ کھولا اور پھر مسلمان اندر

---

[۴] انفرد به البخاري.

داخل ہو گئے۔

"فقال : هكذا عن وجوهنا حتى نضارب بالقوم" یہ بڑی مجمل سی عبارت ہے، اس میں الفاظ محذوف ہیں، مطلب یہ ہے کہ **"هكذا عن وجوهنا"** اشارہ کیا کہ دشمن ہمارے چہروں کے سامنے بالکل قریب آ گیا تھا یہاں تک کہ ہم ایک قوم کو مار رہے تھے، یعنی بالکل گتھم گتھا ہو گئے تھے، ہماری صفیں ٹوٹ گئیں تھیں، اور ہم ایک دوسرے کے اندر داخل ہو گئے تھے۔

کہتے ہیں کہ: **"ما هكذا كنا نفعل مع رسول الله ﷺ"** ثابت بن قیس ؓ نے کہا: ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس طرح نہیں کیا کرتے تھے کہ صفیں توڑ کر دشمن سے مل جائیں، بلکہ ہمارے اور دشمن کے درمیان فاصلہ ہوتا تھا، پہلی صف لڑتی تھی اور دوسری صف اس کی پشت پر ہوا کرتی تھی۔

"بئس ما عوّد تم اقرانكم" تم نے اپنے ساتھیوں کو بُری عادت ڈال دی ہے کہ وہ صفیں توڑ کر اندر گھس جاتے ہیں۔

سوال: آج کل دہشت گردی میں جو لوگ شہید ہو رہے ہیں، ان کا کیا حکم ہے؟

جواب: جس کو بھی ظلماً ہتھیار سے قتل کیا جائے اور فوراً موت واقع ہو جائے تو وہ دنیا کے احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہے اور آخرت کے احکام کے اعتبار سے بھی شہید ہے۔

(۴۴) باب الجهاد ماض مع البر والفاجر

"لقول النبی ﷺ":((الخيل معقود فی نواصيها الخير إلى يوم القيامة)).

۲۸۵۲ ـ حدثنا أبو نعيم : حدثنا زكريا ، عن عامر : حدثنا عروة البارقی : أن النبی ﷺ قال:((الخيل معقود فی نواصيها الخير إلى يوم القيامة ، الأجر والمغنم)).

[راجع: ۲۸۵۰]

اس سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے استدلال کیا کہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اور یہ کہ جہاد کے لئے ضروری نہیں ہے کہ امیر متقی ہی ہو بلکہ **"مع البر والفاجر"** چاہے امیر ایسا ہو جس کو فاسق فاجر کہا جاتا ہے، اگر جہاد کا مقصد درست ہے اور واقعی جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس کے ساتھ بھی جہاد کرنے کی وہی فضیلت ہے جو جہاد کی ہوتی ہے۔

(۴۶) باب اسم الفرس والحمار

یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ گھوڑے اور گدھے کا نام رکھ لینا بھی جائز ہے، حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں بھی نام ہوا کرتے تھے، اسی کی روایتیں لا رہے ہیں۔

(۴۷) باب ما يذكر من شؤم الفرس

۲۸۵۸ - حدثنا أبو اليمان : أخبرنا شعيب ، عن الزهري قال: أخبرني سالم بن عبد الله أن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما قال : سمعت النبي ﷺ يقول : ((إنما الشؤم في ثلاثة: في الفرس ، والمرأة ، والدار)) . [راجع : ۲۰۹۹]

اس کے معنی بعض حضرات نے یہ بتائے ہیں کہ اگر کسی چیز میں نحوست ہوتی تو ان میں ہوتی، ورنہ نحوست کی چیزیں ہیں ہی نہیں۔

لیکن میرے خیال میں "واللہ اعلم" حضور ﷺ کا منشأ یہ ہے کہ نحوست کسی چیز میں نہیں، جیسا کہ دوسری جگہوں پر حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے، البتہ نحوست کے اثرات ان چیزوں میں پائے جاتے ہیں۔

نحوست کسے کہتے ہیں؟

نحوست کہتے ہیں کہ اگر کوئی چیز ایک دفعہ آجائے تو آدمی اس چیز سے پریشان رہے۔

اگر چہ فی نفسہ تو شؤم کسی چیز میں نہیں ہے لیکن اس کے اثرات ان چیزوں میں حقیقتاً پائے جاتے ہیں، اس لئے کہ اگر ان میں سے کوئی چیز غلط مل جائے تو ساری عمر مصیبت ہے۔ یعنی اگر گھوڑا غلط مل گیا تو آدمی جلدی جلدی تو نہیں بدلتا کہ کسی کو دے دیا اور دوسرا لے لیا، اس لئے ساری عمر مصیبت ہے۔ اسی طرح بیوی غلط مل جائے تو اس کو بدلنا بھی بڑا مشکل ہے، ساری عمر کے لئے مصیبت بن جاتی ہے اور اگر گھر خراب مل جائے تو وہ بھی ساری عمر کے لئے مصیبت بن جاتا ہے۔ اس لئے نحوست تو نہیں، البتہ ان کے اثرات ان میں پائے جاتے ہیں۔

(۵۱) باب سهام الفرس،

وقال مالك : يسهم للخيل والبراذين منها لقوله تعالىٰ : ﴿ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا﴾ [النحل : ۸] ولا يسهم لأكثر من فرس [أنظر : ۴۲۲۸]

اختلاف ائمہ

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ گھوڑے ہوں یا براذین ہوں (برزون کی جمع ہے براذین، ترکی گھوڑے کو کہتے ہیں) ان سب کے لئے حصہ لگایا جائے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے " **وَالْخَيْلَ وَ الْبِغَالَ**

والحمير لتركبوها" اللہ تعالیٰ نے ان سب کو سواری قرار دیا ہے، لیکن ایک گھوڑے سے زیادہ کا حصہ نہیں لگائیں گے۔

یعنی اگر ایک مجاہد دو یا تین گھوڑے ساتھ لے کر گیا تو ایک ہی گھوڑے کا حصہ لگے گا، دو یا تین کا نہیں لگے گا، یہی مذہب اکثر فقہاء کا بھی ہے۔

۲۸۶۳ ــ حدثنا عبيد بن إسمعيل ، عن أبي أسامه ، عن عبيدالله ، عن نافع عن إبن عمر رضي الله عنهما : أن رسول الله ﷺ جعل الفرس سهمين ولصاحبه سهما. [۴۱]

جمہور کا مسلک

جمہور کا مسلک اسی حدیث کے مطابق ہے کہ جو شخص گھوڑے پر سوار ہو کر جہاد میں شریک ہو، اس کو تین حصے ملیں گے، ایک حصہ خود اس کا اپنا اور دو حصے گھوڑے کے۔ [۴۲]

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور بعض اہل کوفہ اس بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو دو حصے ملیں گے، ایک حصہ خود اس کا اور ایک حصہ گھوڑے کا۔ حدیث باب جمہور کی دلیل ہے۔

حنفیہ کی دلیل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت ہے جو ابن ماجہ اور امام طحاوی رحمہما اللہ نے نقل کی ہے۔ [۴۳]

حدیث باب کے بارے میں حنفیہ فرماتے ہیں کہ گھوڑے کو جو دو سہم دیئے گئے تھے ان میں سے ایک سہم تو گھوڑے کا تھا اور دوسرا حضور اکرم ﷺ کی طرف سے نفل یعنی انعام تھا، اور حضور اکرم ﷺ کو کسی کو زیادہ دینے کا حق حاصل تھا، اس کے تحت آپ نے زیادہ دیا۔ اس طرح دونوں حدیثوں میں تطبیق دی ہے۔

---

[۴۱] وفي صحيح مسلم ، كتاب الجهاد السير ، باب كيفية قسمة الغنيمة بين الحاضرين ، رقم : ۳۳۰۸، وسنن الترمذي ، كتاب السير عن رسول الله ، باب ماجاء في سهم الخيل ، رقم : ۱۴۷۵ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الجهاد ، باب في سهمان الخيل ، رقم : ۲۳۵۷، وسنن ابن ماجة ، كتاب الجهاد ، باب قسمة الغنائم ، رقم : ۲۸۴۵، ومسند احمد ، مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبدالله بن عمر الخطاب ، رقم : ۴۲۱۶، ۴۷۵۷، ۵۰۳۴، ۵۱۵۵، ۵۲۶۱، ۶۰۱۵، ۶۱۰۶، وسنن الدارمي ، كتاب السير ، باب في سهمان الخيل ، رقم : ۲۳۶۲.

[۴۲] عمدة القاري ، ج: ۱۰ ص: ۱۸۳ .

[۴۳] عن ابن عمر أن النبي ﷺ أسهم يوم خيبر للفارس ثلاثة أسهم للفرس سهمان وللرجل سهم ، سنن ابن ماجه ، كتاب الجهاد ، باب قسمة الغنائم ، رقم : ۲۸۴۴.

(۵۸) باب الركاب والغرز للدابة

"غرز" بھی رکاب ہی کو کہتے ہیں، لیکن عام طور سے "غرز" لکڑی کی اور رکاب لوہے کی ہوتی ہے۔

(۵۹) باب ناقة النبی ﷺ ،

۲۸۷۲ ـ حدثنا مالک بن إسمعیل : حدثنا زهیر ، عن حمید ، عن أنس ﷺ قال : كان للنبی ﷺ ناقة تسمی العضباء لا تسبق . قال حمید : أو لا تكاد تسبق ، .فجاء أعرابی علی قعود فسبقها فشق ذلک علی المسلمین حتی عرفه فقال :((حق علی الله أن لا یرتفع شئی من الدنیا إلا وضعه)).

طوله موسی عن حماد ، عن ثابت ، عن أنس عن النبی ﷺ .[راجع: ۲۸۷۱]

آپ ﷺ کی اونٹنی سے کوئی آگے نہیں نکلتا تھا، ہمیشہ وہ سب سے آگے ہی رہتی تھی۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی اونٹنی پر بیٹھ کر آیا اور آگے نکل گیا، مسلمانوں پر اسؓ کا آگے نکلنا ناگوار گزرا "**حتی عرفه**" یہاں تک کہ حضور اقدس ﷺ نے پہچان لیا کہ صحابۂ کرام ﷺ کو اس پر ناگواری ہورہی ہے۔

آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی بھی آگے بڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو کسی وقت نیچے گرا دیتے ہیں تا کہ کوئی تکبر پیدا نہ ہو۔

(۶۹) باب نزع السهم من البدن

۲۸۸۴ ـ حدثنا محمد بن العلاء : حدثنا أبو أسامة ، عن برید بن عبد الله ، عن أبی بردة عن أبی موسی ﷺ قال : رمی أبو عامر فی ركبته فانتهیت إلیه فقال : انزع هذا السهم ، فنزعته فنزا منه الماء فد خلت علی النبی ﷺ فأخبرته . فقال :((اللّٰهم اغفر لعبید أبی عامر)) . [أنظر: ۴۳۲۳، ۶۳۸۳]. [۴۴]

یعنی جب تیر نکالا تو اس سے پانی نکلنے لگا، جب زخم سے پانی نکلے تو یہ موت کی علامت ہوتی ہے، اس لئے کہ اس کا مطلب ہے کہ خون پانی میں تبدیل ہو رہا ہے۔ جب حضور اکرم ﷺ کو بتایا تو آپ نے مغفرت کی دعا کی، فرمایا "**اللّٰهم اغفر لعبید أبی عامر**".

(۷۰) باب الحراسة والغزوة فی سبیل الله

۲۸۸۷ ـ وزاد لنا عمرو قال : أخبرنا عبد الرحمٰن بن عبد الله بن دینار ، عن أبیه،

---

[۴۴] وفی صحیح مسلم ، كتاب فضائل الصحابة ، باب من فضائل أبی موسی وأبی عامر الاشعریین ، رقم : ۴۵۵۴، ومسند أحمد أول مسند الكوفیین ، باب حدیث أبی موسی الاشعری ، رقم : ۱۸۷۴۶، ۱۸۸۶۲ .

عن أبی صالح، عن أبی هريرة عن النبی ﷺ قال : ((تعس عبد الدينار وعبد الدرهم وعبد الخميصة ، إن أعطى رضی وإن لم يعط سخط. تعس وانتكس . وإذا شيک فلا انتقش. طوبى لعبد آخذ بعنان فرسه فی سبيل الله اشعث رأسه ، مغبرة قدماه ، إن كان فی الحراسة كان فی الحراسة ، وإن كان فی الساقة كان فی الساقة. إن استأذن لم يؤذن له ، وإن شفع لم يشفع)). وقال : فتعسا، كأنه يقول : فأتعسهم الله . طوبى : فعلى من كل شیء طيب وهی ياء حولت إلى الواو، وهو يطيب. [راجع : ۲۸۸۶]

"**تعس عبد الدینار**"۔"**تعس**" کے معنی ہیں ہلاک ہواوہ شخص جو دینار اور درہم کا بندہ ہو،"**وعبد الخمیصة**" اور اچھی چادروں کا بندہ ہو،"**وان اعطی رضی وان لم یعط سخط**" اگر دیا جائے تو راضی ہو، نہ دیا جائے تو ناراض ہو، مراد یہ ہے کہ ایسا شخص ہلاک ہو، برباد ہو۔

"**وإذاشیک فلا انتقش**" اور جب اس کو کانٹا لگ جائے تو نہ نکالا جائے، مطلب یہ ہے کہ اس کے ساتھ کوئی بھی ہمدردی نہیں کرتا۔

آگے فرمایا "**طوبیٰ لعبد......اشعث رأسه مغبرة قدماه**" اس کا سر، اس کے بال پراگندہ، اس کے پاؤں غبار آلود۔"**إن کان فی الحراسة کان فی الحراسة**" اگر اس کو چوکیداری میں رکھ دیا جائے تو چوکیداری کرے گا،"**وإن کان فی الساقة**" اور اگر اس کو لشکر کے پچھلے حصے میں رکھ دیا جائے تو پچھلے حصے میں رہے گا،"**وإذا استأذن لم یؤذن له**" اور اس کی حالت ایسی ہے کہ اگر کہیں جانے کی اجازت طلب کرے تو لوگ اجازت بھی نہ دیں۔ مطلب یہ ہے کہ معمولی آدمی ہے، اس کا لوگوں کے اندر کوئی خاص وقار نہیں ہے۔

"**وإن شفع فلم تشفع**" اور اگر کسی کی سفارش کرے تو سفارش قبول نہ کی جائے۔ ایسے شخص کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ اور حضور اکرم ﷺ نے خوشخبری دی ہے کہ دنیا کے اندر اگرچہ اس کا مقام نہیں ہے، لیکن اللہ جل جلالہ اس کے ساتھ اچھا معاملہ فرمائیں گے۔

(۷۱) باب الخدمة فی الغزو

۲۸۸۸ ۔ حدثنا محمد بن عرعرة : حدثنا شعبة ، عن يونس بن عبيد ، عن ثابت البنانیّ ، عن أنس ﷺ قال : صحبت جرير بن عبد الله فكان يخدمنی وهو أكبر من أنس. قال جرير: إنی رأيت الأنصار يصنعون شيئ لاأجد أحداً منهم إلا أكرمته . [۴۵، ۴۶]

[۴۵] لایوجد للحدیث مکررات.

[۴۶] وفی صحیح مسلم ، کتاب فضائل الصحابة ، باب فی حسن صحبة الأنصار، رقم : ۴۵۷۰.

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ میں حضرت جریر بن عبد اللہ ﷺ کے ساتھ تھا تو وہ میری خدمت کیا کرتے تھے، حالانکہ حضرت جریر ﷺ عمر میں بڑے تھے، دوسرا یہ کہ وہ اپنے علاقہ میں بنو بجیلہ کے نواب تھے، وہ کہتے تھے میں نے انصار کو ایک ایسا کام کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ جب بھی ان میں سے کسی کو دیکھتا ہوں اس کا اکرام کرتا ہوں۔ وہ کام کیا تھا؟ وہ حضور اکرم ﷺ اور مہاجرین کی خدمت تھی، اس کی وجہ سے حضرت جریر ﷺ انصار کی خدمت کرنے کو پسند فرماتے تھے۔

۲۸۹۰ ـ حدثنا سليمان بن داؤد أبو الربيع ، عن إسمعيل بن زكريا : حدثنا عاصم، عن مورّق العجلي ، عن أنس ﷺ قال : كنا مع النبي ﷺ أكثرنا ظلاً من يستظل بكسائه، وأما الذين صاموا فلم يعملوا شيئا ، وأما الذين أفطروا فبعثوا الركاب وامتهنوا وعالجوا، فقال النبي ﷺ: ((ذهب المفطرون اليوم بالأجر)). [۴۷، ۴۸]

متعدی عبادت کی فضیلت

حضرت انس ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ اس حالت میں تھے کہ **"اكثرنا ظلا من يستظل بكسائه"** ہم میں سے سب سے زیادہ سایہ اس شخص کو حاصل تھا جو اپنے کمبل سے سایہ لے رہا تھا، مطلب یہ ہے کہ سارے لشکر کے لئے کہیں سایہ کی جگہ نہیں تھی، کوئی درخت بھی نہیں تھا، اتنی گرمی اور دھوپ تھی کہ اگر کسی کے پاس کمبل یا چادر تھی تو وہ اس سے سایہ لے رہا تھا، بس وہ سب سے زیادہ سایہ لینے والا تھا۔

"وأما الذين صاموا" اس حالت میں جن لوگوں نے روزہ رکھا تو انہوں نے کوئی کام نہیں کیا، یعنی انہوں نے کوئی خدمت کا کام نہیں کیا۔

"وأما الذين افطروا" اور جنہوں نے سفر کی حالت میں روزہ افطار کیا ہوا تھا وہ سواریاں اٹھاتے اور معمولی نوعیت کے کام کرتے تھے، جیسے برتن دھونا، کھانا پکانا، صفائی کرنا، کیونکہ جنہوں نے روزہ رکھا ہوا تھا وہ روزہ کے اندر کام کرتے ہوئے کتراتے تھے اور دوسرے صحابہ کرام ﷺ بھی دیکھ رہے تھے کہ روزہ سے ہیں اس لئے ان کی خدمت کریں اور ان سے زیادہ کام نہ لیں، افطار کرنے والے سارا کام کر رہے تھے۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آج کے دن مفطر سب اجر لے گئے کہ انہوں نے خدمت کی، گویا ان کو صائمین کے مقابلے میں زیادہ اجر ملا، کیونکہ صائمین جو عبادت کر رہے تھے وہ ان کی ذات سے متعلق تھی اور جو حضرات

---

۴۷ لايوجد للحديث مكررات.

۴۸ وفي صحيح مسلم ، كتاب الصيام ، باب أجر المفطر في السفر اذا تولى العمل ، رقم : ۱۸۸۲ ، وسنن النسائي ، كتاب الصيام ، باب فضل الافطار في السفر على الصيام ، رقم : ۲۲۴۵.

خدمت کر رہے تھے، وہ متعدی عبادت تھی اور لازم عبادت کے مقابلہ میں متعدی عبادت ہمیشہ زیادہ ثواب کا موجب بنتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جس عبادت سے کسی دوسرے مسلمان بھائی کا فائدہ ہو اور اس کی خدمت ہو، وہ محض اپنی ذاتی نفلی عبادتوں کے مقابلہ میں افضل ہے۔

(۷۲) باب فضل من حمل متاع صاحبه فی السفر

۲۸۹۱ ـ حدثنا إسحاق بن نصر : حدثنا عبد الرزاق ، عن معمر ، عن همام ، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ عن النبي ﷺ قال : ((كل سلامىٰ عليه صدقة كل يوم ، يعين الرجل في دابته، يحامله عليها أو يرفع عليها متاعه صدقة ، و الكلمة الطيبة ، وكل خطوة يمشيها إلى الصلاة صدقة ، ودل الطريق صدقة)). [راجع : ۲۷۰۷]

یہ سارے اعمال بتا رہے ہیں کہ دوسروں کی خدمت کرنا اور دوسروں کو نفع پہنچانا، اس کو اللہ جل جلالہ نے کتنی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ "**یعین الرجل فی دابته**" آدمی سفر میں ہو تو آدمی ساتھیوں کی خدمت کرے۔

حضرت مولانا اعزاز علی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ

حضرت مولانا اعزاز علی صاحب رحمہ اللہ میرے والد ماجدؒ کے استاذ تھے، فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم سفر میں جا رہے تھے، حضرت بھی ساتھ تھے، حضرت نے فرمایا: بھائی سفر میں کسی کو امیر بنانا چاہیے، کہا ٹھیک ہے، آپ کو ہی امیر بناتے ہیں۔ کہنے لگے: مجھے امیر بناتے ہو تو ہر حکم ماننا ہوگا، کہا: جی حضور، ہر حکم مانیں گے۔ اب پلیٹ فارم پر پہنچے، ریل کے اندر جانا تھا، جب ریل آئی تو سارے ساتھیوں کا سامان جمع کیا، کچھ سر پر رکھا، کچھ ہاتھ میں پکڑ کر ریل پر چڑھنے لگے، اب جتنے شاگرد تھے سب دوڑے کہ یہ کیا کر رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا امیر کا حکم ماننا پڑے گا، اس طرح سارے سفر میں امیر کے حکم نے تنگ کر دیا کہ ہر موقع پر سارا کام کرنے کے لئے خود بڑھتے، اگر کوئی اعتراض کرتا تو فرماتے کہ تم نے پہلے وعدہ کیا تھا کہ امیر کا حکم مانیں گے۔

یہ ہیں ہمارے اکابر علماء دیوبند، اتنے اونچے مقام پر ویسے ہی نہیں پہنچ گئے، اللہ جل جلالہ نے ان حضرات کو ایسی اعلیٰ صفات عطا فرمائی تھیں۔

(۷۶) باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب،

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں یہ باب قائم کیا ہے کہ "**باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب**" کہ جنگ کے اندر ضعفاء اور صالحین سے دعا کرانی چاہئے، اس لئے کہ ان کی دعا

زیادہ قبول ہوتی ہے۔

جو آدمی فقر و فاقہ کا شکار ہے، بے وسیلہ ہے، جب وہ اللہ ﷻ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس کے رجوع میں زیادہ انابت و خشیت ہوتی ہے، اور آدمی جتنا دنیا کے اندر گھرتا چلا جاتا ہے، پیسے زیادہ ہوتے چلے جاتے ہیں، اتنا ہی انسان کا دل دنیا میں الجھتا چلا جاتا ہے، اس کی دعاؤں اور عبادتوں میں اتنا اخلاص نہیں ہوتا۔

۲۸۹۶ ـ حدثنا سليمان بن حرب: حدثنا محمد بن طلحة، عن طلحة، عن مصعب بن سعد، قال: رأى سعد ﷺ أن له فضلاً على من دونه. فقال النبي ﷺ: ((هل تنصرون وترزقون إلا بضعفائكم؟)). [۴۹، ۵۰]

حضرت مصعب ﷺ فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص ﷺ کے دل میں خیال آ گیا کہ **"ان له فضلا على من دونه"** کہ ان کو اپنے سے نیچے لوگوں پر فضیلت حاصل ہے۔

یعنی مرتبہ یا علم یا کسی بھی اعتبار سے دل میں فضیلت کا خیال آ گیا، نبی کریم ﷺ کو اندازہ ہوا تو آپ ﷺ نے فرمایا **"هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم؟"** کہ اللہ ﷻ کی طرف سے جو تمہاری مدد کی جاتی ہے اور جو رزق دیا جاتا ہے وہ تمہارے ضعفاء کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ یعنی جو تم میں ضعیف اور کمزور لوگ ہوتے ہیں جن کا بظاہر کوئی مرتبہ نہیں، جن کے پاس پیسے بھی نہیں، وسائل بھی کم ہیں، ان کی طرف اللہ ﷻ کی رحمتیں زیادہ متوجہ ہونے کی وجہ سے تمہیں بھی رزق مل جاتا ہے اور تمہاری بھی نصرت ہو جاتی ہے۔

(۷۷) باب: لايقال: فلان شهيد،

وقال أبو هريرة عن النبي ﷺ: ((الله اعلم بمن يجاهد في سبيله. والله أعلم بمن يكلم في سبيله)).

۲۸۹۸ ـ حدثنا قتيبة: حدثنا يعقوب بن عبد الرحمٰن، عن أبي حازم، عن سهل ابن سعد الساعدي ﷺ: أن رسول الله ﷺ التقى هو والمشركون فاقتتلوا، فلما مال رسول الله ﷺ إلى عسكره ومال الآخرون إلى عسكرهم، وفي أصحاب رسول الله ﷺ رجل لا يدع لهم شاذة ولا فاذة إلا اتبعها يضربها بسيفه، فقالوا: ما أجزأ منا اليوم أحد كما أجزأ فلان، فقال رسول الله ﷺ: ((أما إنه من أهل النار))، فقال رجل من القوم: أنا صاحبه.

---

۴۹ لايوجد للحديث مكررات.

۵۰ وفي سنن النسائي، كتاب الجهاد، باب الاستنصار بالضعيف، رقم: ۳۱۲۷، ومسند احمد، مسند العشرة المبشرين بالجنة، باب مسند أبي اسحاق سعد بن أبي وقاص رقم: ۱۴۱۱.

قال : فخرج معه كلما وقف وقف معه وإذا أسرع أسرع معه ، قال : فجرح الرجل جرحاً شديداً فاستعجل الموت فوضع نصل سيفه في الأرض وذبابه بين ثدييه ، ثم تحامل على سيفه فقتل نفسه . فخرج الرجل إلى رسول الله ﷺ فقال : أشهد أنک رسول الله ، قال : ((وما ذاک؟)) قال : الرجل الذي ذكرت آنفاً أنه من أهل النار فأعظم الناس ذلک فقلت: أنا لكم به ، فخرجت في طلبه ثم جرح جرحاً شديداً ، فاستعجل الموت فوضع نصل سيفه في الارض وذبابه بين ثدييه، ثم تحامل عليه فقتل نفسه. فقال رسول الله ﷺ عند ذلک : ((إن الرجل ليعمل عمل أهل الجنة فيما يبدو للناس وهو من أهل النار ، وإن الرجل ليعمل عمل أهل النار فيما يبدو للناس وهو من أهل الجنة)).

[أنظر : ۴۲۰۳، ۴۲۰۷، ۶۴۹۳، ۶۶۰۷] [۵۱]

اعتبار خواتیم کا ہے۔

فرمایا کہ جب قتال کے دوران حضور اکرم ﷺ اپنے لشکر کی طرف آئے اور دوسرے لوگ بھی اپنے لشکر میں چلے گئے تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں میں ایک ساتھی تھے **" لا يدع لهم شاذة و لا فاذة الا اتبعها يضربها بسيفه"** اگر کوئی علیحدہ نظر آتا تو اس کے پیچھے بھاگتے تھے۔

" فقالوا : ما اجزأ منا " لوگوں نے کہا آج جیسا معاملہ انہوں نے کیا ہے، ایسا ہم میں سے کسی نے نہیں کیا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **"اما انه من أهل النار"** تمہیں کیا پتہ، یہ تو دوزخی ہے، حالانکہ دیکھنے میں بڑی جان فشانی کا کام کر رہے تھے، تو ایک شخص نے کہا: **"أنا صاحبه"** میں ان کے پیچھے لگتا ہوں تاکہ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔

"قال : فخرج معه ، كلما وقف وقف معه وإذا أسرع أسرع معه ، قال : فجرح الرجل جرحا شديدا فاستعجل الموت فوضع نصل سيفه في الأرض" سخت زخمی ہو گیا تو زخم کی تکلیف کی وجہ سے جلدی موت چاہی، چنانچہ اس نے اپنی تلوار زمین پر رکھی **" وذبابه بين ثدييه"** اور ذباب اپنے ثدیین کے درمیان رکھی **"ثم تحامل علیٰ سيفه فقتل نفسه"** اپنی تلوار کے اوپر گر گیا اور خودکشی کر لی۔

اس وقت آپ ﷺ نے فرمایا: **"ان الرجل ليعمل"** کہ آدمی بظاہر جنت کا عمل کر رہا ہوتا ہے، لیکن

---

[۵۱] وفي صحيح مسلم ،كتاب الايمان ، باب غلظ تحريم قتل الانسان نفسه وأن من قتل نفسه ، رقم : ۱۶۳ ، ومسند أحمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث أبي مالک سهل بن الساعدي ، رقم : ۲۱۷۴۷، ۲۱۷۶۸.

حقیقت میں اہل النار سے ہوتا ہے، اور اہل نار کا عمل کر رہا ہوتا ہے، حقیقت میں اہل جنت میں سے ہوتا ہے، کیونکہ اعتبار خواتیم کا ہے۔

اب بظاہر خودکشی گناہ کبیرہ ہے، تو اہل نار میں قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ اولاً دخول نار ہوگا تا کہ اس عمل کی سزا بھگتے، بعد میں شاید جنت میں چلا جائے، اور بعضوں نے کہا ہے کہ یہ شخص منافق تھا، دل میں "العیاذ باللہ" ایمان نہیں تھا، ویسے ہی اپنی قومی حمیت میں لڑ رہا تھا، تو جب مر گیا اور خودکشی بھی کی تو آپ ﷺ نے اس کو اہل النار میں سے قرار دیا۔

سوال: جو خودکشی کرے تو کیا وہ خالد فی النار ہے؟ اور اس کے جنازہ کا کیا حکم ہے؟

جواب: خودکشی بھی دوسرے کبائر کی طرح ایک کبیرہ ہے، جو حکم ان کا ہے وہی اس کا بھی ہے، مخلد فی النار کہنا صحیح نہیں ہے اور ایسے شخص کی نماز جنازہ بھی پڑھی جائے گی، البتہ اگر امام دوسرے کو پڑھانے کو کہہ دے تو اس کی بھی گنجائش ہے تا کہ لوگوں کو پتہ چلے کہ یہ برا عمل ہے۔

خودکش بم دھماکہ

بعض مرتبہ مجاہدین ایسا کام کرتے ہیں جو بظاہر خودکشی لگتا ہے جیسے بارود باندھ کر دشمن پر کود گئے وغیرہ، آیا اس قسم کے اعمال خودکشی کے ذیل میں آتے ہیں یا نہیں؟

جواب: اس کا حکم تلاش کرنے کے باوجود مجھے کتب فقہ کے اندر نہیں ملا، البتہ بعض واقعات ایسے ملے ہیں جو اس سے ملتے جلتے ہیں جیسا کہ پیچھے گزرا کہ غزوۂ یمامہ میں ایک شخص نے کہا کہ مجھے منجنیق میں رکھ کر پھینک دو۔ اب بظاہر منجنیق میں رکھ کر پھینکنے کے بعد زندہ رہنا بہت مشکل ہے، جو خودکشی جیسا عمل ہے لیکن اس کو جائز سمجھا گیا، اسی طرح کوئی شخص تلوار لے کر تن تنہا دشمن کی صف میں گھس گیا تو بظاہر بچنے کا کوئی راستہ نہیں ہے، لیکن ایسے واقعات پیش آئے ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسے طریقے اختیار کرنا جن میں موت یقینی معلوم ہوتی ہے، لیکن مسلمانوں کے لشکر کو اس کی ضرورت ہے تو وہ خودکشی میں داخل نہیں بلکہ جہاد کا حصہ ہے، "واللہ اعلم" بعض اوقات اس قسم کے معاملات کرنا پڑتے ہیں اور سلف کے بعض کاموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسا کرنے کی گنجائش ہے۔[۵۲]

البتہ ان مثالوں اور موجودہ خودکش حملوں میں یہ فرق ہے کہ وہاں اصل حملہ دشمن پر ہوتا ہے، اگرچہ گمان غالب ہو کہ دشمن ہمیں مار دے گا، لیکن خودکش حملوں میں اپنی ذات کو ہلاک کر کے اسے دوسروں کی ہلاکت کا ذریعہ بنایا جاتا ہے، اس لئے بندہ کو ان کے جواز پر شرح صدر نہیں ہے، تاہم جو لوگ کسی فتوے کی بنیاد پر ایسی قربانی دیتے ہیں اور

---

۵۲ دلالة على الأخذ بالشدة في استهلاک النفس وغيرها في ذات الله عزوجل، وترک الأخذ بالرخصة لمن قدر عليها الخ وفيه : التداعي للقتال، عمدة القاري، ج: ۱۰، ص: ۱۶۴.

اخلاص کے ساتھ دیتے ہیں، ان کے بارے میں اللہ ﷻ سے رحمت کی امید رکھنی چاہئے۔

(۷۸) باب التحريض على الرمي، وقول الله عز وجل :

﴿ وَأَعِدُّوا لَهُم مَّا اسْتَطَعْتُم مِّن قُوَّةٍ وَمِن رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُونَ بِهِ عَدُوَّ اللَّهِ وَعَدُوَّكُمْ ﴾ [۵۳]

۲۸۹۹ ـ حدثنا عبد الله بن مسلمة : حدثنا حاتم بن إسماعيل ، عن يزيد بن أبى عبيد قال : سمعت سلمة بن الاكوع ﷺ قال : مرّ النبى ﷺ على نفر من أسلم ينتضلون . فقال النبى ﷺ :((رموا بنى إسماعيل فإن أباكم كان راميا، ارموا وأنا مع بنى فلان)). قال: فأمسك أحد الفريقين بأيديهم ، فقال رسول الله ﷺ : ((ما لكم لا ترمون؟)) قالوا : كيف نرمي وأنت معهم ؟ فقال النبى ﷺ: ((رموا فأنا معكم كلكم)). [أنظر : ۳۳۷۳، ۳۵۰۷] [۵۴]

صحابہ کرام ﷺ جب یہ مشق کررہے تھے تو آپ ﷺ نے کسی ایک جماعت سے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔

صحابہ کرام ﷺ نے فرمایا کہ "**كيف نرمى وانت معهم ؟**" آپ ان کے ساتھ چلے گئے تو ہم کیسے رمی کریں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "**ارموا فانامعكم كلكم**" میں سب کے ساتھ ہوں۔

(۸۲) باب الحمائل وتعليق السيف بالعنق

اونٹ کی ہڈی سے ایک تانت نکال کر تلوار کے مقبض پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ اور عنق، سیسہ، پیتل یا لوہے کا حلیہ ہوتا تھا، سونے چاندی کا حلیہ استعمال نہیں ہوتے تھے۔

(۸۴) باب من علق سيفه بالشجر في السفر عند القائلة

۲۹۱۰ ـ حدثنا أبو اليمان :.........ولم يعاقبه وجلس. [أنظر: ۲۹۱۳، ۴۱۳۴، ۴۱۳۵، ۴۱۳۶] [۵۵]

تلوار کو نیام میں کرلیا، دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمان بھی ہو گئے تھے۔

---

۵۳ [الانفال : ٦٠]

۵۴ وفى مسند احمد ، اول مسند المدنيين اجمعين ، باب حديث سلمة بن الاكوع ، رقم : ۲۸۸۵.

۵۵ وفى صحيح مسلم ، كتاب صلاة المسافرين وقصرها ، باب صلاة الخوف ، رقم : ۱۳۹۱ ، وكتاب الفضائل ، باب توكله على الله تعالىٰ وعصمة الله تعالىٰ له من الناس ، رقم : ۴۲۳۱، ومسند احمد ، باقى مسند المكثرين ، باب مسند جابر بن عبدالله ، رقم : ۱۳۸۱۶، ۱۴۴۰۰، ۱۴۶۵۷.

(۸۶) باب من لم یر کسر السلاح وعقر الدواب عند الموت

یعنی جاہلیت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی مرجاتا تو اس کے ہتھیار توڑ کر ختم کر دیئے جاتے تھے، تو بتایا کہ اسلام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

(۸۸) باب ما قيل فی الرماح

ویذکر عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال: ((جعل رزقی تحت ظل رمحی، وجعل الذلة والصغار علی من خالف أمری)).

میرے نیزے کے نیچے اللہ ﷻ نے میرا رزق رکھا ہے، مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو جو فتوحات حاصل ہوئیں تو وہ مال غنیمت وغیرہ کے ذریعہ ہوئیں۔

(۸۹) باب ماقيل فی درع النبی ﷺ والقميص فی الحرب،

وقال النبی ﷺ: ((أما خالد فقد احتبس أدراعه في سبيل الله)).

۲۹۱۵ ـ حدثنی محمد بن المثنی: حدثنا عبد الوهاب: حدثنا خالد، عن عكرمة، عن ابن عباس رضی الله عنهما قال: قال النبی ﷺ وهو فی قبة: ((اللهم إنی أنشدک عهدک ووعدک. اللهم إن شئت لم تعبد بعد اليوم)). فأخذ أبو بكر بيده فقال: حسبک يا رسول الله، فقد ألححت على ربک، وهو فی الدرع فخرج وهو يقول: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّونَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ أَدْهَى وَأَمَرُّ﴾ [القمر: ۴۵، ۴۶]. وقال وهيب: حدثنا خالد: يوم بدر. [أنظر: ۳۹۵۳، ۴۸۷۵، ۴۸۷۷] [۵۶]

یعنی عبدالوہاب نے بھی اس کو خالد سے روایت کیا ہے۔ خالد سے خالد بن ولید مراد نہیں بلکہ خالد راوی مراد ہیں اور "قبہ" سے وہ عریش مراد ہے جو حضور اقدس ﷺ کے لئے بدر کے دن بنایا گیا تھا۔

(۹۱) باب الحرير فی الحرب

۲۹۱۹ ـ حدثنا أحمد بن المقدام: حدثنا خالد بن الحارث: حدثنا سعيد، عن قتادة أن أنسا حدثهم: أن النبی ﷺ رخص لعبد الرحمٰن بن عوف والزبير فی قميص من

---

۵۶ وفی مسند احمد، ومن مسند بنی هاشم، باب باقی المسند السابق، رقم: ۲۸۸۵.

حرير من حكة كانت بهما. [أنظر : ۲۹۲۰، ۲۹۲۱، ۲۹۲۲، ۵۸۳۹] [۵۷]

۲۹۲۰ ۔ حدثنا أبو الوليد : حدثنا همام ، عن قتادة ، عن أنس.

حدثنا محمد بن سنان : حدثنا همام ، عن قتادة ، عن أنس ﷺ : أن عبد الرحمٰن بن عوف والزبير شكوا إلى النبی ﷺ ۔ يعنی القمل ۔ فأرخص لهما فی الحرير ، فرأيته عليهما فی غزاة. [راجع : ۲۹۱۹].

نبی کریم ﷺ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷺ اور حضرت زبیر بن العوام ﷺ کو حریر کی قمیص پہننے کی اجازت دی۔ امام بخاری رحمہ اللہ نے یہاں کئی طریقوں سے روایت نقل کی ہے۔

پہلی روایت میں ہے کہ ان کو اس وجہ سے اجازت دی کہ ان کو خارش تھی۔

دوسری روایت میں کہا گیا ہے کہ جوئیں ہوگئی تھیں، اور اسی میں یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کو حالت حرب میں حریر کی قمیص پہنے ہوئے دیکھا۔

حریر کا استعمال

مسلک امام شافعی رحمہ اللہ

ان تمام روایتوں سے امام شافعی رحمہ اللہ نے استدلال فرمایا ہے کہ کسی عذر کی وجہ سے حریر کا استعمال جائز ہے اور ان کے نزدیک عذر یا تو کوئی بیماری ہے جیسے خارش وغیرہ میں مفید ہوتا ہے یا جنگ کی حالت میں دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے جائیں تو حریر کا لباس پہن کر جائیں، اس لئے کہ حریر سے تلوار اچک جاتی ہے اور یہ تلوار کے راستہ میں رکاوٹ بن جاتا ہے، اس واسطے اجازت دی۔

مسلکِ حنفیہ

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ مسلمان کے لئے کسی بھی حالت میں حریر خالص کی اجازت نہیں ہے اور جب کبھی عذر ہو، جیسے یہ حالات بیان کئے گئے ہیں، تو اس صورت میں حریر مخلوط کی اجازت ہے، البتہ اتنا

---

۵۷ وفی صحيح مسلم ، كتاب اللباس والزينة ، باب اباحة لبس الحرير للرجل اذا كان به حكة او نحوها ، رقم : ۳۸۶۹، وسنن الترمذی ، كتاب اللباس عن رسول الله باب ماجاء فی الرخصة فی لبس الحرير فی الحرب ، رقم: ۱۶۴۴ ، وسنن النسائی ، كتاب الزينة ، باب الرخصة فی لبس الحرير فی الحرب ، رقم : ۵۲۱۵ ، وسنن أبی داؤد ، كتاب اللباس ، باب فی لبس الحرير لعذر ، رقم : ۳۵۴۴ ، وسنن ابن ماجة ، كتاب اللباس ، باب من رخص له فی لبس الحرير ، رقم : ۳۵۸۲ ، ومسند احمد ، باقی مسند المكثرين ، باب مسند أنس بن مالك ، رقم : ۱۱۷۸۳ ، ۱۱۸۴۰ ، ۱۳۱۴۸ .

فرق ہے کہ عام حالات میں وہ حریر جس کا بانا حریر ہو اور تانا غیر حریر ہو وہ جائز نہیں اور جس کا تانا حریر اور بانا غیر حریر ہو، وہ جائز ہے اور حالت حرب میں یا حالت عذر میں وہ کپڑا بھی استعمال کرنا جائز ہے، جس کا بانا حریر اور تانا غیر حریر ہو۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ ان تمام روایات کو اس حریر مخلوط پر محمول فرماتے ہیں جس کا بانا حریر ہو اور مطلق حریر کا اطلاق اس لئے کر دیا جاتا ہے کہ جب بانا حریر ہو تو بانا ہی اوپر رہتا ہے، تانا نیچے رہتا ہے، تو چونکہ دیکھنے میں سارا حریر ہی نظر آئے گا، سارا حریر ہی معلوم ہوگا، اس لئے اس کو حریر کہا گیا۔[۵۸]

(۹۳) باب ماقیل فی قتال الروم

۲۹۲۴ ـ حدثني إسحاق بن يزيد الدمشقي :.................. أول جيش من امتي يغزون مدينة قيصر مغفور لهم)) ، فقلت : أنا فيهم يا رسول الله؟ قال : ((لا)) . [راجع : ۲۷۸۹]

یہ وہ روایت ہے جس کا پیچھے حوالہ دیا تھا "**أول جيش يغزون مدينة قيصر**" مدینہ قیصر سے قسطنطنیہ مراد ہے، پہلا لشکر یزید کی سربراہی میں تھا۔

(۹۵) باب قتال الترک

۲۹۲۷ ـ حدثنا أبو النعمان :.................. أن تقاتلوا قوما عراض الوجوه كأن وجوههم المجان المطرقة)). [انظر : ۳۵۹۲]

۲۹۲۸ ـ حدثني سعيد بن محمد :.................. كأن وجوههم المجان المطرقة . ولا تقوم الساعة حتى تقاتلوا قوما نعالهم الشعر)). [أنظر : ۲۹۲۹، ۳۵۸۷، ۳۵۹۰، ۳۵۹۱].[۵۹]

ایسی قوم سے تمہارا مقابلہ ہوگا جو بالوں کے جوتے پہنتے ہونگے، ان کے چہرے چوڑے ہونگے جیسے

---

[۵۸] تكملة فتح الملهم ، ج: ۴ ، ص: ۱۱۱ .

[۵۹] وفي صحيح مسلم ، كتاب الامارة ، باب الناس تبع لقريش والخلافة في قريش ، قم : ۳۳۹۰، وكتاب فضائل الصحابة ، باب خيار الناس ، رقم : ۴۵۸۸، وكتاب البر والصلة والآداب ، باب ذم ذي الوجهين وتحريم فعله ، رقم : ۴۷۱۵، وكتاب الفتن وشراط الساعة ، باب لاتقوم الساعة حتى يمر الرجل بقبر الرجل فيتمنى ، رقم: ۵۱۸۴، وسنن الترمذي ، كتاب البر والصله عن رسول الله ، باب ماجاء في ذي الوجهين ، رقم : ۱۹۴۸ ، وكتاب الفتن عن رسول الله ، باب ماجاء في قتال الترك ، رقم : ۲۱۴۱ ، وسنن أبي داؤد ، كتاب الملاحم ، باب في قتال الترك ، رقم : ۳۷۴۹، وكتاب الأدب ، باب في ذي الوجهين ، رقم: ۴۲۲۹، وسنن ابن ماجة ، كتاب الفتن ، باب الترك ، رقم : ۴۰۸۲، ومسند احمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند أبي هريرة ،رقم :۶۹۶۵، ۷۰۳۹، ۷۱۸۳، ۷۲۲۸، ۷۳۵۱، ۷۷۲۴، ۷۸۹۲، ۸۰۸۴، ۹۹۹۴ ،وموطأمالك ، كتاب الجامع ، باب ماجاء في اضاعة المال وذي الوجهين ، رقم : ۱۵۷۳ .

ڈھال کی طرح، جو بالکل سپاٹ ہو جاتی ہے، مینگول نسل کے لوگوں کے چہرے ایسے ہی ہوتے ہیں، ان کی ناکیں چھوٹی ہوں گی۔

(۹۷) باب من صف أصحابه عند الهزيمة، ونزل عن دابته واستنصر

۲۹۳۰ ـ حدثنا عمرو بن خالد الحراني :......... وخفافهم حسرا ليس بسلاح ....ثم صف اصحابه .[راجع :۲۸٦۴]

"وخفافهم حسرًا" ۔ "خف" بمعنی "خفيف" کے ہے یعنی جو ہلکے لوگ تھے، جن کے جسم ہلکے تھے اور جن کے پاس ہتھیار نہیں تھے، "حسّرًا" وہ ننگے سر تھے، ننگے سر سے مراد ہے کہ بغیر اسلحہ کے نہتے تھے، وہ جلدی سے بھاگ گئے تھے۔

(۹۸) باب الدعا على المشركين بالهزيمة والزلزلة

۲۹۳۵ ـ حدثنا سليمان بن حرب.........((فلم تسمعي ما قلت؟ وعليكم)).

[أنظر: ۶۰۲۴، ۶۰۳۰، ۶۲۵۶، ۶۳۹۵، ۶۴۰۱، ۶۹۲۷] [۶۰]

قال: "فلم تسمعي ماقلت ؟وعليكم" یعنی میں نے صرف وعلیکم کہا ہے، السلام علیکم کا لفظ استعمال نہیں کیا۔

(۱۰۱) باب دعوة اليهود والنصارىٰ، وعلى ما يقاتلون عليه، وما كتب النبي ﷺ إلى كسرىٰ و قيصر، والدعوة قبل القتال

یہاں مقصود یہ ہے کہ قتال سے پہلے دعوت دینا مسنون ہے۔

قتال سے پہلے دعوت دینا

چنانچہ فقہاء کرام نے اس مسئلہ میں کلام کیا ہے کہ ہر جہاد اور حملے سے پہلے دعوت دینا ضروری ہے یا نہیں؟

فقہاء کرام کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ قتال سے پہلے دعوت دینا ضروری ہے۔

---

[۶۰] وفي صحيح مسلم، كتاب السلام، باب النهي عن ابتداء أهل الكتاب بالسلام وكيف يرد، رقم: ۴۰۲۷، وسنن الترمذي، كتاب الاستيذان والآداب عن رسول الله، باب ماجاء في التسليم على أهل الذمة، رقم: ۲۶۲۵، وسنن ابن ماجة، كتاب الأدب، باب رد السلام على أهل الذمة، رقم: ۳۶۸۸، ومسند احمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث السيدة عائشة، رقم: ۲۲۹۶۱، ۲۳۷۰۶، ۲۳۸۸۰، ۲۴۴۵۲، ۲۴۷۳۵، وسنن الدارمي، كتاب الرقاق، باب في الرفق رقم: ۲۶۷۴.

لیکن جمہور فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ دعوت دینا ضروری نہیں، البتہ مستحب ہے۔

اور بعض فقہاء نے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر ان لوگوں کو پہلے دعوت پہنچ چکی ہے تب تو ان کو دعوت ضروری نہیں، لیکن اگر ان لوگوں کو پہلے دعوت نہیں پہنچی تو پھر قتال سے پہلے ان کو دعوت دینا ضروری اور واجب ہے، اس کے بغیر قتال جائز نہیں۔

جمہور فقہاء کا کہنا یہ ہے کہ اب دنیا کے تمام خطوں میں اسلام کی دعوت عام پہنچ چکی ہے کیونکہ دنیا کا کوئی آدمی اب ایسا نہیں رہا جو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین سے بحیثیت اجمالی واقف نہ ہو، لہٰذا اب کسی بھی جگہ جہاد سے پہلے دعوت دینا شرط نہیں البتہ مستحب ہے۔ لہٰذا دعوت دئے بغیر بھی اگر جہاد کیا جائے گا تو وہ جائز ہوگا، ناجائز نہیں ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو دعوت مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے وہ پہنچ چکی ہے۔ وہ یہ کہ غیر مسلموں کو یہ پتہ لگ جائے کہ حضور اقدس ﷺ اللہ کے رسول تھے اور آپ نے اقوام عالم کو توحید کی دعوت دی اور آپ ﷺ یہ دین اسلام لے کر تشریف لائے تھے۔ اگر اتنی بات بھی اجمالی طور پر پہنچ گئی ہیں تو دعوت کا فریضہ ادا ہوگیا۔ اب ہر ہر فرد کو الگ الگ دعوت دینا یہ کوئی فرض نہیں۔ آج کل یہ تصور مشکل ہے کہ کوئی فرد ایسا ہو جس کو اسلام کے بارے میں اجمالی دعوت نہ پہنچی ہو حتی کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابۂ کرام ﷺ کے زمانے میں بھی ایسا فرد نہیں تھا۔ اس لئے کہ یہ بات تو سب کو معلوم ہوگئی تھی کہ حضور اقدس ﷺ نے نبوت کا دعوی کیا ہے اور آپ ﷺ توحید کی دعوت دیتے ہیں۔ اتنی بات تو سب جانتے تھے اس لئے وہ لوگ معذور نہیں سمجھے جائیں گے۔ [۶۱]

(۱۰۲) باب دعاء النبی ﷺ إلى الإسلام و النبوة، وأن لا يتخذ بعضهم بعضا أربابا من دون الله.

وقوله تعالى: ﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتَابَ﴾ الآية [۶۲]

۲۹۴۰ ـ **شكرًا لما ابلاه الله.** اس پر شکر ادا کرنے کے لئے اللہ جل جلالہ نے جو انعام کیا یعنی اس نے کسریٰ کے لشکر کو بھگا دیا، شکست دی۔

۲۹۴۶ ـ حدثنا أبو اليمان: أخبرنا شعيب، عن الزهري: حدثني سعيد بن المسيب أن أبا هريرة رضي الله عنه قال: قال رسول الله ﷺ: ((أمرت أن أقاتل الناس حتى يقولوا: لا إله إلا الله، فمن قال: لا إله إلا الله، فقد عصم مني نفسه وماله إلا بحقه، وحسابه على

---

[۶۱] [آل عمران: ۷۹]

[۶۲] المغنی لابن قدامة، ج: ۸، ص: ۳۶۱.

الله)). رواه عمر وابن عمر عن النبي ﷺ . [۶۳، ۶۴]

یہ جزیرۂ عرب کے لوگوں سے متعلق ہے کہ میں اس وقت تک قتال کرتا رہوں گا جب تک کہ وہ "لا إله إلا الله" نہ کہیں۔ جزیرۂ عرب میں صرف اسلام یا سیف ہے، جزیہ نہیں ہے۔ یہ حکم اس اصول پر ہے کہ اللہ جل جلالہ نے جزیرۂ عرب کو مسلمانوں کا مستقر بنایا ہے۔ یہ مسلمانوں کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ اس لئے اب اس میں کسی غیر مسلم کو مستقل سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جزیرہ عرب میں کافروں سے جزیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ یہاں تو صرف دو چیزیں ہیں: اسلام یا تلوار۔ البتہ اگر عارضی طور پر تجارت یا ملازمت کے ارادے سے یہاں رہیں تو اس کی گنجائش ہے۔

(۱۰۹) باب: يقاتل من وراء الإمام ويتقى به

۲۹۵۶ ـ حدثنا أبو اليمان: أخبر شعيب قال. حدثنا أبو الزناد أن الأعرج حدثه أنه سمع أبا هريرة رضي الله عنه أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: ((نحن الآخرون السابقون)). [راجع: ۲۳۸]

۲۹۵۷ ـ وبهذا الإسناد: ((من أطاعني فقد أطاع الله ومن عصاني فقد عصى الله. ومن يطع الأمير فقد أطاعني، ومن يعص الأمير فقد عصاني. وإنما الإمام جنة يقاتل من ورائه ويتقى به. فإن أمر بتقوى الله وعدل فإن له بذلك أجرا. وإن قال بغيره فإن عليه منه)). [أنظر: ۷۱۳۷] [۶۵]

---

[۶۳] لايوجد للحديث مكررات.

[۶۴] وفي صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الامر بقتال الناس حتى يقولوا لااله الا الله محمد رسول الله، رقم: ۳۰، وسنن الترمذي، كتاب الايمان عن رسول الله، باب ماجاء أمرت أن اقاتل الناس حتى يقولوا لااله الا الله محمد رسول الله، رقم: ۲۵۳۱، وسنن النسائي، كتاب الجهاد، باب وجوب الجهاد، رقم: ۳۰۳۹، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب على ما يقاتل المشركون، رقم: ۲۲۷۰، وسنن ابن ماجة، كتاب المقدمة، باب في الايمان، رقم: ۷۰، وكتاب الفتن، باب الكف عمن قال الااله الا الله، رقم: ۳۹۱۷، ومسند احمد، مسند العشرة المبشرين بالجنة، باب مسند أبي بكر الصديق، رقم: ۶۴، وباقي مسند المكثرين، باب باقي المسند السابق، رقم: ۸۵۵۰، ۹۱۰۹، ۱۰۱۱۴، ۱۰۴۲۰.

[۶۵] وفي صحيح مسلم، كتاب الامارة، باب وجوب طاعة الامراء في غير معصية وتحريمها في المعصية، رقم: ۳۴۱۷، وسنن النسائي، كتاب البيعة، باب الترغيب في طاعة الامام، رقم: ۴۱۲۲، وكتاب الاستعاذة من فتنة المحيا، رقم: ۵۴۱۵، وسنن ابن ماجة، كتاب المقدمة، باب اتباع سنة رسول الله، رقم: ۳، وكتاب الجهاد، باب طاعة الامام، رقم: ۲۸۵۰، ومسند احمد، باقي مسند المكثرين، باب مسند أبي هريرة، رقم: ۷۰۳۲، ۷۱۲۵، ۷۳۳۵، ۷۷۸۶، ۸۱۴۹، ۸۳۷۳، ۸۷۵۴، ۹۰۱۶، ۹۶۵۵، ۹۷۰۸، ۱۰۲۲۶، ۱۰۳۵۹.

یعنی ہم آخری زمانہ میں آئے ہیں "**نحن الآخرون السابقون**" لیکن یہ امت فضیلت کے اعتبار سے دوسری امتوں پر سبقت لے جائے گی۔

اور فرمایا "**انما الإمام جنة**" امام ایک ڈھال ہے، جس کے پیچھے سے لوگ قتال کرتے ہیں اور اس سے بچاؤ حاصل کرتے ہیں، یعنی امام مسلمانوں کے لئے ایک ڈھال کی حیثیت رکھتا ہے، جس طرح آدمی ڈھال کے ذریعہ کفار کے حملوں سے بچتا ہے، اسی طرح امام کے ذریعہ بچتا ہے۔ تو امام کی بڑی قدر و منزلت ہے اور اس کی اطاعت واجب ہے۔

(۱۱۰) باب البيعة في الحرب على أن لا يفروا

وقال بعضهم : على الموت ؛ لقوله تعالى : ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ......﴾ الآية [۶۶]

۲۹۵۸ ـ حدثنا موسى بن إسماعيل : حدثنا جويرية ، عن نافع قال : قال إبن عمر رضي الله عنهما : رجعنا من العام المقبل فمااجتمع منا اثنان على الشجرة التي بايعنا تحتها كانت رحمة من الله . فسألنا نافعا : على أي شيء بايعهم ، على الموت؟ قال : لا ، بايعهم على الصبر . [۶۷،۶۸]

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حدیبیہ سے اگلے سال جب ہم دوبارہ عمرۂ قضاء کے لئے آئے تو ہم میں سے دو آدمی بھی اس درخت کے نیچے جمع نہیں ہوئے جس کے نیچے آپ ﷺ نے پچھلے سال بیعت لی تھی۔ یعنی نبی کریم ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر درخت کے نیچے جو بیعت لی تھی وہ کون سا درخت تھا؟ اس کے بارے میں دو آدمیوں کی رائے بھی متفق نہیں ہوئی کہ کوئی کہہ رہا تھا یہ ہے، متفق علیہ طور پر کسی درخت کی تعیین نہیں ہوئی۔

"**كانت رحمة من الله**" ہمیں اس درخت کا پتہ نہ چل سکا، یہ بھی اللہ ﷻ کی طرف سے ایک رحمت تھی، اس واسطے کہ اگر لوگوں کو پتہ چلتا تو لوگ وہاں پر کفر و شرک کے کام کرتے، تو اللہ ﷻ نے ہم سے اس کا علم ہٹا لیا۔

اس کے دوسرا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شجرہ اللہ ﷻ کی طرف سے رحمت تھا، اس واسطے ہم اس کو تلاش کر رہے تھے، لیکن اس کی تعیین پر ہماری اتفاق رائے نہ ہوسکی۔

---

۶۶ [الفتح:۱۸]

۶۷ لايوجد للحديث مكررات.

۶۸ وأنفرد به البخاري.

اس سے پتہ چلا کہ روایت میں جو آتا ہے کہ حضرت فاروق اعظم ﷺ نے شجرۂ رضوان کو کٹوا دیا تھا، درحقیقت اس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کو اصل شجرہ کا پتہ نہیں تھا کہ کون سا شجرہ ہے، لیکن ویسے ہی کسی نے کہہ دیا کہ یہ رضوان کا شجرہ ہے، لوگ اس کو دیکھتے اور اس سے تبرک حاصل کرتے تھے، حضرت فاروق اعظم ﷺ نے اس کو کٹوا دیا۔ اس لئے اس سے یہ استدلال کرنا کہ تبرک بآثار الصلحاء ناجائز اور حرام ہے، یہ استدلال درست نہیں ہے۔[۲۹]

۲۹۵۹ ـ حدثنا موسى : حدثنا وهيب :حدثنا عمرو بن يحيى ، عن عباد بن تميم، عن عبد الله بن زيد ﷺ قال : لما كان زمن الحرة أتاه آت فقال له : إن ابن حنظلة يبايع الناس على الموت . فقال : لا أبايع على هذا أحدا بعد رسول الله ﷺ.[أنظر : ۴۱۶۷]

عبداللہ بن زید ﷺ فرماتے ہیں کہ جب حرہ کا وقت آیا، یعنی وہ جس میں مدینہ منورہ سے یزید کے خلاف لشکر تیار کیا گیا تھا ان کے پاس ایک آنے والا آیا اور آکر کہا کہ عبداللہ بن حنظلہ لوگوں سے موت پر بیعت لے رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نبی کریم ﷺ کے بعد کسی کے ہاتھ پر موت پر بیعت نہیں کروں گا۔

اس سے پتہ چلا کہ نبی کریم ﷺ کے عہد میں نبی کریم ﷺ کے ہاتھ پر کبھی موت پر بیعت لی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ مرجائیں گے یا فتح یاب ہوں گے اور یہ بھی ہوا کہ صبر پر بیعت لی گئی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔ پیچھے روایت میں آیا ہے کہ صبر پر بیعت لی گئی، حدیبیہ کے موقع پر موت پر بیعت نہیں لی گئی۔ تو یہ مختلف حالات پر محمول ہے کبھی آپ ﷺ نے موت پر بیعت لی، کبھی صبر پر بیعت لی۔

(۱۱۱) باب عزم الإمام على الناس فيما يطيقون

۲۹۶۴ ـ حدثنا عثمان بن أبي شيبة : حدثنا جرير، عن منصور ، عن أبي وائل قال : قال عبدالله ﷺ : لقد أتاني اليوم رجل فسألني عن أمر ما دريت ما أرد عليه ، فقال : أرأيت رجلا مؤديا نشيطا يخرج مع أمرائنا في المغازي ، فيعزم علينا في أشياء لا نحصيها؟ فقلت له : والله ما أدرى ما أقول لک إلا أنا كنا مع النبي ﷺ فعسى أن لا يعزم علينا في أمر إلا مرة حتى نفعله ، وإن أحدكم لن يزال بخير ما اتقى الله . وإذا شک في نفسه شيء سأل رجلا فشفاه منه وأوشک أن لا تجدوه ، والذى لا إله إلا هو ما أذكر ما غير من الدنيا إلا كالثغب شرب صفوه وبقى كدره.

ابووائل روایت کرتے ہیں کہ ہم سے ابن مسعود ﷺ نے ایک مرتبہ کہا "**لقد أتاني اليوم رجل**" آج

[۲۹] تكلمة فتح الملهم ، ج: ۳ ، ص: ۳۶۳.

میرے پاس ایک شخص آیا تھا، اس نے ایک ایسے معاملہ میں مجھ سے سوال کیا کہ مجھے پتہ نہیں چلا، میں کیا جواب دوں۔

اس نے یہ سوال کیا کہ ایک شخص "**مـؤدی**" ہے "**مؤدی**" کے معنی ہیں قوی، صاحب سلاح، مسلح آدمی، "**نشيطاً**" یعنی پھرتیلا ہے۔ "**يخرج مع أمرائنا**" امراء کے ساتھ جہاد میں نکلتا ہے، تو ہمارے اوپر قسم دے کر وہ لازم کرتا ہے جو ہمارے بس سے باہر ہوتا ہے، یعنی امیر ہمیں پختہ طریقہ سے حکم دیتا ہے کہ یہ کرنا ہی ہوگا، اور وہ چیزیں ایسی ہیں کہ ہم اس کی استطاعت نہیں رکھتے۔ بعض نے "**لا نحصيها**" کے معنی یہ بتائے ہیں کہ ہمیں معلوم نہیں ہوتا اور ہم ان کے حکم سے ناواقف ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں یہ حکم طاعت ہے یا معصیت ہے، تو ہم کیا کریں؟ یہ سوال کیا۔

"**فقلت له: و الله ما أدرى ما أقول لک**" میں نے کہا: کہ مجھے نہیں معلوم کہ میں اس کا کیا جواب دوں۔

ایک طرف تو یہ ہے کہ ایسی بات کا حکم دیتا ہے جو ہماری قدرت سے باہر ہے "**لا يكلف الله نفساً إلا وسعها**" **دوسری طرف** امیر کی اطاعت کا بھی حکم ہے، یا یوں کہیں کہ ایک طرف یہ پتہ نہیں کہ وہ معصیت ہے یا طاعت ہے، اور دوسری طرف امیر کی اطاعت کا حکم ہے، تو میں کیا جواب دوں؟ مگر میں اپنی حالت بتاتا ہوں کہ ہم نبی کریم ﷺ کے ساتھ ہوتے تھے، آپ ﷺ نے ہمیں کبھی عزم کر کے حکم نہیں دیا، مگر ایک مرتبہ۔

"**وإن أحدكم**" جب تک تمہارے اندر تقویٰ ہو تو تم خیر میں رہو گے۔ "**وإذا شک في نفسه**" اور جب دل میں شک پیدا ہو جائے کہ یہ چیز جائز ہے یا ناجائز ہے، تو پھر کسی سے پوچھ لو وہ تمہیں بتادے۔

مطلب یہ ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو کہ امام ایسی بات کا کہہ رہے ہیں، جس کے بارے میں معلوم نہیں کہ حلال ہے یا حرام ہے، تو ایسی صورت میں کسی جاننے والے سے پوچھ کر تشفی حاصل کرلیں، پتہ چل جائے گا کہ حلال ہے یا حرام ہے، اس کے مطابق عمل کرلیں۔

"**وأوشک أن لا تجدوه**" اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ وہ زمانہ قریب ہے جب تم وہ آدمی نہیں پاؤ گے جس سے سوال کیا جاسکے کہ حلال ہے یا حرام ہے، کیونکہ رفتہ رفتہ علم اٹھ جائے گا۔

"**والذي لا إله إلا هو**" قسم اللہ کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں، "**ما اذكر**" جو کچھ دنیا گزر گئی ہے میں اس کو یاد نہیں کرتا، مگر ایسا سمجھتا ہوں جیسے کوئی تالاب ہو، "**شرب**" جس کا بہترین اور صاف پانی پی لیا گیا اور گدلا پانی رہ گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اچھے اچھے لوگ دنیا سے اُٹھ گئے ہیں، یہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی شہادت سے پہلے وفات پاچکے تھے، یعنی فتنوں کا دور بھی شروع نہیں ہوا تھا، اس وقت کی بات کر رہے ہیں، کہ گویا صاف چلا گیا اور کدر رہ باقی رہ گیا، تو اب کیا ہے؟

(۱۱۳) باب استئذان الرجل الإمام

لقوله : ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَإِذَا كَانُوا مَعَهُ عَلٰى أَمْرٍ جَامِعٍ لَمْ يَذْهَبُوا حَتّٰى يَسْتَأْذِنُوْهُ إِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَأْذِنُوْنَكَ﴾ إلى آخر الآية [۷۰]

۲۹۶۷ ـ حدثنا إسحاق بن إبراهيم:...... إني عروس .... لانرى به بأسا . [راجع: ۴۴۳] .

یارسول اللہ (ﷺ) "إنی عروس" کہا میری نئی نئی شادی ہوئی ہے، بس جلدی جانا چاہتا ہوں، اس میں یہ ہے کہ جب کوئی جائے تو امیر سے اجازت لے کر جائے۔

(۱۱۴) باب من غزا وهو حديث عهد بعرسه،

"فيه جابر عن النبي ﷺ".

یہ پہلا باب قائم کیا ہے کہ جس کی نئی نئی شادی ہو اور وہ جہاد پر جائے تو کہتے ہیں کہ جائز ہے، جیسا کہ حضرت جابر ؓ کی حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نئی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ جہاد پر چلے گئے تھے۔ آگے دوسرا باب قائم کیا ہے۔

(۱۱۵) باب من اختار الغزو بعد البناء،

"فيه أبوهريرة عن النبي ﷺ".

جس نے بناء کے بعد جہاد کو پسند کیا، یعنی ایک شخص کا نکاح ہو چکا ہے، اور ابھی رخصتی نہیں ہوئی، اس نے بناء نہیں کی تو اس کے لئے افضل یہ ہے کہ پہلے بناء کرلے پھر جہاد میں جائے، بناء سے پہلے جہاد میں نہ جائے۔ اس میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ابو ہریرہ ؓ کی ایک حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے، جو آگے دوسری جگہ نکالی ہے، لیکن یہاں محض اس کی طرف اشارہ کردیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک نبی نے جہاد کیا اور بظاہر وہ حضرت یوشع علیہ السلام تھے تو فرمایا کہ ہمارے ساتھ کوئی ایسا شخص نہ آئے جس نے نکاح کیا ہو اور ابھی اس کی رخصتی نہ ہوئی ہو۔ [۷۱]

معلوم ہوا کہ افضل یہی ہے کہ پہلے بناء کرلے جیسے نماز کے لئے یہ ہوتا ہے کہ پہلے کھانا کھالے تاکہ ذہن کھانے کی طرف نہ لگا رہے، اور آدمی اطمینان سے نماز پڑھ لے، ایسے ہی اگر جہاد میں جانا ہے تو پہلے ایک مرتبہ بناء کرلے پھر جائے، تاکہ اس کا ذہن اس طرف مشغول نہ رہے۔

---

۷۰ [النور : ۶۲]

۷۱ صحيح بخاری ، كتاب فرض الخمس، باب قول النبي احلت لكم الغنائم ، رقم : ۳۱۲۴ .

(۱۱۸) باب الخروج فی الفزع وحده

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے **"وان وجدناه لبحرًا"** والی حدیث کئی جگہ پر نکالی ہے اور ہر جگہ نیا ترجمۃ الباب قائم کیا ہے، اور دوبارہ حدیث نہیں لائے ۔ وہ چاہتے تھے کہ ہر جگہ مختلف سندوں سے حدیث لاتے رہیں، لیکن ساری سندیں ختم ہوگئیں تو پھر ترجمۃ الباب قائم کردیا اور حدیث نہیں لائے۔

(۱۱۹) باب الجعائل والحملان فی السبیل،

"وقال مجاهد : قلت لابن عمر : الغزو ، قال : إني أحب أن أعينك بطائفة من مالي ، قلت : أوسع الله علي ، قال : إن غناك لك ، وإني أحب أن يكون من مالي في هذا الوجه. وقال عمر: إن ناسا يأخذون من هذا المال ليجاهدوا ثم لايجاهدون، فمن فعل فنحن أحق بماله حتى نأخذ منه ما أخذ. وقال طاؤس ومجاهد : إذا دفع إليک شیء تخرج به في سبيل الله فاصنع به ماشئت وضعه عند أهلک".

حدیث باب کی تشریح

یہاں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص جہاد میں شامل ہونا چاہتا ہے اور اپنے ساتھ کسی کو کرایہ پر رکھتا ہے تا کہ اُس سے جہاد کا کام کرائے، مثلاً ایک شخص کا جہاد میں شامل ہونے کا دل بھی چاہتا ہے، فضیلت بھی حاصل کرنا چاہتا ہے اور مشقت سے بھی گھبراتا ہے تو ایک آدمی کو اس نے ساتھ رکھ لیا کہ بھائی میں تمہیں تنخواہ دوں گا تم میرے ساتھ رہنا اور جب قلعہ پر چڑھنے کا وقت آیا تو اُس کو کہا کہ میری جگہ تو چڑھ جا، اس کو **"جعیل"** کہتے ہیں جو **"جُعل"** سے نکلا ہے، **"جُعل"** اس مزدوری کو کہتے ہیں جو اس کو دی جائے، اور **"جعیل"** مزدور کو کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جہاد کی فضیلت بھی حاصل ہو جائے اور مشقت بھی زیادہ نہ اُٹھانی پڑے، اس کو **"جعیل"** کہتے ہیں، اس کا کیا حکم ہے؟

"والحملان فی السبیل"۔ "حملان" کا معنی یہ ہے کہ ایک شخص خود جہاد نہیں کرنا چاہتا، وہ اپنا گھوڑا کسی کو دیدیتا ہے کہ کم از کم اس طرح میں حصہ لے لوں، اب اگر وہ ویسے ہی ہبۃً دیدیتا ہے یا عاریۃً تو ٹھیک ہے اور اگر پیسے لے کر دیتا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جہاں تک پہلی بات یعنی **"جُعیل"** رکھنا تو اس کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ایسا کرنا مکروہ ہے، اس لئے کہ جب جہاد فرض عین نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے، اگر ہمت اور طاقت ہے تو کرو، اگر نہیں کر سکتے تو مزدور کے ذریعہ کام

کرانے کی کوئی ضرورت نہیں، تو اس صورت کو مکروہ کہا گیا ہے۔ حملان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اگر اپنی طرف سے کسی مجاہد کو عاریۃً سواری دیدیں تو یہ جائز اور باعثِ فضیلت ہے، لیکن اگر اس کے اوپر پیسے وصول کرے تو مجاہد سے پیسے وصول کرنا کراہت سے خالی نہیں ہے، البتہ اگر کوئی کرلے تو جائز ہے، اجارہ ہے، حرام نہیں ہے۔

ایک اختلافی مسئلہ

اگر کسی شخص نے کسی مجاہد کو کوئی سواری وغیرہ دی اور کہا کہ اس سے جہاد کرو۔

سوال یہ ہے کہ آیا یہ سواری صرف جہاد میں استعمال کرنے کے لئے ہوگی یا وہ اس کا مالک بن گیا کہ جہاں چاہے استعمال کرے، اس میں کلام ہوا ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا رجحان اس طرف معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ دے دیا تو مالک بن گیا، اب مالک بننے کے بعد چاہے جہاد کرے یا ذاتی استعمال میں لائے۔

اس پر استدلال کیا فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے کہ انہوں نے عرض کیا میں نے ایک گھوڑا اللہ جل جلالہ کے راستہ میں کسی مجاہد کو دے دیا تھا، بعد میں دیکھا کہ وہ بازار میں بک رہا ہے۔ تو انہوں نے خریدنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اس سے استدلال یہ کررہے ہیں کہ اگر تملیک نہیں ہوتی تو بازار میں بیچنا جائز نہ ہوتا۔ تو اس بیع کو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نافذ قرار دیا، معلوم یہ ہوا کہ مجاہد کو جب کوئی چیز دی جاتی ہے تو وہ محض جہاد میں استعمال کرنے کے لئے نہیں ہے بلکہ تملیک ہوتی ہے، وہ جہاں چاہے مصرف میں لائے۔

حنفیہ کے نزدیک اس کے دار و مدار ان الفاظ پر ہیں جو دیتے وقت استعمال کیے گئے۔ اگر دیتے وقت نیت اور الفاظ عاریت کے تھے اور جہاد ہی میں استعمال کرنے کے لئے دئے گئے تھے تو اس کے لئے صرف جہاد ہی میں استعمال کرنا جائز ہوگا، کسی اور مصرف میں استعمال کرنا جائز نہیں ہوگا۔

اور اگر دیتے وقت ایسے الفاظ استعمال کئے یا جس ماحول میں دئے گئے اس سے ہبہ یا صدقہ سمجھ میں آرہا ہے تو اس صورت میں وہ اس کا مالک ہوگا اور جہاں چاہے استعمال کرسکے گا۔ اس لئے اس پر کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بتایا جا سکتا بلکہ حالات پر منحصر ہے۔

"وقال مجاهد: قلت لا بن عمر" حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ میں نے عبد اللہ بن عمرؓ سے کہا کہ آپ میرے ساتھ جہاد پر چلئے۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ اپنے مال سے کچھ تمہاری مدد کروں یعنی خود جہاد میں نہیں جا سکتا لیکن جہاد میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ تو حضرت مجاہد نے کہا کہ اللہ جل جلالہ نے مجھے بہت وسعت دی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ تمہارا غنا تمہارے ساتھ ہے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے مال کا بھی کچھ حصہ لگ جائے۔ تو یہاں پر عبد اللہ بن عمرؓ نے مجاہد کو پیسے دینے کو فضیلت کا سبب قرار دیا ہے۔

"وقال عمر : إن ناسا يأخذون" حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بعض لوگ ہم سے جہاد کے لئے مال لیتے ہیں اور پھر جہاد نہیں کرتے۔ تو جو ایسا کریں گے ہم اس کے لئے مواخذہ کا حق دار ہوں گے، یہاں تک کہ ان سے لے لیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب پیسے جہاد ہی کے لئے دیئے گئے ہوں، پھر دوسرے کام کے لئے استعمال کرنا جائز نہیں ہے۔

"وقال طاؤس ومجاهد : إذا دفع إليك" طاؤس اور مجاہد نے کہا کہ جب تمہیں کوئی چیز اس غرض کے لئے دی گئی ہو کہ اس کو لے کر اللہ جل جلالہ کے راستہ میں نکلو تو وہ تمہاری ہوگئی، تو تم جو چاہو کرو اور چاہو تو اپنے گھر میں رکھو۔

یہ اس صورت میں ہے جب کوئی چیز تملیکاً دی گئی ہو۔ لیکن جب کوئی جہاد کے لئے پیسے دے تو اس کو جہاد ہی میں صرف کرنا ضروری ہے اور اگر کوئی جہاد کے سبب سے پیسے دے کہ تم مجاہد ہو، جہاد کر رہے ہو۔ اس سبب سے میں تمہیں ہدیہ دیتا ہوں تو اس صورت میں وہ تملیک ہوگی، پھر وہ جہاں چاہے استعمال کرے، لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے، دونوں باتیں اپنے اپنے حالات پر محمول ہیں۔

(۱۲۰) باب الأجير

"وقال الحسن وابن سيرين: يقسم للأجير من المغنم. وأخذ عطية بن قيس فرسا على النصف فبلغ سهم الفرس أربعمائة دينار فأخذ مائتين وأعطى صاحبه مائتين".

یہ اجیر کے بارے میں باب قائم کیا ہے کہ جہاد میں جو اجیر ہے اس کو مال غنیمت میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

اجیر کی اقسام

ایک "اجیر" وہ ہے جس کو کوئی مجاہد اپنے ساتھ اپنی یا دوسرے لوگوں کی خدمت کے لئے لے گیا، اس اجیر کا مقصد قتال پر اجرت دینا نہیں ہے، بلکہ دوسروں کی خدمت پر اجرت دینا ہے۔ ایسے اجیر کو مال غنیمت سے حصہ ملے گا یا نہیں؟

اختلاف فقہاء

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہے کہ اس کو حصہ نہیں ملے گا۔ امام اوزاعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔ دوسرے فقہاء فرماتے ہیں کہ اس کو حصہ ملے گا۔ بعض کہتے ہیں کہ اگر قتال میں حصہ لیا تو ملے گا، ورنہ نہیں ملے گا۔ اور حنفیہ کا بھی یہی مسلک ہے۔

اجیر کی دوسری قسم

دوسرا اجیر وہ ہے جس کو قتال ہی کے لئے اجرت پر رکھا گیا کہ تم لڑو، تمہیں پیسے ملیں گے۔
اس کے بارے میں اختلاف ہے۔

اختلاف فقہاء

جمہور کا قول

جمہور کا کہنا یہ ہے کہ اس کو مال غنیمت میں سے حصہ ملے گا۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ اس کو حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ اس کا لڑنا بھی دوسری ملازمتوں کی طرح ایک ملازمت ہے۔ اور اس کی دلیل مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی روایت ہے کہ انہوں نے ایک صاحب کو جہاد کی دعوت دی۔ انہوں نے کہا کہ میرے اہل وعیال ہیں، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے انہیں تین دینار اُجرت کے طور پر دیئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: **"هذه الثلاثة دنانير حظه ونصيبه من غزوته في أمر دنياه وآخرته"** [۴۲]

ایک اثر روایت کیا کہ عطیہ بن قیس نے ایک گھوڑا لیا کہ میں اس کو جہاد میں استعمال کروں گا اور اس کے حصہ میں جو کچھ مال غنیمت آئے گا، وہ ہمارے درمیان تقسیم ہوگا۔

"فبلغ سهم الفرس" تو فرس کا حصہ چار سو دینار تک پہنچا، جس میں سے دو سو انہوں نے خود رکھے اور دو سو صاحب فرس کو دے۔

حنفیہ کا قول

حنفیہ کے ہاں یہ معاملہ درست نہیں کہ کسی سے کہا جائے تم مجھے گھوڑا دیدو، میں جہاد میں لے جاؤں گا اور جو مال غنیمت آئے گا وہ آدھا آدھا تقسیم کریں گے۔ یہ اجارہ بھی نہیں ہے اور مضاربت بھی نہیں ہے۔

اگر اجارہ ہوتا تو اس میں اجرت متعین ہونی چاہئے تھی اور یہاں پتہ نہیں کہ اجرت ملے گی یا نہیں ملے گی اور اگر مضاربت ہوتی تو مضاربت میں تجارت ہونی چاہئے، یہاں اس میں تجارت بھی نہیں ہے۔ البتہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک اس کو مضاربت کے مسئلہ پر تخریج کیا جاسکتا ہے۔ [۴۳]

سوال: مجاہدین کو اگر تنظیم کی طرف سے جہاد کی اجرت ملتی ہے تو کیا ان کو مال غنیمت میں حصہ ملے گا یا نہیں؟

جواب: اجرت کسی کی طرف سے بھی ہو۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان کے لئے مال غنیمت میں حصہ نہیں ہے۔

---

۴۲ مصنف عبدالرزاق، حدیث ۹۴۵۷

۴۳ عمدة القاری، ج: ۱۰، ص: ۲۹۰.

(۱۲۹) باب کراهية السفر بالمصاحف إلى أرض العدوّ،

”وكذلك يروى عن محمد بن بشر، عن عبيد الله، عن نافع، عن ابن عمر عن النبى ﷺ ۔ وتابعه ابن إسحاق، عن نافع، عن ابن عمر عن النبى ﷺ. وقد سافر النبى ﷺ وأصحابه في أرض العدوّ وهم يعلمون القرآن“.

نبی کریم ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کے ساتھ دشمن کی سرزمین میں سفر کیا جبکہ صحابہ کرام ؓ قرآن کی تعلیم دیتے تھے۔ معلوم ہوا کہ ارض عدو میں قرآن کریم کا لے جانا منع نہیں ہے، لیکن مصاحف کے لے جانے میں اس وقت کراہت ہے، جیسا کہ آگے حدیث میں آرہا ہے جب وہ مصاحف کفار کے ہاتھ لگیں گے اور وہ اس کی بے حرمتی کریں گے اور جہاں یہ اندیشہ نہ ہو وہاں پر لے جانا جائز ہے۔

(۱۳۳) باب التكبير إذا علا شرفا

۲۹۹۴۔ حدثنا محمد بن بشار: حدثنا ابن أبى عدى، عن شعبة، عن حصين، عن سالم، عن جابر ؓ قال: كنا إذا صعدنا كبرنا، وإذا تصوّبْن سبَّحْنا. [راجع: ۲۹۹۳].

۲۹۹۵ ۔ حدثنا عبد الله قال: حدثني عبد العزيز بن أبى سلمة، عن صالح بن كيسان، عن سالم بن عبد الله، عن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما قال: ((كان النبى ﷺ إذا قفل من الحج أو العمرة، ولا أعلمه إلا قال: الغزو، يقول: كلما أوفى على ثنية أو فدفد كبر ثلاثا ثم قال: لا إله إلا الله وحده لا شريك له، له الملك وله الحمد، وهو على كل شيء قدير. آيبون تائبون عابدون ساجدون لربنا حامدون، صدق الله وعده، ونصر عبده، وهزم الا حزاب وحده.)). قال صالح: فقلت له: ألم يقل عبد الله: إن شاء الله؟ قال: لا. [راجع: ۱۷۹۷]

بعض حضرات کا خیال ہے کہ ”آیبون تائبون“ کے ساتھ ان شاء اللہ کہنا چاہئے، انہوں نے پوچھا کہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے ان شاء اللہ کہا تھا؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ معلوم ہوا کہ روایت بغیر ان شاء اللہ کے ہے۔

سوال: نفس جہاد تو قطعی الثبوت ہے، لیکن آج کل دنیا کے مختلف خطوں مثلاً کشمیر، بوسنیا اور افغانستان و غیرہ میں جو جہاد ہو رہا ہے وہ بھی قطعی الثبوت ہے یا مجتہد فیہ ہے؟

جواب: نفس جہاد تو فرض ہے، اس کا انکار جائز نہیں، لیکن اگر کسی خاص جگہ کوئی جہاد ہو رہا ہے تو اس میں آراء مختلف ہوسکتی ہیں کہ کوئی شخص اس کو جہاد سمجھے اور کوئی نہ سمجھے، اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔

(۱۳۵) باب السیر وحده

۲۹۹۷ ۔ حدثنا الحمیدی: حدثنا سفیان: حدثنی محمد بن المنکدر قال: سمعت جابر بن عبد اللّٰه رضی اللّٰه عنهما یقول: ندب النبی ﷺ الناس یوم الخندق، فانتدب الزبیر. ثم ندبهم فانتدب الزبیر. ثم ندبهم فانتدب الزبیر، قال النبی ﷺ :((إن لکل نبی حواریا و حواری الزبیر)). قال سفیان : الحواری الناصر. [راجع : ۲۸۴۶]

۲۹۹۸ ۔ حدثنا أبو الولید: حدثنا عاصم بن محمد قال: حدثنی أبی، عن ابن عمر رضی اللّٰه عنهما عن النبی ﷺ .ح

حدثنا أبو نعیم: حدثنا عاصم بن محمد بن زید بن عبد اللّٰه بن عمر، عن أبیه، عن ابن عمر عن النبی ﷺ قال: ((لو یعلم الناس ما فی الوحدة ما أعلم ما سار راکب بلیل وحده)) . [۴۷، ۵۷]

حدیث کا مطلب

اگر لوگوں کو تنہا سفر کرنے کے نقصانات اور اس کے بارے میں وہ باتیں معلوم ہوں جو مجھے معلوم ہیں تو کوئی سوار تنہا سفر نہ کرے اور پہلی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے دشمن کی خبر لانے کے لئے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو تنہا روانہ فرمایا۔

دونوں حدیثیں ایک ہی باب میں روایت کرنے سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ بعض حالات میں تنہا جانا جائز ہے اور بعض حالات میں جائز نہیں ہے۔ جہاں دشمن کے حالات معلوم کرنے کی ضرورت ہو اور ساتھ خودکشی جیسا اندیشہ نہ ہو تو پھر جائز ہے اور جہاں حاجت نہ ہو یا ہلاکت کا سخت اندیشہ ہو تو پھر ایسی صورت میں تنہا جانا جائز نہیں ہے۔ [۶۷]

---

[۴۷] لایوجد للحدیث مکررات.

[۵۷] وسنن الترمذی ، کتاب الجهاد عن رسول اللّٰه ، باب ماجاء فی کراهیه أن یسافر الرجل وحده ، رقم : ۱۵۹۶ ، وسنن ابن ماجة ، کتاب الأدب ، باب کراهیه الوحدة ، رقم : ۳۷۵۸، ومسند احمد ، مسند المکثرین من الصحابة ، باب مسند عبداللّٰه بن عمر الخطاب ، رقم : ۴۵۱۸، ۵۰۰۱، ۵۳۲۴، ۵۳۹۲، ۵۶۴۰، ۵۷۴۲، وسنن الدارمی ، کتاب الاستئذان ، باب ان الواحد فی السفر شیطان ، رقم : ۲۵۶۳ .

[۶۷] عمدة القاری ، ج: ۱۰ ، ص: ۳۱۲.

(۱۳۸) باب الجهاد بإذن الأبوين

۳۰۰۴ ـ حدثنا آدم: حدثنا شعبة: حدثنا حبيب بن أبي ثابت قال: سمعت أبا العباس الشاعر وكان لا يتهم في حديثه قال: سمعت عبد الله بن عمرو رضي الله عنهما يقول: جاء رجل إلى النبي ﷺ يستأذنه في الجهاد فقال: ((أحي والداك؟)) قال: نعم، قال: ((ففيهما فجاهد)). [أنظر: ۵۹۷۲]. ۷۷

امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا کہ جہاد کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے۔

جہاد وحصول علم کے لئے والدین کی اجازت

یہی حکم تعلیم کا بھی ہے کہ جتنا علم حاصل کرنا ضروری، واجب اور فرض عین ہے، اس میں تو والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے، لیکن اس سے زیادہ علم کے حصول کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے، والدین کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے۔

اُصولی بات

ہروہ کام جو فرض کفایہ ہے اس کے لئے والدین کی اجازت ضروری ہے اور جو فرض عین ہے اس کے لئے والدین کی اجازت ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ جب جہاد نفیر عام ہو جائے تو پھر اس میں والدین کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور جہاں نفیر عام نہیں ہے بلکہ فرض کفایہ ہے، وہاں پر والدین کی اجازت ضروری ہے، اس لئے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا **"ففيهما فجاهد"**۔

میں بار بار کہتا رہتا ہوں کہ شریعت کے احکام ہر موقع پر موقع کی مناسبت سے ہوتے ہیں، کسی شخص کے والد یا والدین بیمار ہیں اور ان کو خدمت کی ضرورت ہے، تو ایسی صورت میں ان کو چھوڑ کر جانا چاہے، جہاد کے لئے ہو، چاہے دعوت وتبلیغ کے لئے ہو یا تعلیم کے لئے ہو، سب ناجائز ہے، کیونکہ ان کو خدمت کی ضرورت ہے، اس لئے کہ اس وقت تقاضا یہ ہے کہ ان کی خدمت کی جائے۔ بہت سے والدین اجازت دے دیتے ہیں اور اگر

۷۷ وفي صحيح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب بر الوالدين وأنهما أحق به، رقم: ۴۶۲۴، وسنن الترمذي، كتاب الجهاد عن رسول الله، باب ماجاء فيمن خرج في الغزو وترك أبويه، رقم: ۱۵۹۴، وسنن النسائي، كتاب الجهاد، باب الرخصة في التخلف عن له والدان، رقم: ۳۰۵۲، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب الرجل يغزو وله ابوان، رقم: ۲۱۷۲، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب مسند عبدالله بن عمرو بن العاص، رقم: ۶۲۳۹، ۶۲۵۷، ۶۴۷۴، ۶۵۲۰، ۶۵۳۹، ۶۵۶۲، ۶۵۷۳، ۶۷۶۵.

اجازت نہ دیں تو انسان کے لئے جانا جائز نہیں ہے اور اگر اس اجازت نہ دینے کے نتیجے میں جہاد بالکل ہی متروک ہو جائے، تو پھر وہ فرض عین ہو جائے گا اور سب گناہ گار ہوں گے، اس کا حکم الگ ہے۔لیکن جہاں کچھ لوگ جا رہے ہوں تو فرض کفایہ چونکہ ادا ہو رہا ہے اس لئے اس صورت میں والدین کی اجازت کے بغیر جانا جائز نہیں ہے اور اگر فرض عین ہو جائے تو پھر بغیر اجازت کے بھی جانا جائز ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ والدین کی خدمت کے ساتھ ساتھ جہاد کے لئے کوشش کریں اور حکمت حربی کے لئے جو بھی مناسب اقدامات ہوں وہ کریں، لیکن قتال کی مباشرت فرض عین نہیں کہی جا سکتی۔

(۱۳۹) باب ما قيل فى الجرس ونحوه فى أعناق الإبل

۳۰۰۵۔ حدثنا عبد الله بن يوسف: أخبرنا مالک، عن عبد الله بن أبى بكر، عن عباد بن تميم: أن أبا بشير الأنصارى ﷺ أخبره: أنه كان مع رسول الله ﷺ فى بعض أسفاره، قال عبد الله: حسبت أنه قال: والناس فى مبيتهم، فأرسل رسول الله ﷺ رسولا: ((لا تبقين فى رقبة بعير قلادة من وتر ـ أو قلادة ـ إلا قطعت)). [۷۸،۷۹]

قلادہ کی ممانعت کی وجہ

آپ ﷺ نے یہ حکم دیا کہ کسی اونٹ کی گردن میں وتر کا قلادہ نہ چھوڑا جائے، ہر ایک کو کاٹ دیا جائے۔ اس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ بعض لوگوں نے وتر کے اندر تعویذ وغیرہ لٹکائے ہوئے تھے، جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں تمائم ہوا کرتے تھے، جس میں شرک کا اندیشہ ہوتا تھا۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ وجہ بیان کی ہے کہ وہ تانت جب گردن میں بندھی ہوتی تھی تو جانور اس سے تنگ ہوتا تھا کہ بیچارہ چل رہا ہوتا اور اس کو سانس وغیرہ لینے میں دقت ہوتی۔

بعض لوگوں نے ممانعت کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ لوگ اس میں گھنٹیاں لٹکاتے تھے اور اس سے مقصد ایک طرح سے لہو ہوتا تھا اس لئے منع فرمایا، یہ تینوں اسباب ہو سکتے ہیں۔

---

۷۸ لایوجد للحدیث مکررات.

۷۹ وفی صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینة، باب کراهیة قلادة الوتر فی رقبة البعیر، رقم: ۳۹۵۱، وسنن أبی داؤد، کتاب الجهاد، باب فی تقلید الخیل بالأوتار، رقم: ۲۱۸۹، ومسند احمد، مسند الأنصار، باب حدیث أبی بشیر الأنصاری، رقم: ۲۰۸۸۲، وموطأ مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی نزع المعالیق والجرس من العین، رقم: ۱۴۷۰.

(۱۴۰) باب من اكتتب في جيش فخرجت امرأته حاجة أو كان له عذر هل يؤذن له؟

۳۰۰۶۔ حدثنا قتيبة بن سعيد: حدثنا سفيان، عن عمرو، عن أبي معبد، عن ابن عباس رضي الله تعالىٰ عنهما: أنه سمع النبي ﷺ يقول: ((لا يخلون رجل بامرأة، ولا تسافرن امرأة إلا ومعها محرم)). فقام رجل فقال: يا رسول الله، اكتتبت في غزوة كذا و كذا و خرجت امرأتي حاجة، قال: ((اذهب فاحجج مع امرأتك)). [راجع: ۱۸۶۲]

یعنی یہاں جہاد میں نام لکھ لیا گیا تھا مگر چونکہ بیوی کو حج کے لئے جانا تھا اور اس کے لئے محرم ضروری تھا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم جہاد چھوڑ دو اور جا کر اپنی بیوی کو حج کراؤ۔

اس سے بھی پتہ چلا کہ جہاں جس موقع پر جو تقاضا ہو اس پر عمل کرنا چاہئے، یہ نہیں کہ صرف ایک بات ذہن میں آ گئی کہ صرف جہاد کرنا ہے باقی سارے احکام سے منہ موڑ لیا۔

سوال: اگر والدین بیمار ہوں تو بیوی کے ساتھ حج پر جا سکتا ہے یا نہیں؟

جواب: اگر ایسا ہے کہ ان کی خدمت کے لئے کوئی اور آدمی نہیں ہے تو یہ حج کو مؤخر کرنے کا صریح عذر ہے۔ لہٰذا اس کو مؤخر کر دے۔

سوال: اگر والدین کے پاس رہنے کی ضرورت ہے لیکن وہ پھر بھی بخوشی تعلیم کے لئے اجازت دیتے ہیں تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر وہ اپنا حق ساقط کر رہے ہیں تو جائز ہے، البتہ اگر ان کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو تو پھر جائز نہیں ہے۔

(۱۴۲) باب الكسوة للأسارى

۳۰۰۸۔ حدثنا عبد الله بن محمد: حدثنا ابن عيينة، عن عمرو: سمع جابر بن عبد الله رضي الله عنهما قال: لما كان يوم بدر أتي بأسارى وأتي بالعباس ولم يكن عليه ثوب، فنظر النبي ﷺ له قميصا، فوجدوا قميص عبد الله بن أبي يقدر عليه فكساه النبي ﷺ إياه، فلذلک نزع النبي ﷺ قميصه الذي ألبسه. قال ابن عيينة: كانت له عند النبي ﷺ يد فأحب أن يكافئه.

یہ پہلے جنائز میں گزر چکا ہے کہ آپ ﷺ نے عبداللہ بن اُبی کو جو اپنی قمیص دی تھی، وہ اس کے صلہ میں دی تھی کہ اس نے اپنی قمیص حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو پہنائی تھی۔

(۱۴۶) باب أهل الدار يبيتون فيصاب الولدان والذراري،

﴿بَيَاتاً﴾ [الاعراف: ۴، ۹۷، ويونس: ۵۰]: ليلا.

۳۰۱۲ ـ حدثنا علي بن عبد الله: حدثنا سفيان: حدثنا الزهري، عن عبيد الله، عن ابن عباس، عن الصعب بن جثامة رضی اللہ عنہ قال: مرّبي النبي ﷺ بالأبواء أو بودان فسئل عن أهل الدار يبيتون من المشركين فيصاب من نسائهم وذراريهم؟ قال: ((هم منهم)). وسمعته يقول: ((لا حمى إلا لله ورسوله ﷺ)).

شب خون کا حکم

جب رات کو شب خون مارا جاتا ہے تو بعض اوقات اس میں عورتیں اور بچے بھی مارے جاتے ہیں، جبکہ عام حالات میں عورتوں اور بچوں کو مارنے کی ممانعت ہے۔ چونکہ شب خون مارنے میں امتیاز کرنا مشکل ہے اس واسطے پوچھا کہ کیا اس میں جائز ہوگا یا نہیں؟

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا **"هم منهم"** کہ وہ انہی کا حصہ ہیں، لہٰذا قصد کر کے عورتوں اور بچوں کو نہ ماریں، لیکن جو بلا قصد مر جائیں تو وہ جائز ہے۔ یہی حکم بم اور گولوں کا ہے کہ بم پھینکنے کی صورت میں بعض اوقات عورتیں اور بچے بھی قتل ہوتے ہیں، لیکن چونکہ وہ مقصود نہیں ہوتے اور حالت جنگ میں ان کا امتیاز کرنا مشکل ہے، اس لئے اس کی گنجائش ہے۔[۸۰]

(۱۴۹) باب لا يعذب بعذاب الله

۳۰۱۷ ـ حدثنا علي بن عبد الله: حدثنا سفيان، عن أيوب، عن عكرمة: أن عليا رضی اللہ عنہ حرق قوما فبلغ ابن عباس فقال: لو كنت أنا لم أحرقهم، لأن النبي ﷺ قال: ((لا تعذبوا بعذاب الله))، ولقتلتهم كما قال النبي ﷺ: ((من بدل دينه فاقتلوه)). [أنظر: ۶۹۲۲]. [۸۱]

---

۸۰ عمدة القاري، ج: ۱۰، ص: ۳۳۰.

۸۱ وفي سنن الترمذي، كتاب الحدود عن رسول الله، باب ماجاء في المرتد، رقم: ۱۳۷۸، وسنن النسائي، كتاب تحريم الدم، باب الحكم في المرتد، رقم: ۳۰۰۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الحدود، باب الحكم فيمن ارتد، رقم: ۳۷۸۷، وسنن ابن ماجة، كتاب الحدود، باب المرتد عن دينه، رقم: ۲۵۲۶، ومسند احمد، ومن مسند بني هاشم، باب بداية مسند عبدالله بن العباس، رقم: ۱۷۷۵، ۱۸۰۲، ۲۴۲۰، ۲۸۱۳.

یہ عبداللہ بن سبا کے پیروکار (سبائی لوگ) تھے جن کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جلایا تھا اور بظاہر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو یہ حدیث نہیں پہنچی ہوگی اس لئے جلایا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اس پر نکیر فرمائی۔

(۱۵۱) باب هل للأسير أن يقتل أويخدع الذين أسروه حتى ينجو من الكفرة؟

"فيه المسور عن النبي ﷺ".

کفار نے کسی شخص کو قیدی بنالیا، کیا اس قیدی کو اجازت ہے کہ قید کرنے والوں کو قتل کرے یا نجات حاصل کرنے کے لئے دھوکہ دے؟ مطلب یہ ہے کہ جب اس کو قیدی بنالیا تو ایک طرح سے اس کے ساتھ عہد کرلیا کہ اب تم ہمارے ساتھ جنگ نہیں کروگے، اب اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرے تو کیا یہ اس عہد کی خلاف ورزی تو نہیں ہوگی؟

بعض فقہاء نے کہا کہ یہ عہد کی خلاف ورزی ہوگی، لہٰذا وہ بھاگنے کی کوشش نہ کرے، یہ قول امام مالکؒ کی طرف منسوب ہے۔ لیکن جمہور کا کہنا یہ ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے اور اگر بالفرض قید ہوتے وقت زبانی بھی عہد کرلیا تو اس عہد کی پابندی لازم نہیں، اس لئے کہ اسے زبردستی قید کیا گیا ہے خوشی سے تو نہیں گیا۔

دلیل میں امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت مسور بن مخرمہ رضی اللہ عنہ کی روایت پیش کی ہے، جس میں ابوبصیر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے جو پیچھے گزر چکا ہے کہ وہ قید سے بھاگ گئے تھے، انہیں پکڑ کر واپس لے جا رہے تھے، راستہ میں تلوار مانگ کر اس کو قتل کردیا، پھر حضور ﷺ کے پاس آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا **"یا ویل امه"** تو آپ ﷺ نے کوئی نکیر نہیں فرمائی۔ [۸۲]

(۱۵۲) باب إذا حرق المشرك المسلم هل يحرق؟

۳۰۱۸ـ حدثنا معلى: حدثنا وهيب، عن أيوب، عن أبي قلابة، عن أنس بن مالك رضي الله عنه: إن رهطا من عكل ثمانية قدموا على النبي ﷺ فاجتووا المدينة فقالوا: يارسول الله، ابغنا رسلا. فقال: ((ما أجد لكم إلا أن تلحقوا بالذود)). فانطلقوا فشربوا من أبوالها وألبانها حتى صحوا وسمنوا، وقتلوا الراعي واستاقوا الذود، وكفروا بعد إسلامهم، فأتى الصريخ النبي ﷺ فبعث الطلب فما ترجل النهار حتى أتي بهم فقطع أيديهم وأرجلهم، ثم أمر بمسامير فأحميت فكحلهم بها وطرحهم بالحرة يستسقون فما

---

۸۲ عمدة القاري، ج: ۱۰، ص: ۳۳۶.

يسقون حتى ماتوا. قال أبو قلابة: قتلوا وسرقوا وحاربوا الله ورسوله ﷺ وسعوا في الأرض فسادا. [راجع: ۲۳۳]

"إحراق بالنار" کا حکم

اس حدیث اور پچھلی حدیث دونوں کے لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ اگر دشمن نے احراق کیا ہے تو کیا اس کے مقابلے میں مسلمان احراق کر سکتے ہیں یا نہیں؟

بظاہر تو یہ لگ رہا ہے کہ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بدلہ میں احراق کر سکتے ہیں، کیونکہ جب عرنیین نے راعیوں کی آنکھوں کو داغا تھا، تو آپ ﷺ نے بدلہ میں ان کی آنکھوں کو داغا۔

لیکن جمہور کا کہنا یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے، اس واسطے کہ یہ اس وقت کا واقعہ ہے کہ جب احراق بالنار ممنوع نہیں تھا اور یہ جو دوسرا واقعہ ہے یہ "**شرائع من قبلنا**" سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہمارے لئے حجت نہیں ہے اور ہمارے پاس اس کے خلاف حدیث موجود ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اللہ کا عذاب دینے سے منع فرمایا۔

(۱۵۵) باب قتل المشرك النائم

۳۰۲۲۔ فقمت ومابي قلبة حتى . [۸۳]

پاؤں اچٹ جانے سے جو موچ آجاتی ہے اس کو "**قلبة**" کہتے ہیں، اس واقعہ کی تفصیل ان شاء اللہ مغازی میں آئے گی۔

(۱۶۹) باب قتل الأسير وقتل الصبر

۳۰۴۴۔ حدثنا ....فقال: إن ابن خطل متعلق بأستار الكعبة، فقال: ((اقتلوه)). [راجع: ۱۸۴۶]

اس حدیث میں ابن خطل کے قتل کا واقعہ ہے، جس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

(۱۷۰) باب هل يستأسر الرجل؟ ومن لم يستأسر، ومن ركع ركعتين عند القتل.

۳۰۴۵۔ حدثنا ابو اليمان......من لحمه شيئاً. [أنظر: ۳۹۸۹، ۴۰۸۶، ۷۴۰۲].

---

۸۳ انفرد به البخاري.

یہ حضرت عاصم رضی اللہ عنہ اور حضرت خبیب رضی اللہ عنہ والی روایت ہے جس کی پوری تفصیل مغازی میں ہے۔

(۱۷۳) باب الحربی إذا دخل دار الإسلام بغير أمان

۳۰۵۱ ـ حدثنا أبو نعيم: حدثنا أبو العميس، عن أباس بن سلمة بن الأكوع، عن أبيه قال: أتى النبی ﷺ عين من المشركين وهو فی سفر فجلس عند أصحابه يتحدث، ثم انفتل، فقال النبی ﷺ: ((اطلبوه واقتلوه))، فقتلته. فنفله سلبه. [۸۴، ۸۵]

غیر مستأمن جاسوس کا حکم

حضور اقدس ﷺ سفر میں تھے، مشرکین کا ایک جاسوس آکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے باتیں کرنے لگا، پھر چلا گیا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اس کو تلاش کرو اور قتل کردو۔ یہ شخص چونکہ بغیر امان لئے داخل ہوا تھا، لہٰذا اس کا خون مباح تھا، اس لئے نبی کریم ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا اور مزید یہ کہ یہ جاسوس بھی تھا۔

اور اگر کوئی امان لے کر آئے تو چونکہ مسلمانوں نے اس کا ذمہ لے لیا اور وہ مستأمن ہو گیا، اس لئے اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اور اگر کوئی مستأمن جاسوسی کرے تو اس کو قتل کرنا بھی مباح ہے، اس لئے کہ اس نے عہد توڑا ہے۔

(۱۷۵) باب جوائز الوفد

(۱۷۶) باب: هل يستشفع إلى أهل الذمة ومعاملتهم؟

۳۰۵۳ ـ حدثنا قبيصة:...... فتنازعوا ولا ينبغی عند نبی تنازع، فقالوا: هجر رسول الله ﷺ قال: ((دعونی فالذی أنا فيه خير مما تدعونی إليه))...... [راجع: ۱۱۴]

واقعۂ قرطاس میں پہلے جو روایت آئی تھی، اس میں یہ جملہ نہیں تھا جو یہاں ہے اور خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا "**دعونی فالذی انا فيه خير ما تدعونی إليه**" کہ مجھے چھوڑ دو، اس لئے کہ میں جس

---

۸۴ لايوجد للحديث مكررات.

۸۵ وفی صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب استحقاق القاتل سلب القتيل، رقم: ۳۲۹۸، وسنن ابی داؤد، كتاب الجهاد، باب فی الجاسوس المستأمن، رقم: ۲۲۸۱، ومسند احمد، أول مسند المدنيين اجمعين، باب حديث ثابت بن الضحاک الانصاری، رقم: ۱۵۷۹۷، ۱۵۹۲۲، ۱۵۹۳۹، وسنن الدارمی، كتاب السير، باب الشعار، رقم: ۲۳۴۳.

حالت میں ہوں وہ اس بات سے بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے دعوت دے رہے ہو۔

بعض نے کہا لکھوایا جائے، بعض نے کہا نہ لکھوایا جائے، اس میں اختلاف ہوا۔ جو حضرات لکھوانے کا کہہ رہے تھے ان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ میں جس حالت میں ہوں وہ اس بات کی بنسبت بہتر ہے جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو یعنی لکھنے کی۔ یعنی آپ ﷺ نے خود لکھنے کا ارادہ ملتوی فرما دیا تھا۔ اس واسطے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے منع کیا، یہ درست نہیں۔

(۱۷۷) باب التجمل للوفد

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے اس بات پر استدلال کیا ہے کہ آنے والے وفد کے لئے تجمل کرنا خاص اچھے لباس پہننا یہ جائز ہے، اس کو ریا کاری میں شمار نہیں کرنا چاہئے۔

(۱۸۰) باب: إذا أسلم قوم فی دار الحرب، ولهم مال وأرضون فهی لهم.

۳۰۵۸ ـ حدثنا محمود: أخبرنا عبد الرزاق: أخبرنا معمر عن الزهری، عن علی ابن حسین، عن عمرو بن عثمان بن عفان، عن أسامة بن زید قال: قلت: یا رسول الله، این تنزل غدا؟ فی حجته قال: ((وهل ترک لنا عقیل منزلا؟)) ثم قال: ((نحن نازلون غدا بخیف بنی کنانة المحصب حیث قاسمت قریش علی الکفر)). وذلک أن بنی کنانة حالفت قریشا علی بنی هاشم أن لا یبایعوهم ولا یؤوهم، قال الزهری: والخیف الوادی. [راجع: ۱۵۸۸]

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب قائم کر کے ایک مشہور فقہی مسئلہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

اور وہ یہ ہے کہ دار الحرب میں کچھ کفار مقیم ہیں، ان کی کچھ زمینیں ہیں، بعد میں وہ مسلمان ہو گئے اور اپنی زمینوں پر برقرار رہے، لیکن اگر مسلمان اس ملک پر حملہ کر دیں تو وہ بدستور اپنی زمینوں کے مالک رہیں گے یا نہیں؟

یہ سوال اس لئے پیش آیا کہ جب مسلمانوں نے دار الکفر فتح کر لیا تو ساری زمینیں مسلمانوں کی ملکیت میں آ گئیں، اب جو کفار کی ملکیت تھیں وہ تو آ گئیں آیا جو مسلمان وہاں پر مقیم ہیں ان کی زمینیں بھی مال غنیمت میں شامل ہو جائیں گی یا وہ مسلمان اپنی زمینوں پر برقرار رہیں گے؟

یہ مسئلہ فقہاء کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے۔

اختلاف ائمہ

امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب

امام بخاری رحمہ اللہ کا مذہب یہ ہے کہ وہ لوگ اپنی ملکیت پر برقرار رہیں گے اور ان کی زمینیں مال غنیمت کا حصہ نہیں بنیں گی۔

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا قول

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فرمانا یہ ہے کہ اگر تقسیم سے پہلے وہ مسلمان آکر کہہ دیں کہ یہ ہماری زمینیں ہیں ان کو تقسیم نہ کیجئے، تب تو امام کے لئے جائز ہے کہ وہ کہے کہ تم اپنی زمینوں پر رہو، لیکن اگر وہ مسلمان نہیں آئے اور امام نے ساری زمینیں مجاہدین کے درمیان تقسیم کر دیں تو پھر وہ تقسیم ہو جائیں گی اور ان مسلمانوں کی ملکیت سے نکل جائیں گی۔

اگر مسلمان اپنے بھائیوں کے لئے خود حصہ چھوڑ دیں تو وہ الگ بات ہے لیکن فی نفسہ ملکیت سے نکل جائیں گی۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا استدلال

امام بخاری رحمہ اللہ نے جن حدیثوں سے استدلال کیا ہے ان میں پہلی حدیث تو وہ ہے جو بار بار گزر چکی ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ مکہ مکرمہ پہنچے تو آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں جا کر اتریں گے؟

آپ ﷺ نے فرمایا: **"هل ترک لنا عقیل منزلا؟"** عقیل نے ہمارے لئے کوئی گھر نہیں چھوڑا، سب فروخت کر دیئے؟

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ اس طرح استدلال کر رہے ہیں کہ اگر وہ زمینیں حضرت عقیل نے نہ بیچی ہوتیں تو آنحضرت ﷺ ان کے گھروں پر جا کر اترتے، لیکن چونکہ عقیل نے بیچ دی ہیں، لہٰذا اب ہمارے واسطے کوئی جگہ نہ رہی۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر انہوں نے نہ بیچی ہوتیں تو ہم اس میں جا کر اترتے یعنی ملکیت قائم ہوتی معلوم ہوا کہ ملکیت قائم ہے۔

حنفیہ کا استدلال

حنفیہ کہتے ہیں کہ استیلاء کفار سے زمین مسلمانوں کی ملکیت سے نکل جاتی ہے اور اس پر مشہور استدلال قرآن کریم کی آیت ہے کہ:

﴿لِلْفُقَرَآءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلاً مِّنْ اللهِ وَرِضْوَاناً﴾

ترجمہ: ”واسطے ان مفلسوں، وطن چھوڑنے والوں کے، جو نکالے ہوئے آئے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے، ڈھونڈتے آئے ہیں اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی“۔

یعنی اس آیت کریمہ میں جن کو فقراء کہا وہ زمینوں اور جائیدادوں کے مالک تھے، اور فقراء کا اطلاق اس وقت ہوسکتا ہے جب ان سے زمینوں اور جائیدادوں کی ملکیت نکل گئی ہو۔

حدیث باب کا جواب

حدیث باب کا جواب یہ ہے کہ یہ استدلال بالمفہوم المخالف ہے کیونکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”**هل ترک لنا عقيل من منزل؟**“ عقیل نے ہمارے کوئی گھر نہیں چھوڑا، جہاں ہم جا کر اتریں۔

اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اگر نہ بیچا ہوتا تو ہم جا کر اترتے اور ہماری ملکیت ہوتی، یہ تو مفہوم مخالف ہے۔ اگر اس کے مفہوم کا اعتبار کیا بھی جائے تب بھی اس کا حاصل یہ ہوگا کہ اگرچہ کفار بیع کی وجہ سے مالک ہوگئے تھے لیکن جب مسلمانوں نے دوبارہ فتح کرلیا تو ساری زمینیں مسلمانوں کی ہوگئیں۔ اب اس میں امام کو اختیار ہے جس طرح چاہیں تقسیم کریں۔

اس میں یہ بھی کر سکتے ہیں کہ جو لوگ پرانے مالک ہیں ان کو وہ زمینیں لوٹا دیں، تو اس وقت حضور اقدس ﷺ یہ فرماتے کہ جس جس کی پرانی زمینیں ہیں ان کو دی جارہی ہیں، اس میں حضور اقدس ﷺ کو بھی وہ مکان مل جاتے تو پھر معاملہ ٹھیک ہوجاتا۔

۳۰۵۹ ۔ حدثنا إسماعيل قال: حدثني مالک، عن زيد بن أسلم، عن أبيه أن عمر بن الخطاب ﷺ استعمل مولى له يدعى هنيا على الحمى. فقال: يا هنى! اضمم جناحک عن المسلمين، واتق دعوة المسلمين، فإن دعوة المظلوم مستجابة. وأدخل رب الصريمة، ورب الغنيمة، وإياى ونعم ابن عوف ونعم ابن عفان، فإنهما أن تهلک ما شيتهما يرجعان إلى نخل وزرع. وإن رب الصريمة ورب الغنيمةأن تهلک ماشيتهما يأتنى ببيته فيقول: يا امير المؤمنين، يا امير المؤمنين أفتاركهم أنا لا أبا لک؟ فالماء والكلا أيسر على من الذهب والورق. وايم الله إنهم ليرون أنى قد ظلمتهم، إنها لبلادهم، قاتلوا عليها في الجاهلية وأسلموا عليها في الإسلام. والذى نفسى بيده لولا المال

الذی أحمل علیه فی سبیل الله ماحمیت علیهم من بلادهم شبرا. [۸۶، ۸۷]

حدیث کا پس منظر

یہ حدیث بخاری میں ایک ہی جگہ آئی ہے۔ پہلے اس کا پس منظر سمجھ لینا چاہئے۔

یہ بات ذکر کی جا چکی ہے کہ جاہلیت میں یہ تصور تھا کہ بڑے بڑے سردار کچھ علاقہ کو حمی بنا لیتے تھے اور اس میں دوسروں کو جانور چرانے کی ممانعت ہوتی تھی۔ حضور اکرم ﷺ نے یہ طریقہ ختم فرمایا اور فرمایا: **"لا حمی إلا لله ولرسوله"** جس کا حاصل یہ ہے کہ صرف سرکاری بیت المال کے جانور چرانے کے لئے علیحدہ چراگاہ بنائی جاسکتی ہے، جس میں دوسرے لوگوں کا داخلہ ممنوع ہو، لیکن عام آدمی کے لئے جائز نہیں۔

اس اصول کے تحت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں بیت المال کے اونٹوں اور مویشیوں کے لئے ایک جگہ کو حمی بنالیا اور اس میں دوسرے لوگوں کے داخلہ کی ممانعت کردی کہ یہاں صرف بیت المال کے جانور چرا کریں گے۔

اس پر بعض لوگوں کو اشکال ہوا کہ جس زمین کو آپ نے حمی بنایا ہے جاہلیت میں اس پر ہم قابض تھے اور اسلام لائے تو یہ ہمارے تصرف میں تھی، آپ نے ہم سے وہ زمینیں چھین کر ہمیں محروم کردیا۔ یہ مباح عام زمین تھی، مملوکہ نہ تھی۔ مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں بھی ہم اس سے استفادہ کرتے تھے اور اسلام لانے کے بعد بھی اس سے استفادہ کرتے تھے لیکن آپ نے ہمیں اس استفادہ سے محروم کردیا اور اس کو صرف بیت المال کے لئے خاص کردیا۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ میں نے کسی کی زمین چھینی ہو، اگر چھینتا تو میں ظلم کررہا ہوتا، یہ مباح عام زمین تھی اور چونکہ حضور اقدس ﷺ نے بیت المال کے لئے حمی بنانے کی اجازت دی ہے اس وجہ سے میں نے بیت المال کے لئے حمی بنایا۔

اب اس حمی کے لئے چوکیدار مقرر کیا تھا جو بیت المال کے اونٹ چرایا کرتا تھا اس کا نام **"هنی"** تھا۔ اس حدیث میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے **"هنی"** کو کچھ ہدایات دی ہیں کہ تم اس حمی کی حفاظت کس طرح کرو۔

اس میں بنیادی طور پر یہ ہدایت ہے کہ جو بڑے بڑے امیر لوگ ہیں جن کے پاس جانوروں کے غلے ہیں ان کو روکنا، انہیں یہاں داخل نہ ہونے دینا اور اگر کوئی بیچارہ مسکین آدمی اپنا جانور لے آئے تو اس کو زیادہ روکنے کی ضرورت نہیں۔

---

۸۶ **لایوجد للحدیث مکررات.**

۸۷ **وفی موطأمالک، کتاب الجامع، باب مایتقی من دعوة المظلوم، رقم: ۱۵۹۳.**

تشریح حدیث

اپنے ایک عامل کو جن کا نام **"هنی"** تھا حمی پر عامل بنایا تھا۔

"فقال : یا هنی اضمم جناحک عن المسلمین" اپنے بازوؤں کو مسلمانوں کے لئے جمع رکھو، مطلب یہ ہے کہ ان کے ساتھ شفقت کا معاملہ کرو۔

" و اتق دعوة المسلمين، فان دعوة المظلوم مستجابة، و ادخل رب الصريمة. صريمه، تصغیر" ہے، اکا دُکا دو چار اونٹ **"صریمه"** کہلاتے ہیں۔ **"غنیمة"** بکریوں کا چھوٹا سا گلہ تو جو اونٹوں اور بکریوں کے چھوٹے چھوٹے گلے لے کر آئیں ان کو حمی میں داخل کر لینا۔

"وایای ونعم ابن عوف" اور عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے جانوروں سے پرہیز کرنا، (کیونکہ یہ دولت مند صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے تھے) یہ امیر حضرات ایسے ہیں کہ اگر ان کے مویشی ہلاک ہو گئے تو یہ کھیتوں اور باغات کی طرف لوٹ جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آیندہ نہیں آئیں گے، اپنے کھیتوں اور باغات کو استعمال کریں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر ان کے سارے کے سارے جانور بھی ہلاک ہو جائیں، تب بھی ان کے پاس اپنی کھیتیاں اور باغات ہیں، ان سے کام چلائیں گے۔

"وإن رب الصريمة ورب الغريمة" اور اگر چھوٹے گلے والوں کو تم نے روک دیا اور اس کے نتیجے میں ان کے جانور ہلاک ہو گئے، تو وہ اپنے پورے گھر کو میرے پاس لے کر آئیں گے۔

"فیقول: یا أمیر المؤمنین" اے امیر المؤمنین! ہمارے جانور ہلاک ہو گئے، لہٰذا ہمیں ان کا معاوضہ دیجئے، تو کیا میں ان کو چھوڑ دوں گا جب وہ آ کر کہیں گے کہ ہمارے جانور ہلاک ہو گئے؟

"لا ابا لک؟" بددعا مقصود نہیں ہوتی، محض بے تکلفی میں کہتے ہیں کہ تیرا باپ نہ ہو۔

"فالماء والکلاء أیسر علی" ان چھوٹے چھوٹے گلے والوں کو پانی اور گھاس دیدینا زیادہ آسان ہے بنسبت اس کے کہ بعد میں سونا چاندی دینا پڑے، یعنی اس وقت زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ ان کے جانور ہمارے حمی کا گھاس کھالیں گے اور پانی پی لیں گے، لیکن اگر ان کے جانور ہلاک ہو گئے اور بعد میں آ کر انہوں نے معاوضہ کا مطالبہ کیا تو پھر سونا چاندی دینا پڑے گا، تو سونا چاندی کے مقابلہ میں ان کو پانی اور گھاس دے دینا زیادہ مناسب ہے۔

"وایم اللّٰہ" اور اللہ کی قسم یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں نے اس علاقہ کو حمی بنا کر ان پر ظلم کیا ہے۔

"إنها لبلادهم" اور ان کا خیال ہے کہ یہ ان کا وطن ہے جس پر انہوں نے جاہلیت میں لڑائیاں لڑی ہیں اور اسلام لائے ہیں۔

"والذی نفسی بیده" اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر وہ مال نہ ہوتا جس پر میں

لوگوں کو جہاد کے لئے سوار کرتا ہوں یعنی یہ اونٹ، گھوڑے وغیرہ اس کام کے لئے ہیں تا کہ ان پر مجاہدین سواری کریں اوران کی حفاظت کریں اگر یہ نہ ہوتے تو میں ان کے بلاد اوران کے وطن میں سے کسی ایک بالش کو بھی حمی نہ بناتا۔لیکن یہ حمی بیت المال کے لئے بنائی گئی،ضرورت کے تحت بنائی گئی ہے اس لئے حقیقت میں ان پر کوئی ظلم نہیں کیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ کا یہاں اس روایت کو لانے سے مقصود یہ اُصول بیان کرنا ہے کہ **"قاتلوا علیها فی الجاهلية و اسلموا علیها فی الاسلام"** حضرت عمرؓ نے تسلیم کیا کہ جب اسلام لائے تھے اس وقت وہ اس کے مالک تھے۔یعنی جب اسلام لائے تھے اس وقت کافروں کا غلبہ تھا اور یہ زمینیں ان کی سمجھی جاتی تھیں، بعد میں جب حضرت فاروق اعظمؓ نے فتح کرلیں تب بھی انہوں نے ان کی ملکیت تسلیم کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی دارالحرب میں مسلمان ہے تو اس کی زمین کی ملکیت مسلمانوں کی فتح کے بعد بھی تسلیم کی جائے گی، باب سے یہ مناسبت ہے۔لیکن یہ استدلال پوری طرح تام نہیں ہے، اس واسطے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ زمین جس کی گفتگو ہو رہی ہے یہ کسی کی ذاتی ملکیت نہیں تھی بلکہ یہ مباح عام تھی، لہٰذا ان کے اوپر ملکیت سے استدلال کیا ہی نہیں جاسکتا۔

دوسرا یہ کہ اگر ملکیت ہوتی بھی اور بعد میں امام اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے ان کو پہلے ہی تقسیم کر کے دے دیتا ہے تب بھی ان کی ملکیت ہو جاتی۔اس لئے جو محل نزاع ہے اس روایت سے اس کے بارے میں امام بخاریؒ کا استدلال تام نہیں ہے۔

(۱۸۱) باب كتابة الإمام الناس

۳۰۶۰ ـ حدثنا محمد بن يوسف: حدثنا سفيان، عن الأعمش، عن أبي وائل، عن حذيفة ؓ قال: ((قال النبي ﷺ: اكتبوا لي من تلفظ بالإسلام من الناس فكتبنا له الفا وخمسمائة رجل. فقلنا نخاف ونحن الف وخمسمائة؟ فلقد رأيتنا ابتلينا حتى إن الرجل ليصلي وحده وهو خائف)).

حدثنا عبدان، عن أبي حمزة، عن الأعمش: ((فوجدنا هم خمسمائة))، قال أبو معاوية: ((ما بين ستمائة إلى سبعمائة)). [۸۸، ۸۹]

نبی کریم ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ان لوگوں کا نام لکھ کر دو جو اسلام کا تلفظ کرتے ہیں، گویا مردم شماری

---

۸۸ لايوجد للحديث مكررات.

۸۹ وفي صحيح مسلم، كتاب الايمان، باب الإستسرار بالايمان للخائف، رقم: ۲۱۳، وسنن ابن ماجة، كتاب الفتن، باب الصبر على البلاء، رقم: ۴۰۱۹، ومسند احمد، باقي مسند الأنصار، باب حديث حذيفة بن اليمان عن النبي، رقم: ۲۲۱۷۳.

کرائی۔ تو ہم نے ایک ہزار پانچ سو مرد لکھے۔ ہم نے کہا **"نخاف ونحن الف و خمسمائة" "نخاف"** سے پہلے ہمزۂ استفہامیہ انکاریہ محذوف ہے **"انخاف؟"** کیا ہم ڈریں گے جبکہ ہم ایک ہزار پانچ سو ہیں۔

کہتے ہیں کہ بعد میں ہمارے اوپر آزمائش آئی کہ **"حتی ان الرجل لیصلی وحده وهو خائف"** آدمی تنہا نماز پڑھ رہا ہوتا ہے پھر بھی خوف میں ہوتا ہے۔

بعد میں جب فتنوں کا زمانہ آیا جس میں مسلمانوں کے درمیان لڑائیاں ہوئیں تو باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی، لیکن پھر بھی اکیلا نماز پڑھتا تھا تو ڈرتا تھا، اس کی طرف اشارہ ہے۔

(۱۸۳) باب من تأمر في الحرب من غير امرة إذا خاف العدو

۳۰۶۳ ۔ حدثنا يعقوب بن إبراهيم: حدثنا ابن علية، عن أيوب، عن حميد بن هلال، عن أنس بن مالک ﷺ قال: خطب رسول الله ﷺ فقال: ((أخذ الراية زيد فأصيب، ثم أخذها جعفر فأصيب، ثم أخذها عبد الله بن رواحة فأصيب، ثم أخذها خالد بن الوليد عن غير إمرة ففتح الله عليه، فما يسرني - أو قال: ما يسرهم - أنهم عندنا)). وقال: وإن عينيه لتذرفان. [راجع: ۱۲۴۶]

یعنی کسی نے امیر نہیں بنایا تھا، خود ہی جھنڈا اٹھا لیا، معلوم ہوا کہ ایمرجنسی (**Emergency**) کی صورت میں یہ کام بھی جائز ہے کہ جب مسلمان پریشان ہوں تو کوئی آدمی ایک دم سے امیر بن جائے۔

"فما یسرنی" یعنی آپ ﷺ نے جب یہ خبر دی کہ یہ واقعات پیش آئے ہیں تو فرمایا کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ وہ میرے پاس ہوتے باوجود یکہ وہ شہید ہو رہے ہیں، کیونکہ اللہ ﷻ نے ان کو جو درجات دیئے ہیں وہ یہاں رہنے سے حاصل نہ ہوتے۔

(۱۸۷) باب: إذا غنم المشركون مال المسلم ثم وجده المسلم،

۳۰۶۷ ۔ وقال ابن نمير: حدثنا عبيد الله عن نافع، عن ابن عمر رضى الله عنهما قال: ذهب فرس له فأخذه العدو، فظهر عليه المسلمون فرد عليه في زمن رسول الله ﷺ. وأبق عبد له فلحق بالروم فظهر عليهم المسلمون فرده عليه خالد بن الوليد بعد النبي ﷺ. [أنظر: ۳۰۶۸، ۳۰۶۹]

یہ باب قائم کیا ہے کہ اگر مشرکین مسلمانوں کے مال کو غنیمت کے طور پر لوٹ کر لے جائیں اور بعد میں مسلمان اس کو پالیں تو کیا وہ اصل مالک کو دیا جائے گا یا مجاہدین میں تقسیم کیا جائے گا؟

حنفیہ کا مسلک

اس میں حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر تقسیم میں مال غنیمت سے پہلے پہلے مالک آجائیں تو ان کو دیا جائے گا اور اگر تقسیم کے بعد اصل مالک آیا ہے تو پھر جس کو تقسیم میں دیا گیا ہے، اس کی رضامندی کے بغیر اصل مالک کو نہیں دیا جائے گا۔ یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے جتنے واقعات ذکر کئے ہیں یہ سب تقسیم سے پہلے کے ہیں۔

"وقال ابن نمير" حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ان کا ایک گھوڑا بھاگ گیا **"فاخذه العدو"** دشمن نے پکڑ لیا۔ **"فظهر عليه المسلمون"** بعد میں مسلمانوں نے دشمن کا وہ علاقہ فتح کر لیا تو وہ گھوڑا حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی طرف لوٹا دیا گیا۔ ان ہی کا ایک غلام بھاگ کر روم چلا گیا تھا۔ **"فظهر عليه المسلمون فرده عليه خالد بن الوليد بعد النبي ﷺ"**.

(۱۸۸) باب من تكلم بالفارسية والرطانة،

وقول الله عز وجل:

﴿وَاخْتِلَافُ أَلْسِنَتِكُمْ وَأَلْوَانِكُمْ﴾ [۹۰]

ترجمہ: "اور طرح طرح کی بولیاں تمہاری اور رنگ"۔

وقال:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ﴾ [۹۱]

ترجمہ: "اور کوئی رسول نہیں بھیجا ہم نے مگر بولی بولنے والا اپنی قوم کی تاکہ ان کو سمجھائے"۔

یہ باب قائم کیا ہے کہ عربی زبان کے علاوہ دوسری زبان کی باتیں کرنا جائز ہے۔

"رطانة" کی تشریح

"رطانة" کے لفظی معنی بڑبڑانے کے ہوتے ہیں یعنی اس طرح بولنا کہ کچھ سمجھ میں نہ آئے کہ کیا بول رہا ہے۔ عرب لوگ تمام عجمی زبانوں کو **"رطانة"** کہتے ہیں، کیونکہ ان کے خیال میں تو وہ بڑبڑا ہی رہا ہے ان کو کوئی مطلب سمجھ ہی نہیں آتا، مطلب یہ ہے کہ غیر عربی زبانیں بولنا جائز ہے۔

اس باب کا جہاد سے اس طرح تعلق ہے کہ عام طور سے جب جہاد کے لئے جاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے

---

[۹۰] [الروم: ۲۲] [۹۱] [ابراهيم: ۴]

واسطہ پڑتا ہے جن سے عربی کے علاوہ دوسری زبانوں میں بات کرنی پڑتی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ جائز ہے اور اس کی دلیل میں مختلف روایتیں لائے ہیں جن میں رسول کریم ﷺ سے کوئی نہ کوئی ایسا لفظ ثابت ہے جو غیر عرب لفظ ہے۔

۳۰۷۰ ـ حدثنا عمرو بن علي: حدثنا أبو عاصم: أخبرنا حنظلة بن أبي سفيان: أخبرنا سعيد بن ميناء قال: سمعت جابر بن عبد الله رضي الله عنهما قال: قلت : يا رسول الله ذبحنا بهيمة لنا وطحنت صاعا من شعير فتعال أنت ونفر، فصاح النبي ﷺ فقال: ((يا أهل الخندق، إن جابرا قد صنع سورا فحي هلا بكم)) . [أنظر : ۴۱۰۱، ۴۱۰۲] [۹۲]

یہ غزوۂ احزاب کا واقعہ ہے، اس میں ہے **"قد صنع سورا"** کہ جابر نے تمہارے لئے کھانا بنایا ہے۔

"سورا" اصلاً عربی کا لفظ نہیں ہے بلکہ فارسی کا لفظ ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اس کو استعمال فرمایا، معلوم ہوا کہ فارسی زبان کا لفظ استعمال کرنا جائز ہے۔

۳۰۷۱ ـ حدثنا حبان بن موسى: أخبرنا عبد الله، عن خالد بن سعيد، عن أبيه، عن أم خالد بنت خالد بن سعيد قالت: أتيت رسول الله ﷺ مع أبي وعلي قميص أصفر، قال رسول الله ﷺ :((سنه سنه)). قال عبد الله: وهي بالحبشية: حسنة، قالت: فذهبت ألعب بخاتم النبوة فزبرني أبي، قال رسول الله ﷺ:((دعها)) ثم قال رسول الله ﷺ: ((أبلي وأخلقي، ثم أبلي وأخلقي، ثم أبلي وأخلقي)). قال عبد الله : فبقيت حتى ذكر. [أنظر: ۳۸۷۴، ۵۸۲۳، ۵۸۴۵، ۵۹۹۳] [۹۳]

امّ خالد بنت خالد کہتی ہیں کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی یہ چھوٹی بچی تھی، **"وعليّ قميص أصفر"** اور زرد رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے دیکھ کر فرمایا **"سنه سنه"** **قال عبد الله: "وهي بالحبشية: حسنة"** حبشی زبان میں **"سنه سنه"** کے معنی ہوتے ہیں، اچھی ہے۔ **"قالت: فذهبت العب"**، میں بچی تھی، خاتم نبوۃ سے کھیلنے لگی۔ میرے والد نے مجھے منع کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ چھوڑ دو، بچی ہے۔

"ثم قال رسول الله ﷺ :أبلي وأخلقي" ۔ **"أبلي"** یہ **"بلاً"** سے نکلا ہے **"بلي ۔ يبلي ۔ بلاً"** کے معنی ہیں پرانا ہونا اور **"أبلي"** کے معنی ہیں پرانا کر دیا۔

---

۹۲ وفي صحيح مسلم ، كتاب الاشربة ، باب جواز استتباعه غيره الى دار من يثق برضاه بذلك ، رقم : ۳۸۰۰، ومسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب مسند جابر بن عبدالله ، رقم : ۱۳۶۹۵، ۱۳۷۰۴، ۱۴۴۹۷، وسنن الدارمي ، كتاب المقدمة ، باب ما اكرم به النبي في بركة طعامه ، رقم : ۴۲.

۹۳ وفي سنن أبي داؤد ، كتاب اللباس ، باب فيما يدعى لمن لبس ثوبا جديداً ، رقم: ۳۵۰۶، ومسند احمد ، مسند الأنصار، باب حديث أم خالد بنت خالد بن سعيد بن العاص ، رقم : ۲۵۸۱۱.

اسی طرح "أخلقي" کے معنی بھی پرانا ہونا ہیں، تو دونوں کے معنی ایک ہیں۔
نبی کریم ﷺ نے دعا دی کہ تم اس کپڑے کو پرانا کر دو، یعنی درازی عمر کی دعا دی کہ تمہاری عمر اتنی لمبی ہو کہ عرصہ دراز تک یہ کپڑا پہنو، یہاں تک کہ کپڑا پرانا ہو جائے۔
"قال عبد الله : فبقيت حتى ذكر" عبداللہ بن مبارک راوی کہتے ہیں کہ یہ عورت کافی عرصہ تک زندہ رہی اور لوگوں میں کافی شہرت ہوئی کہ یہ اتنے دنوں تک زندہ ہے اور اتنے دنوں تک اللہ ﷻ نے عمر دراز کی ہے۔

۳۰۷۲ ـ حدثنا...... فقال له النبی ﷺ بالفارسية: ((كخ كخ، أما تعرف أنا لا نا كل الصدقة؟)) [راجع: ۱۴۸۵]

یہ "كخ كخ" یا "كخّ كخّ" بھی "رطانه" میں داخل ہے، اس لئے کہ اصل لغت عربی میں کوئی لفظ نہیں ہے لیکن چھینکنے لئے استعمال کیا جارہا ہے۔

(۱۹۰) باب القليل من الغلول

"ولم يذكر عبد الله بن عمرو عن النبی ﷺ أنه حرق متا عه، وهذا أصح".

۳۰۷۴ ـ حدثنا علی بن عبد الله : حدثنا سفيان ، عن عمرو، عن سالم بن أبی الجعد، عن عبد الله بن عمرو قال: كان على ثقل النبی ﷺ رجل يقال له: كر كرة، فمات فقال النبی ﷺ :((هو فی النار))، فذهبوا ينظرون إليه فوجدوا عباء ة قد غلها. قال أبو عبد الله: قال ابن سلام : كر كرة، يعنی بفتح الكاف وهو مضبوط كذا. [۹۴،۹۵]

نبی کریم ﷺ کے سامان پر ایک شخص مقرر تھا جس کا نام "كر كرة" تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں گیا۔ العیاذ باللہ۔

(۱۹۵) باب إذا أضطر الرجل إلى النظر فی شعور أهل الذمة والمؤمنات إذا عصين الله وتجريد هن.

۳۰۸۱ ـ حدثنی محمد بن عبد الله بن حوشب الطائفی: حدثنا هشيم: أخبرنا حصين ، عن سعد بن عبيدة، عن أبی عبد الرحمن وكان عثمانيا، فقال لابن عطية، وكان

---

۹۴ لايوجد للحديث مكررات.

۹۵ وفی سنن ابن ماجة ،كتاب الجهاد ، باب الغلول ، رقم : ۲۸۳۹، ومسند احمد ،مسند المكثرين من الصحابة ، باب مسند عبدالله بن عمر بن العاص ، رقم : ۶۲۰۵

علوياً: إني لأعلم ما الذي جرأ صاحبك على الدماء، سمعته يقول: بعثني النبي ﷺ والزبير فقال: ((أتوا روضة كذا، وتجدون بها امرأة أعطاها حاطب كتابا)) فأتينا الروضة فقلنا: الكتاب، قالت: لم يعطني، فقلنا: لتخرجن أو لأجردنك. فأخرجت من حجزتها فأرسل إلى حاطب، فقال: لا تعجل، والله ما كفرت ولا أزددت للإسلام إلا حبا ولم يكن أحد من أصحابك إلا وله بمكة من يدفع الله به عن أهله وماله، ولم يكن لي أحد، فأحببت أن أتخذ عندهم يدا. فصدقه النبي ﷺ فقال عمر: دعني أضرب عنقه فإنه قد نافق. فقال: ((وما يدريك لعل الله أطلع على أهل بدر فقال: اعملوا ما شئتم؟)) فهذا الذي جرأه. [راجع: ۳۰۰۷]

یہ انتہائی کارروائی ہے

یہ باب قائم کیا ہے کہ جب ضرورت پیش آئے تو اجنبیہ کو دیکھا جا سکتا ہے، اس کے بال بھی دیکھے جا سکتے ہیں اور ننگا کرنے کی دھمکی بھی دی جا سکتی ہے۔

روایت ذکر کی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے، اس کا شروع کا حصہ یہ ہے کہ سعد بن ابی عبیدہ، ابوعبدالرحمٰن عثمانی سے روایت کرتے ہیں یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گروپ سے تھے۔ انہوں نے ابن عطیہ سے کہا اور ابن عطیہ علوی تھے یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے گروپ میں سے تھے۔ **"إني لأعلم ما الذي جرأ"** مجھے پتہ ہے تمہارے صاحب کو خون ریزی پر کس چیز نے جرأت دلائی ہے۔ تمہارے صاحب سے حضرت علی رضی اللہ عنہ مراد ہیں۔ اس پر یہ واقعہ سنایا کہ حضور اکرم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جاسوسی کرنے والی عورت کو پکڑنے کے لئے بھیجا تھا۔ آخر میں حضور اکرم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ تمہیں کیا پتہ ہے؟ اللہ جل جلالہ نے اہل بدر پر نظر فرمائی ہے اور فرمایا ہے، تم جو چیز کرتے رہو تمہارے لئے جنت واجب ہو گئی ہے۔

اس چیز نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جرات دلائی ہے کہ اب جنت تو پکی ہو گئی ہے، لہٰذا جو چاہو کرو۔

(۱۹۷) باب مايقول إذا رجع من الغزو

۳۰۸۵ ۔ حدثنا أبو معمر: حدثنا عبد الوارث قال: حدثني يحيى بن أبي إسحاق، عن أنس بن مالك رضي الله عنه قال: كنا مع النبي ﷺ مقفله من عسفان، و رسول الله ﷺ على راحلته، وقد أردف صفية بنت حيي، فعثرت ناقته فصرعا جميعا، فاقتحم أبو طلحة فقال: يا رسول الله، جعلني الله فداءك، قال: ((عليك المرأة)) فقلب ثوبا على وجهه وأتاها

فألقاه عليها أصلح لهما مركبهما فركبا. واكتنفنا رسول الله ﷺ فلما أشرفنا على المدينة، قال: ((آيبون تائبون، عابدون لربنا حامدون)). فلم يزل يقول ذلك حتى دخل المدينة. [راجع: ۳۷۱]

حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پیچھے بیٹھی ہوئی تھیں کہ آپ ﷺ کی ناقہ کا پاؤں پھسلا، آپ دونوں گر گئے حضور اکرم ﷺ کے ساتھ۔

ابوطلحہ رضی اللہ عنہ جلدی سے آگے بڑھے اور فرمایا: اللہ جل جلالہ مجھے آپ ﷺ پر قربان کریں، **"قال: عليك المراة"** تم میری فکر مت کرو، عورت کو دیکھو یعنی حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کو کہ ان کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی۔

"فقلب ثوبا على وجهه" حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ نے اپنے چہرہ پر کپڑا ڈال دیا تا کہ حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پر نظر نہ پڑے اور حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے پاس آئے۔ **"فالقاه عليها"** اور وہ کپڑا حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا پر ڈال دیا تا کہ ان کا پردہ ہو جائے۔

(۱۹۹) باب الطعام عند القدوم،

"وكان ابن عمر يفطر لمن يغشاه"۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما اس شخص کے لئے روزہ افطار کرتے تھے جو ان کے پاس آئے، یعنی وہ عام حالات میں تو بکثرت روزہ رکھا کرتے تھے، لیکن کوئی مہمان آئے تو اس کے لئے افطار کرتے تھے، تا کہ اسے کھانا کھانے میں کوئی تکلیف نہ ہو۔

كتاب فرض الخمس

٣٠٩١ - ٣١٥٥

۵۷ ـ كتاب فرض الخمس

(۱) باب فرض الخمس

۳۰۹۲ ـ حدثنا عبد العزيز بن عبد الله: حدثنا إبراهيم بن سعيد، عن صالح، عن ابن شهاب قال: أخبرني عروة بن الزبير أن عائشة أم المؤمنين رضی الله عنها: أخبرته أن فاطمة رضی الله عنها بنت رسول الله ﷺ سألت أبا بكر الصديق بعد وفاة رسول الله أن يقسم لها ميراثها، ما ترك رسول الله ﷺ مما أفاء الله عليه. [أنظر: ۳۷۱۱، ۴۰۳۵، ۴۲۴۰، ۶۷۲۵]

۳۰۹۳ ـ فقال لها أبو بكر: إن رسول الله ﷺ قال: ((لا نورث، ما تركنا صدقة))، فغضبت فاطمة بنت رسول الله ﷺ فهجرت أبا بكر فلم تزل مهاجرته حتى توفيت، وعاشت بعد رسول الله ﷺ ستة أشهر. قالت: وكانت فاطمة تسأل أبابكر نصيبها ما ترک رسول الله ﷺ من خيبر وفدک وصدقته بالمدينة. فأبى أبو بكر عليها ذلک، وقال: لست تاركا شيئا كان رسول الله ﷺ يعمل به إلا عملت به، فإني أخشى إن تركت شيئا من أمره أن أزيغ. فأما صدقته بالمدينة فدفعها عمر إلى علی وعباس، فأما خيبر وفدک فأمسكها عمر وقال: هما صدقة رسول الله ﷺ كانتا لحقوقه التی تعروه ونوائبه، وأمرهما إلى من ولی الأمر. قال: فهما على ذلک إلى اليوم قال أبو عبد الله: اعتراک افتعلت من عروته فأصبته. ومنه يعروه واعترانی. [أنظر: ۳۷۱۲، ۴۰۳۶، ۴۲۴۱، ۶۷۲۶][1]

مسئلہ جاگیر فدک

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضور اقدس ﷺ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر ؓ سے نبی کریم ﷺ

---

[1] وفی صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب قول النبی لانورث ماتركنا فهو صدقة، رقم: ۳۳۰۴، وسنن النسائی، كتاب قسم الفیء، رقم ۴۰۷۲، وسنن أبی داؤد، كتاب الخراج والأمارة والفیء، باب فی صفايا رسول الله من الاموال، رقم: ۲۵۷۸، ومسند احمد، مسند العشرة المبشرين بالجنة، باب مسند أبی بكر الصديق، رقم: ۲۵، ۵۲، ۴۳، ۷۳، ۱۶۶، وموطأمالک، كتاب الجامع، باب ماجاء فی تركة النبی ﷺ، رقم: ۱۵۷۷.

کی چھوڑی ہوئی میراث تقسیم کرنے کا سوال کیا۔ **"ماترک رسول اللہ ﷺ مما افاء اللہ علیہ"** جو کچھ ترکہ نبی کریم ﷺ نے اس مال میں سے چھوڑا ہے، جو اللہ جل جلالہ نے آپ کو بطور **"فئی"** عطا فرمایا تھا۔

"فقال لھا أبو بکر" صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **"إن رسول اللہ ﷺ قال": ((لا نورث ماترکنا صدقة))** نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ہماری وراثت کسی کو نہیں ملتی اور ہم کوئی میراث نہیں چھوڑتے، ہم نے جو کچھ چھوڑا، وہ سب صدقہ ہے۔ **"فغضبت فاطمة"** حضرت فاطمہؓ ناراض ہوگئیں اور انہوں نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو چھوڑ دیا یعنی ان سے بات چیت بند کردی۔ **"فلم تزل مھاجرته"** اور چھوڑا نہیں صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو یہاں تک کہ ان کی وفات ہوگئی اور وہ نبی کریم ﷺ کے بعد چھ مہینہ زندہ رہیں۔

اس روایت کا حاصل یہ ہے کہ اس پورے عرصہ میں انہوں نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے بات چیت نہیں کی۔ یہ روایت یہاں اس طرح ہے اور بخاری میں دوسری جگہ ہے کہ **"فلم تکلمه حتی ماتت"** بات چیت نہیں کی، یہاں تک کہ ان کا انتقال ہوگیا۔

اس سے عام طور پر یہ بات پھیلائی گئی ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قطع تعلق کرلیا تھا اور انتقال کے وقت تک ان کے تعلقات صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے ٹھیک نہ تھے اور بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ یہاں تک کہ جب حضرت فاطمہؓ کی وفات ہوئی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو بتایا تک نہیں، خود نماز جنازہ پڑھ لی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بھی شریک نہ ہوئے۔

عام طور سے یہ ایک منظر ہے جو لوگوں میں مشہور ہے اور روایتوں سے سامنے آتا ہے، لیکن تحقیق یہ ہے کہ یہ بات سرے سے غلط ہے اور یہ جملہ کہ حضرت فاطمہؓ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قطع تعلق کرلیا تھا، بات چیت کرنی چھوڑ دی تھی، درحقیقت یہ امام زہریؒ کا ادراج ہے، حضرت عائشہؓ کی اصل حدیث میں یہ حصہ نہیں ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ سنن بیہقی میں یہ روایت آئی ہے، اس میں صراحۃً بیچ میں **"قال"** کا لفظ موجود ہے۔ یعنی زہری نے کہا کہ **"فلم تکلمه حتی ماتت یا فھجرته حتی ماتت"** مرتے دم تک حضرت فاطمہؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے قطع تعلق رکھا، دوسری روایات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔

ایک روایت سے استدلال

ابن شاہین رحمہ اللہ کی **"کتاب الخمس"** میں روایت ہے کہ ایک دن حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور جا کر اجازت طلب کی۔ جب اجازت مل گئی تو اندر تشریف لے گئے اور جا کر عرض کیا کہ شاید آپ کی طبیعت میں میری طرف سے خلش ہے، لیکن میں نے جو کچھ کیا وہ آپ ﷺ کے فرمان کے عین مطابق کیا اس بنا پر کیا اور ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ کے پاس آنحضرت ﷺ کی طرف سے کوئی

وصیت ہے تو **"فانت الصادقة"** آپ سچی ہیں، میں اسی وقت اس سے دستبردار ہونے کو تیار ہوں، پھر حضرت فاطمہؓ راضی ہوگئیں۔ [۲]

نیز بیہقی میں ہے کہ وہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو راضی کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ راضی ہوگئیں۔ یہ الفاظ روایت میں موجود ہیں۔ [۳]

ابوداؤد میں ایک روایت ہے، جس میں یہ کہا گیا ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ نے آکر یہ کہا کہ بتاؤ رسول اللہ کے وارث کون ہوں گے؟ تم ہوگے یا ان کے اقارب ہوں گے؟ تو حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ اقارب ہوں گے۔

حضرت فاطمہؓ نے فرمایا کہ پھر مجھے میراث کیوں نہیں دیتے؟ حضرت صدیق اکبرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جب اللہ جل جلالہ کسی نبی کو کوئی چیز عطا فرماتے ہیں تو اس کے بعد وہ اس شخص کے تصرف میں ہوگی جو اس کا خلیفہ بنے۔

حضرت فاطمہؓ نے فرمایا کہ **"لک وما سمعت"** آپ نے جو کچھ سنا ہے آپ کو اس پر عمل کرنے کا حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے ایک طرح سے صدیق اکبرؓ کے مؤقف کو تسلیم کرلیا۔

تمام روایات کو مدنظر رکھنے کے بعد جو بات میری سمجھ میں آتی ہے، وہ یہ ہے **"واللہ سبحانہ وتعالٰی اعلم"** کہ درحقیقت جس وقت صدیق اکبرؓ نے یہ بات فرمائی کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ فرمایا ہے کہ جو اللہ جل جلالہ کسی نبی کو کوئی چیز عطا فرماتے ہیں، اس کے بعد اس کا والی اور متصرف اس کا خلیفہ ہوتا ہے۔ حضرت فاطمہؓ خاموش ہوگئیں اور ان کو ایک طرح سے معذور قرار دیا۔

لیکن ایسا لگتا ہے کہ شاید ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ اس حدیث کی تفسیر اور تاویل مختلف ہوسکتی ہے، اس واسطے طبیعت میں تھوڑا سا تکدر برقرار رہا، لیکن وہ تکدر ہجران کی حد تک نہیں تھا کہ بات چیت کرنا چھوڑ دیں۔

جیسے دو مجتہدوں کے درمیان رائے کے اختلاف کی وجہ سے تکدر ہو جاتا ہے، اس قسم کا کچھ تھوڑا بہت تکدر برقرار رہا، جس کو بعد میں حضرت صدیق اکبرؓ نے جاکر دور کیا اور انہیں راضی کیا اور کہا کہ آپ تو حضور اقدس ﷺ کی صاحبزادی ہیں، ہر طرح سے آپ ﷺ کی خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں اور وہ راضی ہوگئیں۔

---

[۲] وقد ذكر في كتاب الخمس تأليف أبي حفص بن شاهين عن الشعبي : ان ابابكر قال لفاطمة : يابنت رسول الله ﷺ ماخير عيش حياة أعيشها وانت علي ساخطة ؟ فان كان عندك من رسول الله ﷺ في ذلك عهد فانت الصادقة المصدقة المامونة على ماقلت قال : فما قام ابو بكر حتى رضيت رضى . عمدة القاري ، ج: ١٠ ، ص: ٤٢٣.

[۳] سنن أبي داؤد ، كتاب الخراج و الإمارة و الفيء ، باب في صفايا رسول الله من الاموال ، رقم: ٢٥٧٤.

اس کے بعد حضرت فاطمہؓ بیمار ہوگئیں، اس وقت حضرت صدیق اکبرؓ دوبارہ گئے اور کہا کہ مجھ سے جو کچھ غلطی ہوئی آپ اسے معاف کردیں، ایسا نہ ہو کہ آپ دنیا سے اس حالت میں جائیں کہ میری طرف سے آپ کے دل میں کوئی کدورت ہو۔ حضرت فاطمہؓ نے فرمایا: کوئی بات نہیں ہے، بات بالکل صاف ہوگئی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے پھر اپنی اہلیہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا کو ان کے پاس بھیجا اور انہوں نے تیمارداری کی، یہاں تک کہ غسل بھی حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے دیا۔

اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی اہلیہ تیمارداری کررہی ہیں، غسل دے رہی ہیں اور صدیق اکبرؓ کو اطلاع نہ ہو اور وہ نماز جنازہ نہ پڑھائیں، یہ ممکن نہیں ہے، لہٰذا ایسی جتنی روایات آئی ہیں سب میں گڑبڑ واقع ہوئی ہے اور یہاں امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت میں **"فھجرت ابا بکر"** یہ زہری رحمہ اللہ کا ادراج ہے۔

امام زہری رحمہ اللہ کا ادراج

امام زہری رحمہ اللہ کا معاملہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ حدیث میں ثقہ ہیں، لیکن محدثین کے ہاں ان کے بارے میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ وہ روایتوں میں اپنی طرف سے ایسی باتوں کا ادراج کردیتے ہیں جو روایت کا حصہ نہیں ہوتیں۔

علامہ سیوطی اور حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہما اللہ نے ''تدریب الراوی'' اور ''النکت علی ابن الصلاح'' میں یہ بات صراحۃً بیان کی ہے کہ وہ اس طرح کا ادراج کرتے تھے اور محدثین ان کی اس بات پر نکیر کرتے تھے اور زہری رحمہ اللہ کا جو ارسال ہے وہ بھی **"أضعف المراسیل"** ہے۔ لہٰذا اس جملہ کا کوئی اعتبار نہیں۔ [۴]

آگے کہتے ہیں **"وکانت فاطمة تسأل أبا بکر نصیبها ما ترک رسول الله من خیبر وفدک وصدقته بالمدینة"۔**

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا حضرت صدیق اکبرؓ سے اپنا حصہ مانگ رہی تھیں جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے چھوڑا تھا خیبر، **''فدک''** اور مدینہ طیبہ میں صدقہ کا مال۔

حضور اکرم ﷺ کی ملکیت میں کچھ اموال تھے۔ مدینہ منورہ سے بنونظیر کو باقاعدہ جلاوطن کیا گیا تھا، ان کا چھوڑا ہوا مال فئی کے حکم میں تھا اور فئی میں امام کو اختیار ہوتا ہے، مجاہدین میں مال تقسیم نہیں ہوتا۔ اس میں کچھ حصہ نبی کریم ﷺ کا تھا اور کچھ حصہ آپ نے نوائب مسلمین کے لئے رکھ دیا تھا، کچھ حصہ آپ ﷺ کو خیبر میں ملا تھا۔

---

[۴] تدریب الراوی فی شرح تقریب النووی، ص: ۲۳۸ و النکت علی ابن الصلاح، ص: ۲۰۶، تکملة فتح الملهم، ج: ۳، ص: ۹۲.

”فدک“ کی تفصیل

”فدک“ یہ خیبر سے کچھ فاصلہ پر ایک مستقل قلعہ تھا، وہاں کے لوگوں نے حضور اکرم ﷺ سے صلح کر کے اپنا سب کچھ حضور اکرم ﷺ کے حوالہ کر دیا تھا، چونکہ وہ صلح کر کے حوالہ کیا تھا اس واسطے **”فدک“** - **”فئی“** میں داخل ہو گیا، جس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو مکمل اختیار حاصل تھا۔

وہ آنحضرت ﷺ کی ملکیت تھا اور اس ملکیت سے نبی کریم ﷺ اپنے عیال کا نفقہ ادا فرماتے تھے، اپنے اہل بیت کو بھی کچھ حصہ دیا کرتے تھے اور باقی جہاد میں اور فی سبیل اللہ خرچ فرماتے تھے۔

چونکہ نبی کریم ﷺ کی میراث تقسیم نہیں ہوتی تھی اس لئے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور اقدس ﷺ کے ارشاد کے بمطابق فدک کی تولیت اپنے پاس رکھی، لیکن ساتھ ہی اس بات کا التزام کیا کہ فدک کی آمدنی سے جن جن لوگوں کو حصہ جاتا ہے ان سب کا اسی طرح حصہ جائے جس طرح نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں جاتا تھا۔

چنانچہ آپ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی ازواج مطہرات اور اہل بیت، سب کو اسی طریقہ سے حصہ دینا شروع کیا۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے جب میراث کا سوال کیا تھا تو اس میں فدک کا سوال بھی داخل تھا، لیکن جب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل فرما دیا تو اس کے بعد حضرت فاطمہؓ خاموش ہو گئیں اور جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ اس کے بعد میں حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس کے متولی رہے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ متولی رہے، اس کے بعد جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ متولی رہے، تو انہوں نے بھی حضرت فاطمہؓ یا اپنی اولاد کو اس کے مالکانہ حقوق نہیں دیئے، بلکہ جس طرح کا تصرف حضرات شیخینؓ کرتے آئے تھے، اسی طرح کا تصرف حضرت علیؓ رضی اللہ عنہ نے بھی کیا اور پورے بنی امیہ کے دور میں یہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ جب خلافت عباسیہ کا دور آیا تو چونکہ شیعوں نے یہ پروپیگنڈہ کر رکھا تھا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فدک غصب کر رکھا ہے، اس لئے بنو عباس کے پہلے خلیفہ سفاح نے فدک پر قبضہ کر کے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی اولاد میں مالکانہ حقوق کے ساتھ دینا چاہا۔

اس وقت زید بن علی جو بنو ہاشم میں سے تھے اور امام تھے، شیعہ بھی انہیں امام مانتے ہیں انہوں نے سفاح پر نکیر کی کہ جو معاملہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کرتے آئے ہیں، آپ اس کو بدل رہے ہیں، میں اس کی مخالفت کرتا ہوں اور اس کو جائز نہیں سمجھتا۔

اس سے صاف واضح ہے کہ **”فدک“** کے معاملہ میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جو طریقہ اختیار فرمایا وہ نبی کریم ﷺ کے طریقہ کے عین مطابق تھا اور اس سے اہل بیت بھی مطمئن ہو گئے تھے۔

شیعوں کا استدلال

شیعہ عام طور سے اس روایت سے استدلال کرتے ہیں جو علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے مسند ابی یعلی کے حوالہ سے تفسیر درمنثور میں نقل کی ہے، اس میں یہ آتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں حضرت فاطمہؓ کو **"فدک"** عطا فرما دیا تھا، ہبہ کر دیا تھا۔[۵]

اس روایت کی بنا پر شیعہ بڑی بغلیں بجاتے ہیں کہ اس میں صاف صاف موجود ہے کہ فدک حضرت فاطمہؓ کو بھی دیا گیا تھا اور ان کی کتابوں میں تو ایسی واہی تباہی روایات بہت ہی ہیں، حالانکہ جو انہوں نے پیش کی ہیں انتہا درجہ کی ضعیف اور موضوع روایتیں ہیں، بلکہ شیعوں کی ایک روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ یہ مجھے ہبہ ہو گیا تھا اس وجہ سے میں اس کی مالکہ ہوں، میراث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ گواہ لے کر آؤ، اس پر حضرت فاطمہؓ نے دو گواہ پیش کر دیئے، ایک حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ایک ام ایمنؓ۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ آپ کا نصاب پورا نہیں ہے کیونکہ ایک مرد اور ایک عورت ہے یا تو ایک مرد دو عورتیں ہوں یا دو مرد ہوں، اس واسطے رد کر دیا۔

اول تو یہ روایت ہی غلط ہے اس کا کوئی سر اور پیر نہیں اور اگر صحیح ہو تب بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ درست ہے، اس واسطے کہ نصاب شہادت پورا نہیں، لیکن یہ سب شیعوں کی روایتیں ہیں۔

درمنثور کی ایک روایت کی تحقیق

علامہ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ نے درمنثور میں مسند ابی یعلی کے حوالہ سے ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فدک کی زمین حضرت فاطمہؓ کو ہبہ کر دی تھی۔ اس روایت کو اہل سنت کے خلاف بڑی زبردست حجت قاطعہ سمجھتے ہیں۔

لیکن میں نے مسند ابی یعلی میں اس کی تحقیق کی تو پتہ چلا کہ اس روایت کا مدار عطیہ العوفی پر ہے اور عطیہ عوفی اول تو ویسے ہی ضعیف راوی ہے اور اس کے علاوہ سب سے بڑی خرابی اس کے اندر یہ ہے کہ وہ عام طور سے کلبی سے روایتیں نقل کرتا ہے۔

سائب بن یزید کلبی مشہور شیعہ راوی اور مؤرخ ہے اور تفسیر میں بھی اس کی بہت سی روایتیں آتی ہیں، بڑا واہی تباہی قسم کا راوی ہے۔ مشکل یہ ہے کہ اہل سنت کی کتابیں بھی اس سے بھری ہوئی ہیں، یہ وہ شخص ہے جو کہتا ہے کہ **"حفظت مالم یحفظ أحد ونسیت مالم ینسه أحد"** میں نے تین دن میں قرآن کریم یاد کر لیا اور **"نسیت فأني جلست یو ما اقطع لحیتي من تحت قبضه فقطعتها فوقها"**۔

---

۵ مسند أبي یعلی، ج: ۲ ص: ۳۳۴، رقم: ۱۰۷۵، ۱۴۰۹، مطبع دار المامون للترک ۱۴۰۴ھ

اس کے ضعف اور خاص طور پر احکام میں اس کی روایت کے غیر معتبر ہونے پر اتفاق ہے، اس پر شیعہ ہونے کا الزام بھی ہے، کلبی کی کنیت ابوسعید ہے، عطیہ عوفی کلبی سے روایت کرتے وقت بکثرت **" عن أبی سعید "** کہتے ہیں، تاکہ لوگوں کو معلوم نہ ہو سکے کہ **" أبی سعید "** کون ہیں اور اس سے یہ بھی ارادہ ہوتا ہے کہ جب **" عن أبی سعید "** مطلقاً کہا جائے گا تو لوگ اس کو ابوسعید خدری ﷺ سمجھیں گے، چنانچہ بعض دفعہ خدری بھی لگا دیتے ہیں۔

اس وقت روایت کے ساتھ یہی واقعہ ہوا جو درّ منثور میں لکھا ہوا ہے۔[۶]

لیکن مسند ابی یعلی میں صرف ''ابی سعید'' ہے اور رجال کی کتابوں میں ہمارے محدثین نے (اللہ ان کو جزائے خیر دے، انہوں نے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے) بتا دیا ہے کہ جب عطیہ عوفی ابوسعید سے روایت کرتا ہے تو اس سے ابوسعید خدری ﷺ مراد نہیں ہوتے، بلکہ کلبی مراد ہوتا ہے، اس لئے اس روایت کا ان روایات کے مقابلہ میں کوئی بھروسہ نہیں جو ہمارے پاس صحیح طریقے سے پہنچی ہیں، لہٰذا فدک کی بنیاد پر حضرت صدیق اکبر ﷺ پر جو مطاعن کئے جاتے ہیں ان کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔ یہ خلاصہ ہے۔ اس کی تفصیل کے لئے **" تکملة فتح الملهم "** کی طرف مراجعت کی جا سکتی ہے۔[۷]

سوال: جب اس روایت میں ادراج پایا گیا تو کیا یہ علت خفیہ نہیں ہوگی؟

جواب: علت خفیہ اس معنی میں ہے کہ اس کو حضرت عائشہؓ کی طرف منسوب کرنا غلط ہوا، لیکن فی نفسہ یہ جملہ صحیح ہے اور حضرت عائشہؓ نے نہیں کہا، بلکہ زہری نے کہا ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لیں کہ ہم یہ جو کہتے ہیں کہ بخاری کی تمام احادیث صحیح ہیں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انہوں نے جو کچھ روایت کیا ہے اس کی ہر حدیث میں صحیح کی تعریف صادق آتی ہے، یعنی **" ما رواه العادل التام الضبط من غير انقطاع في الاسناد ولا علة ولا شذوذ "**۔

یہ مطلب نہیں کہ اس کا ایک ایک لفظ نفس الامر میں صحیح ہے۔ چنانچہ بہت ساری جگہوں پر راویوں سے وہم ہوا ہے اور اس وہم کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ ایک چیز کو جو کہ مدرج تھی اس کو اس طرح بیان کر دیا کہ وہ حدیث کا جزو معلوم ہو۔

لہٰذا اگر کہیں یہ بات کہی جائے کہ یہ حصہ فلاں کا ادراج ہے یا اس حصہ میں فلاں راوی سے وہم ہوا ہے، تو یہ حدیث کی صحت کے منافی نہیں ہے، حدیث کی صحت کے باوجود یہ بات کہی جا سکتی ہے۔

آگے کہتے ہیں **"فابى أبو بكر عليها ذلك، وقال: لست تاركا شيئا"**.

---

۶ الدرّ المنثور، ج: ۶ ص: ۲۸۶، عطية العوفي - منكر لايعرف، " المغني في الضعفاء "، ج: ۱، ص: ۱۲۸.

۷ تكملة فتح الملهم، ج: ۳، ص: ۸۶-۱۰۵.

مدینہ منورہ میں جو اموال تھے وہ اگرچہ میراث تو نہیں تھے، لیکن خلیفہ کے ذمہ تھا کہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں اور حضورِ اکرم ﷺ کے طریقہ کے مطابق تقسیم کریں، لیکن حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے خود یہ کرنے کے بجائے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دے دیا تھا کہ یہ حضرات خود انتظام کریں۔ بعد میں دونوں میں جھگڑا ہوگیا تھا، اس کا قصہ آگے آرہا ہے۔

"فامّا خيبر وفدك فا مسكها عمر" ان کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس رکھا **"وقال: هما صدقة رسول الله ﷺ كـا نتا لحقوقة التي تعروه و نوائبه"** یہ آپ کی پیش آمدہ ضروریات اور ان حقوق کے لئے تھا جو آپ پر لازم تھے۔

"قال : فهما على ذلك إلى اليوم" زہری کہہ رہے ہیں کہ یہ اب اسی طرح چلا آتا ہے یعنی خلیفہ ان کا انتظام کرتا ہے۔

۳۰۹۴ ـ حدثنا إسحاق بن محمد الفروی : حدثنا مالك بن أنس ، عن ابن شهاب ،عن مالك بن أوس بن الحدثان ،وكان محمد بن جبير ذكر لي ذكراً من حديثه ذلك ،فا نطلقت حتى أدخل على مالك بن أوس فسألته عن ذلك الحديث فقال مالك: بينما أنا جالس في أهلي حين متع النهار إذا رسول عمر بن الخطاب يأتيني، فقال: أجب أمير المؤمنين ،فانطلقت معه حتى أدخل على عمر فإذا هو جالس على رمال سرير ليس بينه وبينه فراش ،متكئ على وسادة من أدم فسلمت عليه ثم جلست ، فقال : يا مال ،إنه قدم علينا من قومك أهل أبيات ،وقد أمرت فيهم برضخ فاقبضه فاقسمه بينهم ، فقلت: ياأمير المؤمنين ،لوأمرت له غيري،قال : فاقبضه أيهاالمرء .فبينما أناجالس عنده أتاه حاجبه يرفا،فقال : هل لك في عثمان وعبدالرحمٰن بن عوف والزبير وسعد بن أبي وقاص يستأذنون؟قال : نعم ،فأذن لهم فدخلوا فسلموا وجلسوا ،ثم جلس يرفا يسيرا، ثم قال : هل لك في علي وعباس ؟ قال : نعم ،فأذن لهمافدخلا فسلما فجلسا ، فقال عباس : ياأمير المؤمنين ،اقض بيني وبين هذا ،وهما يختصمان فيما أفاء الله على رسوله ﷺ من مال بني النضير،فقال الرهط : عثمان وأصحابه ياأمير المؤمنين اقض بينهما ،وأرح أحدهما من الآخر،فقال عمر : تئدكم ،أنشدكم بالله الذي بإذنه تقوم السماء والأرض ،هل تعلمون أن رسول الله ﷺ قال : ((لا نورث ،ما تركنا صدقة))،يريد رسول الله ﷺ نفسه ؟قال الرهط : قد قال ذلك. فأقبل عمر على علي وعباس،فقال: أنشدكما [الله] تعلمان أن رسول الله ﷺ قد قال ذلك ؟ قال عمر: فإني

أحدثكم عن هذا الأمر، إن الله قد خص رسوله ﷺ في هذا الفيء بشيء لم يعطه أحدا غيره، ثم قرأ ﴿وما أفاء الله على رسوله منهم﴾ إلى قوله: ﴿قدير﴾ فكانت هذه خالصة لرسول الله ﷺ ووالله ما احتازها دونكم، ولا استأثر بها عليكم، قد أعطاكموه وبثها فيكم حتى بقي منها هذا المال، فكان رسول الله ﷺ ينفق على أهله نفقة سنتهم من هذا المال، ثم يأخذ ما بقي فيجعله مجعل مال الله فعمل رسول الله ﷺ بذلك حياته. أنشدكم بالله هل تعلمون ذلك؟ قالوا: نعم، ثم قال لعلي وعباس: أنشدكما الله هل تعلمان ذلك؟ قال عمر: ثم توفى الله نبيه ﷺ فقال أبو بكر: أنا ولي رسول الله ﷺ، فقبضها أبو بكر فعمل فيها بما عمل رسول الله ﷺ، والله يعلم إنه فيها لصادق بار راشد تابع للحق. ثم توفى الله أبابكر فكنت أنا ولي أبي بكر فقبضتها سنتين من إمارتي أعمل فيها بما عمل رسول الله ﷺ وما عمل فيها أبوبكر، والله يعلم إني فيها لصادق بار راشد تابع للحق. ثم جئتما ني تكلماني وكلمتكما واحدة وأمركما واحد، جئتني يا عباس تسألني نصيبك من ابن أخيك، وجاء ني هذا ـ يريد عليا ـ يريد نصيب امرأته من أبيهما فقلت لكما: إن رسول الله ﷺ قال: ((لا نورث، ما تركنا صدقة)). فلما بدا لي أن أدفعه إليكما قلت: إن شئتما دفعتها إليكما على عليكما عهدالله وميثاقه لتعملان فيها بما عمل فيها رسول الله ﷺ وبما عمل فيها أبوبكر وبما عملت فيها منذ وليتها، فقلتما: ادفعها رسول إلينا، فبذلك دفعتها إليكما. فأنشدكم بالله هل دفعتها إليهما بذلك؟ قال الرهط: نعم. ثم أقبل على علي وعباس، فقال: أنشدكما بالله، هل دفعتها إليكما بذلك؟ قالا: نعم. قال: فتلتمسان مني قضاء غير ذلك؟ فوالله الذي بإذنه تقوم السماء والأرض لا أقضي فيها قضاءً غير ذلك. فإن عجزتما عنها فادفعاها إلي، فإني أكفيكماها. [راجع: ۲۹۰۴]

مالک بن اوس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ "بینما أنا جالس في أهلي حين متع النهار" میں اپنے گھر والوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا جبکہ دن چڑھ چکا تھا کہ اچانک میرے پاس حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا ایک پیغامبر آیا۔

"فقال: أجب أمير المؤمنين" امیر المؤمنین کو جواب دو یعنی انہوں نے بلایا ہے۔

"فانطلقت معه حتى أدخل على عمر فإذا هو جالس على رمال سرير" حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ چارپائی کے بانوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور چارپائی کے درمیان کوئی بستر نہیں تھا۔ چمڑے کے تکیہ پر ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

"فسلمت عليه ثم جلست فقال: يا مال، انه قدم علينا من قومك أهل أبيات" کہ تمہاری

قوم کے اہل ابیات کے کچھ لوگ ہمارے پاس آئے تھے۔ **"ابیـات، بیت"** کی جمع ہے، خاندان مراد ہے، **"وقد أمرت فيهم برضخ فاقبضه فاقسمه بينهم"** اور میں نے ان کو حکم دیا تھا کہ تھوڑا بہت مال لے لو اور اپنے خاندان والوں میں تقسیم کردو۔

میں نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اگر آپ میرے علاوہ کسی اور کو حکم دے دیں کہ وہ تقسیم کرے تو اچھا ہے۔ انہوں نے کہا: اے آدمی، تم ہی قبضہ کرو۔

"فبينما أنا جالس عنده أتاه حاجبه يرفا" آپ کے دربان "یرفا" آئے، "یرفا" غلام کا نام ہے۔

"فقال: هل لك في عثمان و عبد الرحمٰن بن عوف والزبير وسعد بن أبي وقاص يستأذنون؟" یہ حضرات اجازت طلب کررہے تھے۔

"قال: نعم، فأذن لهم فدخلوا فسلموا وجلسوا" یہ حضرات آکر بیٹھ گئے۔

ان میں سے حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم یہ چاروں عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں۔

پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ آئے۔ عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میرے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے درمیان فیصلہ کردیجئے۔

اب یہ چچا بھتیجے کا معاملہ تھا، اس میں چچا نے بھتیجے کے لئے ذرا سخت الفاظ استعمال کئے۔

"وهما يختصمان" نبی کریم ﷺ کو بنی نضیر سے جو مال ملا تھا ان کا اس کے بارے میں جھگڑا ہورہا تھا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا تولیت میں نزاع

جھگڑا یہ تھا حضور ﷺ کے ترکہ کا متولی وقت کا خلیفہ ہوتا تھا لیکن وہ اسے ان ہی مصارف میں صرف کرتا تھا جن مصارف میں حضور اکرم ﷺ صرف کیا کرتے تھے۔

باقی تو سارے اموال خلیفہ نے اپنے پاس رکھے ہوئے تھے، البتہ بنو نضیر کے فئی کی کچھ زمینیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو دیدی تھیں کہ ان کا انتظام آپ لوگ کریں۔

اب اس انتظام، مصرف یا کسی اور چیز میں آپس میں اختلاف ہوگیا، تو اس وقت یہ دونوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے، حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس لے کر جائیں اور ان سے کہیں کہ اس پوری زمین کا ہم دونوں کو مشترک متولی بنانے کے بجائے زمین ہمارے درمیان تقسیم کردیجئے کہ اتنے حصہ کا متولی حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بنادیں اور اتنے حصہ کا مجھے بنادیں، تاکہ کوئی اختلاف اور جھگڑا باقی نہ رہے۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ کرنا گوارا نہیں کیا، اس لئے کہ اگر یہ تقسیم کردیتے تو لوگوں کا عام تأثر یہ ہوتا

کہ جو زمین حضرت علی ﷺ کو دی گئی ہے، وہ ان کی ملکیت ہوگئی اور جو حضرت عباس ﷺ کو دی گئی ہے وہ ان کی ملکیت ہو گئی، تو تولیت کی بات باقی نہ رہتی۔ چونکہ لوگوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہونے کا امکان تھا کہ یہ ان کو ملکیۃ دے دی گئی ہے، اس لئے حضرت فاروق اعظم ﷺ نے اس عمل سے انکار کیا۔ یہ پوری حدیث کا خلاصہ ہے۔

"فقال الرهط عثمان وأصحابه" جو حضرات (حضرت عثمان ﷺ وغیرہ) پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا: اے امیر المؤمنین ان کے درمیان فیصلہ کر دیں اور ان میں سے ایک کو دوسرے سے راحت دیدیں۔ مطلب یہ ہے کہ تقسیم کردیں **"فقال عمر: تئدكم"** حضرت عمر ﷺ نے فرمایا: ٹھہرو، **"تئدكم، تئد"** سے نکلا ہے **"تئد"** کے معنی ہیں تحمل کرنا اور **"تئدكم"** محاورۃ اس وقت کہتے ہیں جب یہ کہنا ہو کہ ٹھہرو، جلدی مت کرو۔

"انشدكم بالله" میں تم کو اللہ کی قسم دیتا ہوں جس کے حکم سے آسمان و زمین کھڑے ہیں۔ **"هل تعلمون إن رسول الله ﷺ "قال: ((لانورث، ما تركنا صدقه الخ))** لوگوں نے کہا: جی ہاں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔ **"قال عمر: فاني أحدثكم"** میں اس معاملہ کے بارے میں بتاتا ہوں کہ اللہ ﷻ نے اس فئی کے بارے میں اپنے رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسے اختیار کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا کہ جو اختیار آپ کے سوا کسی اور کو نہیں دیا، معنی یہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے لئے فئی کو مخصوص کر دیا تھا۔

صورت حال یہ تھی کہ پچھلی امتوں میں مال غنیمت کو آگ کھالیا کرتی تھی اور اس امت کے لئے یہ مقرر کر دیا گیا کہ خمس بیت المال میں دیا گیا اور باقی چار اخماس غانمین میں تقسیم کئے گئے۔

مال فئی اور اس کا حکم

مال فئی سے مراد وہ مال ہے جو مسلمانوں کے قبضہ میں لشکر کشی کے بغیر آ گیا ہو۔ اس کے بارے میں نبی کریم ﷺ کو کلی اختیار دیا گیا تھا کہ وہ بحیثیت امام جس طرح چاہیں اس کو مسلمانوں کے مصالح میں خرچ کریں، حضرت فاروق اعظم ﷺ اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

بنو نضیر سے جو مال قبضہ میں آیا تھا وہ بھی فئی تھا، مال غنیمت نہیں تھا، کیونکہ ان سے لڑائی کے ذریعہ حاصل نہیں کیا گیا بلکہ صلحاً حاصل کیا گیا، اس واسطے آپ ﷺ نے فرمایا کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اس فئی کے بارے میں ایک ایسے اختیار کے ساتھ مخصوص کر دیا تھا جو اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی اور کو نہیں دیا، اور وہ یہ ہے **"أفاء الله على رسوله منهم"** اگرچہ حضور اکرم ﷺ کو مکمل اختیار تھا، اگر وہ چاہتے تو ساری فئی اپنے لئے رکھ لیتے، لیکن اللہ کی قسم نبی کریم ﷺ نے اس ساری فئی کے اموال کو اپنے پاس نہیں رکھا۔ **"دونكم"** تمہارے بغیر اور نہ خود کو تمہارے اوپر ترجیح دی ہے، یعنی ایسا نہیں کیا کہ اپنے آپ کو ترجیح دے کر خود رکھ دیا ہو اور تمہیں نہ دیا ہو، حضور اکرم ﷺ نے تمہیں دیا اور تمہارے درمیان تقسیم کیا یہاں تک کہ اس میں سے یہ باقی رہ گیا جس کی تولیت کا مسئلہ ہے۔

"فکان رسول اللہ ﷺ ینفق" آپ ﷺ اسی سے اپنے اہل کو سال بھر نفقہ دیا کرتے تھے، باقی جو رہ جاتا تھا وہ بھی مسلمانوں کے مصالح، جہاد اور فقراء وغیرہ پر صرف کرتے تھے۔

"فعمل رسول اللہ ﷺ .... نصیبک من ابن اخیک" دو سال تک میں انتظار کرتا رہا، پھر تم دونوں آئے (یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ وعباس رضی اللہ عنہ) مجھ سے بات کرنے کے لئے اور تمہاری بات ایک تھی، تمہارا معاملہ بھی ایک تھا یعنی تمہارے درمیان کوئی اختلاف نہیں تھا۔ اے عباس! آپ آئے کیا آپ اپنے بھتیجے کے حصہ میں سے مانگ رہے تھے یعنی نبی کریم ﷺ کے ترکہ میں سے؟

"وجاء نی هذا .... قضاء غیر ذلک" میرے پاس یہ یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے جو اپنی اہلیہ کا حصہ ان کے والد کے حصہ میں سے مانگ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ میراث تو نہیں ہو سکتی۔ جب میری رائے یہ ہوئی کہ آپ کو دے دوں تو آپ نے یہ کہا: ہمیں ولایت کے طور پر دے دو۔ اب اگر تم چاہتے ہو کہ اس کے سوا کوئی فیصلہ کروں تو" **فواللہ الذی بإذنه تقوم لسماء والأرض لاقضی فیها قضاء غیر ذلک"**.

"فإن عجزتما...........فإنی أکفیکماها" اگر تم اس کی تولیت سے عاجز ہو رہے ہو تو مجھے دے دو، میں تمہارے لئے اس کے انتظام میں خود کروں گا۔ خلاصہ یہ نکلا کہ الگ الگ تقسیم کر کے تولیت دینے سے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے انکار کر دیا اور کہا کہ یا تو جس طرح پہلے دونوں مشترک انتظام کر رہے تھے اسی طرح کرتے رہو یا مجھے واپس کر دو۔

(۳) باب نفقة نساء النبی ﷺ بعد وفاته

۳۰۹۷ ــ حدثنا عبد اللہ بن أبی شیبة: حدثنا أبو أسامة: حدثنا هشام، عن أبیه، عن عائشة قالت: توفی رسول اللہ ﷺ وما فی بیتی من شیء یأکله ذو کبد إلا شطر شعیر فی رف لی، فأکلت مه حتی طال علی فکلته ففنی. [أنظر: ۶۴۵۱]. [۸]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ نبی کریم ﷺ کی وفات ہوئی اس حالت میں کہ میرے گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کو جگر والا کھا سکے، الا یہ کہ جو کا ایک صاع تھا جو میرے پاس طاق میں رکھا ہوا تھا، **"فأکلت منه"** پس میں اس سے بہت عرصہ تک کھاتی رہی، بعد میں میں نے اس کو ناپ لیا کہ کتنا ہے تو وہ ختم ہو گیا۔

---

[۸] وفی صحیح مسلم، کتاب الزهد والرقائق، رقم: ۵۲۸۱، وسنن الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق والورع عن رسول اللہ، باب منه، رقم: ۲۳۹۱، وسنن ابن ماجة، کتاب الاطعمة، باب خبز الشعیر، رقم: ۳۳۳۶، ومسند احمد، باقی مسند الانصار، باب حدیث السیدة عائشة، رقم: ۲۳۶۲۴.

(۴) باب ما جاء فی بیوت أزواج النبی ﷺ وما نسب من البیوت إلیهن،

وقول الله عز وجل: ﴿وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ﴾ [۹] و ﴿لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَنْ يُؤْذَنَ لَكُمْ﴾ [۱۰]

میراث سے تعلق نہیں

یعنی نبی کریم ﷺ کی ازواج مطہرات کے جو گھر تھے، وہ قرآن وحدیث اور صحابہ کرام ﷺ کی زبانوں پر بھی ازواج مطہرات کی طرف منسوب کئے گئے جیسا کہ کہا جاتا تھا یہ حضرت عائشہؓ، حضرت ام سلمہؓ اور یہ حضرت حفصہؓ کا گھر ہے وغیرہ۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس سے یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ چونکہ وہ گھر ان کے لئے نبی کریم ﷺ نے مخصوص کر دیئے تھے اس واسطے ان کی طرف نسبت کی جاتی تھی، ملکیت ان میں سے کسی کی بھی نہیں تھی، لہذا کسی کو شبہ نہ ہو کہ ازواج مطہرات نے تو میراث پالی اور دوسرے اہل بیت نے نہیں پائی۔

وہ گھر رسول اللہ ﷺ کے زمانہ ہی سے ان کو استعمال کے لئے دے دیئے گئے تھے اور یہ بات نبی کریم ﷺ کی وصال کے بعد بھی باقی رہی کہ ازواج مطہرات کو ان گھروں کے استعمال کا حق دیا گیا اور اس استعمال کے حق کی وجہ سے "بیوت" کی نسبت ان کی طرف کی گئی، میراث سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۵) باب ما ذکر من درع النبی ﷺ وعصاه وسیفه وقدحه وخاتمه، وما استعمل الخلفاء بعده من ذلک مما لم یذکر قسمته، ومن شعره ونعله وآنیته مما تبرک أصحابه وغیرهم بعد وفاته.

حضور اکرم ﷺ کے تبرکات مختلف صحابہ ﷺ کے پاس موجود ہیں۔

بتلانا یہ مقصود ہے کہ میراث تقسیم نہیں ہوئی، لیکن حضور ﷺ کے مختلف تبرکات مختلف صحابہ ﷺ کو دے دیئے گئے تھے یا تو آپ ﷺ کی حیات ہی میں یا آپ ﷺ کی وفات کے بعد، میراث کے طور پر نہیں بلکہ لوگوں نے تبرکاً رکھے۔

۳۱۱۰ ـ حدثنا سعید بن محمد الجرمی: حدثنا یعقوب بن إبراهیم: حدثنا أبی أن الولید بن کثیر حدثه عن محمد بن عمرو بن حلحلة الدؤلی حدثه: أن ابن شهاب حدثه: أن علی بن حسین حدثه: أنهم حین قدموا المدینة من عند یزید بن معاویة مقتل

---

۹ [الاحزاب: ۵۳] ۱۰ [الاحزاب: ۳۳]

الحسين بن علي لقيه المسور بن مخرمة فقال له: هل لک إلى من حاجة تأمرني بها؟ فقلت له: لا ، فقال : فهل أنت معطي سيف رسول الله ﷺ فإني اخاف أن يغلبک القوم عليه؟ وايم الله لئن أعطيتنيه لا يخلص إليه أبدا، حتى تبلغ نفسي. إن علي بن أبي طالب خطب ابنة أبي جهل على فاطمة فسمعت رسول الله ﷺ يخطب الناس في ذلک على منبره هذا، وأنا يومئذ المحتلم فقال: ((إن فاطمة مني، وأنا أتخوف أن تفتن في دينها)). ثم ذكر صهرا له من بني عبد شمس فأثنى عليه في مصاهرته إياه، قال: ((حدثني فصدقني ووعدني فوفى لي، وأني لست أحرم حلالا، ولا أحل حراما، ولكن والله لا تجتمع بنت رسول الله ﷺ وبنت عدو الله أبدا)). [۱۱]

حدیث کا مطلب

حضرت علی بن حسین ؒ جن کو زین العابدین کہا جاتا ہے، حضرت حسین ؓ کے صاحبزادے ہیں، وہ روایت کررہے ہیں کہ **"انهم حين قدموا المدينة"** جب یہ حضرت حسین ؓ کی شہادت کے بعد یزید بن معاویہ ؓ کے پاس واپس مدینہ منورہ آئے، (یہ بچ گئے تھے)۔

"لقيه المسور بن مخرمة" تو مسور بن مخرمہ ؓ ان سے ملے اور کہا۔ **"هل لک إلى"** اگر آپ کا کوئی کام ہو تو مجھے بتائیے، میں وہ کام کروں۔ حضرت علی بن حسین ؒ نے کہا کہ کوئی کام نہیں ہے۔

"مسور بن مخرمة" نے ان سے کہا: کیا آپ کے پاس رسول اللہ ﷺ کی جو تلوار ہے وہ مجھے دے دیں گے؟ کیونکہ اندیشہ ہے کہ لوگ آپ پر تلوار کے بارے میں غلبہ پالیں گے۔ معنی یہ ہے کہ آپ کے پاس نہیں چھوڑیں گے، آپ سے حاصل کرنے کی فکر کریں گے۔ اس واسطے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگوں کی پریشانی اٹھانے کے بجائے وہ تلوار مجھے دیدیں۔

"وايم الله" اور میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اگر یہ آپ نے مجھے دیدی تو کبھی بھی اس تک کوئی شخص نہیں پہنچ سکے گا۔ یہاں تک کہ میری جان چلی جائے، جب تک میرے دم میں دم ہے، مجھ سے کوئی نہیں لے سکے گا، یہ تو پیشکش تھی۔

---

[۱۱] وفي صحيح مسلم ، كتاب فضائل الصحابة ، باب فضائل فاطمة بنت النبي ﷺ ، رقم : ۴۴۸۲، وسنن أبي داؤد، كتاب النكاح ، باب مايكره أن يجمع بينهن من النساء ، رقم : ۱۷۷۲ ،وسنن ابن ماجة ، كتاب النكاح ، باب الغيرة ، رقم : ۱۹۸۸ ، ومسند احمد ، اول مسند الكوفيين ، باب حديث المسور بن مخرمة الزهري ومروان بن الحكم ، رقم . ۱۸۱۴۹، ۱۸۱۵۳، ۱۸۱۶۴.

اب آگے کہہ رہے ہیں کہ میں یہ بات جو کہہ رہا ہوں کہ مجھے دیدیجئے، اس کا منشأ آپ کے ساتھ محبت اور تعلق ہے، کیونکہ آپ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں اور حضرت فاطمہؓ سے نبی کریم ﷺ کو اتنی محبت تھی کہ آپ ﷺ نے فرمایا تھا **"ان فاطمة بضعة منی"** اور پھر وہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنت ابی جہل سے نکاح کا ارادہ کیا تھا اس پر آپ ﷺ نے خطبہ دیا تھا، واقعہ گزر چکا ہے۔

پھر جس طرح حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے محبت کی تھی، اسی طرح میں آپ سے محبت کرتا ہوں کیونکہ آپ ان کے پوتے ہیں۔

۳۱۱۱ ۔ حدثنا قتيبة بن سعيد: حدثنا سفيان، عن محمد بن سوقة، عن منذر، عن ابن الحنفية قال: لو كان علي رضی اللہ عنہ ذاكرا عثمان رضی اللہ عنہ ذكره يوم جاء ه ناس فشكوا سعاة عثمان فقال لي علي: اذهب إلى عثمان فأخبره أنها صدقة رسول الله ﷺ، فمر سعاتك يعملوا بها فأتيته بها، فقال: أغنها عنا. فأتيت بها عليا فأخبرته فقال: ضعها حيث أخذتها .[أنظر: ۳۱۱۲]. [۱۲]

محمد بن حنفیہ جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہنے والے ہوتے تو اس دن کہتے، آگے اس دن کا واقعہ بیان کر رہے ہیں۔

یہ ان لوگوں کی تردید کر رہے ہیں جو یہ کہتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے میں بدگوئی کیا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بدگوئی کرنی ہوتی تو اس دن کرتے جس دن کچھ لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تھے اور آکر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مصدقین کی شکایت کی تھی کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زکوۃ وصول کرنے والے آتے ہیں اور ہم سے خلاف شرع زیادہ لے کر جاتے ہیں۔

"فقال لی علی"، محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس جاؤ اور ان کو یہ صحیفہ دیدو اور کہو یہ رسول اللہ ﷺ کا صدقہ ہے، حضور اکرم ﷺ نے صدقہ کے جو کچھ احکام طے فرمائے تھے وہ اس میں لکھے ہوئے ہیں، یہ وہی ہے جو ان کی تلوار کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ تو اپنے زکوۃ وصول کرنے والے کو حکم دیجئے کہ وہ اس صحیفہ کے مطابق عمل کرے۔

چنانچہ میں (محمد بن حنفیہ) اس کو لے کر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس گیا۔ **"فقال : أغنها عنا"** آپ نے فرمایا کہ اس کو ہمارے پاس سے لے جاؤ۔ لفظی معنی ہے اس کو ہم سے بے نیاز کردو۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے پاس پہلے سے احکام موجود ہیں، اس کو اپنے پاس رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

"فأتيت بها عليا فأخبرته" میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس دوبارہ لے آیا اور ان کو بتایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا ہے۔ **"فقال: ضعها"** آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جہاں سے لیا تھا وہیں رکھ دو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بارے

[۱۲] وفي مسند احمد، مسند العشرة المبشرين بالجنة، رقم : ۱۱۳۴.

میں کوئی نازیبا کلمہ نہیں فرمایا۔ اگر فرمانا ہوتا تو اس وقت فرماتے کہ ایک تو شکایت تھی، دوسری بات یہ کہ صدقات کی کتاب واپس ہو رہی، تو اس وقت کوئی کلمہ کہتے کہ عجیب آدمی ہے، کتاب لوٹا دی، لیکن اس وقت بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔

(٦) باب الدليل على أن الخمس لنوائب رسول الله ﷺ والمساكين. وإيثار النبى ﷺ أهل الصفة والأرامل حين سألته فاطمة وشكت إليه الطحن والرحى أن يخدمها من السبى فوكلها إلى الله.

خمس کے احکام

یہاں امام بخاری رحمہ اللہ نے خمس کی تقسیم کے سلسلے میں کئی ابواب قائم فرمائے ہیں۔

جیسا کہ قاعدہ ہے کہ غنیمت کے چار حصے تو غانمین میں یعنی مجاہدین میں تقسیم ہوتے ہیں اور ایک خمس بیت المال میں جاتا ہے۔ بیت المال میں جو خمس جاتا ہے اس کے لئے اللہ جل جلالہ نے قرآن کریم میں فرمایا:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ ﴾ [۱۳]

ترجمہ: ''اور جان رکھو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے کسی چیز سے سو اللہ کے واسطے ہے، اس میں سے پانچواں حصہ اور رسول کے واسطے اور اس کے قرابت والوں کے واسطے اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں کے واسطے''۔

گویا پانچ مدات کا بیان ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا تو محض تبرک کا ذکر ہے، باقی پانچ رہ گئے۔ رسول، ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل۔

خمس میں حنفیہ اور حنابلہ کا مؤقف

حنفیہ اور حنابلہ کا مؤقف یہ ہے کہ اس میں اللہ جل جلالہ اور رسول ﷺ کا ذکر تبرکاً ہے، رسول اللہ ﷺ کا حصہ آپ

---

۱۳ [الانفال: ۴۱]

کی وفات کے ساتھ ختم ہو گیا۔

اسی طرح ذوی القربی سے نبی کریم ﷺ کے اہل بیت مراد ہیں، ان کا حصہ بھی نبی کریم ﷺ کے وصال کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اب تین باقی رہ گئے، یتامی، مساکین اور ابن السبیل خمس ان میں تقسیم کیا جائے گا۔

امام مالک رحمہ اللہ کا مؤقف

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ذوی القربی، نبی کریم ﷺ کے اہل بیت اب بھی خمس کے اندر بطور مصرف باقی ہیں نہ کہ بطور مستحق۔

مصرف اور مستحق میں فرق

مصرف اور مستحق میں فرق ہے۔ مصرف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر امام چاہے تو تقسیم میں ان کو بھی دیدے۔ خواہ وہ غنی ہوں یا فقیر ہوں، لیکن ان کو مطالبہ کا حق نہیں ہے کہ وہ بطور استحقاق کہیں کہ چونکہ اب صرف چار مصرف باقی رہ گئے ہیں اس لئے خمس کے چار حصے کئے جائیں اور ایک حصہ ہمیں دیا جائے، ایک یتامی کو، ایک مساکین کو اور ایک ابن السبیل کو، تو بطور مستحق نہیں ہیں بلکہ بطور مصرف ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ وہ بطور مستحق اب بھی باقی ہیں، لہٰذا وہ کہتے ہیں کہ خمس کا پانچواں حصہ اب بھی نبی کریم ﷺ کے رشتہ داروں کو دینا ہوگا، چاہے وہ غنی ہوں یا فقیر ہوں۔

حنفیہ اور حنابلہ کہتے ہیں کہ بطور مصرف اور مستحق تو ان کا حصہ ختم ہو گیا ہے، البتہ جو ان میں اہل فقر ہیں وہ مسکین یا ابن السبیل کے ذیل میں آجائیں گے، اگر اس حیثیت سے دیا جائے تو وہ دوسری بات ہے، لیکن بحیثیت ذوی القربی ان کو کوئی خمس نہیں دیا جائے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال

امام شافعی رحمہ اللہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن کریم میں ذوی القربی موجود ہے، اس کو کیسے منسوخ کہا جائے۔

حنفیہ اور حنابلہ کا استدلال

حنفیہ اور حنابلہ کا استدلال حضرات خلفاء راشدین ﷺ کے عمل سے ہے، خلفائے راشدین ﷺ حضرت

ابوبکر رضی اللہ عنہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک چاروں نے ذوی القربی کو الگ سے **"سھم"** نہیں دیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ آگے جو احادیث لا رہے ہیں ان سے بھی یہ پتہ چل رہا ہے کہ ذوی القربی کا **"سھم"** الگ نہیں کیا گیا۔ تو چاروں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کا یہ عمل رہا کہ وہ صرف اہل فقر کو دیتے رہے، اہل غنا کو بطور **"سھم"** نہیں دیا۔

امام مالک رحمہ اللہ کی دلیل

امام مالک رحمہ اللہ دونوں کو جمع کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ قرآن میں بطور مصرف ذکر ہے اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے نہیں دیا، یہ ان کی صوابدید ہے، لہٰذا آج بھی امام کی صوابدید پر ہے، چاہے دے چاہے نہ دے۔

حنفیہ اور حنابلہ کے قول پر اور بھی متعدد احادیث شاہد ہیں، علامہ بدر الدین عینی رحمہ اللہ نے **"عمدۃ القاری"** میں بھی اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

"تکملہ فتح الملھم" میں میں نے تمام دلائل جمع کر دیئے ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ **"ذوی القربی"** کا **"سھم"** ساقط ہو گیا ہے۔ [۱۴]

امام بخاری رحمہ اللہ یہ باب قائم کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ **"باب الدلیل علی أن الخمس لنوائب رسول اللہ ﷺ الخ"** کہ خمس رسول اللہ ﷺ کے نوائب کے لئے تھا اور مساکین کے لئے تھا۔

"نوائب" کے معنی ہیں آپ کو پیش آنے والی حاجتیں اور آپ کو پیش آنے والی حاجتوں سے تمام مسلمانوں کو پیش آنے والی حاجتیں مراد ہیں۔ اور یہ بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اہلِ صفہ اور بیواؤں کو ترجیح دی جب کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے سوال کیا اور شکایت کی کہ **"الطحن والرحی"** چکی پیسنے میں مجھے مشقت ہوتی ہے، خواہش ظاہر کی کہ مجھے قیدیوں میں سے کوئی خادم دید یجئے۔

"فو کلھا إلی اللہ" آنحضرت ﷺ نے ان کو اللہ کے حوالہ کیا اور تسبیح فاطمی تلقین فرمائی جیسا کہ آگے حدیث میں آرہا ہے۔

اگر **"ذوی القربیٰ"** کا باقاعدہ کوئی **"سھم"** ہوتا تو آنحضرت ﷺ ان کی اس خواہش کو رد نہ فرماتے کیونکہ وہ تو ذوی القربیٰ ہونے کی وجہ سے باقاعدہ مستحق ہوتیں، امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہی بتلانا ہے۔

(۷) باب قولہ تعالی: ﴿فَأَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُوْلِ﴾ [۱۵]

یعنی للرسول قسم ذلک. وقال رسول اللہ ﷺ: ((إنما أنا قاسم وخازن، واللہ یعطی)).

یہ باب بھی اسی سلسلہ میں قائم کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو خمس کی تقسیم کا جو حق دیا گیا ہے اس میں یہ

---

۱۴ تکملة فتح الملھم، ج: ۳، ص: ۲۵۴-۲۵۷، والعینی فی "العمدۃ" ج: ۱۰، ص: ۴۴۶۔ ۱۵ [الأنفال: ۴۱]

ضروری قرار نہیں دیا گیا کہ آپ خمس کا پانچواں حصہ ذوی القربیٰ کو دیں، تو امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے مسلک کی تردید کرنا مقصود ہے۔

۳۱۱۵ ـ حدثنا محمد بن یوسف :..........ولا ننعمک عینا. فقال النبی ﷺ : ((أحسنت الأنصار،فسموا باسمی ولاتکنوا بکنیتی فإنما أناقاسم)).

"ولا ننعمک عینا" یعنی اس نام سے تمہاری آنکھیں ٹھنڈی نہیں کریں گے کہ تم اپنے بیٹے کا نام قاسم رکھو، پھر آپ نے انصار کی تائید فرمائی کہ میرا نام رکھ لیا کرو یعنی "محمد" لیکن میری کنیت نہ رکھو۔

اس کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی کہ میں قاسم ہوں تمہارے درمیان اموال تقسیم کرتا ہوں، بعض علمائے کرام نے دوسری وجہ بیان فرمائی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کو "یا محمد" کہہ کر کوئی نہیں پکارتا تھا، اس لئے اس میں کسی التباس کا اندیشہ نہیں تھا۔ جو مسلمان تھے وہ "یا رسول اللہ" کہتے تھے اور جو غیر مسلم تھے وہ "یا اباالقاسم" کہتے تھے، تو ابوالقاسم کنیت رکھنے میں التباس کا اندیشہ تھا کہ کہیں حضور اقدس ﷺ مراد نہ ہوں، چونکہ "یا محمد" کہنے میں کوئی اندیشہ نہیں تھا، اس لئے نام رکھنے کی اجازت دی اور کنیت رکھنے کی اجازت نہیں دی۔

۳۱۲۴ ـ حدثنا محمد بن العلاء ،عن ابن المبارک ، عن معمر ،عن همام بن منبه ،عن أبی هریرة ﷺ قال :قال النبی ﷺ :((غزا نبی من الأنبیاء ، فقال لقومه :لا یتبعنی رجل ملک بضع امرأة ،وهو یرید أن یبنی بها ولما یبن بها . ولا أحد بنی بیوتا ولم یرفع سقوفها ، ولا آخر اشتری غنما أو خلفات وهو ینتظر ولادها . فغزا فدنا من القریة صلاة العصر أو قریبا من ذلک .فقال للشمس :إنک مأمورة وأنا مأمور ،اللّٰهم احبسها علینا ،فحبست حتی فتح الله علیهم ،فجمع الغنائم ، فجاء ت ـ یعنی النار ـ لتأکلها فلم تطعمها فقال: إن فیکم غلولا ، فلتبایعنی من کل قبیلة رجل، فلزقت ید رجل بیده فقال : فیکم الغلول ، فلتبایعنی قبیلتک ، فلزقت ید رجلین أو ثلاثة بیده ،فقال:فیکم الغلول ،فجاؤا برأس مثل رأس بقرة من الذهب فوضعوها فجاء ت النار فأکلتها .ثم أحل الله لنا الغنا ئم ، رأی ضعفنا وعجزنا فأحلها لنا)). [أنظر : ۵۱۵۷] [۱۲]

حدیث کی تشریح

حضرت ابو ہریرہ ﷺ روایت فرماتے ہیں کہ **"غزا نبی من الأنبیاء"** انبیاء علیہم السلام میں سے ایک نبی نے جہاد کیا۔ دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حضرت یوشع علیہ السلام تھے، انہوں نے اپنی قوم سے فرمایا کہ

---

[۱۲] وفی صحیح مسلم ، کتاب الجهاد والسیر ، باب تحلیل الغنائم لهذه الأمة خاصة ، رقم : ۳۲۸۷، ومسند احمد ، باقی مسند المکثرین ، باب باقی المسند السابق ، رقم : ۷۸۹۰.

"لا يتبعني رجل ملك بضع إمرأة" میرے پیچھے ایسا کوئی شخص نہ آئے یعنی جہاد میں شامل نہ ہو جو کسی عورت کے بُضع کا مالک ہو یعنی اس سے نکاح کیا ہو **"وهو يريد أن يبني بها ولمّا يبن بها"** اور بنا کرنا چاہتا ہے مگر ابھی تک نہیں کی، ایسا شخص ہمارے ساتھ نہ آئے کیونکہ اس کا دل نئی شادی کی طرف مشغول ہوگا اور جہاد میں اس کا اچھی طرح دھیان نہ ہوگا۔

"ولا أحد بنى بيوتا ولم يرفع سقوفها" اسی طرح وہ شخص جس نے اپنا گھر بنایا ہے، لیکن ابھی تک اس کی چھت نہیں ڈالی وہ بھی نہ آئے، کیونکہ اس کا دل بھی اپنے گھر کی تعمیر میں مشغول ہوگا۔

"ولا آخر اشترى" اسی طرح وہ شخص جس نے بکریاں یا اونٹنیاں خریدیں، **"خَلِفات"** کے معنی ہیں اونٹنیاں۔ **"وهو ينتظر ولادها"** اور اس کو ان کے بچے پیدا ہونے کا انتظار ہے، وہ بھی نہ آئے، کیونکہ اس کا دل اپنی اونٹنیوں اور بکریوں میں مشغول رہے گا۔

یہ اعلان کرنے کے بعد **"فدنا من القرية صلاة العصر"** نماز عصر کے وقت یا اس کے قریب بستی کے پاس تشریف لائے اور بشارت دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر اس دن کے گزرنے سے پہلے پہلے فتح کرلیں تو فتح ہو جائے گا، بعد میں فتح کرنے میں مشکل ہوگی۔

اس واسطے انہوں نے سورج سے کہا: **"إنك مامورة وأنا مامور"** اے سورج! تو بھی اللہ ﷻ کی طرف سے مامور ہے اور میں بھی جہاد کے لئے مامور ہوں، **"اللّٰهم احبسها علينا"** اے اللہ! اس کو ہمارے لئے روک دیجئے تو اللہ ﷻ کی طرف سے سورج کو روک دیا گیا، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سورج کے غروب ہونے سے پہلے پہلے فتح عطا فرمادی۔

حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے سورج کا روکا جانا

حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے سورج کا روکا جانا صحیح احادیث سے ثابت ہے اور اکثر علماء نے اس کو حقیقت پر محمول کیا ہے کہ واقعۃً اللہ ﷻ نے حضرت یوشع علیہ السلام کے لئے سورج کو روک دیا تھا۔

بعض حضرات نے اس کی توجیہ کی ہے کہ وقت میں برکت ہوگئی یعنی سورج رک جانے کا معنی ہے کہ وقت میں برکت ہوجائے اور تھوڑے وقت میں زیادہ کام ہوجائے، لیکن زیادہ تر علماء اس کو حقیقت پر ہی محمول کرتے ہیں۔

"فجمع الغنائم" حضرت یوشع علیہ السلام نے غنیمت کا مال جمع کیا، **"فجاء ت يعني النار لتأكلها"** پہلے زمانہ کے دستور کے مطابق آگ کھانے کے لئے آئی **"فلم تطعمها"** اس نے نہیں کھایا۔

"فقال: إن فيكم غلولا" جب آگ نے نہیں کھایا تو انہوں نے بتایا کہ اس میں کوئی خیانت ہوئی ہے، جس کی وجہ سے آگ نہیں کھا رہی ہے۔

"فلیبا یعنی من کل قبیلة رجل " ہرقبیلہ میں سے ایک آدمی مجھ سے بیعت یعنی مصافحہ کرے، **"فلزقت ید رجل بیده"** اس بیعت کے دوران ایک شخص کا ہاتھ ان کے ہاتھ سے چپک گیا۔

"فقال : فیکم الغلول " فرمایا کہ تمہارے قبیلے میں غلول ہے، **"فلتبا یعنی قبیلتک "** اب تمہارے قبیلے کے سارے افراد مجھ سے بیعت کریں۔

"فلزقت ید رجلین أو ثلاثة بیده " جس کے نتیجے میں ان کے ہاتھ سے دو تین آدمیوں کے ہاتھ چپک گئے **"فقال : فیکم الغلول"**.

"فجاؤا برأ س مثل رأس بقرة من الذهب فوضعوها فجاء ت النار فأکلتها" پتہ چلا کہ انہوں نے گائے کے پورے سر جتنا سونا لے لیا تھا۔

"ثم أحل الله" حضور ﷺ نے فرمایا کہ پھر اللہ ﷻ نے ہمارے لئے غنیمت کا مال حلال کردیا۔

سوال: آج کل ابوالقاسم کنیت رکھنا جائز ہے یا نہیں؟

جواب: آج کل چونکہ کسی التباس وغیرہ کا اندیشہ نہیں ہے، اس لئے ابوالقاسم کنیت رکھنا جائز ہے۔

(۱۲) باب کیف قسم النبی ﷺ قریظة والنضیر؟ وماأعطی من ذلک نوائبه .

۳۱۲۸ ۔ حدثنا عبد الله بن أبی الأسود: حدثنا معتمر ،عن أبیه قال : سمعت أنس بن مالک ﷺ یقول : کان الرجل یجعل للنبی ﷺ النخلات حتی افتتح قریظة والنضیر وکان بعد ذلک یرد علیهم . [راجع : ۲۶۳۰]

یہ حضرت انس ﷺ کی حدیث ہے، فرمایا کہ بعض اوقات انصار کے کچھ حضرات نبی کریم ﷺ کے لئے کچھ کھجور کے درخت ہدیہ کے طور پر پیش کردیا کرتے تھے کہ اس درخت کا پھل آپ تناول فرمائیں۔

"حتی افتتح" یہاں تک کہ جب قریظہ اور نضیر فتح ہوئے تو اس کے بعد اگر کوئی پیش کرتا تو آپ رد فرمادیتے، کیونکہ اس میں حضور ﷺ کا بھی حصہ ہوتا تھا، اس لئے اب ضرورت نہیں رہی تھی۔

(۱۳) باب برکة الغازی فی ماله حیا ومیتا مع النبی ﷺ وولاة الأمر

جوشخص غازی ہو اور نبی کریم ﷺ کے ساتھ یا ولاۃ الأمر کے ساتھ جہاد کرے، اللہ تعالیٰ زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اس کے مال میں برکت عطا فرماتے ہیں۔

جنگ جمل کا ایک مختصر خاکہ

اس میں امام بخاری رحمہ اللہ نے جو حدیث روایت کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جو عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں، جنگ جمل کے موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ کے لئے تشریف لے گئے۔ متدرک حاکم کی روایت میں آتا ہے وہاں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مقابلہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کو یاد دلایا اور کہا کہ اے زبیر! تم مجھ سے لڑنے کے لئے آئے ہو تمہیں یاد نہیں کہ ایک مرتبہ میری موجودگی میں نبی کریم ﷺ نے تم سے ارشاد فرمایا تھا کہ: "**لتقاتلن عليا و أنت ظالم**" تم علی سے لڑو گے اور تم ظلم کرنے والے ہو گے۔[۱۷]

آج وہ دن آگیا ہے کہ تم مجھ سے لڑنے کے لئے آئے ہو، حضرت زبیر ابن العوام رضی اللہ عنہ کو یہ بات یاد آگئی کہ حضور ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی تھی، اس لئے انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نہیں لڑوں گا، چنانچہ وہ واپس ہو گئے۔

واپس ہوتے وقت خیال ہوا کہ میری وہ پوری جماعت جو میں ساتھ لے کر آیا ہوں مجھے نہیں چھوڑے گی، (اس میں بہت سے منافقین بھی تھے جو ادھر ادھر کی باتیں کرتے تھے)۔

انہوں نے اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر سے کہا کہ آج ایسی جنگ ہونے والی ہے اس میں جو مرے گا وہ یا تو ظالم ہوگا یا مظلوم ہوگا، اور میرا خیال ہے کہ میں مظلوم ہو کر مارا جاؤں، پھر کچھ وصیت فرمائی جو یہاں پر مذکور ہے۔

بعد میں ایک شخص عمرو بن جرموز نے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ کو قتل کر دیا اور ظاہر یہ ہے کہ یہ ان لوگوں میں سے تھا جو دونوں فریقوں کے درمیان آگ بھڑکا رہے تھے اور منافق قسم کے لوگ تھے، اس نے دیکھا کہ یہ واپس جا رہے ہیں، اس لئے انہیں قتل کر دیا۔

یہ حدیث بھی بعض روایتوں میں اچھی اور مضبوط سند سے آئی ہے کہ "**بشروا قاتل الزبير بالنار**" آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ زبیر رضی اللہ عنہ کا جو قاتل ہوگا اس کو جہنم کی خوشخبری سنا دو۔ یہ بات نبی کریم ﷺ کی طرف منسوب ہے اور امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے مسند میں روایت کی ہے۔[۱۸]

اب عجیب شبہ ہوتا ہے کہ ایک طرف "**قاتل عمار في النار**" کہا گیا، ادھر "**قاتل الزبير في النار**" کہا گیا، ایک طرف یہ کہ تم حضرت علی رضی اللہ عنہ سے لڑو گے تو ظالم ہو گے تو بات اس طرح پیش آئی ہے کہ بعد میں جس شخص نے قتل کیا وہ درحقیقت ان منافقین میں سے تھا جو آگ بھڑکانے والے تھے۔

---

۱۷ المستدرک علی الصحیحین، ج:۳، ص:۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۶، رقم: ۵۵۷۶، ۱۱۷۴ و ۵۵۷۷، ۱۱۷۵.

۱۸ مسند احمد، مسند الخلفاء الراشدين، مسند علي بن أبي طالب، ص: ۹۶، رقم: ۶۸۰، ۶۸۱ و المعجم الاوسط، ج:۷، ص: ۱۳۰، رقم: ۷۰۷۲، وتهذيب الكمال، ج:۲۳، ص:۱۹۶، رقم: ۴۷۳۱.

بہر حال جب حضرت زبیر ﷺ کو یہ اندیشہ ہوا کہ میں شہید ہو جاؤں گا تو حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کو بلا کر کہا کہ مجھے اپنی شہادت میں سب سے زیادہ اپنے دیون (قرضے) کی فکر ہے کہ میرے قرضے ادا ہو جائیں اور قرضوں کا سلسلہ یہ تھا کہ حضرت زبیر ﷺ امین آدمی تھے، لوگ اپنی امانتیں آپ کے پاس رکھواتے تھے، حضرت زبیر ﷺ ان سے یہ فرماتے تھے کہ میں تمہاری امانت نہیں رکھتا، البتہ اگر چاہو تو مجھے قرضہ دے دو اس میں تمہارا فائدہ ہوگا کہ امانت مضمون نہیں ہوتی اور قرض مضمون ہوگا، میں اس کا ضامن ہوں گا اور حضرت زبیر ﷺ کا اس میں یہ فائدہ تھا کہ وہ اس کو اپنی تجارت وغیرہ میں استعمال کرتے تھے۔

چنانچہ وہ اس طرح رقم جمع کرتے اور تجارت میں لگاتے تھے، تجارت میں لگانے کے نتیجہ میں انہوں نے بہت ساری جائیدادیں خرید لیں، ویسے بھی یہ مالدار آدمی تھے یہاں تک کہ جب شہادت کے بعد دیکھا گیا تو ان کے قرضے بائیس لاکھ تھے، شاید پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں بھی تجارتی قرضے لئے جاتے تھے، اور یہ طریقہ کار بینکوں کے طریقہ کار سے ملتا جلتا ہے کہ لوگ ان کے پاس لا کر رکھوار ہے ہیں اور وہ تجارت میں لگا رہے ہیں تو یہ بائیس لاکھ کا قرضہ تھا، حضرت عبداللہ بن زبیر ﷺ پر بہت بوجھ تھا کہ یہ بائیس لاکھ روپے کا قرضہ کس طرح ادا کروں؟ بعد میں انہوں نے قرض ادا کیا، حضرت زبیر ابن العوام ﷺ نے وصیت بھی کی تھی جس کی تفصیل آرہی ہے، تو پہلے وصیت نافذ کی، قرضے ادا کئے، اس کے بعد ورثاء کے درمیان تقسیم ہوا، سب کچھ ادا کرنے کے بعد حساب لگایا تو وہ تقریباً ۶۰ لاکھ کا سامان تھا جو زبیر بن العوام ﷺ نے چھوڑا تھا۔

اب یہ دین کس طرح ادا ہوا، وصیتیں کس طرح ہوئیں، وہ پوری تفصیل اس روایت میں ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ اس روایت کو یہ بتانے کے لئے لائے ہیں کہ اللہ جل جلالہ نے ان کے مال میں برکت عطا فرمائی جس کے نتیجہ میں یہ کام ہو گیا۔

۳۱۲۹ ـ حدثني إسحاق بن إبراهيم قال : قلت لأبى أسامة: أحدثكم هشام بن عروة، عن أبيه، عن عبد الله بن الزبير قال: لما وقف الزبير يوم الجمل، دعاني فقمت إلى جنبه. فقال: يا بني ! إنه لايقتل اليوم إلا ظالم أو مظلوم، وإني لا أراني إلا سأقتل اليوم مظلوما وإن من أكبر همي لديني، أفترى يبقي ديننا من مالنا شيئًا؟ فقال: يا بنيّ، بع مالنا فاقض ديني. وأوصى بالثلث وثلثه لبنيه، يعنى عبدالله بن الزبير، يقول: ثلث الثلث، فان فضل من مالنا فضل بعد قضاء الدين فثلثه لولدک. قال هشام: وكان بعض ولد عبد الله قد وازى بعض بني الزبير خبيب وعبادوله يو مئذ تسعة بنين وتسع بنات. قال عبدالله: فجعل يوصيني بدينه ويقول: يا بنيّ إن عجزت عن شيٍ منه فاستعن عليه مولاى. قال: فوالله ما دريت ما أراد حتى قلت: يا أبت من مولاک؟ قال: الله. قال: فوالله ما وقعت

فی كربة من دينه إلاقلت: يا مولى الزبير اقض عنه دينه ، فيقضيه .فقتل الزبير رضی الله عنه ولم يدع دينارا ولا درهما إلا أرضين منها الغابة واحدى عشرة داراً بالمدينة، ودارين بالبصرة ،ودارا بالكوفة ،ودارا بمصر . قال: وإنما كان دينه الذی عليه أن الرجل كان يأتيه بالمال فيستودعه إياه فيقول الزبير :لا،ولكنه سلف فإنی أخشى عليه الضيعة . وماولی إمارة قط ولا جباية خراج ولاشيئا إلاأن يكون فی غزوة مع النبی ﷺ أومع أبی بكر وعمر وعثمان ﷺ . قال عبدالله ابن الزبير: فحسبت ما عليه من الدين فوجدته ألفی ألف ومائتی ألف .قال: فلقی حكيم ابن حزام عبدالله بن الزبير فقال :يا ابن أخی، كم على أخی من الدين ؟فكتمه فقال :مائة الف،فقال حكيم: والله ماأری أموالكم تسع لهذه ، فقال له عبدالله :أفرأيتك إن كانت ألفی ألف ومائتی ألف ؟قال: ماأراكم تطيقون هذا،فإن عجزتم عن شئ منه فاستعينوا بی.قال: وكان الزبير اشترى الغابة بسبعين ومائة ألف، فباعها عبدالله بألف ألف وستمائة ألف.ثم قام فقال: من كان له على الزبير حق فليوافنا بالغابة .فأتاه عبدالله بن جعفر،وكان له على الزبير أربعمائة ألف . فقال لعبد الله:إن شئتم تركنا لكم .قال عبدالله :لا ،قال : فإن شئتم جعلتموها فيما تؤخرون إن أخرتم ،فقال عبدالله : لا، قال: قال : فاقْطَعوُا لِیُ قطعةً ،فقال عبدالله : لك من هاهنا إلى هاهنا.قال:فباع منها فقضى دينه فأوفاه وبقی منها أربعة أسهم ونصف . فقدم على معاوية وعنده عمرو بن عثمان والمنذر بن الزبيروابن زمعة .فقال له معاوية: كم قومت الغابة ؟قال :كل سهم مائة ألف ، قال: كم بقی ؟ قال:أربعة أسهم ونصف. فقال المنذر بن الزبير :قد أخذت سهما بمائة ألف ،قال عمرو بن عثمان: قد أخذت سهما بمائة ألف ، وقال ابن زمعة :قد أخذت سهما بمائة ألف .فقال معاوية: كم بقی ؟فقال:سهم ونصف،قال:أخذته بخمسين ومائة ألف.قال: وباع عبدالله بن جعفر نصيبه من معاوية بستمائة ألف . فلمافرغ ابن الزبير من قضاء دينه قال بنو الزبير :اقسم بيننا ميراثنا ،قال : لا والله ،لا أقسم بينكم حتى أنادی بالموسم أربع سنين :ألامن كان له على الزبيردين فليأتنا فلنقضه،قال:فجعل كل سنة ينادی بالموسم فلما مضى أربع سنين قسم بينهم. قال: وكان للزبير أربع نسوة،ورفع الثلث فأصاب كل امرأة ألف ألف ومائتا ألف)).

فجميع ماله خمسون الف الف وما ئتا الف . [۱۹، ۲۰]

---

[۱۹] لايوجد للحديث مكررات.

[۲۰] انفرد به البخاری.

حدیث کی تشریح

یہ ایسی روایت ہے جس میں شاگرد استاد پر پڑھ رہا ہے، یہ نہیں ہے کہ اسحاق بن ابراہیم کہیں **"حدثنی إسحاق بن إبراهيم"** بلکہ روایت پہلے سے ابواسامۃ کے طریق سے لکھی ہوئی موجود تھی، وہ اسحاق بن ابراہیم نے پڑھی اور کہا کہ کیا تم کو یہ حدیث ہشام بن عروۃ نے **"عن أبيه عن عبد الله بن الزبير"** سنائی ہے کہ **"لما وقف الزبير يوم الجمل"** جمل والے دن حضرت زبیر کھڑے تھے، مجھے بلایا **"فقمت .... وإني لا أراني إلا سأقتل اليوم مظلوما"** اور میں آج کے دن ایسا لگتا ہے کہ مظلوم ہو کر شہید ہوں گا۔

"وإن من أكبر همي لديني، أفترى يبقى ديننا من مالنا شيئا؟" تمہارا کیا خیال ہے کہ ہمارا قرض ہمارے مال میں سے کچھ باقی چھوڑے گا؟ مطلب یہ ہے کہ وہ سارا دین میں ادا ہو جائے گا۔

"فقال : يا بنيّ، بع مالنا فاقض ديني" یہ کہا کہ میرا قرضہ ادا کر دینا اور ساتھ ایک ثلث کی وصیت کی اور فرمایا کہ ثلث کا ثلث اپنے بیٹوں کو دینا یعنی آپ نے فرمایا کہ ثلث کو تین حصے کرنا اور ایک حصہ اپنے (عبداللہ بن زبیر کے) بیٹوں کو دینا۔

"فإن فضل من مالنا" اگر دین کی ادائیگی کے بعد کچھ باقی بچ جائے، تو **"فثلثه لولدك"** کل وصیت مساکین وغیرہ کی ہے، اس کا ثلث تمہارے بیٹوں کا ہے، ثلث سے ثلث الثلث مراد ہے۔

"قال هشام" یعنی حضرت عبداللہ بن زبیر کے بعض بیٹے حضرت زبیر کے بعض بیٹوں کے برابر تھے مثلاً خبیب اور عباد، ان کے برابر تھے۔

"وله يومئذ تسعة بنين وتسع بنات" حضرت زبیر کی نو لڑکیاں اور نو لڑکے تھے۔

"قال عبدالله" وہ مجھے دین کے بارے میں وصیت کرتے رہے، و **"يقول : يا بنيّ إن عجزت عن شيئ منه"** اگر کچھ دین ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ تو اس پر میرے مولیٰ سے مدد مانگنا، **"قال: فوالله"** مجھے نہیں معلوم تھا کہ مولیٰ سے کیا مراد ہے، **"حتى قلت : يا أبت من مولاك ؟ قال: الله"** مطلب یہ ہے کہ اللہ جل جلالہ سے مدد مانگنا یعنی دعا کرنا۔

"قال: فوالله ما وقعت" جب کبھی مشکل پیش آتی تو یہ دعا کرتا **"فيقضيه"** اللہ جل جلالہ پورا کر دیتے تھے۔

"فقتل الزبير و لم يدع دينارا و لا درهما" یعنی نقد پیسہ کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ **"إلا أرضين"** مگر کچھ زمینیں تھیں، **"منها الغابة"** ان میں سے ایک غابہ تھا، احد کے پیچھے **"غابه"** ایک بہت بڑی زمین تھی۔

"واحدى عشرة داراً بالمدينة" مدینہ منورہ میں گیارہ گھر تھے، دو گھر بصرہ میں تھے، ایک کوفہ اور

ایک مصر میں تھا۔

"قال وانما کان دینه" اوران کے ذمہ دین اس طرح کا ہوتا تھا کہ لوگ ودیعت رکھوانے آتا تھا اور فرماتے تھے کہ میں تو اس کو امانت میں نہیں لیتا کیونکہ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ ضائع نہ ہو جائے اور تمہارا نقصان ہو۔

"وما ولی إمارة قط ولا جبایة خراج" ساری عمر کبھی امارت کے والی نہیں بنے، کہیں کے گورنر نہیں بنے، نہ کبھی خراج کا ٹیکس وصول کیا۔ مطلب یہ ہے کہ سرکاری ذرائع سے جو لوگوں کے پاس پیسے جمع ہو جاتے ہیں، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا مگر یہ کہ وہاں جو کچھ مال غنیمت ملتا وہ لے لیتے۔

"قال عبداللّٰه بن الزبیر: فحسبت" وہ دوملین اور دولاکھ یعنی بائیس لاکھ تھا۔

"قال: فلقی حکیم" بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ملے اور کہا **"یا أخی کم علی أخی من الدین؟"** پوچھا کہ کتنا قرضہ ہے **"فکتمه"** حضرت عبداللہ زبیر رضی اللہ عنہ نے چھپایا اور کہا کہ **"مائة الف"** ایک لاکھ ہے۔

اب بظاہر یہ غلط بیانی ہے، لیکن فقہائے کرام رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اگر زیادہ عدد کے بجائے چھوٹا عدد بتا دیا جائے تو وہ غلط بیانی میں شمار نہیں ہوتا کیونکہ ایک لاکھ تو ہے، اس کے علاوہ اور بھی ہیں لیکن زیادہ کو چھپالیا اور صرف **"مائة الف"** کہہ دیا۔

"فقال حکیم: واللّٰه" انہوں نے کہا کہ تمہاری موجود جائیدادیں اس دین کو پورا کرنے کیلئے کافی نہیں ہوں گی۔ اگر ایک لاکھ پورا نہیں ہوگا تو بتاؤ اگر بائیس لاکھ ہو تو پھر کیا ہوگا۔

"قال: ما أراکم" میرا اندازہ ہے کہ تم اس کی ادائیگی کو برداشت نہیں کرسکو گے۔

"قال: وکان الزبیر" حضرت زبیر رضی اللہ عنہ نے غابہ ایک لاکھ ستر ہزار میں خریدا تھا **"فباعها عبداللّٰه"** حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے وہ غابہ سولہ لاکھ میں بیچا۔

"ثم قام فقال" پھر فرمایا کہ جس کا کوئی حق ہو وہ غابہ میں آکر ہم سے لے جائے۔

"فأتاه عبداللّٰه بن جعفر" حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ آئے، ان کے حضرت زبیر رضی اللہ عنہ پر چار لاکھ واجب تھے۔

"فقال لعبد اللّٰه" عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کو پیشکش کی کہ اگر تم چاہو تو میں یہ چار لاکھ چھوڑ دوں، معاف کردوں۔

"قال عبد اللّٰه لا" اگر تم چاہو تو ابھی جلدی دینے کی نہیں ہے تو مؤخر کردو۔

"فقال عبداللّٰه: لا، قال: قال فاقطعوا لی قطعة" عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، مجھے جائیداد کا ایک قطعہ کاٹ کردے دیا۔ **"فقال عبداللّٰه: لک من ههنا إلی ههنا"** اس چار لاکھ کے بدلے میں یہاں سے

وہاں تک کی زمین آپ کو دے دی۔

"قال: فباع منها فقضى دينه" انہوں نے یہ بیچا اوران کا پورا دین ادا کر دیا۔

"وبقی منها أربعة اسهم ونصف" ساڑھے چار سہم باقی رہ گئے، **"فقدم علىٰ معاوية وعنده عمرو بن عثمان والمنذر بن الزبير وابن زمعة"** بعد میں حضرت عبداللہ بن زبیر ﷜، حضرت معاویہ ﷜ کے پاس آئے، ان کے پاس عمرو بن عثمان، منذر بن زبیر اور ابن زمعہ موجود تھے۔

"فقال له معاوية: كم قوّمت الغابة؟"

حضرت معاویہ ﷜ نے پوچھا کہ غابہ کی کل کتنی قیمت لگائی گئی؟

"قال: كل سهم مائة الف" کہا ایک سہم کی لاکھ قیمت لگائی گئی ہے. حضرت معاویہ ﷜ نے پوچھا کہ کتنے حصے باقی ہیں؟ عبداللہ زبیر ﷜ نے کہا کہ ساڑھے چار حصے باقی ہیں۔

"فقال المنذر بن الزبير" منذر بن زبیر ﷜ نے کہا کہ ایک حصہ ایک لاکھ میں لے لیتا ہوں۔

"قال عمرو بن عثمان : قداخذت سهما بمائة الف، وقال ابن زمعة: قد اخذت سهما بمائة الف فقال معاوية: كم بقى؟" اب کتنا باقی رہ گیا؟ **"فقال : سهم ونصف"** کہا ڈیڑھ حصہ باقی رہ گیا ہے **"قال: أخذته بخمسين ومائة الف"** حضرت معاویہ ﷜ نے کہا کہ اسے میں ڈیڑھ لاکھ میں خرید لیتا ہوں۔

"قال: وباع عبدالله بن جعفر" عبداللہ بن جعفر ﷜ نے جو حصہ چار لاکھ کے عوض لیا تھا وہ حضرت معاویہ ﷜ پر چھ لاکھ کا بیچ دیا۔ **"فلما فرغ ابن الزبير"** جب دین ادا ہو گیا تو بیٹوں نے کہا میراث تقسیم کیجئے۔

"قال: لا واللّٰه، لا اقسم بينكم حتى أنادى بالموسم أربع سينن" کہا کہ میں اس وقت تک میراث تقسیم نہیں کروں گا جب تک کہ چار سال تک موسم حج میں اعلان نہ کر دوں کہ جس کا بھی زبیر ﷜ پر قرضہ ہو وہ آ کر وصول کرے۔

"قال: فجعل كل سنة ينادى بالموسم فلما مضى أربع سنين" ہر سال اعلان کرتے تھے، جب چار سال گزر گئے تو پھر باقی مال ورثاء کے درمیان تقسیم کیا۔ **"قال: وكان للزبير أربع نسوة"** حضرت زبیر ﷜ کی چار بیویاں تھیں، **"ورفع الثلث"** اور جو باقی بچ گیا تھا اس میں سے ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے ثلث نکالا گیا۔

"فأصاب كل امرأة الف الف ومائتا ألف" ہر بیوی کے حصہ میں بارہ لاکھ آیا، تو چار بیویوں کے اڑتالیس لاکھ ہوئے، یہ اڑتالیس لاکھ ترکہ کا ثمن ہوا . اب اڑتالیس لاکھ کو آٹھ سے ضرب دیں اور وصیت والے ثلث کا اس میں اضافہ کریں تو یہ کتنا بنتا ہے، تو فرماتے ہیں، **"فجميع ماله خمسون الف الف وما ئتا**

الف" اس روایت کے مطابق کل مال پانچ کروڑ دولاکھ بنتا ہے۔

لیکن جب شراح نے اس بنیاد پر حساب لگایا کہ ہر بیوی بارہ لاکھ اور چار بیویوں کے اڑتالیس لاکھ، پھر اڑتالیس لاکھ آٹھ سے ضرب دیا، پھر اس میں وصیت کا مال شامل کیا تو یہ سب مل کر چھ کروڑ سے بھی زیادہ بنتے ہیں، اس لئے شراح بخاری حیران ہیں کہ یہ حساب کس طرح صحیح بیٹھے گا، کسی طرح نہیں بنتا۔ اس کی مختلف لمبی چوڑی توجیہات کی گئی ہیں جن کو سمجھنا بھی آسان نہیں ہے۔

حضرت گنگوہی اور شاہ صاحب رحمہما اللہ کی توجیہ

حضرت گنگوہی اور حضرت شاہ صاحب رحمہما اللہ نے جو توجیہ کی ہے وہ ایسی آسان ہے کہ اس میں کسی لمبے چوڑے حساب کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ کہتے ہیں کہ اصل میں غلطی اس طرح لگ رہی ہے کہ لوگ سمجھ رہے ہیں "**خمسون**" کے بعد "**الف الف**" "**خمسون**" کی تمیز ہے، "**الف الف**" کے معنی ایک ملین اور "**خمسون الف الف**" کے معنی پچاس ملین، تو پانچ کروڑ ہوگئے "**ومائتا الف**" اور دولاکھ بھی، تو پانچ کروڑ دولاکھ ہوگئے۔

وہ کہتے ہیں کہ یوں نہیں ہے خمسون الگ ہے، اس کے معنی ہیں کہ کل مال کے پچاس حصے کئے گئے، جن میں سے ہر حصہ بارہ لاکھ کا تھا اور جب بارہ لاکھ کو پچاس سے ضرب دی جائے تو وہ چھ کروڑ بنتا ہے اور چار بیویوں سے بھی حساب چھ کروڑ بنتا ہے، صرف دولاکھ کا فرق ہے کہ وہ چھ کروڑ دولاکھ بنتا ہے اور یہ چھ کروڑ بنتا ہے، اس دولاکھ کے بارے میں یہ کہہ دینا آسان ہے کہ یہ کسر حذف کردی گئی۔ لیکن اتنا بڑا فرق کہ پانچ کروڑ کے چھ کروڑ دولاکھ بن جائیں، یہ مشکل ہے۔

تو کہتے ہیں کہ "**خمسون**" سے "**خمسون سهما**" مراد ہے، "**كل سهم الف الف ومائتا الف**" پچاس حصے تھے جن میں سے ہر حصہ بارہ لاکھ کا تھا، اس طرح حساب صحیح بیٹھ جاتا ہے۔

ایک سوال یہ ہوتا ہے کہ یہ درہم تھے یا دینار؟ اس میں کہیں نہیں لکھا ہوا، بظاہر درہم ہی ہوں گے۔[۲۱]

(۱۴) باب إذا بعث الإمام رسولا في حاجة أو أمره بالمقام هل يسهم له؟

۳۱۳۰ ـ حدثنا موسى: حدثنا أبو عونة: حدثنا عثمان بن موهب، عن ابن عمر

۲۱ فیض الباری، ج: ۳، ص: ۴۶۵.

رضي الله عنهما قال: إنما تغيب عثمان عن بدر فإنه كان تحته بنت رسول الله ﷺ وكانت مريضة، فقال له النبي ﷺ:((إن لك أجر رجل ممن شهد بدرا وسهمه)). [أنظر: ۳۶۹۸، ۳۷۰۴، ۴۰۶۶، ۴۵۱۳، ۴۵۱۴، ۴۶۵۰، ۴۶۵۱، ۷۰۹۵] [۲۲]

حضرت عثمان ﷺ چونکہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی تیمارداری کی وجہ سے بدر میں شامل نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے آپ ﷺ نے ان کو بدر میں شامل قرار دیا اور مالِ غنیمت میں ان کا بھی حصہ بھی لگایا۔

(۱۵) باب : ومن الدليل على أن الخمس لنوائب المسلمين، ما سأل هوازن النبي ﷺ برضاعه فيهم فتحلل من المسلمين. وما كان النبي ﷺ يعد الناس أن يعطيهم من الفيء و الأنفال من الخمس، وما أعطى الأنصار، وما أعطى جابر بن عبد الله من تمر خيبر

یہ مسلسل وہی بات چل رہی ہے کہ خمس میں حضور ﷺ کو اختیار ہے بطور استحقاق کسی کا حصہ معین نہیں ہے۔

۳۱۳۳ ـ حدثنا عبد الله بن عبد الوهاب: حدثنا حماد: حدثنا أيوب، عن أبي قلابة قال: وحدثني القاسم بن عاصم الكليبي ـ وأنا لحديث القاسم أحفظ ـ عن زهدم قال: كنا عند أبي موسىٰ فأتي ـ وذكر دجاجة ـ وعنده رجل من بني تيم الله أحمر كأنه من الموالي دعاه للطعام فقال: إني رأيته يأكل شيأ فقذِرتُه فحلفت أن لا آكل. فقال: هلم فلأحدثكم عن ذلك. إني أتيت رسول الله ﷺ في نفر من الأشعريين نستحمله فقال: و الله لا أحملكم وما عندي ما أحملكم. و أتي رسول الله ﷺ بنهب إبل فسأل عنا فقال: أين نفر الأشعريون؟ فأمر لنا بمس ذود غر الذرى. فلما انطلقنا قلنا: ما صنعنا لا يبارك لنا، فرجعنا إليه فقلنا: إنا سألناك أن تحملنا فحلفت أن لا تحملنا، أفنسيت؟ قال: ((لست أنا حملتكم، ولكن الله حملكم وإني والله إن شاء الله لا أحلف على يمين فأرى غيرها خيراً منها إلا أتيت الذي هو خير وتحللتها)). [أنظر: ۴۳۸۵، ۴۴۱۵، ۵۵۱۷،

---

۲۲ وفي سنن الترمذي، كتاب المناقب عن رسول الله، باب في مناقب عثمان بن عفان، رقم: ۳۶۳۹، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باب باقي المسند السابق، رقم: ۵۵۱۱، ۵۷۳۹.

۵۵۱۸، ۶۶۲۳، ۶۶۴۹، ۶۶۷۸، ۶۶۸۰، ۶۷۱۸، ۶۷۱۹، ۶۷۲۱، ۷۵۵۵]. [۲۳]

یمین متحلل

حضور اکرم ﷺ کے پاس کچھ اشعری لوگ آئے اور انہوں نے آپ ﷺ سے کچھ اونٹ مانگے۔

آپ ﷺ نے فرمایا **"واللہ لااحملکم وما عندی ما احملکم"** قسم کھائی کہ میں نہیں دوں گا۔

بعد میں غنیمت کے کچھ اونٹ آئے تو آپ ﷺ نے پوچھا کہ وہ اشعری کہاں ہیں، اس کے بعد آپ ﷺ نے ہمیں پانچ اونٹ دیئے۔ **"غرّ الذری"** جن کی کوہان سفید تھی۔

جب ہم چلنے لگے تو ہم نے سوچا **"ماصنعنا لا یبارک لنا"** ہمیں برکت نہیں ہوگی کیونکہ حضور اقدس ﷺ نے قسم کھائی تھی کہ نہیں دیں گے اور پھر دے دیئے۔

"فرجعنا إلیہ، فقلنا، انا سألناک أن تحملنا فحلفت أن لا تحملنا أفنسیت ؟"

آپ نے نہ دینے کی قسم کھائی تھی، اب جو آپ دے رہے ہیں تو کیا آپ بھول گئے ہیں؟ **"قال: لست أنا حملکم ولکن اللہ حملتکم"** تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں نے نہیں دیا، اللہ جل جلالہ نے دیا ہے، اللہ جل جلالہ نے غیب سے یہ اونٹ بھیج دیئے۔

"وإنی واللہ إن شاء اللہ لا أحلف علی یمین فأری غیرھا خیرا منھا إلا أتیت الذی ھو خیر وتحللتھا"۔

جب بھی میں کوئی ایسی قسم کھاؤں کہ بعد میں دوسرا راستہ بہتر معلوم ہو تو پھر میں اس قسم کے خلاف عمل کر لیتا ہوں اور اس یمین کو متحلل کر لیتا ہوں۔ یمین کو متحلل کرنے کے معنی یہ ہیں کہ یا تو کفارہ ادا کردیں گے یا یمین کھاتے وقت ہی ان شاء اللہ کہہ دیا تو پھر یمین منعقد ہی نہیں ہوتی۔ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں۔

یہاں یہ ہو سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے قسم ہی یہ کھائی ہو کہ موجود اونٹ یا موجود مال میں سے نہیں دوں گا، اگر کہیں غیب سے آجائیں، تو پھر دینا اس قسم کے خلاف نہیں ہوگا۔

۳۱۳۵ ۔ حدثنا یحیی بن بکیر : أخبرنا اللیث ، عن عقیل ، عن ابن شھاب ، عن

---

[۲۳] وفی صحیح مسلم ، کتاب الایمان ، باب ندب من حلف یمیناً فرأی غیرھا خیراً فیھا ان یأتی ، رقم : ۳۱۰۹، وسنن الترمذی ، کتاب الاطعمة عن رسول اللہ ، باب ماجاء أکل لحوم الدجاج ، رقم : ۱۷۴۹، وسنن النسائی ، کتاب الصید والذبائح ، باب اباحة أکل لحوم الدجاج ، رقم : ۴۲۷۱، وسنن ابن ماجة ، کتاب الکفارات ، باب من حلف علی یمین فرأی غیرھا خیراً منھا ، رقم : ۲۰۹۸، ومسند احمد ، اول مسند الکوفیین ، باب حدیث أبی موسی الاشعری ، رقم : ۱۸۷۳۳، ۱۸۷۶۹، ۱۸۷۹۶، ۱۸۹۱۴، وسنن الدارمی ، کتاب الاطعمة، باب فی أکل الدجاج ، رقم : ۱۹۶۶.

سالم، عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن رسول الله ﷺ كان ينفل بعض من يبعث من السرايا لأنفسهم خاصة سوى قسم عامة الجيش. [۲۴، ۲۵]

نفل کا ثبوت

آپ ﷺ بعض اوقات سرایا یعنی چھوٹا لشکر کسی کام کے لئے بھیجتے تھے، وہ کچھ مال غنیمت لے کر آتا، اس میں سے ان کو نفل دیا کرتے تھے یعنی بڑے جیش کی بنسبت ان کو زیادہ دیتے تھے۔ بڑے جیش میں جو کچھ تقسیم ہوا اس میں تو ان کا حصہ لگتا ہی تھا، لیکن ان کو خصوصی طور پر الگ سے بھی دیتے تھے، اس کو نفل کہتے ہیں۔

۳۱۳۶۔ حدثنا محمد بن العلاء: حدثنا أبو أسامة حدثنا يريد بن عبدالله، عن أبي بردة، عن أبي موسى ﷺ، قال: بلغنا مخرج النبي ﷺ ونحن باليمن، فخرجنا مهاجرين إليه۔ أنا وأخوان لي أنا أصغر هم: أحدهما أبو بردة والآخر أبو رهم۔ إما قال: في بضع، وإما قال: في ثلاثة وخمسين أو اثنين وخمسين رجلا من قومي، فركبنا سفينة. فألقتنا سفينتنا إلى النجاشي بالحبشة، ووافقنا جعفر بن أبي طالب وأصحابه عنده، فقال جعفر: إن رسول الله ﷺ بعثنا هاهنا، وأمرنا بالإقامة، فأقيموا معنا. فأقمنا معه حتى قدمنا جميعا فوافقنا النبي ﷺ حين افتتح خيبر، فأسهم لنا۔ أوقال: فأعطانا۔ منها وما قسم لأحد غاب عن فتح خيبر منها شيئا إلا لمن شهد معه، إلا أصحاب سفينتنا مع جعفر وأصحابه، قسم لهم معهم. [أنظر: ۳۸۷۶، ۴۲۳۰، ۴۲۳۳] [۲۶]

حضور ﷺ کو مال غنیمت کا اختیار حاصل ہونا

ابوموسی ﷺ فرماتے ہیں کہ جب ہمیں رسول اللہ ﷺ کے مبعوث ہونے کی خبر ملی اس وقت ہم یمن میں تھے۔ **"مخرج"** سے بعثت مراد ہے۔ میں اور میرے دو بھائی ابو بردہ اور ابو رہم ان میں سے میں چھوٹا تھا، ہم ہجرت کر کے

---

۲۴ لايوجد للحديث مكررات.

۲۵ وفي صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب الانفال، رقم: ۳۲۹۴، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في نفل السرية تخرج من العسكر، رقم: ۲۳۶۲، ومسند احمد، مسند المكثرين من الصحابة، باقي المسند السابق، رقم: ۵۹۶۹.

۲۶ وفي صحيح مسلم، كتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل جعفر بن أبي طالب واسماء بنت عميس، رقم: ۴۵۵۸، وسنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله، باب ماجاء في أهل الذمة يغزون مع المسلمين هل يسهم، رقم: ۱۴۸۱، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب فيمن جاء بعد الغنيمة لاسهم له، رقم: ۲۳۴۹.

حضور اقدس ﷺ کے پاس چلے گئے۔

ہمارے ساتھ ہماری قوم کے (یا تو کہا کہ) پچاس سے کچھ اُوپر افراد تھے **"بضع"** (یا کہا کہ) ترپین یا باون آدمی تھے، جو ہجرت کی غرض سے حضور اقدس ﷺ کے پاس حاضر ہونے کے لئے چلے۔

"فرکبنا سفینة" خشکی کے راستہ کے بجائے ہم نے سمندر میں سفر کرنا شروع کیا۔ **"فالقتنا سفینتنا إلى النجا شی بالحبشة"** تو ہوا کارخ بدل گیا جس کے نتیجے میں اس نے کشتی کو حبشہ لے جا کر چھوڑ دیا۔

وہاں جا کر ہم نے دیکھا کہ جعفر بن ابی طالب ؓ اور ان کے ساتھی پہلے سے ہی حبشہ کی طرف ہجرت کئے ہوئے ہیں۔ حضرت جعفر ؓ نے کہا کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے یہاں پر بھیجا ہے اور یہاں ٹھہرنے کا حکم دیا ہے، لہٰذا تم بھی ہمارے ساتھ ٹھہرو۔

چنانچہ ہم بھی ٹھہرے رہے، یہاں تک کہ سب مل کر آئے جب ہم آئے تو اس وقت آپ ﷺ نے خیبر فتح کیا تھا، غزوۂ خیبر ہو چکا تھا اور مال غنیمت تقسیم ہو رہا تھا **"فاسھم لنا"** آپ ﷺ نے ہمارا حصہ بھی لگایا اور یا یہ کہا کہ **"فأعطانا منها وما قسم لأحد، غاب عن فتح خیبر منها شيئا إلا لمن شهد معه"** خیبر کی فتح سے جو لوگ غائب تھے ان میں سے کسی کو حصہ نہیں دیا، سوائے ان لوگوں کے جو آپ کے ساتھ شامل ہوئے، البتہ ہمارے کشتی والے ساتھیوں اور جعفر بن ابی طالب ؓ اور ان کے ساتھیوں کو خیبر کی فتح میں حصہ دیا۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں یہ حدیث لا کر بتا رہے ہیں کہ اس سے پتہ چلا کہ حضور اقدس ﷺ کو مال غنیمت کی تقسیم میں کلی اختیار حاصل تھا، ورنہ قاعدہ کی رو سے یہ مال غنیمت کے حصے دار نہیں تھے لیکن حضور اقدس ﷺ نے اپنے اختیار کے تحت ان کو حصہ دیا۔

(۱۶) باب مامن النبی ﷺ علی الاساری من غیر أن یخمس.

یہ باب یہ بیان کرنے کیلئے قائم کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے جنگی قیدیوں کو خمس نکالے بغیر احسان کر کے چھوڑنے کو جائز قرار دیا ہے۔

مال غنیمت مجاہدین کی ملکیت کب بنتا ہے؟

اس سے امام بخاری رحمہ اللہ دو مسئلوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

جمہور کا مسلک

ایک مسئلہ یہ ہے کہ جمہور کے نزدیک جن میں حنفیہ بھی داخل ہیں مال غنیمت اس وقت تک مجاہدین کی ملکیت میں نہیں آتا جب تک کہ وہ تقسیم نہ کر دیا جائے یعنی تقسیم کرنے سے پہلے مجاہدین کی ملکیت میں نہیں آتا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بھی مال غنیمت حاصل ہوا، مجاہدین اس کے مالک بن گئے۔

امام بخاری رحمہ اللہ جمہور کی تائید کرنا چاہ رہے ہیں کہ تقسیم سے پہلے مجاہدین کی ملکیت نہیں اور اس کی دلیل میں یہ بات پیش کی ہے کہ اگر مال غنیمت حاصل ہوتے ہی مجاہدین کی ملکیت ہو جاتا تو امام کو فدیہ لئے بغیر قیدیوں کو چھوڑنے کا حق نہ ہوتا، کیونکہ مجاہدین اس کے مالک ہو گئے۔ اب جب تک ان کی رضامندی نہ حاصل کی جائے امام کو یہ حق نہ ہوگا کہ فدیہ لئے بغیر آزاد کردے، لیکن نبی کریم ﷺ نے آزاد کرنے کی اجازت دی اور یہ صرف حدیث میں ہی نہیں بلکہ قرآن کریم میں بھی ہے **"فاما منا بعد واما فداء"** کہ **"من"** کرنا بھی جائز ہے۔

اگر مجاہدین مال غنیمت حاصل ہوتے ہی مالک ہو جاتے تو پھر جو قید ہیں ان کے بھی مالک ہو جاتے، اس کا تقاضا یہ تھا کہ جب تک ان سے اجازت نہ لی جائے، اس وقت تک **"مــن"** کرنا جائز نہ ہو، لیکن **"مــن"** کرنے کی اجازت دی گئی۔ معلوم ہوا کہ مجاہدین اس وقت تک مالک نہیں بنتے جب تک مال غنیمت کی تقسیم عمل میں نہ آجائے۔

دوسرا مسئلہ پہلے گزر چکا ہے کہ جو خمس بیت المال میں جاتا ہے، اس میں حنفیہ کے نزدیک تین مدات ہیں: یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل، ذوی القربیٰ کا حق ساقط ہو گیا ہے۔

امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں ذوی القربیٰ مصرف کے طور پر ہیں، مستحق کے طور پر نہیں اور جیسا کہ ذکر کیا تھا کہ امام بخاری رحمہ اللہ ہر جگہ امام مالکؒ کے مسلک کو ترجیح دیتے رہتے ہیں۔

یہاں یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ قیدیوں کو جو خمس میں سے آزاد کیا گیا، اس میں ذوی القربیٰ، یتامیٰ اور مساکین سے نہیں پوچھا، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیں کہ جو مصارف قرآن کریم نے بیان کئے ہیں، ان میں ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل تو موجود ہیں، لیکن **"من"** کا ذکر نہیں ہے۔

معلوم ہوا کہ امام کو خمس کے اندر تصرف کا کلی اختیار ہے جبھی تو **"من"** کی اجازت ہوئی ورنہ اجازت نہ ہوتی، ترجمۃ الباب میں یہ استدلال کیا ہے۔

۳۱۳۹ ـ حدثنا إسحاق بن منصور: أخبرنا عبد الرزاق: أخبرنا معمر، عن الزهري، عن محمد بن جبير، عن أبيه ﷺ: أن النبي ﷺ قال في أسارى بدر: لو كان المطعم بن عدي حيا ثم كلمني في هؤلاء النتنى لتركتهم له. [أنظر ۴۰۲۴] [۲۷]

---

[۲۷] وفي سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في المن على الاسير بغير فداء، رقم: ۲۳۱۴، ومسند احمد، اول المدنيين اجمعين، باب حديث جبير بن معطم، رقم: ۱۶۱۳۳۔

مکافاتِ حسن سلوک کا شوق

حضرت جبیر بن مطعم ﷺ کی حدیث نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بدر کے قیدیوں کے بارے میں نبی کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ **"لو کان المطعم بن عدی"** آج اگر مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور وہ مجھ سے ان بدبودار لوگوں کے بارے میں بات کرتا یعنی یہ کہتا کہ ان کو بغیر فدیہ لئے چھوڑ دیں، **"لتر کتم له"** تو میں اس کی سفارش قبول کر کے ان کو چھوڑ دیتا۔

"النتنی" اس کا لفظی معنی ہے، **"بدبودار"** اس سے مراد مشرکین قیدی ہیں۔

مطعم بن عدی کا حسن سلوک

مطعم بن عدی اگر چہ مشرکین میں سے تھا لیکن اس نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ حسن سلوک کیا تھا۔ ایک حسن سلوک یہ تھا کہ جب آپ ﷺ شعب ابی طالب میں محصور تھے، اس وقت تمام قریش نے آپ کا بائیکاٹ (مقاطعہ) کیا ہوا تھا اور با قاعدہ ایک تحریر لکھ دی تھی، اس وقت اس تحریر کو منسوخ کرانے میں مطعم بن عدی کا بڑا دخل تھا۔ اس کے علاوہ جب نبی کریم ﷺ طائف تشریف لے گئے تھے اور وہاں کے لوگوں نے آپ ﷺ کے ساتھ بدسلوکی کی تھی، جب آپ وہاں سے واپس آئے تو مطعم بن عدی نے ایک طرح سے آپ کو اپنے جوار میں رکھا تھا تو اس حسن سلوک کی مکافات کے طور پر یہ فرمایا کہ اگر آج وہ ان کی سفارش کرتا تو میں قبول کر لیتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام کو قیدیوں کو آزاد کرنے کا حق حاصل ہے۔

(۱۷) باب : ومن الدليل على أن الخمس للإمام، وأنه يعطي بعض قرابته دون بعض ما قسم النبی ﷺ لبني المطلب وبني هاشم خمس خيبر،

" وقال عمر بن عبد العزيز: لم يعمهم بذلک، ولم يخص قريبا دون من أحوج إليه، وإن كان الذي أعطى لما يشكو إليه من الحاجة، ولما مستهم في جنبه، من قومهم وخلفائهم".

یہ دوبارہ امام مالک رحمہ اللہ کے مسلک کی تائید کرنے کیلئے باب قائم فرمایا کہ ذوی القربیٰ اس معنی میں مستحق نہیں ہیں کہ ان کو خمس کا کوئی نہ کوئی حصہ دیا جائے، بلکہ امام کو اختیار ہے جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ باب اس بات کی دلیل قائم کرنے کے لئے قائم کیا کہ خمس کو صرف کرنے کا حق صرف امام کو حاصل ہے، "**وانہ یعطی بعض قرابتہ دون بعض** "بعض رشتہ داروں کو دے سکتا ہے اور بعض کو نہ دے، نبی کریم ﷺ قرابت میں بھی بعض کو دے اور بعض کو نہ دے۔ اس کا حق امام کو حاصل ہے۔

"**ما قسم النبی ﷺ لبنی المطلب**" اگلی حدیث میں یہ بات ہے کہ آنحضرت ﷺ نے خیبر کے خمس میں سے بنوالمطلب اور بنو ہاشم کو دیا لیکن بنونوفل اور بنوعبد شمس کو نہیں دیا حالانکہ رشتہ کے اعتبار سے وہ بھی حضور اقدس ﷺ سے تقریباً وہی تعلق رکھتے تھے جو بنومطلب اور بنو ہاشم کا ہے۔

یعنی عبد مناف کے چار بیٹے تھے، نوفل، عبد الشمس، مطلب اور ہاشم۔ آپ ﷺ نے بنوالمطلب اور بنو ہاشم کو دیا لیکن بنونوفل اور بنوعبد الشمس کو نہیں دیا، لہٰذا پتہ چلا کہ مستحق ہونے کی بنیاد پر نہیں دیا، اگر ذوی القربیٰ کو مستحق ہونے کی بنیاد پر دیا ہوتا تو سب کو دیتے لیکن سب کو نہیں دیا کچھ کو دیا اور کچھ کو نہیں دیا۔

"**وقال عمر بن عبدالعزیز** .... **إلیہ** " حضرت عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا "**لم یعمھم بذلک**" عطاء خمس میں آپ نے سب کو عام نہیں کیا۔ "**ولم یخص قریباً دون من أحوج إلیہ** "اور ایسا نہیں کیا کہ آپ نے کسی خاص رشتہ دار کو دیا ہو اور اس شخص کو چھوڑ دیا ہو جو اس سے زیادہ محتاج تھا، گویا احتیاج کی بنیاد پر دیا، قرابت کی بنیاد پر نہیں دیا۔ اس سے بالواسطہ حنفیہ کی تائید ہو رہی ہے کہ مدار احتیاج پر ہے قرابت پر نہیں۔

"**وإن کان الذی أعطی لما یشکو إلیہ من الحاجة**" اس "کان" کی خبر محذوف ہے، اصل عبارت یوں تھی "**ان کان الذی أعطیٰ بعد قرابة ممن لم یوت**" کہ اگر چہ اپنے رشتہ داروں میں سے وہ شخص جس کو دیا وہ قرابت کے لحاظ سے بنسبت ان کے بعید ہو جن کو نہیں دیا، یعنی بعید کو دے دیا اور قریب کو نہیں دیا۔ "**لما یشکو إلیہ من الحاجة** "اس واسطے کہ بعید حاجت کی شکایت کر رہا تھا۔ "**ولما مستھم فی جنبہ من قومھم وخلفاً ھم**" اور ان کی قوم اور خلفاء کی طرف سے ان کی جانب میں کوئی بات پہنچی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ یا تو حاجت کو بنیاد بنایا، یا اس بات کو کہ ان کی طرف سے مسلمانوں کو زیادہ نصرت حاصل ہوئی، اس کی وجہ سے ان کو دیا، چاہے وہ قرابت کے اعتبار سے بعید ہیں۔

۳۱۴۰ ـ حدثنا عبداللہ بن یوسف : حدثنا اللیث عن عقیل ، عن ابن شہاب ، عن ابن المسیب ، عن جبیر بن مطعم قال: مشیت أنا وعثمان بن عفان إلی رسول اللہ ﷺ فقلنا: یارسول اللہ، أعطیت بنی المطلب وترکتنا، ونحن وھم منک بمنزلہ واحدة؟ فقال رسول اللہ ﷺ :((إنما بنو المطلب وبنو ھاشم شیء واحد)). قال اللیث: حدثنی یونس، وزاد: قال جبیر: ولم یقسم النبی ﷺ لبنی عبد شمس ولا لبنی نوفل. وقال ابن إسحاق: عبد شمس وھاشم والمطلب إخوة لأم، وأمھم عاتکة بنت مرة، وکان نوفل

أخاهم لأبيهم. [أنظر: ۳۵۰۲، ۴۲۲۹]. [۲۸]

حضرت جبیر بن مطعم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں اور حضرت عثمان بن عفان ﷺ دونوں رسول اللہ ﷺ کے پاس گئے اور عرض کیا "**یا رسول اللہ أعطیت بنی المطلب و تركتنا**" آپ نے بنوالمطلب کو دیا اور ہم کو چھوڑ دیا، حالانکہ ہم اور وہ یعنی بنوالمطلب آپ سے ایک ہی رشتہ رکھتے ہیں، ایک ہی درجہ میں ہیں۔

حضرت عثمان ﷺ بنوعبدالشمس میں سے تھے اور حضرت جبیر بن مطعم ﷺ بنونوفل میں سے تھے، یہ دونوں آئے اور آکر کہا کہ اگر آپ نے صرف بنو ہاشم کو دیا ہوتا، اور بنوالمطلب کو نہ دیا ہوتا تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں تھا، اس لئے کہ بنو ہاشم کو فضیلت حاصل ہے کیونکہ آپ بنو ہاشم میں سے ہیں، بنو ہاشم آپ کا خاندان ہے اور اس نے جو آپ ﷺ کی نصرت کی ہے وہ عیاں ہے، بنو ہاشم کے ساتھ آپ کو زیادہ قرابت داری حاصل ہے، لیکن آپ نے بنو ہاشم کے ساتھ بنوالمطلب کو بھی دیا اور بنوالمطلب سے آپ کا وہی رشتہ ہے جو بنونوفل اور بنوعبدالشمس سے ہے، ان کو ہمارے اوپر کوئی مزیت حاصل نہیں ہے، اس کی کیا وجہ ہے کہ آپ نے ان کو دیا اور ہمیں چھوڑ دیا، حالانکہ وہ یعنی بنوالمطلب اور ہم آپ کے ایک ہی رشتہ میں ہیں۔

"**فقال رسول اللہ ﷺ .... شیء واحد**" بنوالمطلب اور بنو ہاشم ایک ہی چیز ہیں، یعنی بنو المطلب کا بنو ہاشم سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ دونوں ایک ہی خاندان بن گئے ہیں اور انہوں نے جس طرح قرابت کا حق ادا کیا اور جس طرح نصرت کی وہ بنوعبدالشمس اور بنونوفل سے بہت زیادہ ہے، چونکہ وہ دونوں ایک جیسے ہیں اس لئے میں نے ان دونوں کو دیا یعنی بنوالمطلب کو بھی دیا اور بنو ہاشم کو بھی دیا، اس پر بنونوفل اور بنوعبدالشمس کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، نصرت کے معاملہ میں یہ اس درجہ پر نہیں ہیں جس پر بنوالمطلب و بنو ہاشم ہیں۔

بہر حال معلوم ہوا کہ بنوالمطلب اور بنونوفل وغیرہ سے رشتہ داری کا تعلق ایک جیسا تھا لیکن آپ ﷺ نے دوسری باتوں کو مدّ نظر رکھتے ہوئے بنوالمطلب کو بنوعبدالشمس اور بنونوفل پر ترجیح دی۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کر رہے ہیں کہ اگر بنیاد قرابت ہوتی تو سب کو یکساں طور پر دیتے لیکن چونکہ سب کو یکساں نہیں دیا، اس لئے معلوم ہوا کہ بنیاد قرابت نہیں ہے۔

---

[۲۸] وفی سنن النسائی ، کتاب قسم الفیئ ، رقم : ۴۰۶۷ ، و سنن ابی داؤد ، کتاب الخراج و الامارة و الفیئ ، باب بیان مواضع قسم الخمس و سهم ذی القربیٰ ، رقم : ۲۵۸۵ ، و سنن ابن ماجة ، کتاب الجهاد ، باب قسمة الخمس ، رقم : ۲۸۷۲ ، ومسند احمد ، مسند المدنيين اجمعين ، باب حديث جبير بن مطعم ، رقم : ۱۶۱۴۱ ، ۱۶۱۶۷ ، ۱۶۱۷۹ .

(۱۸) باب من لم یخمس الأسلاب ،

ومن قتل قتیلا فله سلبه من غیر أن یخمس ، وحکم الإمام فیه ،

مقتول کے سلب کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ ہمیشہ سلب کا مستحق قاتل ہوتا ہے یا نہیں؟

امام شافعی وامام احمد رحمہما اللہ کا مسلک

امام شافعی رحمہ اللہ اور امام احمد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو بھی قتل کرے گا ہمیشہ سلب اسی کو ملے گا، یہ حکم شرعی ابدی ہے، اور سلب خمس کا حصہ نہیں ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہما اللہ کا مسلک

امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اور امام مالک رحمہ اللہ یہ فرماتے ہیں کہ یہ حکم شرعی ابدی نہیں ہے، بلکہ امام کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے یہ اعلان کردے **"من قتل قتیلا فله سلبه"** جب چاہے قاتل کو سلب دے اور جب چاہے نہ دے۔

حضور اقدس ﷺ نے متعدد مقامات پر یہ اعلان کروایا۔ شافعیہ اور حنابلہ اس کو حکم شرعی پر محمول کرتے ہیں اور حنفیہ اور مالکیہ اس کو حکم انتظامی یا سیاسی پر محمول کرتے ہیں کہ بحیثیت امام آپ ﷺ نے یہ حکم جاری کیا تھا۔

حنفیہ کی دلیل بدر کا واقعہ ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ روایت کر رہے ہیں، جس کے آخر میں ہے:

۳۱۴۱ ـ .... ثم انصرفا إلى رسول الله ﷺ فأخبراه فقال: ((أیکما قتله؟)) قال کل واحد منهما: أنا قتلته. فقال: ((هل مسحتما سیفیکما؟)) قالا: لا، فنظر في السیفین فقال: ((کلاکما قتله)). سلبه لمعاذ بن عمرو بن الجموح، وکانا معاذ بن عفراء ومعاذ بن عمرو بن الجموح.

قال محمد: سمع یوسف صالحا وسمع إبراهیم أباه عبدالرحمٰن بن عوف.

[أنظر: ۳۹۶۴، ۳۹۸۸.] [۲۹]

اب قتل معاذ رضی اللہ عنہ اور معوذ رضی اللہ عنہ دونوں نے کیا تھا لیکن آپ ﷺ نے سلب حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو دیا، حالانکہ حضرت معوذ رضی اللہ عنہ بھی قتل میں شریک تھے۔

---

۲۹ وفي صحیح مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب استحقاق القاتل سلب القتیل، رقم: ۳۲۹۶، ومسند احمد، مسند العشرة المبشرین بالجنة، باب حدیث عبدالرحمن بن عوف الزهري، رقم: ۱۵۸۳.

دوسری بات یہ ہے کہ آخر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے قتل کیا تھا اور ایسے موقع پر جو آخر میں قتل کرنے والا ہوتا ہے، سلب اس کو ملتا ہے لیکن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ نے سوائے تلوار کے اور سلب نہیں دیا۔

اگر یہ کوئی حکم شرعی ابدی ہوتا تو تینوں کے درمیان برابر تقسیم ہونا چاہئے تھا، لیکن آپ ﷺ نے ایسا نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ یہ کوئی حکم شرعی ابدی نہیں ہے۔

"فقال : هل مسحتما سيفيكما" دونوں کی تلوار دیکھی اور پھر فرمایا کہ تم دونوں نے قتل کیا، تم دونوں قاتل ہو، ہمت افزائی فرمائی لیکن سلب کا فیصلہ معاذ بن عمرو کیلئے کیا، اس لئے کہ شاید تلوار کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ آخر کاری ضرب انہوں نے لگائی ہے۔

(۱۹) باب ما كان النبي ﷺ يعطي المؤلفة قلوبهم وغير هم من الخمس ونحوه،

"رواه عبدالله بن زيد عن النبي ﷺ".

اس ترجمۃ الباب سے بھی وہی بات کہنا چاہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ مؤلفۃ القلوب کو تالیف قلب کیلئے پیسے دیتے تھے **"من الخمس"** حالانکہ قرآن کریم نے اس کے جو مصارف بیان کئے ہیں اس میں مؤلفۃ القلوب داخل نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ امام کو اختیار ہے جہاں چاہے صرف کرے۔

۳۱۴۴ ۔ حدثنا أبو النعمان: حدثنا حماد بن زيد، عن أيوب ، عن نافع: أن عمر ابن الخطاب رضي الله عنه قال: يا رسول الله، إنه كان علي اعتكاف يوم في الجاهلية فأمره أن يفي به. قال: وأصاب عمر جاريتين من سبي حنين فوضعهما في بعض بيوت مكة، قال: فمن رسول الله ﷺ على سبي حنين فجعلوا يسعون في السكك فقال عمر : يا عبدالله. انظر ما هذا؟ قال : من رسول الله ﷺ على السبي. قال : اذهب فأرسل الجاريتين. قال نافع: ولم يعتمر رسول الله ﷺ من الجعرانة، ولو اعتمر لم يخف على عبدالله. وزاد جرير بن حازم عن أيوب عن نافع عن ابن عمر وقال : من الخمس ، ورواه معمر ، عن أيوب عن نافع ،عن ابن عمرفي النذر ولم يقل: يوم. [راجع: ۲۰۳۲]

آپ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو دو کنیزیں دی تھیں، وہ خمس میں سے تھیں، معلوم ہوا کہ امام کو خمس میں تصرف کرنے کا مکمل حق حاصل ہے۔

۳۱۴۵ ۔ حدثنا موسى بن إسماعيل : حدثنا جرير بن حازم : حدثنا الحسن قال : حدثني عمرو بن تغلب رضي الله عنه قال : أعطى رسول الله ﷺ قوماً ، ومنع آخرين فكأنهم عتبوا

عليه فقال : إني أعطي قوما أخاف ظلعهم وجزعهم ، وأكل اقواما إلى ما جعل الله في قلوبهم من الخير و الغناء. منهم عمرو بن تغلب. فقال عمرو بن تغلب : ما أحب أن لي بكلمة رسول الله ﷺ حمر النعم. زاد أبو عاصم ،عن جرير قال : سمعت الحسن يقول : حدثنا عمر و بن تغلب أن رسول الله ﷺ أتى بمال أو بسبي فقسمه بهذا.[راجع : ۹۲۳]

حضور اقدس ﷺ نے کچھ لوگوں کو دیا اور کچھ کو نہیں دیا تو بعض لوگوں کو شکایت ہوئی۔

"عتبوا عليه" کا معنی ہے، لوگوں کو شکایت ہوئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ: **"إني أعطي قوما أخاف ظلعهم و جزعهم"** میں ایسے لوگوں کو دیتا ہوں جن کے بارے میں مجھے ٹیڑھے ہو جانے کا ڈر ہے۔ **"ظلع"** کا لفظی معنی ہے لنگڑا ہو جانا۔ **"ظالع"** لنگڑے کو کہتے ہیں، اس لئے اگر نہیں دوں گا تو اندیشہ ہے کہ وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائیں۔ **"وجزعهم"** اور ان کی گھبراہٹ سے یعنی اگر نہیں دوں گا تو ان کے اندر جزع پیدا ہوگا، ایسا نہ ہو کہ وہ اسلام چھوڑ کر بھاگ جائیں، تو گویا تالیف قلب کے لیے دیتا ہوں۔

"وأكل اقواما إلى ما جعل الله في قلوبهم" اور بعض لوگوں کو چھوڑ دیتا ہوں یعنی اس بات پر بھروسہ کرتا ہوں جو اللہ ﷻ نے ان دلوں میں خیر اور غنا رکھا ہے، اس لئے ان کو یقین نہیں۔

ساتھ ہی فرمایا **"منهم عمرو بن تغلب"** انہی میں سے عمرو بن تغلب بھی ہیں، کیونکہ ان کے دل میں غنا اور خیر کا احساس ہے، اس لئے ان کو نہیں دیا۔

"فقال عمرو بن تغلب" مجھے سرخ اونٹ ملتے ہیں، تب بھی اتنی خوشی نہ ہوتی جتنی رسول اللہ ﷺ کے اس قول سے ہوئی تو گویا آپ ﷺ نے میرے دل میں غنا اور خیر ہونے کی شہادت دی ہے۔

۳۱۴۸ ۔ حدثنا عبد العزيز بن عبد الله الأويسي : حدثنا إبراهيم بن سعد ، عن صالح ، عن بن شهاب قال : أخبرني عمرو بن محمد بن جبير بن مطعم أن محمدبن جبير قال : أخبرني جبير بن مطعم أنه بينا هو مع رسول الله ﷺ ومعه الناس مقفله من حنين علقت رسول الله ﷺ الأعراب يسألونه حتى اضطروه إلى سمرة فخطفت رداء ه فوقف رسول الله ﷺ فقال : ((أعطوني ردائي ،فلو كان عدد هذه العضاه نعما لقسمته بينكم ثم لا تجدونني بخيلا ولا كذوبا ولا جبانا)).[راجع: ۲۸۲۱]

حضرت جبیر ﷺ کو آپ ﷺ نے جاگیر دی تھی اس سے استدلال کر رہے ہیں کہ امام کو خمس میں تصرف کا حق حاصل ہے۔

۳۱۵۲ ۔ حدثني احمد بن المقدام: حدثنا الفضيل بن سليمان : حدثنا موسى بن عقبة قال: أخبرني نافع ، عن ابن عمر رضي الله عنهما: أن عمر بن الخطاب أجلى اليهود

والنصارى من أرض الحجاز، وكان رسول الله ﷺ لما ظهر على أهل خيبر أراد أن يخرج اليهود منها وكانت الأرض ۔ لما ظهر عليها ۔ لليهود وللرسول وللمسلمين، فسأل اليهود رسول الله ﷺ أن يتركهم على أن يكفوا العمل ولهم نصف الثمر، فقال رسول الله ﷺ: ((نترككم على ذلك ما شئنا))، فأقروا حتى أجلاهم عمر في إمارته إلى تيماء وأريحاء. [راجع ۲۲۸۵]

اس حدیث کا باب سے کیا تعلق ہے؟ یہ کسی شارح کی سمجھ میں نہیں آیا، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہما اللہ وغیرہم نے ہتھیار ڈال دیئے کہ باب میں کہا گیا ہے خمس سے مؤلفۃ القلوب کو دیا جا سکتا ہے یہاں نہ مؤلفۃ القلوب ہیں، نہ خمس دینے کا کوئی مسئلہ ہے کیونکہ یہ زمین تو غنیمت تھیں، ان پر یہودیوں کو برقرار رکھا گیا، لہٰذا کوئی تعلق باب سے سمجھ میں نہیں آتا۔

حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی توجیہ

صرف حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے اس کی یہ توجیہ کی ہے کہ خیبر کی زمین ان کو مزارعت پر دی گئی تھیں اور حضور ﷺ کا معمول تھا کہ ان کے پاس خرص کیلئے خارص بھیجتے تھے، وہ خارص خرص کی بنیاد پر پیداوار وصول کرتے تو اس کا ثلث یا ربع چھوڑ دیا کرتے تھے جیسا کہ بعض روایتوں میں آتا ہے۔

تو ثلث اور ربع چھوڑ دینا ایک طرح سے یہود خیبر کے لئے عطا ہے اور یہ عطا تالیف قلب کے لئے ہے یا غیر مؤلفۃ القلوب کو دی گئی کیونکہ ترجمۃ الباب میں مؤلفۃ القلوب وغیرہم دونوں کا ذکر ہے۔

امام نے اپنے اختیار کو استعمال کرتے ہوئے یہ عطا دی تو یہ مناسبت ہوسکتی ہے، باقی باب سے کوئی اور بات یا مناسبت سمجھ میں نہیں آتی۔

(۲۰) باب ما يصيب من الطعام في أرض الحرب

۳۱۵۴ ۔ حدثنا مسدد: حدثنا حماد بن زيد، عن أيوب، عن نافع: عن ابن عمر رضي الله عنهما قال: كنا نصيب في مغازينا العسل والعنب فنأكله ولا نرفعه. [۳۰]

آپ نے چونکہ نکیر نہیں فرمائی، معلوم ہوا کھانے پینے کی چیز تقسیم سے پہلے بھی لی جاسکتی ہے، **"فنأكله ولا نرفعه"** یعنی کھالیتے تھے اٹھا کر نہیں رکھتے تھے کہ اس کا ذخیرہ کرلیں۔

---

[۳۰] وفي سنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب اباحة الطعام في أرض العدو، رقم: ۲۳۲۶.

كتاب الجزية والموادعة

٣١٥٦ - ٣١٨٩

۵۸ - كتاب الجزية والموادعة

(۱) باب الجزية والموادعة مع أهل الذمة والحرب،

وقول الله تعالى: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلا يُحَرِّمُوْنَ﴾ إلى قوله: ﴿وَهُمْ صَاغِرُوْنَ﴾[۱] يعني أذلاء. والمسكنة مصدر المسكين، فلان أسكن من فلان أحوج منه ولم يذهب إلى السكون وماجاء في أخذ الجزية من اليهود والنصارى والمجوس والعجم. وقال ابن عيينة، عن ابن أبي نجيح: قلت لمجاهد: ما شأن أهل الشام عليهم أربعة دنانير، وأهل اليمن عليهم دينار؟ قال: جعل ذلك من قبل اليسار.

یہ ''جزیہ'' اور ''موادعہ'' کے بارے میں باب ہے، اہل حرب کے ساتھ صلح کرنا۔ بعض نسخوں میں اس کو باقاعدہ کتاب قرار دے کر ''**كتاب الجزية**'' کا عنوان دیا گیا۔

اس میں پہلی بات یہ ذکر کی کہ ''**صاغرون**'' کا معنی ہے ''**أذلاء**'' اور ''**مسكنه**'' یہ ''**مسكين**'' کا مصدر ہے ''**أسكن من فلان**'' کے معنی ہوتے ہیں ''**أحوج منه ولم يذهب إلى السكون**'' اور تشریح کرنے والا ''**سكون**'' کی طرف نہیں گیا یعنی یہ نہیں کہا کہ یہ ''**سكون**'' سے ماخوذ ہے، بلکہ کہا کہ ''**مسكنه**'' سے ماخوذ ہے۔

''**وما جاء في الجزية**'' اور وہ روایتیں جو یہود و نصاریٰ اور مجوس سب سے جزیہ لینے کے بارے میں وارد ہوئی ہیں، اس سے اختلاف کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

جمہور کا قول

جمہور کہتے ہیں کہ کفار عرب کے سوا تمام کفار سے جزیہ لیا جائے گا، اس لئے کہ اہل عرب کے بارے میں دو ہی باتیں ہیں، اسلام یا قتال۔ اہل عرب کیلئے جزیہ نہیں ہے اور باقی سارے کفار سے جزیہ لیا جائے گا۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا قول

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جزیہ صرف اہل کتاب کے لئے ہے اور غیر اہل کتاب جو کافر ہیں، عجم

[۱] [التوبة: ۲۹]

کے بت پرست وغیرہ ان میں جزیہ نہیں ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا استدلال

امام شافعی رحمہ اللہ اس آیت سے استدلال کرتے ہیں ﴿ **قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْ مِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّ مُوْن** ﴾ کہتے ہیں کہ قرآن کریم میں صرف اہل کتاب کا ذکر ہے، معلوم ہوا کہ جزیہ صرف اہل کتاب کے لئے ہے غیر اہل کتاب کیلئے نہیں ہے، البتہ مجوس کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ ان سے جزیہ لیا جائے گا۔ شروع میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مجوس سے جزیہ لینے میں تردد تھا، بعد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے یہ روایت بتائی کہ حضور اقدس ﷺ نے مجوس سے جزیہ لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی مجوس سے جزیہ لینے کا فیصلہ کیا۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہین کہ مجوس سے اس لحاظ سے جزیہ لیا جائے گا کہ وہ بھی اہل کتاب ہیں، اصلاً ان کے اوپر کوئی کتاب اتری تھی اگر چہ وہ محفوظ نہیں ہے، اس لئے **"من الذين أوتوا الكتاب"** میں داخل ہیں، ان سے جزیہ لیا جائے گا اور باقی کفار سے نہیں لیا جائے گا۔

جمہور کا استدلال

جمہور کا استدلال یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے مجوس سے جزیہ لیا اور مجوس کا اہل کتاب ہونا اسلام میں تسلیم شدہ نہیں ہے، کیونکہ اگر اہل کتاب ہونا تسلیم شدہ ہوتا تو ان کی عورتوں سے نکاح بھی جائز ہوتا اور ان کا ذبیحہ بھی حلال ہوتا، لیکن نہ ذبیحہ حلال ہے نہ ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ اسلام میں ان کا اہل کتاب ہونا مسلم نہیں۔

اب جو جزیہ لیا گیا وہ بحیثیت اہل کتاب کے نہیں بلکہ عام کافروں کی حیثیت سے لیا گیا اور تمام کافر **"الكفر ملة واحدة"** ہیں اور قرآن کریم میں جو **"من الذين أو توا الكتاب"** کا ذکر آیا ہے وہ بطور واقعہ کے ہے، بطور احتراز نہیں ہے اور جزیہ لینے کی اصل وجہ **"ولا يد ينون دين الحق"** ہے جس میں ہر کافر داخل ہے۔

امام بخاری رحمہ اللہ بھی جمہور کی تائید کررہے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور مجوس سے اور عجم سے جزیہ لیا جائے گا۔ عجم سے تمام بت پرست مراد ہیں۔

آگے کہتے ہیں کہ حضرت مجاہد نے کہا **"ماشان أهل الشام عليهم أربعة دنا نير، وأهل اليمن عليهم دينار؟"** کیا وجہ ہے کہ اہل شام سے تو چار دینار وصول کئے جاتے ہیں اور اہل یمن سے ایک دینار؟

"قال: جعل ذٰلک من قبل الیسار" انہوں نے کہا کہ لوگوں کے مالدار ہونے کی وجہ سے ایسا کیا ہے، شام کے لوگ زیادہ مالدار ہیں، لہٰذا چار دینار مقرر کئے گئے اور یمن کے لوگ کم مالدار ہیں، لہٰذا ان پر ایک دینار مقرر کیا گیا۔

حنفیہ کا اُصول

حنفیہ کے ہاں اصول یہ ہے کہ جزیہ کی دو قسمیں ہیں۔

ایک صورت یہ ہے کہ جزیہ پر صلح ہوئی ہو، تو صلح کسی بھی مقدار پر ہو سکتی ہے، صلح میں جو مقدار طے ہو جائے وہ دینی ہوگی، چاہے کم ہو یا زیادہ۔

دوسری صورت یہ ہے کہ مسلمانوں نے فتح کرنے کے بعد زبردستی جزیہ عائد کیا ہو، اس میں غنا اور فقر کا اعتبار ہے۔ فقہائے کرام رحمہم اللہ نے مختلف مقدار بیان کی ہے مثلاً ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ غریبوں سے بارہ درہم، متوسط لوگوں سے چوبیس درہم اور جو غنی ہیں ان سے اڑتالیس درہم سالانہ لئے جائیں گے، بہر حال اس میں غنا اور فقر کا اعتبار ہے۔

۳۱۵۶ ۔ حدثنا علي بن عبد الله : حدثنا سفیان قال: سمعت عمر ا قال: کنت جالسا مع جابر بن زید وعمرو بن أوس فحد ثهما بجالة سنة سبعین ۔ عام حج مصعب بن الزبیر بأهل البصرة ۔ عند درج زمزم قال: کنت کاتبا لجزء بن معاویة ،عم الأحنف ، فأتانا کتاب عمر بن الخطاب قبل موته بسنة ، فرقوا بین کل ذي محرم من المجوس، ولم یکن عمر أخذ الجز یة من المجوس .

۳۱۵۷ ۔ حتی شهد عبد الرحمٰن بن عوف : أن رسول الله ﷺ أخذ ها من مجوس هجر .[۲]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو خط بھیجا اس میں دو حکم تھے، ایک تو یہ کہ **"فرق بین کل ذی محرم من المجوس"** مجوسی لوگ محرمات سے بھی نکاح جائز سمجھتے ہیں، اگر کسی نے ایسا نکاح کیا ہو تو ان میں تفریق کر دو۔

---

۲ وفی سنن الترمذی ، کتاب السیر عن رسول الله ، باب ماجاء فی اخذ الجزیة من المجبوس ،رقم : ۱۵۱۲، وسنن أبی داؤد ، کتاب الخراج والامارة والفئی ، باب فی اخذ الجزیة من المجبوس ، رقم : ۲۶۴۲، ومسند احمد ، مسند العشرة المبشرین بالجنة ، باب حدیث عبدالرحمن بن عوف الزهری ،رقم : ۱۵۶۹، ۱۵۹۳، وموطامالک ، کتاب الزکاة ، باب جزیة أهل اللکتاب والمجبوس ، رقم : ۵۴۴، وسنن الدارمی ، کتاب السیر ، باب فی اخذ الجزیة من المجبوس ، رقم : ۲۳۸۹.

اور حضرت عمرؓ نے شروع میں مجوس سے جزیہ نہیں لیا تھا، یہاں تک کہ حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ نے شہادت دی کہ حضور ﷺ نے ہجر کے مجوسیوں سے جزیہ وصول کیا، اس کے بعد حضرت عمرؓ نے مجوسیوں سے جزیہ لینا شروع کیا۔

ایک سوال ہوتا

ہے کہ آیا جزیہ واجب ہے یا حکومت معاف بھی کر سکتی ہے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ معاف بھی کر سکتی، دوسرا یہ کہ جزیہ کے سلسلے میں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ جزیہ ہی کے نام سے لیا جائے، بلکہ کوئی بھی ٹیکس عائد کیا جائے، وہ جزیہ کے مد میں شامل ہو سکتا ہے۔

۳۱۵۸ ـ ....فتبسم رسول الله ﷺ حين رآهم............ولكن أخشى عليكم أن تبسط عليكم الدنيا كما بسطت على من كان قبلكم فتنا فسوها كما تنا فسوها وتهلككم كما أهلكتهم)).

دے بھی رہے ہیں اور ساتھ تنبیہ بھی فرما رہے ہیں کہ دنیا تمہیں ہلاک نہ کر دے۔

۳۱۵۹ ـ حدثنا الفضل بن يعقوب: حدثنا عبدالله بن جعفر الرقي : حدثنا المعتمر بن سليمان : حدثنا سعيد بن عبيد الله الثقفي : حدثنا بكر بن عبدالله المزني و زياد بن جبير عن جبير بن حية، قال : بعث عمر الناس في أفناء الأمصار يقاتلون المشركين ، فأسلم الهرمزان فقال : إني مستشيرك في مغازيّ هذه. قال: نعم ، مثلها و مثل من فيها من الناس من عدو المسلمين مثل طائر له رأس وله جنا حان وله رجلان، فإن كسر أحد الجناحين نهضت الرجلان بجناح والرأس فإن كسر الجناح الآخر نهضت الرجلان والرأس. وإن شدخ الرأس ذهبت الرجلان والجناحان والرأس. فالرأس كسرى والجناح قيصر والجناح الآخر فارس ، فمر المسلمين فلينفروا إلى كسرى . وقال بكر وزياد جميعا : عن جنبير حية، فند بنا عمر واستعمل علينا النعمان بن مقرن، حتى إذا كنا بأرض العدو، خرج علينا عامل كسرى في أربعين ألفا، فقام ترجمان فقال : ليكلمني رجل منكم ، فقال المغيرة : سل عما شئت ، قال: ما أنتم؟ قال: نحن أناس من العرب كنا في شقاء شديد وبلاء شديد نمص الجلد والنوى من الجوع ، ونلبس الوبر والشعر، ونعبد الشجر والحجر . فبينا نحن كذلك إذ بعث رب السموات ورب الأرضين ، تعالى ذكره ، وجلت عظمته ، إلينا نبيا من أنفسنا نعرف أباه وأمه. فأمرنا نبينا

رسول الله ربنا ﷺ أن نقاتلكم حتى تعبدوا الله وحده أو تؤدوا الجزية. وأخبرنا نبينا ﷺ عن رسالة ربنا أنه من قتل منا صار إلى الجنة في نعيم لم ير مثلها قط، ومن بقي منا ملك رقابكم. [أنظر: ۷۵۳۰] [۳]

جبیر بن حیہ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مشرکین سے قتال کرنے کیلئے مختلف شہروں کے علاقوں میں بھیجا ہوا تھا، "**فأسلم الهرمزان**" ہرمزان یہ اھواز کے علاقہ کا سردار تھا، اسلام لے آیا، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حقیقت میں مسلمان نہیں ہوا تھا، ویسے ہی اس نے مکر کیا تھا، لفظی طور پر مسلمان ہوگیا تھا، اندر سے مسلمان نہیں ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ کی شہادت کی سازش میں یہ بھی شریک تھا۔

"**فقال: إني مستشيرك في مغازي هذه**" جب اسلام لے آیا تو حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہم جو جنگیں لڑ رہے ہیں، اس میں تم سے مشورہ لینا چاہیں گے کیونکہ تم اس علاقہ کے ماہر ہو۔ "**قال: نعم**" اس نے کہا ہاں میں مشورہ دیتا ہوں "**مثلها ومثل من فيها**" مسلمانوں کے دشمنوں کی مثال ایسی ہے جیسا کہ ایک پرندہ ہے، جس کا ایک سر، دو پر اور دو ٹانگیں ہیں، اگر ایک پر توڑ دیا جائے تو پھر بھی وہ ٹانگوں پر کھڑا ہو جائے گا "**بجناح والرأس**" ایک جناح اور ایک سر ہوگا، جس کی وجہ سے وہ اٹھ جائے گا۔

"**فإن كسرا لجناح الآخر**" اگر دوسرا پر توڑ دیا جائے، تو دو پاؤں اور ایک سر اس کے کھڑے ہونے کیلئے کافی ہوں گے، "**وإن شدخ الرأس**" اور اگر سر ہی پھاڑ دیا جائے تو "**ذهبت الرجلان والنجاحان والرأس**" پھر کچھ بھی نہیں رہے گا۔ "**فالرّأس كسرىٰ والجناح قيصر والجناح الأخر فارس**" کہتے ہیں کہ کسریٰ سر ہے اور ایک بازو قیصر ہے اور دوسرا بازو فارس ہے۔

اب تو ہم ایران، خراسان سارے کو فارس کہتے ہیں، اس وقت فارس الگ تھا اور خراسان الگ تھا یعنی دونوں مستقل حکومتیں سمجھی جاتی تھیں، اگرچہ سب پر حکومت کسریٰ کی تھی لیکن فارس کے اندر اس کا کوئی اور عامل بھی کام کرتا تھا۔

"**فمر المسلمين فلينفروا إلىٰ كسرىٰ**" آپ مسلمانوں کو حکم دیں کسریٰ کی طرف جائیں، پہلے اس سر کو توڑیں باقی بازو خود بخود کٹ جائیں گے۔

"**فندبنا عمر واستعمل علينا النعمان بن مقرن**" حضرت نعمان بن مقرنؓ کو ہمارے اوپر عامل یعنی امیر مقرر کیا اور کہا کہ کسریٰ کی طرف جاؤ۔ "**حتى إذا كنا بأرض العدو وخرج إلينا عامل كسرى في أربعين ألفا، كسرىٰ**" کا عامل چالیس ہزار کا لشکر لے کر آ گیا۔

---

[۳] وفي سنن الترمذي، كتاب السير عن رسول الله، باب ماجاء في الساعة التي يستحب فيها القتال، رقم: ۱۵۳۷، وسنن أبي داؤد، كتاب الجهاد، باب في أي وقت يستحب اللقاء، رقم: ۲۲۸۳.

"**فقام ترجمان**" اس کا ایک ترجمان کھڑا ہوا، "**فقال: لیکلمنی رجل منکم**" "تم میں سے کوئی آدمی ہم سے بات کرے"، "**فقال المغیرة: سل عما شئت، قال: ما أنتم؟**" "تم کیا چیز ہو؟" "**قال: نحن أناس من العرب کنا فی شقاء شدید وبلاء شدید نمص الجلد والنوی من الجوع ونلبس الوبر والشعر**".

۳۱۶۰ ۔ فقال النعمان: ربما أشهدک الله مثلها مع النبی ﷺ فلم یندمک ولم یخزک، ولکنی شهدت القتال مع رسول الله ﷺ. کان إذا لم یقاتل فی أول النهار انتظر حتی تهب الأرواح وتحضر الصلوات.

حضرت نعمان بن مقرن رضی اللہ عنہ نے جب حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کی تقریر سنی تو کہا کہ اللہ جل جلالہ نے آپ کو اس جیسے موقع پر نبی کریم ﷺ کے ساتھ رہنے کا موقع دیا ہوگا یعنی جہاد کے موقع پر "**فلم یندمک ولم یخزک**" اللہ جل جلالہ نے نبی کریم ﷺ کے ساتھ جہاد کرنے کے نتیجے میں نہ آپ کو پشیمان کیا اور نہ رسوا کیا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج آپ نے کسریٰ کے لشکر کے سامنے اتنی اچھی تقریر کی۔

لیکن ساتھ ہی انہوں نے کہا کہ میں اس کے باوجود آپ کو یہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ حملہ کرنے میں جلدی نہ کریں، کیونکہ "**ولکنی شهدت القتال**" اس لئے مقصد یہ ہے کہ تھوڑا انتظار کریں، پھر حملہ کریں۔

(۲) بابٌ: إذا وادع الإمام ملک القریة، هل یکون ذلک لبقیتهم؟

۳۱۶۱ ۔ حدثنا سهل بن بکار: حدثنا وهیب، عن عمرو بن یحیی، عن عباس الساعدی، عن أبی حمید الساعدی قال: غزونا مع النبی ﷺ تبوک، وأهدی ملک أیلة للنبی ﷺ بغلة بیضاء، وکساه بردا، وکتب له ببحرهم. [راجع: ۱۴۸۱]

یعنی حضور اقدس ﷺ نے ان کی بستیاں ان کے لئے لکھ دی تھیں کہ تم ان بستیوں پر حاکم رہو، جزیہ ادا کرو۔

اس پر امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ ترجمۃ الباب قائم کیا ہے کہ جب قریہ کے بادشاہ سے معاملہ ہو تو وہ اس قریہ کے تمام باشندوں پر لازم ہوتا ہے۔

۳۱۶۵ ۔ وقال إبراهیم بن طهمان: عن عبد العزیز بن صهیب عن أنس: أتی النبی ﷺ بمال من البحرین فقال: ((انثروه فی المسجد)). فکان أکثر مال أتی به رسول الله ﷺ إذ جاءه العباس فقال: یا رسول الله، أعطنی إنی فادیت نفسی وفادیت عقیلا فقال: ((خذ))، فحثا فی ثوبه، ثم ذهب یقله فلم یستطع، فقال: اؤمر بعضهم یرفعه إلی. قال: ((لا))، قال: فارفعه أنت علی، قال: ((لا))، فنثر منه ثم ذهب یقله فلم یرفعه فقال:

فمر بعضهم يرفعه علي ، قال : ((لا)) ، قال : فارفعه أنت علي ، قال: ((لا))، فنثر منه ثم احتمله على كاهله ثم انطلق فما زال يتبعه بصره حتى خفي علينا عجبا من حرصه. فما قام رسول الله ﷺ وثم منها درهم. [راجع: ۴۲۱]

اس سے بتانا چاہ رہے ہیں کہ مال فئی کے اندر امام کو تصرف کرنے کا کلی اختیار حاصل ہے، اس واسطے آپ ﷺ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اتنا دیا۔

(۷) باب إذا غدر المشركون بالمسلمين ، هل يعفى عنهم؟

۳۱۶۹ ۔ حدثنا عبد الله بن يوسف: حدثنا الليث قال: حدثني سعيد، عن أبي هريرة رضی اللہ عنہ قال: لما فتحت خيبر أهديت للنبي ﷺ شاة فيها سم فقال النبي ﷺ : ((اجمعوا لي من كان ها هنا من يهود))، فجمعوا له فقال لهم: ((إني سائلكم عن شيء ، فهل انتم صادقي عنه؟)) فقالوا: نعم ، قال لهم النبي ﷺ : ((من أبو كم؟)) قالوا: فلان ، فقال : ((كذبتهم بل أبو كم فلان)) ، قالوا: صدقت، قال: ((فهل أنتم صادقي عن شيء إن سألت عنه؟)) فقالوا: نعم يا أبا القاسم وإن كذبنا عرفت كذبنا كما عرفته في أبينا، فقال لهم: ((من أهل النار؟)) قالوا: نكون فيها يسيراً، ثم تخلفونا فيها. فقال النبي ﷺ : ((اخسؤا فيها، والله لا نخلفكم فيها أبدا)). ثم قال: ((فهل أنتم صادقي عن شيء إن سألتكم عنه؟)) قالوا: نعم يا أبا القاسم. قال: ((هل جعلتم في هذه الشاة سما؟)) قالوا: نعم ، قال: ((ما حملكم على ذلك؟)) قالوا: أردنا إن كنت كاذبا نستريح ، إن كنت نبيا لم يضرك. [أنظر: ۴۲۴۹ ، ۵۷۷۷]. [۴]

یعنی یہاں خود اقرار کرلیا کہ زہر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود نبی کریم ﷺ نے ان کو قتل نہیں کیا۔ اس سے امام بخاری رحمہ اللہ استدلال کررہے ہیں کہ اگر مشرکین مسلمانوں سے غدر کریں تو امام کو معاف کرنے کا حق حاصل ہے۔

(۱۱) باب إذا قالوا: صبأنا، ولم يحسنوا: أسلمنا،

"وقال ابن عمر: فجعل خالد يقتل فقال النبي ﷺ : ((أبرأ إليك مما صنع خالد))، وقال عمر: إذا قال: مترس، فقد آمنه، إن الله يعلم الألسنة كلها. وقال: تكلم لا بأس".

---

[۴] وفي مسند أحمد ، باقي مسند المكثرين ، باب باقي المسند السابق ، رقم : ۹۴۵۱ ، وسنن الدارمي ، كتاب المقدمة ، باب ماأكرم الله به النبي من كلام الموتى ،رقم : ۶۹ .

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر کوئی مسلمان کافر سے یہ کہہ دے کہ **"مترس"** یہ فارسی کا جملہ ہے یعنی ڈرو نہیں، تو یہ بھی امان ہو گیا، اسی طرح اگر یہ کہہ دیا کہ **"تکلم لا بأس"** تو بھی امان ہو گیا۔ یہ واقعہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آیا تھا کہ ہرمزان (جس کا واقعہ پیچھے گزرا ہے) کو جب پکڑ کر لایا گیا تو یہ ڈر کے مارے بری طرح کانپ رہا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا **"تکلم لا بأس"** کوئی بات نہیں، ڈرتے کیوں ہو، بات کرو۔

اس سے اس کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے بات چیت کی، بعد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب اس کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو اس نے کہا کہ آپ یہ کہہ کر **"تکلم لا بأس"** مجھے امان دے چکے ہیں، اب آپ امان واپس نہیں لے سکتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ہاں میں نے یہ کہا تھا اس سے امان ہو گئی، تو اس کو بھی امان قرار دیا۔

(۱۲) باب الموادعة والمصالحة مع المشركين بالمال وغيره، وإثم من لم يف بالعهد،

وقوله: ﴿وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ﴾ جنحوا : طلبوا السلم. ﴿فَاجْنَحْ لَهَا﴾

۳۱۷۳ ـ حدثنا مسدد: حدثنا بشر، هو بن المفضل: حدثنا يحيى، عن بشير بن يسار، عن سهل بن أبي حثمة قال: انطلق عبد الله بن سهل ومحيصة بن مسعود بن زيد إلى خيبر وهي يومئذ صلح فتفرقا، فأتى محيصة إلى عبد الله بن سهل وهو يتشحط في دمه قتيلا فدفنه، ثم قدم المدينة فانطلق عبد الرحمن بن سهل ومحيصة وحويصة ابنا مسعود إلى النبي ﷺ . فذهب عبد الرحمن يتكلم فقال: ((كبر كبر))، وهو أحدث القوم. فسكت فتكلما فقال: ((أتحلفون وتستحقون قاتلكم أو صاحبكم؟)) قالوا: وكيف نحلف ولم نشهد ولم نر، قال ((فتبرئكم يهود بخمسين))، فقالوا: كيف نأخذ أيمان قوم كفار؟ فعقله النبي ﷺ من عنده. [راجع: ۲۷۰۲]

"وهي يومئذ صلح" خیبر سے صلح ہوئی تھی۔

امام بخاری رحمہ اللہ یہاں پورا واقعہ لائے ہیں اور قسامت کے باب میں یہ حدیث نہیں لائے۔ مقصد اس کا یہ کہ اس پر عمل نہیں ہے، عمل اس پر ہے جو وہاں آئی ہے، حالانکہ وہ اس کے مقابلے میں نسبتاً مجمل ہے۔

(۱۴) باب هل يعفى عن الذمي إذا سحر؟

"وقال ابن وهب: أخبرني يونس، عن ابن شهاب، سئل: أعلى من سحر

من أهل العهد قتل ؟ قال : بلغنا أن رسول الله ﷺ قد صنع له ذلک فلم يقتل من صنعه و كان من أهل الكتاب "۔

مطلب یہ ہے کہ اگر ذمی جادو کرے تو اس کے بدلے اس کو تعزیر دے سکتے ہیں، قتل نہیں کر سکتے۔

(۱۵) باب ما يحذر من الغدر،

۳۱۷۶ ـ ....**موتان ياخذ فيكم كقعاص الغنم**........ یعنی ایسی عام وبا آجائے گی جس سے لوگ مریں گے، مراد طاعون ہے۔ [۵، ۶]

"**كقعاص الغنم**" جیسے مویشیوں میں بیماری پھیل جاتی ہے اور بعض زیادہ صحیح نسخوں میں "**كقُصاص**" ہے "صاد" کے ساتھ "**أی كقُصاص الغنم**" دونوں کے معنی ایک ہیں۔

(۱۷) باب إثم من عاهد ثم غدر،

۳۱۸۰ ـ ..... **لم تجتبوا**....... کے معنی ہیں ٹیکس نہیں وصول کرسکو گے، دینار و درہم کی صورت میں کوئی ٹیکس نہیں وصول کرسکو گے، کیونکہ تمہاری قوت کمزور پڑ جائے گی اور غیر مسلم چھا جائیں گے وہ تمہیں خراج نہیں ادا کریں گے۔

(۱۸) باب:

۳۱۸۱ ـ حدثنا عبدان: أخبرنا أبو حمزة قال: سمعت الأعمش قال: سألت أبا وائل: شهدت صفين؟ قال: نعم، فسمعت سهل بن حنيف يقول: اتهموا رأيكم، رأيتني يوم أبي جندل، ولو أستطيع أن أرد أمر النبي ﷺ لرددته، وما وضعنا أسيافنا على عواتقنا لأمر يفظعنا إلا أسهلن بنا إلى أمر نعرفه غير أمرنا هذا. [أنظر: ۳۱۸۲، ۴۱۸۹، ۴۸۴۴، ۷۳۰۸] [۷]

ابو اعمش کہتے ہیں کہ میں نے ابو وائل سے پوچھا کہ آپ صفین کی جنگ میں حاضر تھے؟ انہوں نے کہا:

---

۵ لایوجد للحدیث مکررات.

۶ وفی سنن أبی داؤد ، کتاب الأدب ، باب ماجاء فی المزاح ، رقم : ۴۳۴۸، وسنن ابن ماجة ،کتاب الفتن ، باب اشراط الساعة ، رقم : ۴۰۳۲، ومسند أحمد ، باقی مسند الأنصار ، باب حدیث عوف بن مالک الأشجعی الأنصاری، رقم : ۲۲۸۴۶، ۲۲۸۵۴، ۲۲۸۶۰، ۲۲۸۷۱.

۷ وفی صحیح مسلم ، کتاب الجهاد والسیر ، باب صلح الحدیبیة فی الحدیبیة ، رقم : ۳۳۳۸، ومسند احمد ، مسند المکیین ، باب حدیث سهل بن حنیف ،رقم : ۱۵۴۰۷.

ہاں میں حاضر تھا، تو میں نے حضرت سہل بن حنیف کو یہ کہتے ہوئے سنا۔

اس کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت سہل بن حنیف اگر چہ جنگ صفین میں موجود تھے، لیکن لوگ ان پر تہمت لگاتے تھے کہ یہ جنگ کے اندر جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کر رہے ہیں اور جنگ میں کچھ کوتاہی کر رہے ہیں، تو جیسا اس قسم کے موقعوں میں ہوتا ہے ان کے دل میں بھی تردد تھا کہ پتہ نہیں یہ جنگ ٹھیک بھی ہے یا نہیں، اس واسطے یہ اپنے آپ کو کچھ روک کر لڑ رہے تھے۔

ایسے موقعوں پر جیسے جوشیلے لوگ کہتے ہیں کہ یہ بزدل ہیں، لڑ نہیں رہے ہیں، ان کو بھی کہا گیا، انہوں نے کہا کہ **"اتھموا رأيكم"** اپنی رائے کو متہم سمجھو، تم مجھ پر بزدلی کی جو تہمت لگا رہے ہو اس پر اپنے آپ کو متہم سمجھو۔

"رأيتني يوم أبي جندل" کہتے ہیں کہ جو موقع لڑنے کا تھا اس میں، میں نے بزدلی نہیں دکھائی۔ ابو جندل کے دن یعنی حدیبیہ کے دن جب ابو جندل آئے تھے تو اس دن کا حوالہ دیا کہ اگر اس دن میرے اندر لڑنے کا اتنا جذبہ تھا کہ اگر حضور اقدس ﷺ کو رد کرنے کی طاقت ہوتی تو میں رد کر دیتا۔

یعنی حضور اقدس ﷺ نے فرمایا تھا کہ نہ لڑو اور میرے دل میں یہ آ رہا تھا کہ لڑوں، لیکن حضور اقدس ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے خاموش رہا۔

اور آج یہاں ٹھنڈا پڑا ہوا ہوں، لڑ نہیں رہا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حضور اقدس ﷺ کے حکم کی تعمیل میں جب کبھی اپنے کندھوں پر تلواریں اٹھائیں تو چاہے کتنا ہی گھبرا دینے والا منظر ہو، بالآخر اللہ ﷻ نے ہمارے ساتھ سہولت کا معاملہ فرمایا۔

اور صفین کی جنگ کا معاملہ ایسا ہے کہ ہم نے کندھوں پر تلواریں اٹھائی ہیں، لیکن اس کے باوجود معاملہ سہولت کی طرف نہیں جا رہا، اس سے مجھے یہ اندیشہ ہو رہا ہے کہ پتا نہیں ہماری یہ لڑائی صحیح ہے یا نہیں؟

کہتے ہیں کہ **"وما وضعنا أسيافنا على عواتقنا لأمر يفظعنا إلا أسهلن بنا إلى أمر نعرفه"** "ہم نے جب بھی اپنے کندھوں پر تلوار اٹھائیں ہیں ایسے معاملہ کیلئے جو ہمیں گھبرا دینے والا ہو تو وہ تلواریں ہمیں سہولت کی طرف لے گئی ہیں، ایک ایسے امر کی طرف جس کو ہم جانتے تھے کہ یہ ہمارے لئے سہولت کا باعث ہے۔

"غير أمرنا هذا" سوائے ہمارے اس صفین کے معاملہ میں کہ تلواریں اٹھائی ہیں، مگر سہولت کا راستہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

(۱۹) باب المصالحة على ثلاثة أيام أو وقت معلوم

تین دن یا وقت مقررہ تک کے لئے صلح کرنے کا بیان

(۲۰) باب الموادعة من غير وقت ،

وقول النبی ﷺ :((أقركم على ما أقركم الله)).

غیر معین وقت کے لئے معاہدہ کرنے سے متعلق آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے (اے یہودیوں) جب تک اس سرزمین میں اللہ ﷻ کو تمہارا ٹھہرانا مقصود ہے اس وقت تک میں بھی تم کو رہنے دونگا۔

یعنی پہلے تو مصالحت کی کوئی مدت تھی اور یہاں مصالحت کی کوئی مدت نہیں ہے۔

(۲۱) باب طرح جيف المشركين في البئر ،

ولا يؤخذ لهم ثمن

مشرکوں کی لاشوں کو کنویں میں پھینکنے کی اجرت نہ لینے کا بیان

۳۱۸۵ ۔ حدثنا عبدان بن عثمان قال : أخبرني أبي عن شعبة عن أبي إسحاق عن عمرو بن ميمون، عن عبدالله ﷺ قال: بينا رسول الله ﷺ ساجد وحوله ناس من قريش من المشركين إذ جاء عقبة بن أبي معيط بسلى جزور وقذفه على ظهر النبي ﷺ فلم يرفع رأسه حتى جاءت فاطمة رضي الله عنها فأخذت من ظهره، ودعت على من صنع ذلک.فقال النبي ﷺ ((اللّهم عليک الملأ من قريش ، اللّهم عليک أبا جهل بن هشام، وعتبة بن ربيعة ، وشيبة بن ربيعة ، وعقبه بن أبي معيط وأميه بن خلف أو أبي بن خلف فلقد رأيتهم قتلوا يوم بدر فألقوا في بئر غير أميه أو أبي فإنه كان رجلا ضخما فلما جروه تقطعت أوصاله قبل أن يلقى في البئر)). [راجع : ۲۴۰]

اس سے اس مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کافر کہیں کہ ہمارے آدمی کی لاش دیدو اور پیسے لے لو تو پیسے لے کر لاش نہیں دی جائے گی اور یہ ترمذی کی ایک حدیث کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جس میں ہے کہ مشرکین نے اپنے ایک ساتھی کی لاش پیسے دے کر لینے کا ارادہ کیا تھا، نبی کریم ﷺ نے انکار فرمایا۔

یہاں بدر کا واقعہ ذکر کیا کہ آپ ﷺ نے مشرکین کی لاشوں کو کنویں میں ڈال دیا، حالانکہ وہ بڑے بڑے سردار تھے، اگر جائز ہوتا تو وہ پیشکش کر کے اپنے لوگوں کی لاشیں لے لیتے، لیکن معلوم تھا کہ نبی کریم ﷺ اس طرح نہیں دیں گے، اس لئے انہوں نے نہیں لیا۔ [۸]

اللّٰھم اختم لنا بالخیر

کمل بعون اللّٰہ تعالیٰ الجزء السابع من "إنعام الباری" ویلیہ إن شاء اللّٰہ تعالیٰ الجزء الثامن: أوّلہ کتاب بدء الخلق، رقم الحدیث: ۳۱۹۰۔

نسأل اللّٰہ الاعانة والتوفیق لإتمامہ۔

والصلوٰة والسلام علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد خاتم النبیین وامام المرسلین وقائد الغر المحجلین وعلی الہ وأصحابہ أجمعین وعلی کل من تبعھم باحسان الی یوم الدین۔

آمین ثم آمین، یا رب العالمین۔

---

[۸] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیں: انعام الباری، ج:۲، ص:۳۹۱۔

شیخ الاسلام مولانا مفتی **محمد تقی عثمانی** صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث جامعہ دارالعلوم کراچی

کے گرانقدر اور زندگی کا نچوڑ، علمی افادات آڈیوز کی شکل میں

- ☆ درس بخاری شریف (مکمل)
- ☆ کتاب البیوع درس بخاری شریف عصر حاضر کے جدید مسائل (معاملات) پر سیر حاصل بحث
- ☆ **أصول افتاء للعلماء والمتخصصین**
- ☆ دورۂ اقتصادیات
- ☆ دورۂ اسلامی بینکاری
- ☆ دورۂ اسلامی سیاست
- ☆ تقریب "**تکملة فتح الملهم**"
- ☆ علماء اور دینی مدارس (بموقع ختم بخاری ۱۴۱۵ھ)
- ☆ جہاد اور تبلیغ کا دائرہ کار
- ☆ افتتاح بخاری شریف کے موقع پر تقریر دل پذیر
- ☆ زائرین حرمین کے لئے ہدایات
- ☆ اسلام اور سیاسی نظریات
- ☆ والدین کے ساتھ حسن سلوک
- ☆ زکوۃ کی فضیلت و اہمیت
- ☆ جوش و غضب، حرص طعام، حسد، کینہ اور بغض، دنیائے مذموم، فاستبقوا الخیرات، عشق عقلی و عشق طبعی، حب جاہ وغیرہ اصلاحی بیانات اور ہر سال کا ماہ رمضان المبارک کا بیان۔
- ☆ اصلاحی بیانات۔ بمقام جامعہ دارالعلوم کراچی، تسلسل نمبر ۱ تا ۴۲۵ کیسٹوں میں ۱۴۳۲ھ تک۔
- ☆ امت مسلمہ کی بیداری